PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

نیرنگ خیال جلد ۱۱

کیا اکبر بادشاہ اَن پڑھ تھا؟

از جناب شجاعت علی صاحب اسسٹنٹ ناظم کتاب خانہ شاہی ریاست رامپور

مصدرہ بالا عنوان کے ماتحت میرے فاضل محترم پروفیسر وجاہت حسین صاحب عندلیب شادانی کا ایک محققانہ مضمون رسالہ نیرنگ بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں شایع ہوا تھا۔ اُسی وقت سے یہ خیال تھا کہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ لیکن بعض دیگر علمی مشاغل کی وجہ سے اس کا موقع نہیں ملتا تھا۔ خدا خدا کرکے آج اپنے یکسالہ خیال کے اظہار کا وقت آیا۔ مجھے اپنے فاضل مہربان سے قوی امید ہے کہ وہ میری اس ناشناسانہ جرأت سے اپنے احساسات کو متألم نہ ہونے دینگے ◆

پروفیسر صاحب موصوف کے مضمون کے بظاہر دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں آپ نے مولٰنا اشفاق حسین صاحب کے کمزور کیرکٹر پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے حصہ میں مولانا موصوف اور مسٹر نریندرا ناتھ لا کی تردید کرتے ہوئے شہنشاہ اکبر کو اَن پڑھ ثابت کرنے کی غیر واجب کوشش کی ہے۔ اور سنت مورخین اسلاف کے ادا کرنے میں خوب سرگرمی دکھائی ہے ◆

میرے مضمون کا تعلق صرف دوسرے حصہ سے ہے ◆

پروفیسر صاحب موصوف نے آئین اکبری کی حسب ذیل عبارت نقل کرکے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے (ہر روز کہ بدآنجی رسد بشمارۂ آں بندہ بقلم تو ہر بار نقش کنند الخ) "معلوم نہیں کہ ہمارے فاضل مضمون نگار سے کس نے کہدیا کہ یہ عام دستور ہے کہ ہندسہ نویسی حروف شناسی کے بعد بتائی جاتی ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا عام رواج موجود نہیں۔ کہیں اتفاقاً ایسا بھی ہوتا ہوگا۔ مگر عموماً اس کے خلاف ہے"

پروفیسر صاحب کی اس عمومیت کے معنے میری سمجھ میں نہیں آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عموم میں کسی خصوص کو دخل ہے۔ اور اس سے مراد آپ کی اختراعی عمومیت ہے ورنہ مشاہدہ تو اس کی تردید کرتا ہے ◆

ایشیائی طریقہ تعلیم کے لحاظ سے تو بچے کے ہاتھ میں قلم ہی اُس وقت دیا جاتا ہے۔ جب وہ کم از کم ابتدائی مراحل ابجدی کو طے کر چکتا ہے ◆

رہا پروفیسر صاحب کا ذاتی خیال اس کی عنان ہمارے ہاتھ میں نہیں کہ وہ بچہ کو ہندسہ نویس بنا کر حروف شناس کرنا پسند کرتے ہوں۔ یا ارتھمیٹک۔ والجبرے کی "یبوست بخش فضا" سے گزر جانے کے بعد لیکن موجودہ طریقہ تعلیم کے لحاظ سے تو اس عبارت سے یہ ضرور لازم آتا ہے کہ اکبر اُس وقت کم از کم کچھ پڑھا لکھا تھا۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب استماع حدیث کی روایت نقل کرکے لکھتے ہیں کہ "ہمیں اس کا ذرا بھی تعجب نہیں کہ ہمارے فاضل مضمون نگار نے پڑھنے اور سننے کو مترادف سمجھ لیا۔ کیونکہ اُنہوں نے تو اصل کتاب کو چھوا تک نہیں۔ جو کچھ شعر العجم میں لکھا تھا وہ نقل کر دیا۔ مگر حیرت تو اس پر ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے مآثر الامراء کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کس طرح لکھدیا کہ اکبر ان کے گھر جا کر حدیث پڑھتا تھا"

میرے محترم دوست کو علامہ شبلی کے اس قول سے جسقدر تعجب ہوا مجھے اُس سے کہیں زیادہ آپ کے اس تعجب پر تعجب ہے۔ خدا کرے کہ یہ تعجبات تسلسلی صورت اختیار کرکے دور کی حد تک نہ پہنچے۔ جو علامہ شادانی کو میرا ہمخیال ہونا پڑے۔

کاشکے ہمارے پروفیسر صاحب موصوف طریقۂ درس حدیث تاریخی کتابوں ہی میں دیکھ لیتے۔ پھر شبلی مرحوم کو ملامت کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ◆

حدیث کی تعلیم کا طریقہ یہی تھا کہ اُستاد شاگردوں کو حدیث پڑھ کر سناتا تھا اور اس کے ختم ہو جانے کے بعد سماعت کی سند دیتا تھا۔ آجکل بعض محدثین نے ضرور اس کو بعض وجوہ سے ترک کر دیا ہے۔ لیکن اُس وقت تک یہی طریقہ رائج تھا۔ اس بنا پر علامہ شبلی کا یہ کہنا کہ اکبر حدیث پڑھنے اُن کے گھر جایا کرتا تھا۔ بالکل صحیح ہے اور اس سے اکبر کی تعلیم کا بہترین ثبوت ملتا ہے ◆

اس کے بعد فاضل مضمون نگار نے ایک اور دلیل قایم کی ہے جس کو سب سے زیادہ مضبوط اور لاجواب خیال کرکے اس پر پورا زور قلم صرف کیا ہے ◆

لیکن وہ "ان اوھن البیوت بیت العنکبوت" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ابو الفضل جس نے اکبر کو انسانی سطح سے اُٹھا کر دیوتاؤں کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ بلکہ اسے الوہیت کے مرتبہ پر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ...... یہ امر حیرت کا ہے کہ اکبر نے بالکل ابتدائی تعلیم بھی پائی ہوئی اور معمولی نوشت خواند پر بھی قادر ہوتا تو وہ (ابو الفضل) اسے دنیا کے تمام علماء سے بڑھا دیتا لیکن اکبر کا ان پڑھ ہونا ایک ایسی عالم آشکارا حقیقت تھی جس سے کسی طرح انکار ممکن نہ تھا۔ لہذا اس کو اس کی تاویلیں کرنا پڑیں" +

مجھے نہایت افسوس ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس معاملہ میں بھی کچھ دقت نظر سے کام نہیں لیا۔ ورنہ ہرگز ایسے الفاظ تحریر کرنے کی جرأت نہ کرتے +

میرے خیال میں ابو الفضل کی یہ چالاکی دنیا تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اکبر کو امی ثابت کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی اور اپنے عقیدت کیش اصحاب کے دلوں پر اس امر کا نقش اس طرح جمایا کہ مٹائے نہیں مٹتا +

ابو الفضل کی اس فعل کے کرنے سے یہ غرض تھی کہ وہ اکبر کو ایک نئے مذہب کا بانی اور اس مذہب کو الہی مذہب ثابت کرنا چاہتا تھا +

ادھر ہمارے رسول اللہ صلعم کے واقعات اس کے پیش نظر تھے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ نبی آخر الزماں کو جس چیز نے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا وہ آپ کا امی ہونا تھا۔ اور حقیقتاً ایک ان پڑھ شخص کا ایک نئے مذہب کے بار کا متحمل ہو جانا اس کا بہترین معجزہ اور تائید غیبی کا مسلم ثبوت ہے +

صرف اسی بنا پر ابو الفضل نے بھی بانی مذہب الہی (اکبر) کو بانی مذہب اسلام (محمدؐ) کے مقابلہ میں ان پڑھ بنا کر پیش کیا۔ ورنہ حقیقت اس کے خلاف تھی +

اس کے بعد پروفیسر صاحب موصوف نے اکبر کی توجہ اور تبدیل اساتذہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اکبر کے نہ پڑھنے کی وجہ سے چند استاد بدلے گئے۔ مگر اس کو نہ پڑھنا تھا نہ پڑھا +

اس میں بھی فاضل مضمون نگار کو تسامح ہوا۔ ایک شاہزادہ کے استاد کو اس بنا پر بدل دینے کے کہ وہ اس سے پڑھتا نہیں یہ معنے نہیں ہوتے کہ شاہزادہ تعلیم کی طرف سے بالکل کورا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کے حسب دلخواہ اپنی تعلیم کو وسیع نہیں کرتا +

آئین اکبری کی روایت کے مطابق ہمایوں نے چار سال اکبر کو پڑھانے کی کوشش کی۔ اب میں دریافت کرتا ہوں کہ اس چار سالہ کوشش کے بعد کیا اکبر جیسا فہیم ذکی الفطرت بچہ ان پڑھ رہ سکتا تھا یا نہیں؟

مانا کہ وہ ابو الفضل یا فیضی جیسا فاضل نہیں بن سکا لیکن اس قابل بھی نہ تھا کہ اس کو امی کہا جا سکے۔ آگے چل کر مولانا عبد القادر بدایونی کے قول کے مطابق مولانا لکھتے ہیں۔ کہ "۹۶۳ھ میں اکبر نے میر عبد اللطیف سے دیوان حافظ پڑھنا شروع کیا تھا۔" اب ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک سمجھدار سلیم الطبع شخص جو آج دیوان حافظ پڑھنے کی جرأت کرتا ہے کیا وہ آگے چل کر ان پڑھ کہلانے کا بھی مستحق ہو سکتا ہے؟ ہمنے مانا کہ فارسی اس وقت معراج کمال پر پہنچ چکی تھی۔ اور دیوان حافظ کے پڑھنے کے لئے کسی اعلیٰ قابلیت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن کیا اس کے یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ ایک بالکل بے پڑھا لکھا شخص اس کو شروع کر دے۔ اس کو تو الف بے تے یا زائد سے زائد چھوٹے چھوٹے جملوں کی کتاب پڑھنا چاہئے۔ نہ کہ دیوان حافظ جیسی مسلسل اور وہ بھی نظم کی کتاب +

اس یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو گئی کہ اکبر ۹۶۳ھ میں ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب موصوف نے ایک نہایت زبردست اور مستند شہادت پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے:۔

پدرمن در اکثر اوقات با دانایان ہر دین و مذہب صحبت می داشتند خصوصاً با پنڈتان و دانایان ہندو با آنکہ اُمی بودند الخ"

حقیقتاً یہ شہادت نہایت معتبر ہے۔ اور اس کی تردید سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ جہانگیر کی کسی دوسری روایت سے ہی اس کو غلط ثابت کیا جائے۔ اور یہ نہایت دشوار ہے۔ بظاہر اس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ کیونکہ جہانگیر کا اپنے اس قول کے مخالف کوئی بات کہدینا اور خود اپنے آپ جھوٹا ثابت کرنا محال ہے۔ لیکن حقیقت بغیر ظاہر ہوئے نہیں رہتی۔ اور جھوٹ کبھی نہ کبھی کھل ہی جاتا ہے۔ جہانگیر غریب کو یہ کیا معلوم تھا کہ میں کسی معمولی جگہ اپنے باپ کو پڑھا لکھا لکھ چکا ہوں۔ حال ہی میں سر تھامس ڈبلیو آرنالڈ نے بہزاد کی وہ تصویریں شائع کی ہیں جو اس نے اپنے قلم سے ظفر نامہ میں بنائی تھیں۔ ظفر نامہ کا یہ نسخہ شاہجہان، اکبر اور جہانگیر کے کتاب خانوں میں رہ چکا ہے۔ اور آجکل مسٹر رابرٹ گیریٹ کے پاس ہے +

جناب مرتب نے اس ظفر نامہ کے ٹائیٹل پیج کا عکس بھی دیا ہے۔ جس پر شاہجہان اکبر اور جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی عبارتیں ہیں +

چنانچہ ایک جگہ "۱ فروردین" نہایت صاف خط میں لکھا ہے۔ اسکے نیچے جہانگیر کے قلم کی یہ عبارت تحریر ہے:۔

"ایں کلمہ خط مبارک حضرت آستانیست و میر جلال الدین حسین ایں نسخہ را در دار الخلافت آگرہ بپیشکش آنحضرت نمود"

یہاں جہانگیر نے خود اپنے باپ (اکبر) کو پڑھا لکھا ہونا ثابت کیا ہے۔ اور ثبوت میں خود اکبر کا لکھا ہوا پیش کر دیا ہے +

بوجوہ مندرجہ بالا کی بنا پر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اکبر پڑھا لکھا نہ تھا اور اگر اب بھی کوئی اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو اُس کا خدا حافظ +

شجاعت علی



جذباتِ مادر

میرے بچے! تو مجھے یاد آتا ہے۔

جب مرغ سحر اہل دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اپنا بگل بجاتا ہے۔ اور مرغان خوش الحان مناظر قدرت کی فضا میں کھیلتے ہیں۔ آنکھیں کھلنے سے پہلے میرے ہاتھ تجھ کو ٹٹولتے ہیں۔ اور پانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نہ پا کر بصد افسوس اپنی جگہ پر واپس آجاتے ہیں۔ تاریکی اپنا منہ کالا کر کے روپوش ہو گئی۔ اب دنیا کی ہر چیز نورانی ہے۔ مائیں اپنے اپنے بچوں کو دیکھ کر آنکھیں روشن کرتی ہیں لیکن میری آنکھیں کھلتی ہیں ہر چہار طرف تیری تلاش میں دوڑتی ہیں بھر ناچار تھک کر رہ جاتی ہیں۔ اور تیری یاد میں محبت کے چند آنسو بہاتی ہیں +

میرے بچے! تو مجھے یاد آتا ہے +

جب پڑوس کے بچے اپنی پیاری پیاری باتوں سے اپنی ماؤں کے دل ٹھنڈے کرتے ہیں۔ آوازیں سُنکر دل بیچین ہو جاتا ہے۔ دیوانہ وار تیرے دیدار کی حسرت کو آغوش میں دبائے کھڑکی کی طرف دوڑتی ہوں اور بیٹھ کر جھانکتی ہوں۔ کان تیری آواز سُننے کے مشتاق ہوتے ہیں آنکھیں اپنی پوری قوت سے نظر دوڑاتی ہیں۔ اور تجھ کو ان بچوں کی جماعت میں دیکھنا چاہتی ہیں جن کے ساتھ کبھی تو کھیلتا تھا۔ لیکن آہ! بہت جلد کام اپنی جگہ پر آجاتی ہیں۔ اور سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے +

میرے بچے! تو مجھے یاد آتا ہے +

جب سڑکیں اسکول کے ننھے ننھے بچوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ میری آنکھیں تیزی سے چلتی ہیں اور ہر سڑک کو ٹٹولتی ہیں لیکن افسوس! وہ مضطربانہ واپس آتی ہیں اور اپنی ناکامی پر آنسو بہانے لگتی ہیں +

میرے بچے! تو مجھے یاد آتا ہے +

جب آفتاب ڈھلکر دنیا کی بے ثباتی کا ثبوت دیتا ہے اور جب گھڑی میں "تین کا وقت" ماؤں کے قلوب میں انبساطی کیفیت متحرک کرتا ہے بچوں کی آوازیں سُنکر میرا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ آنکھیں جلد جلد دوڑتی ہیں اور انتظار میں دروازے تک بڑی تیزی سے جاتی ہیں۔ اور صبر کی دیوی بن کر لگ جاتی ہیں۔ اسکول سے واپس ہونے والے ہر بچہ کو غور سے دیکھتی ہیں اور پہچاننے کی کوشش کرتی ہیں۔ آہ! ناکام و نامراد آنکھیں خون حسرت کے چند آنسو بہا کر خاموش ہو جاتی ہیں +

(خاص)

اظہر فاروقی

مولوی فاضل۔ فاضل ادب و دینیات و دبیر کامل ہیڈ اردو ٹیچر ٹاؤن ہال بنارس

"محدّث کی دُختر"

از جناب ایم۔ اے وحید سنبھلی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (کلاس)

عشق و محبت کی پُر لطف و پُر غم داستانیں۔ ان مدوجزر اور ابتدائی و انتہائی حالتیں آپ نے اغلباً پڑھی اور سنی ہونگی۔ ہمارے خیال میں ہر ایک عاشق کا معیار عشق دوسرے سے جدا رہا ہے۔ اگر آپ ایک راجہ یا نواب ہیں تو آپ نے عورتوں کے چھڑانے میں کمی نہ کی ہوگی۔ اگر آپ ایک بڑے انگریزی داں عہدہ دار ہیں تو صاحب وہاں کی حاضری سے حالت بخار میں بھی باز نہیں رہے ہوں گے۔ اگر آپ ایک کفایت شعار معمولی زمیندار ہیں تو اپنے گاؤں کے مقدم کی لڑکی۔ ڈیرے میں آٹا پیسنے والی چماری۔ یا پانی بھرنے والی کہاری پر دل مجبوراً پھینک کر اس کو ایک قطعہ زمین بلا لگان دینے کا وعدہ کر دیا ہوگا۔ اگر آپ بڑے زمیندار کے بیٹے ہیں تو خوب بے نرخ اناج بیچ کر عیاشی کی ہوگی۔ اگر آپ کالج کے طالبعلم ہیں تو زنانہ اسکول والی سڑک پر ضرور ٹہلے ہونگے۔ اگر آپ ایک شریف کے سیدھے بیٹے ہیں تو کسی نہ کسی دن اپنی خادمہ کا باورچیخانہ میں زبردستی پیار لے کر اس کو نیا قمیص بنا دینے کا وعدہ کر دیا ہوگا۔ ہمارے ایک دوست کو جب کہیں موقع نہ ملا تو انہوں نے سفر ریل میں اپنے متقابل بیٹھنے والی کو مع ایک سگریٹ کے دل پیش کر دیا۔ گویا کامیاب رہے۔ غرض یہ ہلکا خاکہ ہے۔ اس میدان کا جسمیں ہر شخص ایک نہ ایک دفعہ ضرور گامزن ہوا ہوگا۔ یہ تو بلاشبہ بات ہے کہ نوابوں کو اُن کی سوسائٹی۔ زمینداروں کو گاؤں کی چماریاں۔ کالج کے طلبہ کو زنانہ اسکول کی لڑکیاں اور شریف گھرانوں کے بچوں کو ان کی خادمائیں موجودہ زمانہ میں کارزار عشق کے ابتدائی مراحل ثابت ہوتی ہیں اول قدم یہیں سے بڑھایا جاتا ہے۔ اور آخرکار تباہی کے عمیق گڑھے میں جا پڑتے ہیں +

انسان کیا ہے؟ کرشمۂ قدرت کا بہترین نمونہ۔ ذرا اس کی دماغی کیفیت کا دوسرے انواع سے مقابلہ کیجئے۔ فرشتہ کی دماغی رجوعات صرف عبادت خالق پر ختم ہیں۔ جانوروں کا مقصد دنیا میں پیٹ بھر کر انسانی ضروریات کو پورا کر دینا ہے۔ لیکن انسان کی دماغی کیفیت ایسی کچھ ہے کہ ہر شخص اپنے دماغ میں ایک جداگانہ تنا ہی دنیا رکھتا ہے۔ نہیں معلوم انسان کے اس دماغی راز کا مسئلہ کب حل ہوگا۔ پھر ذرا مرد کے دماغ کا دوسرے دماغوں سے فرق بتلائیے۔ دیکھئے فرشتہ کی انتہائی دماغی خرابی یہ ہے۔ کہ وہ شیطان بن جائے۔ عورت کی دماغی کمزوری یہ ہے کہ وہ پیشہ طوائف اختیار کرے۔ جانور کی دماغی بیماری یہ ہے کہ وہ اپنے کام سے باز رہے۔ لیکن ہماری عقل آجتک مرد کے دماغ کی خرابی کو نہ پہچان سکی۔ جب یہ بگڑتا ہے تو عجیب عجیب پر درد و پرمسرت نظارے پیش کرتا ہے۔ قدرت نے فرشتہ کو نافرمانی پر اخراج جنت کی سزا دیدی۔ عورت کو اُس کی نافرمانی پر عصمت فروشی کی پاداش ملی۔ جانور کی نافرمانی پر اُس کے ذبح کر لینے کا حکم دیدیا۔ مگر فرمائیے مرد کی نافرمانیوں پر قدرت نے اُس کے واسطے کونسی نئی تعزیر تجویز کی ہے؟

(۲)

اب یہ بات سب کو معلوم ہے کہ عتیق کی صحبت کا زیادہ وقت اجل جیسے عیاش مزاج لوگوں کی صحبت میں کٹتا ہے لیکن عتیق کی صحبت ان لوگوں میں محض ایک شکاری کی حیثیت سے ہے۔ وہ بذات خود شکار کا بیحد شوقین ہے۔ دوستوں کی بازاری تفریحات سے وہ بالکل بے تعلق اور لاپرواہ ہے۔ نہ کسی کو یہ یقین ہو سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی عیاشانہ تفریحات میں حصہ لے گا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے نہایت سنجیدہ، مہذب اور پاکباز رہا ہے۔ تقریباً اُنیس سال کی عمر میں انٹرنس پاس کر لینے کے بعد اُس کے ضعیف باپ نے گھر کے کل حساب کتاب اُس کے حوالہ کر دیا ہے۔ زمینداری کی کل آمدنی اُسی کے ہاتھوں میں آتی اور خرچ ہوتی ہے اُس کے باپ خان بہادر کبیر الدین قصبہ کمال پور سودھی کے رئیس اعظم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص عتیق کی بھی عزت کرتا ہے +

ایک ناتجربہ کار انسان، دنیا و مافیہا سے بے خبر اول مرتبہ کسی قسم کی پہلی سوسائٹی میں شریک ہوتے ہوئے خاص لطف لیتا ہے۔ گو اُس کا یہ لطف عمل پر مبنی نہ ہو۔ وہ صرف سوسائٹی کی زبان سے زبانی قصہ سنتا ہے۔ لیکن جب عملی

مدارج پر پہنچتا ہے تو اُس کو دلچسپی ہو جاتی ہے۔ عتیق اپنے شکاری دوستوں کو زمینداری کے قصے سناتا اور وہ لوگ اپنی ذہنی حالت کے مطابق بازاری عیاشی کی حکایات سُناتے۔ وہ ان قصوں میں بڑا لطف لیتا۔ خوب ہنستا اور دوسروں کو ہنساتا۔ شکار بازی بے تکلفی کا بہترین آلہ ہے۔ اگر آپ کو کسی سے بے تکلفی کرنا مقصود ہے تو ذرا اُس کے شکار میں جایئے پھر دیکھئے کتنی جلدی دوستی ہوتی ہے جبتک شکار نظر نہیں آتا راستہ کی مسافت جھوٹی سچی یا مسخری باتوں سے طے ہوتی ہے۔ اُس کے نزدیک ان کی زندگی ایک نئی زندگی تھی۔ ایک دفعہ اجمل نے سرسری طور پر دورانِ صحبت میں ایک نووارد طوائف کے حسن و جمال کی خبر سنائی اگرچہ اس خبر نے عتیق کے دماغ پر کچھ اثر نہ کیا۔ نہ اُس کے دل نے یہ رغبت ظاہر کی کہ وہ اس طوائف کو دیکھے۔

کمال پور گو ایک قصبہ ہے مگر کثرت آبادی اور زیادتی تجارت نے اس کا شمار شہروں میں کردیا ہے۔ مزارات کے لئے تو بالخصوص مشہور ہے۔ آجکل میاں فاضل شاہ کا عرس زور پر ہے۔ دور و نزدیک کی رنڈیاں نہ صرف بغرض زیارت بلکہ برائے اشاعت بھی آئی ہوئی ہیں۔ مزار مقدس کے گرد ہر وقت مجالس قوالی کا سلسلہ ہے۔

عتیق ایک شام کو بغرض فاتحہ مزار پر جاتا ہے۔ گانے والیوں کے راگوں کو بھی سنتا ہے۔ یہیں پر شکاری دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ذرا دیر بعد سب لوگ گھر کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ راستہ میں گانے والیوں کے گانوں پر ہر شخص اپنی تنقیدانہ نظر ڈالتا چلا آرہا ہے۔ دورانِ گفتگو میں عتیق کہتا ہے "وہ حسین طوائف جو مزار کے مغربی حصہ میں گا رہی تھی خوب گاتی ہے"۔ اجمل اسکی تشریح یوں کرتے ہیں۔ "ارے بھائی یہی تو وہ نووارد گلشنی بائی ہے۔ جس کے حسن کا چرچہ یکہ والے کی زبان سے لیکر اسٹیشن کے بابوؤں کی زبان تک ہے"۔

آج یہ پہلا موقع تھا کہ عتیق کی زبان سے ایک طوائف کے لئے لفظ "حسین" نکل گیا۔ اُس کے حسن و جمال کے گذشتہ تذکرات اور آج عینی دید عتیق کے دماغ کو کچھ دیر غور کرنے کا موقع دیا۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے خوبصورت معلوم ہوئی۔ اب یہ لوگ ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے اور عتیق بھی اپنے گھر آگیا حقیقت پوچھتے ہو تو یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مجالسِ عرس عیاشی کے کمپنی گھر ہیں جہاں ہر قسم کے گاہک اور مال ملتا ہے۔ جنس مخالف اگر اشاعت حسن کے لئے جاتی ہے تو بعض مرد شانہ سے شانہ ہی ملانے پہنچ جاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ خطرناک میلے جہاں صدہا مسلمان اپنے ہزارہا روپیہ کی بربادی کرتے ہیں۔ کتنے شریف زادے ہیں جو ایسی مجالس کے مہلک جراثیم سے فنا ہو گئے۔

(۳)

عرصہ چند ماہ کا گذر جاتا ہے۔ آج محلہ میں ایک شادی ہے۔ اور اتفاق سے گلشنی بائی ہی گانے کے واسطے بلائی گئی ہیں۔ گیارہ بجے شب کو عتیق اپنے دوستوں کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کر رہا ہے۔ اتنے میں گانے کی آواز سنائی پڑی۔ گانے کا یا گانا سننے کا اُسے بالکل شوق نہ تھا۔ بلکہ ابتک وہ اُسے بیکار وقت کی تفریح بھی خیال نہیں کرتا ہے۔ گانے کی آواز سُن کر سب لوگ خاموش سے ہو گئے۔ عتیق کو نیند آرہی تھی۔ اُس نے کہا "اب سونا چاہئے"۔ اجمل نے کچھ دیر خاموش رہ کر جواب دیا "آؤ ذرا گانا سنینگے"۔

عتیق۔ نہیں بھائی مجھے تو نیند آرہی ہے۔

اجمل۔ بس آدھ گھنٹے میں چلے آئیں گے۔

دوستوں کے ضد سے وہ چلنے پر تیار ہو گیا۔ جب یہ لوگ ٹھیکیدار صاحب کے مکان پر پہنچے۔ فوراً اگلی نشستیں خالی کرادی گئیں۔ اور ہر شخص اس معزز مہمان کو بغور دیکھنے لگا گلشنی نے بھی ایک دفعہ اس کی جانب گہری نظر سے دیکھا۔ گانا ہوتا رہا۔ عتیق سنتا رہا تقریباً دو گھنٹہ بعد گلشنی بیٹھ گئی اور یہ لوگ اُٹھ بیٹھے۔

عتیق اپنے کمرہ میں آیا اور سو گیا۔ مگر خلاف معمول آج اُس نے چندبار گلشنی کو خواب میں دیکھا۔ صبح کے وقت بیداری کے بعد تھوڑے عرصہ تک اُس کو گلشنی کی گانے والی صورت اور خوابی حرکات کا خیال رہا۔ اور پھر اپنی روزانہ زندگی میں شب کی تمام تفریحات کو بھول گیا۔ بات یہ ہے کہ اول اجمل کی تعریفیں دویم عرس کی دید اور تیسرے گذشتہ شب کے نظارہ نے یکجائی طور پر گلشنی کی صورت اور حرکات کا ایک ہلکا فوٹو اُس کے دماغ میں کھینچ دیا تھا۔ دوسری شب جب وہ سونے کے لئے جاتا ہے تو سب سے قبل گلشنی کی دھندلی صورت اُس کی آنکھوں کے روبرو ہے۔ وہ اپنے خیالات کو دوسری طرف پھیرنا چاہتا ہے مگر دماغ اس مرکز سے ہٹنا پسند نہیں کرتا۔ اسی حالت میں اس کو نیند آجاتی ہے۔ مگر کیسے جبکہ گلشنی بھی اپنی دلنواز صداؤں کے ساتھ اُس کو سحر کر رہی تھی۔ ذرا دیر بعد آنکھ کھلتی ہے اور عتیق سوجاتا ہے لیکن سُلاتا کون ہے وہ گلشنی کی خیالی صورت اور جگاتا کون ہے۔ اُسی کی حرکات کے پریشان کن خیالات۔ ایک دفعہ اُس نے خواب میں دیکھا کہ اُس کی شادی گلشنی سے ہو رہی ہے۔ وہ اُچک پڑا اور پھر سو گیا۔

سورج نکلتا ہے۔ دن ہوتا ہے۔ عتیق اپنے گھر کے کاموں کو بدستور دیکھتا بھالتا ہے۔ دنوں کے ہفتے اور ہفتوں کے مہینے بن جاتے ہیں۔ عتیق میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ راتیں دوستوں کی صحبت میں کٹتی ہیں۔ اگر کبھی کشنی کا ذکر ہوتا ہے دلچسپی سے سنتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ انسانی دماغ کے لئے بُری تعلیمی تربیت اس درجہ خطرناک نہیں جتنی کہ خراب عملی تربیت۔ وجہ یہ ہے کہ علمی تربیت محض خیالات پیدا کر دیتی ہے۔ مگر عملی تربیت پردہ ساز بنا کر ہمت وجرأت کے میدان میں کامزنی کا موقع دیتی ہے۔ اور انسان ایک چالاک بازیگر کی چالیں دکھلاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ رینالڈز کے ناول انسانی سوسائٹی کو اتنے مضر نہیں جتنا کہ مجالس رقص یا مرڈنو ٹروس۔ اوّل الذکر ممکن ہے بسرعت اصلاح کر دے۔ لیکن موخر الذکر ایک مہلک بیماری ہے۔ سوسائٹی کا رخ ملاحظہ ہو۔ عتیق طبقۂ طوائفان کو ذلیل سمجھتا ہے۔ مگر کشنی کا ذکر اس کی روح کو تازہ کرتا ہے ۔

(۴)

دنیا میں انسان کی تباہی کا کامیاب آلہ دوستی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دوست کی حیثیت اس قدر پیچیدہ ہے جس کی تعریف ابھی تک ناممکن۔ اس کا راز فاش کرنا اپنے کو اقراری مجرم ٹھہرانا ہے۔ اس کی سیرت بیان کرنا اپنی سیرت کا اظہار ہے۔ اگر کسی سے ہم اتنا کہیں ہمارا دوست چوری میں گرفتار ہو گیا۔ کہتے کہتے رک جاتے ہیں۔ کیوں۔ اس لئے کہ دوسروں کو ہمارے چور ہو جانے کا شبہ نہ گزر جائے۔ ہمارا بیٹا ایک بُرا کام کرتا ہے۔ تو اُس کو آدمیوں کے روبرو خوب مارتے ہیں۔ بھائی ایک جرم کا مرتکب ہوتا ہے اُس کی شکایت فوراً ماں باپ سے کر دیتے ہیں۔ لیکن آہ! دوست کی شکایت کس سے کی جائے جس کے سامنے اپنے گھر تک کی شکایتیں اور عیب بیان کئے جاتے ہیں۔ جو اپنی زندگی کا رہبر ہے۔ جو ہمارے دماغ پر حاوی ہے۔ اُس کی خطائیں کس کے روبرو بیان کریں۔ آج شام اجمل کے لڑکے کی ختنہ ہوئی ہیں۔ رات کو اسی خوشی میں گانا ہوگا۔ عتیق اپنے دوست کے مکان پر شام ہی سے چلا گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ گانے کا شوقین ہے۔ بلکہ بسلسلہ انتظامات۔ اجمل نے ذرا دیر بعد اپنے معزز مہمان کو اوپر لے جا کر کمرہ میں بٹھلا دیا اور کہا یہیں تشریف رکھئے۔ ہم لوگ یہیں پر کھانا کھائیں گے۔ اجمل کسی کام سے نیچے چلا گیا۔ عتیق کمرہ میں اکیلا بیٹھا بطور اوقات گذاری کے الماریوں میں بے ترتیب پڑی ہوئی کتابوں کو دیکھ رہا ہے۔ ایک دفعہ اُس کا ہاتھ تصویروں کے البم پر گیا یہ تصاویر کا خزانہ ان مادہ پرست ملکوں کی حیاسوز عیاشی کا برہنہ ثبوت رکھتا ہے۔ جہاں قدرت کاملہ کی بہترین صنعت یا صنف نازک کی بے دردی سے پامالی کی جاتی ہے۔

عتیق ہر تصویر کو دیکھتا ضرور ہے۔ مگر سمجھتا کچھ نہیں۔ کتاب کے آخری حصہ میں ایک تصویر دیکھ کر خوف کے ساتھ اچک پڑتا ہے۔ وہ سمجھا کہ اس کو کوئی دیکھ رہا ہے۔ مگر نہیں یہ فریب خیال تھا۔ وہ تصویر کو پھر جلدی سے دیکھتا ہے اور اُس کی جمی ہوئی پتلیوں میں اپنی نظر گاڑ دیتا ہے۔ معلوم ہوا تصویر اُس کی آنکھوں کو اپنے چند رنگین مصالحوں سے مسحور کر رہی ہے۔ کیا کاغذ کے چند انچ لانبے ٹکڑے میں کوئی قوت ہے۔ جو اُس کی نگاہ کو نہیں ہٹنے دیتی۔ وہ بار بار دیکھتا ہے ہاتھ کو خود بخود حرکت ہوتی ہے اور تصویر کتاب کے باہر نکال لاتا ہے۔ اُٹھتا ہے کہ اس کو جیب کے اندر رکھ دے۔ مگر آپ ہی رُک جاتا ہے ——— کوئی دیکھ رہا ہے ——— کیا یہ ایک دوست کے مال کی چوری نہیں ——— مجھے اس کا کرنا کیا ہے ——— لیکن اپنے کمرہ میں خاموشی اور تنہائی میں! ——— ہاتھ کو یکبیک حرکت ہوئی۔ تصویر کوٹ کی اندرونی جیب میں جا کر سو گئی۔ نہیں عتیق کے پُر اضطراب دل کو تسکین دینے لگی۔ دماغ نے اس وقت تصویر کی چوری نہیں کرائی بلکہ عتیق کے دل کو چُرا لیا اب اُس کو کوئی خطرہ نہ تھا ۔

اب تک جو وقت گذرا وہ خلاف معمول کام کی مشغولیت تھی۔ چند منٹ کے سکون نے دماغ کو پھر اصلی حالت پر لا دیا۔ اُس نے ایک مرتبہ جیب سے تصویر قصداً نکالی اور اُس کو البم میں لگانے لگا۔ مگر دل نے کہا آخری نظارہ اور کروں گا۔ ہاتھ تصویر کو آنکھوں کے سامنے کھینچتا ہے۔ اور ضمیر اور البم کی جانب۔ اس ادنیٰ مہم کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ یکایک آنے والے شخص کی آہٹ قدم نے اُس کے جسم میں رعشہ پیدا کر دیا۔ تصویر گری اور عتیق تصویر کو اُٹھا رہا ہے ———

کشنی۔ (کمرہ میں داخل ہوتے ہی) ——— آداب ۔

اجمل۔ عتیق یہ تصویر تو نہیں کی ہے ۔

کشنی۔ کیا آپ کے ہاتھ میں میری تصویر ہے ۔

عتیق۔ جی ہاں۔ یہ اس البم سے نکل کر گر گئی ۔

اجمل میاں ہر دو صاحبان کا تعارف کرا کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ اب کمرہ میں صرف عتیق اور کشنی دو کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ اجمل کے جاتے ہی عتیق کے دماغ میں فوری فرق ہوا۔ اسے آج تک کسی طوائف سے ملاقات کا موقع تو درکنار بات کرنے کا اتفاق بھی نہ ہوا تھا۔ تصویر کو بھول گیا اور اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھا۔ بدحواسی کا یہ عالم ہے کہ اپنے جسم تک کی خبر نہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ کوئی شخص مجھے یہاں دیکھ کر کیا خیال کرے گا۔ لاؤ باہر چلوں۔ اتنے میں کشنی نے کہا۔

کشنی۔ شاید دو ماہ گذرے ٹھیکیدار صاحب کے یہاں آپ بھی تو تشریف لائے تھے ۔

عتیق - (جلدی سے) جی ۔

کشنی - (ڈبیہ کھولتے ہوئے) لیجئے پان حاضر ہے ۔

عتیق - میں پان نہیں کھاتا ہوں (یہ الفاظ کانپتی ہوئی آواز سے نکلے)

کشنی - خیر اس وقت تو کھا ہی لیجئے ۔

عتیق - واقعی میں پان نہیں کھاتا ہوں ۔

کشنی - (ہنس کر) جناب پان کوئی نقصان کی چیز نہیں ۔

مجبوراً عتیق نے پان کھالیا۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس سے بات کر رہا ہے - چاہتا یہ ہے کہ کمرہ سے باہر چلا جائے۔ مگر جسم حرکت بھی نہیں کرتا کشنی کے سوالات کا جواب تو دیتا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کیا ۔

کشنی - آپ خاموش کیوں ہیں ۔

عتیق - نہیں تو ۔

اتنے میں اجمل میاں مع کھانے کے آجاتے ہیں۔ سب لوگ کھانا کھانے لگے۔ کھاتے وقت گفتگو ہوتی جاتی ہے۔ اجمل کے آنے سے عتیق کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ اور اب وہ خوب باتیں کر رہا تھا۔ نصف گھنٹہ بعد کشنی محفل میں جانے کے لئے اُٹھی۔ عتیق سے ہاتھ ملایا اور کہا "مجھے اُمید ہے کہ جناب آئندہ بندی کو موقع ملاقات بخشیں گے۔ آپ سے مل کر بیحد مسرت ہوئی" ۔

عتیق نے بھی مناسب جواب دیدیا۔ کشنی کے جانے کے بعد عتیق نے اجمل سے کہا "عورت بات کرنے میں کسقدر معقول ہے" اجمل نے کہا "بہت سنجیدہ اور مہذب عورت ہے"۔ اسی گفتگو کے بعد یہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور عتیق تین گھنٹے کا تانگہ کر مکان چلا گیا ۔

رات ماہتابی ہے اور چاند کی کرنیں پھولوں کے مانند کھل رہی ہیں نصف شب سے زیادہ ہو چکی لیکن عتیق کو نیند نہیں آتی۔ کیا آج اُس کے جسم میں کسی جدید عنصر کا اضافہ ہوگیا۔ ہاں وہ مادہ جو اُس کے دماغ میں گذشتہ تین کیفیتوں سے پیدا ہوگیا تھا آج جو تھی دو بدو کی ملاقات میں پک گیا۔ چاہتا ہے کہ نیند آجائے دماغ کہتا ہے اور سوچ ۔

وقت کی روانی خدا معلوم کس درجہ سریع الحرکت ہے۔ پورا ہفتہ گذر گیا شب کو سوتے وقت کشنی کا خیال بندھ جانا یقینی امر ہوگیا ہے عشق ہمارے خیال میں دید کا نام ہے اور پھر خیال کا۔ اگر عشق سے ان اجزاء کو جدا کر دیا جائے تو کچھ نہیں ۔

---

(۵)

مغرب کی نمازیں ہو گئیں اور شب نے اپنا سیاہ دامن پھیلانا شروع کر دیا ہے - اجمل کئی دن سے عتیق کو بازار لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ اپنی عادت کے موافق انکار کر دیتا ہے۔ آج کام کی کثرت نے اُس کے دماغ کو تھکا دیا تھا اجمل کی فرمائش پر تیار ہوگیا - بازار جا کر کچھ سامانِ ضروریات خرید کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے شب کو واپسی ہوئی - دونوں باتیں کرتے چلے آرہے تھے۔ کہ اجمل یکبارگی اُس گلی میں مڑا جہاں شاہدانِ بازاری اپنی عبرتناک زندگی کے چند ایام نہایت فسق و شغب کی حالت میں گذارتی ہیں۔ عتیق جھجکتا ہے۔ مگر اجمل یہ کہہ کر راستہ سیدھا نکل جائے گا۔ بلا لیتا ہے۔ اس گلی میں گھستے ہی عتیق جلدی جلدی چلنے لگا۔ شاید اس لئے کہ اُس کو کوئی شخص یہاں نہ دیکھ لے ایک مکان کے سامنے پہنچتے ہی ایک ٹہلتے ہوئے شخص نے برابر آن کر کہا "عتیق صاحب" یہ انسانی آواز تھی یا صدائے موت - وہ ٹھٹھر گیا اور کہا "ہاں" کے ساتھ ہی وہ سمجھ گیا کہ مخاطب کرنے والا شخص کون ہے - اُس کا کوئی رشتہ دار نہیں ۔

"آئیے پان کھاتے جائیے" کشنی نے کہا ۔

کشنی کی فرمائش کا بغیر جواب دئیے ہوئے وہ اُس کے ساتھ تیزی سے اندر چلا گیا - کیونکہ دوسرا خوف طوائف سے باتیں کرتے ہوئے کسی کے دیکھ لینے کا تھا - مگر خلاف اُمید وہ اجمل کو اپنے پیچھے نہیں پاتا۔ اور صحن میں پہنچتے ہی یہ سوال کرتا ہے "اجمل میاں کہاں رہ گئے" کشنی نے کہا "آرہے ہونگے۔ تھے تو آپ کے پیچھے ہی" ۔

کشنی نے جلدی جلدی پان بنا کر پیش کیا۔ عتیق نے کہا رکھدیجئے کھالونگا ۔

کشنی - آپ گھبرا کیوں رہے ہیں شاید آپ کو یہ خطرہ ہے کہ کوئی شخص اور نہ آجاوے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور آنافاناً دروازہ کی کنڈی لگا کر واپس آگئی ۔

عتیق - مہربانی فرما کر اجمل کو بلوا دیجئے ۔

کشنی - ہاں ہاں ابھی آجائیں گے - آپ خوف کیوں کرتے ہیں؟

عتیق صاحب مجسٹریٹوں اور ججوں کی عدالتوں میں اس درجہ بدحواس نہ آئے ہونگے۔ بڑے بڑے نوابوں کی کوٹھیوں میں بھی جا کر اس درجہ مرعوبیت کے شکار نہ بنے ہونگے جیسا کہ اس مکان کے اندر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مکان کی ہر شے پر

بھر ڈالتا ہے۔ وحشت کا یہ عالم ہے۔ کہ پتے کی صدا ڈرا دیتی ہے۔ مکان کی مجموعی حالت اُس کی نظر میں سوائے ایک بھیانک نظارہ کے اور کچھ پیش نہیں کرتی۔ حالانکہ کشنی کا مکان بھی اُن ہی اینٹوں اور اسی مصالح سے بنا ہوا ہے جن سے کہ عدالتیں اور کوٹھیاں اور خود اُس کے ذاتی مکانات۔ پھر کونسی بات ہے جو نوگرفتار کو طوائف کے گھر میں اول مرتبہ آنے پر حالت تخویف میں ڈال دیتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عدالتوں میں فریادیوں کی دادرسی ہوتی ہے۔ یہاں مظلوموں پر اور ستم توڑے جاتے ہیں۔ وہاں بربادوں کو تبادلہ دلایا جاتا ہے۔ یہاں لٹے ہوئے انسانوں کو اور کھسوٹا جاتا ہے۔ کوٹھیوں میں سے عزت کے ساتھ کچھ لے کر آتے ہیں۔ یہاں کچھ دیکر بے عزتی کے ساتھ نکال دیئے جاتے ہیں +

عتیق۔ (کچھ دیر خاموشی کے بعد) مجھے ایک ضروری کام ہے۔ اب اجازت دیجئے +

کشنی۔ واہ حضرت۔ کبھی نہ کبھی تو آپ آئے ہیں۔ اور اسقدر جلدی۔ میرے نصیب کہاں اور آپ کہاں۔ (یہ کہتے ہوئے کشنی عتیق کے بالکل قریب آگئی۔ اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔)

عتیق۔ میں پھر کسی دن آؤنگا (یہ الفاظ اُس وقت نکلے جبکہ اُس کا جسم خود بخود کانپ رہا ہے +

کشنی۔ یہ صحیح ہے۔ افسوس کہ آپکو میرا ذرا خیال نہیں +

عتیق۔ خیال کیسا (گھبراتے ہوئے)

کشنی۔ آپ ابھی تک نہیں سمجھے +

عتیق۔ نہیں۔ بالکل نہیں +

کشنی۔ میں آپ سے بیحد محبت کرتی ہوں +

عتیق۔ (ہاتھ چھڑاتے ہوئے) اچھا اب جانے دیجئے +

کشنی۔ سنیئے تو سہی۔ پہلے (اب کشنی لپٹ جاتی ہے)

عتیق۔ (جلدی سے علیحدہ ہوکر) بس اب معاف کر دیجئے۔ کل آؤنگا (اُٹھ بیٹھتا ہے)

کشنی۔ آپ ابھی جا نہیں سکتے +

عتیق (دروازہ کی جانب چلتے ہوئے) میرے والد انتظار کر رہے ہونگے +

کشنی۔ (آگے بڑھ کر) اگر آپ کو جلدی ہے تو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔

یہ الفاظ تھے یا برقی رو جس نے انسانی جسم سے روح کو سلب کر لیا۔ وہ بت کی مانند نہ صرف ساکت بلکہ بے حس کھڑا رہ گیا۔ جس شخص کے اشارے پر دوسرے آدمی چلا کرتے تھے۔ آج وہی شخص ایک عورت کے حکم پر ناچ رہا ہے۔

اُس نے گھبرا کر ایک بار پوچھا "آپ چاہتی کیا ہیں"

کشنی۔ صرف یہی کہ آپ آدھ گھنٹہ اور بیٹھیں +

عتیق۔ اچھا چلیئے +

یہ کہتے ہوئے وہ پھر فرش پر آن بیٹھا +

کشنی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں اپنے دل سے مجبور ہوں جس وقت سے کہ آپ کو ٹھیکیدار صاحب کے مکان پر ناچ میں دیکھا ہے۔ آپ کی محبت میں ازخود رفتہ ہوں +

آخری جملہ کہتے کہتے کشنی عتیق کو پھر لپٹ گئی۔ اب عتیق کی پریشانی کم ہو چلی تھی۔ انسانی خواہشات کے لئے خوف و ڈر ایک دیوار کا کام کرتے ہیں۔ مگر جب یہ ہٹ جاتے۔ جذبات میں ہیجان آجاتا ہے۔ اب عتیق ازخود رفتہ تھا +

(۶)

مزدور کام پر اور طالب علم اسکول جاچکا لیکن عتیق ابھی تک نیند میں ہے خان بہادر کے مکان پر کام والے آدمی آتے ہیں اور عتیق کو دریافت کرتے ہیں بالآخر خان بہادر خود اُٹھے اور عتیق کو اُس کے کمرہ میں جاکر بیدار کیا +

"میاں کیسی طبیعت ہے۔ رات جاگے معلوم ہوتے ہو۔ کہاں گئے تھے؟" خان بہادر نے دریافت کیا +

"جی ہاں اجمل میاں کے یہاں بیٹھ گیا تھا" عتیق نے کہا۔ یہ سنکر خان بہادر چلے گئے +

اے دنیا! کیا تیرا خمیر فریب و دغا کے ساتھ گوندھا گیا ہے۔ ہم کتنے ہی چالاک بنتے ہیں اور کسی کی بات کا یقین نہیں کرتے۔ مگر بیٹے کے سامنے نہایت بیوقوف اور اُس کی ہر بات کو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی جانب سے نیک گمان رکھتا ہے۔ اے تلوار سے زیادہ خونخوار لفظ "دوستی" بتلا اور اسکا سبب بیان کر کہ باپوں کو تیرا نام سنتے ہی اپنا قلب کیوں بدگمانی سے صاف کر لینا پڑتا ہے۔ آہ! ایک باپ بیٹے کی زبان سے یہ الفاظ سنکر "میں اپنے دوست کے پاس بیٹھا تھا" بیٹے کے جرائم سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ وہ تیری جانب سے حسن ظن رکھتا ہے۔ اور تو اپنی آڑ میں اُسی کے بیٹے کو عظیم گناہوں کا مرتکب ٹھہراتی ہے +

عتیق اُٹھ بیٹھا۔ مگر کس حالت سے۔ دل میں خوشی ہے نہ رنج۔ چہرہ بشاش

ہے۔ نہ پژمردہ۔ دن پہلے بھی نکلا کرتے تھے اور نکلیں گے۔ لیکن آج کا دن اُس کی زندگی میں ایک نیا رنگ کھلا کر چمکا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اب کچھ نہیں۔ کبھی وہ اجمل کی طرف سے بدگمان ہوتا ہے۔ کہ یہ اسی کی سازش کا نتیجہ ہے۔ وہ مجھے کشنی سے پھنسانا چاہتا ہے۔ متعدد خیالات کے بعد دماغ سے جو تصفیہ کیا وہ یہ تھا کہ اب کبھی بازار ہی نہیں جانا چاہئے ✦

دوسری شب معمول کے موافق اجمل آیا۔ عتیق سے گفتگو ہوتی رہی۔ ایک دفعہ عتیق نے چاہا کہ گذشتہ شب کی معرکہ آرائی کے متعلق کچھ کہے۔ مگر یہ سوچ کر ممکن ہے اجمل کو یہ واقعہ نہ معلوم ہو تو کیوں خواہ مخواہ راز افشانی کی جائے۔ خاموش ہو رہا ✦

ہر شخص اپنے دماغ کی تراشیدہ بات کو صحیح سمجھا کرتا ہے مگر کبھی یہ نہیں سوچتا کہ اُس کے دشمن کے پاس بھی تو اُس قدرت کا دیا ہوا دماغ ہے۔ عتیق بازار نہ جانے کے ارادہ پر مضبوطی سے قایم ہے ✦

چار دن بعد ایک شخص آیا اور عتیق صاحب کو دریافت کرکے ان کے ہاتھ میں خط دیا اور سلام کرکے رخصت ہوگیا۔ عتیق نے لفافہ کھولا تو کیا پڑھا:-

"وعدہ خلافی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دوسری شب ہی نہیں آج تک ادھر تو نہ جھانکا۔ اگر آج نہ آئے تو آپ کی جیبی گھڑی آپ کے والد صاحب کے پاس بھیجدی جائے گی۔ ک"

عتیق نے خط پڑھ لیا۔ مگر ہوا کیا۔ دماغی سکون پھر غایب ہوگیا۔ متواتر خیالات کے دوران نے اس کو سوچنے کا عادی ضرور کردیا تھا۔ وہ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ — کیا کروں — اجمل سے کہوں — غضب ہو جائے گا۔ گھڑی ہے بھی انہیں کی — ہوں۔ میں خود۔ اس کے بعد وہ سوگیا ✦

رات کے نو بجے عتیق تنہا بازار کی سڑک پر غیر معمولی لباس پہنے جا رہا ہے عجیب بات ہے کیا آپ کا خیال ہے کہ محض گھڑی کا خوف اُس کو بازار لئے جا رہا ہے کیا آج سے چار روز قبل گھڑی اگر کشنی کے پاس پہنچ جاتی اور وہ اس کا خوف دلا کر بلاتی۔ عتیق چلا جاتا؟ یہ کیا بات ہے کہ ایک انسان اگر پہلی شب دو فاقوں کی مجبوری سے چوری کرنے میں ہزاروں کا مال لے آتا ہے تو دوسری شب کونسی قوت اُس کو چوری کی جانب رغبت دلاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی شب وہ مجبوری سے گیا تھا دوسری شب اُس کو ہمت اور جرأت لے گئی۔ پہلی شب عتیق کے واسطے مجاز تھی دوسری رات حقیقت ✦

کشنی کے دروازہ پر پہنچکر وہ جھجکا۔ مگر ہمت نے ساتھ دیا۔ اُس کی اُمید کے موافق مکان خالی تھا۔ آج مکان کی کوئی چیز اُس کو خوف نہیں دلاتی کشنی دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ اور اپنے مہمان کا ان الفاظ میں خیر مقدم کیا:-

کشنی۔ آہا۔ آیئے ✦

عتیق۔ وعدہ خلافی کی معافی چاہتا ہوں ✦

کشنی۔ ارے آپ کیا فرماتے ہیں۔ کیا گھڑی والے معاملہ کو سچا سمجھے ✦

عتیق۔ نہیں نہیں میں خود آیا ہوں ✦

اس گفتگو کے بعد کشنی اُٹھی اور دروازہ بند کرآئی ✦

کشنی۔ ممکن ہے۔ گذشتہ شب میری کوئی بات ناپسند آئی ہو معافی مانگتی ہوں مگر محبت میں انسان اندھا ہوتا ہے ✦

عتیق آپ کیا باتیں کرتی ہیں۔ مجھے کسی بات کا ملال نہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا ✦

کشنی۔ میرے پیارے شاید تم محبت کی لذت سے ابھی تک ناواقف ہو۔ کیا تم بھی مجھ سے محبت رکھتے ہو ✦

یہ کہا اور کشنی نے عتیق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومنے لگی عتیق نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ پر آنسو ٹپک رہے ہیں ✦

عتیق۔ آپ روتی کیوں ہیں۔ میں آیا کرونگا ✦

کشنی۔ مجھے اب فراموش تو نہیں کروگے ✦

عتیق۔ نہیں ✦

کشنی کے رونے کا عتیق پر کچھ اثر ہوا اور اُس نے یہ وعدہ کرلیا کہ وہ اپنی زبان پر قایم رہے گا۔ آج دو گھنٹہ کی صحبت کے بعد وہ مکان چلا گیا۔ اور تمام شب آرام کی نیند سویا ✦

(۷)

اب عتیق روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن کشنی کے ہاں جانے لگا۔ اور اجمل میاں کو بھی اپنا رازدار بنالیا۔ اجمل میاں کی اُمیدیں بر آئیں۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ ایک ناکتخدا انسان طوائفوں اور عیاشوں کے چنگل میں جلدی اور بری طرح پھنستا ہے وجہ یہ ہے کہ اُس کو شادی شدہ زندگی سے تعلقات بے خبری ہوتی ہے وہ اُس فرق سے واقف نہیں ہوتا جو ان دونوں کیفیتوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ جائز زوجیت میں کیا لذت ہے۔ جب ایک نوجوان نے ابھی تک اپنی بیوی کو نہیں دیکھا ہے تو وہ طوائف ہی کو اپنی محبوبہ سمجھتا ہے۔ ایک الدار بیٹا ہوتے ہوئے۔ اگر ایک نیک بیوی کے اخراجات کا اندازہ ہی نہ کرسکا ہو۔ تو وہ طوائف کی قیمتی فرمائشوں کو صحیح سمجھتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ باپ نے کون کون سے گنا خرید کے جائداد پیدا کی ہے

آہ! اے غیر شادی شدہ شخص تجھے یہ معلوم ہوجاتا کہ طوائف کے گھونگر والے بالوں میں مصالحہ کا بنا ہوا تیل وہ پاک خوشبو نہیں دیتا۔ جو ایک باعصمت بیوی کے سر میں سرسوں کا خالص تیل۔ اس کا چھوٹا ریشمین تہبند اس بدبو کو چھپانے سے عاجز ہے جو اس کے جسم میں لاتعداد مردوں سے مل کر پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا گھٹنوں سے نیچا ململ کا سادہ کرتا اس لئے ہے کہ وہ پاکیزہ زینت کی بو سے بس کر تجھے وہ لطافت دکھلا دے جو کسی اور عورت میں نہیں مل سکتی۔ اس کی آنکھیں زمانہ کو تکتی ہیں اور وہ تیری منتظر ہے۔ اس کے دماغ کا مرکز سینکڑوں مالدار شخص ہیں۔ اُس کے دماغ کا مرکز صرف ایک تو ہے۔ یہ اپنی تکلیف پہ روتی ہے۔ اور وہ تیری تکلیف پر۔ اس کے کانوں میں روپیہ کی جھنکار سے آہٹ ہوتی ہے۔ اس کے کانوں میں تیرے قدموں کی آواز سے رس پڑتا ہے۔ اس کے مہندی سے رنگے ہوئے ہاتھ اس لئے ہیں کہ مصیبت کے وقت تجھے اور زخمی کر کے بالا خانہ سے نیچے دھکیل دیں۔ اُس کی آٹا گوندھنے والی انگلیاں اس لئے ہیں کہ آڑے وقت میں تیری مرہم پٹی کر دیں۔ یہ اپنی نیند سوتی ہے اور وہ تیری نیند۔ یہ زر کی بندی ہے اور وہ تیری بندی ؛

رفتہ رفتہ ناغہ کی عادت بھی جاتی رہی اور عتیق مستقل طور سے گلشنی کے گھر حاضری دینے لگا۔ اب اُس کو کسی کا فریب۔ خوف اور جبر نہیں لاتا ہے۔ بلکہ اُس کی دلچسپی۔ پہلی مرتبہ دوست کی سوسائٹی فریب دے کر لے آئی تھی۔ دوسرم باپ کی گھڑکی کا خوف اور ہمت۔ لیکن اس کے بعد دلی رغبت۔ اب وہ ایک زبردست عیاشش ہے ؛

(۸)

عتیق نے اس عرصہ میں ہزارہا نقد روپیہ عیاشی کی نذر کر دیا۔ گلشنی کا مکان معمولی مکان نہیں ہے۔ بلکہ ایک بڑے رئیس کی کوٹھی۔ قیمتی فرنیچر اور برتنوں کے سیٹ کے سیٹ موجود ہیں۔ ملازموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہے۔ سونے اور ہر قسم کے زیورات سے کئی صندوقچے پُر ہیں۔ کونسا ممکن سامان عیش ہے جو یہاں مہیا نہ کیا گیا ہو؟

عتیق کی ذاتی زندگی پر گلشنی کا صحبت کا کیا اثر پڑا۔ وہ شراب و کوکین کا شوقین ہوگیا۔ اب گھر کے ضروری کام اُس کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتے۔ بیکار پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔ ماں باپ کو تشویش یہ ہے کہ عتیق کو ہوا کیا۔ رفتہ رفتہ خان بہادر کو پتہ چل گیا کہ صاحبزادے عشق کے پُتلے بنے ہوئے ہیں۔ اور گھر کی نقدی کے زیادہ حصہ سے گلشنی طوائف لطف اُڑا رہی ہے ؛

شریف باپ نے عتیق کو بہت سمجھایا۔ جو کچھ تم کو کرنا تھا کر چکے۔ اب باز آ جاؤ اپنی طبیعت کے موافق جہاں کہیں تم چاہو کسی شریف خاندان میں شادی کر لو۔ مگر جو شخص لذت شادی سے واقف نہ ہو۔ اُس پر ان باتوں کا کیا اثر۔ خان بہادر کی متواتر نصائح نے اس پر خلاف اثر کیا۔ اور ان باتوں نے اُس کو ایک نڈر عیاش کی صورت دیدی ؛

بالآخر وہ دن آگیا جس کا ہر شخص منتظر تھا۔ تالی کنجیاں خان بہادر نے عتیق سے چھین لیں اور اپنے بھتیجے جبار کو بلا کر گھر کا کل کام حوالہ کر دیا۔ اب عتیق میاں ایک نہنگ رہ گئے۔ پہلے جو کچھ ہاتھ لگ جاتا تھا وہ بند ہوگیا۔ اخراجات کثیر اور روپیہ کی کمی کے سوال نے سخت پریشان کیا۔ عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ جب کہیں موقع نہ لگا۔ ایک دن چار ہزار روپیہ کی رقم جو واسطے مالگذاری کے واسطے گھر میں رکھی تھی قفل توڑ کر چُرا لے بھاگے۔ اس حرکت پر خان بہادر نہایت متنفر ہوگئے۔ اور حکم دلا بھیجا کہ اگر آئندہ گھر میں گھسے تو نہایت ذلت کے ساتھ پکڑ کر نکلوا دیئے جاؤ گے۔ جہاں چاہو جاؤ یار ہو اِدھر آنے کی ضرورت نہیں ؛

(۹)

بڑے شہروں کی سیریں۔ ہوٹلوں کی رہائش۔ موٹروں کی سواری شراب کے جلسوں نے پانچ ماہ کے اندر اندر یہ کثیر رقم بھی ٹھکانے لگا دی۔ اب وہ وقت آگیا جس کے لئے تیز عیاش نہایت بیتابی کے ساتھ منتظر رہتے ہیں۔ یعنی اُدھار خرید۔ مہینہ کے اختتام پر دوکانداروں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ اور قرض خواہوں کے تقاضے شروع ہوگئے۔ شروع شروع میں دوکاندار جھوٹے وعدوں کو بھی سچا سمجھ لیتے ہیں۔ مگر یہ کب تک۔ ایک دن لالہ ہر دواری لال پارچہ فروش کا منیم جو تقاضہ کرنے آیا میاں جی نے نشہ میں مار پچھاڑا۔ منیم لالہ جی کے سامنے بہت رویا۔ لالہ جی نے سنت دیرینہ پر عمل کرتے ہوئے نالش ٹھونک دی۔ یہاں کسے پروا۔ ڈھائی سو کی ڈگری بھی ہوگئی ؛

ظہر کا وقت ہے عتیق صاحب گلشنی کے کمرہ میں بیٹھے ہارمونیم کا شغل کر رہے ہیں۔ یکبارگی چند آدمیوں کے آنے کی آہٹ ہوئی ؛

عتیق ۔ کون ؛

نووارد اشخاص ۔ عتیق آپ ہی کا نام ہے ؛

عتیق ۔ کہئے ؛

نووارد اشخاص ۔ یہ آپ کا وارنٹ گرفتاری ہے ؛

عتیق ۔ ہیں . . . . .

یہ لفظ بے ساختہ زبان سے نکلا اور عتیق صاحب بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ ان کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ ان کی مشکیں سپاہیوں نے کب کس لیں۔ جب سپاہیوں نے اپنے سہارے سے اُٹھایا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے جسم میں دل نہیں ہے۔ سپاہیوں نے

شریف صورت دیکھتے ہوئے کہا۔ اگر تم روپیہ کی ادائگی کا انتظام کرو تو ہم اس مکان سے باہر نہیں لے جائیں گے +

ایسے وقت میں انسان کی نظر کہاں جاتی ہے۔ ماں باپ پر۔ مگر ماں باپ سے تو آپ ناراض ہو گئے ہیں۔ پھر دوستوں پر۔ ہاں دوست موجود ہیں اور محض دوست ہی نہیں بلکہ جاں نثار شیدائی کشنی جس نے ہزاروں روپیہ اُس سے لے کر جمع کر لیا ہے اور جس کی خاطر وہ آج یہ دن دیکھ رہا ہے کشنی کا خیال آتے ہی اُس نے کہا +

عتیق۔ ان لوگوں کو ڈھائی سو روپیہ دیدو +

کشنی۔ میرے پاس کہاں ہے +

عتیق۔ تمہارے پاس بالکل نہیں اور ہزاروں روپے کہاں گئے +

کشنی۔ کیا تم کو خبر نہیں +

عتیق۔ تو کیا میں جیل خانہ چلا جاؤں +

کشنی۔ میں کیا کر سکتی ہوں +

عتیق۔ (غصہ سے) میں نے جو سونے کا زیور گھر سے لا کر دیا تھا۔ اس کو ادھر لاؤ +

کشنی۔ (سپاہیوں سے) آپ لوگ میرے مکان سے باہر جا کر جھگڑا کیجئے۔ (سپاہی باہر کو لیجانا چاہتے ہیں)

عتیق۔ میں تجھ سے اُدھار مانگتا ہوں +

کشنی۔ رنڈی اُدھار کا حساب نہیں رکھتی ہے —— ہا ہا ہا

عتیق۔ (آبدیدہ ہو کر) میں تجھ سے بھیک مانگتا ہوں +

کشنی۔ بھیک ستم زدہ غریبوں کو دی جاتی ہے۔ خان بہادروں کے بیٹوں کو نہیں +

عتیق۔ حرامزادی تو مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا کرتی تھی۔ میرے ہزاروں روپے بنک میں اپنے نام سے جمع کر لئے +

کشنی۔ مجھے تجھ سے نہیں بلکہ تیرے روپے سے محبت تھی۔ بنک میں جمع شدہ روپیہ اس لئے ہے کہ بڑھاپے کی عمر میں جب تم جیسے بیوقوف نہیں پھنسینگے۔ میری آخری زندگی کے ایام آسانی سے کٹ جائیں +

اب کشنی کا درجہ حرارت بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اُس نے سپاہیوں کو اپنے مکان سے نکل جانے کا حکم دیدیا +

———٭———

(۱۰)

عتیق کی گرفتاری معمولی گرفتاری نہیں تھی۔ یہ خبر شام تک ہر شخص کے کان میں پہنچ گئی۔ پبلک بڑی دلچسپی سے اُس کی عیاشانہ زندگی کے چرچے کر رہی ہے۔ ہر شخص کی زبان اُس کے کارنامے دہراتی ہے +

انسانی دلچسپیوں کا بھی عجیب عالم ہے۔ ہم ایک تماش بین کے قصّے دہرانے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ مگر کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اس دلچسپی کی بنیاد کیا ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ دلچسپ قصّہ کتنے خطرناک واقعوں کا مجموعہ ہے۔ جب ایک انسان ریل سے کٹ جاتا ہے تو ہم جلدی سے آدمیوں کو ہٹا کر سب سے پہلے اُس کی شکستہ لاش کو دیکھنے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں لیکن کبھی ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی ہوگی کہ ہماری دلچسپی کا سامان اس وقت مہیا ہوا جبکہ ایک شخص کے کٹ جانے سے اُس کی بیوی بیوہ ہو گئی۔ اُس کے بچے یتیم ہو گئے۔ اور ایک ماں کی گود خالی ہو گئی +

گرفتاری کے دوسرے دن شام کو عتیق کے والد نے زرڈگری ادا کر دیا۔ عتیق حوالات سے نکل کر اپنے آپ کو دائرہ انسانیت سے باہر سمجھنے لگا۔ گرفتاری کے وقت سے اب تک اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تین فاقوں کا مارا ہوا ہے۔ مگر بھوک محسوس نہیں کرتا۔ اُس کا دماغ ماں باپ کے گھر کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔ کیا باپ اور دیگر عزیزوں کی سختیوں نے اُس کی اصلاح کر دی۔ نہیں۔ بلکہ ان کی سختیوں نے اُس کے دماغ میں سینکڑوں قیسوں کا جنون اور دل میں ہزاروں فرہادوں کا جوش اور بھر دیا تھا۔ حوالات سے نکل کر وہ سیدھا کشنی کے گھر آتا ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ کشنی کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں خون آلودہ ہو جاتی ہیں اور کہتا ہے:-

عتیق۔ کیوں حرامزادی میری محبت کا یہی صلہ تھا میرا سامان......

کشنی۔ حرامزادہ تو اور تیرا باپ (نوکروں اور اجل کی طرف دیکھتے ہوئے) اس بدمعاش کو میرے مکان سے باہر نکال دو +

کشنی کی زبان سے گالیاں سنکر عتیق کو قوت برداشت نہ رہی۔ اُس نے جھپٹ کا کشنی کا گلا پکڑ لیا۔ مگر اجل اور دیگر ملازمین نے اُس کو زبردستی ایک طرف ڈھکیل دیا۔ وہ پتھر پہ گرا اور اُس کا سر پانی کے نل سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا آناً فاناً میں اُس کو مکان سے باہر نکال کر کشنی نے دروازہ بند کر دیا۔ وہی دروازہ ہے جو اُس کی آہٹ قدم پہ کھلتا تھا +

بارش کی تیزی۔ سر سے خون کا بہنا اور تین فاقوں کی کمزوری نے اُس کو

اجتماعی طور پر بدحواس بنا دیا۔ پریشانی کی حالت میں جدھر منہ اُٹھا چل دیا۔ ایک دوکان نے بارش سے پناہ دی۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ دوکان سے پھر اُٹھا۔ اور ایک گلی کی طرف چل دیا۔ مگر جسم جواب دے چکا تھا۔ بالآخر ٹھوکر کھا کر گرا اور بیہوش ہو گیا ❖

(۱۱)

بھوک کی شدّت نے جب ڈیڑھ گھنٹہ بعد اُس کی آنکھ کھولی۔ تو اُس نے اپنے آپ کو ایک کمرہ میں پایا۔ اُس کی کمر نے آج دو دن بعد اپنے نیچے نرم بستر محسوس کیا۔ اُس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ ایک نہایت حسین لڑکی نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا:۔

"جناب اب اغلباً تکلیف کم معلوم ہوتی ہے۔ لیجئے یہ دودھ حاضر ہے"

اُس نے فوراً دودھ غٹ غٹ پی لیا۔ وہ سخت حیرت میں تھا کہ اس کے سر پر کس نے پٹی باندھ دی۔ کمرہ میں عورت کی حاضری اُس کے دماغ میں صدہا خیالات پیدا کر رہی ہے۔ ذرا دیر بعد اُس کی مہربان تیماردار نے کہا "آپ گھبرایئے نہیں۔ آرام کیجئے۔ میں نماز پڑھ کر ابھی آتی ہوں" اور چلی گئی ❖

متواتر مصائب کی سختیوں نے اُس کے دماغ کو بالکل پراگندہ کر دیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے آرام و سکون اور غذا ملنے سے اب وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اور خیال کرنے لگا..... ہو نہ ہو یہ کوئی مالدار فاحشہ ہے..... یہ مجھے پھانسنے کے لئے میری خاطر کر رہی ہے۔ ممکن ہے مجھ پر عاشق ہو گئی ہو۔ ورنہ عورت کو کیا ضرورت کہ مرد کی خاطر کرے۔ دماغ کے اس زبردست فیصلہ نے دل کو بھی یقین دلا دیا ❖

اتنے میں عورت پھر واپس آ گئی اور مسہری کے برابر والی کرسی پر بیٹھ کر اُس کے پیر دبانے شروع کر دیئے۔ اس نے اپنی پلکوں کو حرکت دی اور غور سے عورت کی جانب دیکھنے لگا ❖

عورت ۔ میرے خیال میں اب تکلیف بہت کم ہے ❖

عتیق ۔ ہاں۔

پیروں کے دبانے سے رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا اور ہلکی آواز سے کہا پیر ذرا اوپر تک دبایئے۔ فرمانبردار عورت اپنے ہاتھوں کو اُس کی کمر تک لانے لگی۔ یکبارگی عتیق کے ہاتھوں نے اُس کے ہاتھ کو پکڑ کر وحشیانہ انداز میں مسہری پر کھینچنے کی کوشش کی ❖

عورت ۔ جناب کیا بات ہے۔ آپکی تکلیف میں اضافہ نہ ہو جائے ❖

عتیق ۔ اس کی فکر نہ کیجئے۔ میرے پاس آ جایئے ❖

عورت مسہری پر آن بیٹھتی ہے۔ اور چہرہ پر مسکراہٹ کے آثار ہویدا ہیں:

عتیق ۔ میں تم پر عاشق ہو گیا ہوں ——

عورت ۔ (مسکرا کر) میں آپ کی خادمہ ہوں ❖

عتیق ۔ بس تو میرے پاس لیٹ جاؤ ❖

عورت ۔ آپ آرام کیجئے۔ میرے سونے سے آپکو تکلیف ہو گی ❖

عتیق (اُٹھ کر غصہ سے) نہیں تم کو میرے پاس لیٹنا ہو گا ❖

عورت ۔ اچھا میں ابھی آتی ہوں۔ (کھڑے ہوتے ہوئے)

عتیق ۔ نہیں تم یہاں سے نہیں ہٹ سکتیں ❖

بازوؤں سے پکڑ کر عورت کو گرانا چاہتا ہے۔ مگر عورت بجائے پلنگ کے زمین پر گری اور اُس کے بائیں ہاتھ کی چار اُنگلیاں برابر رکھی ہوئی انگیٹھی کے تیز کنارے سے کٹ کر لہولہان ہو گئیں۔ گرنے کی آواز پر ایک ضعیف العمر سفید ریش شخص تسبیح پڑھتے ہوئے مستقل مزاجی کے ساتھ اندر آتا ہے ❖

بوڑھا ۔ بیٹی ذکیہ کیا بات ہے ❖

عورت ۔ (ندامت کے ساتھ) معزز مہمان زیادہ بھوکا ہے۔ جلدی سے سیب تراشنے میں چاقو نے اُنگلیاں کاٹ دیں ❖

بوڑھا ۔ خون کو صاف کر کے سیب جلدی دو۔ مہمان بھوک کی تکلیف زیادہ نہیں اُٹھا سکتا ❖

یہ کہتے ہوئے بوڑھا واپس چلا گیا ❖

عتیق نے نظر بھر کر بوڑھے شخص کو دیکھا اور پہچان لیا۔ اُس کے جسم پر پسینہ نمودار ہوا اور لرزہ براندام ہو گیا۔ دوسرے لمحہ میں آنکھیں ذکیہ کے قدموں پر ہے۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں:۔

"مجھے معلوم نہ تھا آپ مولانا محدّث صلاح الدین کی بیٹی ہیں"

مولانا صلاح الدین شہر کے مشہور محدّث اور فقیر کامل کا درجہ رکھتے تھے۔ عتیق نے مولانا کو بہت دفعہ مسجد جامع میں نماز پڑھاتے دیکھا تھا ❖

(۱۲)

عتیق نے کشنی کی صحبت سے جو نظریہ تیار کیا تھا۔ وہ آج غلط ثابت ہو گیا۔ ابتک وہ عورت کو خود غرض عصمت فروش اور ظالم سمجھتا تھا۔ مگر آج یہ یقین ہو گیا کہ شریف عورت مہمان نوازی۔ پاکبازی اور رحم کا مجسمہ ہوتی ہے۔ عتیق کو والدین کی سختی، جیل کی مصیبت اور کشنی کی بے شرمیوں نے کبھی عیاشانہ زندگی سے نفرت نہ دلائی

بالآخر ذکیہ سے عتیق کی شادی ہو گئی۔ خان بہادر بیٹے کو [illegible]

"کہاں کی راہ نکلی ہے کہاں سے!!"

از جناب عبدالشکور صاحب ایم اے علیگ - لکچرر شاستری کالج - ڈربن

میں یہ جانتا ہوں کہ

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں" (غالب)

میں اس کا قائل ہوں کہ

"ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود" (غالب)

میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ

"جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
ملگجے پھول ترے بستر کے" (اثر)

میں اس پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ

"لیگ آف نیشنس بیسویں صدی کا سب سے زیادہ مہتم بالشان ڈھکوسلہ ہے"

لیکن ان عقائد اور اجزائے ایمان کے باوجود وہی مرغے کی ایک ٹانگ

"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"

دن کا جسقدر حصہ کالج میں بسر ہوتا ہے۔ وہ تو خیر جوں توں کرکے ختم ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن فرصت کے اوقات میں اپنی کم مائگی، اور اللہ صاحب کی کارسازی دونوں پر یکساں نظر رہتی ہے۔ سہ پہر کو تین بجے نہایت خستگی کی حالت میں کالج سے فارغ ہو کر فلیٹ پر پہنچے، اور مایوسانہ نگاہوں سے کمرے کی در و دیوار کو دیکھنے لگے، بستر صاف ستھرا، نہایت مرتب، میز پر کتابیں قرینہ سے لگی ہوئیں۔ ایک طرف ٹرنک اور سوٹ کیس ترتیب سے رکھے ہوئے، مگر ہر شے سرد، مردہ بے حس۔ کیونکہ ان اشیا میں جس قدر ترتیب بڑھتی جاتی ہے۔ اسیقدر ان میں بے حسی کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس ترتیب میں کبھی نہ کبھی تو ہیجان پیدا ہو۔ کبھی نہ کبھی تو ان میں حیات کے آثار پائے جائیں۔ مگر موجودہ صورت میں اس ہیجان کی توقع فضول ہے۔ دستِ سیمیں، انگشت حنائی دونوں گو ذہن میں پیوست ہیں۔ لیکن حقیقت سے دور۔ پانچ ہزار میل دور...... منہ ہاتھ دھو کر چار بجے کے قریب سہ پہر کی چاء سے دوچار ہونا پڑا۔ پابندی رسم کے خیال سے چاء زہر مار کی، ڈربن کا باورچی سب کچھ جانتا ہے۔ لیکن چاء پکانا نہیں جانتا۔ کسی ہوٹل۔ کسی کیفے میں چلے جایئے۔ چائے کا آرڈر کیجئے۔ گنگنا شربت فوراً آپ کے کام و دہن کو سیراب کرنے لگیگا۔ گنگنا بھی کیسا؟ جیسے محرم کا شربت دھوپ میں رکھے رکھے سبیل پر گنگنا ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ ہندوستان کی فضا نے لپٹن کی چاء کا خوگر کر دیا تھا۔ یہاں دوسرے مارکہ کی چائیں رواج پذیر ہیں۔ اس لئے ابتک چاء پیتے وقت اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم چاء پی رہے ہیں۔ بہر حال چاء کے مسئلہ نے یہاں نہایت اندوہناک صورت اختیار کر لی ہے۔ مارے ہار کر اپنے خود اپنے مکان پر گرم چاء کا انتظام کر بھی لیا۔ لیکن پھر آپ کو ہر دم کے ساتھ یہ دعا مانگنا پڑے گی۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ آپ کسی اپنے دوست کے پاس گئے تو یقیناً وہ سروقد کھڑا ہو جائے گا۔ اور نہایت مخلصانہ انداز سے آپ کا خیر مقدم کریگا۔ مگر "مزاج شریف" کا جواب دینے سے قبل پھر آپ کے کام و دہن کو گنگنے شربت سے ملوث ہونا پڑیگا۔ پھر لطف یہ ہے کہ آپ بیک وقت پانچ جگہ گئے۔ تو پانچوں ہی جگہ آپ کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جائے گا۔ ناممکن ہے کہ آپ کا عذر قبول ہو جائے +

میرا ذاتی خیال ہے کہ چاء تیار کرنا ایک مستقل اور نہایت اہم آرٹ ہے۔ جس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے مشق کی اسیقدر ضرورت ہے۔ جسقدر غور و فکر کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس آرٹ کے مختلف ممالک میں مختلف نصب العین اور پیمانے ہوں۔ لیکن جنوبی افریقہ کا نصب العین کچھ انوکھا معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا خوگر ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ بہر حال چاء کا ذکر اس سلسلہ میں آگیا تھا کہ یہ شغل فرصت کے اوقات میں خوب ہوتا ہے۔ لیکن عقلا

ہم مانتے چلے آتے ہیں کہ خود اپنی ہی ذات کے لئے تنہائی میں چار پکانا اور خود ہی خرخرغوں پی لینا انتہائی بدمذاقی ہے۔ جیسے آپ شراب کا آدھا لے آئے اور پی کر "موت کی نیند" سو گئے۔ اور صبح اُٹھکر اس بات پر ناز کرنے لگے کہ ہم بھی شرابی ہیں

⸻

شبِ ہجر کی طوالت کو ہندوستان کے شعرا "یار کی زلف" "شیطان کی آنت" اور "روزِ قیامت" سے تشبیہ دیتے ہیں، مگر میرا اب یہ خیال ہوچلا ہے کہ "یار کی زلف" کو چھوڑکر "شبِ ہجر" "شیطان کی آنت" اور "روزِ قیامت" دونوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسی لئے تنہائی کے اوقات کو گزارنے کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے جاتے ہیں۔ مثلاً پان کھانا، سگرٹ پینا۔ سگرٹ کے دھوئیں کے حلقے بنانا۔ سگرٹ کو پھینک کر اور آرام کرسی پر لیٹ کر سگار سلگانا۔ کتابیں پڑھنا۔ اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرنا۔ مگر جب دردِ فراق کی ٹیس زیادہ ہوتی ہے تو یہ ساری تجویزیں نقش برآب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً آپ بالکنی میں کتابیں، اخبارات، سگرٹ، سگار، ایش ٹرے، پاندان سب رکھ کر بیٹھے اور شب کے نو بجے آپ نے یک وقت سب تجاویز پر انتقام کے طور پر عمل پیرا ہونا شروع کیا۔ ساڑھے دس بجے تک سگرٹ۔ پان۔ چائے سگار سب ختم ہو جائیں گے، اور پھر مایوس ہوکر آپ یہی بڑبڑانا شروع کریں گے۔

"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"

میں فرصت کے اوقات میں نہایت غور و خوض کے ساتھ کتابیں پڑھتا ہوں، نوٹس لیتا جاتا ہوں۔ کلاس لکچرس اور پبلک تقریریں بڑے اہتمام سے تیار کرتا ہوں۔ دوستوں سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملتا ہوں۔ لیکن پھر بھی ایسی گھڑیاں آجاتی ہیں جب میں اپنے آپ کو نہایت شدت کے ساتھ تنہا اور بے کیف پاتا ہوں۔ اُس وقت بالکنی پر بیٹھ کر دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہوں۔ اور سوچنے لگتا ہوں

ہوم رول کے زمانہ میں ہندوستان میں خوب دلچسپی رہے گی۔ مسلمان اگر خوابِ گراں سے اب نہیں اُٹھنا چاہتے تو نہ اُٹھیں۔ ان حالات میں تو بیدار ہی ہونا پڑیگا۔ . . . . مگر یار! مسلمانوں کا خوابِ گراں بھی کیسا حسرت ناک ہے۔ ان کی کیا کیا ذلتیں نہیں ہو رہی ہیں آخر اس سے زیادہ تباہی اور کیا ہوگی؟ . . . . کیا اس کا انتظار ہے کہ مسیح موعود آئیں اور مُردے مار مار کر اُٹھائیں؟ تعلیمی۔ معاشرتی۔ اور سیاسی اقتدار جاچکا۔ مذہب جبّہ و دستار کی نذر ہوا۔ مگر اب بھی اپنی حالت میں مگن ہیں ؛

پھر جمائی لے کر غور کرتا ہوں۔

برادرانِ وطن کی سطوت اور جاہ و جلال کو دیکھو۔ کیسی بلند پروازی کی جانب مائل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں؟ ہر قسم کی ترقی ان کے قدموں سے لگی ہوئی ہے۔ . . . اور کیوں نہ لگی ہو؟ ان کے اخلاق اچھے۔ اُن کی عادتیں پاکیزہ۔ ان کے دماغ روشن۔ اُن کے بازوؤں میں قوت۔ ان کے ایثار کی مثالیں بے نظیر، ان کی کوششیں لاتناہی . . . .

اسی اثنا میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز ہوتی ہے۔ اور ایک ٹریم کار مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتی ہے۔ ٹریم کار میں اکثر فرنگی نژاد مسافر ہوتے ہیں۔ اُن کی چستی اور مصروفیت، اُن کی تندرستی اور بشاشی میرے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ ان کی صورتوں کو دیکھ کر انگلستان کی زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ کاظمی صاحب کے خطوط یاد آتے ہیں۔ خیال کرنے لگتا ہوں کہ کاظمی صاحب ابتک تو ہندوستان پہنچ گئے ہونگے۔ خداوند کریم ان کو خوش رکھے۔ وہ کچھ قوم کا ہاتھ بٹا سکیں۔ آمین ؛

اس کے بعد ہندوستان کی ڈاک کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ آنے والے خطوط کے مضامین کو   کرتا ہوں۔ روانہ کئے ہوئے خطوط کے اثرات پر دل ہی دل میں تبصرہ کرتا ہوں۔ اور کبھی کبھار دبی زبان سے یہ بھی کہتا جاتا ہوں

"گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے"



سہ پہر کو تین بجے سے شام کے چھ بجے تک کا وقت نہایت صبر آزما اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اوّل تو مغرب سے گھنٹہ سوا گھنٹہ قبل ویسے ہی روح پر غیر معمولی پژمردگی ہوتی ہے۔ پھر صحبت ناجنس۔ کالج کی لغو اور بے معنی سیاست جس کو میں نے ہمیشہ استحقار کی نظر سے دیکھا۔ مزید برآں ٹریم کی گھڑگھڑ۔ مکان کی تاریکی۔ وطن سے دوری۔ آسمان کی کجروی۔ زمانہ کی ناہمواری۔ غرضکہ ہر وہ جذبہ جس کا تعلق مایوسی سے ہے اُس وقت دل پر مسلط ہوتا ہے۔ چنانچہ سوچتا ہوں کہ لاؤ کہیں چلدیں۔ کہیں سیر سپاٹا کر آئیں۔ لیکن جائیں تو کہاں جائیں بازار؟ لاحول ولاقوۃ۔ آدمی بازار جائے تو "شوپنگ" کے لئے۔ گرڈ برن بازار شام کے پانچ بجے تک سب بند ہو جاتے ہیں۔ اس لئے بازار کے خیال

کو نظر انداز کیجئے۔ بعض اصحاب کا یہ دستور ہوتا ہے کہ شام کو بازار میں ٹہلنے نکلتے ہیں دس پندرہ منٹ ایک دوکاندار کے یہاں۔ دس بیس منٹ دوسرے کے ہاں۔ اسی طریقہ سے گھنٹہ دو گھنٹہ ختم کرکے مکان کو واپس آگئے۔ اور اگر ایک آدھ شے سستے داموں کی نگاہ چڑھی تو خرید تے بھی لائے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس لئے خریدی گئی کہ اُن کے خیال میں ارزاں ملی۔ زیادہ شوقین مزاج ہوئے تو تھوڑا سا عطر۔ بچّوں کے لئے نقلی مٹھائی۔ کچھ پان۔ کچھ گجرے بھی لیتے چلے آئے۔ گھر میں گھستے ہی عطر۔ پان اور گجروں کو دیکھ کر بیوی صاحبہ باغ باغ ہوگئیں بچے مٹھائی کے دونے پر ٹوٹ پڑے۔ اور آپس میں لڑنے لگے۔ بیوی کے تبسم زیرِ لب' اور بچوں کی مار پیٹ کو دیکھ کر میاں نہال۔ اور بیوی صاحبہ اپنے شوہرِ نامدار کی گرویدگی اور دریادلی سے متاثر ہوکر دل ہی دل میں رشیمہ خطمی ہوئی جا رہی ہیں۔ عطر اور گجروں کے ساتھ اگر میاں دلّی کی کوئی کامدار جوتی بھی لے آئے تو محلہ والیوں میں غل ہوگیا کہ دیکھو، خورشید کے دولہا خورشید پر بُری طرح ریجھے ہوئے ہیں۔ اب کیا تھا۔ خورشید کے دولہا کی مثالیں دے دے کر محلہ ٹولہ والیاں اپنے اپنے شوہرِ بے جوہر کو طعنے دینے لگتیں کہ تمہاری چاہت منہ دیکھے کی ہے۔ خورشید کے دولہا سے چاہنا سیکھو۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ رویّہ اچھا نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور کہونگا کہ ڈربن میں اس کا امکان نہیں ہے۔ جس کی وجہ میں اوپر بیان کرچکا ہوں +

بازار کے علاوہ یہاں دو مقامات اور ایسے ہیں جہاں شام کی دلِگیر گھڑیاں بسر کی جاسکتی ہیں۔ ایک تو ساحل اور دوسرا فورٹ (قلعہ) لیکن وہ خوش نصیب جو جناب مولانا سیدنا مولوی اشفاق علی صاحب قبلہ کی معیت میں دلی کا فورٹ دیکھ چکا ہے اُسے ڈربن کے قلعہ میں کیا لطف حاصل ہوسکتا ہے۔ قلعوں کی دلکشی تو صرف ہندوستان کا ہی حصہ ہے۔ اور عجائب خانہ کی رونق ہند کے سلاطین کی جوتیوں کا طفیل۔ اس لئے چاروناچار ڈربن کے قلعہ سے ہاتھ دھونا ہی پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شام کے وقت جذبات میں ایک حد تک نرمی رقت اور لطافت پیدا ہوجاتی ہے۔ جن کی بالیدگی کے لئے قلعہ کی فضا معاون نہیں ہوسکتی۔ قلعہ میں جانے کے لئے دن کے دس بجے سے سہ پہر کے تین بجے تک کا وقت مناسب ہے۔ صبح کا وقت شوالوں میں اور شام کا وقت اگر خدا توفیق اور سودا دونوں دے تو چوپاٹی پر گذارنا چاہئے۔ یعنی موسیقی کی تابناک لہروں میں' رنگ و بو کی جانفزا موجوں میں' شفق کی زنگا رنگیوں میں' پھولوں کے جھرمٹ اور تیتلیوں کی دلکش آغوش میں۔ . . . . .

میری پژمردگی کو دیکھ کر میرے ایک نہایت مہربان دوست مسٹر آدم نے ازراہ نوازش اپنا فونوگراف باجہ اور چند بہترین ریکارڈ میرے حوالہ کردیئے۔ اور کہنے لگے کہ جب ہندوستان یاد آئے تو اس سے لطف اندوز ہو جئے گا۔ میں انکار کرتا رہا لیکن وہ نہ مانے اور اپنا کل بمعہ ساز و سامان کے میرے کمرے پر چھوڑ گئے۔ میرا خیال فونوگراف اور ٹاکی کے متعلق یکساں ہی ہے۔ دونوں کو میں مذاقِ سلیم پر بار سمجھتا ہوں' دونوں حالتوں میں ہم مشین کے ذریعے سے فطرت کی نقالی کرتے ہیں۔ اور دونوں کیفیتوں میں لمس انسانی کا جز غائب ہوجاتا ہے۔ جو موسیقی اور بات چیت کی جان ہے۔ لیکن آخر کار باجہ بجانا شروع کیا۔ گر مجھے کبھی یہ خیال نہ تھا کہ اس باجہ کا میرے ہوش و حواس پر اتنا گہرا اثر ہوگا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو میں مبہوت ہوگیا۔ ساز کی نغمہ ریزی۔ تانوں کی بے پناہ التہاب آفرینی۔ موسیقی کا چلتا پھرتا جادو۔ پھر جنوبی افریقہ میں اپنے ہندوستان کی سیر! یعنی فضائے ہند کا ایک لطیف سا مرقع آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہی ہند کی وجد آفریں شاعری۔ ہند کی محبت کی کلاسیکل داستانیں میرا بائی۔ سنجوگتا پدمنی کی پیاری پیاری صورتیں۔ بندرابن میں گوپیوں کے ساتھ کرشن جی کی اٹکھیلیاں نورجہاں۔ ممتاز محل اور چاند بی بی کی دلکش تصویریں۔ تاج محل اور چتوڑ کے مرقعے ـ ہندوستان کی پاک و صاف چاندنی میں جمنا جی کی موجوں کا رقصِ لرزاں۔ موسمِ برشگال کی بادہ ریزی۔ کوئل کی دلکش تانیں' اور موروں کا بجلی کی لرزش کے ساتھ ساتھ ڈر ڈر کر چیخنا۔ یہ سب ان ریکارڈوں میں موجود تھا۔ جو مسٹر آدم میری تفنن طبع کے لئے مجھے دے گئے تھے۔ اور جن کی اصلی قدر و قیمت سے میں پہلے پہل ناواقف تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان ریکارڈوں کی تکرار اس مقصد کو فوت کردیتی ہے۔ اس لئے بجائے ہر وقت سوئی چڑھا دینے کے یہ بہتر ہے کہ ہفتہ میں محض ایک آدھ دفعہ پورے اہتمام کے ساتھ باجہ بجانا شروع کیا جائے +

مثال کے طور پر ایک نادر شعر آپ کی خدمتِ والا میں پیش کرتا ہوں۔ شعر یہ ہے ؎

"سر اڑاتے ہیں اب وہ تلواروں سے
کوئی کہتا نہیں سرکار یہ کیا ؟"

فرض کیجئے کہ یہ دلّی (کشمیری گیٹ) کا واقعہ ہے۔ یعنی کشمیری گیٹ میں کوئی شدت کے ساتھ قتل و غارتگری میں مصروف ہے۔ دنیا انگشت بدنداں ہے لیکن کسی کو ہمت نہیں کہ یہ کہے کہ بندہ نواز! یہ کیا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ اب جانے دیجئے۔ لوگ تباہ ہوئے جاتے ہیں۔ مخلوق سخت اضطراب اور بے چینی کی حالت میں

ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گانے والی کی آواز نہایت پردرد۔ رقیق اور دل میں اُتر جانے والی تھی۔ اس کے علاوہ وہ راگ راگنی کے اصول سے بھی واقف معلوم ہوتی ہے۔ گو اس کی جانچ میں اغلباً صحت کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ مگر میری ساری توجہ شعر کے مضمون، شاعر کی بلند پروازی اور الفاظ کے دروبست پر بھی ہوئی تھی +

کوئی کہتا نہیں سرکار! یہ کیا؟

اس شعر کو کاشمیری گیت سے نسبت دے کر مجھے نادر خاں کا نادری حکم یاد آگیا جس نے دلی والوں کو تحت ابتلائی حالت میں گرفتار کر دیا تھا۔ لیکن شاعر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر مورخ نہیں ہو سکتا۔ شاعری کی بلند پروازی اور مورخ کی صحت پڑھی دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ اس لئے چاروناچار نادر خاں کے نادری حکم کو نظر انداز کر دیجئے۔ اور اس شعر کی باطنی خصوصیات سے لطف اندوز ہوجئے۔ اُردو اور فارسی کے شعرا کا دستور رہا ہے کہ جہاں شعر کے مضمون میں کچھ تعقید یا گھپلا پیدا ہوا شاعر کا شاگرد کہہ اُٹھتا ہے "استاد! کیا عارفانہ کلام ہے!"

اس شعر کو سُنتے ہی مجھے ڈبلن کی ویسٹ اسٹریٹ یاد آجاتی ہے ویسٹ اسٹریٹ کو ڈبلن میں وہی خصوصیت حاصل ہے جو لندن میں پکیڈلی کو، لکھنؤ میں حضرت گنج کو یا لاہور میں مال کو۔ سڑک نہایت کشادہ اور ہموار۔ دور سے آئینہ معلوم ہوتی ہے۔ دونوں جانب ڈبلن کی بڑی بڑی عالیشان دوکانیں۔ تقریباً سب ہفت منزلہ۔ دوکانوں کی آرائش اور زیبائش وہم و ادراک سے فزوں تر۔ اس پر فرنگی نژاد آدم کے بچوں، اور حوا کی بیٹیوں کا اژدہام۔ ہر فرد نہایت معروفیت کی حالت میں بھاگا چلا جا رہا ہے۔ کہیں خدانخواستہ آپ کسی دوکان میں داخل ہوگئے تو گویا خود آپ نے اپنی تباہی مول لے لی۔ جیب میں جسقدر رقم تھی وہ خیر گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حضرت دل بھی جاتے رہے۔ سودا خرید کر آپ کو سر کرنا چاہئے۔ لیکن آپ زدیدہ نگاہوں سے زمین پر ادھر اُدھر دیکھتے جاتے ہیں۔ اور گردن بھی کھجاتے جاتے ہیں۔ اُدھر زاہد فریب نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ آپ بدحواس ہوکر گرتے پڑتے بھاگے۔ مگر پھر یمین و یسار سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔ آپ خوش نصیب ہی ہوں گے۔ اگر آپ اس دار و گیر سے صحیح سالم نکل سکیں۔ اسی لحاظ سے میں کہتا ہوں کہ مجھے اردو کے اس شعر کا یہاں ڈبلن میں آکر صحیح مفہوم معلوم ہوا۔ اس محشرستان کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ پری کو یا جا کر۔ یونین آف سوتھ افریقہ کے وزراء سے ملوں، اور کہوں کہ بندہ نواز آپ کے "ملک" میں اچھا انصاف ہے!! اسی لئے تو داغ غریب کہتا تھا کہ

"منصفی دنیا سے ساری اُٹھ گئی"

ممکن کیا، مجھے یقین ہے کہ ڈبلن کے تخیل نے داغ سے یہ غزل کہلوائی تھی۔ کیونکہ ہندوستان میں خصوصاً دلی کی گلیوں میں جیب تراشی تو ضرور ہوتی ہے لیکن دن دہاڑے کوئی راہ زنی نہیں کرتا۔ گو اس کا احتمال ضرور ہے کہ عنقریب مستقبل میں وہاں بھی امن عامہ میں خلل پیدا ہونے لگیگا +

اس کے بعد کنارِ آب رکنا باد (   ) کا سوال پیدا ہوتا ہے مگر خود "گلگشتِ مصلےٰ" سے کنارِ آب رکنا باد کی سیر و تفریح مشکل ہے۔ خاصکر ڈبلن میں۔ کیونکہ بادی النظر میں ڈبلن گو حبشیوں کا ملک ہے۔ لیکن یہ جلد کی سپیدی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے بالفاظ دیگر بچ رہ جانے کے لئے بعض فطری اور غیرفطری اوصاف سے متصف ہونا اسقدر ضروری ہے۔ جسقدر کہ ریل میں سفر کرنے کے لئے ٹکٹ خریدنا۔ مثلاً آپ بے تکلف محلّہ کی مسجد سے لے کر تانگہ اسٹینڈ تک۔ اور بعض اوقات خود اسٹیشن تک پیدل جا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچ رہ جانے کے لئے موٹر کا ہونا ضروری ہے۔ اور موٹر بھی "ٹیکسی" یا "فورڈ" نہ ہو، بلکہ لینڈو وضع کی چمکتی دمکتی، اس کے علاوہ سوٹ نہایت پُر تکلف۔ ٹائی مناسب رنگ۔ اچھی طرح استری شدہ۔ کالراسٹف منہ میں سگار۔ اور چہرہ و ہاتھوں کی جلد یاسمینی یا سمینی نہ ہو تو مرمریں۔ لیکن اس سے ذرا بھی اُنیس نہیں، ڈبلن میں کالے گورے کے امتیاز کا تخت غلبہ ہے۔ اس لئے یہاں کی فضا میں حسین ہونا از حد ضروری ہے۔ آپ کا رنگ ذرا میلا ہوا۔ یقین کیجئے کہ آپ تقریباً ہر تفریح کے مقام سے نکال دیئے جائیں گے۔ بالخصوص بیچ کی تیز جہت نگاہوں سے، خواہ آپ کی نگاہوں سے کتنی ہی،

"انوار کی بارش ہو، اسرار کی ریزش ہو"

اس لئے خدا کا شکر ہے کہ میں اس تجلی گاہ سے فطرتاً دور رہنے پر مجبور ہوں،

ڈبلن کے نظام تعلیم پر کوئی مکمل مقالہ لکھنا ایک نہایت اہم کام ہے اس لئے فی الحال اس کی جرأت تو نہیں کرتا۔ لیکن اپنے کالج کے تھوڑے بہت ظاہری حالات لکھے دیتا ہوں تاکہ تعلیم کے شائقین مطمئن ہو سکیں۔ شاستری کا جا

ٹیچرس ٹریننگ کالج ہے جس کے ساتھ ساتھ ایک ماڈل ہائی اسکول ہے ملحق ہے۔ ہائی اسکول مکمل نہیں ہے۔ بلکہ ساتویں، آٹھویں۔ نویں۔ دسویں جماعت پرشتمل ہے۔ کالج صبح ساڑھے آٹھ بجے سے لے کر سہ پہر کے تین بجے تک "چالو" رہتا ہے۔ درمیان میں بارہ بجے سے ایک بجے تک لنچ کے لئے چھٹی ملتی ہے۔ کچھ طلبا اور اساتذہ قریب کے ہوٹلوں میں جاکر لنچ کھاتے ہیں۔ اور باقی اپنا من وسلویٰ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اور کالج ہی میں کھاتے اور غراتے ہیں۔ کالج کے نصاب میں اردو۔ ہندی کے بجائے فرنچ ولیٹن داخل ہیں۔ انگریزی ادب کا معیار درجوں میں عام طور سے بہت اونچا ہے دسویں جماعت کی کتابیں ہندوستان کے ایف اے کے کورس سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں۔ مگر طریقہ تعلیم وہی ہے جو ہندوستان میں رائج ہے۔ یہاں کے مدارس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ طالب علم غیر حاضر ہونا نہیں جانتا اگر کوئی غیر حاضر ہوگیا تو سمجھ لیجئے کہ اس کا خاندان کسی آفتِ ناگہانی میں مبتلا ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ تعطیلات کی ترتیب، اور سال کا "ٹرمس" میں منقسم ہونا یہاں کے تعلیمی اسکیم کا حسین ترین پہلو ہے۔ ہمارے شیخ علی جواد صاحب کا ایمان ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کے دو نمایاں ترین اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ علیگڑھ کا تعلیمی سال "ٹرمس" میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ جمعہ کا خطبہ عربی میں دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان کے مسلمان عرصہ ہوا عربستان سے کوسوں دور نکل آئے۔ شیخ صاحب کے اخلاص اور سرگرمی سے جو اصحاب واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن سے اختلاف کرنا ہاتھیوں سے گنے کھانا ہے۔ اس کے علاوہ ہفتہ۔ اتوار دونوں دن ہمیشہ مدارس بند رہتے ہیں۔ چنانچہ جو تعطیلات منظور شدہ ہیں جن کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے علاوہ کالج کا تھوڑی دیر کے لئے بھی بند ہونا اک امر محال ہے۔ ہندوستان میں جو تین ماہ کی مسلسل تعطیل کلاں ہوتی ہے اُس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ٹرمس کے ختم پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میری ضروریات کے لئے یہ نظام پسندیدہ نہیں ہے۔ لیکن میں اسکے حسن وخوبی کا معترف ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں بھی اس پر عمل ہونے لگے۔ حالانکہ وہاں کی مقامی۔ مذہبی، معاشرتی اور رسمی ضروریات اس اسکیم سے ٹکرا جائینگی اور دل کی آرزو دل ہی میں رہے گی ◆

~~~*~~~

ٹول صاحب کے زمانہ میں ایم۔ او۔ کالج کے پرنسپل سے متعلقہ دفاتر سب یکی بارگ کے کمروں میں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ حافظ صاحب میرے ہمراہ تھے۔ اور میں ان کی معیت میں داخلہ کے مراحل سخت بدحواسی کے عالم میں طے کررہا تھا۔ ٹول صاحب کی ہیبت اُس زمانہ میں کیا، آجتک دل پہ بیٹھی ہوئی ہے۔ اُن سے غلط سلط انگریزی میں "گھین ہین" "گھین ہین" کرکے

بابو رفیع اللہ خاں صاحب قبلہ کی خدمت والا میں حاضر ہوا۔ بابو صاحب قبلہ کی دفتری آن بان ابتک نظروں کے سامنے ہے۔ میرٹھ کی کشتی نما ٹوپی۔ ایک گال میں چار پانچ پان دبے ہوئے۔ آنکھوں پر سفید نال کا چشمہ ناک کے بانسے پر رکھا ہوا۔ چہرہ پر غیر معمولی مصروفیت اور اہمیت شان، آواز میں ڈانٹ ڈپٹ، اُن کے سامنے ذرا دور کو ایک اور کلرک بیٹھتے تھے۔ ان کی نشست کچھ ایسی تھی کہ کمرے میں داخل ہونے والے کی نظر سب سے پہلے اُن ہی پر پڑتی تھی۔ اور نیا طالب علم ان کو دیکھتے ہی سہم جاتا تھا۔ سر گھٹا ہوا۔ داڑھی یکمشت و دو انگشت لیکن بہت چھدری چھدری۔ زاہد شب زندہ دار کی طرح کے خشک لب، دانت خوفناک طریقہ سے خوفناک۔ آنکھوں پر وہی بابو صاحب قبلہ کا سا سفید نال کا چشمہ، ان کا نام پیر شمس الدین تھا۔ اب یہ بزرگ اشاعت اسلام لاہور کے سفیر کی حیثیت سے ڈربن میں موجود ہیں۔ اور مجھ خاکسار کو میزبانی کا شرف عطا فرما رہے ہیں ◆

چندہ کے سفیر سے اور صاحبان ڈرتے ہوں، میں خود نہیں ڈرتا۔ لیکن اوروں کو اُس سے ڈراتا رہتا ہوں۔ مگر خرابی یہ ہے کہ ہمارے پیر صاحب جن کی میں حقیقتاً دل سے قدر کرتا ہوں صرف سفیر ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مبلغ بھی ہیں، اگر سچ پوچھئے تو میں مبلغ سے بھی نہیں ڈرتا۔ کیونکہ مبلغ اسلام کے خیالات سے میں خود دس پانچ قدم آگے ہی رہتا ہوں۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اس کے باوجود پیر صاحب اپنی روزانہ کی تبلیغ صبح صبح مجھ ہی سے شروع کرتے ہیں۔ گویا شمشیر زباں کی باڑھ مجھ پر تیز کی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ دردناک پہلو جس کو میں ابتک ہمت کے ساتھ برداشت کر رہا ہوں۔ ورنہ پیر صاحب تو خیر میرے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بھی اگر علیگڑھ کا نام لیوا یہاں آجاتا تو میں اُسے سر آنکھوں پر ہی بٹھاتا ◆

پیر صاحب آجکل پردے کے خلاف سخت پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ میں نے قبل اس کے کہ یہ مسئلہ معرض بحث میں آئے نہایت صداقت اور دیانتداری کے ساتھ عرض کر دیا کہ پیر صاحب! خدا گواہ ہے۔ میں آپکا بسر وچشم ہم خیال ہوں۔ بلکہ میں تو خدا کی قسم مولانا شرر مرحوم کی طرح یہ ایمان رکھتا ہوں کہ مسلمانوں کی
~~~

کی ساری معاشرتی اور سیاسی تباہی اسی غیر فطری رسم کا نتیجہ ہے۔ بلکہ میں نے پنا نظریہ بیان کرتے ہوئے مولانا کو اس کا بھی یقین دلایا کہ جب تک مسلمانان عالم ں پردے کے بت کو نہیں توڑتے۔ ان کی فلاح سراسر ناممکن ہے۔ پیر صاحب ہے میں نے یہ سب کچھ انتہائی صداقت کے ساتھ کہدیا تھا۔ لیکن اسقدر کہنے کے اوجود وہی تکرار " وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا " وہی اُٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ ہے:-

" اپنی زینت کو نہ دکھائیں سوائے اُس زینت کے جو کھلی رہتی ہے "

جس کو پیر صاحب انتہائی جوش و خروش کی حالت میں باربار دہن مبارک یں جھاگ بھر بھر کر دہراتے جاتے ہیں۔ مگر صرف پیر صاحب موصوف کی موجودگی یہاں کے مسلمانوں کی معاشرتی خرابیوں کو دور نہیں کر سکتی۔ چنانچہ میں نے پیر صاحب سے تجویز کی ہے کہ وہ لاہور کو لکھ کر مولانا صدرالدین صاحب یا خود خواجہ صاحب قبلہ کو تکلیف دیں۔ یہاں جنوبی افریقہ میں شاخ قایم کریں، اور بہت استقلال اور استحکام کے ساتھ تبلیغ کا کام شروع کریں۔ خواجہ صاحب قبلہ یہاں دورہ فرما چکے ہیں۔ اور اُن کی صداقت اور فصیح البیانی کا ابتک لوگوں کے دل پر گہرا اثر ہے حقیقت یہ ہے کہ اس اشاعت اسلام لاہور کو از حد ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اور دولتمند اصحاب کو چاہئے کہ وہ اس مشن کو جہانتک ہو سکے کامیاب کریں۔ اس اثنا میں دو کتابیں میری نظر سے گذریں، جن کے مصنف پادری ہیں۔ دونوں کتابوں میں اسی خیال کی اشاعت کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان (دنیا بھر میں) اپنے مذہب سے ایک حد تک بددل اور غیر مطمئن ہیں چنانچہ جسقدر جلد ممکن ہو سکے ان کے کانوں تک عیسائیت کا الہامی پیام پہنچا دینا چاہئے۔ ان میں سے ایک کتاب کے مصنف پادری زمیور ہیں جن سے لاہور میں خواجہ صاحب کا مناظرہ ہو چکا ہے۔ یورپ کی تہذیب خواہ اچھی ہے یا بری اقصائے عالم پر آجکل مسلط ہے۔ گاندھی جی کا چرخہ، جبہ و دستار، یا کشکول۔ ان میں سے کوئی بھی اس اسٹی نیوشن آج اپنی جگہ پر قایم نہیں۔ علاوہ ازیں روزمرہ کے خیالات اور عقائد کی نئی قیمتیں آج دنیا میں رائج ہیں۔ قوم کی فلاح اس میں نہیں ہے کہ آپ صحرائے عرب کے اونٹوں کو ریل کے انجن پر ترجیح دیں حدی خوانی پر وجد کریں اور انجن کی سیٹی پر لاحول پڑھیں۔ یہ سوال ترکوں کے سامنے دوسو سال تک پیش رہا۔ مگر خود ان کی ذہانت اس عقدہ کو حل نہ کر سکی۔ یہ اُنکی بدقسمتی تھی کہ سلطان عبدالحمید خاں جیسے فرمانروا اُن کو ملے۔ جنہوں نے قومی زندگی کا ہر جائز اور ناجائز طریقہ سے قلع قمع کیا۔ یہانتک کہ ترکوں کو اپنی سلطنت کا چپہ چپہ

اغیار کی نذر کرنا پڑا۔ اس سے زیادہ قیمت اپنی غفلت شعاری کی کیا ہو سکتی ہے؟

میں ایک جذبہ کے تحت اس تقریر کو کر رہا تھا کہ معاً پیر صاحب کمرے میں آموجود ہوئے، اور بولے

" شکور صاحب! ولا یبدین زینتهن الا ما ظهر منها "

میں نے عرض کیا " پیر صاحب حق ہے "



آخر الذکر موضوع کے متعلق میں علیحدہ ایک مدلل اور مفصل مقالہ سپرد قلم کرنے والا ہوں۔ اس لئے اعتراض فرمانے والے حضرات ذرا تھوڑا سا صبر فرمالیں۔ مگر اس کے بعد مجھے ایک اور موضوع چھیڑنا ہے۔ جس میں مجھے عرصہ سے دلچسپی ہے۔ وہ موضوع یہ ہے:- " اردو کی زبان کی موجودہ شاعری "

ڈربن میں سوائے نیرنگ خیال کے اور کوئی اردو کا رسالہ مجھے دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس لئے اردو کی تازہ غزلوں سے میں قطعاً تو محروم نہیں ہوں لیکن ایک بڑی حد تک محروم ہوں۔ اس کے علاوہ بدایوں والے سبطین صاحب کا احسانمند ہوں جو سال میں ایک آدھ مرتبہ اپنی تازہ فکر مجھے بھیجدیتے ہیں باقی سراسر خیر سلا ہے۔ اس لئے دل کی آرزو دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں دوسری حالت تھی۔ مولانا سید نا سید علی احسن صاحب قبلہ۔ جناب حاذق صاحب۔ جناب ضیا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اُن کی غزلیں سنتا بھی تھا، اور شایع بھی کرتا تھا، اس کے علاوہ دنیا بھر کے اردو رسائل دیکھنے کو ملتے تھے۔ کبھی کبھار قبلہ " اُستاد خنداں " اور قاضی صاحب بھی اپنا کلام سُنا دیتے تھے۔ شاذ و نادر مولانا بنیظیر شاہ صاحب بھی کرم فرماتے تھے۔ ذوقی اور جلیل قدوائی سے بھی بر سر راہ مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ سال میں ایک مرتبہ مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ اصغر گونڈوی۔ جگر مرادآبادی۔ رواں۔ اثر۔ حفیظ۔ یہ صاحبان بھی آتے رہتے تھے۔ یا اب یہ حال ہے کہ اردو کا شعر سُننے کو ترس گئے۔ جتنے یاد تھے وہ بھول گئے۔ میدان صاف ہو گیا (باقی رہے نام اللہ کا) قریشی صاحب قبلہ کا مشاعرہ میں صدر ہونا۔ معین۔ سعید۔ رشید اور مولانا احسن صاحب قبلہ کا مشاعرہ کے انتظام میں بھاگم بھاگ پھرنا۔ حاذق صاحب کی چوٹ پر پوری صاحب کا ترنم کے ساتھ غزل پڑھنا۔ طلبا کا گھنٹوں پہلے آموجود ہوتا۔ اور حفیظ کا سامعین پر چھا جانا۔ یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ اب تو زبان پر یہی ہے:- " ولا یبدین زینتهن الا ما ظهر منها "

ردِّ عمل

حضرت قیسی کے قلم سے

بارش کی گھنگھور گھٹائیں میری فطرت پرست طبیعت کو کئی روز سے اُس کوہستانی حصار کے گشت کی دعوت دے رہی تھیں جس کے مہیب مناظر نگہ جاں بخش فضائیں مجھے ایک عرصہ سے یقین دلا رہی تھیں کہ ان کے لطیف پردوں میں متاع کی دولت اور تخیل پرواز شخص کے لئے گرانقدر مواد موجود ہے۔

تین گھنٹے تک بے مسلسل بارش کے تھم جانے کے انتظار میں اس کوہستانی سلسلہ کی دلچسپ سینری کا خیالی لطف اُٹھاتا رہا۔ میرا جہاں تک خیال ہے یہ لمحات گریزاں تضیع اوقات کے ہم معنی ثابت ہونے سے قطعی محفوظ تھے۔ اس عرصۂ فرصت میں میں نے اُن تمام سرسبز جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے مقامات کی اچھی طرح سیر کرنے کا معقول پروگرام بنا لیا تھا۔ جن کی ظاہری بھیانک ہیئت مجھے ابتک یہ خوف دلاتی رہی تھی کہ مبادا وہ درندوں کا مسکن ہوں +

یہ میرا پارک جس کو بیک وقت میں پارک بھی کہہ سکتا تھا اور جنگل بھی شہر کے ان حصص سے بالکل علیحدہ تھا جہاں سیر و تفریح کے عام متوالے اور نزہت گاہوں کے رسیا کچھ بغرض تفریح اور چند یہ بنائے ——— تحریص جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر میں نے کبھی کسی شخص کو اس سنسان خطہ کی بادیہ پیمائی کرتے دیکھا تو میں اس کے لئے بجز ایک شوریدہ سر عاشق یا صحرانورد افسان کے اور کوئی رائے قایم نہ کر سکا۔ کبھی اس سنسان سرزمین پر مغربی قمریاں بھی نظر آیا کرتی تھیں۔ جو معلوم نہیں مجھے وحشی انسان یا نیچرل سینری کا بے انتہا دلدادہ تصور کرتی ہوئی گذر جایا کرتی تھیں۔ ایسا بہت کم اتفاق ہوا ہوگا کہ میں نے ماہ میں ایک بھی وہاں کسی متنفس کو اپنی طرح مصروف تفریح پایا ہو۔ الغرض اس خطۂ ویران کو میں اپنی قلم و تصور کرنے لگا تھا۔ اور اپنے اندر یہ زعم پیدا کر چکا تھا کہ ہر اُس شخص کو جس کے احساسات لطیف مردہ اور تخیلاتِ فطری خفتہ ہوں۔ کوئی حق نہیں کہ اس کوہستانی زمین کے ذرات کو جو اپنے اندر سینکڑوں نگکدوں اور بیشمار چمنستانوں کی لطافتیں پنہاں رکھتے تھے آکر اپنے پیروں میں پامال کرے +

تمام سرزمین سنسان اور پُرخطر تھی۔ اور اپنے دل کو وہاں جانے سے باز باز رکھنے کی جرأت میں پاتا نہ تھا۔ لیکن ذی ہوش انسان ہوتے ہوئے میرا فرض تھا کہ ایسی خطرناک جگہ اپنی حفاظت کے لئے ضرور کوئی چیز اپنے ہمراہ لے جایا کروں۔ مگر چونکہ وقت مجھے مہلت دیئے جا رہا تھا۔ جس کے متعلق میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کہ ہمیشہ اسی طرح حوادث و واقعات سے محفوظ مجھے اس "پہاڑی پارک" کی تفریح کی اجازت دیئے جائے گا۔ میں نے کبھی کوئی شے اپنے ہمراہ لے جانیکا خیال نہ کیا +

ایک دفعہ جبکہ میں واپس آ رہا تھا تو دو شخص خلاف معمول اپنے پیچھے ——— تعاقب میں یا نہ معلوم ویسے ہی آتے دیکھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ٹانگوں سے چل رہے تھے۔ میں جب اپنی رفتار ذرا دھیمی کر لیتا تو وہ بھی اسی رفتار سے چلنے لگتے۔ یہ تھی وہ وجہ جس سے مجھے شبہ ہوا کہ تعاقب کیا جا رہا ہوں +

دوسرے دن سیر کے لئے حسب معمول روانہ ہونے کے قبل میں نے اپنی عادت مستمرہ کے خلاف خالی ہاتھ چلنے پڑنے کے ساتھ ہی ایک چار انچ کے پھل کا چاقو سنبھال لیا۔ دھار پر انگلی پھیری تو خون چمک آیا۔ مگر اس کی یہ فریب کاری کیا مجھے یقین دلا سکتی تھی کہ وقتِ ضرورت بھی یہ اسیطرح "خون رائیگاں" کے بجائے کچھ کام کر سکیگا؟ جہاں تک چاقو کی ذات کا اس امر سے تعلق تھا وہ تو چوکنے کا نہ تھا۔ میرے حواس ہی ساتھ نہ دیں تو علاج نہیں۔ خیر چاقو میری جیب میں تھا اور میں جنگل میں +

آفتاب کی زرد زرد رخصتی شعاعیں پہاڑی حصار کی بلندیوں پر اب بھی پڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج پُرفریب دنیا کی رنگا رنگیوں پر دن بھر للچائی نظر ڈالے رہنے کے بعد اب اس خطۂ ویران کی جانب ایک سرسری نظر جس میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی ڈالتا ہوا افسوس سے رخصت ہو رہا تھا۔ جنگل کی پُرملال فضا سے متاثر ہو کر اپنی آواز نکالی جسکو موسیقی سے [illegible]

جسقدر موسیقی کو اُس سے۔ اور جس کے بلند کرنے کے لئے میں اس مقام سے بہتر اور کوئی جگہ نہ پاتا تھا۔ کیونکہ یہاں نہ کسی کی سمع خراشی کا خوف تھا۔ نہ اپنی خفت کا خدشہ۔ اسی طرح لاابالی طور پر چلا جا رہا تھا۔ سرسبز جھاڑیاں۔ بلند ٹھوس پہاڑی چوٹیاں۔ ناہموار راستہ۔ خاموش فضا۔ یہ تمام وہ وحشت خیز مناظر تھے۔ کہ میرے علاوہ اور کوئی شخص ایک منٹ کے لئے بھی ایسے بھیانک مقام کو اپنی تفریح گاہ رکھنے کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ کبھی کبھی خاردار جھاڑیوں میں میرے کوٹ کا دامن اُلجھ جاتا تھا۔ مگر میں بکمال استغنا بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اس میں یا تو کبھی دامن کا نقصان ہوجاتا تھا یا خار کا +

آس پاس کی جھاڑیوں پر چھڑی مارتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ موڑ ختم ہوتے ہی فاصلہ پر ایک متحرک سایہ سی نظر آئی۔ میں نے اُس طرف نظریں گاڑ دیں اور چند سیکنڈ کے لئے "جائے ماقبل" میں آکر غور سے دیکھنے لگا جسقدر میں اُس کے قریب ہوتا جاتا تھا اُسیقدر وہ اپنی شکلیں تبدیل کرتا جاتا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی گنجان جھاڑی ہے۔ جو ہوا سے حرکت کر رہی ہے۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ سبز گھاس کا چھوٹا سا ڈھیر ہے۔ جس میں ہوا نے جان ڈال دی ہے اس کے بعد کوئی بیٹھا ہوا انسان معلوم ہوا اور آخر میں ایک عورت! عورت ہی تھی جو ایک جھاڑی کی جانب اسقدر متوجہ تھی کہ میرے قریب پہنچ جانے پر اُس کے انہماک میں خلل نہ آیا +

ایک لڑکی تھی جس کا کنول سا جسم ہلکے سبز رنگ کی ساڑی سے چھپا ہوا تھا۔ اور جس نے کل شاید موسم بہار دیکھے ہوں گے۔ وہ جھکی ہوئی ایک گھنی خاردار جھاڑی میں سے اپنی خوبصورت کتیا کو نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ غریب ننھی سی جان بُری طرح کانٹوں میں اُلجھی ہوئی تھی حسینہ کی اس قابل رحم کوشش نے اس کے ہاتھوں میں جابجا خراشیں پیدا کردی تھیں۔ غریب کتیا جھاڑی سے نکلنے کے لئے اس طرح تڑپ رہی تھی جس طرح پرندہ قفس میں پھڑپھڑاتا ہے۔ اس کا منہ اور جسم کانٹوں سے لہولہان ہو رہا تھا۔ میرے بیروں کی زد کی آواز نے لڑکی کو چونکا دیا معاً میری جانب اُس کی نظریں اُٹھیں۔۔۔۔۔ "آہ براہ کرم میری کتیا کو نکال دیجئے!" یہ الفاظ اُس کی زبان سے اس طرح ادا ہوئے گویا میں اس کا طلب کردہ یہاں آیا تھا اور وہ مجھ سے یہ خدمت لینے کا بہت دیر سے عزم کئے بیٹھی تھی میں نے فوراً آستینیں چڑھا لیں۔ اور ادھر اُدھر جھاڑی میں ہاتھ پھیرا۔ دو تین کانٹوں نے میری دست بوسی کرکے اس مہم کی مشکلات سے مجھے آگاہ کر دیا۔ ہاتھوں کا کتیا تک پہنچنا ناممکن سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے بالکل مایوس ہونے سے قبل ایک دفعہ اور کوشش کی طیش میں آکر بے تحاشا دونوں ہاتھ اندر بڑھا دیئے پہنچنے کو ستم رسیدہ جانور تک پہنچ تو گئے۔ مگر مجھ سے دریافت کیجئے پھر کیسی گذری! بس اپاہج بن کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ بیکس کتیا اپنی رہائی قریب سمجھ کر خوشی میں ان کو چاٹنے لگی۔ مگر اس کو کیا خبر تھی کہ وہ خود اس کی بدنصیبی کے شریک ہوگئے ہیں" اوہو یہ آپ کیا کر بیٹھے!" یہ الفاظ اس وقت ادا کئے گئے جب میں اس زبردستی کی سرلی ہوئی مصیبت کا بدرجۂ مجبوری عادی سا ہو چلا تھا۔ غریب لڑکی پریشانی میں میرا منہ تکنے لگی۔ میں دل میں اپنی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ لڑکی نے میرے کوٹ کی آستینیں نیچی کردی تھیں۔ تاکہ کلائیاں زخمی نہ ہونے پائیں۔ جب چند منٹ اس حالت میں گذر گئے۔ تو ایک بات میرے ذہن میں آئی۔ جیب سے چاقو نکلوایا اور لڑکی سے آس پاس کی شاخیں کاٹ ڈالنے کی استدعا کی۔ مگر وہ ہاتھ اس چاقو کے لئے موزوں نہ تھے۔ خدا خدا کرکے ایک دو شاخیں کٹیں۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ صرف ایک ہاتھ کی رہائی میں اگر شاخیں اسی رفتار سے کاٹی گئیں تو رات تو یہیں ہو جائیگی۔ رہا دوسرا ہاتھ تو اس کا خدا حافظ!

ازراہ حقارت نہیں بلکہ ترس کھاتے ہوئے میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر سرگرم کار ہاتھوں کی مصروفیت پر نظر کی پھر اس تنگ اور ناہموار جگہ میں نامحرم کے جسم سے اپنا کوئی عضو مس ہوجانے سے بچائے رکھنے کی بیکار احتیاط پر خیال کیا۔ اس کے بعد ان بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھنے لگا جو میرے بہت قریب گھنی پلکوں کی حفاظت میں روشن تھیں اور جنہیں کسی شاخ کے جلد کٹ جانے سے اپنی کامیابی قریب کی مسرت جھلکنے لگتی تھی۔ میرے ہاتھ اسقدر مصیبت میں گرفتار نہ تھے جسقدر ان کو رہائی دلانے والے ہاتھ تھے۔ آخر مجھے اپنی کمزوری پر جوش سا آیا اور میں نے پھر اُسی ہیبت کے ماتحت زور سے باہر کھینچ لئے۔ گوشت میں کانٹے ٹوٹ رہنے کا تو شمار ہی نہ تھا۔ اس کے علاوہ چند بڑی بڑی خراشیں بھی آئیں۔ بدنصیب کتیا اپنے "ہم نفس" کے نکل جانے سے پھر مایوسانہ چوں چوں کرنے لگی۔ میں نے اس کو چمکارا اور آزردہ لڑکی سے اُس کا رومال طلب کیا۔ اس بار دونوں ہاتھوں پر دو رومال لپیٹ کر پھر اس خونخوار جھاڑی کے مقابلہ کے لئے آمادہ ہوگیا۔ کانٹے اب بھی لگے۔ کپڑے کو چھید کر جلد میں گھس گئے۔ مگر اب تک کی ناکامیوں سے مجھے منفعل جوش سا آ رہا تھا۔ بے اختیار کتیا کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر باہر کھینچ لیا۔ اُس نے لاکھ بھوں بھاں مچائی۔ مگر میں نے تو اس بار باہر گھسیٹ ہی لیا۔ اور دیکھ

"آپ کی کتیا" کہتا ہوا ایک فاتحانہ شان سے اٹھ کھڑا ہوا +

چوطرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ اس وقت یہ مقام اور بھی بھیانک معلوم دے رہا تھا۔ میں نے رومال واپس کرتے ہوئے کہا "سیر کا وقت تو اب ختم ہو چکا۔ میرے خیال میں اب آپ بھی شہر کا رُخ کرنا پسند کرینگی؟" "اور آپ؟" سوال اس طرح کیا گیا۔ گویا میرے چلنے پر بھی اصرار کیا جا رہا ہے +



تمام راستہ ہم نے بالکل خاموشی سے طے کیا۔ کبھی کبھی کتیا کے پیچھے رہ جانے سے اس کو بلانے کے لئے ایک ہلکی سی خوشگوار سیٹی کی آواز جنگل کی خاموش فضا میں تھوڑی دور پھیل کر گم ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنی رفتار سست دھیمی کر رکھی تھی۔ کبھی کبھی میں دائیں بائیں مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا۔ مگر حسینہ کو یا تو اپنی کتیا کی شوخیوں پر متوجہ پایا۔ یا بالکل نیچی نظر سے قدم اُٹھاتے ہوئے۔ ارسب باطنی طور پر ہم دونوں آزاد نہ تھے۔ دو اجنبی ـــــ بالکل اجنبی باہم اتفاقی اتصال کے جو اثرات محسوس کرتے ہیں وہ تکلف سے خواہ کتنے بری ہوں لیکن اُن میں ایک ناگوار ثقل ضرور ہوتا ہے جس کا ازالہ باہمی بے تکلفی ہی کر سکتی ہے +

میں یقیناً اُس آنے والے وقت کے مقابلہ میں جس میں ہم دونوں کو جدا ہو جانا تھا۔ موجودہ لمحات کو بہت ہی خوشگوار پا رہا تھا۔ مگر جذبات کی کشمکش اور ایک بے معنی دار و گیر طبیعت پر بار گزر رہی تھی۔ اور اس وقت تک گذرتی رہنے والی تھی۔ جب تک ہم دونوں جدا نہ ہو جائیں۔ میں ہر ہر قدم پر اُس مقام کے قریب آ جانے کا خوف دل میں لئے چلا جا رہا تھا۔ جہاں پہنچکر مجھے رخصتی الفاظ سننے تھے۔ میرے دل میں قسم قسم کے خیالات آ رہے تھے "کیا ہم شہر میں کسطرح پہنچ جائیں گے؟ کیا مکان آتے ہی یہ لڑکی اس میں داخل ہو کر گم ہو جائیگی۔ اور میں یونہی وداعی الفاظ تبدیل کرنے کی توقع کو فریب دیتا ہوا آگے ہی آگے چلتا رہ جاؤنگا۔ ان خطرات کی تاویل کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ ان شکوک کے ساتھ میں نے ایک حیلہ سے گردن موڑ کر اُس بے ریا اور بھولی بھالی شکل کو دیکھا جو تاریکی کے تسلط سے افسوس اچھی طرح نظر نہ آ سکی +

مزدوروں کی جھونپڑیوں کے چراغ نظر آنے لگے۔ خفیف سے کہر کے نیچے جواں دیگر سائبان کی طرح جھونپڑیوں میں چھایا ہوا تھا۔ ایک دو کتے ننھی سی کتیا کو دیکھ کر زبان چاٹتے دُم ہلاتے دوڑے ـــ اور یہاں پہنچکر اب وہ شکر گذاری کے گہرے احساس کے ساتھ مجھ سے رخصت ہونا چاہتی تھی۔ لڑکی اور میں بالمقابل کھڑے ہوئے تھے۔ اور پھر وہی بے معنی اور ناگوار خاموشی طاری تھی۔ جس نے تمام راستہ ہمارے لبوں پر مہر اور دلوں میں ایک ہیجر مجر سی بپا کر رکھی تھی۔ اس وقت وہ اپنی پوری قوت سے ہم پر مسلط تھی۔ کیونکہ یہ وداعی گھڑیاں تھیں یعنی اُس کی قوت آزمائی کا آخری موقع۔ میں نے پھر دریافت کیا "کیا آپ شہر سے باہر رہتی ہیں؟" "جی ہاں" پھر خاموشی۔ آخر میں رخصت ہو جانے کے نیم ارادہ سے ذرا مُڑا لیکن اُس کو اسی جگہ کھڑا دیکھ کر اپنی اس "تبدیلی مقام" کو صرف رفع کسل کی کوشش ثابت کر کے کھڑا رہ گیا۔ مجھ سے سوال کیا گیا "کیا آپ یہاں روزانہ سیر کو آتے ہیں؟" اس کے جواب میں "اکثر" کے ساتھ ہی میں نے رخصتی سلام کیا اور چل دیا۔ کتیا کو کم از کم اتنی توقع ضرور تھی کہ میں چلتے وقت اُس کو ایک بار تو ضرور گود میں لے کر چمکاروں گا۔ اور وہ اس اُمید پر میرے پیچھے چند قدم دوڑی بھی۔ مگر شاید اُس کو بعد میں خیال آ گیا کہ اس سے زیادہ پیار کے قابل اُس کی مالکہ تھی +

بعض دفعہ تو میں کالج سے سیدھا اپنی کوہستانی قلمرو میں چلا جاتا تھا۔ اور جبتک ماہ نو غروب نہ ہو جاتا لوٹنے کا نام نہ لیتا۔ غلطی سے رومالوں کی تبدیلی ہو گئی تھی۔ اُس روز میرا رومال لڑکی کے پاس چلا گیا تھا اور اُس کا میرے پاس آ گیا تھا۔ ایک خوبصورت زنانہ ریشمی رومال تھا۔ جس کے ایک کونہ میں "شکنتلا" اودے رنگ کے ریشمی دھاگے سے کڑھا تھا۔ اگر شکنتلا اُسی لڑکی کا نام تھا تو رومال کا اسقدر خوبصورت ہونا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ اس کے بعد مجھے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دقت پیش آئی کہ آیا رومال واپس کر دوں یا رہنے دوں۔ احمق دل کے تو تقاضوں پر تقاضے تھے کہ رہنے بھی دو۔ مگر ضمیر سنجیدگی سے اس کے خلاف رائے دے رہا تھا لیکن جس ہستی کے متعلق یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ آیا اسی فانی دنیا کی رہنے والی تھی یا کوئی سماوی مخلوق تھی۔ اس کی تلاش میرے لئے ناممکن سی تھی۔ "کیا آپ روز سیر کو اس طرف آتے ہیں؟" اس سوال سے یہ نتیجہ نکالنا کہ سائل خود بھی کبھی کبھی اس طرف آ نکلتا ہے میرا ہی کام ہو سکے۔ اسی قیاس کی بنا پر میں ہر وقت اُس کے رومال کو جیب میں رکھتا تھا۔ نہ معلوم کب ملاقات ہو جائے +

جمعہ تھا۔ رات کو سنیما جانے کا پروگرام تھا۔ جب میں مسعود نہ آیا تو میں تنہا ہی چل دیا۔ میں ایسی بھیڑ بھاڑ کی جگہ بھی تنہائی حاصل کرنے سے باز نہیں رہتا۔ بزرود میں ذرا کم آدمی تھے۔ میں نے ایک کرسی جس کے بازو اور ٹانگیں سنیما کی کانپتی ہوئی تصویروں سے بھی زیادہ لرزاں تھیں گھسیٹ لی اور علیحدہ جا کر بیٹھ گیا۔ انارکلی کا فلم تھا۔ اختتام تماشہ کے قریب جب اکبر نے اُس نامراد عاشق کو دیوار میں چنوا دیا تو باوجودیکہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ یہ تماشہ ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر غیر حقیقت تو

آج چونکہ آنکھیں حقیقت عریاں کے رنگ میں دیکھ رہی تھیں۔ آنسو ضبط نہ کرسکا چند قطرے نکل آئے جن کو میں نے بلا کسی خاص خیال کے شکنتلا کے رومال میں جذب کرلیا ◆

مجمع کم ہوجانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا میں سگریٹ کا دھواں اُڑانے لگا۔ حرماں نصیب انارکلی کی محبت کا سنسنی خیز انجام سینما فلم سے منتقل ہوکر میری سطح دماغ پر اُتر آیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ انارکلی دیوار میں چنوائی جارہی تھی۔ اور آخری اینٹ رکھدی جانے کے بعد وہ اس منحوس دنیا کی مسموم ہوا میں سانس لینے کو زندہ نہیں رہنے والی تھی —— میں چونک پڑا کسی نے مسٹر ہارون کہتے ہوئے میرے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ اگلے ذہنی نقوش آنکھوں کے سامنے سے تمام تر نہیں ہٹ گئے تھے۔ میں نے بھوچکا سا ہوکر اپنے سامنے دو انسانی قد دیکھے جو یہ آوازکسنی ''ہیں! آپ تو ہم کو ایسے حیران حیران دیکھ رہے ہیں۔ گویا بالکل پہلی بار ملاقات ہوئی ہے'' یہ فقرہ بہت صاف و سلیس انگریزی میں ادا کیا گیا تھا۔ میں نے فوراً اپنے حسین متکلم سے معذرت کرتے ہوئے کہا ''معاف کیجئے۔ میرے خیالات نہ معلوم کہاں تھے'' اس کے بعد میں دوسری عورت کے سامنے ان الفاظ سے پیش کیا گیا ''یہ ہیں وہ مہربان جنہوں نے اُس روز میری کتیا کو از سرِنو زندگی بخشی'' جب میں نے دیکھا کہ گذشتہ ملاقات کے واقعات پوشیدہ نہیں رکھے جارہے ہیں۔ تو رومال واپس کرنے کا موقع میں نے غنیمت جانا۔ ''یہ آپ کا رومال غلطی سے تبدیل ہوگیا تھا —— حاضر ہے —— اور مجھے افسوس ہے کہ میں اس کو پوری عظمت کے ساتھ واپس نہیں کررہا ہوں۔ اس میں میرے دو حقیر آنسوؤں کی بوندیں جذب ہیں'' لڑکی کے چہرے سے پہلے استعجاب اور بعد کو ایک پُروقار شان استغنا نمودار ہوئی اور اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ''رومال کی واپسی اگر برمحل تعارفی مراسم کی ادائگی سے آپ کے نزدیک اسقدر قریبی تعلق رکھتی ہے۔ تو لائیے میں اس کو مع ان دو حقیر قطرات اشک کے شکریہ کے ساتھ واپس لیتی ہوں''

''مگر بہن یہ تم نے کیسے یقین کرلیا کہ وہ ''قطرات اشک'' ہی ہیں''۔ یہ ایک خندۂ شوخ کے ساتھ اس کی سہیلی کے منہ سے الفاظ نکلے۔ فقرہ برجستہ تھا۔ میرے جی میں بھی آیا کہ دل کھول کر قہقہہ لگا ہوں۔ مگر شکنتلا نے جو خود بھی اس تمسخر پر اپنی سنجیدگی کو غالب کرنے میں بار بار ناکام ہوئی جارہی تھی بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا ''ہاں یہ تو بتائیے آنسوؤں نے اس وقت آپ کے ساتھ کس معاملہ میں اظہار ہمدردی کیا تھا؟'' ہم پر چند لوگوں کی نظریں پڑرہی تھیں نہ میں دیکھنے والوں کے دیدے پھوڑ سکتا تھا نہ اپنے متکلمین کو خاموش کرسکتا تھا۔ میرے قابو میں صرف یہ تھا کہ فوراً یہاں سے چل دوں۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ ہمارے ہی متعلق کانا پھوسی کررہے ہیں۔ اور میں اس امر سے بھی بےخبر نہ تھا کہ ایسے مواقع پر ہیبت و درشتی میرے بس کی نہیں رہتی۔ زود اشتعال انسان تھا۔ اس کے علاوہ ایک عورت کی اہانت کی تاب نہ لانا میرے لئے قطعی ناممکن تھا۔ چنانچہ میں پھر اسی سرد مہری سے سرد مہری تو نہ کہوں گا غیر شریفانہ طریقہ پر آداب کرکے رخصت ہوا۔ شکنتلا کے جواب میں چلتے وقت صرف اسقدر کہہ سکا کہ کیا یہ غم میرے لئے کم تھا کہ ایسی بیش بہا شے (رومال) کو اپنے سے جدا کررہا تھا۔ کیا اس پر افسوس کے دو آنسو بھی نہ نکلتے؟ سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے وہ میری دوسری کوشش تھی جو میں نے اپنی کمزوری پر غالب آکر اسی جگہ کھڑی ہوئی شکنتلا کو دیکھنے میں صرف کی تھی ◆

شکنتلا میرے تخیل کی مالا تھی۔ میں اس کے آگے سپر انداز ہوچکا تھا۔ مجھے اعتراف کرنے میں قطعی تذبذب نہیں کہ وہ میرے خوابوں کی تعبیر اور بیداری میں ہمہ وقت پیش نظر رہنے والی تصویر تھی۔ لیکن میں نے یہ معلوم کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی کہ میرے اس کیف کا جو شکنتلا نے مجھ پر طاری کردیا تھا اور جس کو میں محبت کے ہم معنی خیال کرنے میں مطلق غلطی نہیں کررہا تھا دوسرا پہلو بھی روشن ہے یا نہیں۔ ہمہ اوقات میرے سینہ میں یہ آرزو موجزن رہتی تھی کہ میری روح کے تمام دلفریب نقوش جن کے مجموعہ کا نام ہی شکنتلا تھا ہر دم میرے سامنے رہیں۔ یہ ''فطرتِ عشق'' کا تقاضا تھا۔ دن ہفتے اور مہینے گذر رہے تھے۔ اور میں اس کوہستانی فضا میں اعلان کرتا پھرتا تھا کہ میں گم ہوگیا ہوں۔ مجھے کوئی تلاش کرے۔ ایسے ہی تو شخص کو لوگ غلطی سے مجنوں کہنے لگتے ہیں۔ اس کا مجاہدہ انداز جنون اور اُس کی سرفروشیاں فاتر العقل انسان کے حرکات سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ جارج میکڈونلڈ کے الفاظ سننے کے قابل ہیں ''اگر عشق صادق اور بے لوث محبت حاصل ہوجائے تو عاشق کی فتادگی کے مقابلہ میں دنیاوی آلام سپر انداز ہوجاتے ہیں'' ◆ ہر شے مجھے اپنے جمود میں اپنی کسی خاص کیفیت میں میرے جذبات کی ریس کرتی نظر آتی تھی۔ میں ہر دلکش جنس کو دیکھ کر فریب کھا جاتا تھا کہ اس میں شکنتلا کا عکس بغایت موجود ہے اور پھر اپنے اس کی جانب لپکتا تھا۔ مگر صرف مایوس ہونے کے لئے ◆

(خیالی شتے)

پروفیسر گھوش تھا تو ایک بوڑھا آدمی۔ مگر بعض اوقات اُس کی طباعی و زندہ دلی

جودت برنائی پر بھی فوق لے جاتی تھی۔ ہم کو کسی پروفیسر کے گھنٹہ میں خوش گپیوں کا اتنا موقع نہیں ملتا تھا۔ جتنا ان کے صرف ایک گھنٹہ میں مل جایا کرتا تھا۔ آتے ہی اُنھوں نے کتاب بند کی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے اور تمام مقامی خبریں سنا ڈالیں۔ وہ احباب سے بحث کرنے والے اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنی فتح رکھنے کے لئے اُستدلال کو اُس حد تک پہنچا دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ جہاں دلائل دلائل نہیں رہتے۔ بلکہ اُن کی ذاتی ملکیت بن جاتے ہیں۔ جس بات پر وہ اڑ جاتے تھے۔ اس پر سے ہٹانے کو ڈیا تھنیس کے دلائل بھی بیکار تھے۔ منجملہ ان کی دیگر عادتوں کے ان کے اندر میں نے ایک بات یہ دیکھی کہ وہ پدرانہ شفقت، بزرگانہ اکرام اور مخلصانہ الطاف کو اپنے کسی اصول کو صدمہ پہنچنے کے بچانے کے لئے اکثر بے دریغ قربان کر ڈالا کرتے تھے۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ دنیا میں بالکل تنہا تھے۔ صرف ایک لڑکی تھی اور عجب نہیں وہ بھی اُن کی پدرانہ شفقت سے محروم ہو۔ وقت کے بڑے پابند تھے۔ بحیثیت مجموعی کچھ بُرے آدمی نہ تھے۔ اُن کے جملے کلاس میں بالعموم اس طرح شروع ہوا کرتے تھے "ام (ہم) تم سے بولا کل (خواہ اُنھوں نے کل کچھ کہا ہی نہ ہو) ہم لوگ چیختے کہ للہ آپ اس بچاری اردو پر تو رحم ہی کیجئے۔ انگریزی میں بھی کچھ فرمائیے۔ مگر وہ کہتے۔ مگر وہ تھے اردو بولنے کے شائق "بنگالیت" کی رُو سے جہانتک الفاظ بچتے ہم خوش نصیب تھے کہ سمجھ جایا کرتے تھے۔ ورنہ پھر تمام لکچر انگریزی میں دہرانے کی درخواست کرنی پڑتی تھی۔ ان کو اردو پڑھانے کا فخر مجھے حاصل تھا۔ اور میں نے ان کو اجازت دے رکھی تھی کہ جسقدر ممکن ہو وہ بولیں اردو ہی۔ مگر جب اس "نو آموز عالم" نے کلاس میں بھی گذشتہ چھ ماہ سے سیکھی ہوئی زبان میں داد فصاحت دینی شروع کی تو مجھے اپنا دیا ہوا لائسنس ضبط کرنا پڑا +

بادل صبح ہی سے ہو رہے تھے۔ تین بجے کے قریب موسلادھار مینہ برسنے لگا۔ میں گیا ہوا تھا ڈاکخانہ۔ جو واپس کالج کو لوٹا ہوں۔ تو شرابور تھا۔ ایک گھنٹہ بعد چھٹی ہوگئی۔ مینہ تھمتا نظر نہ آتا تھا۔ کپڑے تر ہو جانے سے میری خراب حالت تھی۔ تمام جسم میں خارش سی ہونی شروع ہوگئی۔ چھینکیں علیحدہ آ رہی تھیں۔ برآمدے میں کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ مینہ تھمے تو روانہ ہوں۔ اتفاقاً اُدھر سے پروفیسر گھوش گذرے۔ میری حالت دیکھ کر آپ نے بے اختیار فصیح اردو میں فرمایا "ایں! تم اتنا سا (اسقدر) کیوں گیلا ہے؟" میں اپنی مصیبت کے پورے اظہار کی کوشش میں دو تین چھینکیں لیں اور اُن سے اپنے بھیگ جانے کا واقعہ بیان کیا۔ سُنکر بولے "اب تم کھڑا ہونا اچھا نہیں" میں مطلب فقرہ کا سمجھ تو گیا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آنے کا حیلہ کر کے چُپ کھڑا رہا۔ آپنے پھر اُسی فقرہ کو زیادہ صحیح طور پر یوں ادا کیا "اب تم کھڑا ہونا نہیں اچھا" جب میں پھر بھی نہ بولا تو اپنی انگریزی میں فرمایا کہ میرے ساتھ موٹر میں چلے چلو۔ بھیگ گئے ہو۔ بیمار ہو جاؤ گے۔ ان کا مکان نہ معلوم کہاں تھا۔ مگر میں اس خیال سے بیٹھ گیا کہ شاید وہاں پہنچتے پہنچتے مینہ تھم جائے۔ راستہ میں اُنھوں نے صرف "تم کھڑا ہونا اچھا نہیں" کو مجھ سے صحیح اردو میں ادا کرنے کی فرمایش کی۔ ان کو اپنے صحیح اردو نہ بول سکنے پر بار بار افسوس ہوتا تھا۔ اور وہ مجھے قسمیں دے دے کر یقین کر لینا چاہتے تھے کہ اُن کو بھی کبھی صحیح بولنا آئے گا یا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم اُن کے مکان پر پہنچ گئے +

مجھے نشست میں بٹھا کر وہ رسمی عوائد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُن تمام یقینی عادات کے ماتحت جن کا ایک فلاسفی کے پروفیسر میں فقدان دیکھ کر میں یقیناً متعجب ہوتا۔ چلدیئے۔ ان کے جاتے ہی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ بندۂ خدا از راہ تکلف اب اپنی اس وقت کی تمام ضروریات و حوائج کو قربان کر کے میرے پاس آکر بیٹھنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔ نہ میں اس کا متوقع تھا میں فقط یہ چاہتا تھا کہ ایک گرم کوٹ۔ ٹانگوں میں لپیٹنے کو کوئی کپڑا۔ انگیٹھی اور اگر ممکن ہو تو ایک پیالی چائے مہیا کر دی جائے۔ پانچ منٹ بعد ہی یہ اشیاء فراہم کر دی گئیں۔ کوٹ تو پروفیسر صاحب کا میرے جسم پر آیا نہیں۔ میں آرام دہ گرم کمرے میں بیٹھا تھا۔ جس کے دروازہ کے شیشوں پر زور زور سے قطرات بارش آ آ کر لگتے تھے۔ لیکن نامعلوم نہ پاکر شیشوں پر بہیں بہیں کر بہ جاتے تھے۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور میں بالکل غیر ارادی طور پر اس مصرع کو گنگنا رہا تھا ؎

"شاید کہ باز بینم آں یار آشنا را"

یہ مصرع مناجات کا کام کر گیا۔ دفعتہً کمرے کی گرم ہوا میں ایک ہلکی سی جھنک پیدا ہوئی — اور شکنتلا اپنے کمرے میں ایک اجنبی کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی ایک حیرت کی دھیمی آواز! اس کے بعد یہ شکستہ جملہ جس کو جذبات تحیر اچھی طرح ادا نہیں ہونے دے رہے تھے "مسٹر ہارون! یہ آپ — آپ ہیں؟ کس طرف سے آگئے؟" میں تھوڑے سے تعجب کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ استعجاب کے اثرات آنکھوں سے خاص طور پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ شکنتلا کی دلفریب آنکھیں دلکش حد تک پہلے ہی بڑی تھیں۔ اب حیرت و استعجاب نے اور بھی بڑھا دیں

بنادیا۔ دھیمی آواز میں میں نے جواب دیا "جی ہاں یہیں ہوں"۔

شکنتلا: "گذشتہ شب میں نے آپ کو خواب میں دیکھا تھا۔ گویا آپ ہمارے مکان میں آئے ہیں۔ آخر آپ کس۔کس طرح آگئے؟ اور ——"

اس کو میرے اس طرح آجانے پر یقیناً تعجب ہونا چاہئے۔ آخر میں نے اس کی رفع حیرت کے لئے کہا "میں بارش میں بھیگ گیا ہوں۔ پروفیسر صاحب میرے عنایت فرما ہیں کالج سے اس طرف اپنے ہمراہ لیتے آئے"۔

شکنتلا: "اچھا تو آپ ان کے کوئی شاگرد ہیں؟ واقعی آپ تو تمام تر ہو رہے ہیں۔ ٹھیرئیے میں کپڑے منگواتی ہوں"۔

میں: "تکلیف نہ کیجئے۔ پروفیسر صاحب کے کپڑے میرے جسم کے لئے بیکار ہیں"۔ مگر وہ فوراً لینے چلی گئی۔ میرا پاجامہ بالکل تر تھا۔ قمیص تو کوٹ کی وجہ سے محفوظ تھی۔ ٹانگوں میں خارش ہو ہو کر موٹے موٹے نشانات ہوگئے تھے۔ دو منٹ بعد ایک لڑکا سفید نفیس دھوتی لے کر آیا جس کا طول و عرض ایک طویل القامت اور قصیر القامت دونوں کی ستر پوشی کرسکتا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے اس کا صحیح استعمال آتا تھا۔ ورنہ تہبند کی طرح بیٹھنا پڑتا۔ چند منٹ بعد شکنتلا نے مجھے دھوتی میں آدیکھا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اس تبدیلی لباس پر جرأت افزا لہجہ میں بولی "آپ دھوتی ہی استعمال کیا کیجئے۔ خاصے چھتری معلوم دیتے ہو"۔

میں: "مگر اس کو استعمال کرنے کے بعد اپنی تعریف آپ کے لبوں سے سننے کو میں آئندہ آپ کو کہاں سے پاؤنگا"! ایک جملہ تھا کہ بلا ارادہ میری زبان سے نکل گیا۔ اور جس کے اثرات کا رفع کردینا میرے امکان میں نہ تھا۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ پانی تھم چکا تھا۔ اپنے گیلے کوٹ کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور منت پذیری سے بولا "آپ کا اور پروفیسر صاحب کا میں بیحد ممنون ہوں۔ کیا آپ اُن کی صاحبزادی ہیں؟"

شکنتلا: "جی ——"

میں نے چلنے کے لئے پشت موڑی تو وہ پھر بولی:۔

"آپ کا نام ہارون ہی ہے نا؟"

میں: (مسکرا کر) "یہ میرے رومال کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ اگر میرا نام یہی ہے تو آپ اس میں —— میرا مقصد ہے اس کے اگلے دو حروف میں ایک عجیب بات دیکھینگی۔ ان کو جس طرف سے لوٹ کر ادا کیجئے "آہ" یا "ہا" ایک غم کی آواز ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ میں سمجھتا ہوں وہ میرے جذبات کی کچھ کچھ ترجمانی کرتا ہے"۔ اس ہذیانی گفتگو کو خدا جانے وہ سمجھی یا نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں روانہ ہوا۔

ہفتے اور مہینے گذرتے جارہے تھے۔ اور میں اپنے جذبات کی کشمکش میں اسی درجہ مبتلا تھا۔ شکنتلا کا خیال ایک لمحہ نہیں بھولتا تھا۔ اس کی یاد کی کاوشوں اور دید کی آرزوؤں کو فرو کرنا میرے امکان سے باہر تھا۔ چند روز بعد ہی میں اپنے لئے ایک ایسی کیفیت —— ایک ایسے وقت کی پیش بینی کرنے لگا جو مجھ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کردینے والا تھا۔

ایک روز پروفیسر گھوش سے معلوم ہوا کہ وہ ہفتہ عشرہ کے لئے کلکتہ جارہے ہیں۔ میں نے وجہ دریافت کی۔ آہ! کاش میں معلوم کرنے کی کوشش نہ کرتا —— شکنتلا بھی اُن کے ہمراہ جارہی تھی —— کسی خوش بخت کے قبضہ میں دائمی طور پر دی جانے کے لئے۔ اس صدمہ کے جانگسل شدائد میری روح کو گھلا دینے کو کافی تھے۔ اُس کے چلے جانے کے بعد میں عرصہ تک اپنی حالت کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہا۔ حزن و ملال کی میرے لئے انتہا ہوچکی تھی۔ اس گوہر گمگشتہ کے لئے صبر کرنا قطعی ناممکن نظر آرہا تھا۔ لیکن اور چارہ کیا تھا۔ شکر ہے غم و آلام اپنی صبر آزما سختیوں کے ساتھ انسانی دلوں میں مستقلاً قبضہ کرلینے کے عادی نہیں ہیں۔ خارجی موثرات اُن کے شدائد کو ہلکا کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ انسان کے لئے زندہ رہنا وبال ہوجائے۔

ایک سال بعد شکنتلا کے خوش نصیب شوہر سے میری بھی ملاقات ہوئی۔ شکنتلا اُس کے ساتھ کلکتہ سے نہیں آئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے ہماری تقریب کرائی۔ میں اپنے جذبات مباہات و استحسان سے مغلوب ہو کر اس شخص میں اُس تسخیر کو تلاش کرنے لگا جس کے ذریعہ وہ مجھ پر مسابقت کرکے شکنتلا پر قابض ہوگیا تھا۔ میں رشک کے جذبات اور کینہ کی باطنی تحریکات کو ضبط کرتا ہوا اُس غاصب سے ملا۔ بارے شکر ہے۔ اپنے رقیب کی پذیرائی میں زیادہ دن تک مجھے روحانی اذیت نہیں اٹھانا پڑی۔ وہ چلا گیا۔

صبر کا تہیہ کرلینے کے بعد طمانیت و تسکین جن کا بحالت مجبوری آموجود ہونا یقینی بات ہے۔ مجھے ڈھارس بندھاتے رہے۔ اور میں نے کچھ عرصہ بعد اپنے اندر اتنی قوت پیدا کرلی کہ اپنے انجام عشق پر صرف ایک پُر درد آہ کھینچکر خاموش ہوجایا کرتا تھا۔

شکنتلا کا شوہر بھی دنیا میں بالکل بے یار و مددگار شخص تھا۔ خدا جانے کن ذرائع سے انگلینڈ پہنچکر بیرسٹری پاس کر آیا تھا۔ الغرض تمام تر مسرت و کامرانی اس

وقت اس کے حصہ میں آئی ہوئی تھی۔

میں اگر اپنے جذبات محبت کے مدوجزر کو ایک گراف کے ذریعہ ظاہر کروں تو زیادہ مناسب ہے۔ مگر افسوس مجھے کسی خیال نے اسقدر بنا رکھا تھا کہ اپنے تمام ماحول سے بے خبر تھا۔ تمنائیں اگر ناکامی کے بعد فنا ہوسکتی ہیں تو میں بھی اپنے کو محروم دائمی تصور کرنے لگا تھا۔ میری آرزوئیں مٹ چکی تھیں۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ میں چارسمت سے مایوس ہوکر اُن کے سیلاب کو فرو کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ رہی محبت! اس کو اپنے دل سے نکال کر پھینکدینا بشر کے بس کی بات نہیں۔

انفلوئنزا کا اسقدر زور شور تھا کہ خدا کی پناہ "وبائے عام" کا سماں نظر آرہا تھا۔ جس طرف دیکھو لاشیں۔ جنازے۔ ہر مکان میں نالۂ بکا۔ یہ وبا کچھ ایک شہر میں نہ تھی بلکہ تمام ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی۔ میں موت سے ڈرتا نہ تھا مگر بقول حضرت عمرؓ "تقدیر آلٰہی سے تقدیر آلٰہی کی طرف بھاگنا ضروری سمجھتا تھا"

مسٹر گھوش باوجود میری مزاحمت کے ایک ہفتہ کے لئے کلکتہ چلے گئے تھے۔ روز ان کا شدید انتظار تھا۔ دس روز ہوگئے نہ چٹھی آئی نہ کوئی تار آیا۔ پندرہ روز ——— ایک ماہ گذر گیا اور وہ لاپتہ۔ پرنسپل کے علاوہ اور تمام لڑکوں کو سخت تشویش تھی۔ افسوس مجھے بھی ان کا پتہ یاد نہ تھا۔ ورنہ خود چلا جاتا کئی روز اس پریشانی میں گذر گئے۔ اس کی وجہ سے مجھے بھی نقل شہر کا عزم ملتوی کرنا پڑا۔ اور حضرت ابوعبیدہ کے اعتقاد کے مطابق اپنے کو تقدیر آلٰہی کے سپرد کر دیا۔

کالج کی گیلری میں کھڑا تھا کہ تار کا ڈاکیہ بائیسکل اڑاتے نظر آیا۔ میں نہ معلوم کس اندرونی تحریک کے ماتحت اُس کی جانب اس طرح بڑھا۔ گویا وہ مجھے بلا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ایک لفافہ دکھایا اور مکتوب الیہ کو دریافت کیا۔ میرا ہی تار تھا۔ فوراً ہی لے کر جو پڑھتا ہوں تو بس چار لفظ تھے :۔

"فوراً چلے آؤ" شکنتلا

شکنتلا کا نام دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچ جانا دشوار نہ تھا کہ یا تو پروفیسر صاحب سخت بیمار ہیں۔ یا راہیٔ عدم ہوگئے۔ خیر میں نے اُس کا پتہ ذہن نشین کرکے مکان کی راہ لی اور سوٹ کیس سنبھال کر سب سے پہلی ٹرین سے کلکتہ روانہ ہوا۔ تمام سفر میں قسم قسم کے خیالات آتے رہے۔

شام کو سات بجے منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ اس عظیم الشان بستی پر بھی اُن دنوں وہ نحوست برس رہی تھی کہ دل دہلتا تھا۔ میں تلاش کرتا کرتا شکنتلا کے مکان تک پہنچ گیا۔ ایک بڑے سے پھاٹک کے سامنے گاڑی جاکر رکی۔ اور میں ایک وسیع صحن جس کو صرف ایک لالٹین روشن کر رہی تھی۔ طے کرکے اندر پہنچا۔ سیڑھیوں پر سے جونہی برآمدے میں قدم رکھا تو میں نے سفید ساڑی میں کسی عورت کو آہستہ آہستہ اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اُس کی رفتار سے ایک افسردگی سی عیاں تھی۔ قریب پہنچکر میں بے اختیار پکار اٹھا "کون شکنتلا ؟" اُس نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لینے کی کوشش کی۔ مگر میں نے ملائم گرفت سے اُس کا ہاتھ تھام کر دیوانگی کے عالم میں دریافت کیا "پروفیسر صاحب کہاں ہیں ؟" اُس نے بے پروائی سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے گویا میرے الفاظ سُنے ہی نہ تھے۔ اور کمرہ میں داخل ہوئی۔ میں بھی پروفیسر صاحب کی مزاج پرسی کے لئے اچھے اچھے لفظوں پر غور کرتا ہوا۔ اُس کے ساتھ ہی اندر پہنچا۔ مگر وہاں بجز ایک بڑی میز اور چند کرسیوں کے کچھ نہ تھا۔

شکنتلا نے کھڑکی کھولدی اور آہستہ سے ایک کرسی میری جانب بڑھا دی۔ اُس کی ایک ایک حرکت سے انتہائی حزن و ملال عیاں تھا۔ میں نے ایک سنجیدہ خبر کی پیش بینی کرکے اُس سے اُسی لہجہ میں پھر دریافت کیا۔ "بتاؤ نہ تمہارے والد کہاں ہیں ؟" میں نے دیکھا کہ ماہ جبین شکنتلا کے نازک لب تھرائے اور اُس نے ایک بہت بڑے پھندے کو حلق میں اُتارتے ہوئے کہا "تم بیٹھ تو جاؤ ذرا !" مگر میں لپک کر اُس کے قریب پہنچا۔ اُس نے بلا کچھ کہے اس انداز میں مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا جسمیں اصرار سے بہت زیادہ قوت موجود تھی۔ میرے بیٹھتے ہی وہ چلدی اور میں حیرت سے اُس کو دروازہ میں سے گذرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ آخر یہ کیا فی تھی۔ چو طرف بھیانک خاموشی میز پر ایک لیمپ روشن تھا۔ کمرہ میں ایک نفیس فرش بچھا ہوا تھا۔ جس کے وسط میں بے پروائی سے قالین پڑا ہوا تھا۔ میں اپنی حیرت و پریشانی میں مبتلا تھا۔ کہ آہٹ ہوئی اور ایک عورت تھال ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوئی۔ وضع قطع سے وہ بنگالن نہیں معلوم دیتی تھی۔ اُس نے میرے ہاتھ دھلائے۔ اور کھانا سامنے رکھا۔ بھوک ہوتی تو کھاتا۔ چند لقمے لئے اور خوان بڑھا دیا۔

پندرہ منٹ بعد جب شکنتلا آئی تو وہ اس بار کچھ کچھ مطمئن سی نظر آرہی تھی۔ وہ بیٹھی نہیں سیدھی اس کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اور بظاہر باہر جھانکنے لگی۔ چند منٹ بعد بلا میرے سوال کا انتظار کئے اس طرح بولی گویا مجھ سے نہیں کھڑکی میں سے کسی سے بات کر رہی تھی "آپ پروفیسر صاحب کو دریافت کرتے ہیں وہ جس روز آپ کو تار دیا۔ اُسی روز رحلت کرگئے"

اس خبر بد کو سننے کا یقین موجودہ واقعات نہ دلاتے رہتے تو میں حیرت و افسوس سے چیخ اٹھتا۔ تب بھی ایک غم کی آہ کو ضبط نہ کر سکا جس میں شکنتلا نے بھی چند قطرات اشک کے ساتھ شرکت کی۔ چند لمحہ بعد جب اُس کی طبیعت ذرا رکی تو بولی " میں اب بالکل ——" لیکن میں نے کسی خیال کے ساتھ قطع کلام کرتے ہوئے اُس سے اسی اندوہگیں لہجہ میں دریافت کیا " اور تمہارے شوہر کہاں ہیں؟" شکنتلا کے دلفریب چہرے پر جس میں سہ سالہ ازدواجیت بہت کم تغیر پیدا کر سکی تھی۔ ایک دم رنگ سا دوڑ گیا اور پھر فوراً ہی سفید پڑ گیا۔ اُس نے چند سسکیاں اور بہت سے غم کے آنسو ضبط کر کے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بمشکل اتنا کہا۔

" وہ والدہ سے بیس روز پیشتر انتقال کر گئے"

" آہ!" یہ آہ نہ تھی بلکہ ایک فوری صدمہ کی چیخ تھی جس کے ساتھ میں دیوانہ وار کھڑا بھی ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحہ بہت سے خوفناک منظر میں اپنی آنکھ کے سامنے پا رہا تھا۔ کئی منٹ تک میں بحیس و حرکت کھڑا رہا اور نہ معلوم کب تک کھڑا رہتا اگر شکنتلا کی سسکیوں کی آواز مجھے نہ چونکا دیتی۔ اس کا چہرہ سفید ساڑی کے دامن سے چھپا ہوا تھا اور یہ سرو قد عورت اس وقت یوگی کی مجسم تصویر نظر آ رہی تھی۔ میں چند قدم بڑھا اور سہولت سے اُس کے شانہ پر ہاتھ رکھا اور بولا " شکنتلا! کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ تمہارے قیمتی آنسو اُن دونوں عزیز ہستیوں کو پھر زندہ کر دینے سے قاصر ہیں۔ اس غیر متوقع صدمہ کے باعث بیشک یہ اموات پیہم ہیں۔ لیکن یاد رکھو اگر تم نے اسقدر اپنا دل کمزور رکھا تو یہ صدمہ تمہاری بیش بہا زندگی کا بھی خاتمہ کر دے گا۔ غم بذات خود اس قدر جانگسل نہیں ہوتا جسقدر ہماری طبیعتیں اس کو اپنے لئے روح فرسا بنا لیتی ہیں میں جانتا ہوں اس وقت تم بھی موت کی شدید آرزو اپنے دل میں محسوس کر رہی ہوگی۔ وہ اسقدر رحمدل نہیں ہے کہ تمہاری تمنا کا ایسے موقع پر خیر مقدم کر سکے" شکنتلا سسکیوں کے بے انتہا طوفان کے درمیان بولی " آہ ارون! میں دنیا میں بالکل بے یار و مددگار رہ گئی۔ مجھ سے آلام نے اسقدر خوفناک انتقام لیا جس کے لئے میں بالکل تیار نہ تھی۔ دنیا میں —— میرا —— آہ کوئی غمخوار نہ رہا —— وہ بالکل سچ کہہ رہی تھی۔ ایک میں شناسا تھا اور چند لوگ اور تھے۔ مگر اُس کی بد نصیب زندگی ایک مخلص قرابت دار کی مربیانہ تشفی کی محتاج تھی۔ افسوس میں کبھی اس قسم کی ذمہ دارانہ حیثیت سے اپنے کو پیش کرنے کے قابل نہ تھا۔ تاہم میں نے ایک خدا ترس اور ہمدرد انسان کے مانند اُس کے غموں کو ان الفاظ سے کم کرنا چاہا " تم اسقدر پریشان کیوں ہوتی ہو شکنتلا! تم دنیا میں ہرگز بے یار و مددگار نہیں ہو۔ ابھی تمہارے لئے اس بیرحم زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے میں زندہ ہوں —— میں —— میں ایک حقیقی بھائی کی طرح تمہاری زندگی کے آیندہ دکھوں کا شریک رہونگا۔ لو آنسو صاف کر ڈالو اور مجھ پر اعتماد کرو۔ میں ہوں تمہارا سرپرست —— تمہارا غمخوار —— تمہارا بھائی —— اور ——" مگر دوسرے لمحہ شکنتلا بیساختہ اپنی انتہائی بے چارگی کے اعتراف کے لئے میرے سینے سے لپٹ گئی۔ اُس کی گرم گرم تھرتھراتی ہوئی باہیں میری گردن میں تھیں اور اُس نے حقیقتاً اپنے جسم کا تمام وزن اپنے ہاتھوں پر لے کر میری گردن پر ڈال دیا۔ اس کے بعد ایک اُس مصیبت زدہ انسان کی طرح جس کو تمام مایوسیوں کے بعد کسی غیر متوقع دلخوش کن خیال نے زندہ رہنے کی اُمید دلادی ہو وہ میرے سینے پر سر رکھ کر اس قدر روئی اسقدر روئی کہ میری قمیص کے علاوہ بنیان تک تر ہو گیا۔ اس وقت میری کیا کیفیت تھی؟ افسوس میں اس کے اظہار میں عاجز ہوں۔ وہ رو رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ میرے خیال میں اس گریہ تسکین بخش کے اندر وہ تمام غم جو عزیز اموات کا باعث تھا آنسو بن کر نہیں بہا جا رہا تھا۔ بلکہ اس میں اُس سوز کا بھی بہت بڑا جزو شامل تھا جو ہماری ملاقات اولیں کے روز سے ہی جانبین کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اُس پر ایک بیخودی سی طاری تھی۔ اور مجھ پر ایک رقت! ایسی رقت جسکے تسلط سے اندریں صورت بچنا ناگزیر ہے۔ وہ میری گردن سے جھول رہی تھی۔ اور میں نے اُس کا تمام وزن اپنے ہاتھوں پر لے کر اُس کو اپنے دل کے بہت قریب کھینچ رکھا تھا۔

جب میں کلکتہ سے رخصت ہوا تو بالکل ایک جدید انسان تھا۔ میرے ساتھ اسباب تو کچھ نہ تھا۔ مگر مجھے اپنی آرزوؤں کے لئے تمام گاڑی غیر کافی نظر آ رہی تھی۔ وطن پہنچ کر طبیعت مطلق نہیں لگی۔ انفلوئنزا ابتک انسانی بستیوں کو ویران کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے بار بار خوف کے ساتھ خیال ہوتا تھا کہ شکنتلا ایک ایسے مکان میں تھی جہاں دو موتیں واقع ہو چکی تھیں۔ تعدیہ مرض کا خطرہ تھا اس عرصہ میں میں نے اسکے متعلق بہت سے پریشان خواب بھی دیکھے۔ ایک وحشت سی اُٹھی اور پھر کلکتہ پہنچا۔ مکان میں داخل ہوتے ہی سناٹا نظر آیا۔ دفعتاً جھبری کتیا میرے پیروں میں آکر لپٹ گئی۔ اُس کے پیچھے ہی ملازمہ آئی۔ بے اختیار شکنتلا کے متعلق دریافت کیا تو اُس نے رُونی صورت بنا کر ظاہر کیا کہ گذشتہ ہفتہ وہ انفلوئنزا کا شکار ہو گئی۔ میں یقین نہ کرنے کی شدید کوشش کے باوجود ضبط نہ کر سکا۔ ایک آہ کیساتھ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا گرتے گرتے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ شکنتلا میرے سرہانے کھڑی مسکرا رہی ہے۔

عیسی

معنی بیگانہ

از حضرت میرزا یگانہ لکھنوی

کیوں کسی سے گلہ کرے کوئی — دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
وفا

نہ دوا چاہیئے مجھے نہ دعا — کاش اپنی دوا کرے کوئی

ہنس بھی لیتا ہوں اوپری دل سے — جی نہ بہلے تو کیا کرے کوئی

موت بھی آسکی نہ منہ مانگی — اور کیا التجا کرے کوئی

عشق بازی کی انتہا معلوم — شوق سے ابتدا کرے کوئی

کوہکن اور کیا بنا لیتا! — بن کے بگڑے تو کیا کرے کوئی

درد ہو تو دوا بھی ممکن ہے — وہم کی کیا دوا کرے کوئی

دردِ دل پھر کہیں نہ کروٹ لے — اب نہ چونکے خدا کرے کوئی

کون سا دل ہے درد سے خالی — کونسے دل میں جا کرے کوئی؟

اپنے دل کی ہے روشنی ساری — چشمِ بینا تو وا کرے کوئی!

شمع کیا شمع کا اجالا کیا؟ — دن چڑھے سامنا کرے کوئی!

غالب اور میرزا یگانہ کا
آج کیا فیصلہ کرے کوئی؟

وہم کی کیا دوا کرے کوئی

یگانہ

شاعر اور تاریکی

از:- جناب خان شاطرؔ غزنوی۔ مدیر رسالہ چمنستان

سمندِ نور سے تھک کر سوارِ آفتاب اُترا — شفق کا عارضِ مغرب سے وہ رنگیں نقاب اُترا
مناظر پہلے لپٹے زرد سی باریک چادر میں — چُھپے پھر رفتہ رفتہ شام کی باریک چادر میں
اندھیرے نے چھپالیں روح پرور وادیاں ساری — ہوئیں روپوش فطرت کی حسیں شہزادیاں ساری
سوار آئی جہاں میں دوشِ ظلمت پر سیاہ کاری — بھڑک اُٹھے دلِ شیطاں میں جذباتِ گنہگاری
جہاں پر اپنے پر پھیلائے ظلمت کے فرشتوں نے — سکوتِ شب کی چادر اوڑھ لی ارضی بہشتوں نے
چڑھی رہوارِ تاریکی پہ ہیبت ناک خاموشی — فسوں انگیز، خوف آمیز، دہشت ناک خاموشی
زمیں کی وسعتیں گم ہوگئیں ظلمت کے طوفاں میں — فلک کی عظمتیں گم ہوگئیں ظلمت کے طوفاں میں
ہوا گم نیند میں وہ زندگی کا شورِ ہاؤ ہو — جہاں میں چل گیا آخر شبِ تاریک کا جادو
درندے اپنے مسکن میں پرندے اپنے مامن میں — پڑے ہیں دم بخود انسان تاریکی کے دامن میں



مُندھی ہیں خوف سے گو فطرتِ مجبور کی آنکھیں — کُھلی ہیں اب بھی شاعر کے دلِ پُر نور کی آنکھیں
اُسے معلوم ہے اچھی طرح فطرت کی مجبوری — یہ تاریکی ہے اس کے واسطے اک شمعِ کافوری
وہ تاریکی میں جلوے دیکھتا ہے نورِ قدرت کے — وہ اندھیرے میں نقشے کھینچتا ہے صبحِ عشرت کے
نگاہِ فکر سے روشن کئے ہے اپنا کاشانہ — شرابِ آتشیں سے بھر رہا ہے اپنا پیمانہ

وہ مے جلوہ فگن تقدیس کے انوار ہوں جس سے
وہ مے فطرت کے خوابیدہ قویٰ بیدار ہوں جس سے

شاطرؔ

شیرازہ

زمزمۂ تغزل

(لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی)

میرے دل میں کوئی ہنگامہ اور ہے سن رہا ہوں ایک آواز اور ہے
شہپر جبریل نے نسبت ہی کیا طائر دل تیری پرواز اور ہے
میرے نالوں میں کہاں اتنا اثر توڑ دے دل کو وہ آواز اور ہے
ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جان دوں اس سے بڑھ کر کوئی اعجاز اور ہے
اور شے ہے، شور ہنگام نشور وہ خرام فتنہ پرداز اور ہے
کیف چشم مست ہے اک اور چیز بادۂ صافی شیراز اور ہے
سرحدیں ہیں عام ازل ہو یا ابد میرا انجام اور آغاز اور ہے
رنگ مطرب سے علاقہ دل کو کیا یہ مرا ٹوٹا ہوا ساز اور ہے
شاعری جوش جوانی تھی عزیز اب تو رنگ طبع ناساز اور ہے

(میخانہ)

میخانۂ ریاض

(لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی)

در کھلا صبح کو پو پھٹتے ہی میخانے کا عکس سورج ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا
حسن موجوں کا چھلکنا بھرے پیمانے کا رقص پریوں کا ہے عالم ہے پری خانے کا

بکتی ہے عالم نو شورش ہنگامہ عشق حشر اک حرف غلط ہو مرے افسانے کا
نہ ہوا تھی نہ مرہ آہ عدو تھے وہ تھے حال شب کو نہ کھلا شمع کے بجھ جانے کا
پائے زنجیر شکن وہ کشش فصل بہار اور زنداں سے نکلنا کسی دیوانے کا
صدقے اس سوز کے جو سوز ہو اس حسن کیساتھ شعلہ گویا پر پرواز ہے پروانے کا
کھینچنے والے کی جھلک دیکھی ہو جب ساقی دیکھنا منہ مجھے انگور کے ہروانے کا
شمع کعبہ رہے محفوظ الٰہی تاحشر نام روشن ہو اک اجڑے ہوئے بتخانے کا
لوگ کہتے ہیں کہ ہے زاہد مرتاض ریاض رند کہتے ہیں اسے چور ہے میخانے کا

(میخانہ)

نغمۂ زندگی

(از جناب تصدق حسین صاحب خالد ایم۔ اے۔ ای۔ اے۔ سی۔ پی۔ سی۔ ایس)

غنچۂ ناشگفتہ کے سینۂ تابناک میں جذبہ وہ اک لطیف سا کیف فزا کہیں جسے
جس کی نشاط ریزیاں محمل جلوۂ امید آہ وہ جلوۂ امید برق ادا کہیں جسے
اس کی ادائے حسن رقص جمال دلکشی اس کی فضائے قدس میں رنگ فنون لبری
جھوم رہی ہیں شوخیاں اسکی حریم ناز پر جنکی فسانہ کوشیاں جذب میں اضطراب میں
ایک ہجوم آرزو شوق نمو سے بیقرار جیسے شعاع موج نور ساغر آفتاب میں
ہو یہ نوائے دلنشیں راز نہان زندگی اسکی طلسم کاریاں کیف جہان زندگی

(بقیہ)

(کتبہ اشفاق احمد بریلوی)

. جلسوں هوتا

... رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اسلئے ہمیشہ اسمیں اشتہار دو

بابت فروری و مارچ ۱۹۳۱ء

اشاعت ۵۰۰۰

نیرنگِ خیال عید نمبر

سالانہ تین روپیہ چھ آنہ معہ محصول — ممالک غیر سے ۸ شلنگ — فی پرچہ ۵ر — عید نمبر ایک روپیہ

نیرنگِ خیال عید نمبر کے دلچسپ مضامین

حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی
(نسیبی حمزہ انشا کے دس نادر نمونے (ہ مضمون منوعہ)
اورنگ زیب عالمگیر
پروفیسر تاثیر مدظلہ العالی
شاہجہان کی رخصت
از حضرت ظفر قریشی (جادو نا تھ سرکار کا نادر مضمون)

افسانے

ر ایا پرشادی — از ... آبادی
... کی نماز — ناکارہ ...
... میرا کیا قصور ہے؟ — از جناب محمد حکیم جعفری ...
... مبارک — جناب ادیب اے آبادی
ایڈیٹر نیرنگ خیال کی تصویر — از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی

حصہ نظم

جنگ نامۂ اسلام
از طالب الہ آبادی

... یاس یگانہ لکھنوی
... جمال بریلوی
... تبسم

مولانا حضرت راشد الخیری ایڈیٹر عصمت
آمنہ کا لال
نعان شہید
از جناب سید حسن ... بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
تنہا ادیب
از جناب صوفی صفوۃ اللہ بیگ دہلوی
جناب شیام سندر لال صاحب ناصر
جناب افتخار فلک صاحب
جناب مولانا عبدالباری صاحب آسی
سید نذیر احمد صاحب فرخ آبادی وغیرہ وغیرہ

افسانے

فاضل ... مشہور ... کا اصل افسانہ
نارنگی کی کلیاں — مس حجاب امتیاز کے قلم سے
بہنی کی چوٹی — از جناب مرزا محمود نظامی اسلامیہ کالج ...

ڈراما

فوجی کارنامہ — از جناب منشی کنہیا لال بی۔ اے ایڈیٹر چاند

ادبی مضامین

محترمہ سلطان لکھنؤ — چاند

مولانا سید نجیب اشرف ندوی۔ ایم۔ اے
(ہاشمی کی یوسف زلیخا اور اردو شہ پارے
عابد القدرت
کی دو لاجواب نظمیں
والٹیر (کلیسا کا مشہور باغی)
از جناب ریاض حسین صاحب بی۔ اے
تم بھی ہنستے ہو میرے حال پر — شیرین ابن عظیم آبادی
ستیارتھ لورنت کے خط کا جواب ... کا مکتوب
از جناب کنور محمد ... علیخاں
ایک بیوہ کی سرگذشت — از جناب اظہر ... بنارسی
ایڈیٹر نیرنگ خیال کی تصویر — حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ

تصاویر

محبت کا پھول — رنگین
باغ عدن — "
... کی یاد — "
عمر خیام کی ایک ہاپی سہ رنگ
اعلیحضرت غازی نادر شاہ مع اپنے بھائیوں کے وغیرہ وغیرہ

اشتہارات

(کتبہ اشفاق احمد بریلوی)

بزمِ خیال

از ایڈیٹر

چوری کے مضامین

معزز ہمعصر انقلاب نے افکار و حوادث کے کالم میں ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ افسانہ والیا جو مخزن کی کسی کد شایع ہوا تھا۔ آج سے سترہ سال بیشتر جناب پیارے لال شاکر میرٹھی کے قلم سے شایع ہوچکا ہے۔ اور ان پندرہ سالوں رسایل اُسے نقل کرچکے ہیں۔ معزز ہمعصر عصمت نے بھی بعض لڑکیوں کی شکایت اپنے رسالہ میں لکھی ہے کہ وہ مطبوعہ مضامین نقل کرکے عصمت میں بھیجدیتی ہیں۔ میں سے بعض غلطی سے شایع بھی ہوچکے ہیں۔ اس قسم کی چوریاں بلکہ سینہ زوریاں رسایل کی شہرت پر دھبہ لگانے والی ہوتی ہیں۔ نو آموز اہل قلم کو اس قسم کی سے بچنا لازم ہے۔ نیرنگ خیال کو بھی بعض کرم فرماؤں نے تختہ مشق بنانے کی تجویز کی تھی۔ چنانچہ اس وقت تک دو افسانے نیرنگ خیال میں بھی شایع ہوچکے ہیں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اتنا موقعہ نہیں ملتا کہ ہم تمام رسایل کا بغور مطالعہ کرسکیں۔ اس لئے ہم آسانی سے ان کا شکار ہوگئے۔ ایسے مضمون نگار نیرنگ خیال کو تو کیا کریں گے وہ خود اتنے بدنام ہوجائینگے کہ کوئی رسالہ ان کا اچھے سے اچھا مضمون بھی شایع کرنے پر تیار نہ ہوگا +

اسد اللہ

جنوری کے نیرنگ خیال میں ایک افسانہ موتا کے عنوان سے صفحہ ۲۹ پر شایع ہوا ہے۔ مضمون نگار کا نام کاتب نے غلطی سے الہ الزماں لکھدیا۔ اور پھر پر بھی یہ غلطی صحیح لگانے سے بھول گیا۔ یہ نام دراصل اسد اللہ خاں تھا۔ ناظرین درست کرلیں +

سالنامہ کی تصویر واردات قلب

سالنامہ نیرنگ خیال میں ایک تصویر شایع ہوئی تھی جسمیں ٹلغرافی کے ایک کھمبے کے ساتھ ایک سرخ اور ایک سیاہ چہرہ ہے۔ نیچے ایک ہاتھ نکلا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ اس کا مطلب بیشتر ناظرین نہیں سمجھ سکے۔ اس تصویر کا نام وارداتِ قلب ہے۔ انسان کے دل پر خیالات بالکل ٹلغرافی کی طرح سے وارد ہوتے ہیں۔ اس لئے مصور نے تار کے کھمبے پر جو شکلیں بنائی ہیں وہ دل سے مشابہت رکھتی ہیں۔ دل میں بھی دو کیفیتیں ہیں۔ ایک سیاہ ایک سُرخ۔ ایک طرف سے رگوں میں سیاہ خون آتا ہے جو صاف ہوکر سُرخ ہوجاتا ہے۔ انسان کا چہرہ بھی جو بظاہر سیاہ ہے وہ بہ باطن سرخ (رُو) ہے اور وہ تخیل کی دنیا میں ساتویں آسمان تک پہنچ جاتا اور خیالات کو کاغذ پر قلمبند کرتا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جو بعض نظموں پر الہام و پیغام یا وارداتِ قلب کے عنوانات دیکھے جاتے ہیں یہ تصویر اُس کیفیت کی بہترین مظہر۔

شاہنامۂ اسلام

پنجاب کے فردوسی حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام لکھ کر تاریخ اسلام پر ایک احسان عظیم فرمایا ہے۔ شاہنامۂ اسلام کا دوسرا حصہ پہلا سے بھی زیادہ مقبول و معروف ہوگا۔ اور پبلک اسے ہاتھوں ہاتھ خریدیگی۔ حصہ دوم کی ایک نظم ہم سالنامہ میں شایع کرچکے ہیں۔ عنقریب اُس کے بعض دلچسپ حصوں کو بھی ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرینگے۔ تاکہ ناظرین اس عظیم الشان کام کا اندازہ کرسکیں جسے حضرت ابوالاثر کمال کاوش سے سرانجام دے رہے

حضرت چغتائی کا دوسرا کارنامہ

مرقع چغتائی دیوان غالب کی کامیابی اور پبلک کا اُسے ہاتھوں ہاتھ خریدنا نہ صرف چغتائی آرٹ کی کامیابی ہے۔ ملکہ پبلک میں حسن مذاق پیدا کرنے اور ملک میں اچھی اچھی مطبوعات شایع کرنے کے لئے میدان بنانے کا بھی: مرقع چغتائی کی حقیقی قدر و منزلت یورپ میں ہوئی ہے۔ کیونکہ انگلستان کے بیشتر مشہور رسایل میں جو آرٹ سے تعلق رکھتے تھے مرقع چغتائی پر بے انتہا اچھے ریویو شایع ہر اپنی آئندہ اشاعت میں پیش کرینگے۔ مرقع چغتائی کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس لئے ناظرین کو چاہئے کہ یہ کتاب سترہ روپے میں خریدلیں کیونکہ تیسرا ایڈیشن شایع ہو۔ کام ہے۔ بعض اصحاب پوچھتے ہیں کہ عملہ چغتائی صاحب آجکل کیا بیز تیار کررہے ہیں۔ اس کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلومات حاصل نہیں کہ آپ کوئی اور کتاب مصورہ انتظام کررہے ہیں۔ جس کی تصاویر سے کی جارہی ہیں۔ لیکن یہ ابھی تک سربستہ راز ہے کہ چغتائی کا دوسرا کارنامہ کیا ہوگا؟ لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ اُس کی کے نمونہ طلیعہ کے ماہرین میں ہلچل پڑجائیگی۔ اور چغتائی کو وہ بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگی جس کے وہ ہر طرح سے مستحق ہیں +



عمر خیام کی ایک رباعی — محبت کا پھول

عید نمبر کی تصاویر

عید نمبر کی تصاویر میں ایک تصویر "باغ عدن" کے نام سے شایع کی جا رہی ہے۔ یہ ایک یوریپین مصور کی فکر رسا کا نتیجہ ہے۔ ایک باغ ہے جسمیں حرن کھیل رہے ہیں۔ اور خادمائیں اور شہزادیاں اُنسے اپنا دل بہلا رہی ہیں۔ دوسری دو تصویریں عمر خیام کی رباعیوں پر ہیں۔ ایک سہ رنگی ہے اور ایک دو رنگی ہے۔ ایک سہ رنگی تصویر "دوسرے دل کی یاد میں" شایع کی جا رہی ہے۔ ایک حسینہ ایک درخت کے نیچے ملول و حزیں سر جھکائے کھڑی ہے۔ درخت پر دو دلوں کی تصویر کندہ ہے۔ دوسرے دل کی یاد میں یہ عورت غمگین و اداس نظر آ رہی ہے۔

میر ولی اللہ صاحب

یک رنگ تصاویر میں میر ولی اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی پلیڈر ایبٹ آباد کی تصویر بھی شایع کی جا رہی ہے۔ آپ نیرنگ خیال کے معاون خصوصی ہیں۔ اور ہمیشہ دو مختلف ناموں سے مضامین لکھتے رہے ہیں۔ آج ہم پہلی دفعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ نیرنگ خیال کے مشہور مزاحیہ مضامین جو "ادیب" کے قلم سے شایع ہوتے تھے وہ میر ولی اللہ صاحب کے زور قلم کا ہی نتیجہ تھے۔ اس نمبر میں بھی ایک مضمون آپکے قلم سے شایع ہو رہا ہے۔ میر صاحب ایک پختہ گو شاعر۔ ایک مشہور قانون داں اور ایک زبردست ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ناظرین نیرنگ خیال جو "ادیب" کی شخصیت سے آگاہ ہونے کے لئے بیقرار تھے وہ آج اُنکی تصویر دیکھکر بیحد محظوظ ہونگے

اعلیٰحضرت غازی نادر شاہ شاہ افغانستان

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں نے جو خدمات افغانستان کی سرانجام دیں اُن سے مہذب دنیا بخوبی واقف ہے لیکن خدا کو یہ منظور تھا کہ وہ اپنے پروگرام کو پایۂ تکمیل پہنچا سکتے۔ چنانچہ ان کی اصلاحات جلد بازی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔ اس کے بعد افغانستان میں طوائف الملوکی کا دور آیا۔ بچہ سقہ تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا جس سے تہذیب و تمدن کی بنیادیں تک ہل گئیں۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اب افغانستان کا محفوظ رہنا محال ہے لیکن اعلیٰحضرت غازی نادر شاہ جو بے سروسامانی کی حالت میں داخل ہوئے تھے آخر دم تک اپنی جان پر مصیبتیں جھیلتے ہوئے افغانستان کی اصلاح کے لئے سر بکف رہے۔ اللہ پاک کسی کی ہمت و کوشش رائیگاں نہیں کرتا اور نیک نیتی کا پھل ملتا ہے۔ چنانچہ کابل پھر فتح ہوا اور اعلیحضرت تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئے۔ تمام ملک کے سربرآوردہ اصحاب نے آپکو بادشاہ بنایا۔ جس وقت آپ تخت پر بیٹھے۔ اُس وقت خزانہ میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ فوج منتشر و برباد تھی۔ مدارس بند تھے۔ ڈاکوؤں اور بدمعاشوں نے زور پکڑ رکھا تھا۔ لیکن ان حالات میں بھی اعلیٰ حضرت کے تدبر اور حکمت عملی کے طفیل ملک کا نظم و نسق قایم ہو گیا اور ایک سال کے اندر اندر آپ چھوٹی بڑی تمام مشکلات پر غالب آ کر افغانستان کو امن و امان کے پرچم تلے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارے خیال میں ایران میں رضا شاہ پہلوی کو جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ان سے زیادہ مصائب کا مقابلہ اعلیٰحضرت غازی نادر شاہ کو کرنا پڑا ہے۔ اسلام کے اس فرزند وحید سے ہمیں توقع ہے کہ وہ افغانستان میں دین حق کے قیام اور تہذیب و تمدن کی نشر و اشاعت میں کامیاب ہونگے اور افغانستان اور افغانوں کو دنیا کی متمدن سلطنتوں کے برابر سر بلند بنا دینگے۔

اس نمبر میں اعلیٰ حضرت غازی نادر شاہ، اُن کے بھائی سردار ہاشم خاں وزیر اعظم اور ان کے تیسرے بھائی سردار ولی محمد خاں فاتح کابل کی تصویر د۔

جنگ نامۂ اسلام

ایک تصویر اُس آہنی خود کی ہے جسے فاتح قسطنطنیہ محمد ثانی نے زیب سر فرمایا تھا۔ جو جنگ نامۂ اسلام کے سلسلہ
ایک کتاب کا نام ہے جو دفتر نیرنگ خیال میں مرتب ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں دنیائے اسلام کا
میں ایک جھلک اسکی نمایاں ہے یعنی حضرت طالب الہ آبادی نے جنگ قسطنطنیہ کو منظوم کیا ہے۔ جس کی ایک تسطاس تمبرم
اس میں وہ جنگی سپرٹ برابر جھلک رہی ہے جو ہم ان جنگی نظموں میں چاہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ جنگ نامۂ اسلا
شعراسے اس کے مختلف حصے منظوم کرائے جائیں۔ ہم تمام شعرا کو طبع آزمائی کی دعوت دیتے ہیں۔
جو صاحب بھی کوئی جنگ منظوم کرنا چاہیں۔ اوّل وہ ہم سے خط و کتابت کریں۔

سالنامۂ نیرنگ خیال قیمتاً ملتا ہے

ہم محصول ڈاک لیکن بعض نے خریدار جو
یہ سالنامہ کیسے مفت د
زائد

بھی عام رسایل سے بہتر اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ نیرنگ خیال کے جن خریداروں نے ابھی تک سالنامہ طلب نہیں فرمایا اُنہیں جلد وی پی منگوا لینا چاہئے ورنہ بعد میں ایک کاپی بھی باقی نہ بچیگی +

سالنامہ ۱۹۳۰ و ۳۱ء

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۰ء کی جسقدر جلدیں دفتر میں باقی ہیں اُن کی قیمت بڑھا کر دو روپے کر دی گئی ہے۔ تازہ سالنامہ ۱۹۳۱ء کی تین سو کاپیاں باقی ہیں جو عہ کے حساب سے اس وقت مل سکتی ہیں۔ بعد میں ان کی قیمت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ ۱۹۳۰ء کا سالنامہ مجلد عہ محصولڈاک ۱۰ مرکل تین روپیہ ہیں اور ۱۹۳۱ء کا سالنامہ مجلد عہ محصولڈاک ۱۰ مرکل عہ میں مل سکتا ہے۔ جن اصحاب کو مجلد درکار ہوں وہ مجلد طلب کر سکتے ہیں۔ اگر ۱۹۳۰ و ۳۱ء کو یکجا مجلد کرانے کا آرڈر دیا جائے تو اس صورت میں بجائے عہ کے صہ روپے میں دونوں ارسال خدمت ہو سکتے ہیں۔ جلد طلب فرمائیے +

ہمعصر روزنامہ زمیندار اور نیرنگ خیال

معزز ہمعصر زمیندار نے سالنامۂ نیرنگ خیال پر جو ریویو لکھا ہے اُس میں اردو کے عروج و ارتقا کے جدید دور کا افتتاح کرنے کا سہرا نیرنگ خیال کے سر باندھا ہے۔ اور صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ علم و ادب کی اشاعت، اردو کی ترقی اور مشرقی آرٹ کی ترویج کے سلسلہ میں نیرنگ خیال کا کوئی مثیل نظر نہیں آتا۔ اس تنقید کا ہر لفظ غور سے پڑھنے کے قابل ہے +

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۱ء

"نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان میں اردو کے عروج و ارتقا کے جدید دور کا افتتاح کرنے والوں میں حکیم یوسف حسن اور ان کے رسالہ نیرنگ خیال کا نام یقیناً سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ نیرنگ خیال نے اپنی زندگی کے سات سال کی قلیل مدت میں علم و ادب کی اشاعت، اردو کی ترقی، اور مشرقی آرٹ کی ترویج کے سلسلے میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں اس کا کوئی مثیل نظر نہیں آتا۔ مصر کے شیخ صحافت المقتطف کے مدیر المقطم کے بانی اور عربی صحافت کے جدید دور کا افتتاح کرنے والے آنجہانی ڈاکٹر یعقوب صروف نے لکھا تھا کہ "علم و ادب کی عام ترویج و اشاعت کے لئے ضروری ہے کہ رسایل اپنے میں تنوع اور رنگینی پیدا کریں۔ اور خواص کے ساتھ عوام کی دلچسپی کو بھی ملحوظ رکھیں۔" جو حضرات نیرنگ خیال کا ابتدا سے مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ اس امر میں یقیناً ہمارے ہم خیال ہوں گے کہ حکیم یوسف حسن نے بھی ہمیشہ اسی نظریہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور نیرنگ خیال کو بوقلموں دلچسپیوں کا مرقع بنا کر ایک بہت بڑے طبقہ کو ادبیات کے مطالعہ کی چاٹ لگا دی ہے۔ اور ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی ہے جسمیں اب اردو کے ہر ادبی رسالہ کی کامیابی کا امکان پیدا ہو گیا ہے +

اردو کے رسایل میں خاص نمبروں اور سالنامہ کی اشاعت کی بدعت جاری کرنے کا سہرا بھی حکیم یوسف حسن ہی کے سر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں بھی نیرنگ خیال کا ابتک کوئی مقابلہ نہیں کر سکا۔ اور کوئی مقابلہ کرے تو کیونکر خود نیرنگ خیال کا ہر خاص نمبر اپنے پچھلے نمبروں پر فائق ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ سالنامہ ۱۹۳۱ء جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ پچھلے سالناموں سے ہر بات میں بڑھا ہوا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اسے یورپ کے کسی بہتر سے بہتر ...امہ کے مقابلہ میں فخر و تفوق کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ درجنوں تصاویر، مشہور ترین ارباب قلم کے افسانے۔ ڈراما۔ نظمیں۔ غزلیں۔ رباعیات۔ بیسیوں علمی ادبی ...شاندار مجموعہ اگر یورپ میں شایع ہوتا تو اس کی قیمت پانچ چھ روپے سے کم نہیں ہوتی۔ مگر حیرت ہے کہ حکیم صاحب یہ سالنامہ صرف ڈیڑھ ...، تو صرف اس کا چاند اور سورج سے زیادہ حسین و درخشندہ ٹائٹل بھی ارزاں ہے۔ ہم حکیم صاحب کو اُن کی وقیع ... ہیں اور قارئین زمیندار سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ علم و ادب کی یہ گرانقدر تاریخی یادگار ...خدمات کی داد دیں۔ سالنامہ ۱۹۳۱ء کی قیمت عہ ہے۔ اور منیجر صاحب رسالہ

...کا خاتمہ سمجھنا چاہئے اور صرف نیرنگ خیال کے ناظرین
...یہ کا خاص نمبر ہے اس لئے امید
آپ اس مجموعہ کو پسند فرماتے
...تصاویر کو مزین ہوگا

جنگ نامۂ اسلام

فتح قسطنطنیہ

آمد آمد محمدؐ

[دفترِ نیرنگِ خیال میں ایک کتاب جنگ نامۂ اسلام کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔ جس میں دنیائے اسلام کی مشہور ترین لڑائیاں نظم کی صورت میں شایع کی جائینگی۔ فتح قسطنطنیہ کی مشہور ترین جنگ کو حضرت **طالب الٰہ آبادی** نے نظم کا جامہ پہنایا ہے جس کا ایک حصہ عید نمبر کی زینت ہے۔ جنگ نامۂ اسلام عنقریب شایع کیا جائیگا۔ جو اُمید ہو کہ پبلک میں بیحد مقبول ہوگا

ایڈیٹر]

آج پھر سیفِ قلم جنگ پر آمادہ ہے
روکشِ دامنِ مقتل ورقِ سادہ ہے

ساقیا آج ذرا بھر کے چھکا دے ہم کو
جوشِ جرأت سے ہیں مدہوش پلا دے ہم کو

میکدہ میں ہے بہت زور سے اک سنّاٹا
جام ٹکرائیں تو شمشیر کا ہو جھنّاٹا

تودۂ گرد بنے منزلِ قسطنطنیہ
غیرتِ برقِ تپاں ہو دلِ قسطنطنیہ

ہر ورق معرکۂ رزم کی تصویر بنے
ہر سطر جنگ کی چلتی ہوئی شمشیر بنے

آج پھر فوج ہے سلطان محمد کی رواں
بادۂ جوش سے سرشار ہے ایک ایک جواں

گونج جاتے ہیں جو تکبیر کے نعرے پیہم
ڈر سے ہو جاتا ہے شیرازۂ گیتی برہم

افسرِ فوج جو ضیغم ہے وہ ہے ابنِ مراد
اسی رستم کے تو پہلو میں ہے قلبِ فولاد

سر پہ لہراتے ہیں رہ رہ کے ہلالی جھنڈے
اوجِ اسلام دکھاتے ہیں جلالی جھنڈے

بید لرزاں ہے اُدھر پیکرِ قسطنطنیہ
شیرِ قالیں ہے مگر قیصرِ قسطنطنیہ

بانیٔ شہر کی اولاد میں ہے سیزدہم
ڈر سے سلطان محمدؐ کے مگر ہوش ہیں گم

آمد آمد کا جو شہرہ ہے تو گھبراتا ہے
سُن کے اخبار وہ بے موت مرا جاتا ہے

حال سلطان کا سُن سُن کے لرز جاتا ہے
شکلِ مخبر نظر آتی ہے تو تھرّاتا ہے

ایک مخبر نے ابھی آ کے سنائی ہے خبر
روز بڑھتے ہی چلے آتے ہیں جرّار ادھر

یوں تو فوج ان کی نہیں بادِ صبا آتی ہے
ٹوک دیتے ہیں جو شیروں کو قضا آتی ہے

دھجّیاں لشکرِ دشمن کی اڑا دیتے ہیں
صف شکن اینٹ سے بس اینٹ بجا دیتے ہیں

یہ خبر سن کے ڈرا خوف سے تھرّانے لگا
صورتِ افعیِ پُر پیچ وہ بل کھانے لگا

عصر کے بعد ہی وہ برج پہ آ کر بیٹھا
تھے سبھی ساتھ اعزّا نقبا اور وزرا

منتظر آمدِ سلطان محمد کا تھا
موت تھی دور مگر خون گھٹا جاتا تھا

چرخ پر جب شفقِ شام کی چادر پھیلی
افقِ شرق پہ گھنگھور گھٹا سی چھائی

سرخ آندھی سی اٹھی تھی تتقِ گرد نہ تھا
دھندلا دھندلا سی مقتل کا کھنچا تھا نقشا

نوکیں نیزوں کی جو رہ رہ کے چمک جاتی تھیں
آنکھیں ہر صاحبِ مردم کی جھپک جاتی تھیں

جلوے اپنے جو دکھاتے تھے ہلالی پنجے
دلِ دشمن کو مسلتے تھے خیالی پنجے

رفتہ رفتہ جو قریب آ کے چھٹی وہ آندھی
سرخ بجلی کی نگاہوں میں گھٹا کوند گئی

اسلحے جسم پہ ہر بار تڑپ جاتے تھے
سپرِ مہر کو بے ساختہ تڑپاتے تھے

لہریں لیتا ہوا لشکر تھا کہ بڑھتا آیا
یا امنڈتا ہوا فولاد کا دریا آیا

توپخانہ جو دکھائی دیا جرّاروں میں
ایک لرزہ سا پڑا شہر کی دیواروں میں

جب قریب آ کے ہلال اور ستارے چمکے
برقِ خاطف کے نظر سوز شرارے چمکے

سبز علموں کے ہلالوں سے صلیبیں کانپیں
اخترِ بخت بھی کانپے جو جبینیں کانپیں

متصل آ کے جوانوں نے علم گاڑ دیے
آج تک رہ گئے قائم وہ قدم گاڑ دیے

محاصرہ اور نماز

عیسوی چودہ سو ترپن تھی کہ سلطاں پہنچے ۱۴۵۳
دینِ اسلام کے پُر جوش نگہباں پہنچے

مورچے بیٹھ گئے شہر کے در بند ہوئے
جنگ سے پہلے ہی نامرد نظر بند ہوئے

عصر کا وقت تھا جب حصر کا آغاز ہوا
مستعدِ جنگ پہ ہر مسلم جانباز ہوا

آئی اپریل کی چھبیس کہ آفت آئی
گھر گئے رومیِ بدبخت قیامت آئی

خیمے گاڑے گئے جرّاروں نے کمریں کھولیں
جھوم کر شیروں نے تلواریں سنبھالیں تولیں

قلب میں شاہ کا بیچوبہ گڑا بدر مثال
جاں نثاروں کی پڑیں راوٹیاں شکلِ ہلال

اپنے بستر سے سحر ہوتے ہی جرّار اٹھے
یا علیؑ کہتے ہوئے ٹیک کے تلوار اٹھے

اسی زنجیر کے حلقے میں تھا کل بندرگاہ
کثرت ایسی تھی کہ اُس پار نہ جاتی تھی نگاہ

بحر سے ترکوں کے حملے کی نہ تھی کوئی سبیل
دُہری دیواریں تھیں خشکی میں ادھر چھ چھ میل

گرد دیواروں کے تھیں خندقیں سو فٹ گہری
جیسے دل جسم میں محفوظ تھے ایسے شہری

بندشوں سے نہ ہوا کچھ بھی خطر سلطاں کو
حق سے ہاتھ آیا تھا رستم کا جگر سلطاں کو

نعرے تکبیر کے ہونے لگے میداں میں بلند
سینے منقل ہوئے ڈر سے دلِ دشمن تھے سپند

سر بکف مرنے پہ ہر مسلمِ جانباز ہوا
تیر چلنے لگے اور جنگ کا آغاز ہوا

پہلے دن آ گئے خندق میں اُتر کر رومی
اخترِ بخت نے دکھلائی سراسر شومی

خود بخود آ گئے وہ کھچ کے قضا کے مُنہ میں
دہنِ گور میں تھے اور بلا کے مُنہ میں

چھوٹ سکتا ہے بھلا صید شکنجے سے کہاں
بچ کے جاتے ہیں ہرن شیر کے پنجے سے کہاں

تیر مسلم کے نہ چلتے تھے قضا چلتی تھی
یا کڑکتی ہوئی ساون کی گھٹا چلتی تھی

صاف و بے عیب تھی ترکوں کی قدر اندازی
جیسے پتے جھڑیں یوں ہوتی تھی سر اندازی

جب یہ حالت تھی تو دشمن کے قدم کیا رُکتے
موت کے سامنے بانیٔ ستم کیا رُکتے

فوج اسلام ادھر جوش میں آ کر جھومی
پیچھے ہٹنے لگے اُس سمت دبک کر رومی

پھر تو خندق میں قیامت کی ہوئی اک ہلچل
بھاگنے والوں میں بڑھ بڑھ کی جگہ تھا چل چل

ہر لعیں سایہ کو بھی اپنے عدو جانتا تھا
باپ بیٹے کو اُجالے میں نہ پہچانتا تھا

بھاگے جاتے تھے عجب شان سے مشاق سوار
اُن کا منہ غرب کو تھا شرق کو روئے رہوار

دُمچیاں کھینچتے تھے اور سمجھتے تھے لگام
سوجھتا ہی نہ تھا وحشت میں کچھ آغاز انجام

پس کے برباد ہوئے سیکڑوں ٹکرا کے مرے
جوشِ وحشت میں غرض ٹھوکریں کھا کھا کے مرے

بھاگنے میں وہ سپاہی تھے غضب کے ہشیار
گرتے پڑتے ہوئے ہٹتے ہی گئے وہ جرار

دم لیا شہر کی دیوار کے پیچھے جا کر
بڑھ گیا جوشِ شجاعت پسِ پردہ آ کر

افسروں پر تو پیادوں نے کیا گل پاشی
ایک کو ایک نے بڑھ بڑھ کے دیا شاباشی

جم کے حملے کئے ترکوں نے کئی بار اُدھر
پسِ دیوار جو تھے اُن پہ ہوا کچھ نہ اثر

گولیاں کھاتے تھے مسلم بھی ادھر ہنس ہنس کر
پتھر آتے تھے تو کر دیتے تھے سینے کو سپر

جوشِ جرأت میں وہ جانباز بڑھے جاتے تھے
موت کے منہ پہ سرافراز چڑھے جاتے تھے

ظہر کا وقت جب آیا تو نمازی پلٹے
سن کے آوازِ اذاں کھیت سے غازی پلٹے

باقی آئندہ نمبر میں

(خاص) طالب الہ آبادی

علم سبز کے جس وقت پھریرے کھولے — صاف ظاہر ہوا طاؤس نے شہپر تولے
ہاتھ منہ دھونے لگے لوگ وضو کرنے لگے — رنگ تصویرِ عبادت میں جری بھرنے لگے
خوش گلو چند مؤذن جو چڑھے ٹیلوں پر — بلبلِ قدس چہکنے لگے گلدستوں پر
ان کی تکبیر کے نعروں سے بیاباں گونجے — صوفیہ ہلنے لگا شیرِ نیستاں گونجے
جب اذاں ختم ہوئی ہو گئے غازی یکجا — بس امام آگے تھا اور سب تھے نمازی یکجا
دور سے آئے تھے وہ رات کے جاگے ہونگے — ابھی پیچھے ہیں لڑائی میں سب آگے ہونگے"
اپنی تحقیق بتاتی ہے کہ تھے ساٹھ ہزار — پر کئی لاکھ پہ بھاری تھے وہ یکتا جرار
منقسم ہو گئے اب ساٹھ صفوں میں دیندار — ایک اک صف میں کھڑے ہو گئے ایک اک ہزار
شانِ اسلام واخوت کی نظر آنے لگی — عرش تک ملتِ بیضا کی ضیا جانے لگی
تھے کھڑے پہلوئے حاکم میں برابر محکوم — نہ تو خادم تھا کوئی اور نہ کوئی مخدوم
شمعِ اسلام کے جانباز وہ پروانے تھے — کیوں نہ ہو ایک ہی تسبیح کے سب دانے تھے
جلوہ افشانیٔ اخلاص تھی باحسن وجمال — جاہِ اسلام ہویدا تھا بقول اقبال
"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز"
میں کہاں اور کہاں انکی نمازوں کی ثنا — "سمع اللہ وہ کہتے تھے خدا سنتا تھا"
صاف تھی ان کی جو قرأت تو اذاں تھی تہلیل — بے ریا انکی دعائیں تھیں تو خالص تحلیل
یہ قدم وہ ہیں جہاں کھیت میں پڑ جاتے ہیں — مثلِ دیوارِ سکندر وہیں گڑ جاتے ہیں
سر رہے دوش پہ یا تن سے اڑے وقتِ جدال — پانوں ایک انچ سرک جائیں نہیں ہے یہ مجال
ہے جبیں خاک پہ اسوقت تو دینداروں کی — سجدے کرتے ہیں یہی چھانوں میں تلواروں کی

آغازِ جنگ

تھی بس اک نام کی سلطان کی بحری طاقت — رسدی اور ندی کشتیوں کی تھی کثرت
موقع موقع سے رسد ان سے پہنچ سکتی تھی — وقت پڑنے پہ مدد ان سے پہنچ سکتی تھی
بیڑا قیصر کا قوی اور مرتب تھا تمام — جتنا ہو سکتا تھا موجود تھا سب استحکام
بحرِ اسود سے جو آتا تھا تجارت کا جہاز — اپنے بیڑے میں ملا لیتا تھا وہ حیلہ ساز
سامنے بیڑے کے فولاد کی تھی اک زنجیر — جو کہ تھی سدِ سکندر کی بعینہٖ تصویر

ہجرت

مکّے کا آقا، مکّے کا والی، مکّے سے جانے والا ہے
ابرِ سیاہِ رنج و الم پھر مکّے پہ چھانے والا ہے
نادان بھی ہیں، جاہل بھی ہیں، فاسق بھی ہیں، ظالم بھی
کٹ نہ مریں یہ سارے قبیلے کون بچانے والا ہے
مکّے کی گلیوں کے یہ مسافر پوچھیںگے کس سے راہ کدھر ہے
تو ہی تو بھولے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے والا ہے
دکھ ہوگا تو کس سے کہیں گے دکھ کی کہانی کون سنے گا
تو ہی اکیلا اس بستی میں رنج بٹانے والا ہے
دنیا بھر کو آج مدینے رشک نہ ہو کیونکر تجھ پر
وہ جو دنیا بھر کے لئے ہے تجھ میں آنے والا ہے

(خاص) حامد اللہ افسر

برق اور تاریکی

چمک اے برق ہاں اک بار پھر تو بادمِ تازہ
جھپک سے تیری تاریکی کا ہوجاتا ہے اندازہ
نظر پر ہوگئیں قصرِ الم کی ظلمتیں روشن
خوشی کی اک جھلک کے واسطے کھلتے ہی دروازہ

(خاص) حامد اللہ افسر

رباعیات آسی

از حضرت مولنا عبدالباری صاحب آسی

گو شوق نے کر دیا ہے حالت کو تباہ   پھر بھی وہ کہہ رہا ہے ہم مشتِ گیاہ
دیدار کی احتیاج اوروں کو ہے   کافی ہے ہمارے واسطے ایک نگاہ

سامان طرب فزا مہیا کر کے   دنیا سے صفائے دل کا دعوا کر کے
وحدت کو بنا لیا ہے کثرت ہم نے   آئینہ میں اپنے عکس پیدا کر کے

پھر چاک دلِ حزیں کو سینا نہ پڑے   پھر خونِ جگر کسی کو پینا نہ پڑے
اُس حشر کی جستجو ہے مجھ کو آسی   مرنے والوں کو جس میں جینا نہ پڑے

بیکار ہے وہم قرب ساحل کا سرور   بیکار ہے عالم مسرت کا ظہور
دریائے بلا میں جوشِ طوفاں نہ سہی   یہ دل ہے اگر تو ناؤ ڈوبے گی ضرور

پھیلا ہوا سوز اک ترانے کا ہے   دیکھا ہوا باب اک فسانے کا ہے
اے اہلِ زمیں فلک کو نہ کہو   اُلٹا ہوا اک ورق زمانے کا ہے

مستی ہو شباب ہو تو سب کچھ ہے وہی   مطرب ہو رباب ہو تو سب کچھ ہے وہی
یہ کچھ بھی نہ ہو اگر میسر آسی   ساقی ہو شراب ہو تو سب کچھ ہے وہی

غالب کا غیر مطبوعہ کلام

مرسلہ حضرت آسی

غزل

نہ پوچھ حال اس انداز سے عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ

"مجھے بھی تاکہ تمنّا سے ہو نہ مایوسی ✓
ملو رقیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ"

نہ ہو بہرزہ روادار سعئ بیہودہ
کہ دور عیش ہے مانا خیال و خواب کے ساتھ

بہر نمط غمِ دل باعثِ مسرّت ہے
نموئے حسرتِ دل ہے ترے شباب کے ساتھ

لگاؤ اُس کا ہے باعث قیام ہستی کا
ہوا کو لاگ بھی ہے اک مگر حباب کے ساتھ

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب
جو جاگتے کو ملادیوے آکے خواب کے ساتھ

(خاص)

چاندنی رات

حامد اللہ افسر کی ایک نظم

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی
چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی

دل کی دھڑکن گویا دل کو چھوڑ کر
منتشر ہے چاندنی کے فرش پر

کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں
جیسے کھو جائے مسافر راہ میں

چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے
حسن کا شاید پریشان خواب ہے

چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے
نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے

یہ سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال
یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال

خامشی جو ہمرہِ مہتاب ہے
بولنے کے واسطے بیتاب ہے

چاندنی کا حسن اِس کے دم سے ہے
اور محبت اس کو افسر ہم سے ہے

(خاص) افسر

نذرِ عقیدت

محمد علی کی یاد میں

اے کہ تو تھا چمن آرائے وطن جانِ وطن
تیرے ہی دم سے تھا سرسبز گلستانِ وطن

اے محمد علی! اے شمعِ شبستانِ وطن
اُٹھ گئی ساتھ تیرے رونقِ ایوانِ وطن

اے شہیدِ وطن اے روحِ وطن جانِ وطن
ذات سے تیری تھے وابستہ صد ارمانِ وطن

قوم کے واسطے کی جان بھی قرباں تو نے
ہو گیا آج سے تو فخرِ شہیدانِ وطن

رہبرِ کامل اے پیغامبرِ حریت
تیری تعلیم کا ہر لفظ ہے ایمانِ وطن

کوئی ثانی نہیں تدبیر و سیاست میں ترا
کون تھا تجھ سے جو بڑھ کر تھا نگہبانِ وطن

کون وطن آج چلا دنیا سے
ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے گریبانِ وطن

دین و ملت کے فدائی اے خوش انجام حیات
موت ہے تیری ترے واسطے پیغامِ حیات

(خاص) سید شبیر احمد فرخ آبادی

نشاطِ عید

اثر: جناب منظر صدیقی اکبر آبادی - مدیر شاعر آگرہ

(۱)

ہر روز نئی کشید ہوتی ہی رہی روز اک بطِ مے شہید ہوتی ہی رہی
ہر جام ہلالِ عید بنتا ہی رہا روزوں میں بھی اپنی عید ہوتی ہی رہی

(۲)

قسمت سے نصیب دید ہو جاتی ہے سرسبز مری اُمید ہو جاتی ہے
تم جانتے ہو آتے ہیں محرّم گھر میں تم آتے ہو میری عید ہو جاتی ہے

(۳)

تم آ گئے اب کوئی طرب ہو کہ نہ ہو ظاہر کوئی عشرت کا سبب ہو کہ نہ ہو
رویت ہے ہلال کی جمالِ روشن ہو جائیگی عید، چاند اب ہو کہ نہ ہو

(۴)

اک سال ہوا شراب ڈھالی نہ گئی بھولے سے بھی ہونٹھ تک پیالی نہ گئی
تشریف وہ لائے اُن کو تکلیف ہوئی میں خوش ہوں کہ میری عید خالی نہ گئی

(۵)

جو ذریعۂ التفاتِ جاناں نہ ہوا وہ شخص کبھی فائزِ ارماں نہ ہوا
وہ خاک حقیقتِ وفا سمجھے گا جو عید کے دن بھی تجھ پہ قرباں نہ ہوا

(۶)

روزے پہنچے رسید آئی ساقی پیمانہ بکف امید آئی ساقی
میخانے کے در کھول دے پی - اور پلا برخیز کہ صبح عید آئی ساقی

منظر

(خاص)

تبسم عید

ماہِ نو بر فلک نمایاں شدہ — گوشۂ قلب زار تاباں شد
ذرہ ذرہ ز نور رخشاں شد — قطرہ قطرہ مہ فروزاں شد
گوشہ گوشہ جمیل و تاباں شد — چپّہ چپّہ چنیں زر افشاں شد
سینہ صیقل شدہ ز تاب جمال — ظلمت قلب نور عرفاں شد

(۲)

غنچۂ صبح عید خنداں شد — بلبل روح نغمہ افشاں شد
گل امید می چکد غنچہ — چوں نسیم سحر خراماں شد
بر سر موج کاکل سنبل — گہر شبنم ز نار رقصاں شد
بر جبین سمین سیمیں رخ — تاب ماہ طرب فروزاں شد
موج صد پیچ و تاب فرمائد — یا خمش ناز عشق پیچاں شد
ماہ در آب عکس می ریزد — تیغ در دست نار لرزاں شد
بلبلے نغمۂ سرائد چوں — کہ نگار شگوفہ رقصاں شد
بوئے گل عطر پاش شد بحر — کہ مشام شمیم بیزاں شد
آفتاب طرب طلوع شدہ — ذرہ ذرہ سرور افشاں شد
عشرت عید در جہاں آمد — برگ نخل مراد رقصاں شد
صائم تشنہ لب چنیں سیراب — کہ لبش آبجوئے حیواں شد
ہر لب مسلم جہاں شیریں — عید شیریں کہ شکرستاں شد
طفل شوخ و شریر می رقصد — جوشش عشرت بہ قلب ہیجاں شد
نو عروس حسیں بہار فروز — لب لعلش تبسم افشاں شد
صد جواناں بہ قہقہہ ریزند — جوشش خندہ بہ عام ارزاں شد
یک گروہ طرب بصد عشرت — سوئے مسجد چنیں خراماں شد
کہ ز ہر نقش پا چکد خندہ — کہ غبار رہش گلستاں شد
کہ ز طفلاں فضا تبسم خیز — کہ ز پیراں جہاں درخشاں شد
چوں جواناں قدوم مست زدند — ذرۂ گرد راہ رقصاں شدہ
رنگ پوشاک ہائے گوناگوں — حسن قوس و قزح نمایاں شد
شور و غوغا چنیں بلند شدہ — شور محشر تکبیر افشاں شد
ایں جمالہ کہ بلبل ہندی — با مسرّت چنیں غزلخواں شد
پیش آدم گل مبارک باد — غنچۂ صبح عید خنداں شد

(خاص)

بلقیس جمال
بریلوی

"صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ"

(از جناب لالہ امرچند صاحب قیس)

اے کہ ترا وجود ہے وجہِ قرارِ دو جہاں   اے کہ تری نمود ہے لطفِ خدائے لامکاں
اے ترے درود پر سجدہ گزار آسماں   اے کہ ترا درود ہے وردِ زبانِ انس و جاں

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

تیرے ہی دم قدم سے ہے زینتِ بزمِ کائنات   کون و مکاں ہے نور سے آئینۂ تجلیات
دہر میں سب سے تو بڑا تجھ سے بڑی خدا کی ذات   بھیج رہا خدا بھی ہے تجھ پہ درود اور صلوٰۃ

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

آنکھ میں تیری مستتر شانِ جلالِ عزوجل   رُخ پہ ترے ضیا فگن نورِ جمالِ لم یزل
فرق پہ تیرے جلوہ ریز افسرِ خاتمِ رسل   قلب میں تیرے موجزن بحرِ فضیلتِ عمل

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

جلوہ فگن خدا کا نور تیری جبینِ ناز پر   جُھک گئے جسکے روبرو دیکھ کے کافروں کے سر
تو ہی خدا کا آخری دہر میں ہے پیامبر   تیرا عمل خدا کا حکم تیرا وطن خدا کا گھر

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

آج ہمارے حال پر لطف کی اک نظر بھی ہو   یعنی یہی شبِ الم پیشِ رُو سحر بھی ہو
تیرا غلام نعمتِ خاص سے بہرہ ور بھی ہو   حلقہ بگوشِ مصطفیٰ حاملِ مال و زر بھی ہو

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

امرچند قیس

تیرا ہی آسرا ہے

اے رہنمائے اعظم　　پیغمبرِ معظم
سب کے دلوں کے محرم　　تو خوب جانتا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

ہے پاسبان دشمن　　ہر مہربان دشمن
سارا جہان دشمن　　دل تجھ کو ڈھونڈھتا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

ادبار سے بچا لے　　افکار سے چھڑا لے
اے دو جہان والے　　تو جانِ مدعا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

آفات اور بلائیں　　ڈر ہے کہ کھا نہ جائیں
دکھڑا کسے سنائیں　　دل تجھ کو ڈھونڈھتا ہے
تیرا ہی آسرا ہے!

شیام سندر لال باصر

رباعیات

(۱)

ملتا ہی نہیں قرار توبہ توبہ　　اے ہستیٔ مستعار توبہ توبہ
گردابِ بلا ہے اور کشتی اپنی　　اے رحمتِ کردگار توبہ توبہ

(۲)

چشمِ تر اشکِ خوں نہ روتی یارب　　دل کی کھیتی میں غم نہ بوتی یارب
کیوں نہ آرام سے گزرتی اپنی　　تیری رحمت جو ساتھ ہوتی یارب

(۳)

ہمدردِ دلِ زار کہاں سے لاؤں　　ہر دکھ کا خریدار کہاں سے لاؤں
ہو نیکو تیری بزم میں لاکھوں ہی پر　　میں اپنا طرفدار کہاں سے لاؤں

(۴)

خوں ہو گیا دل عشق میں روتے روتے　　ہم تھک گئے غم سینے میں بوتے بوتے
کر اب تو کرم اپنے گدا پر یارب　　تقدیر بھی تنگ آ گئی سوتے سوتے

(خاص)　　افتخار ملک

رسالہ ادبی دنیا کی ترقی معکوس

از احمد حسین

اگرچہ نیرنگ خیال اور ادبی دنیا میں باہم کسی قسم کی چپقلش نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ امید رکھنا کہ ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال اس مضمون کو شایع فرمادیں گے ایک امید موہوم ہے لیکن اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ اردو کی ترقی اور اردو رسایل کے بقا اور قیام کے لئے اگر اس قسم کا مضمون لکھا جائے جس سے ایسے حقایق کا انکشاف ہو جس سے مدیران رسایل کو فائدہ پہنچ سکے تو ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال سطور ذیل کو شایع کرنے میں کسی قسم کی خرابی محسوس نہیں کریں گے +

میں ادبی دنیا کا بغور مطالعہ کرنے والا ہوں۔ اس کے پہلے نمبر سے لیکر آجتک کے تمام نمبر مطالعہ کرچکا ہوں۔ اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ رسالہ ادبی دنیا ترقی معکوس کر رہا ہے +

سب سے اوّل ادبی دنیا کے پہلے نمبر میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا وہ ایک ادبی رسالہ کے لئے کسی حالت میں بھی موزوں قرار نہیں دی جاسکتی۔ ایک ہندو ہندو رہکر اور ایک مسلمان مسلمان رہکر علم و ادب کی خدمت بھی کرسکتا ہے اور مادرِ وطن کی خدمتگذاری بھی۔ لیکن اس قسم کا وعظ رسایل میں کرنا جس سے مذہب سیکنڈری حیثیت میں رہ جائے مذہب پرست ہندوستانیوں کو اپیل نہیں کرسکتا۔ اس کے ساتھ فرہنگ شامل کرکے جو مٹی پلید کی گئی تھی وہ بھی میرے خیال میں ایک بے معنی حرکت تھی جو خدا کا شکر ہے کہ ادبی دنیا نے اب چھوڑ دی ہے۔ لیکن ادبی دنیا کا انقلابی پروگرام اور اس کے بلند بانگ دعاوی نقش بر آب ثابت ہو رہے ہیں۔ سال سوا سال کی قلیل مدت میں چندہ کا تین روپیہ بارہ آنہ سے بڑھاکر محصول سمیت پانچ کردینا اور مضامین کے ایکسو صفحات کا گھٹاتے گھٹاتے ۶۵ تک لے آنا۔ رسالہ کی ترقی معکوس کو ظاہر کرتا ہے۔ چندہ بڑھانے کے ساتھ ضرورت تھی کہ رسالہ کے حجم اور ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اضافہ ہوتا لیکن برعکس اس کے مضامین کا صرف ۶۵ صفحات میں رہ جانا کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ کاغذ جو پہلے ۲۴ پونڈ کا ہوتا تھا اب صرف ۲۰ پونڈ رہگیا ہے ٹائیٹل اور تصاویر کا کاغذ بھی نسبتاً ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے رسالہ ایک آنہ کے ٹکٹ میں آتا تھا۔ اب صرف دو پیسے کے ٹکٹ میں موصول ہوتا ہے۔ پہلے اشتہارات کے خلاف نوٹ لکھے جاتے تھے۔ اب ایسے اشتہارات شایع کئے جاتے ہیں جن میں جریان احتلام سرعت اور تقوی مبہی اور قوت مردمی کی ادویات کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلے سال میں قریباً نو دس ہزار روپے خسارہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور اب جنوری نمبر میں موتا نا حال و قال کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ رسالہ ادبی دنیا **موجودہ صورت** میں پانسو روپے ماہوار کا خسارہ اٹھا رہا ہے۔ یہ پانسو روپے ماہوار کا خسارہ **موجودہ صورت** کی طرف خاص طور پر توجہ دلانے والا ہے جس کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں۔ یعنی سو صفحوں سے ۶۵ صفحوں تک مضامین کو گھٹا دینا محصول سمیت پانچروپے چندہ بڑھا لینا اور ڈاک خرچ میں نصف کے برابر کمی کرلینے کاغذ ۲۴ پونڈ سے کم کرکے ۲۰ پونڈ کردینے اور اشتہارات چھاپنے کے باوجود اتنا خسارہ ابھی باقی ہے۔ اللہ پاک اپنا رحم کرے اور رسالہ ادبی دنیا کو قایم و برقرار رکھے۔ چھ ہزار روپیہ سالانہ کا خسارہ **موجودہ صورت** میں بھی تشویش سے خالی نہیں میں چاہتا ہوں کہ رسالہ ادبی دنیا ہمیشہ زندہ رہے۔ اس لئے مدیر رسالہ ادبی دنیا کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ حجم وغیرہ میں اتنی اور کمی پیدا کرلیں جس سے یہ پانچسو روپے ماہوار کا خسارہ اٹھانا پڑے اور رسالہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیائے ادب کی اچھی بُری خدمت بجالاتا رہے۔

مدیر رسالہ ادبی دنیا میری اس عرضداشت پر بہت ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن انہیں ایک تو اپنے بلند بانگ دعاوی پر غور کرنا چاہئے اور دوسرے مارکٹ میں رسایل کا جو حشر ہو رہا ہے اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ مجھے ایک عزیز نے ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ پشاور کا مشہور رسالہ ادیب پورے ایک سال کے بعد بند ہوگیا ہے صوبہ سرحد کے صدر مقام سے ایک ادبی رسالہ کا جاری ہونا کسقدر ہمت افزا تھا۔ ادیب کتنا اچھا شایع ہو رہا تھا۔ اس کے اعلانات کی کثرت۔ اخبارات میں پروپگنڈا چار چار خاص نمبروں کی اشاعت۔ سب کچھ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے ساتھ ساتھ عدیم النظیر الوالعزمی کو ظاہر کرنے والے تھے۔ لیکن جو قدم انہوں نے عجلت میں اٹھایا اور مارکٹ میں داخل ہوتے ہی مقابلہ کی ٹھانی اس سے خدا جانے کتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ کہ آج بزم ادب ادیب کی رونق سے خالی ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر تھا کہ وہ اپنے اخراجات اس حد تک کم کردیتے جس سے رسالہ بغیر نقصان اٹھائے چل سکتا اور رسایل کے اڈیٹر ذکمور رسالہ زمانہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے جو ۲۵ سال سے چل رہا ہے۔ اور زندہ ہے اور اپنے حلقہ میں اردو کی خدمت کر رہا ہے۔ اگر وہ مقابلہ

کے قریب بھی پھٹکتا تو یقیناً اپنی نقد جان نذر کر دیتا۔ ادبی دنیا کے متعلق جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے طعن سے نہیں لکھا۔ بلکہ میرا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ جب موجودہ صورت میں بھی پانچسو روپے ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے تو رسالہ کو پائدار اور مضبوط بنانے کے لئے اس کے اخراجات میں اتنی کمی اور کر لینی چاہئے جس سے یہ عظیم نقصان باقی نہ رہے۔

ادبی دنیا کی ایک بات مجھے ہمیشہ ناگوار گذرتی ہے وہ حال و قال میں اسکا ایسی چیزوں میں اپنی خدمات کا ذکر کرنا ہے جو حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں اس رنجش کو بھی ترک کر دیا جائے تو رسالہ کی قدر و منزلت اور وقار میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت جنوری کا رسالہ ہے جس میں ایڈیٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"ادبی دنیا کے افسانے عریانی حیا سوزی اور بے باکی سے کلیتہً پاک و عموماً انسانیت نمونہ عبرت آموز اور انسانیت آموز ہوتے ہیں۔ اہل الرائے اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ ادبی دنیا سب سے پہلا رسالہ ہے جس نے حسن دمشق کے عریاں افسانوں کے مقابلہ میں بلند پایہ اخلاقی افسانوں کو عام پسند بنا کر ذوق عامہ کی اصلاح کی ہے"

یہ سب دعویٰ اور اس حقیقت کے باوجود کامل ڈھٹائی سے لکھ دیا گیا ہے کہ ادبی دنیا کے ایک نحش اور گندے افسانے کے خلاف اخبارات میں ڈائریکٹر تعلیم پنجاب اور ٹکسٹ بک کمیٹی کو توجہ دلائی جا چکی ہے۔ اور ہندوستان کے سب سے بڑے اہل الرائے ادیب حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی جو رسالہ ادبی دنیا کے معاون خصوصی ہیں کی رائے بھی چھپ چکی ہے کہ افسانہ زیر بحث واقعی قابل اعتراض تھا۔ حال و قال کے زیر عنوان اس قسم کے قال کے ساتھ حال واقعی کو بھی مد نظر رکھ لیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

اسی جنوری نمبر میں ادبی دنیا کی نظموں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

"فاخر لاہور کی ادبی مجلسوں میں ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے روشناس رہ چکے ہیں۔ لیکن ادبی دنیا کا فاخر جس جاہ و جلال سے اس میدان میں اترا ہے اسکے تیور دیکھ کر حریفانِ فن میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ فاخر جس بلندی پر کھڑا ہو کر اپنا منظوم الہام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے سچ تو یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی کی نگاہیں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں"

یہ ہے ادبی دنیا کی تعلیاں اور دوست و احباب کے پراپگنڈا کا ڈھنگ۔ فاخر واقعی ایک اچھا شاعر ہے لیکن وہ ادبی دنیا کی اس چوٹی پر جسے ہمالیہ کی ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی زیادہ بلند ہونے کا فخر حاصل ہے اور جہاں سے وہ دوسری دنیا تک اپنا الہام بلا کم و کاست بھیج سکتا ہے۔ کے باوجود ابھی ملک میں اتنا مشہور و ہردلعزیز نہیں ہوا جتنے حضرت جوش ملیح آبادی ہیں۔ فاخر کے کلام سے حریفانِ فن میں نہ ابھی کھلبلی مچی ہے نہ اُن کے جاہ و جلال کا تذکرہ ہے۔ اللہ رحم کرے۔ فاخر صاحب کو رسوا کرنے کے لئے ایسے ہی دوستوں کی ضرورت تھی۔

ہم ایڈیٹر صاحب ادبی دنیا کو توجہ دلاتے ہیں (۱) وہ ادبی دنیا کے اخراجات میں اتنی کمی اور کر دیں جس سے پانچسو روپے ماہوار کا خسارہ باقی نہ رہے خواہ صفحے کم کرتے کرتے ۲۵ ہی رہ جائیں (۲) قال و حال میں بلند بانگ دعاوی اور انقلابی پروگرام کی اشاعت ترک کر دی جائے۔ (۳) دنیا کی ۲۵ زبانوں کے تراجم نہ شایع کئے جائیں کیونکہ اس سے زیادہ بے معنی چیز آج تک مطالعہ میں نہیں آئی۔ ادبی دنیا کی سوا سالہ زندگی کی حقیقت اگر ناظرین نیرنگ خیال معلوم کرنا چاہیں تو اس شعر میں ملاحظہ فرمالیں ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

احمد حسین

پطرس کے مضامین

[پطرس کے مضامین مصنفہ اے۔ایس۔بخاری بی اے۔ (کینٹب) ایم اے۔گورنمنٹ کالج لاہور
مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب لاہور۔حجم ۱۵۵ صفحات۔سائز ۲۲×۱۸/۴ ۔قیمت دو روپیہ (عہ)]

کتاب زیر تبصرہ حضرت پطرس کی دس بارہ سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اس میں وہ مضامین بھی ہیں۔جو مصنف نے طالبعلمی کے زمانے میں لکھے۔وہ بھی ہیں جو پروفیسری میں لکھے گئے۔وہ بھی ہیں۔جو کنوارپن کے دوران میں سرزد ہوئے۔اور وہ بھی ہیں جو شادی کی حالت میں لکھے گئے۔

اگر پطرس کو کوئی شیکسپیری انداز کا نقاد میسر آگیا تو کچھ عجب نہیں۔کہ وہ "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" (طالب علمی) "میں ایک میاں ہوں" (شادی)، "انجام بخیر" (پروفیسری) "میبل اور میں" (ولایت رفتگی) وغیرہ مضامین سے مصنف کے صحیح سوانح حیات مرتب کرنے میں کامیاب ہو جائے۔(صحیح سے تاریخی صحت نہیں بلکہ نفسیاتی صداقت مقصود ہے) خدا کرے کہ ایک ایسا نقاد جلد تیار ہو جائے۔ورنہ مجبوراً ہمیں تیار کرنا پڑیگا مگر یہ تو محض مزاح تھا۔اور نتیجہ تھا۔اس اثر کا جو ہم پر کتاب زیر تبصرہ کے مطالعے سے ہوا۔(معلول سے علت کا اندازہ کیجئے) حقیقت یہ ہے۔کہ یہ کتاب ایک نہایت ہی ذکی۔اعلےٰ تعلیم یافتہ اور راسخ ادیب کی عمر کے بہترین حصہ کی تراوش ذہنی کا مجموعہ ہے۔اردو میں اس قسم کی کتابوں کا فقدان ضرب المثل ہے۔اور یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی طباعی کی بنا پر ہم بجا طور پر دوسری زبانوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

مزاحیہ مضامین لکھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ہنسنا آسان ہے۔ہنسانا خون جگر رونا ہے۔انگریزی کے ایک مشہور ادیب کا مقولہ ہے (جو خود اقتصادیات کا ماہر اور ظریفانہ مضامین لکھنے میں ید طولےٰ رکھتا ہے) کہ ایک ظریفانہ مضمون لکھنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں۔وہ اقتصادیات پر ایک کتاب لکھنے میں پیش نہیں آتیں اور پھر پطرس کی قسم کی ظرافت!

—— ہمارے بہت سے مزاحیہ نگار محض فقرہ بازی پر اکتفا کرتے ہیں۔ادھر ادھر کی باتوں کو پیوند لگا کر مضمون تیار کر لیتے ہیں ان میں کوئی مرکزی خیال کوئی تنظیم نگر کسی قسم کی ہم آہنگی نہیں ہوتی پطرس کے مضامین میں (اچھے سے اچھا۔اور برے سے برا) اور خوبی ہو نہ ہو ہم آہنگی جو آرٹ کی جان ہے۔ضرور ہوتی ہے۔ایک ماہر موسیقی دان کی طرح وہ ادھر ادھر پلٹے لگا کر اصل راگ کی طرف لوٹ آتا ہے۔سرحد سے باہر نہیں جاتا ؛

ان مضامین میں ایک خاص بات یہ ہے کہ لکھنے والا اوروں پر ہنسنے کی بجائے اپنے اوپر ہنستا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اس کا "میں" اس روح انسانی کا ترجمان ہے۔جو "من و تو" کے فرق سے نا آشنا ہے۔اس لئے جہاں کہیں وہ "اپنے" سے گذر کر آپ پر چوٹ کرتا ہے تو "آپ" اس طرح ہنستے ہیں۔بلکہ "مسکراتے ہیں"۔کیونکہ پطرس کے مضامین قہقہہ کی بے ہنگامی کے حریف نہیں۔جس طرح "آپ" "میں" پر ہنستے ہیں (دیباچہ ہی کو لیجئے گو مختصر سی چیز ہے مگر اپنی جگہ پر مکمل ہے) فرماتے ہیں:۔

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے (گویا آپ چور ہیں۔مگر گھبرائیے نہیں تلافی ہوئی جاتی ہے) تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔(لو برابر ہوگئی۔اپنے آپ کو بھی دھر لیا) اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں (وہ مصنف سے نہیں بلکہ اس ملک کے لوگوں ...... سے اجازت حاصل کرلیں")

(کہ وہ اس مصیبت عظمےٰ کو اپنے سر لینا چاہتے ہیں۔یا نہیں!)

ہم نے خطوط و عبارتیں آپ کو سمجھانے کے لئے بغیر لکھیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ آپ ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا مقصد محض مصنف کو چڑانا ہے۔ اسے اس جراحی کی جڑ ال جائے جو وہ انسانی فطرت پر اس بے دردی سے عمل میں لاتا ہے۔ باقی رہی یہ بحث کہ ہنسی پیدا کس طرح ہوتی ہے۔ اور گدگدی اور ظرافت میں کیا فرق ہے؟ اور پطرس کیونکر (پیروڈی نقالی وغیرہ سے) یہ کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے لئے فرصت درکار ہے۔

حالت یہ ہے کہ عید نمبر تیار ہو چکا ہے۔ کاتب رو رہا ہے اور ہم قلم ہاتھ میں بلکہ منہ میں لئے بیٹھے ہیں ؛

ادارت

ریویو

دولت غزنویہ باتصویر مدارس میں آجکل تاریخ ہند کے متعلق جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں شاہان قدیم کے متعلق سوائے جنگوں اور لڑائیوں کے دوسری قسم کے حالات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان بادشاہوں نے زیادہ فتوحات حاصل کی ہیں۔ ان کے متعلق غلط فہمیاں بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے متعلق بھی بہت سے ایسے واقعات تاریخوں میں ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ حال ہی میں کتب خانہ دارالادب (بھاٹی دروازہ لاہور) نے "دولت غزنویہ" کے نام سے ایک کتاب شایع کی ہے جسمیں سلطان محمود اور اس کے جانشینوں کے متعلق مفصل صحیح تاریخی واقعات جمع کئے گئے ہیں اور جابجا مستند تاریخی حوالجات سے غلط واقعات کی تردید کی گئی ہے۔ اور دکھایا گیا ہے کہ سلطان موصوف کے حملوں کے اسباب کیا تھے اور انکے کیا کیا نتائج پیدا ہوئے۔ اس سلسلہ میں خاندان غزنویہ کے بھی مکمل تاریخی واقعات جمع ہو گئے ہیں۔ اور کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ سلطان محمود کی سہ رنگی اور امیر سبکتگین کی دو رنگی تصاویر کے علاوہ موصوف کا مقبرہ۔ غزنی کی مسجد اور سومنات کی تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ سرورق نہایت خوبصورت ہے جس پر ایک نقشہ دیا گیا ہے جسمیں وہ تمام مقامات دکھائے گئے ہیں جنکا کتاب میں ذکر آیا ہے۔ ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک۔ مہتمم کتبخانہ اندرون بھاٹی دروازہ۔ لاہور سے طلب کریں ؛

آمنہؓ کا لال

از مولانا حضرت راشد الخیری ایڈیٹر عصمت دہلی

آمنہؓ کے لال پر زمینی کائنات نثار ہونے کو آگے بڑھی۔ بار آور شاخوں نے ارض حجاز کو بوسہ دیا۔ نسیم نے ہزار جان سے قربان ہو کر بطحا کو چوما۔ ہوا نے اس مقدس نام کی تسبیح پڑھی۔ خوش رنگ پھولوں نے مکہ کی خاک اپنی آنکھوں سے ملی۔ اور ملک کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ اس مسرت میں لہلہاتی ہوئی کونپلوں کا ہم آہنگ تھا۔

آسمان عرب نے عبد المطلب کے گھر وار ابن یوسف کے در و دیوار پر روشنی کی بارش کی۔ چمکدار تارے عبد اللہ کے لخت جگر پر قربان ہوئے۔ اور مخلوق فلکی نے شادمانی کا غلغلہ بلند کیا۔

آتش نمرود کے ذرات پھولوں کا لباس پہنکر زر و جواہر کی کشتی میں دعاء ابراہیمی کو سر پر رکھے عبد المطلب کے گھر پر نمودار ہوئے۔ دار ابن یوسف کی دیواریں تعظیم کو جھکیں۔ فرحت کی جھڑیاں برسیں۔ ہوا معطر ہوئی اور زمین و آسمان مبارکباد کے نعروں میں سرگرم ہو گئے۔

یہ بزم طرب اور خوشی کی گھڑی　　مسرت کی ہر سو لگی ہے جھڑی
عقیدت سے یاں دست بستہ کھڑی　　مگر آنکھ تجھ بن ہے سونی پڑی
فدا تجھ پہ سو بار صلِّ علیٰ

غلام اور تھوڑی سی یہ لونڈیاں　　بعجز و منت ہیں حاضر یہاں
کرم ان پہ ہو لے شہ مرسلاں　　بنا انکی مجلس کو رشک جناں
شہ دو جہاں اپنا جلوہ دکھا

گنہگار آنکھوں میں طاقت نہیں　　یہ دوچار ہوں تجھ سے ہمت نہیں
ترے سامنے ہوں یہ جرأت نہیں　　نگہ بھر کے دیکھیں یہ قدرت نہیں
شہ دوسرا جلد آ جلد آ

دلِ مضطرب پر بڑی ہے بنی　　نظر آسماں پر ہے اس کی لگی
یہ بزم کنیزاں ہے خالی پڑی　　اسے جگمگا اتجا ہے یہی
سما جا ان آنکھوں میں آ جلد آ

زمین و زماں تجھ پہ قربان ہو　　ملائک سے ارفع تری شان ہو
تو دنیا کا بے مثل انسان ہو　　خدا تیرا حافظ نگہبان ہو
فدا تجھ پہ جاں جلد آ جلد آ

حیات انسان کی تاریخ ان واقعات سے محروم نہیں۔ جب قدرت کے زبردست ہاتھوں نے اپنی طاقت پر فخر کیا ہے۔ صانع حقیقی نے اپنی صنعت کو سراہا اور احسن الخالقین نے اپنی خلقت پر ناز کیا۔ آج کتاب زندگی کا یہ باب بند ہوتا ہے اور صفات انسانیت ختم ہوتے ہیں۔ اور آدمیت کی تمام صنعتیں جمع ہو کر ایک ذات میں رونما ہوتی ہیں۔ رحم و کرم کی حسین دیویاں خلق و مروت کے تر و تازہ گلدستے ہاتھ میں لئے عبد المطلب کے گھر میں نمودار ہوئیں۔ خلوص و صداقت کے کفش بردار چہرے راستی و ایثار کے جواہرات سے مزین ہو کر سامنے آئے۔ عبادت و ریاضت کے علمبردار شرک و بت پرستی کو تاراج کرتے ہوئے خانہ کعبہ پر توحید کے جھنڈے گاڑنے لگے۔ آسمان فرط مسرت سے اچھل پڑا۔ زمین اپنی خوش نصیبی پر فخر کرنے لگی۔ اور وہ وقت قریب آ گیا جب دنیا کے ہاتھ اس بچہ کو اپنی آغوش میں لیں جس کو روئے زمین کی اصلاح کرنی ہے۔ ارضی و سماوی کائنات کی نظریں اس جمال پر پڑیں جو ایک عالم کو منور کرے گا اور وہ فخر موجودات ظہور پذیر ہوا جس کے مبارک قدموں میں سرکش گردنیں جھکیں گی۔ اور عدل حقیقی اس کے پاؤں چومے گا۔

آمنہ کے لال! تیری پیدائش ایک نعمت ہے۔ جو خدا ہم کو عطا فرما رہا ہے تیرا وجود جس نے کارخانۂ حیات کو زیر و زبر کر دیا۔ تیری مقدس ہستی جس نے دنیا کی تاریکی میں تہلکہ مچا دیا قدرتی انعام تھا۔ رسالت کے معنے تو نے بتائے۔ نبوت کی تفسیر تو نے کی۔ انسانیت کا عقدہ تو نے کھولا۔ اور بندگی کا راز تو نے بتایا۔ معبودیت کا مرحلہ تیری شان تھی۔ اور توحید کا ڈنکا تیری زبان۔ آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بادشاہ ہم لونڈی غلاموں کا سلام قبول فرما۔ چمنستان تخیل کو اپنے رحم سے

تہ تازہ کر۔ ہمارا تحیر یہ منظور کر اپنے رحم سے اور اپنے کرم سے۔ ۵

خدا کے نام سے ناآشنا ہر ایک انساں تھا   نہ قانون عبادت تھا تعلق تھا نہ رستہ تھا
وجود پاک نے تیرے خدا کا رنگ دکھلایا   زبانِ پاک نے تیری خدا کا نام بتلایا
درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

قیامت خیز گھڑیاں کفر کی الغظمۃ للہ   ستم کے سلسلے جاری مظالم کا تھا ایک تانتا
خدا ذات تو نے دکھلائی بتایا راستہ سیدھا   خس وخاشاک کو تو نے صف اعلیٰ میں پہنچایا
درود ہے تجھ پہ اے مولا۔ سلام ہے تجھ پہ اے آقا

خدا نے زندگی دی۔ آدمیت تو نے لے آقا   لباس زندگی آلودہ کو صیقل تو نے دلوایا
خدا انسانیت ہو کر بہیمیت کا دورہ تھا   ہدایت تو نے کی اور امتیاز نیک و بدبخش
درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

دنیا کا دور دورہ تھا گھڑی آفت کی آئی تھی   جو بارش تھی تو ظلموں کی گھٹا خونی سی چھائی تھی
محو ہو کر خدا کا نام قوت کی خدائی تھی   مگر ہستی تری نام خدا ساتھ اپنے لائی تھی
درود ہے تجھ پہ اے مولا۔ سلام ہے تجھ پہ اے آقا

حیا و خلق و ایماں سب سمجھے تھے یکقلم غارت   نہ تھی کمزور کی عزت نہ کچھ عورت ہی کی وقعت
بجائے کلفت و آفت کے دی آسایش و راحت   غلامی تو نے کی رخصت تو دی عورات کو عزت
درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

یتیموں کی طرف تو نے بڑھایا ہاتھ الفت کا   دیا بوسہ سروں پر انکے تحفہ رحم و شفقت کا
دکھایا رنگ انسانی بتایا طرز الفت کا   غریبوں بیکسوں پر تو نے رکھا ہاتھ رحمت کا
درود ہے تجھ پہ اے مولا۔ سلام ہے تجھ پہ اے آقا

خدا کا فضل تھا انعام تھا لطف خدا تو تھا   شمع توحید باری کی جو سچ پوچھو ضیا تو تھا
ترے احکام نے ختم رسل ساکت زباں کر دی   نہ ہوتا قفل گر منہ پر تو بتلاتے کہ کیا تو تھا
درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

زباں احسان اخلاق کہاں تک تیرے گنوائے   بکھیرے ہیں جو تو نے پھول کتاب انکو چنوائے
ترے احسان کا دنیا میں ہر لب پہ تو اب ہے   مگر خیر تیرا خود سنے آرزو انکو سنوائے
درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا



اعجاز کا اعتراف۔ صرف مسلمان نہیں ہر انسان نگاہ بلند کرے اور دیکھے موسوی عہد گزر چکا۔ مسیحی دور ختم ہوا۔ نبوت رسالت کے جلوے اپنے اپنے رنگ دکھا کر فنا ہوئے۔ اور وہ وقت آگیا کہ آمنہ کے لال پر پہلی مرتبہ خدا کا پیام نازل ہوا۔ اعلان نبوت کوس لمن الملک کی طرح دنیا میں گونج رہا ہے۔ آسمانی کتابوں کے

ماہر تلاش کے قدموں سے آگے بڑھ رہے ہیں اور تحقیق کی آنکھیں یتیم عبداللہ کے گھر کا طواف کر رہی ہیں۔ آفتاب نصف النہار پر ہے اور عرب کی قیامت خیز گرمی نے آفت بپا کر رکھی ہے۔ یروشلم کے دو یہودی توریت و زبور کے عالم جن کے دلوں کو آیات ربانی نے تعصب و کدورت سے صاف کیا تھا۔ مکہ کی سرزمین پر داخل ہوئے۔ اور اپنے ایک ہم مشرب و ہم مذہب یہودی بقال کی دوکان پر ٹھیر کر کہا "وہ شخص جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے کہاں ہے"+

میزبان بقال اپنے مہمانوں کے شوق کا استقبال بلند قہقہہ کی صدا میں کر رہا تھا کہ غل غپاڑہ کی آواز کانوں میں آئی اور اجنبی سیاحوں کی آنکھوں نے دیکھا کہ آدمیوں کا غول چیختا چلاتا ہوا کرتا چلا آرہا ہے۔ چشم زدن میں مجمع سر پر آپہنچا تو معلوم ہوا کہ سیاہ کمبل میں لپٹا ہوا ایک انسان بیچ میں ہے۔ جس کے قدموں کو نبوت اور رسالت چوم رہی ہے۔ سر سے خون کے فوارے جاری ہیں۔ لڑکے اور بچے۔ بڈھے اور جوان چاروں طرف سے اس کے اوپر پتھر برسا رہے ہیں اور سر کنکر مار رہے ہیں۔ یہودی دل تڑپ اٹھے۔ ہمدردی کا جذبہ بلند ہوا۔ اضطراب کی لہریں چہروں پر دوڑنے لگیں۔ اور مکہ والوں کے ان مظالم پر لعنت کی بوچھاڑ کرتے ہوئے تھے تو بقال نے کہا "جس کی آرزو تم کو یہاں تک کھینچ کر لائی ہے وہ محمد یہی ہے"۔ ذوق حیرت سے بدلا اور تعجب کے آثار نمودار ہوئے۔ اور دل نے جس کی ہمدردی میں رحم شامل ہو چکا تھا فیصلہ کیا کہ آزمائش کا بہترین موقعہ ہے۔ یہ جگر خراش مظالم خالی جانے والے نہیں۔ یہ خون رنگ لائے گا اور اگر دعویٰ سچا اور رسالت برحق ہے تو اس کی بددعا مکہ کیا عرب کا کلیجہ توڑ دے گی۔ اور عذاب الٰہی ان ظالموں کا ناس کر دے گا+

یہودی مجمع کے ساتھ آگے بڑھے۔ چند قدم چلے تھے کہ ایک پتھر نے سرکار کی پیشانی زخمی کی۔ اور خون کی تللی جاری ہوئی۔ دونوں اس لئے کہ نتیجہ کی آرزو گدگدا رہی تھی اور دل مظالم پر رو رہا تھا۔ قریب پہنچ گئے۔ تھرا اور کانپ رہے تھے کہ ان کے سامنے ایک عجیب سماں آیا۔ عبداللہ کا یتیم جس کے ننھی عمروں میں جا پہنچے تھے۔ اور جس کا کوئی والی وارث زندہ نہ تھا۔ ٹھٹکا۔ کمبل کے کونے سے پیشانی کا خون پونچھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا:۔

"معبود حقیقی میری قوم کی غلطیوں کو معاف کیجیو۔ بے گناہ ہے۔ اس نے ابھی تک مجھ کو پہچانا نہیں"+

استعجاب کا خون رگوں میں بجلی کی طرح دوڑا اور عقیدت نے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا۔ فضا شور و شغب میں ایک متفقہ چیخ یہودیوں کی بلند ہوئی۔ اور دونوں سر پہ کہتے

ہوئے قدموں میں گرے۔

"بلاریب تو رسول برحق ہے"

زندگی کے اس خوشنما دربار میں اس ظلم و ستم پر نفس کو مغلوب کرنا ایسا معجزہ ہے جس کا جواب دینے میں عفو و تحمل کے فرشتے خاموش ہیں۔ یہ رحم و کرم یہ ایثار یہ درگذر عظیم النظیر ہے۔ جویائے حقیقت دریائے تاریخ میں لاکھ غوطے کھائے۔ مگر یہ در شہوار میسر نہیں آتا۔ اور عقل سلیم گردن جھکا کر صرف اتنا کہتی ہے :۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

توسن قلم میدان تاریخ کو طے کر لینے کے بعد بیان سیرت میں سجدے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اور متعجب ہوتا ہے کہ کیسے دل اور کیسے انصاف تھے ان لوگوں کے جنہوں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مگر زندگی کی کشمکش نے ایمان نکلوا دیئے۔ جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ معمولی انسان نہیں پیغمبر ہے۔ مگر ایسے کینہ دوز اور سیاہ قلب کہ دل کی حقیقت سے دماغ کو اور آنکھ کے تماشے سے زبان کو محروم رکھتے تھے ٭

(براہ راست)

راشد الخیری

چاند

(محترمہ مہر سلطان کے قلم سے)

موسم گرما کی ایک رات تھی۔ میں اس وقت ایک کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور رات کی تاریکی میرے سیاہی مائل سنہری بالوں کو اور زیادہ سیاہ کر رہی تھی۔ دفعتاً مغرب کی جانب سے کچھ روشنی نمودار ہوئی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ چاند اپنے منور چہرے کو بادلوں کے سیاہ دامن میں چھپائے کچھ کبیدہ خاطر لڑکھڑاتا چلا آتا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا اے بے چین دلوں کو اور زیادہ بے چین کر دینے والے چاند! تو اسقدر رنجیدہ خاطر کیوں ہے؟ تیرا شگفتہ چہرہ آج اس طرح کمھلایا ہوا کیوں معلوم ہوتا ہے؟ تجھ میں میں اسوقت ایک عظیم الشان انقلاب محسوس کر رہی ہوں۔ بتا تو سہی تو کہاں سے آرہا ہے؟ اور کہاں جانے کا قصد ہے؟ سچ کہنا تجھے کس کی تلاش ہے؟ آخر کس لئے تو اس طرح سرگردان نظر آتا ہے؟!

——— چاند نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ یہ میرے سوالات کا شاید جواب تھا ٭

آہ تجھے جس کی جستجو ہے مجھے بھی اسی کی تلاش ہے۔ تو مجھے دیکھ اور افسوس نہ کر کیونکہ میں بھی تیری ہی طرح مبتلائے گردش ہوں۔ تجھے زندگی کی آرزو ہے اور میں بھی اسی کے حصول کیلئے صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں مشغول ہوں۔ اگر تو اپنے خیالات کی تہ میں ڈوب جاتا ہے تو مجھے بھی نسیم سحر کا ایک جھونکا بیخود و سرشار کر دیتا ہے۔ تو ساکت ہے تو میرا دل بھی خاموشیوں کا مسکن ہو رہا ہے ٭

پیارے چاند! تیرے لئے خوشی کا پرتو اہل کا پیغام ہے۔ اسوقت تیری زندگی میں عظیم انقلاب واقع ہوتا ہے ——— ہاں میری حالت بھی تو ایسی ہی ہے۔ کسی کی روشنی نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ میں اس کی نورانی شعاعوں میں کھوگئی ہوں ——— لیکن اے چاند مجھ میں اور تجھ میں ایک بہت بڑا فرق ہے تو عشق کے ظاہری آثار کے باوجود دراصل گرمی محبت سے خالی ہے لیکن میں اپنے دل میں ایک التہاب اور پہلو میں ایک درد محسوس کرتی ہوں جو رہ رہ کر اُٹھتا ہے اور مجھے بے چین کر دیتا ہے ٭

(خاص) پیارے چاند تو میری ہستی کے راز سے واقف نہیں لیکن ہائے افسوس سچ تو یوں ہے کہ میں خود بھی اسے ابتک نہیں جانتی ٭

مہر سلطان لکھنوی

ع - تم بھی ہنستے ہو میرے حال پہ...

از جناب شرف الدین احمد صاحب عظیم آبادی

دل اور وہ بھی ایسا دل جو لذتِ سوز و گداز سے نا آشنا نہیں۔ بہت ہی نازک ہوتا ہے۔ ترچھی نظریں یا شوخ ادائیں تو خیر ایک طرف بعض وقت محض یہ خیال کہ اپنا کوئی طرزِ عمل کسی کی ناگوارئ خاطر کا سبب ہوا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھئے آنکھوں کے سامنے کیسا تکلیف دہ نقشہ پیش کر دیتا ہے +

مجھے تم سے ——— ہاں صرف تم سے محبت ہے، لیکن کیوں ؟ یہ میں نہیں جانتا۔ تمہاری خوشی سے مجھے ایک خاص مسرّت ہوتی ہے۔ لیکن تمہارا رنج ——— معاذ اللہ۔ اس سے خدا بچائے ! تمہارے بعض انداز ایسے بھی ہیں جو حقیقتاً خدا جانے کیا ہیں۔ لیکن وہ خشم آلود ضرور ہیں۔ پھر تم ہی بتاؤ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس روح فرسا نقشہ کو دیکھوں اور نہ لرزوں ؟ اس تکلیف دہ منظر کی پیچیدگیوں میں اُلجھوں اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لاؤں ——— ؟ اے کاش تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہوتا !

میں قدرتاً ذرا شوخ طبع واقع ہوا ہوں اور زندہ دلی میری فطرت کا بہترین جزو ہے۔ میرا انداز کلام بعضوں کو ہنسا دیتا ہے۔ لیکن میری غیر معمولی شوخیاں بعضوں کے لئے اکثر تکلیف دہ بھی ہو جاتی ہیں۔ دوسروں کے ہنسنے پر میں خوش ہوتا ہوں۔ اسیطرح بعضوں کی خفگی کو میں اپنی شرارتوں کی بہترین کامیابی سمجھتا ہوں ——— لیکن میری کسی غیر ارادی شرارت پر تمہارا آنکھیں بدل لینا، سچ کہتا ہوں میرے لئے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔ اس سانحہ سے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ میری آنکھیں آنسو تو نہیں بہاتیں۔ اس لئے کہ اظہارِ غم کی یہ کوئی اچھی صورت نہیں۔ لیکن میرا دل اس منظر کی تاب نہیں لا سکتا۔ اور میں اُن آنکھوں سے روتا ہوں جو میرے دل میں پنہاں ہیں۔ لوگ میری فطری شوخیوں کے یکایک خموشی سے بدل جانے پر متعجب ہوتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو میرے حال پہ ہنستے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ میری دلی کیفیتوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ میں اُن کے اس اندازِ تمسخر کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ کیونکہ مجھے ان سے واسطہ ہی کیا ——— ؟ مگر ہاں، میری فطرت کے اس حسرتناک انقلاب پر تمہارا یکایک ہنس دینا، اپنی شوخی سے نہیں بلکہ میری بے وقوفی پر، اور کس طرح ——— ؟ قصداً ——— ہاں ہاں، بالکل قصداً ——— بس کچھ نہ پوچھو۔ خیر! اس کی ذمہ داری بھی شاید میری قسمت ہے ؎

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی   تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

شرف الدین احمد   Good   (خاص)



عمر خیام کی ایک رباعی

مزاحیہ:-

دریا پار شادی

از مبلیجہ قلندرآبادی

بجتسم کی شادی نہ ایسی نہ تھی جس میں کوئی دوست "بلا دعوت" شامل نہ ہوتا دوست تو دوست ہر ایک سُننا سا خواہشمند تھا۔ کہ اُس شادی میں ضرور شریک ہو۔ اور ہر فرد و بشر کی خواہش بھی یہی ہونی چاہئے تھی کیونکہ بجتسم کو ہر وہ شخص خوش اور متبسم دیکھنے کا آرزومند تھا جس نے اُس کی سابقہ رفیقۂ حیات کی وفات پر اُس کو ننھے ننھے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے دیکھا ہو +

بجتسم بار بار یہی کہا کرتا تھا کہ اب اُس کی شادی کیا خاک ہوگی۔ اور کہتا تھا کہ بقیہ زندگی حوران جنت کی امید ملاقات اور اپنی چاہتی بیوی کے فراق میں ہی بسر کردیگا۔ لیکن مدت مدید کے بعد اُس کی رگوں میں خون نے جوش مارا اور ہر حبیب سے ملتمس ہوا کہ اُس کی جدید رفیقۂ حیات تلاش کرنے میں مدد دے۔ لیکن اپنی ہونے والی بیوی کا "حدود اربعہ" وہ ایسا پیش کرتا تھا کہ سوائے حوران [illegible] کے اس دنیائے ناپیداکنار میں ایسی سیمتن کا ملنا دشوار تو کیا بلکہ ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ فرض کیجئے کہ وہ ایسی عورت کا خواہشمند تھا کہ جس کے حسن کی مثال آج تک اُس نے یا اُس کے کسی دوست نے اپنے ہوش و حواس کی قائمی میں کبھی نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ صاحب [illegible]ت ایسی ہو کہ اُس کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر دے۔ اور وہ نہایت امیرانہ بلکہ شاہانہ زندگی گذارے۔ صاحب فہم ایسی ہو کہ کسی معاملہ خود اس کو رائے زنی کی ضرورت نہ پڑے۔ یا اگر بھولے کبھی بول بھی اُٹھے تو یقیناً اس کی بات دلائل سے غلط ثابت ہو اور اُس کو اعترافِ کم عقلی کرنا پڑے۔ "وغیر ذالک"۔ القصہ وہ ایسی بیوی چاہتا تھا۔ جس کے ورودِ مسعود کے بعد وہ محض (فقہ کی مکھی کے) نکھٹو کی طرح کاہلانہ زندگی بسر کرے۔

"ایام بیوگی" یا "رنڈاپے" میں وہ ایسا مقبول ہوا کہ ہر معقول اور "نامعقول" شخص اُس کے خانۂ بے تکلف میں ہی اپنا فالتو وقت گذارنا چاہتا تھا۔ اور احباب کے لئے تو اُس کا مکان اچھے خاصے کلب گھر یا "ریٹائرنگ ہاؤس" کا کام دیتا تھا جہاں کسی شخص کی بیوی گھر سے گئی اور وہ سیدھا بجتسم کے یہاں پہنچ گیا۔ غرض تمام محلہ کے مجرد اُس کے مکان میں مستقل طور سے رہا کرتے تھے۔ اور "رنڈووں" کے لئے تو اس سے بہتر ٹھکانا ہی اور کہاں میسر تھا +

نسبت کے بعد بجتسم کی خسرال پورہ کے "بڑے مولوی صاحب" تشریف لائے اور ہر اُس شخص کو شادی میں مدعو کر گئے۔ جو اُن کی زیارت کے لئے آیا۔ اور بجتسم کی بارات کو بہترین موقعہ قرار دیتے ہوئے ایسے مُصر ہوئے کہ گویا کل بارات اُنہی کے دولتسرا پر مقیم ہوگی۔ اس لئے ہر شخص دست بدعا تھا۔ کہ اے ربّ العزت بجتسم کی شادی جسقدر جلد ممکن ہو بہتر ہے۔ تاکہ "بڑے مولانا" کی زیارت "سرکاری سفر خرچ" پر میسر ہو سکے +

کبھی احباب تجویز پیش کرتے تھے کہ ایک ڈیپوٹیشن بجتسم کی خسرال میں بھیجا جاوے۔ جو شادی کی قریب ترین تاریخ طے کروا لیں آئے۔ لیکن کوئی شخص تنہا اپنی جان بقائمی ہوش و حواسِ خمسہ ایسے خطرناک سفر کے لئے پیش کرنا نہ چاہتا تھا۔ جس میں کہ اُس کو علاوہ بادیہ پیمائی کے ایک دریا بھی عبور کرنا پڑے +

سب اوورسیر کا تو یہ حال تھا کہ "بھئی بارات میں ضرور چلنا" "دیکھنا یار کبھی وقت پر انکار کر بیٹھو" "بھئی چھٹی وغیرہ کا ضرور انتظام کر لینا چاہئے" "اتنی مدت رنڈوا رہنے کے بعد تو اب اُس کی شادی کا وقت آیا ہے۔ اُس کی خوشی میں ضرور شریک ہونا چاہئے" ہر ایک کے گھر جا جا کر ایسے کہتے پھرتے تھے کہ گویا "بجتسم گورنٹ آف وارڈس" کے یہی جنرل منیجر ہیں۔ حالانکہ بات نہ کچھ اُس سے جولا ہے سے لٹھم لٹھا یعنی ابھی خود رنڈوے دولہا نے بھی یہ فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کہ کس کس کو بارات میں لے جائے گا اور کب بارات ہوگی +

جب احباب جمع ہوتے یہی چرچا رہتا۔ کوئی کہتا کہ ایسا نفیس سہرا بنانا چاہئے کہ تمام باراتی اور خسرال والے خوش ہی تو ہو جائیں۔ کوئی کہتا۔ کہ یار سب کے سب جب تک نہ چلیں لطف نہ آئے گا۔ غرض ہر وقت بجتسم کی شادی ہی کا تذکرہ زبان پر ہوتا تھا۔ اور اسی کے منصوبے دماغ میں گونجتے رہتے۔ یہانتک کہ "چھوٹے مولوی صاحب"

نے بھی کہدیا کہ بھئی وعدہ تو ہم نے بھی "بڑے مولوی صاحب" سے کیا ہے کہ بارات میں ضرور آئیں گے۔

غرض اسی طرح دن اور دنوں کے بعد ہفتے گذرتے گئے۔ آخر کار وہ وقت آپہنچا۔ جبکہ تمام احباب اپنے بہتر سے بہتر کپڑے زیب تن کئے ایک دوسرے کو جمع کرتے ہوئے پھرنے لگے۔ کہ "بھئی چلو نا۔ موٹر بالکل تیار کھڑی ہے" "بھئی جلدی کرو تم ہر ایک بات میں ٹلنے ہی کی فکر کیا کرتے ہو" "نہ بھئی چلنا ضرور ہوگا۔ تکلیف تو بیشک ہوگی۔ کیونکہ سفر دراز ہو رہا ہے۔ اگرچہ آرام کے کل ذرائع اختیار کئے جائیں گے لیکن ان گھنے جنگلوں اور ناہموار راستوں کا کیا بند وبست ہو سکتا ہے۔ جن پر سفر کرنا کسی حاملہ عورت یا دائم المریض یا نازک مزاج مرد کے لئے خالی از خطرہ نہیں ہو سکتا" بزدل تو ان خطرات سے ڈر کر شرکتِ بارات کا ارادہ ترک کر بیٹھے لیکن اکثر بے سیرے سر بکف اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے لئے "مرگِ انبوہ جشنے دارد" کے مصداق بالکل تیار ہو کر ساتھ ہو لئے۔ اور مزید اطمینان کے لئے آتشیں اسلحہ بھی ساتھ لے لئے۔

تمام راستے کوئی کہتا تھا کہ "بھئی انڈوں کا حلوہ کھانا چاہئے۔ تمام تکان دور کر دے گا" کوئی کہتا تھا کہ "بھئی یہ بندوقیں کیوں ساتھ لی ہیں۔ کیا دُلہن بندوق کے سایہ میں آئے گی" غرض مہذب احباب کی پارٹی جمع ہو کر جائے روانگی پر اس شان سے پہنچی۔ جیسے علاء الدین خلجی مع اپنی فوج ظفر موج کے "پدمنی" کے حصول کے لئے سر بکف میدان میں جا رہا ہو۔ رات بھر آرام کے بعد وہ سفر درپیش تھا۔ جس کے خیال سے بھی آج تک "سرکاری سفر خرچ پر بڑے مولانا کی زیارت کرنے والوں" کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مولوی لوگ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ سفرِ آخرت میں نہ کوئی بھائی کام آئے گا نہ باپ نہ جورو نہ بچے۔ غرض کوئی متنفس اس سفر میں مسافر کا بارِ گناہ ہلکا نہیں کر سکتا۔ بعینہٖ یہی حالت اس سفر میں درپیش آنے والی تھی۔ جس پر یہ "بہادر جانباز" گامزن ہونے والے تھے۔

اُن لوگوں نے جو اپنے آپ کو بارات کی سوبھا خیال کرتے تھے فیصلہ کیا کہ ہم اخیر وقت تک ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اور باقی بارات سے پہلے آہستہ آہستہ چل پڑیں گے۔ تاکہ منزلِ مقصود تک نہایت آرام کے ساتھ پہنچ جائیں۔

ناہموار کچی سڑک اور چھکڑے کی سواری۔ خدا کی پناہ۔ سر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر جامنوں کی طرح ہو گئے۔ اور اس پر راستہ کے گرد و غبار نے "وہ نمک پاشی" کی کہ کچھ دور چلنے کے بعد ایک دوسرے کو بالکل شناخت نہ کر سکا۔ اور نفسی نفسی کا عالم طاری ہو گیا۔ "ارے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے" ایک بولا۔ دوسرے نے شکایت کی "ارمیاں اس سے تو پیدل ہی اچھے تھے" "دو بیل کمبخت تو خود ہم سے کھینچنے کے متمنی معلوم ہوتے ہیں" اگر کوئی نیچے اُتر جاتا تھا۔ تو گرد و غبار میں دفن ہو جانے کے خوف سے فوراً چھکڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ اور چھکڑے کی سواری عمر بھر کے گناہوں کا کفارہ وصول کر رہی تھی۔ ایک صاحب بولے "سنگ آمد سخت آمد" دوسرے نے تائید کی "بھائی پھنس گئے تو سپھر کنا کیا" تیسرے معزز نے گرج کر فرمایا "ارے کم ہمتو! کیوں مرے جاتے ہو۔ عالی شان مردوں کی نہیں کام ادھورا کرنا" اب تو گھروں سے باقاعدہ وداع ہو کر آئے ہو۔ دُلہن کو ضرور قبضہ میں لانا ہے۔ زندہ رہے تو غازی بن کر واپس چلے جائیں گے۔ ورنہ "بڑے مولانا" کے قدموں میں ہی جان دیدیں گے۔ اور شہادت کا رتبہ مفت میں حاصل کرلیں گے" دولہا صاحب زبانِ حال سے کہتے تھے "ہو جائیں دفن سایۂ دیوار کے تلے" دو ایک زندہ دلوں نے دریا کے گھنے جنگلوں میں پیٹ بھرنے کے لئے قسمت آزمائی شروع کردی۔ آخر اس دوزخ کو تو بھرنا ہی تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے "محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ میٹھا ہو یا کڑوا" دو تین گھنٹوں کے متواتر حملوں کے بعد دو بہادر جنگجو دو عدد "بیٹر مول" جان سے مار لینے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اُن کے بنانے کے طریقہ سے معزز سرفروشان میں سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ ان ہر دو غریب شکاروں کو اپنے مرکب کے دونوں طرف لٹکا دیا جائے۔ تاکہ "عروسیین" مرعوب ہو کر دلہن کو رخصت کرنے میں ٹال مٹول کرنے کی جرأت نہ کرسکیں کہ "پھر آکر لیجانا"

بعض معقول آدمیوں کو کہتے ہوئے ہم نے خود اپنے کانوں سُنا ہے کہ دریا کا عبور کرنا پل پر سے آسان ہے۔ مگر اس بارات کے معزز شرکاء اس بارہ میں "سخت شبہ" کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان سب لوگوں نے انہی آنکھوں سے ایک "زنجیر" موٹر مع ایک "نفر" انجینیر صاحب و "ایک راس" لیڈی انجینیر صاحبہ کے اس پل میں اس طرح دھنسا ہوا پایا جیسے دلدل میں تشریف لے جا رہے ہوں۔ ان بزرگ کی اس حالت کو دیکھ کر معزز باراتی اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھے کہ شکر ہے ہم "موٹر میں لاد کر" نہیں لائے گئے۔ ورنہ آج مع موٹر کے غائب تھے۔

موٹر والے صاحب پل والوں پر بگڑ رہے تھے کہ ایک ساتھ زور لگاؤ لیکن باوجود تمام مساعی کے موٹر نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔ باراتیوں پر عجیب کرب کی کیفیت

طاری تھی کہ یا اللہ! اسقدر مصیبت اٹھا کر تو "منزلِ جاناں" کا قرب حاصل ہوا لیکن اب یہ موٹر "دیوارِ چین" بن کر حصولِ مدعا میں حائل ہوگئی۔ دریا میں کود نہیں سکتے کیونکہ "عروس آباد" کی بجائے "عدم آباد" میں پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ اور اگر واپس جائیں تو کس منہ سے۔ اجی منہ تو گیا بھاڑ میں۔ سر سے جا ہی کب سکتے ہیں؟ بعض تو گھبرا کر باوضو قبلہ رو ہو بیٹھے اور حلال المشکلات سے دست بدعا ہوئے۔ اسی جھمیلے میں ایک من چلے باراتی نے قسمت آزمائی کی ہمت کی۔ اور خدا کا نام لے کر صاحب موٹر کی اس مہم میں زور آزمائی شروع کر دی۔ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" آخر ایک نکتہ نکل ہی آیا۔ اور موٹر سیٹر سے پل کے اس پار ہوگئی۔ موٹر والے صاحب اس انعام و اکرام کی بارش کو جو وہ ملاحوں پر کرنا چاہتے تھے چار روز کے لئے ملتوی فرما کر "یہ جا وہ جا" ہوگئے۔

بارات کا "ہوائی جہاز" بھی اس پلصراط سے گذرا اور خوب گزرا۔ ان نحیف تیلیوں کے سب معززین شکر گذار ہیں۔ جنہوں نے ان کو اس "موٹر آزمائی" میں "نہ" الا۔ اور صاف بچا کر لے گئے۔ آخر مسلمانوں کی بارات تھی۔ اور حنفیوں اور حنبلیوں کا مجمع تھا۔ اگر اس دنیاوی پل صراط پر ہی الجھ جاتے۔ تو یوم الدین کے پل صراط کو عبور کرنے کی امید ابھی سے موہوم ہو جاتی +

بعض نازک مزاجوں نے تکالیف کو اعتدال سے گذرتا ہوا خیال فرما کر احتجاجاً چھکڑے سے اتر کر درختوں کے سایہ میں لیٹ کر استفراغ فرمانا شروع کر دیا۔ اور ساتھیوں نے اپنے متفقہ عہد کو فراموش کر کے ان کو وہیں لڑھکتا ہوا چھوڑ کر "کوچۂ جاناں" کی راہ لی۔ یہ مصیبت کے مارے بھی کسی نہ کسی طرح بیٹھتے اٹھتے "بڑے مولانا" کے درِ اقدس پر جا کر لمبی تان ہی پڑے +

دلہن کے مکان سے تو بڑے مولانا ایسے غائب رہے گویا وہ کسی کو اس بارات میں آنے کے لئے مدعو ہی نہ کر آئے تھے۔ لیکن درماندگان راہ کی تیمارداری اور باراتیوں کی چارہ رسانی میں وہ اہتمام فرمایا کہ تمام کلفت فراموش ہوگئی۔ اگر بڑے مولانا بیماروں کی دیکھ بھال نہ فرماتے تو بارات کی واپسی پر یقیناً معزز باراتیوں کے رشتہ دار اپنے عزیزوں کو تلاش ہی کرتے پھرتے اور کہتے کہ

ع "ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا"

غرض دلہن کے گھر پہنچے۔ کھانے کھائے۔ اور اگلے روز علی الصباح اسی سفرِ زحمت اثر کی واپسی پر کمر باندھی جسکو کہ بدقت تمام ایک روز پہلے طے کیا تھا۔ دلہن کے شہر میں باراتی آوازیں دیتے پھرتے تھے کہ "ہے کوئی اللہ کا بندہ جو آج رات ہمیں اور ٹھہرا لے" "تاکہ ہماری کچھ تکان رفع ہو جائے" اور "ہم زندہ سلامت گھروں پر جانے کی امید کر سکیں"۔ لیکن وہ کیا کریں دستور سے مجبور۔ خواہ "کالے پانی" ہی بارات کیوں نہ جائے۔ مگر ٹھہرے گی صرف ایک رات +

اس تاریخی بارات کے شرکاء آجتک اپنے زخموں کے اندمال کی تدابیر دریافت کرتے پھرتے ہیں اور اکثر تو پیروں سے آجتک معذور ہیں یا بہانہ کئے ہوئے ہیں کہ کبھی پھر کوئی ایسی ہی بارات میں مدعو نہ کر بیٹھے۔ قصہ کوتاہ "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"۔ دولہا بھی توبہ کرتا ہے کہ وہ آئندہ ہرگز ایسی حرکت نہ کرے گا۔ جس سے ایسے ایسے معززین کو دوبارہ بادیہ پیمائی کا موقعہ ملے اور باراتی بھی عہد کرتے ہیں کہ خواہ ان کی شرکت کے بغیر کوئی شخص رنڈوا یا کنوارا ہی کیوں نہ رہے وہ ہرگز ایسی پرخطر بارات میں شریک نہ ہونگے۔ اگرچہ کھانے کا نقصان ضرور برداشت کرنا پڑیگا +

اکثر سنا ہے کہ بوڑھا دولہا نوخیز دلہن پر بُری طرح تصدق ہوا کرتا ہے۔ یہی شکایت اس "پیر نابالغ دولہا" کے احباب کو اس "دریا پار کی شادی" سے پیدا ہوگئی اور ہم کو افسوس ہے کہ احباب نے اپنا ایک پرانا رفیق خود اپنے ہاتھوں کھو دیا۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اپنے معزز ناظرین کی خدمت میں نصیحت پیش کرنے کی ضرورت ہوئی ہے کہ جب تک وہ اپنے احباب سے بالکل تنگ نہ آجائیں اس وقت تک ہرگز ان کی شادی میں مدد نہ دیا کریں +

ہاں! احباب ابتک اس بات کے خواہشمند ہیں کہ وہ دولہا سے معلوم کریں یا دیگر ذرائع سے اطمینان کر لیں کہ آیا دلہن میں تمام مطلوبہ صفات موجود بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن "مکرر دولہا" ہر ایک سوال کے جواب میں ایک پُر معنی طریقہ پر مسکرا دیتا ہے۔ اور بس +

(خاص) ہبلو

سیّاح عورت کے خط کا جواب
اُس کے فوجی مُحب کی طرف سے

(طبعزاد)

از جناب کنور محمد لیسین علی خاں صاحب

[یورپ کے ایک سرد ساحل سے۔ مورخہ ۶ دسمبر سنہ ۱۹]

حسین دلنواز و مستِ ناز!

میرے لئے محبت کا تبسّم ہمیشہ تمہارے لبوں پر رقصاں رہے!

عرصۂ دراز کے بعد جبکہ میری اُمیدوں کا جہاز نااُمیدی کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو چکا تھا۔ اور تمہاری جہاں نوردی کے شوق نے مجھ کو تمہاری نقل و حرکت سے بےخبر کر رکھا تھا۔ تمہارا نامۂ اُلفت یکایک پہنچا، دشت ریگزار کے ایک پیاسے مسافر کو آبِ سرد کا ایک لبلب جام اسقدر مسرت و فرحت نہیں پہنچا سکتا جسقدر تمہارے محبت نامہ اور تمہاری خیریت دریافت ہونے سے مجھکو پہنچائی ہے

نامہ آیا گویا عیسےٰ آیا   تنِ بیمار میں جی سا آیا

خیر اب بھی پوچھا تو مہربانی کی، غضب خدا کا دو سال کا طویل عرصہ اسقدر تاریکی میں گذر گیا کہ نہ تمہارا کوئی خط آیا اور نہ خیریت دریافت ہوئی۔ ہر جگہ ڈاک کا انتظام میسّر تھا اور رسل و رسائل خطوط کا سلسلہ موجود، برابر خط لکھ سکتی تھیں لیکن یہی کہو کہ میری محبت پر شوقِ سفر غالب رہا، آہ مجھکو اس پر بھی رشک ہوتا ہے

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری   غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

ہاں صاحب کسی کی جان جائے یا رہے آپ کی بلا سے، غمِ مفارقت کسی کا کام ہی کیوں نہ تمام کر دے مگر آپ کی بیزار سے۔ بہت اچھا

نازِ ہجنا ستایا جائے ستائو جتنا مٹایا جائے

بلا سے جان جائے جاں پہ اپنی قدم نہ پیچھے ہٹائیں گے ہم

توبہ توبہ کیسی کیسی ہولیں اُٹھتی تھیں۔ خوفناک توہمات گھیرے رہتے تھے۔ تمہارے یکایک غائب ہو جانے اور خط نہ آنے سے کبھی خیال ہوتا تھا کہ نصیب اعدا سفر میں کہیں نازک طبیعت تو ناساز نہیں ہوگئی یا خانہ بدوش وحشی اور ظالم بادیہ نشینانِ دشت کے ہاتھوں میں گرفتار تو نہیں ہوگئیں۔ خیالات کا سلسلہ اگر اس سے بھی آگے بڑھتا تو وہ روح فرسا وہم پیدا ہوتا کہ جس کو لکھتے ہوئے قلم بھی لرزتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ یہی ہوتا کہ میری نظروں میں عالم فانی کے دلچسپ مشاغل مبدّل بہ رنج و الم ہو جاتے اور زحمتِ ہستی کا نفرت انگیز بارِ گراں ناقابل برداشت ہو جاتا +

مگر خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ و سلامت واپس آگئیں۔ میری دراز شبہائے فراق مسرور مونہ روشن میں تبدیل ہوگئیں۔ کیا تم یقین کرو گی اگر میں کہوں کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا تھا جس میں تمہاری یاد نہ آتی ہو، ہر وقت میری آنکھوں میں تمہاری حسین و جمیل شکل و صورت اور ممور تھی میری ہر رات تم کو خواب میں دیکھنے کے لئے محجب کبھی سپیدۂ سحر کی ہلکی روشنی اُفق مشرق میں پھیلتی ہوئی نظر آتی تھی تو تمہارا دلفریب نورانی تبسم (جو خاص میرے لئے وقف تھا) یاد آ جاتا، طلوع ہونے والے آفتاب پر تمہارے رخساروں کا گمان ہوتا۔ اور شام کو شفق رنگین کی طلائی تحریر دیکھ کر تمہارے لبہائے نازک کی سرخی آنکھوں میں پھر جاتی۔ یہاں میں تمہاری یاد سے کبھی غافل نہیں تھا حتیٰ کہ جب ملک اور پیارے وطن کی خدمت کا مقدس فرض، نمکحلالی اور وفاداری کا پاک جذبہ اُس حشر انگیز معرکۂ دار و گیر میں پہنچا دیتا جہاں موت کی دیوی انسانی ہستیوں کا قیمتی خون اپنے قدموں میں بہا دیتی ہے تو وہاں بھی میں تمہاری شکل کو دل میں اور تمہارے خیال کو دماغ میں

لئے ہوئے جاتا ۔

میدانِ جنگ کی بہادرانہ سرگرمیوں اور سرفروش کارگذاریوں میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ تم کو اپنی جمال خیز صورت میں روبرو کھڑا ہوا پاتا ۔ جس سے میری ہمت دوگنی ہوجاتی اور رائفل کا ایسا سچا نشانہ لگتا کہ دشمن خاک وخون میں دم توڑتا نظر آتا ۔ دست بدست لڑائی میں بھی یہی خیال میرا معین و مددگار ہوتا تھا ۔ میرے پنجہ کی گرفت قبضہ پر اور زیادہ مضبوط ہوجاتی اور شمشیرِ دشمن کے کاسہ سر سے گذرتی ہوئی درمیان میں سے اُس کے دو ٹکڑے کردیتی اور میرے خاردار سنگین کے ایک ہی زبردست حملہ سے پیٹ کی آلائش باہر آپڑتی اور بالآخر میں مظفر و منصور تحسین و آفرین کے غلغلۂ شادمانی کے درمیان اپنے وطن کے پُر استقبال بازاروں میں خیر مقدم کے پُر جوش نعروں کو سنتا ہوا واپس پہنچتا ۔

میری سدا بہار گلستانِ محبت کے خوبصورت پھول !! تم سمجھ سکتی ہو کہ میری اس طویل تحریر کا ماحصل سوائے اس آرزو کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ میں عرض گذارش اور التماس جیسے عاجزانہ الفاظ میں تم جیسی ملکۂ حسن کی بارگاہ میں درخواست پیش کروں کہ آئندہ تغافل کو خیر باد کہہ کر جہاں کہیں بھی ہو اپنی خیریت کے مختصر لفظوں سے یاد و شاد کرتی رہو گی ۔ میں اس کا ضرور مشکور رہوں کہ وطن پہنچتے ہی فرصت اولین میں سب سے پیشتر تم کو اس دور اُفتادہ کا خیال آیا ۔ اور تمہارے اُن اشعار نے جو عنوانِ خط کو زیب دے رہے ہیں ، میری تمام ہجر کی کلفت اور فراق کے آلام کا خاتمہ کردیا ۔

اگر خدا کو منظور ہے تو محبت کے پروں پر اُڑتا ہوا بہت جلد تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کرونگا ۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ میری خدمت کی اہم ترین ذمہ داریاں بہت کم یہاں سے مجھ کو علیحدہ کرتی ہیں ۔

میرے اشتیاق کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے ۔ اور اُن مسرّت آگیں لمحات کا بے تابانہ منتظر ہوں کہ جب قندیلِ فلک کی نقرئی روشنی کے سیلاب میں ہم دونوں دست بدست باغ میں فوّارہ کے پاس بیٹھے ہوئے ہونگے اور تم اپنی سامعہ نواز آواز میں سیاحت کے افسانے سُنا رہی ہوگی ۔ اور انتظار ہے پُر کیف فضا کی اُس بہار افروز سہر ایک شام کا جس میں گل افروز گلشن کے نزہت آگیں کنج ہماری نگہت سے لبریز ہوں اور تمہارے کاکلِ عنبریں روئے تاباں کے گرد ایک آبنوسی حلقہ بنائے ہوئے ہوا کی شوخیوں سے دوشِ بلوریں پر منتشر ہوں اور ہر ایک صبح خنداں کو صحن لالہ زار ہمارے استقبال کے واسطے گل بداماں نظر آئے اور ہم ایک دوسرے سے ایامِ جدائی کے قصص بیان کرتے ہوئے چہلقدمی میں مصروف ہوں ۔

وطن میں پہنچنے سے جو خوشی تم کو ہوئی وہ حیرت انگیز نہیں ۔ بے شک ۔

حُبِ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر ۔۔۔ خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

لیکن وطن کی قدر بھی پردیس کی مصیبتیں اور تکالیف اُٹھانے کے بعد ہی ہوتی ہر چیز کی قدر و قیمت اپنے مامن سے علیحدہ ہونے کے بعد معلوم ہوتی ہے ، جو کان سے نکل کر تاجِ شاہی میں جگمگاتے ہیں ۔ موتی دریا سے باہر آکر کسی ماہرو کے گلوئے مصفّٰی کی زیب و زینت ہوتا ہے اور گل خوشرنگ چمن چھوڑنے کے بعد گلے کا ہار ہوتا ہے ۔

ایک زمانہ میں جبتک میری خدمات اپنے پیارے وطن کے لئے وقف نہیں ہوئی تھیں ۔ میں نے بھی برّاعظم یورپ و افریقہ کا سفر کیا تھا جس کے حالات بروقت ملاقات تم کو سناؤں گا ۔ میں یورپ کے معروف شہر اور شہروں کے مشہور مقامات کو دیکھتا ہوا فرانس سے گذر کر کوہسار پیرنیز کی سدا بہار اور ہری بھری گھاٹیوں کو عبور کرکے اسپین پہنچا ۔ وہ اسپین کہ جس کا ذرہ ذرہ اپنے ملک کی عظمت شہرت اور اُس میں حکومت کرنے والے جلیل القدر اور اولوالعزم فرمانرواؤں کی کشورستانی اور آئین جہانبانی کی داستانوں سے معمور ہے ۔ غرناطہ ، طلیطلہ قرطبہ جیسے شہروں کی سیر کی جہاں شاہان اسلام کے بنائے ہوئے فلک بوس محلات دیکھے ۔ جن کے خوبصورت نقش و نگار اور وسعت و پختگی ماہرفن اور جدت پسند صنّاعوں کی دستکاری کا اعلیٰ نمونہ ظاہر ہورہے تھے ۔ میرے پاس سب کی تصاویر موجود ہیں جو تم کو دکھاؤنگا اور تم سے مشرقی ممالک کا حال سنونگا ۔

تم نے ہندوستان بھی دیکھا ہوگا ۔ وہ ہندوستان جو موسمی اعتبار سے اعتدال پسند واقع ہوا ہے ۔ سنا ہے وہاں گرمی بھی ہوتی ہے اور سردی بھی موسلا دھار بارش بھی ہوتی ہے اور آفتاب بھی چمکتا ہوا نکلتا ہے ۔ اور ماہتاب بھی خندۂ ضیا بار سے اُس حصہ زمین کو منور کرتا ہے ، تم نے راجپوتانہ کے تپتے ہوئے ریگستان ، بادِ سموم کی لپٹیں اور آندھیوں کے طوفان بھی اُٹھتے ہوئے دیکھے ہونگے اور کشمیر جنت نظیر کی پُر فضا وادیاں ، فرحناک باغات ۔ اور مصفّٰی آبشاروں کی بھی سیر کی ہوگی ۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد ۔ آگرہ کا تاج محل اور ایسی ہی بہت سی عمارتوں کو بھی دیکھا ہوگا ۔ اور وہاں کے باشندوں کی بود و باش ، تمدن و ارتقا کا بھی بغور مطالعہ کیا ہوگا ۔ باشندگانِ ہند کے متعلق عجیب روایات سنی ہیں کہ چونکہ وہاں مختلف اقوام مختلف مذاہب کو ماننے والی آباد ہیں ۔ اس لئے کبھی مذہبی اختلافات جدال و قتل کی کشمکش اور منافرت کا سبب بن کر ایک دوسرے کو خون کا پیاسا بنا دیتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر فسادات رونما ہوجاتے ہیں ۔ اور کبھی یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ

متفق ہو کر باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں ۔ اور اتفاق و اتحاد کی ایک ایسی روح اس میں سرایت کر جاتی ہے کہ دیکھنے والا بیاں کرتا ہے کہ یہ وہ بھائی بھائی ہیں جو آپس میں برسر جنگ ہونا جانتے ہی نہیں ۔ بھلا تم ایسی ذہنیت کو کیا کہو گی ؟

جی تو نہیں چاہتا کہ اپنے نامۂ شوق کو ختم کر دوں ۔ انتہائے مدعا اور عرض مطلب کے واسطے دفتر بے پایاں درکار ہے ۔ لیکن خیال ہے کہ کہیں یہ طویل تحریر تمہاری طبع نازک کو گراں نہ گزرے ۔ لہٰذا خط کو ختم کرتا ہوں ۔ اور جواب کے انتظار میں آنکھیں برابر ہر کارہ فلک کی طرف نگراں رہینگی +

کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ اس مرتبہ بھی دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں اور مہینے سال میں تبدیل ہو جائیں ۔ اور اس خط کے جواب کو تمہاری طرف سے جواب ہو جائے ۔ اور میں عالمِ وحشت میں چلاتا پھروں ؎

ہم آن کو نامے ہزار لکھتے جو کچھ بھی چشمِ امید ہوتی
جواب تقدیر دے چکی ہے ۔ جواب ہم لیکے کیا کرینگے

(خاص) (گنور) محمد لیسین علیخاں

"وہ واپس کیوں نہیں آتے"

اُنھوں نے دبی آواز میں کہا "میری پیاری ! ذرا دروازہ اونچی کرو" میں نے کرخت لہجہ میں جواب دیا :-

"بس یہاں سے چلے جائیے" لیکن وہ قطب از جا نمی جنبد کا مصداق بنے میرے سامنے کھڑے تھے ۔ میرے دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں میں تھے ۔ میں نے کہا "مجھے چھوڑ دو" لیکن انھوں نے نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا اور نہ جانا تھا نہ گئے +

وہ اپنا چہرہ میرے کانوں تک لائے ۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا "تم کو شرم نہیں آتی ؟" لیکن اُن کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی +

اُن کے لبوں نے میرے رخساروں کو چھوا ۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی ۔ اور میں نے اُن سے کہا "تم بڑے ڈھیٹ ہو" مگر اُن کو شرم کہاں +

اُنھوں نے میری چوٹی میں پھول گوندھے ۔ میں نے کہا "یہ سب بیکار ہے" لیکن اب وہ . . . . . . وہ نہ تھے +

اُنھوں نے میری گردن سے پھول کا ہار اُتار لیا اور چلدیے ۔ میں دل ہی دل میں پچھتاتی ہوں ۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ "وہ واپس کیوں نہیں آتے" +

(ٹیگور) (خاص) اظہر فاروقی اودے پرتاپ کالج بنارس

اس میں میرا کیا قصور ہے

از جناب محمد حکیم جعفری۔ بی۔ اے۔ ایڈوکیٹ۔ جونپور

ہماری بھی عجیب عادت ہے۔ جہاں کسی ایسے شخص کو دیکھا جس میں حماقت کے جراثیم موجود ہوں۔ فوراً اُس سے بغض للہ ہو جاتا ہے اور خواہ مخواہ اُس کی صورت دیکھ کر خون کھولنے لگتا ہے ۔۔۔۔۔ قسمت بھی ہم نے وہ پائی ہے کہ جہاں ریل کا سفر ہم نے کیا چاہے ایک ہی اسٹیشن جانا ہو۔ ایک نہ ایک ایسا شخص مل ہی جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ میرا قصور ہے۔ اور خود مجھے بھی شبہ سا ہو چلا ہے۔ جس کی وجہ سے میں نے سفر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اور بالکل "غیر منقولہ" ہو گیا ہوں۔ مگر تقاضائے بشریت کبھی کبھی قطبیت کو بالائے طاق رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اگر ایسی صورت میں بھی کسی ایسے شخص سے مڈبھیڑ ہو جائے تو آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اسمیں میرا کیا قصور ہے +

شامت اعمال سے مجھے سہارنپور سے بنارس کا سفر درپیش ہوا۔ لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ٹالا بتا دوں۔ مگر ضرورت بھلا کیوں ماننے لگی۔ مجبوراً سنگ آمد وسخت آمد سمجھ کر تن بہ تقدیر چل کھڑا ہوا۔ اور یہ تہیّہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو میں کسی ایسے شخص کا خیال بھی دل میں نہ آنے دونگا جس سے مجھے نفرت ہو۔ چنانچہ سارا زور صرف کر کے ذہن کو ہر طرف سے خالی کر لیا۔ اور ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے ڈبہ میں جس میں صرف تین بنچیں ہوتی ہیں۔ جا کر بیٹھا کہ نہ زیادہ آدمی آئیں گے نہ کسی ذات شریف سے ملاقات ہوگی۔ اس ڈبہ میں پہلے سے ایک بنچ پر ایک بنگالی بابو مع اپنے "زنانہ" کے جلوہ فرما تھے۔ دوسری بنچ پر ایک سکھ صاحب رونق افروز تھے۔ صرف ایک بنچ خالی تھی۔ جس پر خاکسار نے ڈیرا ڈالا۔ اللہ اللہ کر کے لکھسر تک راستہ بخیر و خوبی کٹ گیا۔ مگر گاڑی کا لکھسر اسٹیشن پر پہنچنا تھا کہ ایک جم غفیر نظر پڑا۔ میری بدقسمتی سے صاحب لوگ منصوری پہاڑ سے اتر رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ واپس جا رہے تھے۔ میرا ماتھا دیکھتے ہی ٹھنکا کہ یہاں سے خیر بہت گذر گیا مگر [illegible]

[illegible] اس خیال کا آنا تھا کہ دروازہ ایک [illegible]

خدا کی پناہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہجوم اسی ایک درجہ میں بھرنا چاہتا ہے۔ بہت بہت لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بھائی اس ڈبہ میں جگہ نہیں۔ آگے والا درجہ بالکل خالی پڑا ہے۔ مگر کون سنتا ہے۔ ایک صاحب نہایت چراغ پا ہوئے کہ "جناب! آپ ہی اس خانہ میں چلے جایئے" اس مسکت جواب کے بعد کسی سے کچھ کہنے کی ہمت مجھ میں باقی نہ رہی اور ایک کونے میں خاموش بیٹھ رہا اب کیا تھا۔ وہ طوفان برپا ہوا کہ الامان۔ گویا انگریزی خندق میں جرمن گھس پڑے یا دوبارہ ۱۸۵۷ء کا غدر مچ گیا۔ گاڑی تھی کہ نہ اب چلنے کا نام لیتی تھی۔ نہ تب۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انجن ڈرائیور افیم کھا کر پینک میں آ گیا یا گارڈ نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا۔ یا شاید سوراج ہو گیا۔ انتظار کرتے کرتے میں عاجز آ گیا۔ بارے خدا خدا کر کے گاڑی چلی۔ باہر کی یورش بند ہوئی اور اندر کا تلاطم کم ہوا تو سانس لینے کی مہلت ملی۔ جو سین نظر پڑا اس کو دیکھ کر ہوش و حواس دونوں غائب ہو گئے۔ کم و بیش دو درجن اور کئی درجن بکس۔ بستر۔ پہاڑی لاٹھیوں کے بنڈل۔ سب اس طرح تلے اوپر دھرے ہوئے تھے کہ سواریوں اور اسباب میں فرق کرنا مشکل تھا۔ اور سب پر طرّہ یہ کہ میری بنچ پر بغل ہی میں ایک ذات شریف موجود +

ذرا حضرت کا حلیہ ملاحظہ ہو۔ چند فٹ کے تو آپ خود۔ اس پر کم از کم ایک فٹ کے بال جو سر پر بالکل کھڑے کھڑے تھے (میں نے بچپن میں ایک تصویر کہیں دیکھی تھی۔ جو شیطان کی کہی جاتی تھی۔ اُس کی خصوصیت صرف اتنی یاد ہے کہ اُس کے سر کے چاروں طرف لمبے لمبے بال عمود کی طرح کھڑے تھے۔ چنانچہ میرے ذہن میں شیطان کی یہی صورت قایم ہے اور میرے نزدیک اس کی پہچان بھی یہی ہے۔ کسی شخص کے سر کے بال اگر کھڑے ہوں تو میرے دل میں فوراً خیال گزرتا ہے کہ کہیں یہی شیطان نہ ہو) نہایت پتلی اور لمبی ٹانگیں جس پر آپ نے نکر یا انگریزی وضع کا گھٹنا [illegible] لمبا موزہ پہن رکھا تھا۔

جس سے آپ کی لمبائی میں معتدبہ اضافہ معلوم ہوتا تھا۔ قابلیت آپ نے یہ فرمائی تھی کہ باوجودیکہ اکتوبر کی شام تھی اور اندھیرا ہو چکا تھا۔ مگر عینک جناب نے وہ لگا رکھی تھی جو مئی جون میں دھوپ سے حفاظت کے لئے لگائی جاتی ہے۔ گویا جتنی روشنی اس وقت تھی خیر سے وہ بھی آپ کے لئے زیادہ تھی۔ پھر آپ ہی بتایئے کہ مجھے ان بزرگوں سے کیسے چڑھ نہ ہوتی اور اسمیں میرا کیا قصور تھا +

حضرت کا قرب ہی سوہان روح تھا۔ مگر معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا۔ تو میں مان لیتا کہ میرا ہی قصور تھا۔ حضرت نے حرکتیں وہ شروع کیں کہ ہر شخص کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک جائے۔ میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ بھی یقیناً وہی کرتا جو میں نے کیا +

وہی (نہایت کرخت اور تحکمانہ لہجہ میں) کہئے صاحب کہاں جایئے گا +

جی میں تو آیا کہ اُن کے لہجہ کا خیال کرتے ہوئے کچھ ٹیڑھا سا جواب دوں۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں میرا ہی قصور نہ ہو بہ سہولت جواب دیا :-

میں۔ مجھے بنارس جانا ہے +

وہی۔ آہا۔ خوب۔ تو آپ بھی میرے ساتھی ہیں +

بتایئے اسمیں میرا کیا قصور تھا۔ اگر میں نے اپنے دل میں کہا کہ "خدا نہ کرے میں آپ کا ساتھی بنوں" اور اس سلسلہ میں حفظ ماتقدم کی جتنی دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں اور آفات و بلیّات سے بچنے کے جتنے ٹوٹکے معلوم تھے سب کر ڈالے +

وہی۔ (آپ ہی آپ) مجھے جانا تو دراصل ہے گورکھپور۔ مگر چونکہ راستہ معلوم نہیں تھا میں نے اپنا سارا اسباب بنارس کو بک کرا دیا ہے +

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا: "بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ اپنا اسباب ہوڑا اسٹیشن کے لئے بک کرا دیتے"

وہی۔ مگر اس میں دقت یہ تھی کہ ہم لوگ گورنمنٹ سروس والے بڑے مجبور ہیں۔ آئے دن تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اسباب کے لئے کرایہ ہمیشہ ناکافی ملتا ہے۔ اس لئے ہم لوگ سب سے قریب کا راستہ اختیار کرتے ہیں ——— میں سب رجسٹرار ہوں۔ میرا تبادلہ منصوری سے گورکھپور کو ہو گیا ہے۔ اسباب میرے ساتھ بہت ہے۔ آپ کے ساتھ بہت تھوڑا اسباب ہے۔ آپ کیا کام کرتے ہیں +

میں۔ وکالت کرتا ہوں +

وہی۔ کہاں +

میں (اپنے جی میں ــ اسوقت تو جہنم میں) لکھنؤ میں +

وہی۔ کتنی ماہوار آمدنی ہوگی +

آپ ہی بتایئے اسمیں میرا کیا قصور تھا۔ اگر میں نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں اور سوتا بن گیا۔ ذات شریف نے اپنے سوال کو دہرایا۔ مگر یہاں عمداً برخاست۔ پھر آپ ہی آپ یہ کہہ کر کہ "اچھا آپ سو گئے" دوسری طرف مُڑ گئے۔ اور میری جان میں جان آگئی +

حضرت کی بغل میں دوسری طرف ایک بیچارے صورت شکل کے بھلے آدمی بیٹھے تھے۔ بغیر کسی تمہید کے آپ نے اُن سے فرمایا +

وہی۔ آپ کیا کام کرتے ہیں +

بھلے آدمی۔ میں ریلوے میں انجنیر ہوں +

وہی۔ اخاہ۔ آپ بھی میری طرح گورنمنٹ سروس میں ہیں +

انجنیر۔ جی ہاں یہی سمجھ لیجئے +

وہی۔ کیا تنخواہ پاتے ہیں +

انجنیر۔ میں ابھی مقرر ہوا ہوں۔ ساڑھے چار سو پاتا ہوں +

وہی۔ کہاں سے آپ نے پاس کیا ہے۔ گورنمنٹ سروس میں تو باقاعدہ ڈگری کی ضرورت ہوتی ہوگی +

انجنیر۔ لندن سے +

وہی۔ کس درجہ میں +

انجنیر۔ اوّل درجہ میں +

وہی۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ سروس میں لئے گئے۔ کہاں جا رہے ہیں +

انجنیر۔ نینی تال +

وہی۔ کیوں +

انجنیر۔ سرکاری کام سے +

وہی۔ یعنی گورنمنٹ سروس پر جا رہے ہیں۔ تو آپ کے پاس تو ریلوے کا پاس ہوگا +

انجنیر۔ جی ہاں +

وہی۔ تو آپکو اسباب بُک کرانیکی زحمتوں کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے +

انجنیر۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس وقت میرے پاس زیادہ سامان نہیں ہے +

وہی۔ (درجہ کے سارے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مجھے دیکھئے کہ اتنا سامان تو ساتھ ہے اور مال گاڑی کا ایک پورا ڈبہ اسباب بک کرا چکا ہوں +

انجنیر۔ تو آپ اتنا سامان کیوں رکھتے ہیں کہ زحمت ہو +

وہی۔ جی۔ ہم لوگ گورنمنٹ سروس والے اتنا سامان رکھنے پر مجبور ہیں +

انجنیر (مسکرا کر) میں تو ایسا کوئی قاعدہ نہیں جانتا +

وہی۔ (نہایت متانت سے) کوئی سرکاری قاعدہ نہیں۔ بلکہ اپنا رعب قایم رکھنے کے لئے +

جب غریب انجنیر پر جرح ہو رہی تھی۔ میں بار بار ارادہ کرتا تھا کہ حضرت سے کہدوں کہ ایک سوال باقی رہا جاتا ہے۔ یعنی انجنیر صاحب بدھ کے دن انڈے کھاتے ہیں یا نہیں۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں میرا ہی قصور نہ ہو خاموش ہی ہو رہا۔ ایک گھنٹہ سر کھپانے کے بعد جس میں کم از کم سیکڑوں مرتبہ گورنمنٹ سروس کا لفظ ذات شریف نے استعمال کیا ہوگا۔ انجنیر صاحب خاموش ہو رہے۔ اور اُن کی خوش قسمتی سے بریلی کا اسٹیشن بھی آ گیا۔ جہاں نینی تال جانے کے لئے انہیں گاڑی بدلنی تھی۔ اس طرح اُن کی گلو خلاصی ہو گئی +

ذات شریف نے دو ایک جملے سامنے والی سکھ بنچ کے سکھ مسافر پر بھی کئے۔ مگر اس نے سُنی اَن سُنی ایک کر دی۔ شاید اس اثنا میں وہ ان سے واقف ہو گیا تھا۔ بنگالی بابو کو حضرت نے مخاطب کرنا چاہا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ ان کی زد سے باہر تھے اور اپنے "زنانہ" سے باتوں میں اسقدر منہمک کہ ہمارے ذات شریف کو مداخلت بیجا کرنے کی ہمت نہ پڑی اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے +

کوئی اور شکار پھنستا نہ دیکھ کر یا کسی اور کو لائق خطاب نہ پا کر ہمارے بزرگوار نے سونے کی اور مجھ پر آفت ڈھانے کی ٹھہرائی یعنی اس چھوٹی سی بنچ پر جس پر صرف ایک آدمی سو سکتا ہے۔ باوجودیکہ دو آدمی آپ کے سرہانے ابھی بیٹھے تھے اور میں پائنتی کونے میں بیٹھا تھا۔ آپ نے لمبی تانی۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی گئی۔ آپ کا پاؤں بھی پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ آپ تقریباً کل بنچ کے مالک تھے میں سکڑتے سکڑتے کونے میں اسقدر چپک گیا تھا کہ میرا عدم اور وجود دونوں برابر تھا +

لوگ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آتی ہے۔ پہلے اگر مجھے اس میں کچھ شبہ تھا تو وہ دور ہو گیا۔ اور اس رونے کے بعد یقین ہو گیا یعنی باوجود اس کوفت کے بھی میری آنکھ لگ گئی +

شاہجہانپور کے اسٹیشن پر ایک گرومین (ٹکٹ کلکٹر) نے آ کر ٹکٹ مانگا۔ اندازاً رات کے تین بجے ہونگے۔ میں نے اپنا ٹکٹ حوالے کر دیا۔ جب ذات شریف سے ٹکٹ مانگا۔ تو لگے جھگڑا کرنے +

وہی۔ آپ لوگوں کی یہ کیا عادت ہے کہ رات ہی کو آ کر جگاتے ہیں +

گرومین۔ میں مجبور ہوں میری ڈیوٹی یہیں سے شروع ہوتی ہے +

وہی۔ تو آپ کو معلوم نہیں کہ رات کو جگانے کا حکم نہیں ہے +

گرومین۔ یہ قاعدہ صرف اونچے درجہ کے مسافروں کے لئے ہے +

وہی۔ کیا معنی ہم آدمی نہیں۔ آپ جانتے نہیں کہ میں گورنمنٹ سروس میں ہوں +

گرومین۔ تو آپ اوّل یا دوئم درجہ میں کیوں سفر نہیں کرتے کہ رات کو جگائے نہ جائیں۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ مگر جھگڑا جاری رہا +

یکبارگی کان میں ایک ہونہہ کی آواز آئی جیسے کسی نے گھونسہ چلایا ہو اور وار خالی گیا ہو۔ آنکھ کھول کر دیکھتا ہوں کہ ذات شریف کھڑکی میں سے نصف سے زیادہ جسم نکالے گرومین سے مکہ بازی کی مشق کرنے کی سعی بلیغ فرما رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ چلاتے بھی جاتے ہیں۔ مکہ جو خالی گیا تو آپ نہایت تیزی سے باہر نکلے اور گرومین ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ کہ "چلو گارڈ سے تمہاری شکایت کرتا ہوں۔ کہ میں نے ساڑھے چار ٹکٹ تمہیں دیئے اب تم ساڑھے تین ہی واپس کر رہے ہو

گرومین۔ آپ گارڈ سے شکایت کریں یا جس سے جی چاہے۔ جتنے ٹکٹ آپنے مجھے دیئے تھے۔ میں نے اُتنے ہی واپس کئے۔ بھلا میں آپ کا ٹکٹ لیکر کیا کرتا +

وہی۔ میں نہیں مانونگا تمہیں چلنا ہوگا +

غرضکہ نہایت شدّ و مد سے وہ بزرگوار گرومین کو گھسیٹ کر لیگئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہانپتے ہوئے گاڑی میں آ کر پھر بیٹھ گئے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ میں پھر سو گیا۔

ہردوئی کے اسٹیشن پر جب گاڑی رُکی تو وہی گرومین پھر آیا۔ اور کہا کہ "جناب اپنی جیبوں میں پھر تلاش تو کیجئے۔ شاید کوئی ٹکٹ رہ گیا ہو۔ ہمارے بزرگوار نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نہایت زور سے انگریزی میں چیخ پڑے +

"آئی بگ یور پارڈن" (میں آپ سے معافی مانگتا ہوں)

بتائیے اگر ایسے شخص سے بغض للہ ہو جائے تو

اسمیں میرا کیا قصور ہے

"مظلوم"

(خاص)

ننّھا ادیب

از جناب صوفی صفوۃ اللہ بیگ صاحب دہلوی

(۱)

میرے دوست ارشاد کا گھر آجکل خوشی کا منبع اور مخزن بنا ہوا ہے۔ ہر ایک شخص کے چہرے پر انتہائی خوشی کے نشان ہویدا ہیں۔ دیکھنے والوں کو اشتباہ ہوتا ہے کہ یا تو کارکنانِ قضا ان کے گھر کو اپنی فہرست میں درج کرنا بھول گئے ہیں۔ یا ان کے دل میں بھی اتنا رحم پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اس خوشی کو جو ننھا ارشد اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ اپنی بے جا دست درازیوں سے ملیامیٹ کرنا نہیں چاہتے۔ بچے سب کے ہاں ہوتے ہیں۔ بچے سب کو پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ننھا ارشد جس دلفریبی اور کشش کا مالک ہے۔ وہ ضرور غیر معمولی ہے +

دن گذر گئے اور گذر رہے ہیں۔ ننھا ارشد اب خاصا بڑا ہو گیا ہے۔ اُس کی صحت نے اس کی خوبصورتی کو اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔ وہ اپنے پنگھوڑے میں لیٹ کر اور اپنے انگوٹھے کو اپنے منہ میں لیکر جب اِدھر اُدھر غور سے دیکھا کرتا ہے تو میں محسوس کیا کرتا ہوں کہ وہ اس دنیا کا جائزہ لے رہا ہے جس وقت وہ اپنی بڑی بڑی گول گول آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہے تو میرا دل مرعوب ہو جاتا ہے۔ جب میں اُسے دیکھتا ہوں تو مجھے خود تعجب ہے کہ کیوں میرا دل انتہائی خوشی محسوس کرتا ہے +

(۲)

آج ارشد کی پانچویں سالگرہ ہے۔ تمام گھر ابھی تک خوشی کا مخرج بنا ہوا ہے۔ آج اُس کے دوست۔ جو کہ بہت ہی ننھے ننھے سے خوبصورت بچے ہیں۔ جمع ہو رہے ہیں۔ ارشد کی میز تحفوں سے بھری ہوئی ہے +

وہ خوش ہے اور اپنے کھلونوں اور تحفوں کو کنکھیوں سے دیکھ رہا ہے اُس نے اپنے ایک دوست حمید کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور کہنا شروع کیا۔

"تم مدرسہ جاتے ہو نا۔ ہماری امّی تو ہمیں کہیں نہیں بھیجتیں کہتے ہیں مدرسے میں کھلونے ہوتے ہیں۔ اچھے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے لئے خوبصورت تصویروں والی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے ماسٹر صاحب بڑے اچھے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں ہم رسالہ منگا دیں گے۔ ویسا ہی جیسا ابا پاس آتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ تمہیں اردو پڑھنی آجائے تو تم بھی ابا کی طرح کہانیاں لکھ لکھ کر تصویروں والے رسالے میں بھیجنا۔ کیوں نا کیسی اچھی بات ہو گی ——— میں نے ایک کتاب ا۔ ب۔ ت کی لکھی ہے۔ اُس میں اپنا سبق۔ ہندسے۔ نام سب لکھا ہے۔ اُسے چھپا کر رکھ چھوڑا ہے بڑا ہو جاؤں تو چھپواؤنگا۔ سب کہیں گے بھئی واہ میاں ارشد تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ چپکے ہی چپکے کتاب چھپوا ڈالی۔ پھر کیسا مزا آئیگا۔ ہاں جی ہاں"

"ہمیں تو دکھاؤ"

"اچھا"

(۳)

ارشد آج صبح سویرے اٹھا۔ اب وہ ساڑھے چھ برس کا ہے۔ آج اُس کا دل کسی آنے والی خوشی کا انتظار کر رہا ہے۔ اُس کا چہرہ اس بات کا ثبوت دے رہا ہے۔ کہ وہ انتہائی خوش ہے۔ وہ اِدھر اُدھر چلتا پھرتا ہے۔ وہ خود متحیر تھا۔ کہ وہ کیوں اتنا خوش ہے۔ اور اُس کے لئے اُس کی خوشی خود ایک معمہ تھی۔ ڈاکیہ روز آتا تھا اور کہتا تھا "خط منگا لیجئے صاحب" لیکن آج جب وہ آیا تو ارشد کو اس کی آواز موسیقی سے زیادہ دلکش معلوم ہوئی۔ وہ دوڑا ہوا گیا۔ اور اُس سے ڈاک لے لی +

"آبا! پھول آگیا" اُس نے جلدی سے کہا۔ پھول کو کھول کر وہ فرطِ خوشی سے چلّا اٹھا "امّی میری کہانی بھی چھپ گئی دیکھو کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ننھی کی کہانی ننھی کی زبانی اور آگے میرا نام بھی لکھا ہے" +

وہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔ اُس کا دل رقص کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دنیا خوشی سے لبریز نظر آ رہی تھی +

(۴)

میرا تبادلہ ہوگیا ۔ اس لئے میں اپنے دوست ارشاد اور اپنے ننھے منے عزیز ارشد سے وداع ہوکر چلا گیا ۔ کبھی کبھی اکا دکا ایک آدہ خط آجاتا اور میں خوش ہوتا کہ ابتک ننھا ارشد مجھے یاد کرتا ہے ۔

مجھے آئے ہوئے کوئی چھ سات مہینے ہوگئے ۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ ڈاکیہ ایک کارڈ لایا جس میں لکھا تھا :۔

پیارے دوست صوفی

آہ ! کیسے لکھوں ۔ کس قلم سے لکھوں ۔ کہ تمہارا دوست ۔ تمہارا عزیز اس دنیا میں نہیں ہے ۔ اور وہ ہم سب کو داغ مفارقت دے چکا ۔ آہ اُس نے کیسے پیارے مرتے وقت تمہارا نام لیا ۔ میرا کلیجہ منہ کو آرہا ہے ۔ قلم کانپ رہا ہے ۔ آہ ۔ رخصت ۔

غمزدہ ارشاد

میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ۔ میں نے قلم رکھدی ۔ میرا سر چکرا رہا تھا ۔ اور مجھے اس دنیا کی خبر نہ تھی ۔

(۵)

دن ۔ دن سے مہینے ۔ اور مہینوں سے سال گذر گئے ۔ اب کے عید پر میں دہلی گیا ۔ شام کو جبکہ تمام شہر جامع مسجد پر عید کی سیر کرنے زرق برق کپڑے پہنے جمع ہورہا تھا ۔ میں شہر سے باہر ٹہلتا ٹہلتا چلا گیا ۔ میں جارہا تھا ۔ اور بہت تیز جارہا تھا ۔ میں ضرور کہونگا کہ میں ایک کشش محسوس کررہا تھا ۔ جو کہ مجھے کھینچ رہی تھی ۔ میں قلعہ کے پیچھے دور تک غیر آبادی اور گھانس میں چلا گیا ۔ وہاں ایک قبر دکھائی دی ۔ حوادثات زمانہ نے اُس کو توڑ دیا تھا ۔ یہ نہایت چھوٹی سی قبر تھی نیم کے پتے اُڑ اُڑ کر اُس پہ پڑ رہے تھے ۔ اور آرام کرنے والے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ اب اُس کو اُن کی طرح خوف خزاں نہیں ہوتا اب دنیا کی کوئی طاقت اُس کو برباد نہیں کرسکتی ۔ اب وہ حیات جاودانی کا مالک ہے ۔ میں آگے بڑھا ۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی ۔ میری نظر کتبہ پر پڑی ۔ اور میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ۔

"ننھا ادیب"

ارشد

۱۹۲۸ء

میرے اوپر پھر جنون طاری تھا ۔ آہ ! میرے پیارے ۔ میرے دوست ۔ میرے ——— تو یہاں اسقدر آرام کی نیند سو رہا ہے ۔ جبکہ تمام دنیا عید کے مزے لوٹ رہی ہے ۔ لیکن تیرا دل ۔ مجھے یقین ہے اُن سے زیادہ خوش ہوگا ۔ اے بے لوث فرشتے ! اے معصومیت کے سرتاج !! اے اقلیم سکون کے بادشاہ !!! سو اور آرام سے سو ۔ لیکن میرے دل ۔ اندوہگیں دل کا خیال رکھ ——— لا فاتحہ پڑھ دوں ——— پھول یہاں کہاں سے لاؤں ——— آہ ! تو تو خود پھول تھا ۔ پھول سے زیادہ نازک تھا ۔ کلی سے زیادہ جوان تھا ۔ تیری لحد جنت کے پھولوں سے بھری ہوئی ہوگی ——— پھر تو اس دنیا کے مرجھانے والے پھولوں کی کیوں قدر کرنے لگا ———

——— آج عید ہے ——— عید نمبر نکل رہے ہیں ——— لوگ خوش ہیں ۔ بشاش ہیں ——— اسلامی دنیا میں چہل پہل ہے ——— لیکن تو گواہ رہیو کہ میری آنکھیں تیرے سوگ میں خونچکاں ہیں ——— ننھے ادیب ! اب رخصت ——— پھر آؤنگا ——— تو خود ادیب تھا ۔ تو کسی عید نمبر کے لئے تیرے حال سے زیادہ کیا کوئی چیز خوش ہوسکتی ہے ؟

(خاص)

صفوۃ اللہ بیگ

"شاہجہان کی رحلت"

پروفیسر جادو ناتھ سرکار کا ایک تاریخی مقالہ

مترجمہ جناب ظفر قریشی دہلوی ۔ متعلم بی ۔ اے

باب اوّل

بادشاہ اور زنداں کی سلاخیں

فتحمند بیٹے کی قیادت میں جب شاہجہان نے آگرے کے دروازے کھول دیئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمر کے بقیہ حصہ کے لئے ایک "شاہی قیدی" بنادیا گیا۔ "بادشاہوں کے بادشاہ" کے لئے یہ فوری انقلاب بیحد صبر آزما اور تلخ تھا۔ اور گو ابتداءً میں اُس نے "شرف" سے احتراز کرنے کی انتہائی جدّ و جہد کی ۔ مگر بیٹے کے آہنی ارادہ کے آگے ایک نہ چلی اور مجبوراً مقید ہونا ہی پڑا۔ ابتدا ہی سے حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی تھی کہ شاہجہان کے لئے فرار یا آزادی بالکل ناممکن ہوگئی تھی ۔ بوڑھا تھا ۔ ضعیف و نحیف تھا ۔ امراد اکابر فاتح سے جا ملے تھے ۔ اب سوائے حرم کی عورتوں ۔ اور خواجہ سراؤں کے اسکا نہ کوئی مشیر تھا اور نہ صلاح کار ۔ چاروں طرف مظفر بیٹے کی فوج گھیرے پڑی تھی ۔ اور ادر دیگر جاسوسوں کی نگرانی دن رات ہورہی تھی ۔ وفادار لڑکا دارا شکوہ بھی اس سے دور تھا ۔ علاوہ ازیں خطوط اور پیغامات پر بھی اورنگ زیب نے سخت محاسبہ کر رکھا تھا ۔ اس لئے بیرونی دنیا سے اسے کسی امداد کی توقع نہ تھی ۔ نہ بازوؤں میں دم تھا کہ میدان میں نکل سکے ۔ اور نہ پشت پناہی کے لئے جانباز و وفادار امرا تھے ۔ جو آڑے آسکتے ۔ غرض ایک "مغل اعظم" فطرت کی ستم ظریفی کا مرکز تھا ۔ اور ضرورت تھی کہ وہ سٹیج سے اب رخصت ہو جائے ۔ مگر وہ اس قانون کی سنجیدگی کو محسوس کرنے میں بہت سہل انگاری سے کام لے رہا تھا۔

جب ۸ رجون ۱۶۵۸ء کو شہزادہ محمد سلطان اپنے باپ کے ایما سے مفتوح شاہجہان سے قلعۂ آگرہ میں ملنے آیا تو بوڑھے دادا نے بہت التفات اور محبت سے استقبال کیا اور مشہور ہے کہ اُس نے اس نوجوان کی تعریف و توصیف کے بعد اُسے ورغلانے کی کوشش بھی کی تاکہ وہ شاہجہان کے نائب کی حیثیت سے تخت پر بیٹھ جائے اور اورنگ زیب کے خلاف علم بغاوت بلند کردے ۔ جس کی امداد کے لئے شاہجہان اپنے شاہی وقار کو کام میں لانے کی کوشش کرنے کا وعدہ کر رہا تھا۔

نہیں کہا جا سکتا کہ فی الحقیقت ایسی کوئی تجویز نوجوان شہزادہ کو پرچانے کے لئے پیش کی بھی گئی تھی یا نہیں ۔ لیکن اگر فرض کر بھی لیا جائے ۔ تو یہ ظاہر ہے کہ شہزادہ نے اسے فوراً رد کر دیا ہوگا ۔ کیونکہ اورنگ زیب کے ایلچی اور باپ بیٹے کے درمیان ذریعہ پیام رسانی کے علاوہ شہزادہ کی علیحدہ کوئی حیثیت نہ تھی ۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ قلعہ کی ایک ایک منٹ کی حالت سے اورنگ زیب کو باخبر کرے ۔ شاہجہان کی ہر نقل و حرکت اور گفتگو اور ارادہ سے باپ کو خبردار کرتا رہے ۔ اس کے علاوہ اُسے کچھ اختیار نہ تھا ۔ فوج کا کامل اختیار اورنگزیب کے ہاتھ میں تھا ۔ اس لئے کسی بغاوت کا خیال لاحاصل تھا ۔ علاوہ ازیں قلعہ کے مکین بالکل بے دست و پا تھے ۔ کیونکہ کوئی شخص اس میں داخل نہ ہوسکتا تھا جبتک اورنگ زیب کی اجازت حاصل نہ کرلی گئی ہو اور وہ قلعہ کی آمد و رفت پر سخت احتساب قایم کئے ہوئے تھا ۔ اگر اُس کا لڑکا باغی ہو بھی جاتا تو باپ کا عتاب اور اُس کی سزا بیحد لرزہ خیز ہوتی۔

اُس وقت کی بعض تواریخ میں جن کی حیثیت دوئم درجہ کی سمجھی جاتی ہے

یہ بھی واقعہ درج ہے کہ شاہجہان نے قلعہ آگرہ میں ملنے کے لئے اورنگ زیب کو بلایا اور ایک سازش تیار کی کہ جب وہ آئے تو تاتاری عورتوں سے (جو حرم کی حفاظتی فوج ہوا کرتی تھی) اسے قتل کرا دیا جائے لیکن یہ محض افواہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس زمانہ میں اس نوعیت کی کسی سازش کا خیال اور اس کے نتائج سے لوگ پہلے ہی سے واقف ہوا کرتے تھے اور احتیاطی تدابیر اختیار کر لیجاتی تھیں چنانچہ مشہور ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے مشیروں شیخ میر او رشائستہ خاں سے مشورہ کے بعد اس دعوت کو رد کر دیا۔ اس سازش کا بھانڈا "ناہر دل" نامی ایک غلام نے پھوڑ دیا۔ اسی سلسلہ میں شاہجہان اور دارا کے درمیان ایک خفیہ خط کی ترسیل کا بھی سراغ چلا۔

شجاع کا مورخ محمد معصوم جو اس زمانہ میں بنگال میں مقیم تھا۔ اور قلعہ کی اُڑتی اُڑتی خبریں کبھی کبھی سن پاتا تھا ایک واقعہ لکھتا ہے جو بازاری گپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہجہان نے مراد کو خط لکھا کہ وہ محمد سلطان اور اورنگ زیب کو ایک ضیافت میں بلائے اور قتل کر دے مشہور ہے کہ لا پرواہ مراد نے یہ خط ایک کتاب میں چھوڑ دیا اور بھول گیا۔ اس کے کتب خانہ کے نگران نے جسے یہ خط ہاتھ لگا۔ فوراً اورنگ زیب کے ہاتھ ایک بڑی بھاری رقم کے عوض بیچ دیا۔ چنانچہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو قید کر کے اس خطرہ کے امکان کو فوراً رفع کر دیا۔

ہم ان قصہ طرازیوں کو رد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی قابل قبول تاریخی ثبوت ہم نہیں پہنچ سکتا لیکن اس حقیقت سے تو یقیناً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہجہان زنداں کی سلاخوں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ اور آزاد ہونے کی انتہائی جد و جہد کر رہا تھا۔ وہ دارا کو اپنے محبت آمیز خطوط اور مشوروں سے برابر مدد دے رہا تھا۔ خواجہ سرا جو ان خطوط کو دھوکہ دے کر قلعہ کے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے اگر اورنگ زیب کے آدمیوں کے ہاتھ میں پڑ جاتے تھے۔ تو بہت ہی عبرت ناک سزا پاتے تھے۔ مگر شاہی قیدی برابر پیام و سلام کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ آزادی کی ایک آخری کوشش شاہجہان نے اس وقت کی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ شجاع پٹنہ سے آگرہ کی طرف حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گیا ہے۔ بادشاہ نے۔ بادشاہ نے اس فعل کی بہت ہمت افزائی کی اور شجاع کو بہت دعائیں دیں۔ اور تمام وفادار رعایا سے درخواست کی کہ وہ شجاع کی مدد کرے اور غاصب کی اعانت سے احتراز کرے۔ لیکن جب یہ خط (ہندی میں لکھا ہوا) شجاع کو پہنچا تو وہ کھاجوہ کے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں اس شہزادہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

باب دوم
قید کی سختیاں

آزادی کی یہ تمام کوششیں کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ قید کی سختیاں اور پابندیاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ قلعہ آگرہ کا محاصرہ کرتے ہی اورنگزیب نے چاروں طرف ایک زبردست حفاظتی فوج متعین کر دی تھی شہزادہ محمد سلطان کو قلعہ میں بھیجدیا تھا۔ تاکہ اندر کی دم بدم کی خبریں ملتی رہیں۔ قلعہ کے ارد گرد کے تمام مکانات اور عمارتیں گورنمنٹ کے حکم سے خالی کرا دی گئی تھیں۔ تاکہ فوج قلعہ سے قریب تر رہ سکے اور ہر وقت نگرانی رکھنے میں آسانی ہو۔

غرض شاہجہان اب بالکل گھر گیا تھا۔ ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے تھے دوستوں سے مل بھی نہ سکتا تھا۔ بغیر اورنگ زیب کی اجازت اور محمد سلطان کی معیت اور موجودگی کے شاہجہان کسی نو وارد سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ قیدی کے ہر جملہ کی رپورٹ اورنگ زیب کو بھیجی جاتی تھی۔ تاکہ وہ ملاقات کی نوعیت سے باخبر ہو جائے۔ غرض آخر تک شاہجہان کی نقل و حرکت گفتگو اور خط و کتابت پر سخت محاسبہ رہا اور ہر چیز کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا۔ چنانچہ مشہور اطالوی بندوق ساز "منوکی" اپنی ڈائری میں صفحہ ۰۰ پر لکھتا ہے کہ "میں جب کبھی قلعہ میں گیا شاہجہان کی سخت نگرانی ہوتی دیکھی۔ اسقدر احتیاط رکھی جاتی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ہی کوئی دن ہوتا ہو گا کہ میں بادشاہ سے گفتگو نہ کرتا ہوں۔ مگر میرے واپس ہونے سے پہلے ساری رپورٹ خواجہ سراؤں اور جاسوسوں کے ذریعہ سے اورنگ زیب کو پہنچ جاتی تھی۔"

اورنگ زیب نے باپ کو بار بار لکھا کہ وہ بیرونی دنیا سے خط و کتابت کرنا چھوڑ دے۔ کیونکہ اس سے ملک میں بغاوت اور بدامنی پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس پر شاہجہان غصہ میں بھر کر کہا کرتا تھا۔ "کیوں؟ میں اس کا حکم کیوں مانوں؟ کیا میں اس کا بیٹا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میں اس کے حکم کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اور اس فعل سے ہرگز باز نہیں آ سکتا۔"

چنانچہ اورنگ زیب کو ایسی تدابیر اختیار کرنی پڑیں کہ "ملک میں امن و امان قایم رہے۔ اور خواجہ سراؤں کا (جو اس قسم کے بغاوتی خطوط کی ناجائز ترسیل کا واسطہ بنتے تھے) استیصال کر دیا جائے۔ اور شاہجہان کے جلو میں اس قسم کا آلۂ کار کوئی نہ رہے۔" "وفا" نامی ایک باغی خواجہ سرا کی سزا کے موقع پر اورنگ زیب نے

تمام خواجہ سراؤں کے نام ایک تنبیہہ جاری کی کہ "اگر انہوں نے وفا کی طرح کوئی حرکت کی تو انہیں بھی وہ سزا بھگتنی پڑے گی جو وفا کو ملی ہے!"

بادشاہ کو نوشت وخواند کا سامان بھی نہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب اسے کوئی خط لکھنا ہوتا تھا تو ایک خواجہ سرا جو اس کام کے لئے مخصوص تھا اور بطور کلرک کام کرتا تھا بلایا جاتا تھا اور شاہجہان خط کا مضمون بول دیتا تھا۔ قلم دوات اور کاغذ شاہجہان کے ہاتھ میں نہیں دیئے جاتے تھے۔

ہر خط شاہی جیلر کے ہاتھ میں سے گذرتا تھا۔ اس لئے شاہجہان کے لئے بیرونی دنیا سے امداد حاصل کرنے یا اپنے رفیقوں سے اپنی بحالی کے لئے کوشش کرانے کے لئے کوئی پیغام رسانی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بالکل بے بس تھا۔

یہ تاریخ کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے کہ چالیس سال بعد بالکل اسی قسم کی نگرانی اور احتیاطی تدابیر کا رُخ اورنگ زیب نے اپنے ہی بیٹے کی طرف پھیر رکھا تھا! چنانچہ واقعہ ہے کہ جب شاہ عالم نظر بند تھا اور کئی بادشاہوں کے ساتھ ساز باز کرنے کے جرم میں کئی سال تک مقید رہا۔ اُس کی ایسی ہی نگرانی کی جاتی رہی۔ جیسے شاہجہان کی ہوئی تھی۔ اور جب وہ رہا کیا گیا اور ملتان کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تو اُسے اپنے حرم میں تلملاں لیجانے کی اجازت نہ تھی۔ محافظ کو سخت تاکیدی احکام تھے کہ وہ شہزادہ کی خط وکتابت اور ترسیل پیام وسلام پر سخت احتساب ونگرانی رکھے!

باب سوم

حصولِ دولت کیلئے جدوجہد

مغلہائے اعظم کا یہ جلیل القدر اور پُر شوکت شہنشاہ اورنگ زیب کی قید میں اپنے تمام وقار اور شاہانہ صولت کو کھو بیٹھا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ قلعہ آگرہ اور شاہی خزانہ کے بیش قیمت جواہرات کے حصول وتحفظ کے لئے باپ اور بیٹے کے درمیان ایک مسلسل جدوجہد ہوتی رہی۔ شاہجہان گو بے بس اور مقید تھا مگر یہ بے عزتی کسی طرح گوارا کر سکتا تھا کہ اُس کا بیٹا نہ صرف سلطنت کو غصب کر لے۔ بلکہ اس کے ذاتی جواہرات اور خزانہ پر بھی دست تصرف دراز کرے یا سلطنت کے خزانہ پر بیجا مداخلت وتحصیل جائز سمجھے۔ شاہجہان اب تک اورنگ زیب کی اس تمام دستبرد کو سلطنت کے مفاد کے منافی اور قانونی نقطۂ نظر سے بالکل غاصبانہ حرکت سمجھتا تھا۔ اس کے لئے ان جواہرات کو جو اُس کے جسم پر تھے یا قلعہ آگرہ کے شاہی خزانہ میں تھے ہرگز اورنگ زیب کے حوالہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

شاہجہان کی اس دلیل کے جواب میں اورنگ زیب نے لکھا کہ "چونکہ شاہی املاک وخزانہ پر کوئی "عشر" مقرر نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے استعمال ہونا چاہئے۔ زمین پر بادشاہ خدا کا نائب بنکر آتا ہے۔ اس لئے اسے مال ودولت پر بیجا تصرف نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ لوگوں کی اصلاح فلاح کے کاموں میں صرف کرنا چاہئے"۔

لہذا نہ صرف شاہجہان سلطنت سے بے دخل کر دیا گیا۔ بلکہ قلعہ آگرہ کے خزانہ پر بھی اُس کا کوئی حق باقی نہ رکھا گیا۔ اور چونکہ اب وہ ایک گوشہ نشینی اور خدا ترسی کی مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس کے لئے اُس کے جسم پر بھی کسی قیمتی شے کا ہونا اور دنیاوی مال واسباب کی محبت اُس کی مذہبی زندگی اور آخری ایام کے پُر سکون لمحوں کو برباد کرنے والی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لئے اسے اپنے تمام جواہرات اورنگ زیب کے حوالہ کر دینا چاہئے تھے!

گپ باز مورخ معصوم لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے لڑکے محمد سلطان کو شاہجہان کے پاس دو تخت طاؤس لینے کے لئے ایک دفعہ پھر بھیجا۔ لیکن شاہجہان نے ایک آخری نگاہ اُس پر ڈالنے کے بہانہ سے دو تختے اُس میں سے نکال لئے جن میں بیش قیمت لعل اور ہیرے بکثرت جڑے ہوئے تھے اور جو تخت کی جان سمجھے جاتے تھے۔ مگر بعد میں وہ تختے بھی محمد سلطان کی درخواست اور کچھ اورنگ زیب کے خوف سے واپس کر دیئے۔

دارا نے قلعہ آگرہ سے فرار ہونے سے پہلے تیس لاکھ روپے کے جواہرات جو اُس کی بیویوں کی ملکیت تھے حرم کے ایک محفوظ کمرہ میں بند کر دیئے تھے۔ اورنگ زیب نے اُن کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ مگر شاہجہان نے دینے سے انکار کر دیا۔ اور حصول زر کی یہ کشمکش عرصہ تک جاری رہی۔ بالآخر شاہجہان کو ہار ماننی پڑی اور وہ جواہرات اورنگ زیب کے حوالہ کئے گئے!

مشہور مورخ خفی خان اور اطالوی سیاح منوکاٹی کے بیانات کے بموجب ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس تمام مال ودولت کے حصول کے باوجود اورنگ زیب کی حرص زر برابر بڑھ رہی تھی۔ اس کی حریص نگاہیں اب اس ہار پر پڑیں جس میں سو لعل ایک ہی جسامت، ایک ہی وزن اور ایک ہی رنگ وصف کے منسلک تھے اور جن کی مجموعی قیمت چار لاکھ روپے تھی۔ پھر اُس ہیرے کی آرسی کا مطالبہ کیا جو

وقت اُس کے باپ کے انگوٹھے میں رہتی تھی۔ اور یہ سب مطالبات اس دلیل کے وزن پر تھے کہ چونکہ شاہجہان اب گوشہ نشین ہوگیا ہے۔ اس لئے مال و دولت کی حرص چھوڑ دینی چاہئے۔ شاہجہان کو اس مطالبہ کو بھی پورا کرنا پڑا۔

پھر حکم ہوا کہ دارا کی ڈومنیوں کو بھیجا جائے۔ کیونکہ "یہاں کوئی عورت اسقدر ماہر نہیں کہ اپنے گانوں سے مجھے محظوظ کر سکے اور چونکہ ان ایّام میں تمہیں گانے بجانے کی طرف کوئی رغبت نہیں۔ اس لئے ان کا یہاں آجانا بہت مناسب ہوگا۔" شاہجہان اس حکم پر آگ بگولہ ہوگیا۔ اورنگ زیب نے جواب دیا "اگر آپ کا اعتراض اس پر ہے کہ وہ دارا کی عورتیں ہیں تو یہ فضول ہے۔ جب میرے پاس اس کی حرم کی عورتیں آگئیں تو خادماؤں کے آنے میں کیا ہرج ہوگا؟"

۸ جون ۱۶۵۸ء کو جب قلعہ آگرہ محصور کیا گیا۔ اورنگ زیب نے فوراً شاہی محلات کے ان تمام کمروں پر مہریں لگا دیں جن میں قیمتی اشیا۔ جواہرات قالین۔ سامان آرائش وغیرہ محفوظ تھے۔ خواہ وہ دیوان خاص میں تھے یا اندر حرم میں۔ تمام جواہرات اور خزانوں کی حفاظت کے تاکیدی احکام جاری تھے جواہرات اور مرصع ظروف "غسل خانہ" کے کمروں میں بند کر دیئے گئے تھے۔ قفل سربمہر تھے۔ اور اورنگ زیب کا ایک خاص خواجہ سرا "معتمد" نامی ان پر متعین تھا۔ یہ جواہرات اور ظروف بہت کم نکالے جاتے تھے۔ اور اگر نکلتے بھی تھے تو "معتمد" کی اجازت۔ "داروغہ" کی نگرانی اور "تحویلدار" کی ذمہ داری پر بیحد احتیاط کے ساتھ!

ابتدا میں شاہجہان کو اُس کے جذبات کی رعایت سے ان جواہرات کو (جن کی اس احتیاط کے ساتھ حفاظت ہو رہی تھی) دیکھ سکنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ شہزادہ محمد سلطان کو حکم تھا کہ جب کبھی شاہجہان جواہرات کے صندوقچے دیکھنا چاہے تو اُسے دکھا دیئے جائیں۔ لیکن تہدید تھی کہ "خزانوں کو کھولتے وقت جواہرات کی حفاظت اور احتیاط کی کوئی تدبیر فروگذاشت نہ کی جائے۔" مگر یہ بھی آگاہی تھی کہ کوئی پہلو ایسا اختیار نہ کیا جائے۔ جس سے شاہجہان کے جذبات مجروح ہونے کا احتمال ہو۔ چونکہ شاہجہان اب حرم کی چار دیواری میں ہی اقامت گزیں ہوگیا تھا۔ اس لئے اندرونی کمروں تک اُس کی رسائی اب بہت آسانی کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہیں اُس کے آلات مینو کشی بھی رکھے ہوئے تھے۔

شہزادہ محمد سلطان کے چلے جانے پر قلعہ کا واحد مختار "معتمد" نامی خواجہ سرا (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) بن گیا تھا۔ اور وہ شاہجہان کے ساتھ بہت سخت گیری اور اغماض کا سلوک کرنے لگا۔ اطالوی سیاح منوکانی اپنی ڈائری کے دوسرے باب کے صفحہ ۷۷ اور ۷۸ پر مندرجہ ذیل اندراج کرتا ہے:۔

"یہ خواجہ سرا شاہجہان کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتا تھا۔ بالکل اس طرح گویا یہ بادشاہ کوئی غلام حلقہ بگوش تھا...... ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُس نے (یعنی شاہجہان نے) خواجہ سرا سے ایک پاپوشیوں کی جوڑی کے لئے کہلا کر بھیجا۔ اس بدطینت اور حرام خور خواجہ سرا نے نہ آٹھ روپے والی نہ چار روپے والی بلکہ معمولی چمڑے کی خراب سی پاپوش بادشاہ کو بھجوا دی۔ اور اس فعل پر بہت مسرور رہا۔ گویا کہ اُس نے کوئی بہت بڑا کام انجام دیا تھا...... ایک دن اُس نے (شاہجہان نے) دو ستار جنہیں وہ استعمال کرتا تھا۔ خواجہ سرا کو بھجوائے تاکہ ان کی مرمت جلد ہو جائے اور جلد ہی اندر بھجوا دی جائیں۔ مگر اس خواجہ سرا نے ان ستاروں کو ایک طرف لاپرواہی سے ڈال دیا۔ اور تاکید کی کچھ پرواہ نہ کی اور جب تین دن بعد شاہجہان نے ان ستاروں کو منگوایا تو وہ غصہ میں آپے سے باہر ہوگیا۔"

جب سابق شہنشاہ کے پوشاک خانہ کے افسر اعلیٰ خواجہ ماموں کا انتقال ہوا تو کپڑوں کے تمام کمرے مقفل کر دیئے گئے اور تبدیل لباس کے لئے شاہجہان کو کئی دن تک دقت پیش آتی رہی۔ اور یہ اس وقت تک رہی جبتک ایک نیا افسر متعین ہو کر نہ آگیا۔

باب چہارم

"باپ اور بیٹے کے درمیان تلخ خط و کتابت"

قید کے اولین سال کے دوران میں باپ اور بیٹے کے درمیان ایک تلخ خط و کتابت ہوتی رہی۔ اس تمام بحث و تمحیص کے دوران میں اورنگ زیب نے اپنے آپ کو ہمیشہ اسلام کا شیدائی۔ مذہب حنفیہ کا پکا پیرو ظاہر کیا نیز یہ کہ خدا نے اُسے لوگوں کی اصلاح اور فلاح کے کام سرانجام دینے کے لئے مامور کیا تھا اور وہ جو کچھ کر رہا تھا خدا کی مرضی اور عین اسلام سمجھ کر کر رہا تھا۔ وہ شاہجہان کی حکومت کو "خیر الناس" نہیں سمجھتا تھا بلکہ "شر" سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی حکومت کو غیر منصفانہ اور ناقابل برداشت سمجھتا تھا۔ اور اپنے تمام افعال کو پرہیزگاری و اتقا

اور ایک سچے مسلم کی صحیح اسلامی پالیسی پر عمول کرتا تھا۔

جب اس پر ایک باغی اور غیر مطیع بیٹا ہونے کا الزام لگایا تو اس نے جواب دیا

"جب تک عنانِ حکومت آپ کے ہاتھ میں تھی میں نے کوئی کام بغیر آپ کی مرضی کے نہیں کیا اور نہ کبھی اپنی قانونی حدود سے تجاوز کیا۔ خدائے عالم الغیب اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جو وہ سب ڈھکی اور کھلی باتیں جانتا ہے۔ آپ کی علالت کے دوران میں دارا نے آپکو ہر طرف سے نرغہ میں گھیر لیا تھا۔ آپ بالکل بے بس ہوگئے تھے اور وہ ہر چیز پر تسلط جمانے کے بعد ہندو مذہب کی ترویج و اشاعت کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ اسلام کا استیصال ہو۔ اس نے آپ کو ایک طرف کرکے بادشاہی کرنی شروع کردی تھی۔ سلطنت میں ابتری پھیل گئی تھی۔ عمال حکومت میں اتنی جرأت نہ ہوتی کہ آپ کو اصل حالت سے باخبر کرسکتے۔ ... . (خاکم بدہن) اگر اس کافر (دارا) کے ارادے کامیابی کے درجہ تک پہنچ جاتے اور دنیا پر کفر کی ظلمت چھا جاتی۔ اور اسلام کا آفتاب ماند پڑجاتا ——— تو ہم قیامت کے دن کیا جواب دیتے!"

اس کے بعد ذکر کرتا ہے:-

"آگرہ پر میری چڑھائی کسی باغیانہ جذبہ کے ماتحت نہ تھی بلکہ اس کا محرک یہ جذبہ تھا کہ دارا کی غاصبانہ حرکات کو فوراً بند کردیا جائے۔ اور اس کے کفر و الحاد کی بڑھتی رو کو جلد روکا جائے پس اس جہان کا خیال کرکے میں نے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے۔ اور اس میں محرک یہ جذبہ ہے کہ مزارعین اور رعایا کی بہبودی اور بھلائی ہو۔"

برادرانہ خانہ جنگیوں کے متعلق اورنگ زیب کہتا ہے کہ اس نے یہ لڑائیاں طاقت حاصل کرنے یا جاہ و ثروت کے حصول کے لئے نہیں لڑی تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہجہان اپنے بڑے بیٹے کا بیجا پارٹ لے رہا تھا۔ اور اس کے بھائیوں کو اس سے خاص حاسدانہ اور منتقمانہ جلن تھی۔ اور اسے خواہ مخواہ جنگ میں گھسیٹا گیا تھا۔ ورنہ وہ خود برادرکشی کے خلاف تھا۔ اسے حالات نے مجبور کیا تھا۔

چنانچہ لکھتا ہے:-

"گو مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ آپ مجھ سے سخت ناراض ہیں اور سلطنت میں ابتری اور ہنگامہ کا ذمہ دار مجھے ٹھیرایا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ میرے بھائی آپ ہی کے ایما سے میرے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں...... لیکن میں ان خبروں سے بھی مطلق متاثر نہ ہوا۔ اور اس وقت تک آپ کا فرمانبردار رہا جبتک مجھے یہ یقین نہ ہوگیا کہ آپ میری بجائے کسی اور بھائی کو طاقت سپرد کرنے والے ہیں اور مجھ سے آپ کو بالکل محبت نہیں ———"

"اگر آپ اپنے بڑے لڑکے کی بیجا حمایت نہ کرتے اور اس پر بھروسہ کرنے میں اسقدر غلو کا اظہار نہ کرتے۔ اور نہ اسے اسقدر اعلیٰ مراتب پر فائز کرتے۔ تو بدمزگی پیدا ہی نہ ہوتی (اور اسکا غالباً اس کی خدا ترسی اور نیکوکارانہ سیرت کا اندازہ آپکو بھی ہوگیا ہوگا) ——— اگر میرے دوسرے بھائیوں کو آپ خواہ مخواہ اشتعال نہ دیتے اور میرے خلاف تلخی نہ پیدا کرتے تو ہم سب بھائی صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے۔ اور یہ خانہ جنگی ہرگز نہ ہوتی۔"

اورنگ زیب کو یقین کامل تھا کہ ملک میں اس وقت تک امن و امان نہیں ہوسکتا جبتک دارا اور شجاع ملک بدر نہ کردیئے جائیں یا مراد کی طرح مقید نہ کردیئے جائیں چنانچہ مجبوراً اسے ایسی پالیسی اختیار کرنی پڑی کہ "خدا اور عامۃ الناس کے نزدیک" سرخرو ہو۔ اور جس بارگراں کو اس نے محض انسانی ہمدردی اور فلاح عوام کے لئے اٹھایا تھا کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچے۔ چنانچہ اس نے افسروں کا انتخاب خطابات اور عہدوں کی تقسیم اور اسی قسم کے دیگر شاہانہ کام شروع کردیئے۔ اور اپنے آپ کو ملک کا واحد مالک اور حقیقی محسن کی طرح ظاہر کیا۔

تاج و تخت کے قبول کرنے کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے:-

"تاج و تخت کی گراں ذمہ داریاں حصول جاہ کے لئے نہیں محض اشد ضرورت سے مجبور ہوکر اختیار کر رہا ہوں۔ تاکہ ملک میں امن و امان قائم ہو۔ اسلام کا قانون ملک میں جاری ہو تاکہ روز شمار کو میں جوابدہ ہوسکوں۔ عامۃ الناس کے جان و مال کی حفاظت ہے؟ ان کی فلاح اور میری آبائی سلطنت میں ابتری اور ہنگامہ پیدا نہ ہو"

ایک بادشاہ کی ذمہ داریوں اور فرائض کے متعلق اورنگ زیب کا خود کیا عقیدہ تھا

اس کا اندازہ خود اسی کے الفاظ سے ہو سکتا ہے :۔

"پادشاہت سے مراد عامتہ الناس کی بہبود اور اُن کی بہبود اور انکی جان و مال و عزت کی حفاظت ہے۔ ملک میں امن و امان قائم رکھنا ہے۔ نہ کہ جسمانی خواہشات اور نفسانی آرزوؤں کی تسکین و تکمیل"

باب پنجم

اورنگ زیب کی نیکوکاری

اورنگ زیب اپنی کامیابی اور فتوحات کو خدا کی مہربانی اور اپنی نیکوکارانہ زندگی سے منسوب کرتا ہے۔ اور ان کامیابیوں کو اس ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ اُس کا تمام رد یہ خدا کی نگاہ میں برگزیدہ اور قابل ستائش رہا تھا ورنہ وہ کامیاب نہ ہوتا چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے :۔ "چونکہ میرے ارادے نیک تھے اس وجہ سے باوجود قلیل التعداد ہونے کے مجھے دونوں لڑائیوں (یعنی دھرمٹ اور سموگڑھ) میں خدا کے فضل سے فتح نصیب ہوئی۔ اگر خدا کی مرضی شامل حال نہ ہوتی تو مجھے کامرانی کیونکر نصیب ہو سکتی تھی۔ . . . . اور فتحمندی تو صرف خدا ہی کا انعام ہے۔ جسے چاہے دے!"

اس حکم خداوندی اور مرضی الٰہی کے سامنے شاہجہان جیسے دانشمند بادشاہ کو سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کیا چارہ رہ گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اورنگزیب کا نظریہ دیکھئے :۔

"خدا کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ اپنی موجودہ زندگی کے تغیر اور انقلاب کو کیوں کسی مادی طاقت اور ارضی حکم سے متعلق کرتے ہیں۔ یہ تو سب کچھ خدا ہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اور وہی بڑھاتا اور گھٹاتا ہے۔ خدا کی پرجلوہ اُس نے جو فیصلہ کر دیا ہے اور جو ہو چکا ہے اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ یہ طبیعت کا انتشار یہ ذہنی افکار اور غم و ملال سکون قلب میں مبدل ہو جائیگا۔ اگر تم اس کے فیصلہ کو "امر واقعہ" سمجھ لو۔"

معزول شدہ بادشاہ نے اسے "امر واقعہ" سے بھی زیادہ سمجھا۔ بلکہ اپنے بیٹے کا اُسے شکر گذار ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ خود اورنگزیب کے الفاظ میں :۔

"میں نے آپ کو ایک بڑی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے اگر آپ انصاف سے دیکھیں تو میں نے آپ کے افکار و آلام میں کمی کر دی ہے۔ اب آپ کو حوادثات اور پریشانیاں نہیں ستائینگی مجھ جیسے آزاد اور بے فکر انسان نے آپکی ذمہ داریوں کو قبول کر کے آپکو ایک گونا تسلی و بہتری ہے۔ اور اپنے لئے افکار و پریشانیوں کا ایک بار خواہ مخواہ مول لے لیا ہے۔"

شاہجہان ان تمام نظریوں کو محض ظاہرداری سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اورنگزیب کو غاصب بتاتا ہے کہ باوجود اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور اسلام کے احکام پر اس شدت و غلو کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے وہ دوسروں کی ملکیت پر جابرانہ اور غاصبانہ تغلب کرتا ہے۔ اس کے جواب میں اورنگزیب سو ہی انداز اختیار کر کے کہتا ہے:۔

"آپ مجھے غاصب و جابر بتاتے ہیں۔ میرے رویہ کو تغلب سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسروں کی ملکیت پر قبضہ کرنے کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں لیکن آپ کو یہ باور رکھنا چاہئے کہ سلطنت کے خزانے اور ملک کی دولت عامتہ الناس کے فائدہ کے لئے ہے نہ کہ عیش و عشرت کے لئے۔ ایک بادشاہت موروثی املاک نہیں ہوتی کہ باپ کے بعد بیٹا یقیناً مالک ہو۔ بلکہ یہ تو خدا کی امانت ہے۔ جو امین ہوتا ہے اُسے ملتی ہے۔ یہ مال و دولت لوگوں کی فلاح میں صرف ہونی چاہئے۔"

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو شاہجہان اورنگزیب کو تنبیہ کرتا ہے کہ جو سلوک اُس نے اپنے باپ کے ساتھ کیا ہے۔ وہی اس کی اولاد اُس کے ساتھ روا رکھیگی۔ لیکن اس پر بھی اورنگزیب پرہیزگارانہ سپرٹ اور اپنی پالیسی کی مدافعت میں وہی جواب دیتا ہے :۔

"جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ میں جو کر رہا ہوں وہی میرے اگلوں نے بھی کیا تھا۔ پھر تعجب کی بات کیا ہے۔ اگر خدا کی مرضی یہی ہوگی تو میرے بیٹے بھی مجھ سے ایسا ہی سلوک کرینگے میں خدا کی مرضی اور اُس کے حکم سے سر مو تفاوت نہ کرونگا۔ میری نیت بخیر ہے اور نیک نیتوں پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے توقع رکھنی چاہیئے کہ میرے بیٹے میرے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے۔"

بوڑھا بادشاہ اورنگزیب کے ان خطوط سے سخت ناراض ہوتا تھا جن میں وہ اپنے بھائیوں شجاع اور دارا کا بار بار حوالہ دیتا تھا۔

بادشاہ جل کر اورنگ زیب کو بہت سخت و سست لکھتا جس کے جواب میں وہ

بھی ایسی ہی زبان استعمال کرتا اور لکھتا

"آپ مجھے کیوں برا لکھتے ہیں۔ کیا آپ اپنے بھائیوں خسرو اور پرویز کو بھول گئے۔ باوجودیکہ انہوں نے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچایا تھا مگر یاد کیجئے کہ آپ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا!"

لیکن اس سلسلہ میں شاہجہان کی پیشینگوئی اورنگ زیب کی تخمین سے زیادہ صحیح ثابت ہوئی۔ کیونکہ جب ۱۶۸۱ء میں اس کے چوتھے بیٹے محمد اکبر نے بغاوت کی اور یہ اس کے تنزل کا باعث ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان بھی ویسی ہی تلخ خط وکتابت ہوئی جیسی اورنگ زیب اور اس کے باپ کے درمیان ہوئی تھی ان خطوط میں شہزادہ اپنے باپ کو ملکی انتظام کے ناقابل بتاتا ہے۔ اور مشورہ دیتا ہے کہ اپنے باپ کے عزل اور بھائیوں کے قتل کا کفارہ ادا کرنے کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ سلطنت سے سبکدوش ہو جائے۔ اور باقی عمر یاد الٰہی میں بسر کرے۔ جب اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے شاہ عالم پر خاص الطاف وکرم کی باتیں کی اور دوسرے بیٹوں کو یکسر بھلا دیا۔ تو شہزادہ اکبر نے بھی وہی کیا جو اس کے باپ نے کیا تھا۔ اس نے بھی اپنی بغاوت کو بالکل قرین انصاف بتایا کیونکہ بغیر اس کے اورنگ زیب کی خراب حکومت کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تھا اور ملک برباد ہو رہا تھا!! وہ بھی اپنے رویہ کو عین اسلام بتاتا ہے۔ اور حکومت کی ذمہ داریاں محض رفاہ عام اور ملک کی بھلائی کے لئے اٹھانے کو تیار رہتا ہے۔ غرض تاریخ اپنے آپ کو حرف بحرف دہراتی ہے۔ اور ایک ہی سٹیج پر دو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ایک ہی ڈراما کھیلا جاتا ہے!۔ جب اورنگ زیب اپنے بیٹے کو باغی اور بے وفا کہتا ہے۔ تو وہ بھی پلٹ کر یہی کہتا ہے کہ تم نے اپنے باپ کے ساتھ کیا کیا تھا؟!!

شاہجہان اور اورنگ زیب کے درمیان خط وکتابت کی تلخی اور بدمزگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب اورنگ زیب نے باپ کو خود لکھنا بالکل چھوڑ دیا۔ گاہے گاہے منشیوں سے کچھ لکھوا کر بھجوا دیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ سلسلہ بھی محض "اس بیکار جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے" بند کر دیا گیا +

شاہجہان اورنگ زیب سے نہ تو تلوار کی جنگ میں عہدہ برآ ہو سکا اور نہ قلمی جنگ میں۔ کچھ عرصہ کے بعد قدرت کے فیصلہ کے آگے جھک گیا کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ تھا ـــــ اب قسمت کا بھی گلہ نہ کرتا تھا!

باب ششم

"شاہجہان کا مذہبی شغف"

شاہجہان کے لئے اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خدا کی بھیجی ہوئی "مصیبت" پر صبر ورضا کے ساتھ سر تسلیم خم کر دے۔ اورنگزیب نے پہلے دارا شکوہ۔ پھر مراد بخش۔ اور پھر سلیمان شکوہ کو قتل کیا جس سے بوڑھے باپ کا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ شجاع اور اس کے بال بچوں کو مگدھ کے خوفناک جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی اور بوڑھا باپ ان تمام مصائب و آلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ وہ بے بس مقید ومحبوس کر دیا گیا +

لیکن ان تمام صبر آزما جراحتوں کے باوجود شاہجہان کا دل خدا کی تسبیح و تحمید کرتا رہا۔ وہ شاکی نہ تھا۔ اسے خدا کی مرضی پر بھروسہ تھا۔ سات سال تک محبوس رہا۔ مگر ابتدائی ایام کے بعد اس کی زبان پر حرف شکایت نہ آیا۔ اس کے رفقا اور ملازمین پر پے بہ پے مصیبتیں پڑیں۔ کئی گھرانے اس کی آنکھوں کے سامنے برباد ہوئے اور وہ ان تمام مصیبتوں کو سہنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ ان تمام ہمت شکن مصیبتوں اور حوادثات کے باوجود آخر وقت تک شاہجہان کا دل خدا کی محبت سے لبریز اور صبر ورضا کے جذبات سے معمور رہا۔ استقلال کو آخر دم تک نہ چھوڑا +

عمر کے آخری ایام میں اس کا مذہبی شغف بہت بڑھ گیا۔ صرف مذہب ہی ایک ایسی چیز تھی کہ جس کی آغوش میں وہ تسکین پا سکتا تھا۔ ایک نیک پارسا فرشتہ سیرت بزرگ جناب سید محمد قنوجی ہر وقت اس کے پاس رہتے تھے۔ یہ بزرگ اخلاقی حکایات۔ مذہبی روایات اور احادیث کے درس سے ناکام راں بادشاہ کے دل کو ڈھارس دیتے اور اس کی طبیعت کو پریشان و پراگندہ ہونے سے بچاتے تھے۔ بادشاہ کو مسائل اسلام سکھانے اور سکون قلب پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن کی تلاوت اور حدیثوں کے درس سے شاہجہان بہت خوش ہوتا تھا۔ اور ایک گونہ تسلی پاتا تھا۔ سید صاحب شاہجہان کی خیرات باہر لے جا کر غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ایصال ثواب کی دیگر تدابیر بھی کرتے تھے +

اب سابق بادشاہ کا زیادہ وقت عبادت الٰہی میں گذرتا تھا۔ قرآن اور حدیثیں یا تو خود پڑھتا تھا یا سنتا تھا۔ قرآن کی آیات لکھنے وظایف و درود کی تلاوت کرنے اور دیگر مراسم مذہبی میں شاہجہان کی طبیعت بہت سکون پاتی تھی +

تاریخی مطالعہ اور مذہبی شغف کے علاوہ شاہجہان اپنی چھوٹی لڑکی جہان آرا سے بہت محبت کرتا تھا۔ جہان آرا اپنے ضعیف باپ کی خدمت بڑی تندہی اور محبت وشفقت کے ساتھ کرتی تھی اور شاہجہان کے لئے اس عمر میں یقیناً عصائے پیری تھی۔ بلکہ دوسری اولاد کے تلخ تجربہ کا ازالہ کر رہی تھی +

جہان آرا۔ ایک نیک سیرت خاتون جو میاں میر جیسے ولی کی مرید تھی اپنے ضعیف باپ کی اس شفقت اور محبت کے ساتھ خدمت کرتی تھی۔ کہ وہ اپنے تمام مصائب

آلام کو بھول گیا۔ جہان آرا قلعہ میں ایک پاکباز راہبہ کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ دارا اور مراد کے یتیم بچوں کو بھی اپنے ہی سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ اور ان کی پرورش بھی بڑے انہماک سے کرتی تھی ؎

غرض شاہجہان ایسے مذہبی اور پُر سکون ماحول میں اپنے پچھلے مصائب کو بالکل بھول گیا۔ اور آخر عمر میں دنیاداری اور افکار زندگی کو بالکل فراموش کر دیا۔ وہ اب ایک دوسری دنیا کے لئے اپنی راہ صاف کر رہا تھا۔ موت اُس کے لئے کوئی خطرناک چیز نہ تھی۔ بلکہ وہ منتظر تھا جسقدر جلد دنیا کے افکار اور جھگڑوں بکھیڑوں سے اُسے نجات مل جائے اُتنا ہی اچھا (حالانکہ اُسکی آخری زندگی تمام ایسے افکار سے چھٹکارا پا چکی تھی) وہ اکثر موت کے مسئلہ پر گفتگو کیا کرتا تھا اور عالم بالا کے حالات وغیرہ تو اس کی گفتگو کے خاص موضوع تھے ؎

باب ہفتم

"وفات کا منظر"

افکار و حوادث زندگی سے نجات حاصل کرنے کی یہ خواہش جس کا عرصہ سے بے تابی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ بالآخر جنوری ۱۶۶۶ء میں مل ہی گئی اُس سال کی جنوری کا ساتواں دن تھا۔ شاہجہان نے ایک ادویات آمیز تیل اپنے جسم پر ملوایا تھا۔ جس سے اُسے بجائے فائدہ کے نقصان ہوا۔ بخار چڑھ آیا۔ اور تشنج و درد معدہ بھی ہو گیا۔ عارضہ کے نویں دن ایک وید بندرابن نامی نے شکم کے جملہ امراض دور کر دیئے اور شاہجہان کو تب سکون ملا۔ مگر ضعف و نقاہت کسی طرح دور نہ ہوئی۔ زندگی کے چوہتر سال پورے ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں فتح و ظفر بھی دیکھی تھی۔ ناکامی و نامرادی سے بھی سابقہ پڑا تھا۔ تخت پر بیٹھنے سے پہلے جنگلوں کی خاک چھانی تھی۔ لمبے لمبے سفر کئے تھے مشقتیں برداشت کی تھیں تکلیفیں اُٹھائی تھیں اور اب آخر عمر میں آکر بیوفائی کے چرکے بھی سہے تھے۔ غرض زندگی میں ہر قسم کے نرم و گرم تجربات اُٹھا چکا تھا۔ اب وہ راضی برضا تھا ؎

سردی بلا کی پڑ رہی تھی۔ شربت پیتے پیتے لبوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ضعف و ناتوانی کی کوئی حد نہ رہی تھی مرض بڑھ رہا تھا۔ ادویات و اغذیہ کوئی فائدہ نہیں کر رہی تھیں ؎

دوشنبہ — ۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء — کی رات کے ابتدائی حصہ ہی سے زندگی کی آس چھٹ گئی تھی۔ اور اب ہر شخص اس جلیل القدر بادشاہ کی مخلصی کے لئے دست بدعا تھا۔ جب شاہجہان کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کی زندگی کے آخری لمحات پورے ہو رہے ہیں اور اب اُس کے بچنے کے کوئی اُمید نہیں ہے۔ تو اُس نے سب کے سامنے خدا کا شکر ادا کیا ان انعام و اکرام پر جو خدا نے اُسے زندگی میں بخشی تھیں ؎

مرنے سے پہلے بادشاہ نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کئے اور اپنی بیویوں کو جو اُس وقت زندہ تھیں سامنے بُلایا — اکبر آبادی محل اور فتحپوری محل پیش ہوئیں۔ اور دم بلب بادشاہ نے بہت تسلی و تسکین دی۔ جہان آرا اور دیگر حرم کی عورتوں کو بھی جو اُس کے پلنگ کے گرد کھڑی رو رہی تھیں بہت تشفی دی ؎

جہان آرا کو وصیت کی کہ اپنی سوتیلی بہن "پُر ہنر بانو" اور محل کی دیگر عورتوں کی جو اُس کی موت سے لاوارث ہو جائینگی پرورش اور ان کا خیال رکھے۔ اس کے بعد اپنی وصیت تیار کرائی۔ محل کی تمام عورتوں اور ملازمین کو اپنے ہاتھ سے آخری انعام بخشا۔ اور سب کو با دل ناخواستہ رخصت کر کے اپنے سرہانے تلاوت قرآن کا حکم دیا ؎

بستر مرگ کے گرد عورتوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کنیزیں اور خادمیں رو رہی تھیں۔ غرض محل میں ایک کُہرام مچ رہا تھا۔ شاہجہان — جسکے اوسان آخری لمحہ تک برقرار رہے — اس ہنگامہ ہائے و ہو میں پڑا ہوا اپنی چہیتی بیوی ممتاز محل کی فردوس تمثال آرامگاہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ زبان پر کلمہ جاری تھا۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "اے میرے خدا! دنیا اور آخرت دونوں میں مجھ پر رحم کر اور عذاب نار جہنم سے بچا!"

دعا ختم ہونے کے ایک لمحہ بعد تاج کا مفکر ابدی سکون میں پہنچ گیا ؎

رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ شاہجہان مثمن برج میں ایک خواب گراں میں محو تھا۔ سامنے سے تاج محل کا پورا نظارہ ہو رہا تھا۔ اُس کی وصیت تھی کہ مرنے کے بعد اُسے تاج میں اپنی آرام جان کے پاس ہی سلایا جائے۔ چنانچہ جہان آرا کے حکم سے قلعدار "رعد انداز" اور خواجہ سرا بہلول بُلائے گئے۔ جنہوں نے حرم میں آکر مثمن برج کی کھڑکی کھول کر باہر حکم بھیجا کہ شہر کے قاضی قربان اور سید محمد قنوجی کو جلد بلایا جائے تاکہ تجہیز و تکفین کے مراسم جلد شروع ہوں ؎

یہ دونوں بزرگ رات کو ۱۲ بجے کے قریب آئے۔ کچھ خیرات و کفارہ دیا گیا۔ شاہجہان کی روح کو ایصال ثواب کرنے اور اُس کی چھٹی ہوئی نمازوں اور روزوں کے عوض میں — پھر مثمن برج میں پہنچکر جہان آرا کو کورنش کی اور شاہجہان کی نعش کو

باہر لاکر غسل دیا۔ پھر کفن پہنا کر ایک صندلی تابوت میں رکھ دیا گیا ⁕

باب ہشتم

"شاہجہان کا جنازہ"

جہان آرا کا ارادہ تھا کہ شاہجہان کا جنازہ تاج محل تک اس شان و شوکت کے ساتھ جائے جو ایک شاہ دہلی کے شایانِ شان ہو۔ جس کی صورت یہ ہوتی کہ "آگرہ اور نواح آگرہ کے تمام امرا، روسا، علما و مشایخ، دارالخلافہ کے تمام عمایدِ اکابر و شرفاء جنازہ کے گرد ہوں۔ تابوت ان کے کندھوں پر باری باری جا رہا ہو۔ اس کے پیچھے پیچھے شہر کے لوگوں کا اژدھام ہو۔ ہر ایک ننگے سر آہستہ آہستہ جا رہا ہو۔ آہ و بکا ہو رہی ہو۔ کلمات پڑھے جا رہے ہوں۔ فقیروں یتامیٰ پر سیم و زر کی بارش ہو رہی ہو۔ ہر طرف یہی چرچا ہو۔ اور پھر یہ پُرشوکت شہنشاہ سپردِ خاک کر دیا جائے ⁕

مگر ایسا نہ ہوا۔ اورنگ زیب باپ کے مرنے کی خبر سُنکر نہ آیا اور نہ جنازہ پر ہی آیا۔ بلکہ شہزادہ معظم جسے اُسنے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا۔ وہ بھی جب پہنچا جب جنازہ روانہ ہو چکا تھا۔ سارے کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھے جو جہان آرا کی مرضی کے مطابق کچھ نہ کر رہے تھے۔ اس لئے وہ سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ اُس کے بس میں نہ تھا۔ ورنہ وہ شاہجہان کا ایسا جنازہ تیار کراتی جو اُس کے شایانِ شان ہوتا۔ اُس کے خاندان کی ناموس کے منافی نہ ہوتا۔ مگر ہوا وہی جو ہونا تھا" شاہجہان کا جنازہ نہایت معمولی حالت میں تیار ہوا۔ چند لوگ شریک ہوئے۔ معمولی حیثیت کے آدمیوں اور خواجہ سراؤں کے واویلا کے درمیان مغلوں کا یہ جلیل القدر بادشاہ! یہ پُرشوکت شہنشاہ! یہ "دنیا کا بادشاہ!" یہ تاج کا خالق! معمولی مراسم کے ساتھ (جو نہ اُس کے شایانِ شان تھیں اور نہ اُس کے آبا و اجداد کے) سپردِ خاک کر دیا گیا۔ وا حسرتا! عبرت! عبرت!! عبرت!!!

مسمن برج کی سیڑھیوں کے نیچے کا دروازہ جس پر شاہجہان کی قید کے زمانہ سے تیغہ لگا ہوا تھا۔ افسروں نے توڑا۔ اور جنازہ باہر نکالا گیا۔ بیرونی احاطہ سے نکل کر جو اس دروازہ کے آگے واقع ہے۔ جنازہ قلعہ آگرہ کے دروازہ سے باہر تیا گیا۔ اور اُس میدان میں رکھدیا گیا جو قلعہ کے سامنے ہے۔ اس موقع پر آگرہ کا صوبہ دار ہوشدار خاں بھی اپنے افسروں کے ساتھ آملا اور یہ مختصر مجمع صبح صادق کے وقت جمنا کی جانب آہستہ آہستہ روانہ ہوگیا ⁕

دریا پر لے جا کر جنازہ ایک کشتی میں رکھ دیا گیا۔ اور تاج محل کی طرف پہلوبس روانہ ہوگیا ⁕

تاج میں شہر کے عمایدِ۔ قاضی القضاۃ۔ علما و مشائخ اور دیگر اکابرانِ شہر پہلے ہی سے جمع تھے۔ دوپہر کے قریب نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔ اور جنازہ ممتاز محل کے گنبد میں لیجایا گیا اور شاہجہان کے جسدِ خاکی کو ممتاز محل کے پہلو میں بحفاظت تمام محوِ استراحت کر دیا گیا ⁕

شہر میں شاہجہان کی موت ایک ایسا سانحۂ غم انگیز تھی کہ بچہ بچہ چشم پُرنم تھا۔ کوئی زبان نہ تھی جس پر شاہجہان کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر نہ ہو۔ لوگ اُس کی اچھائیاں ایک ایک کر کے یاد کرتے تھے اور روتے تھے۔ اُس کی چند غلطیوں کو لوگوں نے جلد بھلا دیا تھا۔ وہ ایک ایسا حکمران تھا کہ جس نے رعایا کو اپنی اولاد سمجھ کر حکومت کی تھی۔ اُن کے دکھ درد میں ہمدردی کا اظہار کرتا تھا۔ ان کی خوشی اپنی خوشی اُن کی تکلیف اپنی تکلیف سمجھتا تھا۔ وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ اس لئے ہر ایک اُس کے لئے آبدیدہ تھا۔ اُس کا زمانۂ حکومت ایک پُرامن زمانہ تھا۔ وہ رعایا پر کسی قسم کا ظلم ہوتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ اگر کہیں ٹیکس کا شرح جابرانہ ظالم ہوتا تھا اور اُسے خبر ہو جاتی تو اُس کو سزا دینے میں مطلق نرمی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ ہر شخص اُس کے طرزِ حکومت کا مداح تھا۔ پھر آج وہ کیوں نہ روتے؟! اُس کا دربار دنیا کا ایک پُرشوکت دربار تھا۔ اُس کی تعمیرات دنیا میں لاثانی تھیں اور اپنے زمانہ کے لئے باعثِ فخر۔ غرض یہ وہ تاثرات تھے جو شاہجہان نے اپنے مرنے کے بعد لوگوں کے دلوں پر چھوڑے۔ یہی وجہ تھی کہ "ہر گلی کوچہ اور ہر مکان سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ آگرہ کے ہر گھر میں کوئی موت ہوئی ہے!!!"

باب نہم

"اورنگزیب کا رویہ اور رائے عامہ"

سانحہ کے تقریباً ایک مہینہ بعد اورنگ آگرہ میں داخل ہوا۔ اور جہان آرا سے بہت خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے ملا۔ بلکہ اُسے یقین دلایا کہ باپ کے زمانہ میں اُسے جو مراعات اور آسائش حاصل تھیں ان میں سرِ مو فرق نہیں آنے پائیگا۔

یہ جہان آرا ہی کی مصالحانہ مساعی تھیں کہ وفات سے چند روز قبل اُس نے منت سماجت کر کے شاہجہان سے ایک ایسے کاغذ پر دستخط کرا لئے تھے جس میں اُس نے

ؔ مترجم کا فاضل مورخ سے متفق ہونا ضروری نہیں ⁕

والٹیر

کلیسا کا سب سے بڑا باغی

از جناب ریاض حسین صاحب بی۔اے

سترہویں صدی کے وسط میں سرزمین فرانس پر استبداد مطلق العنانی کا دَور دورہ تھا۔ عوام کے جسم اگر حکومت کے جور و جفا کا تختۂ مشق بن رہے تھے۔ تو ان کی روحیں کلیسا کے پادریوں کے ظلم و ستم کی آماجگاہ بن رہی تھیں۔ حکومت کلیسا کی حفاظت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھی۔ اور کلیسا حکومت کی جا و بیجا حمایت کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھی۔ حکومت محصولوں کی جبراً وصولی سے اپنے خزانے بھر رہی تھی اور پادری تخویف و ترہیب کے ہتھیاروں سے نذرانے وصول کر رہے تھے۔ بادشاہ قانون بناتا اور کلیسا مذہبی اعتقادات وضع کرتی۔ بادشاہ قوت سے حکومت کرتا۔ اور پادری دلوں کے اندر خوف پیدا کر کے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے حامی و مددگار تھے۔ اگر کسی کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوتی، تو فوراً اُس کا گلا گھونٹ دیا جاتا۔ الغرض رعایا مظلومی و بیچارگی کی تصویر تھی۔ جہالت نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ نہ صرف جسموں پر غلامی کی لعنت چھا رہی تھی۔ بلکہ دل و دماغ بھی اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ حکومت اور کلیسا چکّی کے دو پاٹ تھے جن کے درمیان عوام دانوں کی پس رہے تھے مصنفین اور اہل قلم بادشاہ اور پادریوں کے رحم پر تھے۔ ان میں سے اکثر قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے۔ یا جلاوطنی میں زندگی کے دن گذار رہے تھے باقی جلّاد کے ہاتھوں سر قلم کروا چکے تھے۔ آنے والے خوفناک انقلاب کے بیج نامعلوم طور پر شاہی امیروں اور کلیسائی پادریوں کے ہاتھوں بوئے جا رہے تھے اور وہ مظلوم رعایا کے دلوں میں دُکھ اور درد کے آنسوؤں سے سیراب ہو ہو کر نشو و نما پا رہے تھے۔ فلاکت زدہ کمزور لوگ جب خوشحال امرا کو دیکھتے تو دل ہی دل میں دانت پیس کر رہ جاتے۔ اُن کے ہاتھ بے اختیار بھینچ جاتے۔ کہ ان امرا اور ان کی مغرور بیگمات کی سفید گردنوں کو مروڑ دیں۔ فرانس کے اندر صرف امرا اور پادری ہی مقدس اور پاکیزہ تھے۔ عوام تو وبائی جراثیم سے زیادہ قابلِ نفرت تھے۔ بیکار امیر عیش پرستیوں میں مگن تھے۔ اور محنت کش مزدور سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے تھے۔ الغرض فرانس میں انسانیت اپنا شرف و مجد کھو چکی تھی اور اپنی بے بسی و مظلومی پر نوحہ کر رہی تھی ◆

پیدائش

اس عہد استبداد میں ۱۲ر نومبر ۱۶۹۴ء کی تاریخ۔ یکشنبہ کے دن فرانس کے ایک معمولی قصبہ میں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ نہایت نحیف و نزار۔ سانس تک بمشکل چل رہی تھی۔ والدین نے جھٹ باغی کو بلایا اور بساطِ ہستی کے اس نووارد کو بپتسمہ دلایا۔ ڈرتے تھے کہ کہیں بپتسمہ لئے بغیر ہی نہ چل بسے۔ ورنہ اس کی ننھی سی روح دائمی عذاب میں گرفتار رہیگی۔ پادری نے بپتسمہ دینے کے بعد بچّے کا نام فرینکائے میری اراؤٹ رکھا۔ اس وقت کسے خیال ہو سکتا تھا۔ کہ یہ کمزور اور نحیف بچّہ جس کی روح کو ابدی عذاب سے بچانے کے لئے کلیسا کے ایک خادم نے بپتسمہ دیا۔ بڑا ہو کر کلیسا کے ہی خلاف بغاوت و سرکشی کا جھنڈا بلند کرے گا اور قصرِ کلیسا کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گا ◆

تعلیم و تربیت

یہ بچّہ طبقہ عوام میں سے تھا۔ وہ کسی نامور خاندان سے نسبت کا فخر نہ رکھتا تھا۔ ابھی وہ سات سال کا ہی تھا۔ کہ اُس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اُسکا ایک بڑا بھائی آرمنڈ تھا۔ جو مذہبی رجحان رکھتا تھا۔ لیکن یہ لڑکا جو دنیا کے مذہب میں ایک ہلچل ڈالنے والا تھا۔ مذہب سے یکسر بیگانہ رہا۔ نیز جہاں تک معلوم

ہوسکا ہے اس کے آبا و اجداد میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ جسے ادبیات سے شغف رہا ہو۔ اسقف ڈاچویو اس کا روحانی باپ بنا۔ لیکن وہ بھی مذہب کا زیادہ پابند نہ تھا۔ والد کی نیت تھی کہ اپنے بیٹے کو قانون کی تعلیم دلائے۔ لیکن بیٹے کا مذاق اس سے مختلف تھا۔ دس سال کی عمر میں وہ لوئی لا گرانڈ کالج میں داخل ہوا یہاں وہ سات سال تک تعلیم پاتا رہا اور اس کے بعد کسی اور جگہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی۔ اس کالج میں جو کچھ اس نے حاصل کیا۔ اس کے متعلق اس کا اپنا بیان ہے۔ کہ "یہاں میں نے تھوڑی سی یونانی۔ کافی لاطینی اور بہت زیادہ خرافات کی تعلیم پائی" +

سترہ سال کی عمر میں اس نوجوان نے جو والٹیئر کے نام سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے والا تھا۔ ارادہ کیا کہ ادبیات کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنائے۔ باپ کو یہ پسند نہ تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کا ذکر ان لفظوں میں کیا "میرے بیٹے کیا ہیں۔ احمقوں کا ایک جوڑا ہے۔ ایک نظم میں دوسرا نثر میں" پس والد نے کوشش کی۔ اور ۱۷۱۳ء میں والٹیئر کو ہیگ میں فرانسیسی وزیر کے ماتحت ملازمت مل گئی +

داستانِ محبت

یہاں ملازمت کرتے زیادہ مدت نہ گذری تھی۔ کہ والٹیئر کو ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ لڑکی کی والدہ کو یہ تعلق پسند نہ آیا۔ اُس نے روکا۔ والٹیئر نے اپنے کپڑے لڑکی کو بھیجے۔ اور کہا۔ کہ یہ پہن کر مجھے ملنے آؤ۔ راز کھل گیا۔ اور والٹیئر کو ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ اُس نے اپنی محبوبہ کو ایک چٹھی لکھی۔ جس میں اقتباس ذیل والٹیئر کی ذہنیت کی کلید سمجھا جاتا ہے:-

"مفت میں اپنی والدہ کے غیظ و غضب کا نشانہ مت بنو۔ تمہیں خوب معلوم ہے۔ کہ وہ کیا کچھ کرسکتی ہے۔ تمہیں پہلے ہی اس کا کافی تجربہ ہوچکا ہے۔ منافقت اختیار کرو۔ بس یہی کامیابی کا گر ہے۔ اسے صاف صاف بتاؤ۔ کہ تم مجھے بالکل بھول چکی ہو نہیں بلکہ مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ اور اس کو یہ بتانے کے بعد مجھ سے بیش از بیش محبت کرو" +

اس واقعہ کی اطلاع جب اُس کے والد کو ہوئی تو اُسے بیحد رنج ہوا۔ یہانتک کہ اُس نے والٹیئر کو باقاعدہ طور پر وراثت سے محروم کردیا۔ اور اُس کی گرفتاری کا حکم بھی حاصل کرلیا۔ اب اس نے صاف لفظوں میں والٹیئر سے کہا کہ یا تو کہیں سمندر پار چلے جاؤ۔ ورنہ تمہاری جگہ قیدخانہ کے اندر ہوگی۔ والٹیئر نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔ والد سے معافی مانگی۔ اور اُس کی رضا جوئی کے خیال سے وکیل بننے پر آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ تھوڑی مدت ایک قانون داں کے ہاں کام بھی کیا۔ لیکن پھر اُسے قانون سے نفرت ہوگئی۔ اب اُس نے شاعری کی طرف توجہ کی۔ اور ایک ٹریجڈی کے لکھنے میں مصروف ہوگیا +

شعروشاعری کا شغل

اگرچہ اس وقت مذہب اور حکومت کے بیسیوں مسائل پر معرکتہ الآرا مباحثے ہو رہے تھے۔ لوگ اعتقادات کے جرم میں قید و بند تو در کنار دار و رسن کے حوالے کئے جا رہے تھے۔ لیکن والٹیئر کو ان واقعات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ مذہب یا حکومت کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتا تھا۔ اس کا تمام تر وقت شعروشاعری کی خیالی دنیا میں گذرتا تھا۔ اس کے رگ و پے میں زندگی کی روح دوڑ رہی تھی اور اس کے خیالات تخیل کے بازوؤں پر مصروفِ پرواز تھے +

جلاوطنی

اسی دَوران میں اس پر الزام لگایا گیا۔ کہ اُس نے ایک طنزیہ نظم لکھی ہے اس کی پاداش میں اُس کو تین سو میل دُور بمقام ٹلے جلاوطن کردیا گیا۔ یہاں سے اُس نے ایک خط میں لکھا:-

"میں یہاں ایک قصر میں اقامت رکھتا ہوں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے کہ اگر میں جلاوطن ہو کر یہاں نہ آیا ہوتا۔ تو دنیا میں قابلِ دید ہوتی۔ اور اس کو چھوڑنے کی اجازت کے سوا جو میسر نہیں۔ یہاں عیش و راحت کے جملہ اسباب مہیا ہیں۔ یہاں رہنا میرے لئے بے انتہا مسرت بخش ہو اگر مجھے یہاں سے چلے جانے کی اجازت مل جائے" +

کچھ مدت بعد اس کو واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن پھر جلد ہی گرفتار کرلیا گیا۔ اور اس دفعہ اس کو زندانِ بسٹیل میں ڈالدیا گیا۔ یہاں وہ ایک سال تک رہا۔ اسی قیدخانہ میں اُس نے فرنیکائے میری ارادٹ کی بجائے والٹیئر کا نام اختیار کیا اور اُس وقت سے لے کر آجتک اسی نام سے مشہور ہے +

فرانس سے فراری

قیدخانہ سے نکلنے کے بعد والٹیئر کا دل نئے نئے خیالات سے ایسا ہی لبریز

تھا۔ جیسا موسم بہار پھولوں سے۔ اس کے اندر ایک جوش اور ولولہ سا تھا۔ وہ ہر موضوع اور ہر مسئلہ پر اپنے خیالات بے کم و کاست بیان کرتا پھرتا۔ اس کی طبع رواں کی تلوار سے نہ بادشاہ بچا۔ نہ پادری۔ اور اس کی صاف بیانی جلد ہی رنگ لائی۔ اور اسے فرانس کی خوبصورت اور آفتابی کرنوں سے دُھلی ہوئی سرزمین کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور اس کی بجائے کہر اور دھند کی سرزمین یعنی انگلستان میں پناہ لینی پڑی +

یہاں دوران قیام میں وہ انگلستان کی بلند ترین اور بہترین شخصیتوں سے متعارف ہوا۔ وہ شاعر پوپ سے ملا۔ جو لفظوں سے مصنوعی پھول ایسے اعلیٰ تیار کرتا تھا کہ اصلی معلوم ہوتے تھے۔ صرف خوشبو کی کسر رہ جاتی "خیالات شبی" کے مصنف ینگ۔ تمیزداری کے پتلے گر انسانیت سے معرا چسٹر فیلڈ۔ شہرۂ آفاق ہجو نگار سوِفٹ۔ اور کانگریو وغیرہ مشاہیر سے ملتا رہا۔ اور ان کے ساتھ علمی اور ادبی مذاکرے ہوتے رہے +

توہم پرستی کی مخالفت

اسی زمانہ میں والٹیئر کے دل میں مذہب کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوتے رہے۔ وہ محسوس کرنے لگا۔ کہ مذہب کی صورت پادریوں کے ہاتھوں مسخ ہو چکی ہے۔ اور اب وہ فقط مجموعۂ اوہام و رسوم رہ گیا ہے۔ اور اس رسمی مذہب نے دنیا کے اندر ظلم و ستم اور خوف و دہشت پھیلا رکھی ہے۔ اعمال کی نیکی اور پاکیزگی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ان سے زیادہ لباس اور وضع قطع کو اہمیت دی جا رہی ہے تصویریں اور بت۔ صلیبیں اور کرم خوردہ ہڈیاں انسان کی زندگی اور اُس کے حقوق سے کہیں زیادہ قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔ اب اس نے اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ اپنی فطری مستعدی سے اس صورت حالات کا مقابلہ شروع کیا +

وہ عقل عامہ کا پیرو تھا۔ ناقابل فہم امور کا قائل نہ ہوتا۔ خرق عادت کو محض ڈھکوسلہ سمجھتا۔ اس کا ایمان تھا۔ کہ دنیا کا کارخانہ مقررہ اصولوں پر چل رہا ہے۔ اور ان میں کبھی سرِ مو فرق نہیں پڑ سکتا۔ وہ علم کیمیا کو بھی بے بنیاد جھوٹ سمجھتا۔ اور یہ کہ کر اس کا مذاق اڑایا کرتا۔ کہ لوہے کو سونے میں تبدیل کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ پہلے لوہے کو نابود کرنا۔ دوسرے سونے کو پیدا کرنا +

وہ نہایت بامذاق۔ خوش طبع اور مسرور انسان تھا۔ وہ ان لوگوں کو ناقابل رحم خیال کرتا تھا جو دنیا ندار یا مسرور ہونے کے لئے مذہب کی اعانت کے محتاج تھے۔ وہ ان باتوں کو محض توہم پرستی سمجھتا۔ اب اس نے تہیہ کر لیا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو اوہام و وساوس کی زنجیروں سے آزاد کر دے۔ اس کے بعد جو جو ہتھیار اُس کی غیر معمولی قابلیت اور دماغی قوت اُسے دے سکی۔ اس نے اس مقصد کے حصول میں استعمال کرنے سے دریغ نہ کیا۔ وہ کسی کی کمزوریوں کا خاکہ اڑانے میں کمال رکھتا تھا۔ قدرت نے یہ وصف خاص طور پر اُسے بخش رکھا تھا۔ اور والٹیئر نے بھی اس کو کمال بے رحمی سے برتا۔ کئی سال تک اسکی بے چین اور مضطرب طبیعت نے یورپ بھر میں اپنے مضامین نظموں۔ ڈراموں تاریخوں اور افسانوں کے ذریعہ ہنگامہ بپا کئے رکھا۔ ان تصانیف میں اس نے قلب انسانی کی ہر کیفیت کو نمایاں طور پر بے نقاب کیا۔ ساٹھ سال تک وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ مصروف پیکار رہا۔ کبھی کھلے میدان میں اور کبھی موقعہ کی آڑ سے۔ لیکن اس تمام مدت میں وہ تمام انسانوں سے بے نیاز اور مستغنی رہا۔ اور اپنی گردن کو کسی کے بار احسان سے جھکنے نہ دیا +

کئی سال تک وہ خدا کی ہستی کا قائل رہا اور اسی کو دین فطرت کہتا رہا۔ خدا تعالیٰ کو وہ آسمانی باپ۔ سرچشمۂ انصاف، منبع ادراک اور مصدر رحم و کرم تصور کرتا تھا۔ لیکن اس کے خیال میں کلیسا کی تعلیم خدا کو ظلم و ستم کا خوفناک مجسمہ اور بندوں کو عذاب دے دے کر خوش ہونے والی ہستی ظاہر کرتی تھی۔ اور اسی لئے وہ کلیسائی خدا کا قائل نہ تھا۔ وہ بائیبل اور کلیسا پر تو بے جگری سے حملے کرتا اور اُن کا مضحکہ اڑاتا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس خدا کی تعریف کے نغمے گاتا جو ہمیں بارش اور روشنی دیتا ہے۔ صدہا نعمتیں اور خوبصورت پھول بخشتا ہے۔ صحت و تندرستی اور خوشی و خرمی عطا فرماتا ہے۔ وہ خدا جو اس عالم رنگ و بو کو شباب اور حُسن کی بیش بہا نعمتیں بخشتا ہے +

ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے تھے۔ لیکن وہ بھی ہر اُس ہتھیار سے۔ جو ظرافت۔ منطق۔ عقل۔ نفرت۔ حقارت۔ مضحکہ۔ جوش۔ رقت۔ غیظ و غضب اسے دے سکتے تھے۔ ان حملوں کا جواب دیتا رہا۔ وہ کئی دفعہ اعتذار کرتا۔ لیکن اس کا اعتذار اور زیادہ توہین آمیز ہوتا۔ وہ اپنی کہی ہوئی بات واپس لیتا۔ لیکن اس سے زیادہ سنگین اور جگر شگاف چوٹ لگاتا۔ قصیدہ کہ کر وہ اپنے مخالف کی دھجیاں اڑاتا۔ اس کی تعریف میں زہر بھرا ہوتا۔ اُس کی پسپائی میں پیشقدمی مضمر ہوتی اور اس کا اعتراف شکست نغمۂ فتح کے مترادف ہوتا +

دہریت والحاد

۱۷۵۵ء میں پرتگال کے دارالحکومت لزبن میں ایک خوفناک زلزلہ آیا۔ اس مصیبت خیز تباہی و بربادی نے والٹیئر کے دل میں خدا کی ہستی کے متعلق شک و شبہ پیدا کردیا۔ وہ دل ہی دل میں سوال کرتا۔ کہ جب زلزلہ آیا اُس وقت آسمانی باپ کیا کر رہا تھا۔ اُس نے کیوں اپنے ہزاروں بچوں کو اس طرح تباہی کے گھاٹ اُترنے دیا۔ اور پھر اُس وقت جبکہ وہ اُسی کے حضور گھٹنوں کے بل گر کر اُس کی تعریف و ثنا کر رہے تھے"! یہ ایک ٹھوکر تھی جس نے والٹیئر کے قدم ڈگمگا دیئے۔ شک و شبہ کے تاریک بادل اُس کے مطلع دل پر یکسر چھا گئے۔ اور ایمان کی آخری کرن کو اپنی ظلمت میں چھپا لیا۔ وہ دہریت و الحاد کی تاریک غاروں میں گر گیا۔ اور اگر پہلے صرف کلیسا سے منحرف تھا۔ اب خدا تعالیٰ سے بھی باغی ہوگیا +

قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کئی سعید روحوں کے لئے ہدایت کا موجب ہوتا ہے۔ اور وہی واقعہ کئی بدبختوں کے لئے گمراہی و ضلالت کا سبب بنتا ہے۔ یہ زلزلہ بھی کئی لوگوں کے لئے باعث عبرت ہوا ہوگا۔ والٹیئر کے لئے ضلالت و گمراہی کا پیغام لایا +

بعض مشاہیر کی والٹیئر کے متعلق رائے

اس بلند پایہ ادیب اور قابل شخصیت کے متعلق دنیا کے مشہور فلاسفروں اور مصنفین نے بالکل متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک کی رائے ناظرین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگی :-

جرمنی کے بے مثال شاعر اور گراں پایہ فلاسفر گوئٹے نے اپنے پُرشکوہ طرزِ تحریر میں والٹیئر کو ان لفظوں میں خراجِ تحسین ادا کیا ہے : -

"اگر تم ژرف نگاہی۔ غیر معمولی ذہانت۔ تخیل۔ ذوق۔ عقل۔ حکمت۔ فطرت۔ ادراک۔ خیال آفرینی۔ حقیقت۔ سلاست۔ لچک۔ صحت۔ کمالِ فن۔ کثرت۔ تنوع۔ زرخیزی۔ حدت۔ طلسم۔ دلکشی۔ ناز۔ قوت۔ عقاب کی بینائی۔ وسعتِ فہم۔ پُرمنفعت تعلیم۔ بہترین لہجہ۔ ضرارت۔ شیریں ادائی۔ نزاکت۔ پاکیزگی۔ صفائی۔ فصاحت و بلاغت۔ ہم آہنگی۔ تنوع۔ برق رفتاری۔ خوش طبعی۔ تاثیر۔ رفعت۔ عالمگیری اور معراج تکمیل دیکھنا چاہو۔ تو والٹیئر کو دیکھو" +

کارلائیل کو بھی جو بوجہ رقابت بہت کم اپنے ہم عصروں کی تعریف میں کوئی لفظ کہنا پسند کرتا ہے۔ یہ اعتراف کرنا پڑا کہ والٹیئر نے عہد حاضرہ کے اوہام و وساوس کے رفیع المنزلت قصر کی اینٹ سے اینٹ بجادی +

ان کے ساتھ ہی لارڈ میکالے کی رائے بھی قابلِ لحاظ ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ میکالے خود مسیحی تھا۔ اور والٹیئر مسیحیت کا دشمن۔ وہ لکھتا ہے کہ والٹیئر نے ہمارے صدی کے علم و ادب میں انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ نیز کہتا ہے۔ کہ

"یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ والٹیئر طبعاً بے درد اور ظالم نہ تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ اُس کے دل میں کسی چیز کا ذرہ بھر احترام نہ تھا۔ علم و فن کے مسائل۔ مذہب کے سنجیدہ ترین موضوع۔ قبر اور حیات بعد الممات کے مباحث۔ ہر ایک میں وہ اپنے فطری مسخرہ پن سے کام لیتا۔ اور ہر بات کا مضحکہ اُڑاتا۔ جسقدر موضوع زیادہ سنجیدہ اور اہم ہوتا۔ اسی قدر زیادہ وہ بندر کی طرح منہ چڑاتا اور اُس کی ہنسی اُڑاتا۔ الغرض وہ مسخروں کا بادشاہ تھا۔ وہ ضبط سے کام نہ لیتا۔ بلکہ گھُورتا۔ دانت نکالتا۔ کولھے مٹکاتا۔ اُنگلی اُٹھاتا۔ ناک چڑھاتا اور زبان کو باہر لٹکاتا۔ اور ان ہتھیاروں سے اپنے مخالف کو ذلیل و رسوا کرتا" +

انگرسول اور میکالے اس امر میں متفق ہیں۔ کہ والٹیئر نے اپنی زندگی کے بہترین سال غریبوں اور مظلوموں کی امداد و اعانت میں بسر کئے۔ وہ بے گناہوں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دلاتا۔ بیکسوں کی دستگیری کرتا۔ زیردستوں کو زبردستوں کے ظلم سے بچانے میں دامے۔ درمے۔ قدمے۔ قلمے ہر طرح تیار و مستعد رہتا۔ چنانچہ ذیل کے دو واقعات مشتے نمونہ از خروارے کا کام دیں گے +

والٹیئر کی رحمدلی اور انسانی ہمدردی

ٹولوس ایک مقدس شہر تھا۔ اس میں بہت سی بابرکت یادگاریں تھیں۔ لوگ جہالت کے پتلے تھے۔ مگر ان کے قبضہ میں ہیرودیس کے ہاتھوں قتل شدہ بچوں کی ہڈیاں۔ حضرت مریم کے لباس کا ٹکڑا۔ اور بہت سے اولیاؤں کی کھوپڑیاں اور ڈھانچے تھے۔ ان رومن کیتھولک عیسائیوں کے درمیان چند رومن پراٹسٹنٹ بھی خاموشی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ کیونکہ تعداد میں کم تھے۔ ان میں سے ایک جین کلاز معمولی دوکاندار تھا۔ وہ چالیس سال سے یہاں بود و باش رکھتا تھا اور اس کا چال چلن ہر قسم کی بدنامی سے پاک تھا۔ وہ رحمدل۔ دیانتدار اور ملنسار آدمی

تھا۔ جین کلاز کی ایک بیوی۔ چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ اس کے بڑے لڑکے نے قانون کا مطالعہ کیا۔ لیکن اُسے وکالت کی اجازت نہ مل سکتی تھی جب تک وہ رومن کیتھولک مذہب اختیار نہ کرے۔ اُس نے پوشیدہ طور پر لائسنس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن راز افشا ہوگیا۔ اس سے اُسے صدمہ ہوا اور وہ اس قدر دل شکستہ ہوا کہ آخر خودکشی کرلی +

اب ٹولوس کے متعصب لوگوں نے یہ کہانی گھڑی۔ کہ رومن کیتھولک ہونے سے روکنے کے لئے اُس کے والدین نے اُسے قتل کر ڈالا ہے۔ اس خوفناک الزام میں اُس کا والد۔ والدہ۔ ایک بیٹا۔ ایک ملازمہ اور ایک مہمان فوراً گرفتار کرلئے گئے۔ مرنے والے کو شہید قرار دیا گیا۔ اور کلیسا نے اُس کی نعش کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے۔ کوئی ثبوت نہ تھا صرف لوگوں کی چہ میگوئیوں کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا +

حالانکہ تمام واقعات و شواہد ملزمین کے حق میں تھے۔ لیکن جین کلاز کے خلاف یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے اُسے عذاب دیئے جائیں۔ اور آخر میں خوفناک چکر پر اُس کے اعضا توڑ کر اُسے مار ڈالا جائے۔ یہ ۹ مارچ ۱۷۶۲ء کو فیصلہ ہوا۔ اور دوسرے ہی روز اس کی تعمیل شروع ہوگئی +

غریب باپ کو عقوبت خانے میں لے گئے۔ وہاں جلاد اور اُس کے معاونین سے حلف لیا گیا کہ وہ عذاب فیصلے کے مطابق دیں گے اور کسی قسم کی نرمی روا نہ رکھیں گے۔ بعد ازاں ایک سنگین دیوار میں ایک آہنی حلقہ کے ساتھ اس غریب کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ اور اُس کے پاؤں ایک دوسرے آہنی حلقہ میں جکڑ دیئے گئے۔ جو فرش میں نصب تھا۔ پھر انہوں نے رسیوں اور زنجیروں کو کسنا شروع کیا۔ اور یہاں تک کسا کہ جین کلاز کے بازوؤں اور ٹانگوں کے تمام جوڑ بند اپنے اپنے مقام سے ہٹ گئے۔ تب اُس سے صحیح حالات کے متعلق سوالات کئے گئے۔ لیکن وہ اپنی معصومیت کا اظہار کرتا رہا۔ پھر زنجیروں کو اور کس دیا حتیٰ کہ طائرِ روح اُس کے شکستہ جسم میں پھڑکنے لگا۔ لیکن وہ اپنی بےگناہی کا اعلان کرتا رہا۔ اس کارروائی کو اُس وقت کی اصطلاح میں "معمولی تفتیش" کہا جاتا تھا۔ پھر ججوں نے ملزم کو سمجھایا۔ کہ وہ اپنے جرم کا اقبال کرلے۔ لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا۔ اور اپنی بے لوثی کا یقین دلاتا رہا۔ اب "غیر معمولی تفتیش" شروع ہوئی۔ بچارے ملزم کے منہ کے ساتھ ایک نل لگا دیا گیا جس کے ذریعہ قریباً پندرہ سولہ سیر پانی اُس کے پیٹ میں جبراً داخل کیا گیا۔ اس سے اُس کو ناقابلِ بیان تکلیف ہوئی۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ پھر اُسے صلیب پہ لٹے وہاں اُس کو باندھ دیا گیا۔ اور جلاد نے لوہے کی سلاخ سے گیارہ ضربیں لگائیں۔ اور اس کی بڑی بڑی ہڈیوں کو دو دو جگہوں سے توڑ ڈالا۔ اس کے بعد اس کو سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ قریباً دو گھنٹے تک وہ زندہ رہا لیکن اخیر دم تک اپنی بےگناہی کا اظہار کرتا رہا۔ چونکہ مرنے میں ذرا دیر لگی۔ اس لئے جلاد نے گلا گھونٹ کر اس کا قصہ پاک کیا۔ بعد ازاں اس کا خون میں لتھڑا ہوا۔ شکستہ اور مجروح جسم کو لکڑی کے ساتھ باندھ کر جلا دیا گیا +

یہ تمام کارروائی ٹولوس کے "خداپرست" باشندوں کے لئے قابلِ دید نظارہ اور دلچسپ تماشہ تھا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ جین کلاز کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ اُس کے بیٹے کو صرف اس شرط پہ رہائی ملی کہ وہ رومن کیتھولک ہو جائے۔ دونوں لڑکیوں اور ملازمہ کو خانقاہ میں داخل کرلیا گیا۔ مہمان رہا کیا گیا اور غریب آفت رسیدہ بیوہ کو آوارہ پھرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا +

والٹیئر نے جب یہ ہولناک داستان سُنی۔ تو اُسے آگ سی لگ گئی۔ اُس نے ایک لڑکے کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور اس تمام مقدمہ کی تاریخ لکھی بادشاہوں اور تاجدار شہزادیوں۔ امراء اور وزراء کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا۔ جہاں روپے کی ضرورت پڑی وہاں روپیہ خرچ کیا۔ اور کئی سال تک یورپ کی فضا کو جین کلاز کی دردناک چیخوں سے معمور رکھا۔ انجام کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ججوں کا فیصلہ منسوخ کر دیا گیا اور جین کلاز کو بے گناہ قرار دیا گیا ؏

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہزاروں ڈالر بیوہ اور اُس کے خاندان کی امداد کے لئے جمع کئے گئے۔ اس تمام کامیابی کا سہرا والٹیئر کے سر تھا +

خاندان سروَن کی مظلومیت

ایک پروٹسٹنٹ عیسائی سروَن نامی اپنی بیوی اور تین لڑکیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ بشپ کے ملازم کی نیت تھی کہ اُس کی ایک لڑکی رومن کیتھولک بنائی جائے۔ قانون نے بشپ کو اجازت دے رکھی تھی۔ کہ کسی پروٹسٹنٹ کا بچہ لے کر اس کی روح کو بچانے کے خیال سے رومن کیتھولک بنائے۔ چنانچہ سروَن کی ایک لڑکی کو جبراً والدین سے چھین کر خانقاہ میں داخل کر دیا گیا۔ وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے والدین کے پاس آگئی۔ غریب کے ننھے سے جسم پر کوڑوں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ والدین کی جدائی کے صدمے اور خانقاہ کی پُرتشدد زندگی نے لڑکی کے

جو اس نے قتل کردیئے تھے۔ وہ یکایک غائب ہوگئی۔ چند روز بعد اُس کی لاش ایک کنوئیں میں سے ملی۔ شور مچ گیا کہ اُس کے والدین نے اُسے عمداً مار ڈالا ہے۔ کہ مبادا رومن کیتھولک نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ ٹولوس سے تھوڑے فاصلہ پر ہوا۔ اور اُس وقت جب جین کلاز قید خانہ میں محبوس تھا۔ لڑکی کے والدین کو یقین تھا کہ مقدمہ ہوا تو جان کی خیر نہیں۔ بچارے بھاگ نکلے۔ ان کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ جائداد ضبط کرلی جائے۔ والدین جلاد کے ہاتھوں قتل کئے جائیں۔ لڑکیوں کو والدین کے قتل کا نظارہ دکھانے کے بعد جلاوطن کیا جائے۔ سردی کا موسم تھا جب یہ مصیبت زدہ قافلہ گھر سے بھاگا۔ راستہ میں برفباری ہو رہی تھی۔ کہ بڑی لڑکی نے جو شادی شدہ تھی بچہ جنا۔ ماں کا وہیں انتقال ہوگیا۔ اور آخر گرتا پڑتا یہ بے سروسامان قافلہ سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا۔ مگر کھانے کو ان کے پاس سوکھی روٹی تک نہ تھی۔ انجام کار وہ والٹیئر کے پاس گئے۔ اُس نے ان کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا۔ ان کو اپنی حفاظت میں لیا۔ ان کی معاش کا معقول بندوبست کیا۔ اور اس کوشش میں لگ گیا۔ کہ اس خوفناک فیصلہ کو منسوخ کرائے جو نوسال ہوئے ان کے خلاف صادر ہو چکا تھا۔ اُس نے بادشاہوں سے روپے کے لئے اپیل کیا۔ روس کی شہزادی کیتھرائن دوم کو لکھا۔ اور ان کے علاوہ سینکڑوں لوگوں کو اس ظلم صریح کی جانب توجہ دلائی۔ آخر وہ کامیاب ہوا۔ اس مقدمہ کی بابت اُس نے لکھا ہے۔ کہ ۱۷۶۲ء میں دو گھنٹے کے اندر اندر خاندان بھر کو مقدمہ چلایا گیا۔ اور فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اب ۱۷۷۱ء میں پورے دس سال کی مسلسل کوشش کے بعد ان غریبوں کو ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس ملے ہیں"+

الغرض ایسے بیسیوں دردناک واقعات ہیں۔ جن میں والٹیئر نے ہمیشہ کمزوروں اور ضعیفوں کی دستگیری کی۔ ایسی باتیں سُنکر اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اُس کا خون اُبلنے لگتا تھا۔ وہ یہاں تک بیزار ہوگیا۔ کہ ایک مرتبہ اُس نے فرانس کی سرزمین کو جس کے اندر ایسے ایسے مظالم توڑے جاتے تھے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن غریبوں اور مظلوموں کی حمایت کے خیال نے اُسے باز رکھا+

مساواتِ انسانی کا علمبردار

والٹیئر ہمیشہ مساوات کا سرگرم واعظ رہا۔ اس کا یہ قول تھا کہ انسان پیدائش سے ہی ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ آؤ صرف نیکی اور خوبی کا احترام کریں۔ اور نسب وخاندان کو فراموش کردیں۔ آؤ۔ اپنے دلوں کے اندر یہ حقیقت ثبت کرلیں کہ تمام انسان برابر ہیں"+

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاید والٹیئر کو اسلام کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ یقین واثق ہے کہ وہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوتا۔ اور دہریت والحاد میں مبتلا نہ ہوتا۔ وہ نیک اخلاق اور رحم وانسانیت کے مذہب کا قائل رہا۔ وہ نہ تو شاعروں میں سب سے بڑا اور نہ ڈراما نویسوں کا سرتاج تھا۔ لیکن انگرسول کے خیال کے مطابق اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انسان تھا۔ وہ آزادی کا سب سے بڑا حامی اور غلامی کا بدترین دشمن تھا+

پیرس کو مراجعت

ستائیس سال کی جلاوطنی کے بعد وہ پیرس کو لوٹا۔ اس کی واپسی نہایت شاندار تھی۔ جابجا فتحمند جرنیل کی طرح اُس کا استقبال کیا گیا۔ فرانسیسی اکاڈمی کے ارکان جن میں بہترین ارباب علم وفن شامل تھے اس کے خیر مقدم کو آئے اور یہ وہ عزت تھی کہ جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس کی ٹریجڈی "آئرین" تمثیل کی گئی۔ تھیئٹر میں اسے پھولوں کا تاج پہنایا گیا۔ اس وقت وہ فرانس کا سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا۔ اقلیم ادب کا واحد تاجدار۔ اس وقت فرانس میں تین طاقتیں کارفرما تھیں۔ بادشاہ۔ کلیسا اور والٹیئر۔ اگرچہ بادشاہ اس کا جانی دشمن تھا۔ اور کلیسا کے پادری اس کے خون کے پیاسے۔ لیکن والٹیئر فرانسیسی عوام کو اسقدر محبوب تھا کہ وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے+

اب وہ چوراسی سال کا بڈھا تھا۔ زندگی کی تمام راحتیں اس کے گردوپیش موجود تھیں۔ دولت اس کی دست بستہ کنیز تھا۔ غالباً اس سے پہلے کسی مصنف کو اسقدر مال و دولت نصیب نہ ہوا تھا۔ اور ان آخری ایام میں فرانسیسیوں نے اس کی عزت نہیں بلکہ پرستش کی+

والٹیئر کا انتقال

۱۷۷۸ء مئی کے آخری دن تھے کہ پیرس میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ والٹیئر بستر مرگ پر دم توڑ رہا ہے۔ اس کی موت سے دو روز پیشتر اسکا بھتیجا گیا۔ اور دو پادریوں کو بلالایا۔ اور اپنے بیمار چچا کے کمرے میں لے گیا۔ والٹیئر نے ان کی طرف دیکھا۔ اور بھتیجے سے کہا۔ ان کو میرا سلام دو۔ اور میرا شکریہ پہنچادو" بڑے پادری نے آگے بڑھ کر کہا: نیک بخت انسان بتا۔ کیا تو ہمارے خداوند یسوع مسیح کی الوہیت

ا اقرار کرتا ہے؟" والٹیئر نے یہ سُنا۔ اور ہاتھ بڑھا کر پادری کو پیچھے دھکیل کر کہا۔ "مجھے آرام سے مرنے دو"۔ اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ پادری مایوس ہو کر چلا گیا۔

۳۰ مئی کو رات کے ساڑھے بجے اُس نے اپنے ملازم خاص موریند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُسے دبایا اور کہا۔ "الوداع میرے عزیز موریند۔ میں اب جا رہا ہوں"۔ یہ اُس کے آخری لفظ تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

لیکن مسیحیوں کے بیان کے مطابق اس کی زندگی کے آخری لمحات نہایت کرب و درد میں گذرے۔ وہ کتے کی طرح آواز نکالتا۔ اور عجیب ہذیان بکتا رہا اور کئی روز تڑپ تڑپ کر جان دی۔

والٹیئر کو زندگی بھر میں کسی خوف اور اندیشہ نے پریشان نہیں کیا لیکن دفن ہونے کے متعلق اُسے بہت فکر رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ فلاسفروں اور غیر مسیحی عالموں کو قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا جاتا۔ بعض کو جلایا جاتا اور ان کی راکھ بکھیر دی جاتی۔ بعض کی نعشوں کو طعمۂ زاغ و زغن بننے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جاتا لیکن والٹیئر کو یہ منظور نہ تھا۔ محض اسی خیال سے اس نے ظاہری طور پر چند ایک عیسائی رسومات بھی پوری کر دیں لیکن پھر بھی پادری جانتے تھے۔ کہ یہ سب ظاہر داری اور ریاکاری ہے۔ اور والٹیئر کو معلوم تھا کہ کچھ بھی کروں۔ مجھے پادری لوگ پیرس کے قبرستانوں میں ہرگز دفن نہ ہونے دینگے۔

اسی خیال سے اس کی موت کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا۔ اس کے ایک ہمدرد پادری نے پیرس سے سو میل کے فاصلہ پر دریائے سین کے کنارے پر اس کے دفن کا انتظام کیا۔

۳۱ مئی کی شام کو والٹیئر کی نعش کو ایک لمبا کوٹ اور ایسے کپڑے پہنائے گئے جن سے معلوم ہو کوئی مریض ہے۔ اس کو ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اور ساتھ ایک ملازم سہارا دینے کے لئے بیٹھ گیا۔ گاڑی میں چھ گھوڑے جوتے گئے تاکہ دیکھنے والے خیال کریں۔ کوئی بہت بڑا امیر اپنی جاگیر کو جا رہا ہے پیچھے پیچھے ایک گاڑی تھی جس میں اُس کے دو بھتیجے اور دو اور رشتہ دار بیٹھے تھے۔ تمام رات سفر کرتے رہے اور دوسرے روز منزل مقصود پر پہنچے۔ جہاں ضروری کاغذات دکھانے کے بعد والٹیئر کو دفن کیا گیا۔ بعد میں اس پادری کو بشپ کی طرف سے ایک تہدیدی خط موصول ہوا جس میں والٹیئر کو دفن کرنے کی مخالفت تھی۔ لیکن خط بہت دیر میں پہنچا۔ وہ دفن ہو چکا تھا۔

انقلاب فرانس

۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو فرانس کے مصیبت زدہ عوام کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ وحشیانہ جوش کے ساتھ اُٹھے۔ تخت حکومت کو اُلٹ دیا۔ امراء کی سرکش اور مغرور گردنوں کو بھینچ بھینچ کر دل کے ارمان نکالے۔ زندان پیرس بر دوش ابول دیا۔ بیسٹیل کے دروازے کھول دیئے۔ اور سالہا سال سے محبوس بے گناہوں کو آزاد کیا۔ اس وقت "والٹیئر کی جے"۔ "والٹیئر زندہ باد" کے نعرۂ جنگ سے فرانس کے زمین و آسمان گونج رہے تھے۔

والٹیئر کو خراجِ عقیدت

۱۷۹۱ء میں اجازت دی گئی۔ کہ والٹیئر کی ہڈیوں کو پیرس کے شاہی قبرستان میں دفن کیا جائے۔ ایک وقت تھا کہ چوری اُسے پیرس سے ایک سو دس میل کے فاصلہ پر دفن کیا گیا۔ اور آج فرانسیسی قوم اُس کی میّت کے جلوس میں شامل تھی۔ ہر گاؤں۔ ہر قصبہ۔ ہر قریہ اپنے اپنے جھنڈوں اور نشانوں کے ساتھ اس فرانسیسی فلاسفر کے استقبال کو نکلا۔ جلوس ایک سو میل لمبا تھا۔ آخر بیسٹیل کے کھنڈرات پر والٹیئر کو پورے پورے عزّت و احترام سے سپرد زمین کیا گیا۔

لیکن پادری بھی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ رات کی تاریکی میں ہڈیوں کو نکال لے گئے۔ اور اگرچہ قبر خالی رہ گئی۔ لیکن دنیا اس کی شہرت سے گونج اُٹھی۔ ۵

ہماری خاک کی بربادیاں ذرا دیکھو
کہاں کہاں سے اُڑی اور کہاں کہاں ٹھہری

(خاص) ریاض بی اے

خان شہید

قاآن ملک سلطانؒ محمد

از جناب سید حسن برنی ۔ بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی ۔ علیگ ایڈوکیٹ بلند شہر

ہندوستان کے تین نامور بادشاہوں آسنے بک[ع] ۔ ایل تتمش اور بلبن نے اپنی زندگی غلامی سے شروع کی آسنے بک کو محمد غوری نے خریدا تھا ۔ (ط ۱۳۸) ایل تتمش کو آسنے بک نے (ط ۱۶۸) اور بلبن کو ایل تتمش نے (ط ۲۸۲) تینوں اپنی حسن لیاقت سے ادنیٰ غلاموں کے درجے سے بادشاہی تک پہنچ گئے ۔ تینوں نے تجربہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی اور تینوں حکمرانی کے دشوار فن میں بڑے کامیاب ثابت ہوئے ۔

ان تینوں بادشاہوں کی شخصیتیں ہندوستان کی تاریخ میں نہایت بلند پایہ رکھتی ہیں لیکن اُن کے مکمل حالات اور سیرتیں ابھی لکھی جانی باقی ہیں ۔

بلبن البری ترکوں میں پیدا ہوا تھا ۔ اور اُس کے آقا ایل تتمش کا خاندان بھی انہی ترکوں میں تھا ۔ (ط ۱۶۵ و ۲۸۱) عین شباب کا زمانہ تھا کہ ترکستان پر مغلوں کی ایک یورش میں وہ اپنے خاندان اور وطن سے جدا ہو گیا اور بغداد کے بازار میں بیچ دیا گیا ۔ وہاں سے گجرات لے آئے جہاں خواجہ جمال بصری نامی ایک تاجر نے اُسے خرید کر اولاد کی طرح پالا اور ہونہار دیکھ کر سلطان شمس الدین ایل تتمش کے ہاتھ سنہ ۶۳۰ھ میں دہلی بیجا کر فروخت کر دیا ۔

بعد میں بلبن کا چھوٹا بھائی کشلی خاں اور ایک چچازاد بھائی شیر خاں بھی اسی بادشاہ کی خرید میں آ گئے اور ترقیاں پا کر بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے (ط ۲۷۰ - ۲۸۰)

بلبن اپنی ذاتی خوبیوں سے روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایل تتمش کے نیکدل گوشہ نشین اور خدا پرست بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں سنہ ۶۴۷ھ نائب السلطنت کے درجہ پر فائز ہو کر بادشاہ کی دامادی اور الغ خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا ۔ (ط ۲۱۳ و ۲۹۳) ۔

ناصر الدین کا وقت زیادہ تر عبادت اور تلاوت و کتابت کلام اللہ میں صرف ہوتا تھا ۔ سلطنت کا سارا کاروبار بلبن ہی انجام دیتا تھا ۔

جب ناصر الدین کے بعد بلبن تخت پر بیٹھا تو اُس نے اپنی دانشمندی اور تجربہ کاری سے ہندوستان کی سلطنت کو جس میں ایل تتمش کے بعد کمزور بادشاہوں کی وجہ سے بڑی ابتری پھیل گئی تھی سنبھالنا اور مضبوط کرنا شروع کیا ۔ اُس نے فتوحات اور لشکر کشیوں کے خیالات چھوڑ کر سلطنت کے استحکام اور مغربی سرحد کی حفاظت کو اپنا کام قرار دے لیا ۔

ہندوستان کو اُس وقت سب سے بڑا خطرہ مغلوں کا لگا ہوا تھا ۔ جنھوں نے دنیا میں ہل چل ڈال رکھی تھی ۔ صدیوں کے تمدن اُن کے ہاتھوں خراب ہو کر رہ گئے تھے ۔ وہ بغداد کی خلافت عباسیہ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر چکے تھے اور چین اور روس تک اُن کا تسلط ہو گیا تھا ۔ ہندوستان بچا ہوا تھا اور اُس پر ہر وقت اُن کی نظر لگی رہتی تھی ۔ اور ایک عرصہ تک یہ ملک بھی بڑے خطرے میں گھرا رہا ۔

مغلوں کے استیلا سے ہندوستان کا کیا حشر ہوتا ؟ اس کے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ۔ وہ جہاں جاتے تھے اپنے پیچھے کشتوں کے پشتے اور خاکستر کے ڈھیر یا لق و دق میدان اور ویرانے چھوڑ جاتے تھے ۔

ع اس مضمون کے تیار کرنے میں بہترین ماخذ طبقات ناصری (سنہ ۶۵۸ھ) تاریخ فیروز شاہی (سنہ ۷۵۸ھ) اور تصانیف امیر خسرو (غیر مطبوعہ) بالخصوص دیوان وسط الحیوۃ ہیں ۔ بنظر اختصار ہم نے طبقات کے صفحات کا حوالہ کے لئے "ط" اور تاریخ فیروز شاہی کے لئے "ف" بطریق علامت مقرر کر دئیے ہیں ۔

ع ہندوستان کے ترک بادشاہوں کے بعض نام کا تلفظ صحیح نہیں کیا جاتا ۔ آسنے بک کے نام کا صحیح تلفظ مختلف طور پر کیا گیا ہے اور اس کے نام کے صحیح معنی اس وقت تک کسی نے بیان نہیں کئے ہماری تحقیقات سے یہ نام آسنے بنام ماہ اور بک بمعنی چہرہ سے مرکب اور اس کا ترجمہ "ماہرو" یا ماہ رخ ہوتا ہے ۔ اس کے لئے ہمارے پاس امیر خسرو کی سند موجود ہے ۔ جس پر مفصل بحث کسی اور وقت کی جائے گی ۔

التمش نے چنگیز خاں کی دستبرد سے ہندوستان کو بچائے رکھا۔ اور بلبن نے چنگیز خاں کے جانشینوں سے۔ بلبن کے زمانہ میں مغلوں کا ستارہ اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اور ان کے ہاتھوں سے ہندوستان کا بچا لینا کوئی سہل کام نہ تھا۔ بلبن کو اس میں انتہائی کوششوں سے کام لینا پڑا یہاں تک کہ اسی میں اُسے اپنی آنکھ کا تارہ اور اُمیدوں کا سہارا بیٹا بھینٹ چڑھانا پڑا ✦

بلبن کا وہ بڑا بیٹا تھا۔ زندگی میں اُس کا نام محمد سلطان اور خطاب قاآن ملک تھا لیکن تاریخ میں وہ خان شہید کے لقب سے مشہور ہے (ف ۶۶)

بلبن کے صرف دو بیٹے تھے۔ چھوٹے بیٹے کا نام محمود سلطان خطاب بغرا خاں اور لقب ناصرالدین تھا۔ اپنی زندگی میں بلبن نے اُسے لکھنوتی (بنگال) کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ بلبن کے بعد اُس نے بنگال میں آزاد حکومت قایم کر لی۔ اور عرصہ تک اُس کا خاندان وہاں حکومت کرتا رہا ✦

تمام تاریخی شہادتیں متفق ہیں کہ یہ دونوں لڑکے بڑے شائستہ اور تعلیم یافتہ تھے۔ بلبن نے اُن کی تعلیم و تربیت میں بڑا اہتمام کیا تھا وہ منصب شاہی و حکمرانی کے متعلق بڑے اونچے خیال رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے بیٹوں کو ہر طرح اُس کا اہل بنا دے۔ بڑا بیٹا اپنی خوبیوں میں یکتائے زمانہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کی ذات سے بادشاہ اور رعایا کو بڑی بڑی اُمیدیں تھیں۔ مورخ ضیاء برنی لکھتا ہے:۔

وہ نہایت آراستہ و پیراستہ شخصیت رکھتا تھا اور جہانبانی کی لیاقت اُس کی پیشانی میں جھلکتی تھی۔ ایل تتمش کے کئی ذی اقتدار غلاموں نے جو خاندان کہلا میں شامل ہوتے تھے۔ اپنے بیٹوں کے نام محمد رکھے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی بات میں مشہور ہوا۔ مثلاً محمد کشلو خاں جسے ملک علاءالدین بھی کہتے تھے فیاضی اور [illegible] میں اپنے وقت کا حاتم ثانی تھا۔ محمد ارسلان خاں جسے تتر خاں کہتے تھے جو بعد میں لکھنوتی میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ عالی ہمتی سخاوت اور بہادری میں مشہور [illegible] تھا ✦

لیکن سلطان بلبن کا بیٹا محمد ان سب سے زیادہ با ادب اور [illegible] تھا۔ سلطان اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا ✦

سلطان محمد مذکور کی مجلس دانشمندوں معتبر لوگوں فاضلوں اور ہنرمندوں سے بھری رہتی تھی۔ اُس کے مصاحب اُس کے سامنے شاہنامہ، دیوان سنائی دیوان خاقانی اور خمسہ شیخ نظامی پڑھتے اور اُن کے اشعار پر بحث کرتے رہتے تھے (ف ۶۶-۶۷)

ماں کی طرف سے محمد سلطان اور اُس کے بھائی کا نسبی سلسلہ ایل تتمش اور [illegible] تک پہنچتا تھا۔ اور اُن کی رگوں میں تین بڑے بادشاہوں کا، جنہوں نے اپنی ذاتی لیاقت سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا خون بہتا تھا ✦

ابتدائی زمانۂ سلطنت میں سلطان محمد کو کول (جسے اب علی گڑھ کہتے ہیں) اور اُس کے قرب و جوار کے علاقے جاگیر میں ملے ہوئے تھے۔ (ف ۶۶)

لیکن کچھ ایسے حالات پیش آئے جن کی وجہ سے بالآخر بادشاہ کو سلطنت کی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک خدمت اپنے اس چہیتے بیٹے کو دینی پڑی ✦

ہندوستان کی مغربی سرحد کی حفاظت التمش کے بعد سے بلبن کے چچا زاد بھائی شیر خاں کے سپرد تھی۔ اور ناصرالدین محمود کے وقت سے سنام، لاہور، دیپالپور اور مغلوں کی درآمد کے تمام علاقے سب اُسی کے سپرد تھے[۵۰] ✦

وہ ایک بڑا آزمودہ کار اور جری سپہ سالار تھا۔ اُس نے ۳۰-۳۵ برس سے مغلوں کے دانت کھٹے کر رکھے تھے۔ اور ہندوستان کی سرحد پر سدِ سکندری کھینچ رکھی تھی۔ اُس کے حسنِ انتظام شجاعت، قوت و شوکت اور متعدد کثیر لشکر کے خوف سے مغلوں کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ہندوستان کی سرحد کا خیال بھی دل میں لے آئیں اُس نے غزنین تک سلطان ناصرالدین محمود کا خطبہ پڑھوا دیا تھا ✦

سلطنت کی طمع اور خود غرضی ہوشیار سے ہوشیار بادشاہ کو بھی شک و شبہ اور بے اعتباری میں گرفتار کر کے بعض اوقات بالکل اندھا بنا دیتی ہے۔ شیر خاں بلبن کا چچیرا بھائی تھا۔ اور دہلی کی سلطنت کا بڑا قوی بازو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن خون کا میل اور ذاتی لیاقت سلطنت کے معاملات میں جہاں بادشاہ کی اپنی غرض شامل ہو۔ بہت کم کام آتے ہوتے، بلکہ اب اوقات

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

کا مصداق ثابت ہوتے ہیں شیر خاں ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ ایل تتمش کے بعد جو انقلابات تاج و تخت دہلی میں پیش آتے رہے اور اُن کی وجہ سے سلطنت کے عہدہ داروں پر جو تباہیاں پڑتی رہیں انہیں دیکھ کر وہ اپنی ولایت سے ہٹ کر دہلی نہیں گیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کسی بہانہ سے اُسے بھی ختم کر دیا جائے گا۔ جب بلبن بادشاہ ہوا تب بھی وہ اپنے مرکز سے نہ ہلا۔ بلبن کی سلطنت کو جب چار پانچ برس گزر چکے تو اُسے شیر خاں کی فکر ہوئی۔ اُس زمانہ کے معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ اُسے بادشاہ نے زہر دلوا دیا ✦

بھٹنڈہ اور بھٹنیر کے حصار اسی شیر خاں نے بنوائے تھے۔ اور بھٹنیر ہی میں ایک بڑا اونچا گنبد بھی تعمیر کرایا (ف ۶۵-۶۶)

قدرت بھی انتقام لینے میں بہت کم چوکتی ہے شیر خاں کو مار کر بلبن نے اپنی سلطنت اور اپنے خاندان کا استحکام و حفاظت چاہی تھی۔ لیکن اس خونِ ناحق نے اس کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ اور کچھ عرصہ بعد اس کا خاندان بھی ہندوستان میں ہمیشہ

۵۰ شیر خاں کے حالات کے لئے دیکھو ط ۲۷۰ اور ف ۶۵-۶۶ ✦

کے لئے نیست ونابود ہوگیا +

شیر خاں کا بدل ملنا محال تھا۔ کار آمد آدمی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اُس کے بعد اُس کی ولایت کا انتظام کئی کئی امیروں کے سپرد ہوا۔ لیکن مغل ان میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے اور یورشوں پر یورشیں کرنے لگے۔ اور سرحد کا سنبھالنا بڑا کٹھن کام ہوگیا۔ (ف ۶۵-۶۶)

بلبن بایک عرصہ تک تو ملک کے انتظام میں لگا رہا۔ مگر جب اُسے چھٹکارا ملا تو سرحد کی فکر پیدا ہوئی اور اس دشوار مہم کے لئے اُس کی نظر اپنے بڑے بیٹے پر پڑی۔ چتر دیکر اُسے ولیعہد مقرر کیا اور تمام سندھ کا ملک اُس کی جاگیر میں دے کر بہت سے عمدہ دار اور اہل کمال اُس کے ساتھ کئے۔ (ف ۶۶)

ملتان میں شاہزادہ کا مستقل قیام ہوا۔ تو اُس کی زندگی نہایت معروفیت سے گذرنے لگی۔ وہ رزم وبزم دونوں میں یکساں کمال رکھتا تھا۔ اور اُس کی دونوں قسم کی مصروفتیں ادب میں اپنی یادگاریں چھوڑ گئی ہیں +

ملتان میں پانچ برس تک اس کے ندیموں میں امیر خسرو اور امیر حسن بھی نوکر رہے۔ ضیائے برنی لکھتا ہے:-

" امیر خسرو اور امیر حسن اُس کی خدمت میں ملازم تھے۔ اور پانچ برس تک ملتان میں اس کی خدمت کرتے رہے۔ شاہزادہ اُنہیں تنخواہ کے علاوہ انعامات دیتا رہتا تھا اپنی دانشمندی سے اُس نے چند ہی مجلسوں میں ان دونوں شاعروں کی خوبیوں۔ لطایف اور دانش وہنر کو خوب پرکھ لیا تھا۔ اور اپنے سب ندیموں میں اُنہیں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اُسے ان کی نثر و نظم پسند تھی۔ دونوں کو اپنا مخلص بنالیا۔ اور اُن پر سب ندیموں سے بڑھ کر لطف کرتا۔ اور زیادہ انعامات اور بہتیرن کپڑے دیتا رہتا تھا"۔ (ف ۶۷)

محسن شاہزادہ کی یاد ان دونوں کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ مورخ مذکور سے اُس کے اوصاف ان دونوں شاعروں نے اس طرح بیان کئے تھے:-

" ویسا مؤدب اور مہذب شاہزادہ جیسا کہ خان شہید تھا۔ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اگر تمام دن اور رات وہ مسند امارت ومنصب فرماں دہی پر بیٹھا رہتا تو بھی زانو سے ادب نہ اُٹھاتا۔ کبھی ایسے موقعوں پر ہم نے اُسے بے تکلف بیٹھے نہیں دیکھا۔ مجلس شراب یا کسی مجلس میں فحش کہتے یا گالی دیتے نہیں سنتا۔ شراب صرف اتنی پیتا تھا کہ مست و بیخود نہ ہونے پائے۔ اُس کی قسم "ھذا" "حقا" تھی +

شیخ عثمان ایک بزرگ ملتان میں آئے۔ تو خان شہید اپنے حسن اعتقاد کے باعث اُن کے ساتھ انتہائی تواضع سے پیش آیا۔ علاوہ بہت کچھ اُن کی خدمت میں نذرانے پیش کئے اور چاہا کہ وہ وہیں رہ جائیں۔ اور اُن کے لئے ملتان میں ایک خانقاہ بنادی جائے اور گاؤں دیئے جائیں۔ لیکن شیخ عثمان ٹھہرنے کے لئے راضی نہ ہوئے +

ایک دن خان شہید نے شیخ مذکور اور شیخ قدوہ پسر حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا کو اپنی مجلس میں بلوکیا۔ اور عربی غزلیں سماع فرمائیں۔ وہ اور دوسرے درویش حالت وجد میں رقص کرتے تھے۔ خان شہید بھی جبتک کہ درویش سماع و رقص میں مشغول رہے برابر دست بستہ کھڑا رہا اور زار وقطار روتا تھا +

خان شہید کی مجلس میں اکثر شعرائے گذشتہ کا کلام جس میں وعظ اور نصیحتیں ہوں پڑھا جاتا۔ تو وہ اُس کی سماعت کو دوسری مشغلوں پر ترجیح دیتا۔ اور بڑے اعتقاد کے ساتھ سنتا اور بہت روتا تھا۔ تمام حاضرین مجلس اس کی فہم ونرم دلی سے حیران و متعجب رہ جاتے تھے +

اپنی وفور دانش کے باعث اُس نے دو مرتبہ شیخ سعدی کو بلانے کے لئے ملتان قاصد اور آدمی بھیجے۔ اور شیخ کے لئے شیراز میں خرچ بھی بھیجا۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ ملتان چلے آئیں اور اُن کے لئے ایک خانقاہ بنا کر بہت سے گاؤں وقف کر دیئے جائیں۔ خواجہ سعدی ضعف پیری کی وجہ سے نہ آسکے اور دونوں مرتبہ اپنی غزلوں کا ایک ایک سفینہ اپنے قلم سے لکھ کر بھیجدیا اور آنے سے معذرت لکھ بھیجی"۔ (ف ۶۷-۶۸)

امیر خسرو اور امیر حسن کہا کرتے تھے " واحسرتا اگر ہماری اور دنیا کے دوسرے ہنرمندوں کی قسمت ہوتی تو خان شہید زندہ رہتا۔ اور بلبن کے تخت پر بیٹھتا اور تمام ماہرو اور ہنرمندوں کو اپنی فیاضی سے مالا مال کرتا۔ (ف ۶۸)

مورخ کے بیان کی تصدیق امیر خسرو کی کتابوں سے بھی ہوتی۔ اپنے تعلق کا تذکرہ دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے۔ کہ پہلے میں سلطان محمود گجرانان کے یہاں دو برس ملازم رہا۔ جب سامانہ سے اُسے لکھنوتی بلالیا گیا۔ تو میں بھی اُس کے ساتھ گیا۔ لیکن اپنے عزیزوں اور وطن کی یاد سے مجبور ہوکر دہلی لوٹ آیا۔ اُسی زمانہ میں قاآن ملک فتح و مرتبہ کے بعد بادشاہ کی خدمت میں دہلی آیا ہوا تھا۔ اور میرے کلام کی تعریف اُس کے کانوں میں پہنچ چکی تھی۔ میں بھی مناسب موقع کچھ کلام موزوں کے اُس کی مجلس میں جا پہنچا۔ شاہزادہ نے اُسے سنکر بہت پسند فرمایا۔ اور خلعت وصلہ عطا کئے۔ میں نے بھی کمر بندگی باندھ لی اور کلاہ ندیمی سر پر رکھی۔ پانچ برس تک ملتان میں اپنے لطایف سے مجلسیں گرم رکھیں +

" ہم دراں شہور بزرگ قاآن ملک از فتح و مرحلہ در رسید وآوازۂ رسیدگی سخنم بود رسیدہ بود۔ رسید۔ از میوۂ پختہ سخنم بر رسد۔ خانہ پخت چنداں کہ بہ بود پیش (بردم) بمجلہ در اخلاص قبول افتاد۔ بہ تشریف تعریف وصلہ موصول گشتم۔ کمر بندگی بر میاں بستم وکلاہ ندیمی

برسو پنج سال دگر پنج آب ملتان را از بحور لطایف خوانی آب دادم "

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو اور امیر حسن کا یہ تعلق ۶۷۹ھ یا ۶۸۰ھ میں ہوا ۔

دیوان وسط الحیٰوۃ میں ایک قطعہ شاہزادہ کی تعریف اور فتح دمریلہ کی مبارکباد میں موجود ہے۔ جو اس وقت کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے جبکہ وہ شہزادہ کی خدمت میں پہلی مرتبہ پہنچے تھے ۔

" نصرت دین محمد شہ فیروز مصاف　　اے ہمہ وقت بشمشیر تو فیروزی یار
بندگانت کہ بہ تو سنگ مغل بشکستند　　چاکراں تو بہ مریلہ کشیدند حصار
گفت ہفت اختر و نہ چرخ کہ چشم بددور　　زاں دو بازو کہ بدولتش بدو دہم کہ بار
فتح بر ران براق تو ازاں بستہ شد　　کہ جو ایں ما بدوانی بدود او ناچار
باد بر فرق ظفر غاشیۂ دولت تو　　فتح دنبال رکاب تو دواں غاشیہ دار"

[(۱) اے نصرت دین، فتحمند محمد سلطان، تیری تلوار کے ساتھ فتحمندی ہر گھڑی لگی ہوئی ہے۔ (۲) تیرے غلاموں نے تیرے ساتھ مغلوں کی عزت خاک میں ملا دی انہوں نے دمریلہ میں ایک حصار کھینچ دیا۔ (۳) سات ستارے اور نو آسمان کہنے لگے چشم بددور ان دونوں بازوؤں سے جن سے دو فتحیں ایک ساتھ ہوتی ہیں۔ (۴) تیرے گھوڑے کی ران پر فتح اس وجہ سے لکھی ہوئی ہے کہ جب تو اُسے دوڑائے تو وہ بھی تیرے ساتھ دوڑتی چلی جائے۔ وہ فتح کے سر پر تیری دولت کا غاشیہ رہے۔ اور فتح تیری رکاب کے پیچھے غلام کی طرح بھاگے۔]

ایک اور نظم بھی جس میں شاہزادہ کی خدمت میں باریاب ہونے کو اپنی خوش نصیبی سے تعبیر کیا ہے اُسی وقت کی معلوم ہوتی ہے :-

چو بخت روشن من سر بر آسماں آورد　　مرا بحضرت شاہزادۂ جہاں آورد
خدایگانا ایں روز مے ازلے حاصل　　زمانہ حاصل من رنج بیکراں آورد
چو بخت دید کہ دستم کسے نمی گیرد　　گرفت دست من و برِ خدایگاں آورد

[(۱) جب میرے چمکتے ہوئے نصیب نے میرا سر آسمان پر پہنچا دیا۔ تو وہ مجھے شہزادۂ عالم کے حضور میں لے کر آیا۔ (۲) اے خداوند اس دن کے لئے زمانے نے مجھے بہت کچھ رنج دکھائے۔ (۳) جب نصیب نے دیکھا کہ کوئی میرا ہاتھ نہیں پکڑتا تو میرا ہاتھ پکڑ کر خداوند کے سامنے لے آیا ۔]

وسط الحیٰوۃ میں چند اور نظمیں بھی اُس زمانہ کی یاد دلاتی ہیں۔ جب امیر خسرو ملتان میں رہتے تھے۔ ان نظموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کا خطرہ ہر وقت سر پر رہتا تھا۔ اور شاہزادہ کو ہر وقت مستعد رہنا پڑتا تھا ۔

(۱) منت ایزد را کہ عمر رفتہ از سر باز گشت　　واں مہر بلغ السیر من ز لشکر باز گشت
(۲) کوہ غم برداشت از پیش دلم چوں مژدہ داد　　کز غزائے کن خاقان مظفر باز گشت
(۳) نصرت دنیا محمد کز سپہ در کہسار　　سد آہن بستہ مانند سکندر باز گشت
(۴) کافر بد کیش ہر تیرے کہ سوئے دیں کشاد　　سہم تو بارے بروز دہم بکافر باز گشت

[خدا کا شکر ہے کہ عمر رفتہ از سر نو لوٹ آئی اور وہ میرا تیز رفتار چاند فوج سے لوٹ آیا۔ (۲) جب میں نے یہ خوشخبری سُنی کہ پہاڑ کی جنگ سے خاقان فتحمند واپس آگیا۔ تو میرے دل کے غم کا پہاڑ دور ہو گیا (۳) نصرت دنیا محمد (سلطان) نے فوج سے کہسار میں ایک لوہے کی دیوار مثل سد سکندری قایم کر دی (۴) مغل نے جو تیر دین پر چلایا اُسی پر تیرا تیر پہنچا اور اُسے لوٹا کر مغلوں پر لے گیا ۔]

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :-

(۱) گر دریں سالے مغل با پر بوم در روئے شوم　　صف کشیدہ چوں کلنگاں از خراساں میرسد
(۲) لیک در وقت گریز از تیغ کشور گیر شاہ　　ریزہ ریزہ می شود آنگہ بکرماں می رسد
(۳) ... خاک ملتاں ہر زماں بر آب دیگر میشود　　چوں سپاہے ہمچو دریائے بملتاں می رسد

[اگر اس برس مغل اُلّو پر لگائے اپنی منحوس صورت لے کر کلنگوں کی طرح خراسان کے ملک سے ہندوستان پر حملہ آور ہو گا تو (۲) بھاگتے وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کیڑوں کی غذا بن جائے گا (یا کرمان کو بھاگ جائے گا)۔ (۳) ملتان کی خاک ہر بار جب دریا کی طرح نئی فوج آتی ہے تو نیا رنگ اختیار کرتی ہے ۔]

ان پانچ برسوں کی بہت سی غزلیں اور نظمیں بھی اس دیوان میں مخلوط ہیں۔ جو اس شاہزادہ کی رنگین مجلسوں اور خوشگوار گھڑیوں کی یاد دلاتی ہیں لیکن مورخ کے لئے اُن سب کو یقین کے ساتھ انتخاب کرنا بہت دشوار ہے ۔

الغرض شاہزادہ کے ایام اسی طرح رزم و بزم میں گزرتے تھے۔ اُس کا معمول تھا کہ ہر سال خزانہ و پایگاہ لے کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور بہت انعام لے کر واپس ہو جاتا (ز: ث: ۷۹)

سب سے اخیر مرتبہ جب شاہزادہ اپنے باپ سے ملنے گیا تو باپ نے اُسے خلوت میں طلب فرما کر بہت سی نصیحتیں کیں جو سلطنت کے کاروبار میں کام آسکیں۔ اور شاہزادہ کے قلم سے ہی لکھوائیں۔ آہ! دونوں گردشِ فلک سے بے خبر تھے۔ کہ اس کے بعد وہ کبھی نہ مل سکیں گے۔ اور بوڑھے باپ کو اپنے لایق بیٹے کی مفارقت دایمی کا داغ اپنی زندگی میں اُٹھانا پڑے گا ۔

مورخ ضیائے برنی نے ان نصیحتوں کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ زبانی روایتوں سے ماخوذ ہیں یا شاہزادہ کا لکھا ہوا وصیت نامہ

محفوظ تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وصایا بلبن کی طرف ... منسوب کر دیئے گئے ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس دور کے مسلمان سلاطین ہند کے تصورات ملک داری کو پیش کرتے ہیں ۔

بادشاہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ نصیحتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو میں نے التمش کی مجلس میں اُن بزرگوں سے جو اپنی مثال نہیں رکھتے تھے سُنی ہیں اور اُن پر عمل کرنا بہت مشکل ہے اور دوسری وہ نصیحتیں ہیں جن پر ہم بھی عمل کر سکتے ہیں ۔

قسم اوّل کی نصیحتیں یہ ہیں کہ جب تو تخت پر بیٹھے تو جہانداری و جہانبانی کو آسان کام نہ سمجھنا۔ بادشاہوں کا دل منظر ربانی ہے (اور عام و خاص مخلوق کے کاروبار بادشاہ کے دل و زبان سے پورے ہوتے ہیں)۔ اگر بادشاہ حکومت کو امر بزرگ نہیں سمجھتا، اُس کی قدر و قیمت نہیں جانتا اور اپنے آپ کو اُس کا اہل ثابت نہیں کرتا تو اُس کی ساری عزت و عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔ بادشاہ کے لئے واجب ہے کہ وہ کمینوں اور ناخداترسوں کو شاہی کاروبار میں دخل نہ دے۔ بلکہ اپنے عہدہ دار پرہیزگار، دیندار، خداترس، حق شناس مقرر کرے۔ جو مکاری، ریاکاری، بداعتقادی، بددیانتی سے دور رہیں۔ الناس علی دین ملوکہم کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اگر بادشاہان شاہی عدل و انصاف، خیرات و حسنات، فضائل و نیکوکاری، زہد و تقویٰ و پرہیزگاری، شجاعت و سخاوت اور صدق و امانت کی طرف مائل ہوں گے تو تمام اہل ملک بھی ان نیک کاموں میں اُن کا اقتدا کریں گے۔ اگر ان کے یہ اعمال ان کے خلاف ہوں گے تو وہی حال رعایا کا ہوگا۔ بادشاہ اور رعایا کو آرائش ظاہر سے بڑھ کر آرائش باطنی کی طرف مائل ہونا چاہئے ۔

(۱) اے فرزند دلبند نعمت بادشاہی کے یہ حقوق پورے طور پر عمر خطاب رض

(۲) عمر بن عبدالعزیز نے ادا کئے۔ ہم غلاموں کا اتنا حوصلہ کہاں کہ ہم ان کی تقلید

دوسری قسم کی نصیحتیں اس طرح بیان کیں کہ بادشاہ کو حشمت و عظمت بادشاہی کو جیسے وہ بادشاہی کی علامت سے تعبیر کرتا ہے ہر وقت اور ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہئے حتیٰ کہ گھر والوں کے ساتھ بھی۔ جو شخص اپنے گھر میں ہلکا ہے وہ باہر بھی ہلکا ہوگا۔ (ہر کہ در خانہ سبک است بیرون ہم سبک نماید) بادشاہی اور ہیبت لازم و ملزوم بلکہ ایک ہی چیز ہیں ("بادشاہی ہیبت محض است") اسی طرح بادشاہی عدل سخاوت اور شجاعت و بزرگ منشی کو کہتے ہیں۔ بادشاہی چند چیزوں سے قائم ہے اور وہ عدل، احسان، فوج، نوکر، خزانہ، چیدہ و کثرت مددگار اور رعایا کا اعتماد ہیں۔ رعایا کا اعتماد اسی بادشاہ پر ہوتا ہے۔ جو عدل و احسان سے کام لیتا رہے۔ ورنہ ظلم و تعدی کا پیکر رعایا میں نفرت پیدا ہو جاتی اور بادشاہی میں خلل آجاتا ہے۔ سلطنت کے کارکنوں کے انتخاب میں بہترین آدمیوں کو لینا چاہئے۔ اور سفارشیوں اور چغل خور و نکموں کو دخل نہ دینا چاہئے۔ ورنہ لوگوں میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور امان کا خیال دلوں سے جاتا رہیگا، بلکہ خوف و ہراس پیدا ہو جائیں گے ۔

بادشاہ کو چاہئے کہ ہر مہم پر خوب غور کرے۔ تاکہ ناکامی کے باعث رسوا نہ ہونا پڑے۔ اس لئے کہ بادشاہی عزت ہی سے قائم ہے ("بادشاہی ہمہ عزت است") اور خواری و بیمقداری کی تاب نہیں لا سکتی۔ بادشاہ کو ذاتی طور پر صرف اُن مہموں میں حصہ لینا چاہئے جو دوسرے انجام نہ دے سکیں ۔

بادشاہ کو خود رائے نہیں ہونا چاہئے اور بغیر مشورہ کئے کسی مہم کو شروع نہیں کرنا چاہئے۔ مشیر وہی لوگ بنائے جائیں جو صاحب تجربہ صاحب فراست۔ دوراندیش اور عاقبت بیں ہوں۔ بادشاہ کو اپنے خاندان والوں، ملازموں، فوج و رعایا سے کسی وقت غافل نہیں رہنا چاہئے۔ ملک داری کا سب سے بڑا فرض نیک و بد خلق سے باخبر رہنا ہے جس کے بغیر بادشاہی ناممکن ہے۔ آمد و خرچ کی بھی خبر رکھنی چاہئے۔ اور ضرورت کے موقعوں کے لئے نصف خزانہ محفوظ رہنا چاہئے۔ اسراف سے پرہیز کرنا چاہئے اور لشکر و رعایا و تجار کو آسودہ و خوشحال رکھنا چاہئے۔ اور بدکاریوں کو روکنے اور نیک کاموں کو ترقی دینے میں ہر وقت ساعی رہنا چاہئے ۔

رعایا کے معاملوں میں میانہ روی سے کام لینا چاہئے، نہ تشدد و بدخوئی و قہر سلطنت سے ہی کام لیا جائے کہ لوگ متنفر ہو کر رہ جائیں۔ نہ اتنی نرمی و سہل گیری و آسان گزاری سے کہ متمرد و باغی ہو کر فساد پیدا کرنے لگیں۔ بلکہ قہر و مکر سے کام لیا جائے اور ہمیں فیصلوں کے انتخاب میں احتیاط کی جائے ۔

آخیر میں بلبن نے کہا کہ اپنے چھوٹے بھائی پر مہربان رہنا۔ کسی کی بدگوئی اُس کے حق میں نہ سننا بلکہ اُسے اپنا دست و بازو سمجھنا۔ اور جس ملک پر مقرر کرو اُسے برقرار رکھنا۔ میرے تم صرف دو بیٹے ہو۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ بلبن کی نسل تباہ ہو کر رہ جائے ۔

(ف ۷۹ - ۸۰)

ان وصایا پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین کن اصولوں پر سلطنت چلاتے اور اُن کے بہترین بادشاہ سلطنت کے فرائض و ذمہ داریوں کے متعلق کس قسم کے تصورات رکھتے تھے۔ کیا انہیں دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ محض جور و تعدی کے ذریعہ سے حکومت کرنا جانتے تھے۔ اور سلطنت کے گہرے رازوں سے بے خبر تھے ؟ ہمارے مورخوں نے بہت کم ان چیزوں کے بیان کرنے میں دلچسپی لی ہے اور بدقسمتی سے ہم جنگی اور درباری حالات پر اکتفا کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسلمان

بادشاہوں کی تاریخ ہدف ملامت بنی رہتی ہے۔ حالانکہ التمش، بلبن، فیروز خلجی، غیاث الدین تغلق اور بابر سے لے کر اخیر تک اکثر مغل سلاطین ایسے بادشاہ تھے جن کی ملک داری بڑی ستائش کی مستحق ہے ۔

یہ سب ہمتیں بیکار تھیں، بہت جلد وہ ساعت آنے والی تھی جب ہونہار شاہزادہ کا شمار مُردوں میں ہونے والا تھا ۔

وہ باپ سے رخصت ہو کر ملتان چلا آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت سرحد کی حالت بہت خطرناک تھی۔ بلبن نے دوسرے بیٹے کو سامانہ میں متعین کر کے ہدایت کی کہ وہ بھی مغلوں کی جواب دہی کے لئے ہر وقت مستعد رہے۔ چونکہ بغرا خاں اتنا لائق نہ تھا جتنا کہ محمد سلطان، باپ نے اُس سے کہا کہ کاموں میں جلدی نہ کرنا۔ مشیروں اور کارداروں سے مشورہ کرتے رہنا۔ بلکہ مشکل کاموں میں مجھ سے مشورہ لے لیا کرنا۔ اور شراب پینا چھوڑ دینا۔ اقطاع سامانہ بہت بڑے ہیں اور وہاں بہت سی کارآمد فوج بھی موجود ہے اگر شراب نہ چھوڑی اور اپنے اقطاع اور فوج کی خبر نہ رکھی تو معزول کر کے پھر کبھی کوئی جاگیر نہ ملیگی اور بیکاروں میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ بادشاہ نے مخبر لگا دیئے اور بیٹے کی جانچ میں بڑی کوشش کی۔ وہ بھی یہ حال دیکھ کر ٹھیک ہو گیا۔ (ف ۸۱)

اُس زمانہ میں مغلوں کے سوار دریائے بیاس سے گذر کر بلبن کے علاقے میں یورشیں کرتے رہتے تھے۔ سامانہ سے بغرا خاں، ملتان سے محمد سلطان اور دہلی سے ملک اختیار الدین بیگ ترس باربک سلطانی دریائے بیاس تک ان کا پیچھا کرتے اور سلطنت کی سرحد سے باہر کر دیتے تھے۔ ان تینوں لشکروں کا اندازہ صرف سترہ اٹھارہ ہزار سے زیادہ نہیں تھا! (ص ۸۱)

بلبن کی حکومت کو پندرہ سولہ برس گذرے تھے کہ بنگال میں اُس کے عامل طغرل نے بغاوت کی جس نے بڑا طول کھینچا۔ اور اُس کے فرو کرنے کے لئے بالآخر خود بلبن کو جانا اور سامانہ سے بغرا خاں کو بلا کر بنگال کا حاکم مقرر کرنا پڑا۔ (ف ۸۱-۹۲) بادشاہ نے اُسے رخصت کرتے وقت بہت سی قیمتی نصیحتیں کیں اور دارالسلطنت کو لوٹ آیا۔ (ف ۹۲-۱۰۶)

ضیائے برنی لکھتا ہے کہ اس مہم کے بعد بلبن کی سلطنت کو غیر معمولی استقامت حاصل ہوگئی۔ اور اُس کا دل تمام ملکی مہموں سے فارغ ہو گیا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مخالف باقی نہیں رہا (ص ۱۰۹)

لیکن ہر زوالے را کمالے۔ اندر کا خطرہ مٹ چکا تھا لیکن باہر کا خطرہ بلبن کے اختیار سے باہر تھا۔ مغل ہندوستان پر آنکھ لگائے بیٹھے تھے۔ اور ہندوستان کی تسخیر کے خیال میں بہت کچھ نقصان اُٹھا چکے تھے۔ وہ نہ خود چین سے بیٹھنا جانتے تھے۔ نہ بلبن کو آرام لینے دیتے تھے۔ اخیر ۶۸۳ھ میں ہلاکو کے پوتے ارغون خاں کے ایک چہیتے امیر نے جس کا نام تیمور خاں تھا۔ اور جس کے تحت میں اُس وقت ہرات، قندھار، بلخ، بدخشاں، غزنین، غور اور بامیان کے علاقے تھے۔ بیس ہزار سوار لے کر لاہور اور دیبالپور کے درمیان لشکر کشی کی ۔

جواں مرد سلطان محمد کو جب یہ خبر ملی تو فوراً مدافعت کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کی کہ اُس کے پاس اتنی فوج نہ تھی۔ جو مغلوں کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتی ۔

یہ معرکہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اُس کی آواز بازگشت تاریخ اور ادب میں آج تک گونجتی ہے۔ گو ہندوستان کی حفاظت میں یہ نوجوان شاہزادہ کام آیا لیکن اپنا ایسا نام چھوڑ گیا جس سے وہ ہماری تاریخ میں ایک نامور ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے ۔

اس جنگ کے حالات مورخ ضیائے برنی نے تفصیل سے نہیں لکھے۔ اور صرف اتنا لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ "شہور ۶۸۳ھ (صحیح اخیر ۶۸۳ھ) میں خان ملتان کا جو کہ سلطان بلبن کا بڑا بیٹا اور ولیعہد اور اُس کے ملک کی پشت و پناہ تھا۔ لوہور (لاہور) اور دیوبالپور کے درمیان تمر ملعون سے جو چنگیز خانی کتوں میں ایک عجیب کتا تھا مقابلہ و مقاتلہ ہوا۔ اور قضائے وقدر باری تعالیٰ سے خان ملتان اور امراء و سرداران لشکر اس محاربہ میں قتل ہو گئے۔" (ف ۱۰۹)

لیکن بہترین واقعات امیر خسرو کی بعض نظموں سے جو انہوں نے اس حادثہ کے متعلق لکھی ہیں، معلوم ہوتے ہیں ۔

جمعہ کا دن تھا، اور ماہ ذی الحجہ ۶۸۳ھ کی اخیر تاریخ (مطابق ۹ مارچ ۱۲۸۵ء) کہ ملتان میں اس یورش کی خبر پہنچی۔ بہادر شاہزادہ فوراً بن چڑھے اپنے تھوڑے سے لشکر کو جو وہاں موجود تھا لیکر روانہ ہوا۔ اور دوپہر کو دریا کے کنارے نماز ظہر کے وقت پہنچا۔ دوپہر سے شام تک بڑی سخت لڑائی ہوتی رہی۔ اور فتحمندی کی امیدیں نظر آتی تھیں یہاں تک کہ دن چھپ گیا۔ لیکن لڑائی ختم نہ ہوئی۔ شاہزادہ فوج کے ایک حصہ کو صحرا میں چھوڑ کر اور ایک حصہ کو اپنے ساتھ لے کر غالباً مغلوں کے تعاقب میں دریا کو عبور کر رہا تھا اور رات ہو چکی تھی کہ لڑائی کی میزان پلٹ کر رہ گئی۔ اور شاہزادہ بیچ دریا میں زخمی ہو کر مارا گیا۔ اور اُس کے اکثر ساتھی بھی مارے گئے ۔

ضیائے برنی لکھتا ہے کہ اس واقعہ کا بلبن کی سلطنت پر بڑا برا اثر پڑا۔ بہت سے تجربہ کار فوجی کام آئے۔ ملتان میں ہر مکان میں مصیبت تھی اور ماتم تھا۔ تمام لوگوں نے نیلا لباس اختیار کر لیا۔ لوگوں کا شور و شغب آسمان تک پہنچا تھا۔ دارالسلطنت کی بھی

یہی حالت ہوئی۔ بلبن کو جب اس حادثہ کی خبر پہنچی تو اُس کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔ ہر چند اپنے آپکو سنبھالتا تھا۔ اور لوگوں پر اپنا صبر و ضبط ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن روز بروز حالت خراب ہوتی جاتی تھی۔ دن بھر ملکداری کے کاموں میں لگا رہتا تو رات بھر آہ و زاری میں مصروف رہتا۔ کپڑے پھاڑتا اور خاک میں تڑپتا تھا (ف ۱۰۹ - ۱۱۰)

اس لڑائی میں امیر خسرو بھی شریک تھے۔ اور مغلوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے۔ اور بڑی تکلیف اُٹھائی۔ اور خوش قسمتی سے کسی طرح چھوٹ کر آ گئے۔ ان واقعات کا اُن کی نوکی الحس طبیعت پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ اُنھوں نے متعدد نظمیں اس واقعہ کے متعلق لکھی ہیں۔ جو دیوان وسط الحیوۃ میں درج ہیں۔ ان میں دو ترجیع بند جو شاہزادہ کے مرثیہ میں لکھے ہیں۔ ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیریں ہندوستان کے فارسی ادب میں کیا شاید دنیا بھر کے ادب میں ملنا دشوار ہیں۔ کلیجے کے ٹکڑے ہیں جو کاغذ کے صفحوں پر بکھیر دیئے گئے ہیں لفظوں سے آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں اور خون ٹپکتا ہے۔ اس حادثہ کی یہ بہترین ادبی اور تاریخی یادگاریں ہیں۔ ضیاء برنی نے سچ لکھا ہے کہ ان کی تصنیف میں امیر خسرو نے جادوگری سے کام لیا ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ پڑھے جانے کے قابل ہے۔ ہم نے جو انتخاب پر اکتفا کی ہے وہ صرف اپنے مضمون کو طوالت سے بچانے کے لئے۔

پہلی نظم میں گیارہ بند ہیں اور اُس کا نام امیر خسرو نے "نعت الغزا" رکھا تھا:-

"بس کہ از خونِ شہید انست نقش این سریر
نام این نعت الغزا گفتہ فی نعت الغزا

پہلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے:-

واقعہ است این یا بلا کز آسماں آمد پدید
آفت است این یا قیامت در جہاں آمد پدید

(یہ واقعہ ہے یا بلا ہے جو آسمان سے ظاہر ہوا ہے۔ یہ آفت ہے یا قیامت ہے جو دنیا میں دکھائی دے رہی ہے)

راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را
رخنۂ کامسال در ہندوستان آمد پدید

(ہندوستان میں اس سال جو رخنہ نمودار ہوا ہے۔ اُس نے ایک ایسا سیلاب فتنہ پیدا کر دیا جس نے دنیا کی بنیادیں خراب کر ڈالیں)

مجلس یاراں پریشاں شد ز باد تند دہر
برگ ریزی گوئی اندر گلستاں آمد پدید

(دوستوں کی مجلس دنیا کی ہوا کے تیز جھوکے سے ایسی ابتر ہوئی کہ گویا باغ میں پت جھڑ ہونے لگی)

مردماں بودند تا اقتران را منتظر
اینک اینک خسرو آثار آں آمد پدید

(لوگ ستاروں کے یکجائی کا اثر دیکھنے کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ دیکھا خسرو اب اس کے آثار ظاہر ہوگئے)

من نخواہم جز بہاں جمعیت واین کے شود
خود خیالست این بنات نعش پرویں کے شود

(میں اس جماعت کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیکن یہ محض خیال ہے بھلا نبات النعش کے منتشر ستارے پروین کی طرح یک جا کیسے ہو سکتے ہیں)

دوسرے بند میں شاہزادہ کی لشکر کشی کی یاد ہے:-

تا چہ طالع بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید
تیغ کافر کش برائے کشتن لشکر کشید

(وہ کیا بری گھڑی تھی جب شاہزادہ نے مولتان سے فوج کشی کی اور اپنی کافر کش تیغ کو ایک فوج کے قتل کے لئے نکالا)

چوں خبر کرد نش از دشمن باں قوت کہ دست
بے محابا خشم در سر کرد و رایت در کشید

(جب اُسے دشمن کی خبر ملی تو باوجود اُس کی قوت کو جاننے کے فوراً وہ غضبناک ہوگیا۔ اور اُس نے اپنا نیزہ اُٹھا لیا)

آنچہ حاضر بود لشکر لشکرے دیگر نہ جست
زانکہ رستم را نشاید منت لشکر کشیدہ

(جو کچھ فوج موجود تھی اُسی پر اکتفا کر کے اور فوج تلاش نہ کی۔ رستم کو فوج کا احسان لینا شایاں نہیں)

یک کشش از مولتاں بیں تا لہاور او فتاد
یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید

(مولتان سے لاہور تک ایک یورش کر رکھی ہے۔ تعجب ہے کہ میرے عہد میں کافر کو سر اُٹھانے کی ہمت ہوئی)

من نہ آں شیرم کہ شمشیر چو آب و آتشم
از کشش ہر سال شاں وخاک خاکستر کشید

(کیا میں وہی شیر نہیں ہوں کہ میری پانی اور آگ جیسی تلوار نے اُنہیں ہر برس خاک

اور خون میں ملایا ہے]

آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خون شاں
کز زمیں باید شفق را گونۂ احمر کشید

[اس برس ان کے خون سے زمین کو ایسا رنگین کر دونگا کہ زمین سے شفق کو سرخی کا اُبٹنا مانگنا پڑے گا]

او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تقدیر فلک
صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید

[وہ اس قسم کی تدبیر سوچ رہا تھا، اور آسمانی تقدیر سے بے خبر تھا کہ خطِ مشیت نے صفحۂ تدبیر کو کاٹ دیا ہے]

غرۂ سرشد محرم نے برو بر کُل خلق
چوں ہلالِ سلخ اندر گلوئے دشمناں خنجر کشید

[دنیا جانداُس پر کیا تمام دنیا کے لئے محرم ثابت ہوا۔ جس وقت کہ اُس نے ماہ ذی الحجہ کی اخیر تاریخ میں جس دن کہ نئے برس کا چاند دکھائی دے گا۔ (یا دشمنوں کی پوست کنی کے لئے) ان کے گلے پر چھری پھیری]

آں چہ ساعت بود کہ کافر بر سر لشکر رسید
جوق بر جوق آب را بگذشت و ناگہ در رسید

[وہ کیا (بُرا) وقت تھا، جس وقت کہ کافر فوج پر حملہ آور ہوا اور جوق در جوق دریا سے گذر کر معاً آپہنچا]

تیسرے بند میں میدان جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ شاہزادہ گھوڑے پر سوار فوج کو اُبھار رہا ہے۔ فوجی باجوں اور گھوڑوں اور آدمیوں کے شور نے صحرا اور دشت و کوہ کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے چنگاریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اُس وقت کی ہیبت و وحشت، تلواروں کی چمک، تیروں کی بارش، بہادروں کی پیش قدمی اور بزدلوں کی پسپائی کے لئے حیلہ جوئی عجیب خوبی کے ساتھ بیان کی ہیں +

خنگ شہ دیدی و برگردوں غبار انگیختن
باد پا بر کافراں خاک را انگیختن

[شاہزادہ کے سفید گھوڑے اور اُس کے آسمان پر گرد اُڑانے کو دیکھا۔ اور تیز رفتار گھوڑا کافروں پر دوڑانا دیکھا]

از خروش کوس و بانگ اسپ و آواز سوار
لرزہ در صحرا و دشت و کہسار انگیختن

ڈھول کی آواز۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور سواروں کے شور سے صحرا اور دشت اور کہسار میں لرزہ پڑنا دیکھا]

نعل در آتش نہادن توسنان گرم را
در سم ہر آتشیں نعلے شرار انگیختن

[بھڑکتے ہوئے گھوڑوں کی بے چینی اور ہر سم کے گرم نعل سے چنگاریوں کا اُٹھنا دیکھا]

آں چہ ہیبت بود وقتِ کارزار آراستن
وانچہ وحشت بود گاہ گیر و دار انگیختن

[لڑائی کے لئے تیاریاں ہوتے وقت کیسی ہیبت معلوم ہوتی تھی اور جب لڑائی ہونے لگی تو کیسی وحشت تھی]

پُردلاں در حملہ از بہر مخالف سوختن
بے دلاں در حیلہ از بہر فرار انگیختن

[بہادر اپنے مخالف پر حملہ کرنے کے لئے تڑپتے تھے اور بزدل بھاگنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے]

کار شاہ مرد پرور اندراں میدان کار
کار مرداں کردن و مردن کار انگیختن بُد

[اُس میدان جنگ میں بہادروں کے سرپرست شاہزادہ کا یہ کام تھا کہ وہ مردوں کے کام کرے اور مُردوں کو اُبھارے]

اندراں میدان کہ فرق از مرد تا نامرد بود
اے بسا کس را کہ لب خشک و رو با زرد بود

[اُس میدان میں جہاں مرد اور نامرد کا فرق دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سے لوگوں کے ہونٹھ سوکھے ہوئے تھے اور چہرے زرد]

چوتھے بند میں لڑائی کا مہیب سین کھینچا ہے :-

روز را تاریکی آمد چوں بہم بر یافتند
زرد شد خورشید چوں خنجر بہ خنجر یافتند

[جب دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھڑیں تو دن تاریک ہوگیا۔ اور جب تلوار سے تلواریں ملیں تو سورج زرد ہوگیا (یہ واقعہ ہے کہ لڑائی دن ڈھلے سے شروع ہو کر رات کے وقت تک رہی تھی)]

کشتگان اُفتادہ در اطرافِ آں صحرائے سبز
ہمچو صورتہا کہ در دیبائے اخضر یافتند

[اُس سبز میدان میں مُردے اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے کہ سبز دیبا میں موتی

بنی ہوتی ہیں]

یک زماں شمشیر اقبالش نیاسود از قتال — از زوالِ روز تا شب اندروں روز زوال

[اُس تباہی کے دن اُس کی اقبال کی تلوار دن ڈھلے سے رات تک ایک دم کے لئے بھی نہ ٹھیری ۔]

پانچویں بند میں بھی لڑائی کا سین جاری ہے ۔

یا رب آں خوں بود کاندر روئے صحرا می دوید — یا بسوئے تشنگاں موجے ز دریا می دوید

[یارب وہ خون تھا جو صحرا میں بہ رہا تھا یا دریا کی ایک موج تھی جو پیاسوں کی طرف دوڑ رہی تھی]

توسناں در خیز و سرہائے سواراں می فتاد — مرد را سر می دوید و اسپ را پا می دوید

[گھوڑے اُٹھتے تھے اور سواروں کے سر گرتے تھے ۔ مردوں کے سر دوڑتے تھے اور گھوڑوں کے پیر]

ہر کرا از قوتِ دل بازو اندر کار بود — راست کردہ تیر سوئے قلب اعدا می دوید

[جس شخص کا دل ٹھکانے تھا اور ہاتھ کام دیتا تھا وہ تیر سیدھا کر کے دشمنوں کے قلب کی طرف دوڑتا تھا]

واں کہ از ضعف درونی دست و پا گم کردہ بود — گہ بسوئے آب و گاہے سوئے صحرا می دوید

[جس شخص کا دل کمزور تھا اور ہاتھ پیر بھول چکے تھے وہ کبھی دریا کی طرف اور کبھی صحرا کی طرف دوڑتا تھا]

خان لشکر کش بترتیب صف و آئین جنگ — می دوانید اشہب اقبال را تا می دوید

[سپہ سالار لشکر خان (سلطان محمدؒ) صفوں اور لڑائی کا نظام ٹھیک رکھنے میں مصروف تھا اور اپنے اقبالمند گھوڑے کو جہاں تک ہوسکتا تھا دوڑاتا تھا]

باز پس می برد گردوں موگرفتہ فتح را — فتح ہر چند از ملاعیں جانب ما می دوید

[آسمان فتح کو بال پکڑ کر اُلٹا کھینچے لئے جا رہی تھی ۔ حالانکہ فتح مخالفوں کی طرف سے ہماری طرف دوڑا جا رہی تھی ۔]

کافر اندر انتظار شب کہ تا بیروں شود — ناگہاں میزان ما را پلہ دیگر گوں شود

[کافر رات کا انتظار تھا کہ باہر نکل کر فوراً ہمارے ترازو کا پلہ پلٹ دے]

چھٹے بند میں رات کے وقت لڑائی کا اخیر سین کھینچا ہے :-

تا چہ شب بود آں کہ از چرخ آفتاب افتادہ بود — دیو آتش در جہاں می زد شہاب افتادہ بود

[وہ کیسی (منحوس) رات تھی کہ سورج ڈوب چکا تھا اور شیطان دنیا میں آگ لگا رہا تھا اور شہاب گر چکا تھا]

گر حسینؑ کربلا آوارہ بے آبی فتاد — کہ محمدؐ بود کہ در آبش آب افتادہ بود

[اگر امام حسینؑ کو کربلا میں بے آبی سے واسطہ پڑا تو محمدؐ سلطان کو پانی میں ٹھکانا ملا]

فوجے اندر آب طوفاں بلا را می گذشت — فوج دیگر تشنہ در راہِ سراب افتادہ بود

[ایک فوج پانی میں ہو کر طوفانِ بلا سے گذر رہی تھی اور دوسری فوج پیاسی سراب کی راہ میں پڑی تھی]

جوز ہندی بد منقش کردہ از شنگرف بود — کشتگاں را سر کہ اندر خوں و آب افتادہ بود

[مقتولوں کے خون آلودہ سر پانی میں پڑے ہوئے گویا جوز ہندی (نارجیل) تھے جو نئے شنگرف سے منقش کئے گئے ہوں]

از وداع جاں جراحتہائے دل خوں می گریست — در فراق زندگانی تن خراب افتادہ بود

[جان کی جدائی سے دل کے زخم خون روتے تھے اور زندگی کے فراق سے بدن خراب پڑے ہوئے تھے]

نے فزع بود آں قیامت راستیں دیدام — گر قیامت را نشاں این است بس تن دیدام

[وہ ہیبتناک واقعہ نہ تھا بلکہ فی الواقعہ قیامت تھی ۔ اگر قیامت کی یہی حالت ہے تو میں نے اُس کو دیکھ لیا]

ساتویں بند میں جنگ کے تباہ کن نتائج اور شہزادہ کی شہادت پر اظہار غم ہے

دائرات آسماں بیں گردشے پرکار کرد — مرکزِ اسلام را سرگشتہ چوں پرکار کرد

[آسماں کے دائروں کو دیکھو کہ انہوں نے کیسی کاری گردش کی ہے کہ اسلام کے مرکز کو پرکار کی طرح سرگشتہ کر دیا ہے]

ذرہ را دیدی کہ آب چشمۂ خورشید برد — سنگ را دیدی کہ کار لولوئے شہوار کرد

[دیکھا کہ ذرہ نے چشمۂ خورشید کی روشنی چھپا دی اور پتھر نے لولوئے شہوار کو برباد کر دیا]

با مغل ہر سال بہر دیں سرو کارش بود — عاقبت جان گرامی بر سر آں کار کرد

[مغل سے اُسے ہر برس دین کی خاطر سروکار رہتا تھا ۔ آخر کار اپنی قیمتی جان بھی اسی کام میں دیدی]

شیر نر را نیش مورے قصد خونریز صعب کرد — پیل مست از نوک خارے صد فغاں زار کرد

[شیر نر نے ایک چیونٹی کے ڈنک سے سینکڑوں زور کی چیخیں ماریں اور ایک کانٹے کی نوک سے پیل مست نے سینکڑوں بار شور و فغاں کیا]

جمعہ بود و سلخ ذی حجہ کہ رفت ایں کار زار — آخر ہشت دو سہ آغاز ہشتاد و چہار

[جمعہ کا دن تھا ، ذی الحجہ کی اخیر تاریخ تھی جس دن کہ چاند گھاٹی دیا اور ۶۸۳ھ ختم ہو رہا تھا اور ۶۸۴ھ شروع کہ یہ لڑائی ہوئی]

آٹھویں بند میں شاعر نے بتایا ہے کہ اس حادثہ پر گویا تمام کائنات نے ماتم کیا ۔

مہر و مہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند روز و شب بر سال آں اندک بقا بگریستند
(چاند سورج اُس فرخ لقا پر روئے اور روز و شب اُس کم عمر کی زندگی پر روئے)
شبنمے کز آسماں ہر صبح می ریزد بخاک اشک انجم داں کہ از اوج سما بگریستند
(جو شبنم ہر صبح آسمان سے گرتی ہے وہ ستاروں کے آنسو ہیں جو آسمان کی اونچائی سے گرتے ہیں)
خلق ملتاں مرد و زن مویہ زناں و موکناں کوچہ کوچہ و سو بسو و جا بجا بگریستند
(اہل ملتان مرد اور عورت نالے کرتے۔ بال نوچتے۔ گلی گلی اور جگہ جگہ روتے پھرتے تھے)
از خروش گریہ و بانگ دہل شب کس نخفت بسکہ در ہر خانہ اہل عزا بگریستند
(رونے کے شور اور ڈھول کی آواز سے رات بھر کوئی نہ سو سکا۔ ہر گھر میں ماتم والے روتے رہے)
دیدہ خوں افشاند بر گل چوں گلوی کشتگاں بسکہ از بہر اسیران بلا بگریستند
(آنکھ نے مقتولوں کے گلوں کی طرح زمین پر خون بہایا۔ اسیرانِ بلا کے لئے لوگ بہت روئے)
در ازاں ہندوستاں ناگہ اسیرے بازگشت روئے او دیدند کس ہر یا بگریستند
(اور اگر کوئی شخص ناگاہ اُس بھاری قید سے لوٹ کر آگیا تو اُس کے منہ لوگ دیکھتے تھے اور ہر شخص روتا تھا)

نویں بند میں ماتم ہے۔ تمام لوگوں نے ماتم میں نیلا لباس اختیار کر لیا ہے اور ہر طرف نیل ہی نیل نظر آتا ہے اور ہندو اور مسلمان اس غم میں یکساں شریک ہیں:۔
ہم سیاہی شد زہندو ہم سفیدی شد زترک بسکہ می پوشد کنوں ہم ترک و ہم ہندو کبود
(ہندو کی سیاہی اور ترک کی سفیدی جاتی رہی۔ اب ترک اور ہندو نیلا لباس بکثرت پہنے ہوئے ہیں)

دسویں بند میں دوستانِ رفتہ کی یاد ہے:۔
وہ کہ دل یکبارگی خوں شد برائے دوستاں آہ ازاں جمعیت راحت فزائے دوستاں
(آہ! دوستوں کے لئے دل سراسر خون ہو کر رہ گیا۔ افسوس ہے دوستوں کی اُس راحت افزا جمعیت پر)
خفتگان خاک را گر خاستن ممکن بود عمر باقی می کنم وقفِ بقائے دوستاں
(اگر خفتگان خاک کے لئے جاگنا ممکن ہو تو میں اپنی باقی عمر دوستوں کی زندگی کے لئے وقف کرنے کو تیار ہوں)
حیف باشد مردماں در چشم و یار از چشم دور دیگراں را چوں تواں دیدن بجائے دوستاں
(افسوس ہے کہ پتلیاں (یا لوگ) آنکھوں میں ہیں اور دوست آنکھوں سے دور ہیں۔ دوسروں کو دوستوں کی بجائے کیسے دیکھا جائے)
دوستاں رفتند و غیرے را چہ گیرم در کنار چوں کشم بر قامت ہر کس قبائے دوستاں
(دوست تو چلے گئے غیروں سے کیسے بغلگیر ہوں۔ ہر شخص کے جسم پر دوستوں کی قبا کیسے پہنا دوں)

گیارہویں بند میں دعا ہے:۔
کشتگانے را کہ دشواری بر ایشاں دیر ماند یا رب امید رہائی زود آساں باد شاں
(جو لوگ لڑائی میں مارے گئے اور دیر تک موت کی سختی میں مبتلا رہے انہیں اے خدا جلد اور آسانی سے بخشش نصیب ہو)
بود شاں در روز ہیجا خان اعظم پیشرو پیشوائے جنت الفردوس ہم خاں باد شاں
(لڑائی کے دن محمد سلطان ان سب کا پیشرو تھا۔ اسی طرح جنت میں بھی اُن سب کا پیشوا رہے)
رستگانِ بند را رنجے کہ اندر بند بود موجب از بہر نجات آخرت آں باد شاں
(جو لوگ قید کی مشقتیں اُٹھا کر چھوٹ آئے ہیں اُن پر خدا کا فضل ہو اور بادشاہ کا احسان)
چوں محمد رفت شہ را عاقبت محمود باد کیقباد ش و کیخسرو ش محمود باد
(اب جبکہ محمد (سلطان) شہید ہو گیا۔ بادشاہ کے لئے محمود سلطان زندہ رہے (یا بادشاہ کی عاقبت بھی بخیر ہو) اور کیقباد (پسر محمود سلطان) اور کیخسرو (پسر محمد سلطان) مبارک و نیکنام رہیں)

دوسرے ترجیع بند کے مضامین پہلے ترجیع بند سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلے ترجیع بند میں تمام تر جنگ کے حالات پر نظر ڈال کر ماتم کیا گیا ہے دوسرے ترجیع بند میں شاہزادہ کے حالات و واقعات زندگی کو یاد کر کے اظہار غم ہے۔

پہلا بند

اے دل بغم نشیں کہ زشادی نشاں نماند وائے عمر جاں ستاں کہ طرب در جہاں نماند
(اے دل غمگین ہو کر بیٹھ رہ۔ خوشی کا نشان نہیں رہا۔ اور اے عمر جان کو لیلے کہ دنیا میں مسرت باقی نہیں رہی)
فتنہ سپہ کشید چو لشکر شکن بخفت آفت جہاں گرفت چو کشور ستاں نماند
(فتنہ نے فوج کشی کر ڈالی لشکر شکن سو رہا ہے۔ کشور ستان نہیں رہا۔ ایک آفت دنیا پر چھاری ہے)

در تخت ملک پا بشکستِ ظفر شکست　　بر فرق دہر سایۂ امن و اماں نماند

[دارالسلطنت میں فتح وظفر کے پاؤں ٹوٹ کر رہ گئے اور دنیا کے سر پر امن و اماں کا سایہ نہیں رہا]

چشم و چراغ خسرو روئے زمیں برفت　　پشت و پناہ کشور ہندوستاں نماند

[شہنشاہ عالم کا چشم و چراغ چلا گیا۔ ملک ہندوستان کا پشت و پناہ نہ رہا]

از مملکت چہ کام برآید چو خان بشد　　وز کالبد چہ کار کشاید چو جاں نماند

[شاہزادہ چلا گیا اب مملکت سے کیا کام نکلیگا۔ اور جب جان جاتی رہی تو جسم کیا کام کریگا]

دوسرے بند میں شہزادہ کی موت پر ماتم ہے:-

چشمے کہ بود بخت جواں را بخواب رفت　　شمعے کہ بود بزم جہاں را ز تاب رفت

[جو بخت جوان کی آنکھ تھی سو کر رہ گئی۔ اور جو بزم جہاں کی شمع تھی بے نور ہو گئی]

پیرایۂ جلال بہ صندوق چوب رفت　　سیارۂ کمال بدریائے آب رفت

[جلال کا لباس صندوق میں رہ گیا اور کمال کا ستارہ پانی میں ڈوب گیا]

ساقی مدہ کہ طبع حریف از مزاج گشت　　مطرب مزن کہ ساز نشاط از رباب رفت

[اے ساقی شراب مت دے کہ طبع حریف کا مزاج خراب ہے۔ اے مطرب مت بجا کہ چنگ میں ساز نشاط نہیں رہا]

بر خاک ریز بادہ کہ گاہ طرب گذشت　　بر سنگ زن پیالہ کہ وقت شراب رفت

[شراب خاک میں پھینک دو کہ خوشی کا وقت گیا۔ پیالہ کو پتھر پر دے مارو کہ شراب کا وقت گیا]

خسرو ہنوز چند تواں خواندن کتاب را　　ہم شب بآخر آمد و ہم خاں بخواب رفت

[اے خسرو کب تک کتاب پڑھتے رہوگے۔ رات بھی ختم ہونے آئی اور شاہزادہ بھی سو گیا ہے]

تیسرے بند میں شاہزادہ کے بعض مشاغل بتائے گئے ہیں:-

ماہے گذشت و قصد میداں نمی کند　　رغبت بگوی و میل بچوگاں نمی کند

[ایک مہینہ گذر گیا اور شہزادہ میدان کا ارادہ نہیں کرتا اور پولو کھیلنے کی رغبت نہیں کرتا]

تیغش میان معرکہ روشن نمی شود　　جنگش میان کوکبہ جولاں نمی کند

[اُسکی تلوار میدان میں نہیں چمکتی اور اُس کا گھوڑا فوج میں نہیں دوڑتا]

در باغ خندہ چوں گل بستاں نمی شود　　در برج جلوہ چوں مہ تاباں نمی کند

[وہ باغ کے پھول کی طرح نہیں ہنستا اور شاہزادہ برج میں چمکتے ہوئے چاند کی طرح درشن نہیں دیتا]

در کف کتاب کردہ ندیماں نشستہ اند　　آخر چہ شد کہ گوش بدیشاں نمی کند

[مصاحب کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں۔ آخر کیا سبب ہے کہ اُن کی طرف مائل نہیں ہوتا]

در دل کف امید بستہ بزرگاں ستادہ اند　　چونست کار ملک بساماں نمی رسد

[دل میں اُمید کی مٹھی باندھے بزرگ کھڑے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ ملک کا سامان سرانجام نہیں ہوتا]

نوروز عالم است چرا از برائے جشن　　مجلس گہے چو روضۂ رضواں نمی کند

[نوروز عالم افروز ہے۔ کیوں جشن کے لئے روضۂ رضواں کے مثل مجلس آراستہ نہیں کی جاتی]

عید مبارک است چرا بر طریق بار　　آہنگ نیزہ بازی میداں نمی کند

[عید مبارک کا دن ہے کیوں دربار کو جاتے ہوئے راہ میں نیزہ بازی کرتا ہوا نہیں جاتا]

خاں را خبر کنید کہ بر چرخ رفت گرد　　کافر رسید و آب لہاور عبرہ کرد

[خان کو خبر کردو کہ آسمان پر گرد پہنچ گئی ہے۔ کافر آپہنچا اور اُس نے لاہور کے دریا کو عبور کر لیا]

چوتھا بند بھی اسی سلسلہ کو جاری رکھتا ہے:-

خیزید و بارگاہ بصحرا بروں برید　　دنبال شاہ رایت والا بروں برید

[اُٹھو بارگاہ کو نکال کر صحرا میں لے چلو۔ رایت والا شاہ والا کے پیچھے باہر لے چلو]

در سایۂ نشانہ دہل را نوازید　　با نغمتِ دمامہ علم را بروں برید

[نشان کے سایہ میں ڈھول بجاؤ۔ ڈھول کی آواز کے ساتھ علم باہر لاؤ]

مست است شاہ خفتہ بتختش رواں کنید　　چوں نیست آں چناں کہ سوارا بروں برید

[شاہ مست ہے اُسے تخت پر سوتے ہوئے لے چلو۔ وہ اس وقت سوار ہو کر باہر جانے کے قابل نہیں]

قاآن ملک جانب دمریلہ شد رواں　　دریائے قلب جانب دریا رواں کنید

[قاآن ملک دمریلہ کی طرف روانہ ہو گیا، قلب لشکر کا دریا سمندر کی طرف روانہ کرو]

شاہجہان بسوئے کہستاں نمود عزم　　لشکر گہے چو کوہ بصحرا بروں برید

[شاہجہان کوہستان کا ارادہ رکھتا ہے۔ مثل پہاڑ کے لشکرگاہ صحرا کی طرف لے چلو]

نے نے کہ سوئے حضرت اعلاش خواندہ اند　　رایت بسوئے حضرت اعلیٰ رواں کنید

[نہیں نہیں بادشاہ نے اپنے یہاں طلب فرمایا ہے اُس طرف رایت کو روانہ کرو]

اسال ہست امید نیابت بہ پیش تخت | نایب ملک جملہ مہیا بروں برید

[اس برس وزارت کی اُمید ہے۔ اس لئے سلطنت کی تمام علامتیں اور نشانیاں تیار کرکے باہر لے جاؤ]

پانچویں بند میں بھی وہی مضمون جاری ہے:-

گاہے بود کہ ایں شب محنت سر آیدے | خورشید ما فروشدہ تا کہ بر آمدے

[کاش کبھی ہماری یہ شب محنت ختم ہو جاتی اور ہمارا ڈوبا ہوا سورج نکل کر نظر آجاتا]

آں شیر سُرخ کوکہ بہ پیروزی آمدے | در زیر چتر لال بہ دولت در آمدے

[وہ سُرخ شیر کہاں ہے کہ فتحمند آتا اور لال چتر کے نیچے دولت کے ساتھ آتا]

کو گرد چتر کوکبۂ خاصگان شاہ | کانجم صفت بگرد مہ انور در آمدے

[وہ چتر کے چاروں طرف شاہزادہ کا خاص لشکر کہاں ہے جو چاروں طرف چمکتے ہوئے چاند کے گرد ستارے کی طرح آتا تھا]

نایب کجا کہ ہمچو تہمتن بہ پیش تخت | جولاں زناں بہ پیش صف لشکر بر آمدے

[نایب کہاں ہے کہ تہمتن کی طرح تخت کے روبرو صف لشکر کے سامنے آتا]

جاندار بک کجاست کہ از رایتہائے شاہ | با دور باش چتر زر آمدے

[جاندار بک کہاں ہے کہ شاہی نیزوں اور دور باش کو لئے کر سنہرے چتر کے ساتھ ساتھ آتا]

شادی کنید شاہ بملتاں ہمی رسد | تا آن ملک محمد سلطان ہمی رسد

[خوشی کرو کہ شاہزادہ ملتان آرہا ہے۔ تا آن ملک محمد سلطان آرہا ہے]

چھٹے بند میں پھر شاہزادہ کی یاد ہے:-

کو آں جہاں گرفتن و لشکر کشیدنش | بر اوج آفتاب علم بر کشیدنش

[وہ اُس کی جہانگیری اور لشکر کشی کہاں ہے اور سورج تک جھنڈا بلند کرنا کہاں ہے]

کو آں بگاہ بار بمسند نشیدنش | صفہائے صف دراں ہمہ تا در کشیدنش

[وہ دربار کے وقت اُس کا مسند پر بیٹھنا اور دروازہ تک صفوں کا قایم رکھنا کہاں ہے]

کو آں مرصع فگندنش | اسپاں نوبتی ہمہ در زر کشیدنش

[وہ مرصع لگانیں لگانا اور شاہی گھوڑوں کو سنہرے زیور پہنانا کہاں ہے]

کو آں ملوک خواندن و در مے نشاندنش | و آں بزم راست کردن و ساغر کشیدنش

[ملوک کو بلا کر مجلس میں شریک کرنا اور مجلس سجا کر ساغر پینا کہاں ہے]

در بحث علم نکتۂ مشکل شنیدنش | وز دل ہزار نکتۂ دیگر کشیدنش

[علمی بحث میں مشکل نکتہ سننا اور دل سے ہزاروں دیگر نکات نکال لینا]

اخیر بند میں سلطان بلبن محمود سلطان اور کیقباد کیخسرو کی زندگی اور شاہزادہ کی مغفرت کی دعا ہے۔

امیر خسرو نے اسی جنگ اور حادثہ کے متعلق چند رباعیاں بھی لکھی تھیں جن میں سے حسب ذیل انتخاب کی جاتی ہیں:-

(۱)

در جنگ مغل کہ تیر کیں شد پرتاب | ہم تاب ز روئے رفت و ہم رونق تاب

زاں کشتہ و خستہ کاندر آب افتادند | آں آب ہمہ خوں شد واں خوں ہمہ آب

[مغل کی لڑائی میں جب کینے کے تیر چلے تو چہرہ سے طاقت جاتی رہی اور چہرہ طاقت سے پھر گیا۔ مُردے اور زخمی جو پانی میں پڑے تھے۔ تو ان سے پانی سب خون ہو کر رہ گیا اور خون سب پانی]

(۲)

قومے کہ دراں عرصۂ کیں می خسپند | فریاد کہ از بہر چہ چنیں می خسپند

بر خاک نہادہ سرہا گوئی | در ماتم خویش بر زمیں می خسپند

[جو لوگ اُس میدان جنگ میں سو رہے ہیں افسوس وہ کس لئے ایسے سو رہے ہیں گویا خاک پر سر رکھے ہوئے اپنے ماتم میں سو رہے ہیں]

(۳)

جمعے ہمہ گردن برسن کردہ گرد | بودند چو خون کشتگان در دو

ہم خار ہمی گرفت دامن کہ مرو | ہم آبلہ می فتاد در پا کہ مرو

[وہ لوگ جن کی گردنیں رسیوں میں بندھی ہوئی تھیں ایسے دوڑ رہے تھے جیسے مقتولان جنگ کا خون دوڑ رہا تھا۔ کانٹے دامن میں اُلجھتے تھے (یا روکتے تھے) کہ مت دوڑو اور آبلے پیروں میں پڑتے تھے (یا منت سماجت کرتے تھے) کہ مت جاؤ]

(۴)

آں کیست کہ سوئے رفتگاں رہ جوید | ما را خبر از حال اسیراں گوید

پائے کہ بزیر گل خراشیدہ شدے | یارب کہ میان خار چوں می پوید

[کون ہے جو گئے ہوؤں کے پاس جا کر قیدیوں کے حال کی خبر لاوے۔ جو پیر پھول سے زخمی ہو جاتے تھے الٰہی! وہ کانٹوں میں کس طرح دوڑتے تھے]

(۵)

تا لشکر شاہ راہ عالم بالا بگرفت | دل رفت ز جا و غم و درد جا بگرفت

اے آب میائے بعد ازیں در ملتاں | چوں جائے تو آب دیدۂ ما بگرفت

(جب سے شاہزادہ کی موت نے عالمِ بالا کا راستہ لیا ہے۔ دل بیقرار ہے اور غم درد نے دل کی جگہ لے لی ہے۔ اے دریا اس کے بعد ملتان میں مت ٹھیر۔ تیری جگہ ہماری آنکھوں کے آنسوؤں نے لے لی ہے)

زیں واقعہ کامسال بملتان نزاد است ... از گریہ بشہر در جہاں آفتاد است

فریاد ز گوشش من برآمد چہ کنم ... ہر سو ز گوششش ہمی نہم فریاد است

(جو واقعہ اس برس ملتان میں پیش آیا اس کی وجہ سے دنیا میں نالہ و گریہ ہو رہا ہے۔ میرا کان فریاد کرنے لگا۔ کیا کروں جس طرف کان لگاتا ہوں فریاد ہی فریاد سنائی دیتی ہے)

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس حادثہ میں امیر خسرو مغلوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور بڑی تکلیفیں سہکر بھاگ کر رہا ہو سکے تھے۔ ایک قصیدہ میں جس کا نام "حکم الحکم" رکھا ہے اپنی اسیری و رہائی کا ذکر کیا ہے۔ اُس کے چند اشعار لکھتا ہوں:-

ہمیں بلا نگر کہ امسال در حد ملتان ... شکست میمنۂ مومن از کف کفار

چہ گونہ شرح تواں داد آں قیامت را ... کزاں نزع ملک الموت خواستے زنہار

اسیر گشتم و از بیم آنکہ خوں ریزد ... نی ماند زخوں در تنم نحیف نزار

چو آب بے سر و پا می دویدم و چو حباب ... ہزار آبلہ در پا ز رفتن بسیار

برہنہ ماندہ تن چوں درخت گاہ خزاں ... ہزار پارہ چو گل از خراش خار آزار

قرینہ کہ مرا پیش کردہ رہ می رفت ... نشستہ بر فرسے چوں پلنگ در کہسار

زماندگی قدمے گر بماند می تشنہ ... گہے طپانچہ زدے گہ کشیدے بخشم گہ تکمار

ہمی زدم بدل سرد دم و ہمی گفتم ... کزیں بلا نتوانم کہ جاں برم زنہار

ہزار شکر خداوند را کہ داد خلاص ... نہ دل ز تیر شگاف و نہ تن ز تیغ افگار

کنوں کہ شش صد و ہشتاد و چار شد تاریخ ... مرا سنی دو سہ[۳۳] آمد نوید سی و چہار[۳۴]

سبق گرفتہ ام ایں نکتہ را بمکتب طبع

بہ پیش پیر خرد در صحیفۂ افکار

(اس بلا کو دیکھو کہ اس سال ملتان کی حد میں مومن کی صف راست کفار (مغل) کے ہاتھ سے ٹوٹ گئی۔ اُس قیامت کا کیا حال بیان کیا جائے کہ جس کی ہیبت سے ملک الموت پناہ مانگتا تھا۔ میں بھی قید ہو گیا اور اس خوف سے کہ قتل کر دیا جاؤنگا میرے کمزور اور لاغر جسم میں خون باقی نہ رہا۔ پانی کی طرح بے سر و پا دوڑتا تھا۔ اور حباب کی طرح پیروں میں زیادہ چلنے سے آبلے پڑ گئے تھے۔ میرا جسم ایسا ننگا رہ گیا تھا جس طرح کہ خزاں کے وقت درخت اور کانٹوں کے خراشوں سے پھول کی طرح اُس کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک قرونہ (مغل) جو مجھے اپنے سامنے لئے ہوئے چلا جاتا تھا۔ ایک گھوڑے پر اس طرح سوار تھا جیسے کہ چیتا پہاڑ پر۔ اگر تھک کر ایک قدم بھی ٹھیر جاتا تو مجھے کبھی طمانچہ سے مارتا اور کبھی غضبناک ہو کر تکمار سے پیٹتا۔ میں اپنے دل میں آہ سرد کھینچکر رہ جاتا اور کہتا کہ اس بلا سے جان بچا کر نہ لیجا سکونگا۔ خدا تعالےٰ کا ہزار شکر ہے کہ جس نے مجھے اُس سے نجات دلائی۔ نہ میرا دل تیر سے چھدا نہ میرا بدن تلوار سے زخمی ہوا۔ اب کہ ۶۸۴ھ ہے مجھے اپنی عمر کے تینتیسویں[۳۳] برس نوید آئی ہے۔ چونتیسویں[۳۴] برس کی (یعنی چونتیسواں سال شروع ہونے والا ہے) میں نے اس نکتہ کو طبیعت کے مکتب میں پیر خرد کے سامنے فکر کے صحیفہ سے سیکھا ہے)

یہ ہیں خان شہید کے حالات اور جنگ ملتان کے افسوسناک واقعات۔ ہندوستان کی تاریخ میں بہت سی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں جن میں سلطنتیں جیتی اور ہاری گئیں اور بہت سے سورما مارے گئے جن کے نام تاریخ میں چمکتے ہیں۔ لیکن ملتان کی یہ خوفناک لڑائی اور اُس کے ہیرو شاہزادہ سلطان محمد بھی بھولے جانیکے قابل نہیں ہیں۔ معلوم نہیں کہ ملتان میں اُس کی یاد کس حد تک زندہ ہے۔ لیکن وہ دریا اُسکے قریب ابتک بہتا ہے جس کی موجوں میں اُس نے اپنی قربانی کی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی ہندوستان کی حمایت و حفاظت میں کھوئی۔ لیکن اُس کا نام عمر کی چٹانوں پر کندہ ہے۔ تاریخ نے اُس کے نام کو زندہ رکھا ہے اور ادب میں بھی اُس کی یاد ابتک گونجتی ہے آنے والے زمانہ میں جبکہ ہمارے ملک کی تاریخ پورے طور پر لکھی جائے گی۔ تو اس کا نام سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہوگا۔ اگر ہم اُسکی بڑائی سے ابتک بیخبر تھے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔

"ہم اپنے ناموروں کو بہت کم جانتے ہیں۔ اور اُس سے بھی کم اُنکی عزت کرتے ہیں"۔

خدا مغفرت کرے خان شہید۔ واقعی ہندوستان کا ایک بڑا ہیرو تھا۔ اُس کا نام اور اُس کی یاد دونوں سچی عزت کے مستحق ہیں!

(خاص)

سید حسن برنی

چینی کی چوٹی

از جناب مرزا محمود نظامی۔ اسلامیہ کالج۔ لاہور

"سرکار سو [illegible]"

میں چونک کر [illegible] دیکھی تو نو بجکر کچھ منٹ ہوئے تھے۔ گویا ہمارا جہاز ٹرین کی روانگی سے [illegible] منٹ پہلے پہنچا۔ میں نے اطالوی سٹیورڈ کی جانب خمار آلود آنکھوں [illegible] اور پھر کہا:-

"بہتر سو [illegible] ہوا"

ہم چو [illegible] کی راہ عرشہ جہاز پر آئے۔ مطلع ابر آلود تھا اور سیاہ گرجتے ہوئے [illegible] بادل دوش نسیم پر اُڑتے پھرتے تھے۔ تیز بارش میں بھیگتی ہوئی ہما [illegible] جماعت جو چار عورتوں اور سات مردوں پر مشتمل تھی گنگ وے کے راستہ اُس [illegible] بوٹ میں بیٹھی جو ہمیں ساحل سویز تک لے جانے کے لئے جہاز کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں اگنبوٹ خلیج سویز کے پایاب پانیوں کو کھنگالتا ہوا جہاز [illegible] سے پرے ہٹنے لگا۔ ہوا تندی سے چل رہی تھی۔ طوفانی سمندر کی غضبناک موج [illegible] لہریں اُچھل رہی تھیں۔ مغرب میں جس وقت بجلی چمکتی تو دور تک پھیلے ہوئے [illegible] باربرداری کے جہازوں کا عظیم بیڑا جس کی متعدد چمنیوں سے سیاہ دھوئیں کی لکیریں [illegible] ہو رہی تھیں کسی ہیولانی تصور کی طرح غیر واضح نظر آتا۔ اور کچھ لنگر انداز ساحلی جہاز اور بہت سی تیل لے جانے کی کشتیاں متلاطم موجوں میں تنکوں کی طرح ہلتی دکھائی دیتیں +

پندرہ منٹ کے عرصہ میں سٹیمر وہسل کی بھاری اور وحشتناک آواز کے ساتھ جو رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی تیل کی ٹانکیوں کے ساتھ ٹکرا کر فضا میں پھیل گئی تھی ساحل کے ساتھ لگا۔ جب ہم لوگ موٹروں میں بیٹھکر سٹیشن پر اُترے تو گاڑی روانگی کے لئے تیار تھی۔ انجن دھوئیں کے سیاہ بادل اُڑا رہا تھا۔ اور ہمارے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد ایک لمبا پُرشور وہسل دے کر وہ گھنٹیوں اور سیٹیوں کی کرخت آوازوں میں پلیٹ فارم کو پیچھے چھوڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے اور رفتہ رفتہ رفتار تیز کرنے لگی۔ اور کچھ عرصہ میں فراٹے بھرتی کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چونکہ کھڑکیوں کی راہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس لئے میں نے دروازہ پھیر دیا۔ اور شیشے چڑھا دینے کے بعد گدے پر سونے کی نیت سے دراز ہو گیا۔ جب دو گھنٹہ کی خوشگوار نیند کے بعد آنکھ کھلی تو برسات بند ہو چکی تھی لیکن مطلع بدستور غلیظ تھا۔ اور بجلی آتشی کھنکھجورے کی مانند چمک رہی تھی۔ سیاہ بادل غیر مختتم قطاروں میں دوش نسیم پر اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ اگر ہوا کی سرکشی اُنہیں منتشر کر دیتی تو چاند کی روشنی میں صحرا کا ہیبتناک وسنسان و ویرانہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا جس کی بھیگی ہوئی بنجر پہاڑیوں کے ڈھلوانوں پر برسات کا جمع شدہ پانی آہستہ آہستہ بہ رہا تھا۔ اور کہیں سیاہ جنگلوں کے بڑے بڑے پیڑ ہوا کے آگے تنکوں کی طرح ہلتے تھے +

آدھ گھنٹہ کے بعد گاڑی قاہرہ کے عظیم الشان سٹیشن پر پہنچی۔ تو برسات دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ بہرکیف ٹھیک دو بجے ہم لوگ شیپرڈ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک ریفائل گندمی رنگ کے عمر رسیدہ مصری نے موٹر کا دروازہ کھولکر اپنے داہنے ہاتھ کو داڑھی تک بلند کرتے ہوئے میری تقدیم کی۔ اور سامان اُٹھا کر میری رہنمائی کرتا ہوا ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ سنگی زینہ کو طے کرنے کے بعد ہم تھوڑی دیر تک سنسان ہوٹل کے تنگ راستوں کے چکر کاٹتے رہے۔ پھر وہ ایک دروازہ پر پہنچکر رکا۔ جیب سے چابی نکالی۔ اندر دروازہ کھول کر اُس نے میرا سامان میز پر رکھا۔ اور بوٹ اُتارنے میں میری مدد کرنے لگا۔ پھر قدرے جھک کر مسکراتے ہوئے بولا:-

"جناب والا مجھے یقین ہے یہ جگہ آپ کے لئے بالکل آرام دہ ہوگی" +

اور پچھلے پیروں ہٹتا دروازہ کھول کر رخصت ہو گیا۔ اُس کے جانے پر دروازہ کے بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر کمرہ میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ باہر تند ہوا کھڑکیوں سے اپنا سر پھوڑ رہی تھی۔ اور بارش کے پٹ پٹ کر کے گرتے ہوئے پانی کی آواز آ رہی تھی۔ جس وقت میں شب خوابی کا لباس تبدیل کر چکا۔ تو عین اُسوقت دستک ہوا اور دروازہ

بڑی آہستگی سے کھلا۔ اور وہی پیر پیر بوڑھا مصری خادم نمودار ہوا +

"معاف کیجئیگا جناب والا!" اُس نے حسب معمول جھک کر کہا۔ "آپ کا بستر مجھے ٹھیک کرنا ہے" +

اور دروازہ کو بند کرتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے سگار نکال کر سلگایا اور ایک آرام کرسی پر ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ دفعتاً فاصلہ پر سے کسی گھنٹہ کی خوفناک آواز کا مدھم شور طوفانی سمندر کی غضبناک موجوں کی تند آواز سے ملتا ہوا۔ کانوں میں آیا۔ ایک ایسا مدھم شور جو اُن مبہم آوازوں کے اشتراک سے علیحدہ ہو۔ جو رات کے سناٹے میں دوشِ نسیم پر سنائی دیا کرتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بڑھ کر پھر فنا ہوگیا۔ لیکن وہ اسقدر مقبول ذہن تھا کہ مجھ پر عجب طرح کا خوف طاری ہونے لگا۔ ایسے گھنٹے کی آواز عموماً برما کے بدھ مندروں میں سنائی دیا کرتی ہے۔ یا اس قسم کا جرس قرون وسطی کے زمانہ جاہلیت کی خوفناک مذہبی جماعتوں میں بجا کرتا تھا +

میں نے مصری کی طرف دیکھا وہ بڑی خاموشی سے چادر کی سلوٹیں درست کرنے میں منہمک تھا۔ اُس کا چہرہ بالکل مطمئن اور سنجیدہ تھا۔ معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے کوئی خوفناک آواز نہیں سنی۔ کام سے فارغ ہو کر وہ جانا چاہتا تھا۔ کہ میں نے اُسے روکا۔

"ٹھہرو!" میں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم بتلا سکتے ہو یہ آواز کس چیز کی تھی؟"

"جناب والا! کون سی آواز؟" اُس نے حیرت و استعجاب کے عالم میں دریافت کیا۔

"تم نے نہیں سنا؟ . . . . . وہی آواز . . . . ." ابھی اُس کی پوری تفصیل میں بتانا چاہتا ہی تھا کہ دور افتادہ مقام سے کسی ڈھول کی تھرتھراتی ہوئی ہولناک آواز تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد سنسناتی ہوئی ہمارے کانوں تک پہنچی +

ایک خوفناک تبسم بوڑھے مصری کے خشک ہونٹوں پر نمودار ہوا +

"آہ! میں سمجھا۔ جناب والا!" اُس نے آگے سے زیادہ مسکراتے ہوئے کہا "میں سمجھا تانغز دیبی کے مندر میں نقارہ پیٹا جا رہا ہے۔ وہ نقارہ۔ وہ عظیم و مہیب نقارہ جس کو دیکھنے کے لئے دنیا کے ہر کونے سے آئے دن لوگ قاہرہ میں آتے ہیں۔ جناب والا! اس وقت وہاں کوئی مذہبی رقص شروع ہونے والا ہوگا۔" وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ جس کے دوران میں نقارہ کی تھرتھراتی ہوئی آواز بدستور آرہی تھی۔ پھر بولا "آہ وہ کیسا عجیب منظر ہوتا ہے۔ لوبان و عنبر کی بوئے جاں افزا میں اس وقت بھی یہاں کھڑا سونگھ رہا ہوں۔ جناب والا! یقین کیجئے رقص درحقیقت قابل دید ہے" +

اس کے بعد وہ حسب معمول جھکا اور بیشتر اس کے کہ میں اس سے کوئی سوال گھنٹے کے متعلق کرتا وہ دروازہ کھول کر چلا گیا۔ اور فاصلہ پر اُس کے قدموں کی ہلکی سی چاپ بھی بند ہوگئی۔ میں نے سگار کو میز پر رکھدیا۔ اور سونے کی نیت سے اُٹھا۔ اُس وقت اچانک سڑک پر سے کسی شخص نامعلوم کی کسی دستی باجہ کی سمع خراش آواز کے ساتھ ایک بھیانک لے میں ناقابل فہم غیر ملکی گیت گانے کی آواز آئی۔ اور پھر یکلخت بند ہوگئی۔ کچھ دیر کمرہ میں وہی پہلے کی سی موت کی خاموشی طاری رہی۔ مگر رفتہ رفتہ بیشمار آوازیں کانوں میں آنے لگیں وہ عجیب مدھم شور جو رات کی سنسانی سے مخصوص ہے۔ باہر سڑک پر کسی راہرو کی ہلکی چاپ۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز۔ ہوائی سائیں سائیں ہوٹل کے کسی حصہ میں تختوں کا چرچرانا۔ یہانتک کہ کھڑکی کی "ٹک ٹک" بھی میرے لئے باعث اضطراب ہونے لگا۔ بہت دیر اسی حالت میں رہا۔ آخر میں گھبرا کر اٹھا اور کمرہ میں ٹہلتے ہوئے نیند کو مائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ نہ معلوم کتنا عرصہ ٹہلتا رہا۔ گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ عین اُس وقت اسی شیطانی گھنٹہ کی مہیب اور کرخت آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ خوف سے لڑکھڑا کر میں پیچھے ہٹا۔ لیکن کسی غیبی تحریک سے مرعوب ہو کر میں نے سامنے کی کھڑکی جلدی سے کھولی۔ ساتھ ہی تیز ہوا کا تیز چاقو کی دھار کے مانند کاٹتا ہوا داخل ہوا۔ برسات بند ہوچکی تھی۔ کچھ فاصلہ پر درختوں کے جھنڈ تیز ہوا کے آگے سجدہ ریز تھے۔ آسمان پر ابر کے ٹکڑے سیاہ دیووں کی طرح ہوا کے پردوں پر ایک دوسرے کے تعاقب میں اُڑ رہے تھے۔ اور اُن کے اندر کبھی کبھی نصف چاند کھائی دیتا تو اُسکی پھیکی سرد روشنی میں درختوں سے پرے کچھ دھندلے مکان اور اُن سے پرے شہر کا وحشت خیز ویرانہ نظر آتا۔ سڑک پر لیمپوں کی روشنی تاروں کی مانند چمکتی تھی۔ عین اُس وقت جبکہ میں واپس ہونا چاہتا ہی تھا۔ کہ کسی سیاہ چیز کو دیکھ کر رُکا۔ آہ یہ کیا؟

کوئی سیاہ پوش پُراسرار مرد سر پر چینی وضع کی ٹوپی لئے۔ آہستہ آہستہ ہوٹل کی جانب آتا ہوا دکھائی دیا۔ پہلے تو اُس کی شکل اچھی طرح دکھائی نہ دیتی تھی۔ تاہم جب وہ برقی لمپ کے کھمبے کے نیچے پہنچا تو میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا۔ لیکن اُس کے لباس سے اُس کی قومیت مترشح نہ ہوسکی۔ اور وہ بڑی سرعت کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ کچھ دیر میں وہیں کھڑکی کے سامنے ساکت کھڑا رہا۔ پھر خیالات کو توہم پر محمول کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد آنکھ لگ گئی +

اُٹھا تو دن چڑھا ہوا تھا +

غسل کر چکا تو ہوٹل کا ویٹر ناشتہ کے تیار ہونے کی اطلاع دینے آیا۔ چنانچہ تبدیل لباس کے بعد میں کھانے کے کمرہ میں گیا۔ کچھ لوگ کھانا کھا کر اٹھ گئے تھے۔ اور کچھ ابھی تک میزوں پر بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ میں آرام سے ایک خالی نشست پر بیٹھکر کھانوں

کی فہرست میں سے چند ایک کا انتخاب کرنے لگا۔ کاغذ سے سر اُٹھایا تو میز پر بہت سے دوسرے آدمی جو میری آمد پر موجود نہ تھے آکر بیٹھ چکے تھے۔ چائے کی پیالی میں شکر کی ڈلیاں ڈالنے کے بعد میں نے دودھ کے برتن کو میز پر تلاش کرنے کے لئے متجسس نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں تو کیا دیکھتا ہوں میرے مقابل کی قطار میں تیسری نشست پر وہی پُراسرار بیٹھا ہوا انڈے کو کانٹے میں پھنسانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے جسے پچھلی رات میں نے سڑک پر سے ہوٹل کی جانب آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہاں یہ وہی تھا۔ وہی گول گول آنکھیں۔ وہی زرد رنگ +

دل نے کہا ممکن ہے گھنٹہ کی آواز جو ہوٹل کے کسی کمرہ سے دو دفعہ سنائی دی تھی اسی سے تعلق رکھتی ہو۔ لیکن ان خیالات کو دل سے نکال کر میں نے کھانا ختم کیا اور شہر کی سیر کے لئے تیاری کرنے کی نیت سے اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا آیا تیار ہونے کے بعد جس وقت موٹر میں میں نے قدم رکھا تو میں نے دیکھا دو شخص میری آمد سے پیشتر اگلے گدّوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کوئی ترک نوجوان۔ دوسرا وہی مردِ پُراسرار۔ راستہ میں ہم نے بہت کم باتیں کیں لیکن جب ہم مسجد محمد علی خدیو مصری کی سیر کے بعد دوبارہ موٹر میں بیٹھے تو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ترک کا نام مصطفیٰ منیر ہے اور مردِ پُراسرار کا آہ فنگ خو +

آہ فنگ خود اصل چین کا باشندہ تھا لیکن کاروباری ماحول کی وجہ سے دو تین سال سے اُس نے جاپان کے شہر اوساکا میں اپنی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اور اب وہ تجارت کے سلسلہ میں انگلستان جا رہا تھا مصطفیٰ منیر ترکی افواج میں کسی ممتاز عہدہ پر فائز تھا۔ اور اس وقت مصر میں سیر و تفریح کے لئے آیا ہوا تھا —— ان باتوں کا علم اُس وقت ہوا جب ہمارا موٹر قاہرہ کے کشادہ اور فراخ بازاروں میں سے گذر رہا تھا جہاں مشرق و مغرب کے ہر ملک و قوم اور ہر مذہب و ملت کے مختلف انداز کے افراد اپنی قومیت کے جداگانہ لباس پہنے ایک دوسرے کے دوش بدوش چل رہے تھے۔ مسجد محمد علی۔ جامع ازہر اور قلعہ کی مشہور عمارتوں کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد ہم لوگ اہرام مصر کی جانب روانہ ہوئے۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ غروب ہونے والے سورج کی روپہلی کرنیں نیلگوں آسمان پر بکھرے ہوئے سفید رنگ بادلوں کو سنہری رنگ دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ اہرام کے نزدیک پہنچ گئے۔ آسمان کی فضا اور صحرا کا دامن آفتاب کے آخری اثرات سے تمتع اندوز ہو رہے تھے۔ درختوں کے قہقہے فضائے آسمانی میں گونج رہے تھے۔ ہلکی ہوا سرسبز پتّوں کو گدگدا رہی تھی۔ سامنے حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا ریت کے بیشمار ذرّوں کا ہموار میدان تھا جس میں بائیں جانب کھجور کے لہلہاتے درختوں کی اوٹ میں اہرام مصر اور ابوالہول کا چھپا ہوا چہرہ نظر آتا تھا +

موٹر وہیں کھڑا کر دیا گیا۔ اور ہم لوگ اپنے گائیڈ (رہبر) حسین کی معیت میں کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے کھدائی کرنے والے مزدوروں کا سامع خراش شور و شغب شام کی آمد کی وجہ سے کم ہو گیا تھا۔ اور افسر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے اُفق کی سرخی پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ قریب ہی (ایکسکویٹر) کا بڑا بھاری انجن دن بھر کی تھکان کے بعد ساکت و صامت کھڑا تھا اور کچھ پژمردہ و ملول مزدور کپڑے جھاڑ جھاڑ کر اُس راہ پر ہو رہے تھے جس سے ہم لوگ آئے تھے۔ دو منٹ تک پیدل چلنے کے بعد ہم لوگ اہرام کے پاس پہنچ گئے۔ چاروں طرف وسیع چٹیل میدان خشک اور غیر مزروعہ خطہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں تاریک گہری کھڈیں۔ اونچے اونچے ریتلے ٹیلے اور خاک سے ڈھلے ہوئے سفید پتھر نظر آتے تھے۔ فضا میں کوئی دیو ہیکل صحرائی پرندہ اپنے گھونسلے کی جانب مراجعت کرتا ہوا (بحالتِ تباہ) ہم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوا آدمی کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ یہانتک کہ اس وقت رہتے سہے مزدور بھی جا چکے تھے۔ اور اُن کی شکلیں دور فاصلہ پر دھندلے اور تاریک سایوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ نظارہ بہت ہیبتناک تھا۔ سنسانی ہر قدم پر بڑھتی جاتی تھی۔ دور کسی مختصر سے قافلے کے اونٹوں کی مدھم صدائے جرس کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی +

کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ہمارا رہنما ہمیں اُس ندی کے پاس لے گیا۔ جو صحرا میں نیلے کوبر کی طرح خاموش بہتی تھی۔ اور جس کا گدلا پانی کنارے پر اُگی ہوئی سبز گھانس اور اُس میں بکھرے ہوئے چٹانوں کے سیاہ ٹکڑوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر بہ آہستگی بہہ رہا تھا۔ سرد صحرائی ہوا۔ اُس دردناک آواز کے ساتھ جو پستہ قد پودوں میں سے ندی کے ساتھ گذرنے سے سنائی دیتی تھی۔ چل رہی تھی۔ ہم لوگ کچھ دیر کھڑے اُس کے پانی کو دیکھتے رہے۔ پھر حسین ندی کی طرف اشارہ کرکے بولا:-

"سرکار! دریا میں غرق شدہ موتوں کی خبیث اور ناپاک روحیں شام کو یہاں آموجود ہوتی ہیں۔ اور وہ رات کے اندھیرے میں آوارہ پھرتی ہوئی اُن لوگوں کو جو آس پاس گذر رہے ہوں۔ ہلاک کر دیتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت تک ایسی ہزاروں موتیں ہو چکی ہیں" +

مجھے تو واقعی اُس وقت یوں معلوم ہونے لگا جیسے فضا پر بھی بے شمار خبیث روحیں اِدھر اُدھر بے آواز پھرتی ہوئی ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہیں، مگر ترک حقارت اور حیرانی کے لہجہ میں بولا:-

"تم عجیب گاؤدی انسان ہو۔ کہ اس زمانہ میں بھی بھوتوں کی ہستی کے قائل

بنے بیٹھے ہو"۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی جیسے شاید جواب میں کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ چینی زور سے ہنسا۔

"ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ ہو ہو ہا ہا۔۔۔۔۔" اس کی آواز آجتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یقیناً اس طرح کا خوفناک شیطانی قہقہہ جو اس وقت اس چینی نے لگایا بہت کم سننے میں آیا ہوگا۔ عجیب کریہہ آواز تھی۔

پھر آہ فنگ خو نے اپنا ہاتھ ترک کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"میرے دوست بھوتوں کا وجود اتنا ہی یقینی ہے۔ جتنا آپ کے سامنے اس ندی کی موجودگی"۔

ترک نے ایک روکھے لہجے میں جواب دیا:۔

"ممکن ہے آپ اپنے کسی تجربہ کی بنا پر ایسا کہہ رہے ہوں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ میں ان کا قائل نہیں"۔

تھوڑی دیر چینی اس کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر بولا:۔

"ہوگا۔ مگر میں بھوتوں کے ایسے ہوشربا واقعات دیکھ چکے ہیں۔ جنکی نظیر مشکل سے کسی کو دنیا میں میسر آئیگی"۔

اس کی آنکھیں خوفناک طور پر بند ہوتی اور کھلتی تھیں اور اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بڑا بھاری راز جسے وہ چھپانا چاہتا تھا۔ اس کے منہ سے نکل گیا ہے۔

"واقعی؟" ترک نے حیرت واستعجاب کے انتہائی لہجہ میں دریافت کیا "آہ۔ تب تو آپ ہمیں ضرور کسی محیر العقول واقعہ کی داستان سنائیں گے"۔ اور استفہامی نظروں سے چینی کے پشیمان چہرہ کی طرف دیکھنے لگا۔

اشتیاق میرا بھی بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ ترک کی تائید میں "ضرور۔ ضرور" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور ہم لوگ چینی کو آمادہ پاکر وہیں ریت کے فرش پر بیٹھ گئے۔ دہکتے ہوئے لوہے کی مانند سرخ آفتاب لمحہ بہ لمحہ صحرا کے ایک کونہ میں غروب ہوتا جارہا تھا۔ اور تاریکی رفتہ رفتہ شوخ نظروں سے کائنات کو دیکھتی ہوئی نمودار ہورہی تھی۔ چینی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر گرد آلود سمٹی ہوئی ابروؤں کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی درخشاں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ اور اسنے کہا:۔

"یہ تمام اسرار حالات ہرچند پردۂ راز میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔ مگر آپ لوگوں کو بتلانے میں میں کوئی خطرہ نہیں دیکھتا" اور وہ حسب معمول کچھ دیر کے لئے رکا۔ پھر آہستہ آہستہ بولا:۔

"اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو ایک سال سے زیادہ عرصہ گذرا۔ ایک رات جب کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور پانی زور سے برس رہا تھا۔ میں آوسکا میں اپنے مکان پر بیٹھا تجارتی کاغذات کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ بادلوں کی مہیب کڑک اور زہرہ گداز تبسم برق سے دل سینہ میں بیٹھا جارہا تھا۔ اتنے میں ایک دفعہ بجلی کہیں اس زور سے گری۔ گویا توپوں کی ایک بڑی باڑھ چھوٹی ہو۔ اس کے بعد سیڑھیوں پر کسی کی بھاری چاپ سنائی دی۔ جو کمرہ کے دروازہ پر آکر رک گئی اور ساتھ ہی کسی کے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ مگر میں اسے ہوا کی سرگوشی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔

"کھٹ کھٹ کھٹ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ کوئی شخص زور زور سے میرے دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔

"میں اٹھا اور دروازہ کھول کر برستے ہوئے پانی میں دیکھنے لگا۔ باہر بالکل اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی سیڑھیوں پر کوئی شخص سیاہ پوش صاف طور پر نظر آتا تھا۔ وہ مجھ کو دیکھتے ہی چلایا۔

"آہ فنگ خو اس بے وقت آمد کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن تم سے ملنا کچھ ایسا ضروری تھا جو یوں چلا آیا"۔

"آواز میری بارہا کی سنی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت میں اسے قطعاً نہ پہچان سکا۔ بالآخر میں نے حیرانی کے عالم میں اس سے کہا:۔

"اندر چلے آؤ۔ باہر سردی اور ہوا تیز ہے"۔

"مگر جس وقت وہ روشنی میں پہنچا تو اسے پہچان کر میں حیران و ششدر رہ گیا۔

"'تم؟ لی فان!' میں نے بصد دقت اپنی آنکھوں پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ کیا میں تمہاری روح کو دیکھ رہا ہوں؟'

"'نہیں' لی فان نے میری تردید کی۔ 'اطمینان رکھو میں تمہارے سامنے جسم کے ساتھ ہی آیا ہوں'

"'لیکن تم ابتک زندہ کیونکر ہو' میں نے بڑھتی ہوئی پریشانی سے کہا۔ 'عرصہ ہوا حکومت چین کی طرف سے تم کو سزائے موت کا حکم ملا تھا'

"'یہ ٹھیک ہے' اس نے تسلیم کیا۔ 'لیکن اگر حیات باقی ہو تو انسان جہنم کی آگ سے بھی بچکر واپس لوٹ سکتا ہے'

"'اس کے کیا معنی؟ مگر ٹھہرو!—— تم سردی اور بارش میں آئے ہو۔ تم کو قہوہ کی ضرورت ہے۔ پہلے میں تمہارے لئے ایک دو پیالیاں قہوہ کی تیار کرتا ہوں لیکن تم اپنا قصہ بیان کرسکتے ہو۔' اور میں نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اس نے اپنا بھیگا ہوا کوٹ اتار کر ایک کونہ میں رکھدیا۔ اور کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے

میز پر جھک کر کہنے لگا۔

"در اصل موت کا حکم تو حکومت نے خود ہی تبدیل کر دیا تھا۔" پھر وہ میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ "آہ! وہ رات بڑی بھیانک رات تھی۔ جس بدنصیب کے خلاف موت کا فتویٰ صادر ہو چکا تھا اور جس کو علم تھا کہ وہ دنیا میں صرف دو گھنٹوں کا مہمان ہے۔ وہ چین و آرام کی تلاش میں اپنے قیمتی لمحے کیونکر کھو سکتا تھا۔ تاہم میں بیٹھا اس نیند کو مدعو کر رہا تھا جس کے بعد ایک ایسی دائمی میٹھی نیند آنے والی تھی۔ جس سے کبھی کوئی سونے والا بیدار نہیں ہوتا۔ اتنے میں کوٹھری کا دروازہ کھلا اور جیل کے داروغہ نے آ کر اطلاع دی کہ حکومت نے میری سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا ہے۔ آہ تم میری اُس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ مجھے دنیا میں زندہ رہنے کی دوبارہ مہلت دی گئی ہے۔ اس کے بعد رشوت — ایک ہیرے کی انگوٹھی کی رشوت — آج تین ماہ ہوئے میری خلاصی کا باعث ہوئی۔ اور اس وقت میں تمہارے سامنے موجود ہوں"۔

وہ ہنسنے لگا۔ لیکن میں نے اس کی ہنسی کو روکنے کے لئے کہا:۔

"آخر یہ سزا کس جرم میں ہوئی تھی؟"

وہ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد بولا:۔

"ٹینٹن کے تقدس مآب پجاری می پونی کو قتل کر دینے کے جرم میں"۔

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آہ تم نہیں جانتے" وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا "میں نے اسے ہلاک کر کے کیا چیز حاصل کی۔ دیکھو" وہ کچھ عرصہ جیبوں کو ٹٹولتا رہا۔ پھر اس نے میرے سامنے گوتم بدھ کا ایک چھوٹا سا کانسے کا بنا ہوا بت میز پر رکھ دیا۔ "تم کو یہ ایک بہت معمولی شے ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک بہت بڑے کمالات کا ایک مخفی خزینہ ہے۔ یہ بھوتوں کو مسخر کرنے کا آلہ ہے"۔ اور وہ کچھ عرصہ کے لئے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا "مگر یہ اتنا ہی سستا نہیں جتنا تم تصور کرو گے۔ سال بھر میں ایک دفعہ انسان کے دل کا خون اس پر ملنا پڑتا ہے"۔ وہ رک گیا اور میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اور بصورتِ دیگر" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بصورتِ دیگر جان زی دیوتا کا غضب اس کے مالک کی جان لے لیتا ہے۔ چنانچہ ٹینٹن کے پجاری پر میرے ذریعہ اس کا عتاب نازل ہوا۔ اور اس بوڑھے کو اپنی جان ضائع کرنی پڑی۔ تم دیکھ سکتے ہو اس کا خون اس کے جسم پر ابھی تک لگا ہوا ہے"۔

"میں نے دیکھا تو واقعی کہیں کہیں ابھی تک خون کا کوئی داغ موجود تھا۔ بالآخر میں نے حیرت سے کہا:۔

"اگر یہ بات جیسا تم دعویٰ کرتے ہو صحیح ہے تو پھر تم تسخیر الارواح کا عمل کیوں نہیں شروع کر دیتے"۔

"تمہارا اعتراض ٹھیک ہے۔ لیکن جب تک وہ گھنٹہ جو فوکوجی کے بت خانے کے پجاری کے پاس ہے حاصل نہ ہو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر میں آج میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو تم کو بھی اپنے ساتھ لیجا سکتا ہوں"۔

"پہلے تو میں نے انکار کیا۔ لیکن بالآخر اس نے مجھے راضی کر لیا۔ اور اس وقت گیارہ بج رہے تھے تو ہم لوگ گھر سے نکلے۔ بجلی کے قمقموں سے شہر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ رات نکھری ہوئی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا۔ ہر ایک چیز پر چاند کی دلکش اور مدھم نقرئی روشنی کی سرد جگمگاہٹ رقص کر رہی تھی۔ اور سمتِ مشرق میں تھوڑے فاصلے پر آتش فشاں فیوجی کی بادلوں سے ڈھکی ہوئی چوٹی نظر آتی تھی۔ رات زیادہ نہیں گئی تھی پھر بھی برسات کی وجہ سے ابھی سے شہر پر ایک سناٹا اور سکون چھایا ہوا تھا۔ ہمارے گھوڑے سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ کیونکہ رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور اندھیرے میں وہ راستہ جس پر ہم لوگ گامزن تھے سخت خطرناک سمجھا گیا ہے۔ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم شہر نارا میں داخل ہوئے تو مطلع دوبارہ تاریک ہونے لگا تھا۔ اور سیاہ بادلوں کے تیز رو ٹکڑے اطراف و اکناف میں اڑتے پھرتے تھے۔ توفوکوجی کا مندر شہر سے تھوڑی دور ہی ہے۔ اس لئے ہمیں وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ صرف نہیں کرنا پڑا۔ اس وقت ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور سوکھے ہوئے پتے کھڑکھڑا کر رات کے خوفناک سناٹے کو قطع کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ہر طرف خاموشی تھی۔ اس خوفناک سنگی عمارت کے اندر یا باہر کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ ی نان نے گھوڑوں کو ایک محفوظ مقام پر باندھا۔ اور دروازہ کے مقابل کھڑے ہو کر اسے زور سے کھٹکھٹایا لیکن باوجود انتظار کے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ مگر مثل بیشتر کے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ تیسری مرتبہ پھر کوشش کی گئی۔ لیکن جواب ندارد۔ آخر جب ہم مایوس ہو گئے تو ایک تنگ دریچہ کھلا اور منڈا ہوا سر جس سے بہت لمبی چوٹی وابستہ تھی نمودار ہوا۔ اور ساتھ ہی آواز آئی:۔

"کون ہے؟"

"چند نحیف و ناتواں مسافر جو امن کی تلاش میں یہاں تک آئے ہیں" میرے ساتھی نے عاجزانہ انداز میں کہا۔

"لیکن وہ مقدس بندوں کے پاکیزہ سکون میں کیوں مخل ہوتے ہیں۔ جاؤ یہ وقت یہاں آنے کا نہیں"۔ اور وہ دریچہ کو بند کرکے واپس ہوا چاہتا تھا کہ لی فان چلایا "مگر ٹھہرو پہلے آقائے فوہوفان سے ہماری نسبت دریافت کرو" اب اُسکا لہجہ جھگڑالو نہ تھا۔

لیکن دریچہ بند کر دیا گیا اور چینی کے قدموں کی چاپ کچھ فاصلہ پر جا کر بند ہوگئی نہ معلوم ہم لوگ وہاں کتنے عرصہ تک ٹھہرے رہے۔ پھر اندر کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مگر دریچہ کی بجائے دروازہ کھلا اور وہی پستہ قد خمیدہ کمر چینی نمودار ہوا۔ ہم کو دیکھ کر جھکا اور بولا:۔

"حضورِ عالی مقام کا ارشاد ہے۔ کہ سردست معزز مہمانوں کو رخصت نہ کیا جائے اس لئے میں رفیع المرتبت نوواردوں کو اندر آنے کی دینے کا شرف حاصل کرتا ہوں"

"ہم لوگ اندر داخل ہوئے شمع کی جھلملاتی ہوئی روشنی عمارت کے اندھیرے کو دور کرنے کی بجائے اُسے اور تاریک کر رہی تھی۔ یہیں اُس پراسرار عمارت کے پتھریلے فرش پر کھڑا چار سو بھیانک دیواروں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ رات کی خاموشی اور مکان کی ویرانی۔ پھر سناٹا اور تنہائی۔ اس پران بھیانک اثرات میں اضافہ کرنے کی بادتند سیاہ پردوں کو جو دیواروں پر لٹکے ہوئے تھے۔ پھڑپھڑاتی اور لوبان و عنبر کی تیز بو کو پھیلاتی سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ یہ وہ حالت تھی جو قوی سے قوی دل کو ہراساں کر دیتی ہے۔ کبڑا دروازہ بند کر چکا تو اُس نے ہمیں اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ جگہ جگہ پر مشتعل شمعیں جھلک رہی تھیں۔ اور اُن کے کثیف و زہریلے دھوئیں سے پریشان ہو ہو کر بڑی بڑی چمگادڑیں ہمارے سروں پر پھڑپھڑاتی ہوئی منڈلا رہی تھیں۔ اور کمروں کا بادامی رنگ کا چوبی سامان دھندلی روشنی میں انگاروں کی طرح چمکتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے اُن سنگی حجروں سے گذر رہے تھے جو دھوئیں یا گرد و غبار کی وجہ سے سیاہ ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ہمارا رہنما ایک دروازہ پر پہنچکر رُک گیا۔ پہلے اُس نے مڑ کر ہماری جانب دیکھا۔ پھر ایک چھوٹا سا پیتل کا گھنٹہ جو پاس ہی پڑا ہوا تھا آہستگی بجایا۔ اُس کی گونج ہوا کو مرتعش کرتی ہوئی ایک لمحہ تک سنگی حجروں کی ٹھوس دیواروں سے ٹکرا کر سنائی دیتی رہی۔ پھر وہی خاموشی چھاگئی۔ اس کے بعد دفعتاً کسی دور افتادہ مقام سے کسی نغمۂ شیریں کی دلکش و دل آویز صدا جس کے سامنے موسیقی کے روح گداز نغموں کی مقناطیسیت اور چنگ و رباب کی سحر آفرینیاں بھی ماند ہوں ایک ملائم خوشگوار سُر کے ساتھ ہوا کو لرزاتی ہوئی ہمارے کانوں میں آئی۔ مگر رفتہ رفتہ تیز ہو کر تلخ اور خوفناک ہوگئی اور پھر یکلخت بند ہوگئی۔ اسکے بعد ہمارے مقابل کا پردہ ہلا اور ایک تباہ حال لڑکا ہم کو اندر آنے کا اشارہ کرکے اُس کے پیچھے غائب ہوگیا۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے اُس کی تقلید کی لیکن میں نے دیکھ لی فان کا چہرہ مسرور تھا۔ اندر ایک لمبا ریشائل نحیف و ناتواں چینی جس کی عمر اسی سال سے کم نہ ہوگی ناک پر عینک چڑھائے اور سنہ پر جو روئیدگی سے اس طرح پاک تھا جیسے تربوز' ایک لمبی چوٹی لٹکائے طلائی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا کمزور جسم ایک سنہری رنگ کی ریشمین چادر میں ڈھپا ہوا تھا۔ اُس کا رنگ زرد تھا۔ گویا ہزار سال کی بیماری کے بعد چارپائی سے اُٹھا ہے۔ اور اُس کے رخساروں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی بولا:۔

"دن کے سکوں سوز ہنگامے۔ غیروں کے جرم و عصیاں دیکھنے کے لئے اور رات کی تنہائی کا سکوت اپنے نیک و بد افعال کی پڑتال کے لئے ہے۔ پھر ایسے وقت میں اگر میں نے تمہیں پیشتر ہی سے ملنے کی اجازت نہ دی ہوتی تو تم اندر نہ آسکتے تم نے کچھ شک نہیں ایک تنہائی پسند بچاری کا سکون توڑا ہے۔ لیکن تمہیں اسکی رعایت پہلے سے مل چکی ہے۔ مگر بتلاؤ کیا چاہتے ہو"

"لی فان لرزہ براندام آگے بڑھا۔ اور کانپتے ہوئے ذرا جرأت آمیز الفاظ میں بولا:۔

"سیدی! میں چان زی دیوتا کے جرس اور اُس کے کارہائے نمایاں کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ جس کی آپ نے مجھے کل اجازت دی تھی"۔

"اچھا بیٹھ جاؤ۔ بڈھے چینی نے جس کا اُداس و غمگین چہرہ بڑا خوفناک معلوم ہوتا تھا ہم سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور مسند سے اُٹھ کر خود کمرے کے کونے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھولوں کی بھینی بھینی مہک اور عود و عنبر کی تیز بو آنے لگی۔ اور اُس مقام سے جہاں چینی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا سرخ روشنی کبھی مدھم کبھی تیز ہوتی تھی۔ کوئی نصف گھنٹہ تک وہ اپنا عمل کرتا رہا پھر فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ ہمارے پاس آیا اور یوں بولا گویا تقریر کر رہا ہے:۔

"کوئی مخلوق ایسی نہیں جو انسان کی طرح مصائب و تکالیف برداشت کرنے کی خوگر ہو۔ حیات کے جانکاہ خارستان کو عبور کرنے کے لئے اور جسم و جان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کی کشمکش اور جدّ و جہد میں انسان کی کتنی قوت صرف ہوتی ہے لیکن زندگی کی تمام تلخیاں اُس وقت کافور ہو جاتی ہیں اور ہم اس جہانِ کون و فساد کو اُس کے دشوار گذار مراحل سمیت خوشی اور مسرت کا گہوارہ سمجھتے ہیں۔ جب ہماری کوئی تحقیق پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ دنیا بُری ہے۔ اُس کے لوازم و اجزا بُرے ہیں۔ ان کو مانتے ہوئے بھی انسان موت و حیات کی کشمکش میں بھی اُس کے مناظر اور نقش و نگار دل سے محو نہیں کرتا۔ وہ مصیبت اُٹھاتا ہے۔ دُکھ سہتا ہے۔ تکلیف جھیلتا ہے۔ لیکن دُنیا

سے رخصت ہونا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ سب مصائب اُس وقت معدوم ہو جاتے ہیں۔ جب ہم کسی مقصد میں جسے ہم اپنا نصب العین قرار دے لیں کامیاب ہوتے ہیں۔ دیوتا چان ژی کا گھنٹہ دنیا کی مشترکہ روحانی طاقتوں کی لمبی تجسس و کاوش کا نتیجہ ہے۔ آجکل سائنس کے اصولوں کی مدد سے ہر ایک چیز کی نقل تیار ہو رہی ہے۔ فی الحقیقت نقلی چیزوں کو ہی بنانا اگر کمالات انسانی میں داخل ہے تو اس میں شک نہیں سائنس ایک شیطانی تحریک کا نام ہے۔ اور اسی شیطانی تحریک کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لئے یہ گھنٹہ ساخت کیا گیا ہے"۔

وہ کچھ عرصہ کے لیے رُک گیا اُس کی آواز میں ایک عجیب حلم پایا جاتا تھا۔ پھر وہ کمرہ کے دوسری جانب ایک الماری کے پاس گیا جس میں بیشمار چھوٹی چھوٹی شیشیاں۔ مفرد و مرکب دوائیں اور لاتعداد دیگر چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور اُس میں سے ایک زرد رنگ کی ضخیم کتاب نکالی جس میں معلوم ہوتا تھا اُس نے بہت سے مسودے نسخے اور یادداشتیں جمع کر رکھی ہیں۔ اور اُسے لیکر ہماری جانب آیا۔

"یہ کتاب آج سے پانصد برس پیشتر شہنشاہ میدا گر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی"۔ اس کو کھول کر اُس نے اُسے دُہرایا تو وہ طائیم سیل(?) کی مانند کانپ رہی تھی۔ پھر کتاب کو کلیۃً بند کر کے بولا:۔

"خیر میں ان فروعات کو نظرانداز کر کے اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یہ میری غلطی تھی۔ ابھی تم ان چیزوں کے سمجھنے کے اہل نہیں۔ آؤ میرے پیچھے آؤ" اور وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ دروازہ سے گذر کر ہم لوگ اُس جگہ پہنچے جہاں پتھر کا ایک فراخ زینہ تھا۔ اُس کو طے کر کے ایک چوڑے صحن میں پہنچے جس کے چاروں طرف پتھر کے بنے ہوئے متعدد حجرے تھے۔ اور وسط میں مہاتما بدھ کا ایک عظیم الشان دو سو فٹ اونچا سنگی بُت تھا۔ جس کا ایک ہاتھ پہلو میں رکھا ہوا اور دوسرا کہنی کے سہارے اوپر کو اس طرح اُٹھا ہوا تھا جیسے چوک پر گاڑیوں کی آمد و رفت کو قابو میں رکھنے کے لئے سپاہی کا ہاتھ اشارہ کے لئے اُٹھا ہوتا ہے سر پر سونے کا تاج تھا۔ اور سامنے سونے کے شمعدان اور چاندی کے گلدان رکھے ہوئے تھے۔ اور اُس کے سر کے گرداگرد چینی ساخت کے بیشمار چھوٹے چھوٹے بُت ہالہ کے طور پر لگے ہوئے تھے۔ اُس اندھیرے مقام پر بڑے بُت کے سر اور آنکھوں میں نصب شدہ لعل اور یاقوت اس طرح جگمگا رہے تھے جس طرح شب دیجور کی تاریکی میں چرخ چنبری پر تارے۔ مشعل کی دُھندلی روشنی میں تنہائی اور نفس کشی کی وہ تمام اذیتیں جو ریاضت کی وجہ سے اُس بڈھے پجاری خوجو فان نے گذاری تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھیں جو عمیق حلقوں میں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ پھر اُس کے پژمردہ چہرہ پر مختصر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور سامنے دیوار پر اشارہ کرتے ہوئے اُس نے میرے ساتھی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ دریافت کیا۔ لی فان دیوانوں کی طرح سامنے اُس شیر کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ جو دیوار پر بنی ہوئی انسانی ہنر کے کمالِ فن کا ثبوت دے رہی تھی۔ دفعتاً کسی نادیدہ مقام سے گھنٹے کی آواز کا وہ شور قیامت خیز پیدا ہوا کہ الاماں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بجلی گری اور عمارت ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ اُس کی گونج خانقاہ کے ہر حصہ میں پھیل کر دس گنا شدت اختیار کر چکی تو آخر یہ آواز مدھم ہوتی ہوئی بالکل بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک سکوت رہا۔ مگر پھر وہی گھنٹہ بجا اور ویسی ہی بھیانک اور مہیب آواز پیدا ہوئی۔ اور کچھ عرصہ بتدریج تیز ہو کر گم ہو گئی"۔

یہاں تک پہنچکر چینی رُکا۔ اور اُس نے پہلے ابوالہول کے خوفناک بت کو جو اہرام کے پاس کسی کہن سال محافظ کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ پھر آسمان کو دیکھا۔ رات کی مشکیں نسب اور لیلیٰ تمثال شہزادی اپنی سیاہ عنبری چادر پھیلا رہی تھی۔ شفاف نیلے آسمان پر ستارے ایک ایک کر کے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ تیز جگمگاتے ہوئے تارے جو بلادِ مشرق کے سوا کہیں نظر نہیں آتے۔ پھر کہانی کو جاری رکھتے ہوئے بولا:۔

"آہ آج یہاں بیٹھکر بھی جب اُس منظر کا تصور کرتا ہوں تو روح کانپتی ہے اور خوجو فان پجاری کی مرجھائی ہوئی شکل اس طرح واضح نظر آتی ہے۔ جیسے آپ لوگوں کے چہرے۔ خیر ـــــ گونج کے بند ہونے پر بڈھا پجاری بولا:۔

"فقیروں اور راہبوں کے سوا کسی اور مرد دنیادار کا اس جگہ پر گذر محال و ناممکن ہے مگر تم نے چونکہ تین ماہ تک اس جگہ ریاضت کی ہے۔ اس لئے یہ کمالات تمہیں دکھائے جاتے ہیں"۔

"اور اُس نے ایک اونچے مقام سے کانسے کا لٹکتا ہوا ایک جرس اُٹھایا میں نے دیکھا۔ لی فان خفیف سا کانپا۔ اُس کے چہرہ کی رنگت پہلے سرخ۔ پھر ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ بے رنگ ہو گئے اور دبی ہوئی آواز میں اُس کے منہ سے مسرت کی چیخ نکلی۔ سانس بہت تیزی سے آنے لگا۔ اوم۔ پدی ہونگ کا ورد کرتے ہوئے پجاری نے ایک چھوٹی سی چوبی ہتھکی(?) اُٹھا کر گھنٹہ پر ضرب لگائی! ایک مدھا شور رات کے سکوت میں بھیانک اور مہیب گونج پیدا کرتا ہوا اُٹھا اور ساتھ ہی خانقاہ کے ہر حصہ سے ایک عجیب غل سنائی دیا اور بہت سے گھنٹوں کے بجنے کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ پھر شور ہر لحظہ قریب آنے لگا۔ یہاں تک کہ اُس کمرہ میں پہنچکر جہاں ہم تھے اس طرح کی خوفناک آواز پیدا ہوئی جیسے زور سے بجلی کڑکتی ہو اور دفعتاً دوبارہ(?)

پھٹ گئی جس پر شیر کا نقش تھا اور شیر ایک دہاڑ مار کر مجسم ہوگیا۔ یقین کیجئے اُس وقت میری حالت بہت غیر تھی۔ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں بیٹھ گیا تو میرے حواس بجا ہوئے۔ پجاری نے لی فان کے چہرہ کی طرف دیکھا جو فرط حیرت و استعجاب سے مضمحل ہو رہا تھا پھر اُس نے ایک تھیلی سے تھوڑا سا سیاہ سفوف چٹکی میں لے کر دہکتے ہوئے کوئلوں پر پھینکا اور کثیف دھوئیں کا ایک گہرا بادل کمرہ کے ہر حصہ میں محیط ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک تو اس دھوئیں کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا۔ مگر رفتہ رفتہ جب دھواں منتشر ہوا تو بدھ کی دیوقامت سنگی مورت انداز و وقار سے ہلی اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر آسمان کی طرف بلند کیا۔ پھر ویسی ہی مہیب آواز سنائی دی اور بُت ویسے کا ویسا ہو کر رہ گیا +

"اس قسم کی دو تین اور کرامات دیکھنے کے بعد جب ہم لوگ گھر کو واپس لوٹے تو رات خاصی جا چکی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی کرخت آواز رات کی ویرانی اور سنسانی میں بڑی وحشتناک گونجیں پیدا کر رہی تھی۔ اور خاموش وادی میں دوڑتے ہوئے مرکبوں کے قدم تیز تیز اِدھر اُدھر اُٹھ رہے تھے۔ میں نے ایک دفعہ لی فان کو بُلایا۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔ ممکن ہے میری آواز اُس نے سنی ہی نہیں یا ویسے ہی جواب کسی مصلحت کی بنا پر نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہرے معاملہ کو بغور سلجھا رہا ہے۔ بڑی دیر کی خاموشی کے بعد اُس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

"میں نہیں چھوڑونگا۔ میں ہرگز نہیں چھوڑونگا"

"کیا؟" میں نے حیرانی سے دریافت کیا +

"گھنٹہ۔ اُس بڈھے منحوس راہب کا مافوق الادراک گھنٹہ" +

"میں نہیں ٹھہرا اور طنزاً کہا "لی فان! تم قدرے بیوقوف بھی ہو۔ شاید تمکو معلوم نہیں کہ اگر تم پکڑ گئے تو تمہاری خلاصی خنجر ہی کرے گا" +

"اُس نے پہلے میری جانب حقارت سے دیکھا۔ پھر جواب دیا "ہر امر میں فتح و شکست کا امکان مساوی ہوتا ہے" +

"تھوڑے عرصہ بعد ہم اوساکا پہنچ گئے۔ پچھلی رات کا وقت اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی اکّے دُکّے سپاہی یا گھر کو جاتے رکشا قلی کے سوا راستہ میں کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ میرے مکان میں بھی ہر طرف اندھیرا اور گورستان کی سی بھیانک خاموشی تھی۔ احاطہ کا پھاٹک کھول کر میں اندر داخل ہونے لگا تو لی فان مجھ سے معذرت کر کے رخصت ہونے پر مصر ہوا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا اور اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی۔ مگر اُس نے نہ نہ کر کے گھوڑے کو ایڑ لگا ہی دی اور تھوڑی دور نظر آنے کے بعد رات کی تاریکی میں غایب ہوگیا +

اس رات کے ایک ماہ بعد جبکہ میں اس معاملہ کو بالکل بھول گیا تھا۔ ایک شب بہت دیر گئے میں شہر کے ان تنگ اور غلیظ بازاروں سے جہاں گندے فقیروں کی گھناؤنی صورتیں دیکھ کر طبیعت بے اختیار مالش کرتی تھی۔ قدم قدم پر بیٹھے اپنی مکروہ آوازوں سے گذرنے والوں کو اپنے بدنوں کے مرضی اور نمائشی آزار دکھلا رہے تھے۔ گذرتا ہوا گھر آرہا تھا۔ اُس وقت آسمان جو پہلے صاف اور نکھرا ہوا تھا ابر آلودہ ہو رہا تھا۔ سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بادل۔ کوّے کے پروں سے زیادہ سیاہ۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے گرج رہے تھے۔ اور جانب بجر انہی کی سیاہی میں بجلی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھنکھجورے کی مانند کوند رہی تھی۔ میں ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے اپنی جانب کھینچا۔ مڑا تو دیکھا کہ ہون لی فان کھڑا ہنس رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں روشن تھیں اور سپید دانت چمک رہے تھے +

"آخر میں نے پا لیا" اُس نے مجھ سے کہا "میں نے پا ہی لیا"

"کیا"

"چان زی دیوتا کا گھنٹہ"

"تم نے؟ مگر وہ کیسے؟"

"وہ اپنے منہ کو میرے داہنے کان کے پاس لا کر مہین آواز میں بولا "اُسے قتل کرنے کے بعد" اور پیچھے ہٹ کر مسکرایا۔ مسرتِ کامیابی کا خندۂ زیرلب اُس کے خبث باطن سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔

"مجھے دکھاؤ تو" میں نے اُس سے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا:۔

"یہ جگہ موزوں نہیں چلو سڑک کے پار شراب خانہ میں چلیں"۔ اس نے بھیڑ کو دیکھتے ہوئے سامنے کی دوکان پر اشارہ کیا "سر بازار کھڑے ہو کر گفتگو کرنا معیوب ہے" +

"اور ہم دونوں سڑک عبور کر کے شراب خانہ میں داخل ہوئے۔ ادنیٰ قیمت کی تلخ شراب کی بدبو اور تمباکو کا دھواں کمرہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جانب شرابیوں کی بھیڑ تھی۔ دوسری طرف کلوار اور اُس کے ملازم کھڑے تھے۔ شراب کے دو گلاسوں کو طلب کر دینے کے بعد ہم ایک میز پر بیٹھ گئے تو وہ بولا "آہ دوست تم میری خوشیوں کا اندازہ تو کرو۔ میں دنیا کے کتنے بڑے خزانے کا مالک ہوں" +

"میں نے نفرت سے کہا۔ "لی فان! مجھے خدشہ ہے تمہارے افعال تمہارے لئے جہنم میں ایندھن کا کام دیں" +

"مگر اُس نے میری بات کو اَن سُنی کرکے کہا" لو دیکھو تم کو یقین نہیں آتا تھا۔ کیا یہ وہی گھنٹہ نہیں'؟

"میں نے غور سے اُسے دیکھا تو معلوم ہوا گھنٹہ وہی ہے۔ جسے میں نے خوہوفان کے پاس اُس رات دیکھا تھا۔ پھر وہ بولا۔ 'اب تم دیکھو گے میں کیا کچھ کرتا ہوں۔ مگر یار آہ فنگ خوا یقیناً تم کو تکلیف نہ ہوگی۔ اگر میں آج کی رات تمہارے ہاں ہی بسر کروں۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ اس لئے واپس نہیں جا سکتا' +

"بہتر۔ مگر مجھے خدشہ ہے کہیں توفوکوچی اور ٹینٹسن کے پجاریوں کی طرح تیرا انجام بھی حسرتناک نہ ہو۔ میں نے طنزاً کہا جس پر وہ بے اختیار ہنسا +

"ہا ہا ہا! ہو ہو ہو!! تم اور انجام —— ہا ہا ہا! ہو ہو ہو!! - آؤ چلیں تم اور —— ہا ہا ہا"

"راستہ جلدی جلدی طے کرنے کے بعد ہم مکان پر پہنچے۔ اُس وقت تارے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔ کچھ ننھی ننھی بدلیاں فضا میں منڈلا رہی تھیں صحن میں بارش کے جمع شدہ پانی پر برقی لیمپ کی شفاف و بے داغ روشنی بکھر رہی تھی۔ اور کسی مینڈک کی کرخت آواز عجیب زیر و بم کے ساتھ اُٹھتی تھی۔ جو رات کے سناٹے میں مرنے والے انسان کے ٹوٹتے ہوئے سانس کی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دیتی۔ نوکر کو لی فان کیلئے بستر تیار کرنے کا حکم دینے کے بعد ہم دونوں بڑے کمرے میں بیٹھکر قہوہ پیتے رہے۔ دو تین گھنٹے بعد جب میں سونے کی نیت سے اُٹھا تو لی فان نے مجھ سے کہا:-

"بہتر ہوگا تم ان اشیا کو اپنی حفاظت میں رکھ لو۔ میں کل تم سے جاتی دفعہ لے لونگا۔ اور اُس نے نکال کر دی گھنٹہ۔ کانسے کا بت اور ایک کسی سیاہ سفوف سے پُر تھیلی میرے حوالے کئے۔ میں نے ان سب کو ایک دفعہ بغور دیکھنے کے بعد آہنی تجوری میں مقفل کر دیا۔ اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند شاید اُچٹ گئی تھی۔ باوجود بہت دیر تک کروٹیں لینے کے آنکھ نہ لگ سکی۔ ایک عجیب پریشانی جی کو بے چین کر رہی تھی۔ اور رات کے سناٹے میں طرح طرح کے ہولناک اور متوحش خیالات دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ دو گھنٹہ تک آنکھ بند رکھنے کے بعد بھی نیند پاس نہ پھٹکی۔ تو میں نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی۔ باہر چاند نکلا ہوا تھا۔ اور اُس کی مدھم روشنی باغ میں لہرا رہی تھی۔ ہوا عشق پیچے کی بیلوں میں سے سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ مگر میں نہیں جانتا اُس وقت اتنا بزدل کیوں بنا جاتا تھا۔ سینے میں دھڑکن پاؤں میں لغزش۔ دماغ میں عجیب اندیشوں کا ہجوم۔ کیا تقدیر کوئی نیا رنگ کھاتا چاہتی تھی؟ میں نے خیال کیا ممکن ہے روشنی کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ اس لئے پہلے گھڑی دیکھی معلوم ہوا ڈیڑھ بجا ہے۔ پھر روشنی گل کر کے بستر پر دوبارہ لیٹ گیا اتنے میں دفعتہً بند کمرہ سے کسی کے مسلسل کھانسنے کی بلند آواز آئی۔ پھر ساتھ ہی ایک مدھم چیخ میرے کانوں میں پہنچی۔ واقعی یہ کسی آدمی کی چیخ تھی۔ جو اندھیرے اور سناٹے میں بڑی خوفناک تھی۔ پھر کسی کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور اس سے زیادہ زور کے ساتھ بند ہوا۔ اور کسی کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آئی پھر خاموشی چھا گئی۔ میں گھبرا کر بستر پر سے اُٹھا۔ دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اُٹھنے کے بعد پہلا احساس یہ ہوا کہ کوئی میرے کمرے میں موجود ہے کیونکہ کسی کے تنفس کی مدھم خوفناک آواز آ رہی تھی۔ کوئی شخص تجوری کے پاس کھڑا تھا۔ میں گھبرا کر ٹھٹک گیا۔ یہ کون تھا؟ —— کوئی چور؟ — یا لی فان کے افعال کی تفتیش کرتی ہوئی پولیس؟ آخر کیوں وہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ یکلخت بادل ہٹے تو چاند کی ہلکی روشنی میں جو کھڑکی کی راہ کمرہ میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے پہچانا۔ ایک ہلکی چیخ میرے منہ سے نکلی اور میں لڑکھڑا کر دو قدم ہٹ گیا +

"یہ تو لی فان تھا +

"بڑی مشکل سے اپنے حواس کو ٹھکانے لگاتے ہوئے۔ میں نے غصہ میں اُس سے پوچھا "تم کس نیت سے اس وقت یہاں آئے ہو"؟

"مگر وہ خاموش تھا۔ اُس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ سرد پسینہ کے قطرے اُس کی پیشانی پر بہہ رہے تھے۔ اور وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے بادِ نسیم کے آگے کسی نوزائیدہ پیڑ کے نازک پتے۔ اُس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خوف سے لڑکھڑاتا ہوا دروازہ کے پاس جا کر اُسے —— کھول دیا +

کسی دراز قد چینی کی دھندلی صورت جس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں اور منڈے ہوئے سر سے لٹکتی ہوئی بہت لمبی چوٹی نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ اندھیرے سے نکل کر زینہ کے نچلے حصہ پر سے بڑی آہستگی کے ساتھ اوپر چڑھتی دکھائی۔ دو منٹ کے بعد وہ اوپر پہنچے تو ہم دونوں نے اُسے پہچانا —— وہ توفوکوچی مندر کا بڈھا پجاری فوہوفان تھا۔ میں نے دیکھا اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اور اُس کی زبان اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور میرے پاس سے گذر کر لی فان کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہاں ساکت و صامت کھڑے رہنے کے بعد اپنے تھر تھراتے ہوئے زرد ہاتھ آگے پھیلا کر اُس نے گڑگڑاتی ہوئی آواز میں جو بڑی خوفناک

تھی مطالبہ کیا:۔

'دیدو۔میرا مسروقہ مال واپس دیدو۔ لاؤ لاؤ اُسے لاؤ۔ تم اُس امانت کے اہل نہیں۔ لاؤ میں تم سے کہتا ہوں لاؤ'

"اُس کی بھاری آواز سے یوں معلوم ہو رہا تھا۔ گویا وہ کنوئیں کے اندر سے باتیں کر رہا ہے"

"لی فان بےحس وحرکت بُت بنا کھڑا تھا۔ اور میری حالت! اُف مجھ میں لہو کا دورہ ختم ہو چکا تھا۔ آنکھوں نے کچھ دیکھنے سے جواب دیدیا تھا لیکن کسی غیبی ترغیب سے متاثر ہو کر میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ سرہانے کی جانب بڑھایا۔ جہاں رات کو سوتے وقت میں اپنا پستول بھر کر رکھا کرتا تھا۔ مگر معلوم ہوا وہ غائب ہے۔ خدا معلوم کسی نے چُرا لیا یا میں رکھنا ہی بھول گیا۔ بہرحال وہ چیز جو اس وقت سب سے زیادہ کارآمد ہو سکتی تھی مفقود تھی"

"اتنے میں بڑھا چینی دوبارہ بولا 'لاؤ — اچھا کیا تم واپس نہیں دو گے؟ — بہتر بہتر' اور وہ دو قدم پیچھے ہٹا پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔ ہم دونوں متحیر و مبہوت کچھ عرصہ کے لئے خاموش کھڑے رہے۔ اور ہم دونوں میں جو شخص پہلے بولا وہ لی فان تھا۔ کہنے لگا:۔

"'حیرت۔ استعجاب۔ تحیّر۔ تعجب اس معاملہ کے بعد دوبارہ کبھی اسقدر نہ ہوگا۔ ایک مردہ انسان اور میرا اپنا قتل شدہ انسان زندہ ہو کر آتا ہے۔ خیر اب آنے دو —"

"'ٹھہرو' میں نے اُس کا بازو زور سے اپنی جانب کھینچکر اُسے ٹوکا 'تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا کہ تم بڈھے پجاری کو قتل کر چکے ہو؟'

"اُس نے حقارت سے میری طرف دیکھا۔ پھر بولا 'آہ فنگ خو نادان یہ دیکھو میں نے قتل کرنے کے بعد بڈھے راہب کی چوٹی کاٹ لی تھی۔ اب اُسکے قتل کا یقین آیا؟' اور اُس نے مجھے وہی چوٹی دکھائی جو ہو بہو فان کے سر پر میں اُس رات دیکھ چکا تھا۔ پھر وہ مجھے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرہ کی طرف چلا گیا۔ اُس کے جانے پر دروازہ بند ہوا تو میں بھی دراز ہو گیا۔ اور لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ مگر رات بھر متوحش خواب آتے رہے۔ یاد نہیں کب تک سویا۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو پہلی آواز جو میرے کانوں میں آئی وہ شل پیشتر کے لی فان کے چیخنے کی تھی۔

"'آہ فنگ خو۔ آہ فنگ خو' کوئی اُس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ 'آہ فنگ خو آہ فنگ خو' کوئی اُس کا گلا زور زور سے گھونٹ رہا تھا۔ 'آہ فنگ خو۔ آہ فنگ خو آہ فنگ خو' کوئی اُس کو ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی دردناک چیخیں رُک رُک کر میرے کمرے میں آ رہی تھیں۔ وہ مدد کے لئے مجھے پکار رہا تھا میں نے لحاف کو گھبراہٹ میں اُٹھا کر دور پھینکا۔ اور بھاگتا ہوا لی فان کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو دیکھا لی فان پلنگ سے نیچے اوندھا پڑا ہوا تھا۔ دروازہ پر ہی رُک کر میں نے اُسے آواز دی۔ لیکن جواب نہ ملا۔ پھر پاس جا کر اُس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ تو معلوم ہوا

"وہ مر چکا تھا"

"واقعی وہ مر چکا تھا۔ بڈھے چینی کی قطع کی ہوئی چوٹی جو اُس نے مجھے دکھائی تھی اُس کے گلے میں پھنسی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اُسی کی وجہ سے اُس کی موت ہوئی ہے۔ دوسرے دن میں اُٹھا تو دیکھا خون کے بیشمار قطرے اُسی جگہ پر پڑے ہوئے ہیں جہاں رات بڈھا پجاری لی فان کے سامنے کھڑا دیکھا گیا تھا۔ پھر پستول بھی میرے سرہانے کے نیچے پڑا ہوا مل گیا اور اسی دن لی فان کو دفن کر دینے کے بعد میں نے وہ چوٹی بھی آتشدان میں جلا دی جو رات اُس کی موت کا باعث ہوئی تھی اتفاقاً اُسی دن مجھے کسی کام کی وجہ سے ٹوکیو جانا پڑا۔ مگر دوسرے دن ہی علی الصبح میں مکان پر واپس آ گیا۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ چاروں طرف جیل اور دیودار کے بلند قامت درختوں پر طیور چہچہا رہے تھے۔ تند ہوا درختوں کے گنجان پتوں میں سرسراہٹ کے ساتھ چل رہی تھی۔ اردگرد کی پہاڑیوں سے پانی ہلکی شورش کے ساتھ گر رہا تھا۔ اور موجوں کے ساحل بحر کو تھپتھپانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ میرا ملازم باوجود میرے کھانسنے کے کیوں میرے استقبال کے لئے حسب معمول سیڑھیوں پر نمودار نہیں ہوا۔ خیر میں خود اوپر گیا۔ دیکھتا ہوں میرے سونے کے کمرہ کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ لیکن اندر قدم رکھا ہی تھا کہ خوف سے چیخ مار کر پیچھے ہٹا۔ تجوری کا تالا ٹوٹا پڑا تھا۔ اور میرا خادم اُس کے پاس ہی بےحس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ دیوتا جان تئی کا بُت اُس کے ہاتھ میں تھا اور ویسی ہی سیاہ چوٹی اُس کی گردن میں پیوست تھی جس سے ایک روز پیشتر لی فان کی موت واقع ہوئی تھی۔ میں نزدیک گیا تو غور کے بعد معلوم ہوا وہ مر چکا ہے۔ لیکن دفعتہً میرے پیچھے کا دروازہ کھلا اور میں گھبرا کر مڑا تو دیکھتا ہوں بڈھا پجاری آہستہ آہستہ باہر جا رہا ہے۔ وہی منڈا سر۔ وہی لمبی چوٹی۔ وہی زرد چہرہ۔ میں اُسے کس طرح بھول سکتا تھا"

آہ فنگ خو نے اپنی ہوشربا داستان ختم کی۔ تو کچھ عرصہ کے لئے فضا میں کامل سکوت طاری رہا۔ بالآخر ترک نوجوان اشتیاق آمیز نظروں سے چینی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا

"مگر کیا وہ گھنٹہ اور بت آپ کے پاس ہیں ؟"

"ہاں۔ لیکن خو ہو فان نے اُسے مجھ سے واپس لے لینے کی کوشش نہیں کی" چینی نے جواب دیا ۔

اس کے بعد ہم لوگ موٹر پر سوار ہو کر رات کے اندھیرے میں ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے اور تھوڑی دیر بعد قاہرہ کے تنگ تنگ کوچوں اور عجیب بازاروں میں سے گذر رہے تھے ۔ جہاں گیس کے لیمپوں کی روشنی میں کہیں کہیں کوئی مریل کتّا بدحال عرب نظر آجاتا تھا ۔ کئی کوچوں کو طے کرنے کے بعد ہم شہر کے اُس حصّہ میں جا پہنچے جو آبادی کے لحاظ سے قدرے گنجان ہے ۔ لمبے اور کشادہ بازاروں میں لاتعداد لیمپ جگمگا رہے تھے ۔ لیکن خلقت کا ہجوم یا شور و غل زیادہ نہ تھا ۔ پان سگرٹ فروشوں قہوہ خانوں اور رسٹورانٹوں کے آگے کچھ کچھ بھیڑ تھی یا کہیں کہیں حیا باختہ عورتیں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں ۔

آٹھ بج رہے تھے کہ موٹر ہوٹل کی اونچی ڈیوڑھی کے نیچے پہنچ کر رکا ۔ کھانا تیار تھا ۔ چنانچہ نو بجے اس سے فارغ ہو کر ہماری مختصر سی جماعت جو قاہرہ میں سیاحت و سیر کے لئے آئی تھی ۔ نو بجے کی ایکسپریس ٹرین سے قاہرہ کو خیرباد کہہ کر گیارہ بجے بندر سعید کے سٹیشن پر اُتری ۔ جس وقت میں ٹرین میں سے اپنا مختصر سا سامان قلی کے حوالہ کر کے نکلا تو دیکھا ایک لمبا شخص جس کے سر پر ویسی ہی ٹوپی تھی ۔ جیسی قاہرہ میں آہ فنگ خو نے پہن رکھی تھی ۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے اُتر رہا ہے مگر اُس کو اچھی طرح پہچان نہ سکا ۔ کیونکہ وہ جلدی ہی اس بھیڑ میں چھپ گیا جو ٹرین سے اُتر اُتر کر باہر جا رہی تھی ۔ میں ایک گاڑی میں بیٹھ کر گھاٹ کی جانب روانہ ہوا ۔ لیکن جس وقت گاڑی ریوڈی کا مرس پہنچی تو پیچھے سے ایک موٹر شور کرتی ہوئی آئی اور ایک چینی کی دوکان پر آکر ٹھہر گئی ۔ جس کے آگے سے ہم گذر رہے تھے وہی شخص جسے میں نے سٹیشن پر دیکھا تھا موٹر سے اُترا اور چشم زدن میں دوکان کے اندر چلا گیا ۔ ریو ڈی لا میونسپل سے مڑ کر جب میری گاڑی شارع سلطان میں پہنچی تو دوسری مرتبہ وہی موٹر پھر پھوں پھوں کرتی پاس سے نکل گئی ۔ ساحل پر پہنچ کر میں نے گاڑی کو رخصت کیا ۔ اور خود جہاز کی جانب روانہ ہوا ۔ گھاٹ پر برقی لیمپوں کی روشنی تاروں کی مانند چمک رہی تھی ۔ سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر ایک دلنواز نغمے پیدا کر رہی تھیں ۔ اور سطح آب پر چلنے والی پُرنم ہوا کنارے کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو جھولا جھلا رہی تھی ۔ چونکہ رات بہت جا چکی تھی ۔ اس لئے پانی میں سیر کرنے والوں کی آخری کشتیاں اس وقت ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی تھیں جب سب مسافر سوار ہو چکے تو ٹھیک ایک بجے ہماری روانگی ہوئی ۔ جہاز کے اگلے حصّہ میں لنگر اُٹھانے کا شور ہوا ۔ اس کے پانچ منٹ بعد جہاز نے حرکت کی اور تھوڑی دیر میں وہ بحر عمیق کی متلاطم موجوں میں مصروف خرام تھا ۔

یوں تو بجے کو ایک بج چکا تھا ۔ مگر نیند آنکھوں سے عنقا تھی ۔ چنانچہ میں شہر کے آخری منظر کو دیکھنے کے لئے جہاز کے صحن پر آگیا ۔ گھاٹ کے پاس روشن عمارتیں ، کسی سنہری لکیر کی مانند نظر آتی تھیں ۔ اور جگمگاتے ہوئے لیمپ جگنو معلوم ہوتے تھے چاندکی قرمزی شعاعیں سمندر کی نیلی سطح پر بکھر رہی تھیں ۔ اور غضبناک لہریں ارتعاش نور کو جذب کرتی جا رہی تھیں ۔ میں ریلنگ پر جھکا ہوا پانی کی دُور دُور پھیلتی ہوئی جھاگ کو دیکھ رہا تھا ۔ کہ کسی شخص کے بھاری جوتوں کی چاپ سنائی دی ۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا سٹیشن پر جو خیال میرے دل میں گذرا تھا وہ ٹھیک نکلا ۔ آہ فنگ خو جہاز کے پچھلے حصّہ کی طرف جلد جلد جا رہا تھا ۔

"آہا مسٹر آہ فنگ خو !" میں نے اُسے آواز دی ۔ لیکن یا تو اُس نے سنا ہی نہیں ۔ یا جواب دینا پسند نہ کیا ۔ بہرحال وہ سیکنڈ کلاس کی سیڑھیوں پر غائب ہو گیا ۔ دوسرے روز سارا دن اُس کا انتظار کرنے کے باوجود میں نے اُسے عرشۂ جہاز یا کھانے کے کمرے میں نہ دیکھا ۔ نہ معلوم وہ کہاں چلا گیا تھا ۔ شام کو رفع اضطراب کے لئے میں جہاز کے دفتر میں گیا ۔ ایک اطالوی کلرک بیٹھا قلم سے کچھ گھس گھس کر رہا تھا ۔ میں نے اُس سے پوچھا :-

"کیا آپ مجھے اُس چینی کے کمرہ کا نمبر بتلا سکتے ہیں جو کل بندر سعید سے جہاز پر سوار ہوا ہے ؟"

"اُس نے قلم ہاتھ سے رکھ دی اور مجھے دیکھا پھر ایک موٹی سی کتاب اُٹھا کر کچھ دیر اُس کے صفحات دیکھتا رہا ۔

"مارٹن ۔ اینڈریو ۔ ڈوزیا ۔ جیکسن ۔ علی ۔ ولسن " یہاں پہنچ کر وہ رُکا پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا ۔ " افسوس ہے آپکو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ۔ جہاز پر کوئی چینی پورٹ سعید سے سوار نہیں ہوا " ۔

اُسی رات جبکہ ڈوبتے ہوئے تاروں اور مرطوب ہوا کے آگے ہمارا جہاز سمندر کی ساکت و صامت سطح پر تیغ کی مانند تیر رہا تھا ۔ اور میں کھانے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ جہاز کے اگلے حصّہ پر کچھ شور ہوا ۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو میں ڈر کر رہ گیا ۔ کوئی دراز قامت سیاہ پوش چینی جس کے منڈے ہوئے سر پر ایک لمبی سیاہ چوٹی لٹک رہی تھی پانی میں شور بور آہنی باڑ کو پکڑ کر جہاز پر چڑھتا دکھائی دیا ۔ میں گھبرا کر کرسی سے اُٹھا ۔ لیکن پھر جو غور سے دیکھا تو وہ غائب تھا ۔

تیسرے روز جہاز وینس پہنچ گیا ۔ جہاں دو روز قیام کرنے کے بعد میں پیرس چلا گیا ۔

پیرس میں ٹھہرے مجھے پانچواں روز تھا۔ اور اسی رات مجھے لندن جانا تھا کہ ہوٹل کا فرانسیسی ملازم شام کے وقت میرے پاس آیا اور کہنے لگا:۔

"موسیو آج آپ جا رہے ہیں لیکن جانے سے پیشتر کیا آپ مجھ پر ایک نوازش کر سکتے ہیں؟" وہ تھوڑی دیر میری جانب مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا:۔

"آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ آپ یقیناً اصنام کے متعلق ضرور کوئی واقفیت رکھتے ہوں گے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ کس قسم کا بُت ہے؟"

اور اُس نے ایک چھوٹا سنہری بُت نکال کر میز پر رکھ دیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر غور سے دیکھا۔ دل میں ایک یونہی خیال سا گذرا۔ کیا یہ چان زی دیوتا کا ہی بت تو نہیں۔ پھر میں نے ضبط سے کام لے کر پوچھا:۔

"مگر تم کو یہ کہاں سے دستیاب ہوا؟"

کہنے لگا "آپ کے آنے سے پیشتر ہوٹل میں ایک چینی آکر ٹھہرا تھا۔ اُس کی روانگی کے بعد میں اُس کے کمرہ کو صاف کرنے کے لئے گیا تو اسے پڑا ہوا پایا۔ لیکن موسیو یقین کیجئے آجکل اس کی وجہ سے مجھے عجیب متوحش خواب نظر آتے ہیں۔ کل رات جب میں نے اپنے کمرہ کی کھڑکی کھولی تو دیکھا ایک دراز قد چینی جس کے منڈے سر پر لمبی چوٹی تھی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور پھر خود بخود غائب ہو گیا"۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہا "یہ کوئی خاص قسم کا بت نہیں بلکہ معمولی پیتل کا بنا ہوا ہے۔ لیکن اگر تم اسے فروخت کرنا چاہو تو میں اسے پچیس فرانک کو مول لے سکتا ہوں"۔ چنانچہ رقم جیب میں ڈالنے کے بعد وہ بت مجھے دیکر چلا گیا۔

جب رات کو سیر کے بعد میں واپس آیا تو چان زی دیوتا کا بت بدستور میز پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر شمع کے پاس استادہ پر رکھ دیا۔ میں اس بات کا حلف اُٹھا سکتا ہوں کہ اُس وقت میرے اور سامنے کی دیوار کے درمیان کوئی متنفس نہ تھا۔ دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ ایک دُھندلا سا یہ زمین سے اُٹھ کر میری جانب آ رہا ہے۔ پاس آکر اُس نے واضح صورت اختیار کر لی۔ تو میں نے دیکھا کہ اُس کے منڈے سر پر لمبی چوٹی لٹک رہی ہے اور گول گول پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے۔ اُس کی شکل بالکل اُس چینی سے مشابہ تھی جسے میں نے جہاز پر ریلنگ پکڑ کر چڑھتے دیکھا تھا۔ پھر یلکخت وہ غائب ہو گیا۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو لیکن میں نے روشنی میں دیکھا کہ دیوار کے پاس عین اُس جگہ خون کے چھوٹے چھوٹے قطرے پڑے ہوئے ہیں جہاں وہ چینی نمودار ہوا تھا۔

اُس رات مجھ پر کچھ ایسا خوف اُس بت کی وجہ سے چھایا کہ دوسرے دن لندن پہنچتے ہی میں نے اُسے ایک کباڑیے کی دوکان پر فروخت کر دیا۔ ایک ماہ بعد ایک رات میں ایسٹ اینڈ کے تنگ اور غلیظ بازاروں سے ہوتا ہوا کریم ریل روڈ پر جہاں میں رہا کرتا تھا واپس آ رہا تھا۔ اُس وقت آسمان ابر آلود تھا اور سیاہ بادلوں میں چاند اور تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ لندن کے اس حصہ میں جہاں جرم و معصیت کی بڑی دہشتناک مثالیں ملتی ہیں۔ میں خیالات میں غرق جا رہا تھا کہ سامنے سے آہ فنگ خو ہی چینی وضع کی عجیب و غریب ٹوپی پہنے آتا دکھائی دیا۔ اور مجھے پہچان کر رُک گیا۔ میں نے بھی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر میں نے دیکھا اُس کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ اُس کا رنگ دق کے مریض کی طرح بالکل زرد ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ بالآخر میں نے کہا:۔

"مجھے امید تھی کہ یہاں آپ سے ملاقات ہو گی۔ لیکن آپ کون سے جہاز پر یہاں آئے ہیں؟ کیونکہ میں پتہ لینا چاہتا تھا کہ اُس رات جہاز پر میں نے کسے دیکھا تھا۔ سو میرا خیال ٹھیک نکلا۔

"میں پریزیڈنٹ ولسن پر آیا تھا" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"معاف کیجئے گا" میں نے انتہائی حیرت کے عالم میں کہا "میں بھی جہاز پر ہی آیا ہوں لیکن آپکو میں نے کہیں نہیں دیکھا"۔

مگر میری اس بات کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ ہی اپنے بت کی نسبت کچھ بات کی۔ اور میں نے بھی پیرس میں اُس بت کو خریدنے کا تذکرہ نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے رخصت ہوا۔ تو رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ لندن کے بازاروں ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوٹلوں۔ قہوہ خانوں تھیئٹروں اور دوا فروشوں کے سوا اکثر دوکانیں بند تھیں۔ مگر راستہ بھر آہ فنگ خو کی مرجھائی ہوئی شکل یوں نظر آتی جیسے ہر موڑ پر سے بھاگتی ہوئی میری جانب آ رہی ہے۔

سردی کی شدت کی وجہ سے لندن کی تمام خوبیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ اس لئے میں پانچ چھ روز بعد نیس سے ہوتا ہوا مونٹ کارلو چلا گیا۔ ایک شام میں وہاں ایک سبزہ زار پر بیٹھا ہوا تھا جہاں پام کے پیڑوں کے سایہ میں سدابہار پھولوں کے ہریالے پودوں کے پاس زنگار رنگ کی چھتریوں کے نیچے حسنِ مغرب کے بہترین نمونے مردوں کے دوش بدوش بیٹھے ہوئے تھے۔ یا پیرس کی تتلیاں انگریزی پریوں سے ملی ہوئی محوِ خرام تھیں اور افسانہ و شعر کی اس دنیا میں گرینڈا سپرا کے منتخب سازندے اپنے سکریں نغموں سے راگ اور موسیقی کی جانفزا تانیں اُڑا رہے تھے۔ کہ کسی نے

ایک بازو میرے شانے پر رکھا۔ اور ایک بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی ــــ چونک کر پیچھے مڑا ـــــ تو آہ فنگ خو !

وہ بڑا سراسیمہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے ہونٹ نیلے۔ لب بند اور گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور کلوں کی ہڈیاں باہر نکل رہی تھیں۔ میں حیرت سے تکنے لگا +

"میرے دوست" اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا "خدارا میری مدد کرو۔ میں ابھی ابھی انگلستان سے آپکی تلاش میں آیا ہوں۔ پیرس کے قیام کے دوران میں ہوٹل کے کسی خادم نے میرے بکسوں سے وہ عجیب وغریب مورتی جس کا تذکرہ میں نے بارہا آپ سے کیا تھا۔ ایک نادر شئے سمجھ کر چرالی تھی۔ پہلے تو سرے سے ہی اس کی نسبت وہ اپنی لاعلمی ظاہر کرتا تھا۔ لیکن لالچ اور دباؤ کے اثر سے اُسنے مجھے بتلایا کہ ایک ہندوستانی کے پاس جس کا سامان لندن کے فلاں پتے پر روانہ کیا گیا تھا۔ فروخت کر دیا گیا۔ اُس کے دیئے ہوئے پتہ سے مجھے آپ کا نام ملا ہے اس لئے میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔ اب کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ آپ اسے ازراہ کرم اتنی ہی یا دوگنی قیمت لے کر مجھے واپس کر دیں گے۔ آپ جانتے ہیں میرے لئے یہ موت وحیات کا سوال ہے" +

میں نے کہا "بیشک میرے پاس ایسا ہی بُت فروخت کیا گیا تھا۔ لیکن مجھے علم نہ تھا کہ وہ آپ کا مسروقہ مال ہے۔ اس لئے اُسے معمولی شئے سمجھ کر میں نے لندن میں ایک کباڑیئے کے ہاں فروخت کر دیا تھا" +

اس جواب نے اُس پر صاعقہ کا اثر کیا اور اُس کا رہا سہا رنگ بھی زرد ہو گیا بڑی دیر زمین کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا:۔

"میں ساری عمر آپ کا رہینِ منت رہونگا۔ اگر آپ مجھے اُس کباڑی کی دوکان کا پتہ دیدیں یا خود میرے ہمراہ چلیں" +

چنانچہ دوسرے ہی دن لندن پہنچکر ہم دونوں پلاسیڈن روڈ پر کباڑی کی دکان پر گاڑی سے اُترے۔ وہ تو موجود نہ تھا۔ اُس کا لڑکا کھڑا سامان کو ٹھیک کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا:۔

"آپ کے والد کہاں ہیں؟" اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ شاید میرے سوال نے اُس کے جذبات کو مجروح کیا ہو +

"افسوس دو دن ہوئے وہ مرگئے" لڑکے نے بھرائی [illegible]۔ "اُن کی سفاکانہ موت بڑی دردناک اور حیرت خیز ہوئی ہے [illegible] نہیں آئے گا۔ اُن کی گردن پر سیاہ بالوں کی ایک گندھی ہوئی رسی پیوستہ پائی گئی جس سے اُن کی موت واقع ہوئی" +

یہ سنتے ہی ہم دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ کچھ دیر دوکان میں خاموشی رہی پھر آہ فنگ خو مایوسانہ انداز میں بولا:۔

"آپ کے والد کے انتقال کا ہمیں سخت صدمہ ہے۔ لیکن اُن کے پاس چھوٹا سا ایک پیتل کا بت ہے۔ ہمیں وہ درکار ہے۔ کیا آپ اُسے مہیا کر سکتے ہیں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ آپکی آمد سے ایک روز پیشتر وہ ایک چینی کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا" اس مایوس کن جواب کو سُنکر آہ فنگ خو کی شکل بہت بھیانک بن گئی۔ اور اُس نے یاس آمیز لہجہ میں کہا +

"نہیں نہیں یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے تو سہی کہیں رکھا ہوگا" +

لڑکا طوعاً وکرہاً اُٹھا اور بہت دیر کی دیکھ بھال کے بعد آ کر کہا "جناب من میں افسوس کرتا ہوں۔ وہ چیز واقعی بک چکی" +

چینی نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ الماریوں تصویروں اور اشیاء سے پُر صندوقوں پر ایک مایوسانہ نظر ڈالی۔ پھر افسردگی سے کہنے لگا "آہ معلوم ہوتا ہے۔ اب قسمت یاور نہیں" +

وہاں سے نکلکر اُس سے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے میں ہوٹل میں لوٹ آیا۔ دوسرے دن علی الصبح چاء کے بعد ٹائمز کا تازہ پرچہ اُٹھایا۔ سب سے پہلے جس خبر پر میری نظر پڑی وہ یہ تھی "**ایک چینی کی پُراسرار خودکشی**

کل رات بارہ بجے ایک چینی جس کا نام آہ فنگ خو تھا اپنے مکان واقع ایسا اینڈیا ڈاک روڈ میں مردہ پایا گیا۔ سیاہ بالوں کی ایک رسی اُس کے گلے میں گھپی ہوئی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نامعلوم وجہ سے خودکشی کر کے مرگیا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے اور اُس کا سامان جو چند کپڑوں اور ایک پیتل کے گھنٹے اور ایک سیاہ سفوف کی تھیلی پر مشتمل ہے۔ سکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے حوالہ کر دیا گیا ہے" +

(خاص)

مرزا محمود نظامی

نارنگی کی کلیاں

مشہور ہندوستانی ادیبہ حجاب امتیاز علی کے قلم سے

(۱)

اتنی مدت تو کسی کا عشق پنہاں دل میں تھا
اب سرِ بازار میرے راز کی تشہیر ہے

میری عمر چھ سال کی تھی۔ اُس وقت میرے والد نے مجھے اور میری بوڑھی انا زوناش کو لے کر ایک سمندری سفر کیا تھا۔ دراصل یہی سفر ہمارے اور ہمارے دوست لفٹنٹ کرنل جاذب آئی۔ ایم۔ ایس کے دوستانہ تعلقات کا باعث ہوا۔

ایک خوشگوار صبح میں کھیلتی ہوئی عرشۂ جہاز پر آگئی اور تھوڑی ہی دیر میں بوڑھی انا کی غفلت کہئے یا شدنی امر کہ سمندر کے تھپیڑوں میں میرا نازک اور ننھا سا جسم تڑپتا ہوا نظر آیا۔ اللہ! عجب وقت تھا!

مجھے آجتک اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت ایک خوشرو نوجوان نے جس کی عمر تقریباً بتیس سال ہوگی۔ بڑے جان جوکھوں کا کام کیا تھا۔ یعنے بڑی دلیری سے سمندر کی بے پناہ موجوں میں کود کر مجھے ظالم موت کی سرد اور ڈراؤنی آغوش سے زبردستی نکال لیا۔ میں بیہوش ہوگئی تھی۔ بڑی دیر بعد جب مجھے ہوش آیا۔ تو ایک طرف میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ جو قریب ہی اک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھے مجھے تک رہے تھے۔ دوسری طرف میرا وہی محسن کھڑا مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا جس نے میری جان بچائی تھی۔ انا زوناش میرے لئے دودھ لئے قریب آگئی۔ اور دودھ کا کٹورا میری طرف بڑھا کر کہا:۔

"جانِ من! کچھ پی لو"

میں نے کٹورا ہٹا دیا۔ والد سے سوال کیا "یہ کون صاحب ہیں؟"

میرے والد نے مسکرا کر تشکر آمیز لہجہ میں ان سے تعارف کرایا: "ننھی پیاری! یہ تمہارے محسن لفٹنٹ کرنل جاذب آئی۔ ایم۔ ایس ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرو"

اُس زمانہ میں میری حیثیت ایک چھوٹے سے کیڑے کی تھی۔ کیونکہ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اظہار تشکر کے کیا طریق ہوتے ہیں۔ میں نے زوناش سے ان صاحب کا شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ مگر بوڑھی انا نے مسکرا کر کہا کہ یہ کام میرا ہے۔ اُس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں اُٹھی اور اپنے محسن سے لپٹ گئی۔ اُس زمانہ میں میرے خیال میں یہ بہترین اظہار تشکر تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ ہر شخص اپنے محسن کا شکریہ اُس سے ایک دفعہ بغلگیر ہو کر ادا کرتا ہے ✦

(۲)

آج اُس واقعہ کو گیارہ بارہ سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ مگر میرے ننھے دل میں اپنے محسن کی قدر ابتک اُسی جوش و خروش کے ساتھ موجود ہے جیسے پہلے لمحے میں تھی ✦

جس شہر میں میں اور میرے والد رہتے تھے۔ اُسی شہر میں کرنل جاذب بھی کئی سال سے رہتے تھے اور رفتہ رفتہ ہمارے خاندانی طبیب بن گئے تھے۔ اور نہ صرف طبیب بلکہ میرے اور میرے والد کے دلی دوست اور رفیق تھے ✦

اگرچہ میں کرنل جاذب کو اپنا بزرگ تصور کرتی تھی۔ پر ہماری بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات باتوں باتوں میں ہم ہم سنوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑ پڑتے تھے۔ پھر جلد ہی ملاپ بھی ہو جاتا تھا۔ وہ جتنے خوش مزاج، خوش مذاق، اور ظریف الطبع ہیں۔ اُتنے ہی مہربان اور رحمدل بھی ✦

مجھے جہانتک علم تھا۔ اُن کی کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یا کم از کم میں نے ان کے ساتھ کبھی کسی خاتون رفیق کو نہیں دیکھا تھا۔ آج سے گیارہ بارہ سال قبل جب میں نے اُنہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اُس وقت بھی وہ اکیلے تھے۔ اور اب بھی وہ تنہا ہی رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے مزید اطمینان کے لئے اُن سے پوچھا بھی "کہ کرنل! آپ کی بیوی نہیں ہیں؟" تو کہنے لگے "نہیں ہیں!"

"کیوں نہیں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

بے ساختہ ہنس کر کہنے لگے "کوئی نہیں ملی" ✦

میں یہ سُنکر خاموش ہوگئی - اُن کی تنہائی پر اکثر میں متاسف ہوا کرتی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ وہ خود مجرد زندگی کو پسند کرتے تھے - سمندر کے کنارے ایک شاندار وسیع نیلے بنگلے میں شریفانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے - وہ سوسائٹی سے از بس متنفر تھے - مگر ہفتہ میں ایک دفعہ شہر کے یورپین ملٹری کلب کو بہ حیثیت ممبر انہیں جانا ہی پڑتا تھا!

(۳)

برسات کے دن تھے - اکثر گھٹا اُٹھتی تھی اور زور کی بارش ہوا کرتی تھی، ایک دن شام کے وقت میں کالج سے بھیگ کر گھر آئی - سردیوں کے دن تھے - راستے میں مجھے سمندری ہوا لگی - گھر پہنچتے پہنچتے طبیعت بگڑ گئی - اور خفیف بخار محسوس ہوا - میں نے زوناشس کو قہوہ لانے کے لئے کہا اور کرنل جاذب کو ٹیلی فون کرکے بستر پر لیٹ گئی - اُس شام میرے والد کلب کے ایک ممبر کے ہمراہ گھوڑ دوڑ میں گئے تھے - اس لئے میں تنہا اپنے کمرے میں پڑی گھبرا رہی تھی - بخار سے آنکھیں جل رہی تھیں اور ڈاکٹر جاذب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی +

میں سچ کہتی ہوں' ایک مُحب کے لئے اپنے محبوب کا چہرہ اتنا جاں نواز' اسقدر روح پرور نہ ہوتا ہوگا' جتنا ایک مریض کے لئے حالت مرض میں اپنے طبیب کا!!!

خدا خدا کرکے دروازہ کھلا - اور کرنل جاذب مُسکراتے ہوئے ہاتھ میں آلۂ سینہ بین لئے اندر داخل ہوئے - اُنہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی - بستر پر اُٹھ بیٹھی +

"میری چھوٹی دوست! تم کو کیا ہوگیا ہے؟" اُنہوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں مجھے مخاطب کیا +

"بخار" میں نے جواب دیا +

اُنہوں نے یہ سُنکر اپنی تین سفید انگلیاں میری نبض پر رکھدیں مسکرا کر کہنے لگے :- "آج شاید کھٹی کھٹی نارنگیاں کھائی ہیں - اسی کا یہ سبب ہے" +

میں چڑ گئی "میں نے نارنگیاں نہیں کھائیں - آپ کو بھی مذاق اچھے وقت سوجھتا ہے کرنل - آخر نارنگیوں کا کیوں خیال آیا آپ کو؟ زوناش نے آج دوپہر گلدان میں نارنگی کی چند کلیاں سنواری تھیں - شاید اسی کی بو آرہی ہے"

"کہاں سے؟" کرنل صاحب نے عجب بے باکی سے سوال کیا "وہ گلدان کہاں ہے؟"

"کیوں؟" میں نے متحیر ہوکر پوچھا +

"نارنگی کی کلیاں کہاں ہیں!" اُنہوں نے ادھر ادھر [illegible] پریشان لہجہ میں پوچھا +

میں حیران ہوکر بولی "بھلا اس میں پوچھنے کی کونسی بات ہے؟ تیز بو کمرے میں بھر گئی ہے! کیسی اچھی بو ہے! وہ دیکھئے ــــــ دریچے کے پاس گلدان میں" +

کرنل صاحب نے مڑ کر دیکھا' اور پھر ایک عجیب لہجے میں بولے "خداوندا! انہیں نکال پھینکو' نکال پھینکو - میں انہیں برداشت نہیں کرسکتا!"

اُنہوں نے باغ کی طرف چہرہ پھیر لیا - ایک دریچے کے آگے کوچ پر بیٹھ گئے - ان کی سفید پیشانی پر دریچے میں سے ہوکر ایک قسم کی اودی روشنی ناچ رہی تھی - وہ مصر کی کسی قدیم ممی کی طرح ساکت بیٹھے دریچے کو گھور رہے تھے +

میں ڈر گئی ــــــ اللہ! سفید ہوگئی! ویسے میں کچھ زیادہ مضبوط دل کی عورت نہیں ہوں - وہ تو بھلا ہوا کہ اسی وقت زوناشس قہوہ لئے اندر آگئی - ورنہ میں مارے دہشت کے چیخ مار کر کمرے سے باہر بھاگ جاتی!

کرنل نے التجا کے پیرایہ میں دوبارہ کہا "روحی! ان پھولوں کو دریچے سے باہر پھینکدو" +

"پیارے کرنل! کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا +

"پہلے انہیں باہر پھینکدو" +

زوناشس نے میرے کہنے پر گلدان خالی کیا - تب کہیں جاکر ہمارے ڈاکٹر صاحب سنبھلے - بخار تو ایک طرف رہا - اب ڈاکٹر صاحب کی بیماری بڑھ گئی - ابتک میری سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی +

آخر میں نے پوچھا "کیا ہوگیا تھا!؟"

کرنل جاذب ابتک ہانپ رہے تھے - اُن کی صورت درندوں کی سی ہو رہی تھی - میرے اصرار پر کہنے لگے :-

"بچی! مجھ سے اس کے متعلق کچھ نہ پوچھو! میں واقعی اک جانور بن گیا تھا"

"جانور نہیں" میں کہنے لگی "بلکہ ایک پُر اسرار دلچسپ روح! بھلا جانوروں کی زندگیوں میں ایسے پُر اسرار واقعات بھی ہوتے ہیں!"

"تم افسانہ نگاروں کو اور آتا کیا ہے؟" اُنہوں نے سگار سلگا لیا اور اُس کے دھوئیں کو متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے "اپنے دوستوں' واقفکاروں ملاقاتیوں کی زندگی کو قصہ بنا کر پبلک کے آگے پیش کرنا - تم لوگوں کا محبوب فعل

زندگی ہے۔ مگر روحی! اس وقت یہ مت پوچھو۔ اس ذکر کو چھوڑو (چھوٹی سی آہ بھر کر) گذاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں انہیں کی یاد میری زندگی ہے!"

یہ کہتے ہوئے اُن کا چہرہ بے حد اداس اور سفید ہوگیا۔ انہوں نے پھر ایک دفعہ گلدان کو دیکھ کر کہا:۔

"خالی کردیا تم نے؟"

"ہاں"———— میں نے جواب دیا "کرنل! آپ کیا نارنگی کی کلیوں سے ڈرتے ہیں؟"

"ڈر؟ ہاں ذرا وحشت ہوتی ہے" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے سگار سے راکھ جدا کی +

"آخر کیا بات ہے؟ وحشت کیوں ہوتی ہے؟"

وہ تنگ آکر کہنے لگے "تمہیں اس قدر اصرار کیوں ہے؟ اس میں کسی قسم کا راز یا افسانہ نہیں ہے۔ میری بچی! تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ جھینگر سے خوف کھاتے ہیں۔ دور کیوں جاؤ۔ تمہارے پروفیسر صاحب مکڑی سے کانپ جاتے ہیں۔ بعض سانپ سے ڈرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح نارنگی کے پھولوں سے میں خوف کھاتا ہوں +"

"تعجب بالعجب"

میں رات بھر اس پُراسرار "المیہ لیلوی" واقعہ پر غور کرتی رہی پر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ اور ذرا خیال تو کیجئے کہ بھلا مجھ جیسی عورت جس کی تمام زندگی افسانہ نویسی اور شعر و شاعری میں گذر رہی ہو۔ کیونکر اس افسانوی واقعہ کو فراموش کرسکتی ہے!

بخار کم ہوگیا تھا، اور خیال سرزمین خواب کی طرف گھومنے چلا گیا تھا۔ رات تاریک تھی، پُرسنسان! میں نے الماری سے ٹھیکرے کی ایک شگفتہ مضمون والی کتاب نکالی۔ اور رات بھر لیٹی لیٹی پڑھتی رہی +

(۴)

کالج میں چھ دن کی تعطیل تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ میں برآمدے میں ایک کرسی پر دھوپ میں بیٹھی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ تعطیلات کس شغل میں بسر کروں۔ والد اپنے کسی دوست کے ہمراہ شکار کو گئے ہوئے تھے۔ مگر آپ جانئے مجھ جیسی خواب و خیال کی شیدائی رحمدل عورت کو شکار جیسے موذی مشغلے سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ میں نے انکار کردیا تھا۔ اور گھر پر تنہا تھی +

لفٹننٹ کرنل جاذب کوئی دو ہفتوں سے "اودے پہاڑوں" پر گئے ہوئے تھے۔ میری خواہش تھی کہ چھ دن کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤں۔ اتنے میں زوناش نے ایک تار پیش کیا۔ میں نے کھولا تو دیکھا کہ کرنل کا ہے "دل را بہ دل راہیست" سمجھ کر میں خوب مسکرائی۔ وہ مجھے دعوت دے رہے تھے +

"آج شب یہاں ہملیٹ کھیلا جا رہا ہے۔ تم ضرور آؤ۔ جاذب"

ہملیٹ!———— وہ عجیب و غریب جادو نگار کھیل، جس نے ایک شاعر کو اسقدر مقبول و محبوب بنا دیا کہ وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا! ایسے کھیل کو نہ دیکھنا کفران نعمت ہے!

یہ سوچتے ہوئے میں نے وقت دیکھا۔ دس بجکر پچیس منٹ ہو گئے تھے۔ اور میرے لئے کافی وقت تھا۔ کیونکہ "اودے پہاڑوں" کی ایکسپرس بارہ بجے نکلنے والی تھی +

ساڑھے چار گھنٹوں کا سفر تھا +

(۵)

جب میں کرنل جاذب کے گھر پہنچی تو ایک بڑا سا ستارہ مجھے بادلوں میں سے جھانک رہا تھا۔ موسم بہت سرد تھا۔ اور ہوا تیز چل رہی تھی۔ پورے گاؤں میں دھواں سا نظر آرہا تھا۔ کرنل جاذب اپنے مختصر سے دار المطالعہ میں بیٹھے ایک مبتی ماہانہ رسالہ دیکھ رہے تھے +

مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "مجھے تمہارے آنے کی مطلق امید نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم بوڑھے دوست کی دعوت قبول نہ کروگی! مجھے خبر ہوتی تو میں خود اسٹیشن پر موجود ہوتا" +

مجھے ہنسی آگئی" اور میں کیا اندھی ہوں؟ کہ تمہارے گھر تک نہ پہنچ سکوں!"

(۶)

او مالک! میں اُس عجیب و غریب رات کو کبھی نہ بھولونگی! اپنی زندگی بھر نہ بھولونگی۔ بات اصل یہ ہوئی اُس شب مجھے کہانی لکھنے کے لئے بہت سا مضمون مل گیا! ایسے موقعے عموماً کہاں نصیب ہوتے ہیں!

کھیل کے اختتام پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جو افسانے سے بھی زیادہ عجیب معلوم ہوتا ہے! میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے! الٰہی تیری پناہ!

اُس شب لوگوں کی غیر معمولی آمد و رفت تھی۔ میں اور کرنل صاحب ہال کے ایک دروازے سے انسانی تنفس کے جھونکوں سے بمشکل بچکر نکل رہے تھے کہ دفعتاً ایک خاتون جو بظاہر ایک نئی دُلہن معلوم ہوتی تھیں۔ سینے پر نارنگی کی

کلیوں کا گچھا سنوارے ہمارے قریب سے گذریں۔ ان خاتون کا گذرنا ہی تھا کہ کرنل کے چہرے کا رنگ برف کی مانند سفید ہوگیا اور ایک عجب اضطراب کی حالت میں اُس نے اپنے ہاتھ اِدھر اُدھر پھینکنے شروع کئے +

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے چھو کر دیکھا تو یخ کی مانند سرد تھے۔ اور کسیقدر کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بے اختیار چیخ اُٹھے +

"آہ معبود! وہ نارنگی کے پھول ——— یہاں بھی موجود ہیں!

مجھے برانڈی سے مذہبی کراہیت ہے! مگر اس موقع پر میں نے تھوڑی سی کرنل کے لئے منگائی۔ تھوڑی دیر بعد اُن کی حالت کچھ سنبھلی۔ مگر قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں باہر آگئے۔ سردی خوب تھی۔ شہر میں سب دھواں دھواں سا نظر آرہا تھا۔ سڑکیں شبنم کے پردوں میں غائب ہوگئی تھیں۔ خیر یہ سب مجبوریاں ایک طرف تھیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے اب خود کرنل صاحب سے ڈر لگتا تھا۔ آہ! کرنل دراصل کہیں شیطان تو نہیں! بھوت تو نہ ہوگا! کیا عجب کوئی بدروح ہوگی! جو مجھے دھوکہ دے رہی ہے!

وہ شب مجھے کبھی نہ بھولے گی! گھر پہنچ کر ڈاکٹر نے مجھ سے کہا "پیاری بی بی! تم جنوبی طرف کے کمرے میں سو رہو۔ میں آج رات مطالعہ میں گذاروں گی۔ طبیعت بے چین ہے اور دماغ بہت تھکا ہوا"۔

خادمہ نے موم بتی میرے ہاتھ میں دیدی اور میں ڈاکٹر کے بتائے ہوئے کمرے میں چپ چاپ سو رہی +

(۷)

دوسری صبح گرم اور خوشگوار تھی +

ناشتے کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب اپنے ایک نفیس عنابی فلالین میں کھڑے تھے اور مسکرا رہے تھے "آداب روحی! مزاج شریف"

"اور آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

کرنل نے مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر کہا "بہت اچھا رات مریضا پڑھتا رہا۔ مگر پانچ بجے سو گیا تھا۔ ہوا بہت تیز اور سرد چل رہی تھی"!

"مگر مجھے تو نیند نہیں آئی" میں نے کہا +

"کیوں!"

"کیونکہ رات کے واقعات نے میرے خیالات کو پراگندہ کردیا تھا۔ بھلا کیونکر سو سکتی تھی!"

کرنل پہلے ایک دلفریبی کے انداز میں مسکرا کر کہا "میں اپنے راز اپنے دوستوں پر ظاہر کرنے کا عادی نہیں۔ سقراط کہتا ہے کہ جب تمہارا راز تمہارے سینے میں نہیں سما سکتا تو دوسرے کے سینے میں کیونکر سمائے گا؟"

میں ذرا کھسیانی ہوکر بولی "ٹھیک ہے! تم بہت اچھا کرتے ہو کہ اپنا راز کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ مگر تم نے یونانیوں کے چشم و چراغ دیاس کا وہ قول بھی سنا ہے؟ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "ہر کس و ناکس کو اپنا رازدار نہ بناؤ"۔ اس سے دیاس کا یہی مطلب تھا کہ سوائے اپنے نہایت محبوب و معتبر دوست کے کسی غیر پر اپنا راز افشا نہ کرو۔ اس کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ اپنا راز اپنی قبر میں لیجاؤ۔ بھلا کرنل! دوست دنیا میں پھر کس مرض کی دوا ہیں؟"

اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "روحی! معلوم ہوتا ہے وہ وقت قریب آگیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے عظیم الشان راز کو افشا کردوں۔ میں نے آج تک اس کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ مگر اس وقت مناسب یہی معلوم ہوا ہے کہ اپنے قصۂ حیات کو تمہارے آگے من و عن بیان کردوں ؎

یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سُنو!
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سُنو!"

"زہے نصیب" میں نے کہا +

وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا بولا: "مگر یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ چلو ہم دوپہر کے کھانے تک باغیچے میں بیٹھیں" +

باغ میں سرور آگیں ہوائیں چل رہی تھیں۔ زیتون کے درختوں پر سُرخ چونچ والے پرند گیت گا رہے تھے +

ہم دونوں باغ کی ایک چھوٹی سی دیوار کے قریب ایک بانس کی کوچ پر بیٹھ گئے۔ کرنل نے ایک سگریٹ سُلگایا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا:۔

(۸)

"میں یہ نہیں جانتا کہ عورتیں محبت میں صادق القول ہوتی ہیں یا نہیں ——! مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ محبت کے متعلق عورتوں کے کیا خیالات ہوتے ہیں! میں جانتا ہوں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عورتیں جب کسی سے ——— کسی خوش قسمت سے واقعی محبت کرنے لگتی ہیں۔ تو وہ کائنات کو ایک جزیرۂ عشق خیال کرنے لگتی ہیں۔ اور اگرچہ وہ خود نہایت کمزور ہوتی ہیں۔ مگر ان کی محبت کی طاقت کا مقابلہ، خدا اگر مجھے معاف کرے، تو میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ الوہیت کی قوت بھی نہیں کرسکتی!

ایک زاہد خشک کی زبانی ان غیر مشتبہ الفاظ کو سن کر میں تو ششدر رہ گئی +

"کرنل! تم نے کیا اپنی عمر میں کسی عورت سے محبت کی ہے؟"

وہ ایک مغرور مسکراہٹ سے کہنے لگا "ہاں! اور نہ صرف میں نے کی ہے بلکہ ایک عورت کی طرف سے چاہا جا چکا ہوں +

یہ سنکر میں نے کرنل پر ایک نقادانہ نگاہ ڈالی۔ واقعی وہ اپنی جوانی میں ضرور قابلِ محبت ہوگا۔ اب بھی اُس کی حرکات سے ایک دلکشی ٹپکتی تھی شکل و صورت بھی بُری نہیں تھی۔ چھوٹی چھوٹی گہری نیلی آنکھیں مختصر سی سنہری مونچھ دراز قد اور سڈول جسم +

اُس نے پھر کہنا شروع کیا: "مجھے وہ رات کبھی نہ بھولے گی! آج کو پچیس سال قبل کا واقعہ ہے ——— میں ستمبر کی ایک دھندلی شام اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھا اپنی ہمی درسی کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ماہ کے اختتام پر میرا امتحان تھا۔ میں مکان میں تنہا تھا کیونکہ میرا بھائی زرتاش تجارتی سلسلے میں بصرہ اور بغداد کی طرف گیا ہوا تھا۔ دفعتاً کسی نے باہر اطلاعی گھنٹی بجائی۔ میں باہر نکل آیا۔ میرا بھائی موٹر سے اُتر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان خاتون سیاہ برقعہ اوڑھے کھڑی تھی۔ ایک خاتون کو ساتھ دیکھ کر میں متحیر ضرور ہوا۔ مگر کسی قسم کا اظہار کئے بغیر زرتاش کے پاس چلا گیا۔ میرے بھائی نے مجھے بغور دیکھا پھر یہ کہتے ہوئے:-

"یہ میرا چھوٹا بھائی جاذب ہے" +

مجھے اس نوجوان خاتون کے آگے پیش کیا۔ پھر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میرے بھائی نے مجھ سے کہا:-

"یہ تمہاری بھاوج ہیں"

نوجوان خاتون نے سر جھکا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ رسم تعارف کے ادا ہوتے ہی اُس خاتون نے نقاب اُلٹ دیا۔ میں نے کبھی اسقدر پیارا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ مشرقیوں کا حسن تھا۔ سرخ و سفید چہرہ ایشیائی حسن سے معمور۔ سیاہ آنکھیں سیاہ چمکیلے لمبے لمبے بال چھوٹا سا قد۔ اور شریف مسلم خواتین کی سی فطری شرم و حیا بظاہر کوئی عربی لڑکی معلوم ہوتی تھی +

میں نے حیران ہو کر اپنے بھائی کو دیکھا۔ اور میری زبان سے بے ساختہ

"بھائی صاحب! آپ نے کیا پردیس میں شادی کر لی ہے؟"

میرا بھائی ایک بہت ہی خشک مزاج آدمی تھا۔ اُس نے میرے سوال جواب میں صرف "ہاں" کہا اور اُس خاتون کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلا گیا +

(۹)

دن گذرتے جاتے تھے۔ میرا بھائی تجارتی سلسلے میں اکثر سفر پر رہا کرتا تھا اور میرا بہت سا وقت میڈیکل کالج میں گذر جاتا تھا۔ میری نوجوان بھاوج کو مکان پر تنہا رہنا پڑتا تھا۔

ایک شام سات بجے کے قریب میں کالج سے تھکا ماندہ واپس آیا جونہی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا۔ میری نظر میز کی طرف پڑی جہاں میری کمسن بھاوج بیٹھی (شاید) کچھ لکھ رہی تھی۔ غالباً اُسے میرے آنے کا علم نہ تھا۔ اس کو اپنے کمرے میں دیکھ کر مجھے کسقدر حیرت ہوئی +

آج عمر میں پہلی دفعہ میں نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ وہ کچھ حد سے زیادہ حسین و جمیل نظر آ رہی تھی۔ پیازی رنگت کا لباس پہن رکھا تھا۔ سیاہ ریشم کے رومال سے سر لپٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چہلقدمی سے واپس آئی ہے۔ کانوں میں موتی کے آویزے تھے! آج زندگی میں پہلی دفعہ مجھے ایک عورت کی دلکشی کا احساس ہوا۔ اور اسقدر کہ اثر میرے قلب پر ہوا کہ میں اس زاہد فریب منظر کو چھوڑ کر تنہائی پسند نہ کرتا تھا۔ دو لمحے میں اسی حالت میں کھڑا رہا۔ عالمِ بے اختیاری میں میں نے زور سے اپنا ہاتھ میز پر رکھا۔ وہ چونک پڑی۔ اور کاغذ اُس کے ہاتھوں سے نکل کر نیچے جا پڑا +

"اُس کو اُٹھا لاؤ" اُس نے بلبل کے سے لہجے میں کہا۔ اُس کی آواز میں کسی قسم کی جھجک یا شرم مطلق نہ تھی +

میں مقناطیسی پتلے کی طرح فوراً تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گیا۔ اور کاغذ لے کر اُس کی طرف گیا" +

اتنا کہہ کر کرنل نے چونک کر میری طرف دیکھا "ایں روحی! یہ کیا! کیا میری زندگی کا فسانہ لکھ رہی ہو؟"

میں مجرموں کی طرح کرنل جاذب کی طرف دیکھنے لگی +

قصہ پھر شروع ہو گیا +

"مگر اُس نے وہ کاغذ نہیں لیا۔ کہنے لگی "جاذب! یہ تو تمہارے ہی لئے لکھا گیا ہے۔ اس لئے مجھے واپس نہ کرو" ——— ! وہ عربی زبان میں تقریر کر رہی تھی۔ اور میں عربی کچھ کچھ سمجھ سکتا تھا۔ روحی! پہلی مرتبہ اس لڑکی کی زبان سے اپنا نام سنکر مجھے واللہ بڑا پیار آیا۔ میں نے کاغذ کو دیکھا جس پر میرا نام تین دفعہ نہایت خوبصورت حروف میں لکھا ہوا تھا

جاذب، جاذب، جاذب

میں مبہوت رہ گیا میرے جسم سے اک گرم بھاپ نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس وقت کی دلی کیفیات کو میں الفاظ میں ظاہر

روحی! کمرے کی ہر چیز ارگن معلوم ہوتی تھی جس سے دلچسپ اور محبت آمیز راگ نکل رہے ہوں۔ میں نے اس جاں بخش تحریر کو دوبارہ دیکھا، میری پیاری روحی! تم یقین کرو، میں شدت مسرت سے پاگل ہو رہا تھا۔ میری زندگی میں پہلی دفعہ ایک عورت مجھ سے اظہار محبت کر رہی تھی۔ تم عشق و محبت کی چاشنی کو کیا جان سکو گی تم اس کو جیسے ناواقف ہو۔ بھلا کسی نے تم سے کبھی اظہار محبت و شوق کیا بھی ہے؟ ——— ننھی لڑکی! ع

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں!

ناولوں میں اکثر مجھے عشقیہ گفتگو پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ سینما کے پردوں پر میں نے بہت سی شوق محبت میں ڈوبی ہوئی حرکتیں دیکھی تھیں، پر مجھے کبھی زبانی سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "اوہ! یہ لڑکی ——— یہ کمسن سیاہ چشم لڑکی! ہاں یہ میری بھاوج مجھ سے محبت کرتی ہے ——— "محبت" وہی ——— عطیہ الٰہی جو آدم و حوا کو نیچر نے عطا کیا تھا! آج وہی مجھے ملنے والا تھا! اے خوش بخت! ——— کیا اسے زرتاش سے محبت نہیں ہے! مجھے زرتاش پر ترجیح دے رہی ہے! مجھے! ——— زہے نصیب! زہے نصیب میرے! بے شک! کوئی وجہ نہیں کہ دنیا میں خوبصورتی اور مسرت میرے بھائی کے حصہ میں آئے۔ اور میں اس سے محروم کر دیا جاؤں! میں دور شوق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اور حسین شیریں کے لئے ایک دریائے محبت میرے سینے میں موجزن تھا +

کمرہ تاریک پڑا تھا۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ چاند کھجور کی سبز اور نازک ٹہنیوں پر مسکرا رہا تھا۔ اور میں کمرے میں تنہا تھا۔ وہ باہر چلی گئی تھی ——— شیریں! میری سجدہ گاہ آرزو، میری مرکز زندگی، میری پیاری شیریں باہر چلی گئی تھی! کمرے سے باہر!

اب ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ واللہ کیا دن تھے! نئے نئے ولولے نئے نئے خیالات میرے دماغ کو ہیجان کر رہے تھے +

شیریں! راحت جاں شیریں! کتنا ہوا میں دروازے تک بھاگا۔ خدا جانے میں شدت وحشت میں کیا کر گذرتا! اچانک مجھے یاد آ گیا کہ شیریں میری قابل تعظیم بھاوج ہے!

میں ایک ستون کا سہارا لئے کھڑا ہو گیا۔ دل سے کہنے لگا "واہیات! محض واہیات! شیریں میری بہن ہے، میری بھاوج ہے! میرے بڑے بھائی کی بیوی! اس لئے اس کی تنظیم و تکریم مجھ پر فرض ہے۔ سنتا ہوں عورتیں اکثر ہسٹریا کا شکار ہو جایا کرتی ہیں اور اس مرض میں مبتلا ہو کر جنونی حرکات کا مرتکب ہوتی ہیں +

میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جیب میں سے وہ جاں بخش تحریر نکالی۔ چراغ کی روشنی میں پڑھنے لگا۔ مسکراہٹ بے اختیار میرے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ بے چینی بڑھی۔ آہ سچ ہے ع

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!"

بے قراری لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ میں باغ کے دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ سامنے چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ میرے دل، میری روح سے اک آواز آ رہی تھی، ایک نغمہ نکل رہا تھا اور وہ نغمہ یہ تھا "اگر واقعی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے ——— کر رہی ہے ——— کرنے پر مجبور ہے، تو انکار میرے بس کی بات نہیں!"

اسی سوچ و فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے میرا شانہ چھوا۔ اور نرم و نازک ارغنوں کی سی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا

"تم اسقدر حیران کیوں ہو؟"

میں نے مڑ کر دیکھا تو راحت جاں شیریں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ چاند کی زرد روشنی میں اس نازنین عورت کا سفید اور دلربا چہرہ اسقدر محبوب اور خوبصورت نظر آ رہا تھا کہ اگر اس وقت دنیا کی ساری عورتیں بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتیں تو میں متوجہ نہ ہوتا۔ خدایا! کیا واقعی یہ زہد فریب عورت مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا بھولپن اور فرشتوں کی سی سادگی برس رہی تھی +

"میری پیاری شیریں! ———"

بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ وہ بغور میرے چہرے اور میری حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ اور میں ——— کبھی بے تاب، کبھی بے قرار ہو ہو کر اس پر گرنا چاہتا تھا۔ اور پھر سنبھل جاتا تھا +

یکایک کسی خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے شیریں کی طرف دیکھا! ——— وہ میرے بھائی کا خیال تھا۔ بیساختہ میری زبان سے نکلا "میری بھاوج!"

"بھاوج! ——— !" اس نے حقارت کے لہجہ میں کہا "بھاوج! تمہاری بھاوج! بھلا ایک غیر شادی شدہ عورت کسی کی بھاوج کیونکر ہو سکتی ہے! مرد واقعی بڑے کم فہم ہوتے ہیں!"

تو یوں کہئے! یہ ہمارے بھائی صاحب کی کارستانی تھی! یہ ان کی بیوی

نہیں! تو یوں کہئیے 'یہ ہماری بھاوج نہیں ——' ! یہ سوچ کر میں نے مڑ کر شیریں سے ایک سوال کیا۔

"تو کیا تمہیں میرے بھائی سے محبت نہیں ہے؟"

پر آہ —— وہ کمرہ سے باہر جا چکی تھی۔ میری شیریں مجھے میرے تمام ہم جنسوں کو کم فہم بنا کر باہر جا چکی تھی۔

میں دیوانہ وار یہ گاتا ہوا شیریں کے پاس چلا ؎

تم سے کچھ کہنے کی خواہش ہے مری خاطر نشیں
آہ لیکن کیا، مجھے خود بھی خبر اس کی نہیں
اور اگر تم اتفاقاً پوچھ لو مجھ سے کہیں
تو فقط اتنا کہوں گا "تم سے الفت ہے مجھے"
اضطرابِ شوق میں اک خط نہیں لکھوں اگر
اور اس میں لکھ بھی اپنا دل کے سوز دوں اگر
تم پہ ظاہر کر بھی دوں جذباتِ گوناگوں اگر
تو یہ مطلب ہوگا "بے حد ہی محبت ہے مجھے!"
میں کبھی آمادہ ہوتا ہوں جو گانے کے لئے
یعنی اپنا رازِ دل تم کو سنانے کے لئے
تو یہی دو لفظ ہیں میرے ترانے کے لئے
"تم سے راحت ہے مجھے، تم سے مسرت ہے مجھے!"

(لانگ فیلو) کی اس نظم کو میں عالمِ بیخودی میں چیخ چیخ کر گا رہا تھا۔ دنیا کی ہر چیز مجھے عشق و محبت کے فسانے سنا رہی تھی۔

اللہ! کیا دن تھے! کیا راتیں تھیں!

(۵)

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کے بعد میرے اور میرے بھائی کے آپس میں کیسے تعلقات رہے!

ہم آپس میں ایک دوسرے سے بہت کم ملنے لگے۔ اتفاقیہ صورت پیدا ہو جب کھانے پر اکٹھے ہوتے تو مجبوراً دو ایک لفظ ہماری زبان سے نکلتے ورنہ ہر وقت مکان پر ایک سکوتِ مطلق چھایا ہوا رہتا۔ سوائے اس کے کہ شیریں اکثر شام کے وقت پیانو پر عربی شعرا کی غزلیں بجا کر گایا کرتی۔ جس کو میرا بھائی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا۔ اور میں اپنی جگہ اس سے لطف اندوز ہوتا۔ میرے بھائی کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔

ایک دن شام کے وقت میرا بھائی بالاخانہ سے نیچے اتر رہا تھا۔ اور میں اوپر جا رہا تھا۔ دفعتاً دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ زینے پر کھڑا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے میں بھی کھڑا ہوگیا۔

"جاذب! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم کہیں اپنی رہائش کا علیحدہ انتظام کر لو۔ خدا اب تم جوان ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں تمہاری تعلیم و تربیت کے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔"

میں نے مستعد لہجہ میں جواب دیا:- "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں انشاء اللہ کل ہی اس کا انتظام کر لونگا"

"بہتر ہے" یہ کہہ کر میرا بھائی نیچے چلا گیا۔

میں اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچتا ہوا اوپر چلا آیا۔ بالاخانے کے برآمدے کی دیوار پر کہنیاں ٹکا کر نیچے باغیچے کے شگفتہ پھولوں کو دیکھنے لگا۔ وہ بڑی خوشگوار شام تھی۔ دسمبر کے مہینے کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا میں ارغنوں کا سا نغمہ تھا۔ سنہرے پرند آسمان پر گیت گا رہے تھے اور باغ پر سورج خوب چمک رہا تھا۔

شیریں کی مفارقت میرے لئے موت سے بدتر تھی۔ آہ! میں کیونکر اس کو چھوڑ جاؤں! اللہ یہ محبت بھی کیسی عجیب چیز ہے کتنی پاکیزہ! مگر کس قدر جان لیوا اور تکلیف دہ!

ابھی میں فلسفۂ محبت پر غور کر ہی رہا تھا کہ کسی کی گرفت نے مجھے چونکا دیا۔ دو ہاتھ میری گردن میں حائل تھے مڑ کر دیکھا تو شیریں!

وہ ایک سفید رومال سے آنکھ پونچھ رہی تھی۔ میں نے انتہائی محبت کے لہجہ میں اس سے پوچھا:-

"یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

اس نے دھیمی آواز میں بتایا "رو رہی ہوں"

"روتی کیوں ہے؟" میں نے اس طرح جیسے کوئی اپنی پالتو بلی سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس سے باتیں شروع کیں "کیا ہوگیا میری شیریں کو؟"

وہ کہنے لگی "جاذب! میں یہاں نہیں رہ سکتی! میں تمہارے بھائی کے ساتھ نہیں رہ سکتی"

"کیوں نہیں رہ سکتی؟" میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر کہنے لگا:- "شیریں! تمہیں معلوم ہے کہ میں کل تم سے جدا ہو جاؤنگا؟"

"نہیں مجھے اس کی خبر نہیں! کیونکر جدا ہوگے؟"

میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا:- "علیحدگی! میں ہوٹل میں جا رہونگا۔ رہائش

کی یہی خواہش ہے +

"تو اس میں جدائی کا کیا ذکر ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلونگی! جاذب! تمہارے بھائی ایک نہایت سفاک آدمی ہیں۔ تم جانتے ہو گے گذشتہ شب انہوں نے مجھ سے کیسی سخت کلامی کی تھی! ایک سخت کلام بے پرواہ مرد ایک عورت کے ساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا!"

مگر میں تو کسی اور مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چیخ اٹھا "میرے ساتھ!" میرا سانس پھول گیا "تم میرے ساتھ چلوگی؟ شیریں! تم میرے ہمراہ آنے پر رضامند ہو ۔۔۔۔ ؟ مگر ۔۔۔۔ زرتاش ۔۔۔۔۔!"

"واہیات مت بکو" اس نے بے قرار ہو کر کہا "جاذب! تم واقعی ایک بہت ہی پیارے احمق ہو ۔۔۔ کیا تم اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ میں اس کی بیوی بننا نامنظور کر چکی ہوں!"

(۱۱)

ردی پیاری! ۔۔۔ یہ بیان کرنا میرے لئے آسان نہیں ہے کہ دوسرے دن میں کن مصائب کا شکار رہا!

میں نے اپنا اسباب گرین ہوٹل کے چوتھی منزل پر بھجوا دیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نیچے زرتاش اور شیریں سے الوداعی مصافحہ کرنے آیا۔ شیریں نے بے اختیار میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی +

میرے بھائی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں وہ تو خیریت گذری کہ پستول یا ریوالور جیسی کوئی چیز کمرے میں موجود نہ تھی۔ ورنہ خدا جانے کیا حشر ہوتا +

زرتاش غصے کے مارے کانپ رہا تھا۔ اُس وقت وہ ایک ڈراؤنا اژدھا معلوم دیتا تھا جو کوئی دم میں مجھے نگل جانے گا۔ جب وہ بولا تو اُس کا آواز شدت غصہ سے کانپ رہی تھی +

"جاذب! بڑی شرم کی بات ہے کہ تم اس شخص سے بیوفائی کر رہے ہو اور دھوکا دے رہے ہو جس نے تمہارے پیچھے اپنی عمر برباد کی! جس نے تم کو تعلیم و تربیت دلوائی۔ حیوان سے انسان بنایا۔ ان تمام باتوں کا معاوضہ آج تم اس طرح ادا کر رہے ہو کہ میری زندگی کی مسرت اور میری امیدوں کی روشنی کو مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھیننا چاہتے ہو۔ خدا تم سے سمجھے! خدا تم سے اسکا بدلہ لے! ذرا خیال تو کرو ۔۔۔ یہ لڑکی جس سے تم محبت کرنے کے آرزومند ہو جسے تم ورغلا رہے ہو، وہ کون ہے؟ ۔۔۔ وہ تمہارے بھائی کی ہونے والی بیوی ہے! تمہاری قابل تعظیم بھاوج ۔ ۔ ۔ ۔"

"وہ بھائی صاحب خدا غلط کہہ رہے ہیں! ۔۔۔۔ میں نے کبھی ۔ ۔ ۔ ۔"

میں اسیقدر کہنے پایا تھا کہ شیریں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی:-

"غلط ہے! محض غلط! میں کسی کی ہونے والی بیوی نہیں ہوں۔ جاذب! خدا کے لئے مجھے یہاں سے لے چلو ۔۔۔ زرتاش! تم نے جس طرح مجھے دھوکا دیا ہے۔ اسیطرح آج فطرت تم کو دھوکا دے رہی ہے! اُوہ! تمہاری آنکھیں کسقدر ڈراؤنی ہیں +

واقعی میرے بھائی کی آنکھیں لہو کی مانند سرخ ہو گئی تھیں۔ اور چہرے پر درندوں کی سی وحشت برس رہی تھی۔ اس وقت وہ سخت طیش میں تھا۔ اُس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں +

"اے پیارے خدا!" میرا بھائی بلند آواز سے کہنے لگا "تو ان پر اپنا قہر نازل کر ۔۔۔ تو نے نوح کی اُمت کو تباہ کر دیا۔ لوط کی قوم کو برباد کیا۔ اسیطرح انہیں فنا کے گھاٹ اُتار" +

یہ بددعا میں سُن نہ سکا۔ "بھائی صاحب ۔ بھائی صاحب ۔۔۔۔ خدا کے لئے اپنے چھوٹے بھائی"

میں اسیقدر کہنے پایا تھا کہ اُس نے مجھے دھکیل دیا اور یہ کہتا ہوا ع۔

"تو بھی اچھا نہ رہے دل کے جلانیوالے"

کہتا ہوا باہر نکل گیا +

دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا!

(۱۲)

اس کے آخری الفاظ ابھی جب کبھی یاد آتے ہیں۔ تو گھنٹوں قلب پر ایک عجب وحشت سی طاری رہتی ہے!

میرے بھائی کو گئے کامل تین ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ شیریں ان پے در پے حادثات سے کسقدر بیمار ہو گئی تھی۔ اس لئے اسے میں جنوبی ساحل پر غرض تفریح لے آیا تھا +

ایک دن میں نے شیریں سے عقد کا تذکرہ کیا۔ جس کو سنکر وہ کہنے لگی:-

"تمہاری مرضی"

(۱۳)

۳ جنوری کی رات وہ رات تھی جس کی صبح ہمارا عقد ہونے والا تھا۔ اللہ غنی! وہ بھی کیسی رات تھی +

چاندنی خوب نکھری ہوئی تھی۔ زرد چاند کوہساروں پر سے جھانک رہا تھا۔ پہاڑی درخت ہوا کے سرد جھونکوں سے ہل رہے تھے۔ میں برآمدے کے زینے پر کھڑا رات کی کسی چڑیا کا دلگداز نغمہ سن رہا تھا۔ جو پاس ہی ایک شمشاد کے درخت پر بیٹھی تھی +

دفعتاً ہوائیں معطر ہوگئیں۔ خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں۔ نارنگی کے پھولوں کی تیز بو نے جو عموماً عروسی خوشبو کہلاتی ہے میرے دماغ کو معطر کردیا۔ میں جدھر جاتا تھا مکان کے جس حصہ میں جاتا تھا یہ جاں بخش عروسی خوشبو میرا تعاقب کررہی تھی +

میں بےتابانہ اپنی دلہن کے کمرے کی طرف چلا۔ اور بغیر کسی قسم کی اطلاع یا اجازت کے دیوانہ وار اندر چلا گیا۔ میری شیریں نارنگی کے پھولوں میں لپٹی ہوئی دریچے کے آگے آرام کرسی پر بیٹھی چاندنی کی سیر کررہی تھی۔ سفید ریشمی لباس اور نارنگی کی نوشگفتہ کلیوں سے آراستہ دلہن اُس وقت چاند کی صاف وشفاف روشنی میں یونانیوں کے حسن وعشق کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ میں شدت شوق میں پاگل ہورہا تھا۔

"شیریں! دیکھو تو کیسی اچھی رات ہے! ایسی ہی راتیں ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہیں۔ نارنگی کے پھولوں کی یہ خوشبو مجھے مدت العمر تمہارے زمانۂ عروسی کی یاد دلایا کرے گی! شیریں! میری پیاری شیریں! خدا کا شکریہ ادا کرو۔ اُس نے ہمیں کیسی کیسی نعمتیں عطا کی ہیں!"

مگر اُس کی بے وقت کی خاموشی نے میرے خرمنِ آرزو پر بجلی گرائی۔ میں نے جھک کر اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا +

پر ــــــ میں نے ایک چیخ کے ساتھ اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرے منہ سے بےاختیار چیخیں نکل رہی تھیں۔ ہاتھ یخ کے مانند سرد تھا +

میں نے جھک کر اُس کا چہرہ چھوا +

پر آہ روحی! وہاں کیا تھا ــــــ ہائے وہاں رکھا ہی کیا تھا ــــ دلہن نوجوان دلہن ــــ ہمیشہ کے لئے اس کثیف دنیا سے رخصت ہوگئی تھی!

کیا کہوں قاتل تڑپتا چھوڑ کر کیوں چل دیا؟
وار بھی پورا نہ تھا اور تیغ بھی پوری نہ تھی!

ہر طرف موت کا سا سکوت تھا ــــ بس صرف نارنگی کی کلیوں کی بُو کمرے میں مہک رہی تھی +

ہائے روحی! اب تم کو معلوم ہوا کہ بددعا کیسی ہوتی ہے؟ ممکن ہوسکے تو تم ہر ایک کی دعا لینے کی کوشش کیا کرو۔ اور جلے دل کی بددعا سے ڈرو +

(14)

میں نے ایک چھوٹی سی آہ بھری۔ کرنل کو دیکھ کر کہنے لگی "آہ کس قدر دردانگیز ہے تمہاری داستان! تقدیر نے عجب گل کھلائے!"

"ہاں ــــ یہ سب نوشتۂ تقدیر تھا! اچھا تو میری بیٹی! اب بقیہ کہانی بھی سُن لو" اُس نے دوسرا سگریٹ روشن کیا اور کہنے لگا:۔

(15)

"جب مجھے معلوم ہوا کہ میری شیریں مجھے اس مصائب و آلام کی دنیا میں تنہا چھوڑ گئی ہے تو میں غش کھا کر نیچے گر پڑا +

مجھے اس کی خبر نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ مختصر یہ کہ

جہاں جہاں بھی کوئی زندگی کی ٹھوکر تھی!
لئے پھری مری قسمت وہیں وہیں مجھ کو!

سُنتا ہوں کہ پاگل ہوگیا تھا۔ میرے دوستوں نے میرا طبی معائنہ کراکر مجھے شہر کے پاگل خانہ میں بھیجدیا ــــ اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے! کہانی کا یہ حصہ یقیناً بہت دلچسپ ہے! غور سے سُنو!

مجھے یہ ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہوسکا کہ میں کے سال پاگل خانہ میں رہا۔ اور کتنی مدت محبوس رہا! سنتا ہوں چھ سال!

ایک شب کا واقعہ بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز ہے! میں پاگل خانے کے ایک کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ رات گرم اور نہایت سنسان تھی۔ اُلّو درختوں پر چیخ رہا تھا۔ اور میرے جنونی خیالات سمندر کی موجوں کی طرح ادھر اُدھر ٹکرا رہے تھے +

شب کے گیارہ بجے ہوں گے ــــ مجھے کچھ ٹھیک یاد نہیں ــــ بہرحال رات کچھ زیادہ ہوگئی تھی ــــ کہ کمرے کے شمالی طرف کا دروازہ کھلا۔ اور ایک نرس (جو میری نگہداشت پر مقرر تھی) سفید لباس میں اندر داخل ہوئی اُس کے ہاتھ میں یقیناً دوا تھی اور مجھے پلانا چاہتی تھی وہ مجھ پر جھکی +

اُس کا جھکنا تھا کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور میں پلنگ سے کود کر نیچے جا گرا۔ دفعتاً میرے خیالات نے اپنا رُخ بدل دیا۔ کہیں سے کہیں جا پہنچے ــــ اب میں دیوانہ نہ تھا! مجھے ہوش آگیا تھا! اب میں دوسروں کی طرح ہر بات کو سمجھ سکتا تھا! روحی! تم نے دیکھا خدا کے ارادے؟"

"آخر کیا ہوا؟" میں نے سوال کیا +

"ہوا یہ، کہ نرس جونہی مجھ پر جھکی، اُس کے سینے پر سنوارے ہوئے نارنگی کے پھول میرے چہرے پر گر پڑے! میں نے ان پھولوں میں شیریں کی روح ملفوف دیکھی۔ میں نے اُنہیں اُٹھا لیا۔ سینے سے لگا لیا اور چلا چلا کر کہنے لگا:۔

جسم فانی ہے! وہ فنا ہو جاتا ہے! پر روح فنا نہیں ہوتی!
نفسی خواہشات فانی ہیں، وہ فنا ہو جاتے ہیں!
پر عشق فنا نہیں ہوتا! عشق 'ایک الٰہی صفت ہے!
اسی لئے میری روح کو بھی اس سے عشق ہے!

میں پیخ پیخ کر کہتا اور پھولوں کو چومتا جاتا تھا۔ میرا جنون دھیرے دھیرے کم ہوتا جاتا تھا +

نرس میری ان حرکات کو انتہائی دیوانگی پر محمول رہی تھی۔ مگر اس کم بخت کو کیا خبر تھی کہ اب میں اُس سے کہیں زیادہ ہوشمند اور چالاک ہو چکا تھا!

آہ وہ بھی عجب ستم انگیز گھڑی تھی! میں نے نرس کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر اُس خدا کی بندی نے ایک نہ سنی! جی چاہتا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُس اُداس کھڑکی کے باہر پھینک دوں جو ہر روز رات کے وقت میرے سرہانے ہوا کے لئے کھلی رہتی تھی۔ اور جہاں اتو چیخیں مارا کرتا تھا۔ چاند کی شعاعیں رقص کرتی تھیں اور میں اپنی قسمت پر رویا کرتا تھا! ہاں اس کھڑکی کے باہر ——— !

نارنگی کے پھولوں کی تیز بو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر بعد بے تحاشہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ مجھے چیخیں مارنے میں کسی قسم کی شرم نہیں آتی تھی۔ کیونکہ دنیا مجھے پاگل سمجھتی تھی۔ اور وہ رات میری آزادی کی آخری رات تھی۔ میں نے سوچا اپنی آزادی سے کیوں نہ فائدہ اُٹھاؤں! یہ سوچ کر میں گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ اور اپنی دلہن کا نام لے لے کر چیخیں مارنے لگا! شیریں! شیریں!

نارنگی کی کلیوں کی یہ جان لیوا خوشبو مجھے ماضی کے دل گداز افسانے یاد دلا رہی تھی! او پروردگار! عجب ساعتیں تھیں!

دوسری صبح ڈاکٹر آیا اور اُس نے مجھے رہا کر دیا۔ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور دوستانہ بات چیت کی۔ میں نے اپنی کہانی من و عن اُس سے بیان کر دی۔ اُس نے مجھے سیر و سیاحت کی رائے دی۔ اُسی کے مشورے سے میں جنوبی افریقہ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ تم کو یاد ہو گا جب تم جہاز سے سمندر میں گر پڑی تھیں تو سب سے پہلا شخص میں ہی تھا جو سمندر میں کود کر تمہاری مدد کو پہنچا تھا۔ بات اصل یہ تھی کہ میں اپنی جان فنا کرنے پر آمادہ تھا۔ مگر جس کو خدا رکھے اُسے کون چکھے میں نے تمہیں بحفاظت پانی سے نکال لیا اور جہاز پر آ گیا۔ تم چیلیوں نے مجھے اس مصائب و آلام سے بھری ہوئی دنیا سے چھڑایا نہ سمندر کی خوفناک موجوں نے۔

بس یہ ہے میری داستان!

اب تو تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کیوں "نارنگی کی کلیوں" کو دیکھ کر اس قدر خوفزدہ ہو جایا کرتا ہوں!"

اجل نے چاک کیا جب سے اس کا دامنِ زیست
نہیں تمیزِ گریبان و آستیں مجھ کو

(خاص)

مس حجاب اسمٰعیل

عید مبارک

از ادیب ۔ اے ۔ آبادی

تو پاس ہو تو ہے مرا ہر روز روزِ عید
تیرے بغیر عید بھی یوم النشور ہے

اس شعر کے کہنے والے کی طرف سے (خواہ وہ کوئی ہو اور خواہ کہیں ہو) اس کو جسے مخاطب کر کے یہ شعر کہا گیا ہے ۔ عید مبارک !

کیا خوب کہا ہے غالب دہلوی نے ایکسو گیارہ روپے والے مرقع چغتائی میں

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نیرنگ خیال کے مستقل خریداروں کو (یعنی اُن کریم النفس اصحاب کو جو سالانہ وی ۔ پی وصول کرنے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں اور غیر مستقل خریداروں کو یعنی اُن لوگوں کو جو ایجنٹوں اور ریلوے بک سٹالوں سے خرید کر رسالہ پڑھتے ہیں) اور اُن مستقل مزاج ناظرین کو جو ہمیشہ رسالہ پڑھتے ہیں ۔ اور ہمیشہ چرا کر یا اُڑا کر یا مانگ کر پڑھتے ہیں (اور ایسے لوگوں کا دم بھی ہندوستان میں غنیمت ہے) عید مبارک !

ان رسالوں کے مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو کبھی عید نمبر شایع نہیں کرتے اور عید نمبر یا کوئی اور خاص نمبر شایع کرنا شعار اسلامی کے منافی خیال کرتے ہیں اور اسے بدعت بتاتے ہیں ۔ باوجود ایسے رسالوں کے مستقل خریدار ۔ غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے ۔ عید مبارک !

ان رسالوں کے مستقل خریداروں غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو کبھی تصاویر شایع نہیں کرتے (کیونکہ اسے شرع شریف کے خلاف سمجھتے ہیں) یا صرف تیسرے چوتھے سال ایک آدھ تصویر شایع کرتے ہیں (کیونکہ اسے اسراف بیجا خیال کرتے ہیں) بوجہ ایسے شرعی رسالوں کے اور باوجود ایسے کفایت شعار رسالوں کے مستقل خریدار غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے عید مبارک !

ان موخرّ الذکر کفایت شعار رسالوں میں سے ایک رسالے نے جو ہر چوتھے یا پانچویں سال ایک تصویر شایع کرتا ہے ۔ مدت ہوئی ایک تصویر شایع کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ رسالے کے ایڈیٹر کی شبیہ مبارک ہے ۔ اسے دیکھ کر ہمیں مُلا جامی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا +

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ملّا ساغری نے اپنا یہ مطلع مولانا جامی کو جا کر سنایا +

تا شنیدم کہ تو اں لعل ترا جاں گفتن
آتشے در دلم افتاد کہ نتواں گفتن

مطلع خوب تھا اور پھر ملّا ساغری کا مطلع تھا ۔ مولانا نے خوب داد دی اور بہت تحسین آفریں کہی ۔ ساغری نے خوش ہو کر کہا کہ آپ حکم دیں تو اس مطلع کو لکھ کر چوک پہ لگا دیا جائے ۔ مولانا نے فرمایا ہاں ضرور اور بہتر ہے کہ تمہیں بھی ساتھ ہی لٹکا دیا جائے ۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ مطلع کس کا ہے +

اس رسالے کے مستقل خریداروں ۔ غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو عید مبارک !

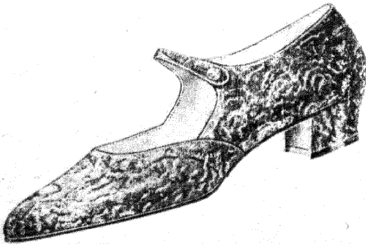
انہی رسالوں میں سے ایک نے ابھی تھوڑی مدت ہوئی کہ تین ادیبوں کی تصویریں شایع کی تھیں ۔ ان ادبائے ثلاثہ میں سے ایک ادیب کا ادبی شاہکار (یعنی عدالتی اشتہار) اسی رسالہ میں شایع ہوا تھا ۔ لیکن باقی دو ادیبوں کے ادبی مقالات اس رسالے میں یا کسی اور رسالے میں باوجود تحقیق و تفتیش کے ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گذرے ۔ ممکن ہے گمنام لکھتے ہوں ۔ اس رسالے کے مستقل خریداروں ۔ غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو ۔ عید مبارک !

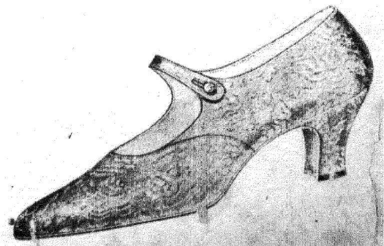
اُن رسالوں کے مستقل خریداروں ۔ غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو آج بوڑھے ہو کر بھی اسی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں جو انہوں نے پیدا



میر ولی اللہ بی۔ اے۔ ادیب۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ ایبٹ آباد







ہونے پر زیب تن فرمایا تھا۔ اور تہیہ کر لیا ہے کہ مر کر بھی اسی لباس میں مدفون ہونگے۔ عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو پیدا ہوئے، جوان ہوئے۔ بوڑھے ہوئے اور مر گئے یا جو پیدا ہوئے اور جوان ہوئے اور عین عالم جوانی میں مر گئے یا جو پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ یا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ بوجہ اور باوجود ایسے رسالوں کے مستقل خریدار، غیر مستقل خریدار اور مستقل مزاج ناظرین ہونے کے۔ عید مبارک!

ان سہ ماہی رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو باوجود سہ ماہی ہونے کے آٹھ روپے سالانہ سے ایک پیسہ کم نہیں لیتے۔ یا جو بوجہ سہ ماہی ہونے کے ایک روپیہ بارہ آنہ سالانہ سے ایک پیسہ زیادہ نہیں لیتے۔ اور جو صرف عالمانہ اور محققانہ مقالات شایع کرتے ہیں (جن عالمانہ اور محققانہ مقالات کو پڑھنے والوں کی تعداد ان عالمانہ اور محققانہ مقالات کے لکھنے والوں کی تعداد سے کبھی زیادہ نہیں ہوئی) یا بوجہ عالم اور محقق ہونے کے یا بوجہ عالم اور محقق ہونے کے۔ عید مبارک!

اُن رسالوں کے مستقل خریداروں، غیر مستقل خریداروں اور مستقل مزاج ناظرین کو جو جواہرات کوڑیوں کے مول بیچتے ہیں یعنی بارہ آنہ سالانہ میں پورے بارہ رسالے نذر ناظرین کرتے ہیں۔ ثم یعنی اپنے جواہرات کو شیخ محمد اصغر جوہری سے بھی ارزاں تر قیمت پر فروخت کرتے ہیں ثم یعنی کوڑی کے تین تین مضامین کوئی مضمون ایک کوڑی پر فروخت کر کے اہل ملک کی علمی۔ ادبی۔ سیاسی۔ بدنی۔ معاشری۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور فلسفی خدمت کرتے ہیں۔ بوجہ مجہول، مظلوم اور مغبون ہونے کے عید مبارک!

اما بعد ان تمام مذکورۂ بالا رسالوں کے ڈائرکٹروں، ایڈیٹروں، آنریری ایڈیٹروں، اسسٹنٹ ایڈیٹروں، سب ایڈیٹروں اور مدیران مسئول و غیر مسئول و مدیران سائل و غیر سائل و مدیران منقول و غیر منقول و مدیران ناقل و غیر ناقل و مدیران معقول و غیر معقول و مدیران عاقل و غیر عاقل و مدیران مجہول و غیر مجہول و مدیران جاہل و غیر جاہل و دیگر مصادر ثلاثی کے اسم فعلا، کو جو عموماً جج، سب جج، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر، حکیم، ڈاکٹر، کتاب فروش اور پان فروش (وغیرہ وغیرہ) ہوتے ہیں اور جو رفاہ عام کی خاطر جج، سب جج، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر، حکیم، ڈاکٹر، کتاب فروش اور پان فروش (وغیرہ وغیرہ) ہوتے ہوئے بھی ادبی رسالوں کی ایڈیٹری کے لئے وقت نکال لیتے ہیں اور سالہا سال تک پانچ سو روپیہ ماہوار کے خسارہ پر ان رسالوں کو جاری رکھتے ہیں اور محض اس لئے کہ امت مرحوم کے افراد میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔ گھر کا اثاثہ بیچ بیچا کر رسالے چھپواتے رہتے ہیں۔ عید مبارک!

پھر اس کے بعد ان مضمون نگاروں کو اور اُن مضمون نگارنیوں کو جو رسالوں میں عُریاں عشقیہ کہانیاں لکھ کر رسالوں کے ادبی معیار کو اور ناظرین و ناظرات کے اخلاقی معیار کو بلند سے بلند تر بنانے کی کوشش میں دن رات سرگردان رہتے ہیں۔ اور ان ادیبوں کو جو مغربیات کو مشرقیات میں یعنی انگریزیات کو ہندوستانیات میں ملا کر بیمار ہندوستان کے لئے معجون مرکب تیار کرتے رہتے ہیں۔ اور ان بزرگوں کو جو قلزم علم میں محققانہ غوطے لگا کر دور کی کوڑی لاتے ہیں اور دیوان حافظ کو دیوان ابن یمین کا جزو مسروقہ ثابت کرتے ہیں اور رباعیات عمر خیام کی مقدار کو کبھی بڑھاتے بڑھاتے پندرہ سو سے اوپر لے جاتے ہیں اور کبھی گھٹاتے گھٹاتے دس پندرہ سے بھی نیچے لے آتے ہیں اور دیوان مخفی کے مصنف کو کبھی مذکر بتاتے ہیں اور کبھی مونث (خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ابھی تک مخنث نہیں کہا) اور فردوسی کی عین حیات میں شاہنامہ فردوسی کے چودہ یا پندرہ ایڈیشنوں کا چھپ کر شایع ہو جانا بیان کرتے ہیں۔ اور اردو زبان کو کبھی سنسکرت کی بال اور کبھی ہندی کی بیٹی اور کبھی نیپالی کی ... ثابت کرتے ہیں اور جہاں اس بچاری کو محل شاہجہان سے کان سے پکڑ کر ... چھوکری بتاتے تھے آج راجہ بکرماجیت کے حرم سرا کی لونڈی کہہ رہے ہیں۔ اور ان استادوں کو جو فن تنقید کو ... مغربی ... حاصل کر کے تنقید شعری کو اوج کمال پر لے جا رہے ہیں۔ اور غالب کے بعض شعروں کو بے معنی اور ذوق کے بعض شعروں کو بامعنی بتا رہے ہیں۔ اور ناسخ و آتش کا مقابلہ کر کے ایک دوسرے کو ناسخ و منسوخ بنا رہے ہیں۔ اور مومن کی غزل کو غالب کی غزل سے بہتر اور غالب کی اردو کو قرآن کی عربی سے بہتر کہہ رہے ہیں۔ عید مبارک!

ابھی تھوڑا عرصہ ہی گذرا ہے کہ ادیبان اردو کے ایک گروہ نے ادبیات میں سے ادب لطیف کو پسند کیا اور ادب لطیف کو شاعرانہ نثر میں ایک نئی بحر کی طرح ڈالی یعنی آ آ۔ آ (فع۔ فع فع) یہ بحر ایسی ہر دلعزیز ہوئی کہ چاروں طرف سے آ آ۔ آ کے نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے۔ ان مستانہ نعروں میں سے چند جو ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں جی چاہتا ہے کہ ناظرین تک پہنچا دئیے جائیں۔

آ آ۔ اے اپنے مرمریں تبسم سے عاشق کے تیوریں دل کو چور چور کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنے ہلال ابرو سے عاشق کے افقِ تخیل پر ہلال عید نمودار کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنی گرمیٔ رفتار سے عاشقوں کے کرۂ دل کے بحرِ منجمد شمالی و بحر منجمد جنوبی کو بھاپ بنا کر اڑا دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنے ہونٹوں کے لعل مذاب کی سیاہ سرخی سے میرے آسمان دل کی شفق کی رنگینیوں کو تاریکی میں تبدیل کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنی لبریز خمار آنکھوں کی گردش سے بزمِ محبت کے بادہ خوارں کو مدہوش، بیوقوف، بیتبق اور مجنونما حواس باختہ بنا دینے والی۔ آ

آ آ۔ اے اپنے ترکشِ مژگاں کے ایک ایک تیر سے سو سو دلوں میں ہزار ہزار چھید کر دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے اپنا حنائی انگوٹھا دکھا کر اپنے آوارہ مزاج جاں نثاروں کے خرمنِ دل میں آگ لگا دینے والی۔ آ +

آ آ۔ اے حسن کی دیوی جس نے باوجود اپنی تانیث کے عشق کے دیو کو باوجود اس کی تذکیر کے مغلوب و مقہور کر لیا ہے۔ اپنی اس فتح پر اور فریق ثانی کی اس شکست پر نازاں نہ ہو۔ کیونکہ شکست و فتح نصیبوں پر ہے۔ دیکھ کہ مقابلہ تو خوب ہوا ہے۔ اس حقیقت پر نظر کر اور آ +

آ آ۔ اے نشۂ شباب کی متوالی۔ یہ نشہ اتر جانے والا ہے۔ اور بڑھاپا آ جانے والا ہے۔ دیکھ کہ میں بھی آج سے چالیس سال پہلے جوان تھا۔ اب بوڑھا ہوں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون پر غور فرما اور آ +

آ آ۔ اے حسین قتالہ۔ قتلِ عمد جرم ہے۔ اور اس جرم کی سزا پھانسی ہے۔ مکافاتِ عمل سے غافل نہ ہو اور ضرور آ +

آ آ۔ اے حسین و جمیل ساحرہ۔ تو جانتی نہیں کہ سحر گناہ کبیرہ ہے اور اسی گناہ کی پاداش میں مسماۃ زہرا اور اس کے دونوں بھائی مسمی ہاروت و مسمی ماروت چاہ بابل میں قید کر دیئے گئے تھے۔ ان تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کر اور آ +

آ آ۔ اے دختر ترسا۔ دیکھ کہ میں تیرا پڑوسی ہوں اور انجیل کا حکم ہے کہ اپنے پڑوسی سے محبت کر (اور اپنے خاوند سے نفرت) اس مقدس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر اور آ +

آ آ۔ اے مسیحائی کا دم بھرنے والی اور ساتھ ہی طبقاتِ عشاق میں درد سر۔ درد دل۔ درد معدہ۔ بخار۔ نمونیہ۔ وجع مفاصل۔ تپ محرقہ۔ تپ لرزہ ہیضہ اور طاعون پھیلانے والی۔ خدا سے ڈر اور آ +

آ آ۔ اے رقیب روسیاہ کے قید خانہ کی چار دیواری میں دن رات بند رہنے والی۔ دفعہ ۴۹۰ تعزیرات ہند کی مطلق پروا نہ کر اور آ۔ وعلیٰ ہذا القیاس +

یہ بچاری آنے والیاں جب کبھی بھول کر گھر سے باہر قدم رکھتیں تو چاروں طرف سے یہی آ آ۔ آ کے نعرے سنتیں اور دل ہی دل میں "دفعہ جا۔ بیہودہ بکواس نہ کر جا" کہتے ہوئے پھر گھروں میں جا چھپتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان آنے والیوں نے گھروں سے باہر نکلنا مطلقاً بند کر دیا۔ اور یہ آ آ کہنے والے درد فراق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ جاں بر نہ ہو سکے۔ بعض بچارے برد اللہ مضجعہ ہو گئے (خدا وند کریم ان کی خوابگاہوں کو گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم کرے) اور بعض نور اللہ مرقدہٗ بن گئے (اللہ تعالیٰ اُن کی آرام گاہوں کو شہر میں ہوں تو بجلی کی روشنی سے اور گاؤں میں ہوں تو مٹی کے تیل کے دیووں سے روشن کرے)

ان مرحوم و مغفور ادیبوں کے نام لیوا اب بھی اگر باقی ہوں تو انہیں عید مبارک!

نیرنگ خیال کے عید نمبر کے کاتب کو بشرطیکہ وہ ہمارے اس علمی، ادبی، اصلاحی، اخلاقی، مذہبی، تنقیدی، صوفیانہ، فلسفیانہ اور محققانہ مقالے کو ہمارے گذشتہ علمی و ادبی مقالے (یعنی دال کی فریاد) کی طرح کتابت کی غلطیوں سے کہیں کہیں بے مزہ اور کہیں کہیں بے معنی بنا کر نہ رکھ دے عید مبارک (سہو سے کوئی بشر خالی نہیں۔ اگر خامیوں کی تصحیح نہ کی جائے تو اس کا کیا علاج ہے منجانب کاتب)

غلام خامۂ آں کاتبم کہ شعر مرا ‌ ‌ چنانچہ بود نوشتا نہ ہر چہ خواست نوشت
اگرچہ شعر ز روغ اندر دروغ مے گیرد ‌ ‌ دروغ وراست دروہر چہ بود راست نوشت

عید ہر سال آتی ہے اور بعض محققانِ لغتِ عرب و فرس کی زبانی سنا گیا ہے کہ اسے عید اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ ہر سال آتی ہے۔ محققین کی اس رائے کی خامی ظاہر ہے۔ کیونکہ روزے بھی (عید سے ایک مہینہ پہلے) ہر سال تشریف لاتے ہیں۔ اور باوجود ہر سال تشریف فرما ہونے کے عید نہیں کہلاتے۔ ہماری ذاتی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ عید کو عید صرف اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ عید ہے۔ اگر عید عید نہ ہوتی تو اسے عید کون کہتا۔ اور اگر کوئی کہتا تو بیوقوف کہلاتا۔ اسی طرح روزے بھی روزے اس لئے کہلاتے ہیں۔ کہ وہ روزے ہیں۔ اگر روزے روزے نہ ہوتے تو انہیں کون عقلمند روزے کہتا +

مخفی نہ رہے کہ ہر سال دو عیدیں آتی ہیں۔ ایک چھوٹی عید یعنی عید الفطر اور ایک بڑی عید یعنی عید الاضحیٰ (جسے رسالوں اور اخباروں کے مدیرانِ مسئول و مدیرانِ غیر مسئول عموماً عید الضحیٰ لکھتے ہیں) چھوٹی عید سے پہلے روزے رکھنے پڑتے ہیں اور تراویحیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ بڑی عید سے پہلے نہ روزے رکھنے پڑتے ہیں۔

نہ تراویحیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عید کو چھوٹی عید اور بڑی عید کو بڑی عید کہتے ہیں ؎

دولت آں است کہ بے خون دل آید بکنار
ورنہ باسعی و عمل باغ جناں ایں ہمہ نیست

بے شک۔ ایں ہمہ نیست۔ تیس دن روزے رکھ کر ایک دن عید لینا بھی اگر عید ہی ہے تو اس عید کو زیادہ سے زیادہ چھوٹی عید ہی کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ نہیں +

نیرنگ خیال والے ہمیشہ چھوٹی عید کے موقعہ پر عید نمبر نکالتے ہیں۔ معلوم نہیں دن کو روزے رکھ کر اور رات کو تراویحیں پڑھ کر یہ لوگ کون سا معجون کھاتے ہیں کہ دن رات ایک کر کے نیرنگ خیال کے عید نمبر جیسا ایک ضخیم اور بے حد دلچسپ عید نمبر مرتب کر کے تیار کر لیتے ہیں۔ غالباً جہاں تک روزے اور تراویح کا تعلق ہے ان بزرگوں کی چھوٹی عید کسی طرح بھی بڑی عید سے چھوٹی نہیں ہوتی +

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اندریں حالات ظن غالب یہی ہے کہ نیرنگ خیال والوں کی عید (یعنی چھوٹی عید) عید کے مندرجہ ذیل اقسام میں سے تیسری قسم کی عید ہے۔ اگر ہمارا یہ ظن ظن المومنین نہ ہو۔ تو یہ صاحبان ہمیں اطلاع دے سکتے ہیں۔ ہم نہایت صدق دل سے تردید شایع کرنے پر تیار رہوں گے۔ اگر اس پر بھی ان کی تسلی نہ ہو تو وہ ہم پر ازالہ حیثیت عرفی (یا اگر چاہیں تو ازالہ حیثیت فیضی) کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مگر خرچہ عدالت و خرچہ وکیل وغیرہ کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے +

ناظرین کرام پر واضح ہو کہ جہاں ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی صرف ایک قسم ہوتی تھی۔ وہاں اسلامی تیوہار بھی صرف ایک ہی قسم کے ہوتے تھے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا اور علم و تہذیب کی برقی روشنی نے انسانی آنکھوں کو خیرہ و تیرہ کرنا شروع کر دیا مسلمانوں کی کئی قسمیں ہو گئیں اور ساتھ ہی اسلامی تیوہاروں کی بھی کئی قسمیں بن گئیں۔ چنانچہ چھوٹی عید بیچاری بھی اس تقسیم سے نہ بچ سکی۔ اور چار قسموں میں منقسم ہو گئی +

(۱) ان لوگوں کی عید جو روزے رکھتے ہیں اور عید کرتے ہیں +
(۲) ان لوگوں کی عید جو روزے رکھتے ہیں اور عید نہیں کرتے +
(۳) ان لوگوں کی عید جو روزے نہیں رکھتے اور عید کرتے ہیں +
(۴) ان لوگوں کی عید جو نہ روزے رکھتے ہیں اور نہ عید کرتے ہیں +

اس تقسیم پر اگر کوئی منطقی منطقیانہ اعتراض یا کوئی مولوی مولویانہ اعتراض کرے یہ اس کی حماقت ہے۔ کیونکہ ہم بحمدہٖ تعالیٰ نہ منطقی ہیں۔ نہ مولوی۔ صرف مضمون نگار ہیں۔ اور رسالوں کے مضمون نگاروں کو نہ منطقی ہونے کی ضرورت ہے۔ نہ مولوی ہونے کی حاجت۔ صرف رسالوں کا مضمون نگار ہونا کافی ہے +

اما بعد پہلی قسم کی عید اُن لوگوں کی عید ہے جو سیدھے سادے مسلمان ہوتے ہیں۔ نہ روزے کی فلاسفی پر بحث کرتے ہیں اور نہ اس کے طبی اغراض و مقاصد سے کچھ واسطہ رکھتے ہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ روزے آئے۔ بڑے اہتمام سے سویرے اُٹھتے ہیں۔ سحری نوش جاں فرماتے ہیں۔ دن بھر نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں (پینے میں حقہ پانی دونوں شامل ہیں) شام کو افطاری کا انتظام کرتے ہیں۔ اور بڑے سلیقے سے روزہ کھولتے ہیں۔ مہینہ بھر اسی پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ مہینہ گذرنے پر (یا ایک دو دن پہلے ہی) بڑے شوق سے ہلال عید کے لئے افق مغرب پر آنکھیں سی دیتے ہیں اور چاند دیکھ کر یا سُنکر کہ کسی نے چاند دیکھ لیا ہے۔ عید کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دوسرے روز صبح سویرے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر (یا بعض صورتوں میں نہا کر) نئے یا دُھلے ہوئے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ اور عید گاہ میں جانے کے لئے پا برکاب ہو بیٹھتے ہیں۔ جب عید گاہ میں پہنچ کر صفیں سیدھی کر لیتے ہیں (یعنی اتنی سیدھی جتنی ان سے توقع ہو سکتی ہے) تو زاید تکبیروں کے لئے عین نماز میں اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے ہیں کہ غلطی نہ ہو جائے۔ نماز ختم کر کے باقی تمام نمازیوں سے بغلگیر ہوتے ہیں اور سال بھر کا کھانا بخشواتے ہیں۔ پھر گھر آتے ہیں اور دہلی کے ہوئے تو سیویاں اور لاہور کے ہوئے تو سیویاں کھاتے ہیں۔ اس قسم کے تمام سیدھے سادے مسلمانوں کو عید مبارک!

دوسری قسم کی عید ان لوگوں کی عید ہے جو پکے مسلمان ہوتے ہیں۔ روزے اس لئے رکھتے ہیں کہ روزے رکھنا فرض سمجھتے ہیں اور عید اس لئے نہیں کرتے۔ کہ عید کا سامان کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نئے کپڑے تو خیر پُرانے کپڑوں کی دھلائی بھی نہیں دے سکتے۔ عید گاہ میں جاتے ہیں لیکن کوئی ان سے بغلگیر نہیں ہوتا۔ بچارے ڈرتے ڈرتے دور ہی سے لوگوں کو عید مبارک کہہ لیتے ہیں اور جو لوگ انکی عید مبارک کے جواب میں عید مبارک کہہ دیتے ہیں وہ گویا نبی نوع انسان کے لئے بڑی قربانی کرتے ہیں۔ اور اس قربانی پر دل ہی دل میں نازاں رہتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تو ہو جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ کوئی وقت ایسا آئے کہ یہ بات بھی داستان پارینہ ہو کر رہ جائے۔ ان بے برگ و نوا مسلمانوں کو بہت بہت عید مبارک!

تیسری قسم کی عید اُن مسلمانوں کی عید ہے جو سب سے زیادہ اسلام کے خیرخواہ ہوتے ہیں۔ گو بوجہ ضعف معدہ یا بوجوہ دیگر وہ روزے نہیں رکھ سکتے لیکن عید سب سے

زیادہ شان وشوکت کے ساتھ مناتے ہیں۔ عیدگاہ میں سب سے پہلے تشریف لے جاتے ہیں اور سب سے پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور غریب مسلمانوں کے ساتھ شانہ بشانہ نماز میں شامل ہو کر دنیا کو جہاد بالنفس کی تعلیم دیتے ہیں۔ عیدگاہ سے نکل کر سیدھے گھر آتے ہیں۔ اور آرام کرسی پر تشریف رکھ کر سامنے دو چار قسم کے خشک میوے اور کچھ شیرینی وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ یہ تمام شہر کے لئے خوان یغما ہوتا ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں۔ عید مبارک کہتے ہیں اور دو چار دانے کسی چیز کے کھا کر واپسی کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ یہ تانا بانا دو تین گھنٹے لگا رہتا ہے۔ آپ کرسی پر بیٹھے دل ہی دل میں بڑی احتیاط سے ان لوگوں کی فہرست مرتب کرتے جاتے ہیں جو اُن کے پاس سلام کرنے کو آتے ہیں اور صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ جو بچارے کسی معقول یا غیر معقول وجہ سے عید کے سلام کے لئے حاضر نہیں ہو سکتے وہ بلیک لسٹ میں درج کر لئے جاتے ہیں۔ یہ سیاہ فہرست بھی دل ہی میں مرتب ہوتی ہے اور سال بسال بڑھتے بڑھتے ان صاحب کے دل کو بالکل سیاہ کر دیتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ اسلام کے خیر خواہ ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں ملت بیضا کے رہنما بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو بھی عید مبارک ہو!

چوتھی قسم کی عید اُن لوگوں کی عید ہے جو بے حد مہذب یافتہ مسلمان ہیں۔ نئی تہذیب کی روشنی نے ان لوگوں کے دلوں کو اس درجہ منور کر دیا ہے کہ وہ ہر ایک چیز کے حقایق و معارف پر نگاہ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ روزے کی فلاسفی پر غور کرتے ہیں تو کم از کم موجودہ زمانے میں روزے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے وہ روزے نہیں رکھتے۔ وہ روزے کے طبی یا اغراض پر نظر ڈالتے ہیں تو اسے رسمی صورت میں ضروری نہیں سمجھتے۔ جب کبھی نصیب اعدا بیمار پڑ جاتے ہیں تو ڈاکٹر کے مشورہ پر ایک آدھ وقت کھانے کا ناغہ کر لیتے ہیں۔ عید یہ لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اس میں انہیں اسراف نظر آتا ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ آجکل مسلمانوں کے لئے کفایت شعاری ایک ایسی ضروری چیز ہے جس پر تمام تیوہاروں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ عیدگاہ میں وہ اس لئے نہیں جاتے کہ وہ ہمیشہ (یعنی دن رات) انگریزی لباس میں ملبوس ہوتے اور اس لباس میں رکوع سجود اور قعود کارے دارد۔ ان تہذیب یافتہ مسلمانوں کو اگر کوئی آدمی (غلطی سے) عید مبارک کہہ دے۔ تو وہ اسے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہم چونکہ بیوقوف نہیں اور اگر (ناظرین نیرنگ خیال کی رائے میں) ہم بیوقوف ہیں بھی تو بیوقوف کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے ہم ان بیحد مہذب مسلمانوں کو عید مبارک کہنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ اگر نیرنگ خیال کے پڑھنے والوں میں بھی کوئی صاحب بیحد مہذب مسلمان ہوں۔ تو وہ ہمیں اس امر میں معذور سمجھیں +

یہ تقسیم اصولی تھی۔ اگر فروعات کا خیال کیا جائے تو اور کئی قسمیں بھی عید کرنے والوں کی موجود ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو سحری کھاتے ہیں اور روزے نہیں رکھتے۔ اس صنف کے ابوالآبا پرانے زمانے کے ایک بزرگ تھے۔ رمضان آیا اور آپ نے بیگم صاحبہ کو تاکید کی کہ سحری کے لئے یہ چیز بھی تیار ہونی چاہئے اور وہ چیز بھی۔ یہ کھانا بھی ہو اور وہ بھی۔ اسی طرح کئی عمدہ عمدہ کھانے تیار کرانے کا انتظام فرما لیا۔ اور سحر کے وقت ان کھانوں پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ دو چار دن یہی پروگرام چلتا رہا۔ ایک روز بیوی کو معلوم ہوا کہ میاں سحری تو کھاتے ہیں لیکن روزے نہیں رکھتے۔ سحری کے اس بیجا تردد پر ناراض ہوئی اور میاں سے شکایت کی کہ جب آپ روزے نہیں رکھتے تو آدھی رات کو مجھے سحری تیار کرنے کی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔ میاں نہایت غصے سے بولے۔ بیوقوف! تم نے مجھے اتنا ہی کافر سمجھ لیا ہے کہ روزے بھی نہ رکھوں اور سحری بھی نہ کھاؤں +

سبحان اللہ کیا معقول جواب ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جہاں مسلمانوں کو روزے رکھنے کی تاکید ہے وہاں سحری کھانے کا بھی حکم ہے۔ اگر دونوں حکموں کی تعمیل ممکن نہ ہو تو ایک حکم کی تعمیل ہی سہی۔ اسی صنف کے ایک اور مسلمان کی روایت کرتے ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ ایک دوست نے گلا کیا کہ تم مسلمان ہو کر نماز نہیں پڑھتے۔ اُس نے جواب دیا کہ قرآن کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ دوست نے حیران ہو کر پوچھا کہ قرآن میں نماز نہ پڑھنے کا حکم کہاں ہے۔ اس نے کہا قرآن شریف میں آیا ہے۔ لاتقربوا الصلوٰۃ۔ (یعنی نماز یا مسجد کے نزدیک مت جاؤ) دوست نے کہا کہ اگلی عبارت بھی پڑھئے (وانتم سکاریٰ۔ بحالیکہ تم نشے میں ہو) اس پر وہ شخص جھنجھلا کر بولا کہ سارے قرآن پر تمہارے باپ نے عمل کیا ہوگا۔ ہم سے تو جتنا بن پڑتا ہے کرتے ہیں +

اس قسم کے تمام مسلمانوں کو چونکہ وہ سحری بھی کھاتے ہیں اور عید بھی کرتے ہیں (گو روزے نہیں رکھتے) اور نیز چونکہ ان کے پاس ایسا کرنے کے معقول دلائل بھی موجود ہیں۔ عید مبارک!

اس فروعی تقسیم میں ان لوگوں کا ذکر بھی غالباً بیجا نہ ہوگا جو روزہ رکھ کر دائرۂ انسانیت سے خارج ہو جانا اپنا شرعی حق سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ روزہ رکھ کر دن بھر لڑنے مرنے پر تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ذرا سی بات بھی ان کے خلاف طبع ہو گئی تو وہ فوراً غصے میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو ہوش سنبھال کر بات کرو۔ میں نے

روزہ رکھا ہے (گویا تمام اولاد آدم پر احسان کیا ہے) اگر دوسری طرف سے جواب میں ذرا بھی اونچ نیچ ہوئی تو یہ صاحبان ایک دوسرے کے گلو گیر ہو گئے۔ اور تحفظ حقوق شریعت کو یہانتک پہنچایا کہ کچہری جا پہنچے۔ اس قسم کے واقعات رمضان میں عام طور پر ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو آخر روزہ رکھا ہے۔ اور اگر روزے سے طبیعت پر اتنا اثر بھی نہ ہو تو وہ روزہ روزہ ہی کیا۔ جو لوگ روزے اس شدت سے رکھتے ہیں۔ لہذا ان اصحاب کو بھی عید مبارک!

اسی تقسیم میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو رمضان میں سحری اور افطاری کو ملا کر روزانہ اتنا کھا جاتے ہیں۔ جتنا وہ رمضان سے باہر تین دن میں بھی نہیں کھا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معدہ کام کرنے سے جواب دے بیٹھتا ہے۔ انہی لوگوں کی برکت سے رمضان میں اکثر بدہضمی اور ہیضہ کی شکایت ہو جاتی ہے۔ دن بھر ان لوگوں کے مُنہ سے سوء ہضم کی وجہ سے بو آتی رہتی ہے اور ان کے پاس بیٹھنا ایک اچھی خاصی مصیبت بن جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں۔ اور فخر کیوں نہ کریں۔ مولوی صاحبان ان کو رمضان کے وعظ میں ہمیشہ بتایا کرتے ہیں کہ روزہ دار کے منہ سے جو بو نکلتی ہے۔ اُسے نکلتے ہی فرشتے منہ میں ڈال کر آسمانوں پر چلے جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بات درست بھی ہو۔ ورنہ یہ لوگ تمام کرۂ ارضی کی ہوا کو متعفن کر دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ بہرحال صرف پُرخوری کے الزام پر ان صاحبان کو عید مبارک سے محروم رکھنا قرین انصاف معلوم نہیں ہوتا۔ لہذا ایسے تمام روزہ داروں کی خدمت میں بھی عید مبارک!

اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ روزہ دار جنہیں تمباکو پینے کی عادت ہوتی ہے۔ تمام دن حقّہ نہ ملنے کی وجہ سے شام کے وقت بالکل بے صبر ہو جاتے ہیں۔ افطار سے ایک گھنٹہ پہلے حقّہ لے کر بیٹھتے ہیں اور اسے تازہ کرتے ہیں اور پھر تازہ کرتے ہیں افطار سے چند منٹ پہلے چلم میں خشک پشاوری تمباکو بھرتے ہیں اور دیا سلائی ہاتھ میں لے کر نقارے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جب اُدھر ڈُم ڈُم ہوئی اُنہوں نے تمباکو کو دیا سلائی دکھائی۔ اور دو تین وہ زبردست کش حقّے کے لئے کہ الاماں الاماں پچاس فیصدی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کش لگاتے ہی لیٹ جاتے ہیں۔ اور بیہوش ہو جاتے ہیں۔ ہوش آنے پر ان کی مشتاق نگاہیں زبان حال سے حقّے کو مخاطب کر کے کہتی ہیں ؎

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی | سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دورم آنچناں کہ گفتم | نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

فلہذا تمباکو نسوار چرس چنڈو مدھک گانجا افیون شراب بھنگ اور اسی قسم کے دوسرے مفرحات سے روزہ کھولنے والے روزہ داروں کو عید مبارک!

اور سچ پوچھئے تو عید صرف ان بچوں کی عید ہے جن پر ابھی روزے فرض نہیں لیکن شوق سے روزے رکھتے ہیں۔ دن بھر کی بھوک پیاس اور پابندی ان کے پھول جیسے چہروں کو مرجھا دیتی ہے۔ ابھی روزہ کھلنے میں دو تین گھنٹے باقی ہوتے ہیں کہ وہ گھبرا گھبرا کر ہر پانچ منٹ کے بعد گھر کے بڑوں سے پوچھتے ہیں کہ افطاری میں ابھی کتنی دیر ہے۔ ماں باپ اُنہیں دن میں کئی دفعہ روزہ توڑ دینے کے لئے کہتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں مانتے۔ ایک دو نہیں کئی کئی روزے اسیطرح رکھ گذرتے ہیں۔ اور پھر عید بھی اسی شوق سے مناتے ہیں۔ ایسے تمام بچوں کو عید مبارک!

اما بعد تمام مولوی صاحبان کو خواہ وہ "مولوی امام مسجد ہوں" خواہ مولوی غیر امام مسجد (یعنی خواہ وہ نماز اجرتاً پڑھتے ہوں خواہ عادتاً) اور تمام مولوی صاحبان کو خواہ وہ دیو بندی ہوں خواہ فرنگی محلی۔ خواہ مقلد ہوں۔ خواہ غیر مقلد۔ خواہ حنفی ہوں خواہ غیر حنفی۔ خواہ چشتی ہوں خواہ غیر چشتی۔ خواہ سی آئی ڈی ہوں۔ خواہ غیر سی آئی ڈی۔ خواہ پکّے تنخواہ دار ہوں خواہ صرف وظیفہ خوار خواہ مسجد کے پڑھے ہوں خواہ مدرسہ کے (یعنی خواہ نماز عید پڑھنی پڑھانی آتی ہو خواہ نہ آتی ہو) خواہ ندوی ہوں خواہ غیر ندوی۔ خواہ لکھ پڑھ سکتے ہوں خواہ مطلق ان پڑھ ہوں۔ بوجہ اس کے کہ اُنہیں روزے کھاتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا اور بوجہ اس کے کہ وہ تمام تر ڈاڑھی دار ہوتے ہیں (خواہ وہ ڈاڑھی مختصر ہو خواہ مطول) عید مبارک!

پھر ان تمام واعظ صاحبان کو جو رمضان شریف میں مسجد کو ہٹّیاں سمجھ کر متاع وعظ بیچنے کے لئے شہر بشہر پھرا کرتے ہیں اور ہر وعظ میں بالالتزام یہ بتایا کرتے ہیں کہ اگر کوئی (امیر) آدمی کسی معقول وجہ سے یا کسی غیر معقول وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو وہ فی روزہ کسقدر مال کسی مستحق کو (یعنی خود واعظ صاحب کو) دے۔ نیز ان تمام حافظ صاحبان کو جنہیں تراویحوں میں قرآن سُنانے کے لئے کوئی مسجد مل گئی ہو۔ یا جنہیں باوجود تگ و دو کے قرآن سُنانے کے لئے کوئی مسجد نہ ملی ہو۔ خواہ قرأت اُن کی بصری ہو خواہ مصری (کیونکہ ہدیہ دونوں کا برابر ہے) عید مبارک!

سب سے بعد (لیکن سچ پوچھئے تو سب سے پہلے) خود ہمیں کہ ہم نے سب کو عید مبارک کہی۔ اور کسی نے ہمیں عید مبارک نہ کہی۔ عید مبارک!

(خاص) **ادیب الہ آبادی**

ہاشمی کی یوسف زلیخا اور اردو شہ پارے

از جناب مولانا نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے

جامعہ عثمانیہ کے قیام، انجمن ترقی اردو کے احیاء اور رسالہ اردو (اورنگ آباد) کے اجرا سے اردو زبان کو جہاں دوسرے بہت سے فائدے ہوئے ہیں، ان میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ ان اداروں نے اردو کی تدریجی تاریخ و ارتقا کی تحقیق کا ذوق و شوق پیدا کر دیا ہے۔ اور اسکا نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ پرانے "تذکرے" قدیم اردو کے مخطوطے منصۂ شہود پر آرہے ہیں۔ بلکہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اردو کو صد سالہ بلکہ اگر ہو سکے تو چہار صد سالہ تاریخ کو مسلسل و مربوط طریقہ سے مرتب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ اردو نے گذشتہ ربع صدی میں خاص اہمیت، وسعت اور عزت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے ایسے مصنفین کی ایک بڑی جماعت اس کوشش میں مصروف نظر آتی ہے کہ وہ جس صورت سے بھی ہو اپنے اپنے صوبہ کو اردو کا اصلی وطن نہیں تو کم از کم اس کی ارتقا کا مرکز ہی ثابت کرے اور اس صوبجاتی تعصب و تنگ نظری نے جہاں ذہین محققین سے بہت کچھ قیمتی چیزیں لکھوالی ہیں وہیں غلط بیانی یا کم از کم مغالطہ سے کام لے کر ہر مصنف نے دوسرے بہت سے صوبوں کے مصنفین کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ "اردوئے قدیم" "دکن میں اردو" "بہار میں اردو" "پنجاب میں اردو" وغیرہ اسی قسم کے سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ لیکن حال ہی میں ان کے علاوہ ایک اور کتاب "اردو شہ پارے" کے نام سے حیدرآباد سے شایع ہوئی ہے +

اس کے مرتب اس جدید جامعہ کے فارغ التحصیل اور جامعہ لندن سے سند یافتہ ڈاکٹر، جناب سید محی الدین قادری صاحب زور ایم اے پی ایچ ڈی ہیں۔ جناب زور اپنی دوسری تصانیف اور تنقیدی مقالوں کی وجہ سے اردو داں طبقہ میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کی یہ کتاب جو اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ایک بڑی حد تک صوبجاتی تعصب سے پاک ہے اور وسعت خیال اور آزادی رائے سے کام لیکر انھوں نے بہت زیادہ غیر جانبدارانہ مرتبہ قایم رکھا ہے لیکن پھر بھی ان کے صفحات کے مطالعہ کرنے والے کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ان کی بھی یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ہو سکے تمام قدیم مصنفین کو دکنی ثابت کیا جائے۔ اور اسی لئے وہ ان تصانیف کے متعلق جو اردو کی گجراتی شکل میں لکھی گئیں اور جن کی ایک اچھی تعداد موجود ہے۔ یہ توضیح کرتے ہیں کہ دکنیوں نے نو آمدہ گجراتیوں کے اثرات کے ماتحت اپنی دکنی زبان کو بھی گرجری۔ گوجری، گجری یا گجراتی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ گوجری تصانیف ان لوگوں کی ہیں۔ جو گجرات سے کسی نہ کسی وجہ سے دکن گئے یا ان کی تصانیف دکن تک پہنچیں۔ اور یہ لفظ ان کے ہاں اس وقت تک جاری رہا جبتک ان کی زبان دکنی نہ بن گئی۔ دوسرے فاضل ڈاکٹر صاحب نے کہیں بھی اس بات کا حوالہ نہیں دیا ہے اور نہ تذکرہ کیا ہے کہ وہ کون کون سی تصانیف ہیں جن کے مصنفین نے اپنی زبان کے لئے گجری وغیرہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً امین نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا کو گجری زبان میں لکھا ہے۔ لیکن فاضل مرتب نے نہ صرف یہ کہ اس کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس غریب کی تقریباً ۴۰۰۰ اشعار کی طویل مثنوی سے ایک سطر بھی نہیں دی گئی۔ یہی حال ان تمام دوسرے مصنفین کی کتابوں کا بھی ہے جن کو فاضل مرتب نے گجراتی تسلیم کیا ہے۔ مثلاً شیخ خوبؒ۔ علی جیو گام دھنی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ یہاں پر ہم کو اس تصنیف کے اس پہلو پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں اور انشاء اللہ کسی قریبی صحبت میں اس کے متعلق عرض کریں گے۔ یہاں پر ہم اردو شہ پارے کے مرتب کو ہاشمی کی تصانیف کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں +

خوش قسمتی سے مجھے اپنے ایک دوست جناب سید عبداللہ برہان الدین صاحب بی۔ اے کے کتب خانہ میں متعدد گجراتی مصنفوں کی اردو یا گرجری، گوجری یا گجری تصانیف کے قلمی نسخوں کے ساتھ ہاشمی کی یوسف زلیخا کا ایک قدیم نامکمل قلمی نسخہ بھی مل گیا ہے۔ اور وہ ہاشمی کی ذات، اس کے عقاید اور اس کی تصنیف پر ایک بڑی حد تک روشنی ڈالتا ہے۔ ہمارے فاضل مرتب اردو شہ پارے نے

بجز اُس مختصر ریختی دیوانوں کے جو جناب آغا حیدر حسن کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس کی کسی دوسری کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ ان کا خود بیان ہے کہ

"معلوم ہوا کہ آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کے کتب خانہ میں بھی اِن کا مخطوطہ محفوظ ہے[۴]"۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک محقق جو حیدرآباد میں رہتا ہے اُسی شہر اُن ہی آغا حیدر حسن صاحب کے کتب خانہ کی ہاشمی کی ایک کتاب کا نہ صرف مطالعہ کرتا بلکہ اُس کا انتخاب اپنی کتاب میں درج کرتا ہے۔ اور پھر بھی ہاشمی کی اس اہم ترین تصنیف کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ کیا فنِ تحقیق کا یہ کوئی نیا اصول ہے؟ اگر فاضل مرتب اس تکلیف کو گوارا کر لیتے تو شاید ان کو اس اعتراف کی نوبت نہ آتی کہ

"اس کا (یوسف زلیخا) ایک نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ لیکن چونکہ راقم کو اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لئے وہ اس کے متعلق تفصیلی حالات پیش کرنے سے مجبور ہے[۵]"۔

پس اگر ہم جرمنی اور آغا صاحب کے نسخوں کا وجود تسلیم کر لیں۔ اور اس سے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تو ہم کو یہ ماننا پڑیگا کہ یہ اس مثنوی کا تیسرا مخطوطہ ہے۔ اور اس لئے نامکمل ہونے کے باوجود خاص اہمیت رکھتا ہے[۶]۔

اس مخطوطہ کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے شروع و آخر کے چند ہی اوراق ضائع ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ نامکمل نسخہ ہندوستان کے پُرانے مہدی موعود جناب سید محمد جونپوری کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے خیال ہے کہ اس کے پہلے زائد از زائد حمد و نعت اور شاید مناجات ہی کا حصہ ہو۔ اسیطرح آخر میں خاتمہ کا بڑا حصہ موجود ہے۔ اور شاید دو چار ہی ورق کم ہوں۔ لیکن یہ اوراق ہاشمی کی ذاتی حالت اور قابلیت کی واقفیت کے لئے بہت اہم ہونگے۔ کیونکہ آخری صفحہ کے آخری چند اشعار وہ ہیں جو ہاشمی کے پیر کی زبان سے اُسکی حالت کو بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور ان سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ اندھا تھا اس مخطوطہ میں ۱۴۵ اوراق ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۷ شعر ہیں۔ لیکن بیچ بیچ میں سرخ روشنائی سے تقریباً ۳۵ سرخیاں بھی لکھی ہوئی ہیں۔ اور ہر سرخی دو سطروں کی ہے۔ اس حساب سے اس مخطوطہ میں ۱۴۵ × ۲ × ۱۷ - ۳۵ × ۲ = ۴۸۶۰ اشعار ہیں۔ ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ یہ عنوانات اُردو نثر میں ہیں۔ حالانکہ اس عہد کے بہت بعد تک اکثر مثنوی نویس شعرا کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ سرخیاں فارسی میں لکھا کرتے تھے۔

جناب زور نے ہاشمی کے حالات میں مندرجہ ذیل چیزیں بتائی ہیں۔ اس کا نام سید میراں تھا۔ سید شاہ ہاشم کا پیرزادہ ہونے کی وجہ سے اُسنے اپنا تخلص ہاشمی رکھا۔ وہ بیجاپور کا باشندہ تھا۔ وہ بالکل اندھا تھا۔ وہ علی عادل شاہ (؟) کا درباری شاعر تھا۔ اُس کی تین تصانیف ہیں (۱) ترجمہ احسن القصص (۲) یوسف زلیخا (۳) غزل کا دیوان۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے ہاشمی کے ریختی دیوان کا بھی تذکرہ کیا۔ اور اس کا انتخاب دیا ہے۔ ایک مرثیہ کا بھی ذکر ہے[۷]۔

مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں ایسی جگہ ہوں جہاں تاریخ دکن، و تذکرہ کی کوئی کتاب بھی میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے میں ہاشمی کے متعلق جو کچھ لکھونگا وہ اس کی اس نامکمل مثنوی تک محدود ہوگا۔ البتہ اس کے عقاید کے سلسلہ میں میں نے ریاست پالن پور کی ضخیم تاریخ سے مدد لی ہے کہ اس ریاست کے فرمانروا اور وہاں کی مسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ اُسی ملت اور اُنہی عقاید کا پیرو ہے۔

ہاشمی کے اصلی نام کے متعلق اس مخطوطہ سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو یہ تخلص اُس کے پیر جناب سید ہاشم نے دیا تھا۔ چنانچہ وہ وہ خود کہتا ہے ؎

سکت کاں ہے اتنی بیاں دار میں — کروں وصف ہاشم کا اظہار میں
اوسی کیچ گھر کا ہوں میں سرفراز — اونی ہاشمی مجھکوں بونیا نواز

یہ سید ہاشم اُس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو جناب سید محمد جونپوری کو مہدی موعود تسلیم کرتی ہے۔ اور ہاشمی اسی کا پیرو ہے۔

جناب سید محمد جونپوری ۸۴۷ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی اور وہیں ولایت کے تمام مدارج طے کئے۔ اس کے بعد گجرات و دکن کی سیاحت کے بعد وہ حج کو گئے اور وہیں اپنے مہدی موعود ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد پھر گجرات آئے۔ اور یہاں بھی اپنا اعلان دُہرایا۔ لیکن زمانہ کو مخالف پاکر مختلف مقامات سے ہوتے اور اپنی تعلیم پھیلاتے فرح تک پہنچے اور وہیں اُن کا

۴؎ اردو کے شہ پارے جلد اوّل صفحہ ۳۰۰۔ ۵؎ یہاں پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جاکر ان مخطوطات کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ حیدرآباد میں ایک ایسی اہم تصنیف کو نہیں دیکھتا اور اس کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے۔

۶؎ اردو شہ پارے صفحہ ۲-۱۰۱۔

انتقال ہوا۔[۱۵] اُن کے پانچ خلفا تھے۔ اور ہاشمی نے اپنی مثنوی میں ان سب کا حال لکھا ہے[۱۶]

یو خاتم ولی رب نے پیدا کیا ۔ دنیاں میں تو ساری بڑائی دیا
یو مہدی میں ہے سب پیمبر کا نشان ۔ یو موعود رب کا وہی ہے نشان
نشانیاں تو کیتا اچھی اس میں سب ۔ یو سید محمد ہے جس کا لقب
نبی اور مہدی کو ایکچہ پچھان ۔ یو یک ذات دو کیپ دنا ہے جان
نبوت ولائت کا یوں یک ہے بھید ۔ کہ جوں ایک موتی کے تئیں دو ہیں چھید
فرض جس کی تصدیق ہے کر کہ مان ۔ یقین کفر انکار ہے اس کا جان
یو مہدی خلیفہ ہے رحمان کا ۔ بیاں جن کیا جگ پہ فرقان کا
زمیں ہوا نہ کرے یوں ندا ۔ ہے مہدی کا تقاصا' دیکھا نا خدا
تو آیا ہے مہدی اسی کام کوں ۔ دیکھانے خدا خاص ہور عام کو
او کیتا دیکھا دے خدا بے نقاب ۔ خدا بخش مہدی ہے جس کا خطاب

ولائت نگر کا یو سلطان سانچ ۔ تو اصحاب یعنی وزیراں ہیں پانچ
(۱) میراں سید محمود فرزند ہے ۔ جسے سب نے مہدیچہ ثانی کہے
او صدیق ہے ہور بلند جس کا شان ۔ جس نے سب سوں لیایا ہے اوّل ایمان

---

(۲) دوجے پر ہوا ہے سو خوندمیر نام ۔ صفت قاتلوا ہوا قتیلو اتمام
او صدیق کینا اچھے نام دار ۔ کہ آیا ہے جس پر ولائت کا بھار

---

(۳) تیجا یار سو شاہ نعمت رہے ۔ بداعت کی متعراض مہدی کہے
بلند کیوں نہ اس کا اچھے کا سو تھاؤں ۔ پہ نعمت رکھیا جس کا مہدی نے ناں نو

---

(۴) وہ ہے یار چو تھا ہے شاہی نظام ۔ خدا کن تھیں ملی ہے زمیں جس مدام

---

(۵) پنجم شاہ دلاور ہے مہدی کا یار ۔ لدنی رہے علم جس دن ہنجھار

اس کے بعد ہاشمی نے اپنے پیر شاہ ہاشم کی تعریف کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ اُس نے یہ مثنوی اُن ہی کے حکم سے لکھی ہے۔ ہاشمی کے اوّلین بیان کو پیش نظر رکھ کر ہم کو دو میں سے ایک نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ ہاشمی کے تخلص سے اُسکو اُس کے پیر نے نوازا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو کیا اس بیعت سے پہلے وہ شاعری کرتا تھا۔ اگر کرتا تھا۔ تو اس کا کیا تخلص تھا اور اس کا وہ کلام کس نام سے پایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اُس نے یہ مثنوی پیر کے حکم سے لکھی ہے۔ اور انکو سنایا بھی ہے تو ایسی صورت میں درازی عمر کی حیثیت سے مرید سے زیادہ پیر قابلِ لحاظ ہیں بہرحال ان چیزوں کو نظر انداز کرکے یہاں پر ہم اُس غلطی کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جو مرتب ارد وشہ پارے سے صرف اس لئے ہوئی ہے کہ اُنہوں نے اصل کتاب کا مطالعہ کرنے کی بجائے دوسروں کے بیانات پر بھروسہ کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے :-

"ہاشمی پر نویس تھا کیونکہ اس زمانہ میں بھی اُس کی تین ضخیم کتابوں کے متعلق پتہ چلتا ہے"[۱۷]

یہ تین ضخیم کتابیں یہ ہیں :-

(۱) منترجمہ احسن القصص (۲) یوسف زلیخا (۳) دیوان لائق مرتب کا بیان ہے کہ اوّل الذکر و آخر الذکر کتابوں کے مخطوطے موجود ہیں۔ لیکن بساطین اور احوال سلاطین کے مصنفین نے ترجمہ احسن القصص کا ذکر کیا ہے۔ اور دیوان کا ذکر صرف بساطین نے کیا اور اسی کی رائے پر بھروسہ کرکے فاضل مرتب نے بھی اپنی رائے ہاشمی کے تغزل کے متعلق دیدی ہے۔ رہا ترجمہ احسن القصص کا حال تو میرا خیال ہے کہ اس نادر مثنوی یوسف زلیخا کو بساطین کے مصنف نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ ایسی غلطی نہ کرتا۔ اور نہ دوسروں کو اس میں مبتلا ہونے کا سامان کر جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ سورۂ یوسف کو خود کلام مجید میں "احسن القصص" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور اسی داستان یوسفؑ کو یہ لقب حاصل ہے' ہاشمی نے اپنے پیر کے حکم سے حضرت یوسفؑ کے قصہ کو منظوم کیا اور شاید اس کا نام بھی احسن القصص یا اسکا ترجمہ رکھا ہو۔ بعد میں لوگوں نے بلا دیکھے دو نام سنکر دو کتابیں تسلیم کرلیں اور بساطین کے مصنف نے ذہانت سے کام لے کر یہ توضیح بھی کردی کہ روضۃ الشہدا کا دوسرا نام احسن القصص ہے۔ اب ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں خود ہاشمی کا بیان پیش کرتے ہیں[۱۸]

تلک اکہ ہاشم کیا یوں ندا ۔ کہ اے ہاشمی تجھ نواز یا خدا
ابد لگ رہے گا یو نیکی کا ناں نو ۔ تو مشہور ہوئے عالم میں تھا نو تھا نو
بخیلی نکو کر توں داتا رہو ۔ کہ حاتم کے نمنے تو اظہار ہو
تو شا گنج یعنی زبان کھول توں ۔ عجب یک قصہ عشق کا بول توں
اچھی کا خبر جس کا فرقان میں ۔ کیا جس کی تعریف سبحان نے
کہ یو قصہ توں بول عرفان سوں ۔ کتا ہوں کہ اب دکھنی کان سوں

[۱۵] تاریخ پالن پور حصہ اوّل صفحہ ۸۰۔۲۲۲۔ [۱۶] ہم نے طوالت کے خیال سے سلسل اشعار نقل نہیں کئے ہیں بلکہ انتخاب دیا ہے۔ [۱۷] یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ضمیمہ میں فاضل مرتب نے اس دیوان دکھنی کا جو انہوں نے انتخاب دیا ہے منظوم کیوں کر نہیں کیا صفحہ ۲۴۲

کہیا احسن القصہ جس کوں خدا کتا ہوں سو میں اس کا تجھ ابتدا

اس مضمون لکھنے سے ہمارا مقصد صرف اسی غلط فہمی کو دور کرنا تھا۔ کیونکہ ایسی مستند کتاب کے دامن پر یہ داغ بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اگر فرصت نصیب ہوئی تو نفس مثنوی اور اس کے سلسلہ میں ہاشمی کے حالات۔ اُسکی شاعری اُس کے زور بیان اُس کی وسعت نظر وغیرہ پر کبھی اظہار خیال کیا جائے گا۔ البتہ یہاں پر اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ مثنوی کی اندرونی شہادت ہم کو اس نتیجہ تک پہنچنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ کتاب دکنی اردو سے زیادہ گجراتی اردو کے قریب تر ہے۔

نجیب اشرف

سیرِ کشمیر

کشمیر جنتِ نظیر

کبھی صرف سلاطین کی سلف کی سیرگاہ۔ آرام گاہ اور شکارگاہ تھی۔ مگر آج صلائے عام ہے کہ ہر اہلِ دل و ہر اہلِ ذوق آئے۔ اور اس فردوسِ ارضی کی سیر و تفریح سے بہرہ اندوز ہو ۔

کشمیر میں

جابجا گلپوش وادیوں کی بہاریں۔ نظارے۔ قدم قدم پر شفاف چشمے۔ اور گوھر بار آبشاریں۔ پھولوں میں بسی ہوئی مشکبار و عطر بیز ہوائیں۔ لالہ زاروں کی گلکار و جلوہ ریز فضائیں ہر باغ و راغ قدرت کے معصوم و دلآویز کرشمے۔ ڈل (جھیل) کی آئینہ پوش سطح پر عروسی کشتیوں کی حسین قطاروں کا لطف اٹھائیے ۔

کشمیر کے

آبشاروں کے شیریں نغمے آسمانی الہام کی طرح دل کو نور و سرور سے معمور کر دیتے ہیں۔ ان آبشاروں میں پانی کی بجائے آبحیات مستِ خرام ہے۔ کشمیر کے چشموں کا پانی دلوں سے کدورت اور دامنِ زندگی سے جسمانی کوفت کے داغ دھو ڈالتا ہے۔ زندگی میں ایک بار کشمیر ضرور آئیے۔ اور اگر ایک دفعہ اس فردوس صفت وادی کو دیکھ چکے ہیں۔ تو دوبارہ دیکھنے کی آرزو پوری کیجئے ۔

آپ جب کشمیر دیکھیں۔ جتنی بار دیکھیں۔ ہر بار کشمیر میں زندگی و زندہ دلی اور تفریح و تندرستی کا نیا لطف اٹھائیں گے ۔

سفر کے متعلق تفصیل۔ کتب اور دیگر معلومات پبلسٹی آفیسر نارتھ ویسٹرن ریلوے۔ لاہور سے طلب فرمائیں ۔

ہماری کہانی دوسرے کی زبانی

(از قلم معجز رقم جناب ایم. شمیم صاحب ۔ بلہوری)

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو رفاہِ عام کو اپنا فرض خاص سمجھتی ہیں اور روز و شب اُن کی خدمات میں معروف و منہمک رہتی ہیں ۔ فی الحال ہمارے شہر کانپور میں مالکان مطبع مجیدی جس اولوالعزمی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں ۔ اُس کو دیکھ کر بعض اوقات یہ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے زمانۂ کساد بازاری میں ان حضرات کو کونسا فرض لاحق ہو گیا ہے کہ زبان اردو کی خدمت میں اپنا ہزار ہا روپیہ بیدریغ صرف کر رہے ہیں ۔ میں اور کتب علمیہ کو نظر انداز کرکے صرف صنف لغات کو ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔

لغات سعیدی

یہ وہ چیز ہے جس کی ایک عرصہ سے پبلک کو ضرورت تھی' یہ تمام لغات قدیمہ و جدیدہ عربی' فارسی' ترکی' لاطینی' معرب و مفرس کا ایک بے بہا خزانہ ہے ۔ اس کے محاسن کو بالتفصیل پیش کرنا باعث طوالت ہے اسکو دیکھ کر ہر شخص خود ہی فیصلہ کر سکیگا ۔ کہ یہ کتاب تمام مروجہ کتب لغات سے ایک بین فوق رکھتی ہے ۔ یہ وہ کتاب ہے جو صاحب علم کو ہر وقت امداد پہنچا سکتی ہے ۔ اور اپنے اندر ان تمام الفاظ کا مجموعہ رکھتی ہے جو فی زمانہ علم ادب میں رائج ہیں ۔ آجکل کے نوجوان ادیب' مضمون نگار' طلبا' مدرسین مدارس' اور مترجم صاحبان کے لئے یہ بیش قیمت تحفہ ہے ۔ ضرور خرید یئے ۔ میری نا چیز رائے ہی کیا ہے ۔ ملک کے مشہور اخبارات انقلاب لاہور' جمہور کلکتہ' و معزز رسایل نگار لکھنؤ' زمانہ کانپور ۔ الناظر لکھنؤ اور مشاہیر عظام نے اسکی بابت جو کچھ اظہار خیال فرمایا ہے وہ اسکی خوبیوں کی ایک روشن دلیل ہے ۔ حجم ۶۲۸ صفحات تقطیع فلسکیپ ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ٹائیٹل رنگین قیمت صرف للعہ

منیر اللغات فارسی

یہ لغت ہے کہ "تمام دشواریوں کا تنہا حل" میں نے اسکو تمام و کمال دیکھنے کے بعد جو رائے قایم کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی نوعیت میں نرالی چیز ہے ۔ اور اردو لغات میں اس سے قبل کوئی چیز ایسی شایع نہیں ہوئی ۔ اسمیں فارسی الفاظ بجائے لغات کے لکھکر اُنکے مرادف تمام اردو محاورات مع اسناد اساتذہ ان بطور معنی بیان کئے گئے ہیں ۔ تاکہ ہر شخص فارسی و اردو کے ہم معنی محاورات کا مطلب سمجھ سکے اور یہ معلوم ہو جائے ۔ کہ اردو میں فلاں فلاں محاورہ کا محل صرف کیا ہے ۔ واللہ یہ لغت ہے یا لغت کا فالنامہ' فارسی کی عبارت لکھنے یا اردو کی ۔ دونوں کیلئے یکساں مفید اور کار آمد ہے جس محاورے کو استعمال کرنا ہو مع سند کے دیکھ لیجئے ۔ کیا ایسی مفید کتاب کا مطالعہ کرنیکے بعد یہ ممکن ہے کہ ان کو اردو محاورات پر کامل عبور نہ حاصل ہو جائے ۔ کیا اس سے زیادہ تفصیل اردو زبان کی کوئی اور لغت پیش کر سکتا ہے ۔ اور کر سکتا ہے تو اسقدر حجم ۳۲۰ صفحات تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ٹائیٹل رنگین قیمت صرف تین روپے (عہ)

منیر اللغات اردو

یہ لغت بھی بوجہ اپنے طرز و جامع اور مختصر ہونے کے تمام لغات مروجہ پر ایک فوقیت رکھتی ہے ۔ اسمیں اُنہیں الفاظ و محاورات کا ذکر ہے جو قطعی طور پر اپنے کئی کئی معنی کے ساتھ اردو میں رائج ہیں اور دوسری زبان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں ۔ اس کے شامل دو اور رسالے بھی ہیں ۔ ایک خاص اسماء صفات کا خزینہ ہے اور دوسرا اقوال و امثال فارسی و اردو کا آئینہ ہے میرے نزدیک یہ کتاب بیحد قابلقدر ہے اور اسکا اسکولوں میں رائج کر دینا بیحد مفید و نتیجہ خیز ہوگا ۔ ان دونوں کتابوں کی بابت حضرت لسان القوم مولانا صفی صاحب لکھنوی اور نیز دیگر مشاہیر عظام نے ان کو پسند فرماکر جو تحریر فرمایا ہے وہی رائے اور حقیقی تعریف ہے جو سرٹیفکٹ کے ساتھ شامل ہے ۔ حجم ۲۵۶ صفحات تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ٹائیٹل رنگین قیمت صرف دو روپیہ (عہ)

(۱) محاورات نسوان و بیگماتی زبان (۲) بازاری زبان و اصطلاحات پیشہ وران (۳) غلط العوام و متروک الکلام (۴) منیر البیان فی تحقیق [illegible] ۔

یہ چاروں رسالے بھی اپنی اپنی نوعیت میں ایک جداگانہ حیثیت [illegible] ۔ ایک اگر لکھنؤ و دہلی کے محلات کے محاورات کا گنجینہ ہے تو دوسرا بازاری [illegible] جواریوں وغیرہ کے مخصوص اصطلاحات کا مجموعہ ۔ خاصکر تیسرا رسالہ [illegible] جس کی موجودگی سے آپ الفاظ اردو و فارسی صحیح و فصیح بولنا اور [illegible] کی انگشت نمائی سے اپنے کو بچا سکینگے ۔ چوتھا رسالہ منیر البیان یہ زبان کی [illegible] اور بے مثل ہے ۔ اس میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق بھی [illegible] دکھلایا گیا ہے ۔

ان چاروں رسالوں کی قیمت یکساں اور تقطیع $\frac{18 \times 22}{16}$ یعنی قیمت [illegible]

جملہ فرمائشیں بنام حاجی محمد سعید تاجر کتب و مالک مطبع مجیدی کانپور آنی چاہئیں

المشتہر منیجر مطبع مجیدی ۔ کانپور

اُٹھ مرے کالی کملی والے

(از حضرت میرزا یگانہ لکھنوی)

اے آئینۂ انوارِ ازل — اے جلوہ گہِ ہر حسن عمل
ہے دیر سے ٹھنڈا دل کا کنول — دیدار دکھا پردے سے نکل
میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

جانِ جہاں مقصودِ دو عالم — فرش نشیں اور عرش کا محرم
اشرفِ انساں۔ افضلِ آدم — خاک کا پتلا۔ نورِ مجسم
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

شمعِ جمال کے پروانے — تیری طلب میں دیوانے
سنتے ہیں کیا کیا افسانے — کس روپ میں تو ہے خدا جانے
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

آشفتہ بیانی سن تو سہی — کچھ دردِ نہانی سن تو سہی
ہاں میری زبانی سن تو سہی — یہ رام کہانی سن تو سہی
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے

دیوانہ ہوں لیکن مستِ ولا — گم گشتۂ منزل ہوں تو کیا
کچھ دھیان نہ کر جو ہوا سو ہوا — گمراہ کو شمعِ جمال دکھا
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

روشن کر دے چراغِ امید — مار نہ ڈالے حسرتِ دید
جلوہ ترا سو عید کی عید — دید کوئی جس کی نہ شنید
میرے اندھیرے گھر کے اُجالے
اُٹھ مرے کالی کملی والے

فوجی کارنامہ

(ڈراما)

از جناب منشی کنہیا لال صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ۔ ایڈیٹر "چاند" الہ آباد

منظر [مختصر مکان کا ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آگ جل رہی ہے اور کھانا پک رہا ہے۔ آتشدان کے اوپر ایک فوجی آدمی کی ایک بھدی تصویر لٹک رہی ہے۔ ایک طرف اخبار کا ایک کٹا ہوا ٹکڑا اور ایک تمغہ فریم کیا ہوا آدمی کے پاس ٹنگا ہوا ہے۔ ایک جگہ لوہے کا چولھا وسط میز پر رکھا ہوا ہے۔ کھڑکی میں ایک چھوٹی میز پر بائبل ہے۔ لکڑی کی گدے دار آرام کرسی رکھی ہے]

جون ۱۸۸۱

پردہ اٹھتا ہے اور خالی کمرہ نظر آتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور نورہ بریوشر ایک دیہاتی لڑکی اپنا اسباب لئے داخل ہوتی ہے اور وحشت زدہ نظر چاروں طرف ڈالتی ہے۔ اس کے بعد دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ہتکنڈی ایک چھوٹے صندوق پر اور ہیٹ اور کوٹ اتار کر بائیں جانب یعنی تختہ پر رکھ دیتی ہے۔ ہتکنڈی پر سے اوپر کا کپڑا اٹھاتی ہے۔ اور داہنے جانب کرسی پر رکھدیتی ہے۔

نورہ ۔ یہ چچا گریگوری کی تصویر ہے (آتشدان کے پاس جاتی ہے) آخر بات کیا۔ یہ بالکل آتشدان کے اوپر کیوں لگائی گئی ہے۔ یہ تو بالکل ویسی ہی ہے جیسی ایک ہمارے گھر پر موجود ہے۔ اچھا اسی کے پاس تمغہ بھی لٹک رہا ہے۔ آہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ سارے گھر کا انتظام میرے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ اب دوسری جگہ شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا۔ میرا خیال ہے چچا ابھی تک نہیں آئے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ دس بجے سے پہلے نہیں آتے۔ او ہو یہ تو بڑا اچھا ہوا کہ خادمہ جانے سے پہلے آگ روشن کر گئی۔ اچھا دیکھ لینا چاہئے کہ چچا کے آنے پر سب چیزیں تیار ملینگی یا نہیں۔ مجھے دیکھ کر ان کو سخت حیرت ہوگی۔ میری آمد کے متعلق میری ماں کا خط تو ان کو ضرور مل گیا ہوگا۔ لیکن ان کو اس کا خیال و گمان بھی نہ ہوگا کہ میں اس قدر جلد آجاؤنگی۔ (بڑی میز کے داہنی طرف) تعجب ہے دودھ کیوں نہیں نظر آتا ہے (بڑی میز کے نیچے الماری پر) اوہ دو کوڑی کا مکھن بالکل واہیات۔ بڑا اچھا ہوا کہ میں مکھن اپنے ساتھ لیتی آئی۔ (وہ پیٹ سے مکھن کی گولی اٹھاتی اور ہتکنڈی میں رکھ دیتی ہے۔ اور مکھن کی گولی ہتکنڈی سے نکالتی ہے اور پلیٹ میں رکھ دیتی ہے) اچھا اب گوشت کو تو دیکھوں۔ اونہہ بہت خراب۔ کہاں ہمارے یہاں کا گوشت اور کہاں یہ۔ توبہ توبہ (گوشت کے پارچے کڑاہی میں رکھتی ہے اور کڑاہی کو آگ پر رکھتی ہے۔ (دیگچی کو دیکھتے ہوئے) اگر پانی گرم ہوگیا ہو تو میں چائے تیار کرلوں۔ ہیں اس میں پانی تو ابھی ٹھنڈا ہی ہے۔ خیر کوئی ہرج نہیں میں ابھی گرم کرتی ہوں (آگ پر چڑھی ہوئی دیگچی کا پانی ایک دوسرے برتن میں انڈیلتی ہے اور برتن کو میز پر رکھدیتی ہے) پیارے بڈھے چچا۔ (تصویر کی طرف دیکھ کر) وہ کتنا بہادر اور جری نظر آتا ہے۔ بیشک ان کو بہت ہی زیادہ دلیر ہونا چاہئے تھا۔ جو اس کے خلاف لڑنے آئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ میں اس کو بہت آرام پہنچاؤنگی۔ اور وہ مجھ سے بہت خوش رہیگا۔ (دستک کی آواز آتی ہے) آہ پیارے! دستک! تعجب ہے کہ یہ کون ہے (پھر دستک کی آواز آتی ہے) مجھے دیکھنا چاہئے آخر یہ کون (دروازہ کھولتی ہے)

[سرجنٹ بیگلڈا اندر داخل ہوتا ہے]

سرجنٹ ۔ (سلام کرکے) میں تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں مس۔ کیا مسٹر پھسل گریگوری بریوشر یہیں رہتے ہیں؟

نورہ ۔ (وحشت زدہ ہوکر) جی ہاں۔

سرجنٹ ۔ وہی نا جو اسکاٹ گارڈز میں تھے؟

نورہ - جی ہاں +

سرجنٹ - اور جو واٹرلو کی جنگ میں شریک رہے ؟

نورہ - جی ہاں وہی +

سرجنٹ - میں اُن سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں +

نورہ - ابھی تک وہ نیچے نہیں تشریف لائے +

سرجنٹ - اچھا تو میں واپسی میں ملاقات کرونگا - ذرا ایک ضروری کام ہے - گھنٹے دو گھنٹے میں واپس ہونگا +

نورہ - بہتر ہے (باہر نکلکر) میں اُن سے کیا نام بتاؤں کہ کون ملنے آیا تھا ؟ (سرجنٹ واپس آتا ہے اور اپنی بندوق کے بائیں جانب کے تختے پر رکھ دیتا ہے)

سرجنٹ - میرا نام ہے میکڈانلڈ - توپخانہ کا سرجنٹ میکڈانلڈ - لیکن مس مجھ کو امید ہے کہ تم میرے اظہار خیال کو معاف کروگی - بندوقچیوں کی بارک میں گفتگو رہی تھی کہ بڈھے جنٹلمین کے آرام و آسایش کا پورا خیال نہیں رکھا جاتا - لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ ساری باتیں غلط تھیں کیونکہ اب اس سے زیادہ اور کیا کیا جاسکتا ہے +

نورہ - لیکن میں ابھی ابھی چلی آرہی ہوں - ہم لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ خادمہ ٹھیک انتظام نہیں کرتی ہے تو میرے والد نے مجھکو یہاں بھیجدیا کہ جس طرح مجھ سے ہوسکے اُن کے آرام میں فرق نہ آنے دوں +

سرجنٹ - بیشک اب ان کو خود ہی فرق معلوم ہوگا +

نورہ - (دوڑ دھوپ کرتے اور چائے کو برتن میں رکھتے ہوئے - دو چچا کے لئے اور ایک برتن کے لئے (سرجنٹ سے) ہم لوگوں کو چچا گرگوری پر بہت فخر ہے (سماور کو آگ پر رکھتی ہے اور اُس میں دیگچی سے پانی بھرتی ہے)

سرجنٹ - اپنی جوانی میں وہ بہت شکیل آدمی تھا - اب اُس کے ہم عمروں میں کوئی باقی نہیں رہا - جو نپولین بوناپارٹ کے خلاف جنگ میں شریک تھے +

نورہ - دیکھو اُس کا تمغہ تصویر کے پاس ہی لٹک رہا ہے +

سرجنٹ - (اُس کے بعد) لیکن یہ تمغہ کے علاوہ اور دوسری کیا چیز ہے ؟

نورہ - (انگوٹھے کے بل کھڑی ہوکر اور گردن اُٹھاکر) یہ تو اخبار کا ایک ٹکڑا ہے - جس میں چچاجان کے حالات درج ہیں ، فریم کو اُٹھا لاتی ہے)

سرجنٹ - آہا یہ تو ایک پُرانے کاغذ کا ٹکڑا ہے - کونے پر زرد روشنائی سے تاریخ اگست ۱۸۱۵ء بھی تحریر ہے +

نورہ - (تمغہ [illegible] تو بہت باریک حروف ہیں +

سرجنٹ - [illegible] پڑھکر سنادوں +

نورہ - عنایت ہے آپ کی +

سرجنٹ (گلا صاف کرکے) " ایک بہادرانہ کام " یہ اوپر سرے پر تحریر ہے +

" بروز سہ شنبہ محافظ فوج کے تیسرے رسالہ کی بارک میں ایک بہت شاندار جلسہ منعقد ہوا اور شہزادہ ریجنٹ کی موجودگی میں یہ امتیازی تمغہ کارپورل بریوسٹر کے نذر کیا گیا " -

نورہ - (سرجنٹ کے دست راست) یہ چچا کی شان میں ہے !

سرجنٹ " کپتان بلڈین کے سینہ فوج کے کارپورل گریگوری کو حال کی جنگ عظیم میں اُنکی بہادری کے امتیاز کے لئے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۸ جون کی قابل یادگار تاریخ کو تیسرے محافظ فوج کے چار رسالوں نے ہگی مونٹ کے اُس خاص مقام پر قبضہ کرلیا جو ہماری مورچہ کے جانب راست واقع تھا - ایسی نازک حالت میں بارود ختم ہوگئی اور کارپورل بریوسٹر سامان حرب کے بچانے کے لئے عقب سے بہت تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے کارپورل بریوسٹر کو بنسوڈ و یڑن سے واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ فرانسیسی گولہ اندازنے جھاڑیاں کاٹ کر آگ لگادی اور راستے میں بارود بچھاکر ناقابل گذر بنادیا ہے - باجہ والوں کے پہلے دستہ پر گولہ باری کی گئی اور اُنکا سردار مارا گیا - دستہ کے بقیہ لوگوں نے اس نظارہ سے خائف ہوکر گھوڑوں کی باگ پھیر دی لیکن کارپورل بریوسٹر کود کر گھوڑے کی زین پر بیٹھ گئے - مقابل والے آدمی کو مار کر گرادیا - اور گاڑی کو شعلوں کے درمیان سے لیکر نکل جانے میں کامیاب ہوئے - خدا بہادر بریوسٹر کو زندہ رکھے " +

سرجنٹ - بعد اس بہادری کے صلے میں کارپورل بریوسٹر کو ان کے ساتھیوں کی موجودگی میں سلطنت کے سب سے زیادہ عالی مرتبہ شخص کے ہاتھ سے یہ تمغہ عطا کیا گیا " +

(کاغذ کو رکھ دیتا ہے) بیشک یہ فخر کرنے کی چیز ہے - (فریم واپس کرتا ہے اور وہ آتشدان کے پاس رکھدیتی ہے)

نورہ - اور ہم لوگوں کو بھی اس پر بیحد فخر ہے +

سرجنٹ - اچھا مس مجھ کو ایک ضروری کام ہے (بندوق لے کر) ورنہ ملاقات کرنے کے لئے ٹھہرتا (دروازے پر)

نورہ - (پیچھے پیچھے جاتی ہے) میرا خیال ہے کہ اب اُن کو آنے میں دیر نہ ہوگی +

سرجنٹ - ممکن ہے وہ میری واپسی تک باہر آجائیں - اچھا مس میں معافی چاہتا ہوں تسلیم - (سرجنٹ جاتا ہے)

نورہ - (دروازہ سے اُس کو دیکھتے ہوئے) آہا کیسا شریف آدمی ہے - میں نے آجتک ایسا آدمی کبھی نہیں دیکھا - مزاج بہت اچھا پایا ہے - کیسے اخلاق سے پیش آیا - چچا کے حالات مجھے پڑھکر سنانے کی تکلیف اُٹھائی (بائیں جانب آکر) جیسے چچا کی فتحیابی میں کوئی شک نہیں ہے - ویسے ہی اُس کے نیک ہونے میں بھی کلام نہیں

ہوسکتا۔ اب تو چائے تیار ہوگئی ہوگی (آگ کے پاس جاکر) اب اور—

کارپول (باہر ہی سے) میری۔ میری بز راشن +

نورہ۔ (علیحدہ) یا اللہ رحم کر +

[کارپول گرتا پڑتا۔ بروسٹر کمرے میں گھُو لتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ وہ بہت ہی لاغر اور کمزور ہے۔ بال سفید ہیں۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ نورہ ہاتھ باندھے ہوئے خوفزدہ ہوکر پہلے اس کو دیکھتی ہے۔ پھر دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کی طرف نظر اُٹھاتی ہے]

کارپول۔ (تسکایتاً) میں راشن چاہتا ہوں۔ بغیر اس کے مجھے سردی ستا رہی ہے میرے ہاتھ کو تو دیکھو (وہ انگلیوں کی کرکراتی ہوئی جوڑوں کو کھولتا ہے)

نورہ۔ (میز کے پیچھے جاتی ہے) بڑے چچا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ میرا نام ہے نورہ بروسٹر۔ ایکسس سے آئی ہوں +

کارپول۔ رم گرم ہے۔ شوربے میں غذائیت ہے۔ لیکن مجھ کو ایک پیالی چائے دو (نورہ کو چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے) نوجوان عورت تو نے اپنا نام کیا بتایا؟ (میز کے داہنے جانب بیٹھتا ہے)

نورہ۔ (میز کے بائیں جانب) نورہ بروسٹر +

کارپول۔ بول لڑکی بول۔ تو تو بالکل دیہاتی معلوم ہوتی ہے اور جیسی تیز آواز ہونی چاہئے ویسی نہیں ہے +

نورہ۔ (کرسی کے پیچھے) میں ہوں نورہ بروسٹر چچا (گوشت اُٹھاتی ہے) آپ کی بڑی بھتیجی اکسیلس سے آپ کے ساتھ رہنے کے لئے آئی ہوں (آگ پر چڑھے ہوئے برتن سے گوشت نکالکر پلیٹ میں رکھتی ہے)

کارپول۔ (منہ چیڑ چیڑ کرتے ہوئے) تو نورہ ہے۔ تو شاید میرے بھائی جارجی کی لڑکی ہوگی؟ مجھے جارجی کی لڑکی کا کچھ کچھ خیال ہے +

نورہ۔ (گوشت کو میز پر رکھ کر) نہیں چچا میرا باپ آپ کے بھائی جارجی کا لڑکا ہے (چائے انڈیل کر)

کارپول۔ (کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آستین اوپر چڑھا کر ہنہناتا اور منہ چیڑ چیڑ کرتا ہے) چھوٹا جارجی بیٹل آدمی تھا (نورہ چائے انڈیلتی ہے اور وہ میز سے بھڑ کر بیٹھتا ہے) جارجی نے مجھکو ایک مرتبہ دھکا بھی دیا تھا۔ چند شلنگ کی ضمانت میں میں نے اپنا بلڈ ڈاک کا بچہ اُس کو دیا تھا۔ شاید اب مرگیا ہے اُس نے تم کو لانے کے لئے نہیں دیا؟

نورہ۔ (میز کے داہنے طرف سے کارپول کو تعجب سے دیکھتی ہوئی) بڑے چچا جارجی کو مرے ہوئے بیس برس ہوگئے +

کارپول۔ (ہنہناتے ہوئے) بہت خوبصورت کتے کے بچے تھے۔ بہت خوبصورت (مسٹر بیٹر کرکے پیا پیتا ہے۔ نورہ دوسری پیالی بھرتی ہے) راشن نہ ملنے کی وجہ سے مجھے سردی معلوم ہو رہی ہے۔ رم گرم ہے اور دوسری شراب بھی گرم ہے +

نورہ۔ میں آپ کے لئے کچھ مکھن اور انڈے اپنے ساتھ لیتی آئی ہوں اور ماں نے سلام کہا ہے اور مزاج پوچھا ہے۔ انہوں نے ایک ٹین بالائی بھی آپ کے لئے دیا تھا۔ وہ راستے میں اُلٹ گئی (آگ کی بائیں جانب کی کرسیوں کی قطار کے داہنی طرف)

کارپول۔ (جلدی جلدی کہتے ہوئے) یہ ایک درمیانی عمدہ طریقہ ہے کہ کل چھوڑنا پڑا +

نورہ۔ کیا چیز چچا؟

کارپول۔ وہی گاڑی جس پر تم آئی ہو +

نورہ۔ نہیں میں صبح کی ٹرین سے آئی ہوں +

کارپول۔ خدایا ذرا اس کو سوچو تو۔ ریلوے ٹرین! تم اس بڑے بڑے خوفناک پہیے والی چیز سے خائف نہیں ہوئیں۔ ریلوے ٹرین سے تمہارا آنا خیال کرکے ڈر معلوم ہوتا ہے (چیڑ چیڑ کرتے ہوئے) خدایا۔ اب دنیا میں کیا ہونیوالا ہے۔ (سینے کو پھیلا کر بازو پھیلانے کی کوشش کرتا ہے) کھانے کے بعد اب مجھکو طاقت معلوم ہو رہی ہے +

نورہ۔ بیشک چچا کھانا کھانے کے بعد آپ کچھ مضبوط معلوم ہو رہے ہیں (میز کے اوپر سے چیزوں کو ہٹاتی ہے)

کارپول۔ غذا اُس آگ کے کوئلے کے مثال معلوم ہوتی ہے۔ لیکن لڑکی میں جل نہیں گیا ہوں +

نورہ۔ (میز کو صاف کرتے ہوئے) آپ نے تو بہت عمر پایا ہے۔ چچا آپ کو ایک زمانہ دراز معلوم ہونا چاہئے +

کارپول۔ نہیں بہت زیادہ نہیں۔ میری عمر نوے برس سے کچھ زیادہ ہے لیکن سارے واقعات معلوم ہوتے ہیں کل کی بات ہے۔ جب مجھے انعام ملا تھا۔ اور لڑائی ہوئی تھی۔ میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ جنگ عظیم کے بارود کی خوشبو ابھی تک میری ناک سے نہیں گئی +

نورہ۔ ہاں چچا میں نے پڑھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں آپکو اُس پر بہت فخر ہوگا

کارپورل ۔ (کھڑا ہو کر اس کو دیکھتا ہے) میرے لئے یہ بہت بڑا دن تھا۔ بہت بڑا شہزادہ ریجنٹ موجود تھا۔ بڑا خوبصورت اور سڈول جسم پایا تھا۔ (پائپ میں تمباکو بھرتا ہے) وہ کہتا تھا "فوج کو تم پر فخر ہے"۔ اور میں کہتا تھا "مجھ کو فوج پر فخر ہے"۔ اور وہ لارڈ بل سے کہتا تھا "کیسا معقول جواب دیا۔ اور دونوں مسکرا بوٹ جاتے تھے (کھانستا ہے اور منہ چبڑ چبڑ کرتا ہے اور آتشدان کے اوپر والے حصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے)

نورہ ۔ چچا آپ کیا مانگتے ہیں؟ کیا چیز دوں؟ (آتشدان کے اوپر سے بوتل اور چمچہ لاتی ہے)

کارپورل ۔ اس بوتل سے ایک چمچہ دے لڑکی (اس کو پیتا ہے) یہ بہت مفید دوا ہے (باجے کی آواز آتی ہے) اور بلغم کو خارج کرتی ہے (نورہ کھڑکی سے جھانکتی ہے) تم کھڑکی سے کیا دیکھ رہی ہو؟ (نورہ کھڑکی کھولتی ہے۔ اور باجے کی آواز صاف آتی ہے)

نورہ ۔ چچا اس سڑک سے فوج کا ایک رسالہ آرہا ہے ؎

کارپورل ۔ (اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے) رسالہ! ہاہا میرے گلاس کہاں ہیں؟ میں ان کو کان میں لگا کر بہت صاف سن سکتا ہوں۔ پہلے کی طرح اب بینڈ نہیں بجتا (کھڑکی سے دیکھ کر) ڈرم میجر وغیرہ سب موجود ہیں۔ لڑکی دیکھ تو اُن کا نمبر کیا ہے؟ (اُس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ چھڑی اور باجے کی آواز پر حرکت کرتا ہے)

نورہ ۔ ان کا تو کوئی نمبر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ شانے پر البتہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ غالباً آکسفورڈ شائر ہے ؎

کارپورل ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے سنا تھا کہ نمبر اڑا دیا گیا ہے۔ اور اُن کا نئے طرز کا نام رکھا گیا ہے۔ (سر ہلاتا ہے) اگر یہ ڈوک کے سنے کیا گیا ہوتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہتا۔ وہ جا رہے ہیں۔ وہ سب کے سب نوعمر ہیں۔ لیکن مارچ کرنے کے قاعدے سے خوب واقف ہیں۔ (باجے کی آواز دھیمی ہو جاتی ہے) اس وقت وہ گھومنے جا رہے ہیں (وہ دیکھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سب غائب ہو جاتے ہیں)

نورہ ۔ (نورہ مدد دیتے ہوئے) اب اپنی کرسی پر چلکر بیٹھئے ؎

کارپورل ۔ اچھا وہ بوتل پھر لاؤ۔ اُس سے بلغم خارج ہوتا ہے۔ جوانس کہتا ہے کہ یہ تمہارے لئے بہت مفید چیز ہے۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اور میں اُس کے کلب میں ہوں۔ دیکھو وہاں ادائیگی کا کارڈ رکھا ہوا ہے۔ بینڈ بند ہو جاتا (یکایک اپنی ران کو پیٹ کر) میں سمجھتا ہوں کچھ دال میں کالا ہے ؎

نورہ ۔ کہاں چچا؟

کارپورل ۔ میں سپاہیوں کے لئے کہہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے وہ اپنا موزہ ہی پہننا بھول گئے ہیں۔ ایک سپاہی بھی موزہ نہیں پہنے ہے (منہ چبڑ چبڑ کرتا ہے) اگر ڈیوک ہوتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ؎

(دروازہ کھلتا ہے اور سرجنٹ نظر آتا ہے)

نورہ ۔ (دروازہ کی طرف دیکھتے ہوئے) چچا یہ وہی سپاہی ہے جو صبح آیا تھا۔ نیلا کوٹ ہے اور اُس میں سنہری پلیٹ لگی ہوئی ہے ؎

کارپورل ۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ لڑکی کھڑی دیکھتی کیا ہے۔ دروازہ پر جا اور اُس سے دریافت کر ؎

(وہ دروازے پر جاتی ہے جو نصف کھلا ہوا ہے۔ توپخانہ کا سرجنٹ میکڈانالڈ اپنی بندوق لئے ہوئے دروازے کے نزدیک آتا ہے اور سلام کرتا ہے)

سرجنٹ ۔ میں دوبارہ تسلیم عرض کرتا ہوں۔ بڈھے جنٹلمین سے اب ملاقات ہو سکتی ہے؟

نورہ ۔ جی ہاں وہ موجود ہیں۔ مجھے اُمید ہے آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہونگے۔ چچا ایک شخص آپ سے ملنا چاہتے ہیں ؎

سرجنٹ ۔ آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خوشی اور فخر دونوں ساتھ ساتھ ؎

(آگے بڑھتا ہے بندوق کو زمین پر ٹیک کر فوجی قاعدہ سے سلام کرتا ہے۔ نورہ کچھ خوفزدہ اور کچھ اشتیاق آمیز نظروں سے آنے والے کو دیکھتی رہتی ہے۔]

کارپورل ۔ (سرجنٹ کی طرف دیکھکر) بیٹھ جاؤ سرجنٹ بیٹھ جاؤ (سر سے اشارہ کرتا ہے) بلے حاصل کرنے کے لئے تم بالکل جوان ہو۔ میرے زمانے میں تو ایک بلا بھی حاصل کر لینا بہت مشکل تھا۔ اب تو تمغے حاصل کر لینا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بندوقچی پرانے سپاہی رکھے جاتے تھے۔ اور وہ لوگ بہت جلد تمغے حاصل کر لیتے تھے ؎

(سرجنٹ لڑکی کے پاس بندوق کھڑی کر دیتا ہے۔ نورہ جھاڑن اُٹھا کر لپیٹتی ہے اور اُس کو ہتکنڈی میں رکھ دیتی ہے]

سرجنٹ ۔ ملازمت کرتے ہوئے مجھے آٹھ برس ہوئے۔ میکڈانلڈ میرا نام ہے۔ اپنے ماتحتوں کی طرف سے آپ سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ جو شہروں میں آپ کی ذات کو غنیمت سمجھتے ہیں ؎

[نورہ میز صاف کر چکتی ہے اور میز پوش لپٹا ہوا الماری میں رکھا ہوا ہے]

کارپورل۔ (چڑچڑ کرتے اور ہاتھ ملتے ہوئے) ریجنٹ نے جو کہا تھا وہی بات ہے وہ کہتا تھا "فوج کو تم پر فخر ہے" اور میں کہتا تھا "مجھ کو فوج پر فخر ہے" وہ لارڈ مبل سے کہتا تھا "دیکھو کیسا معقول جواب دیا" اور دونوں ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔

سرجنٹ۔ اگر آپ یہاں سے تھوڑی دور کی تکلیف گوارا کریں تو تمباکو سے بھرا ہوا پائپ اور ایک گلاس شراب کو ہمیشہ اپنا منتظر پائیں گے اور ادنیٰ درجہ کے ملازمین آپ کی تشریف آوری کو باعث فخر تصور کریں گے۔

کارپورل۔ (کھلکھلاتے ہوئے ہنسکر) وہ کتے مجھ کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اچھا۔ اگر جی پڑنے لگے تو میں آؤنگا۔ آج میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ اور سردی معلوم ہو رہی ہے (سینے کو تھپتھپا کر) تم کسی نہ کسی روز مجھ کو بارک میں دیکھو گے۔

سرجنٹ۔ تو نن کمیشن مس کو دریافت کرنا یاد رکھئیگا۔

کارپورل۔ آں۔

سرجنٹ۔ نن کمیشن مس۔

کارپورل۔ او خدا۔ افسروں کی طرح اُس کے بھی ساتھی ہیں۔ فوجی شرابخانے کے لئے یہ بہت ہی عظیم الشان بات ہے۔ اگر یہ ڈیوک کے لئے کیا جاتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہتا۔

سرجنٹ۔ (تعظیماً) آپ تو محافظ دستہ میں تھے نا؟

کارپورل۔ ہاں میں ایک محافظ ہوں۔ وہی تھرڈ گارڈ جو اب اسکاٹس گارڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس میں جتنے تھے سب مر گئے۔ ایک بچہ بھی زندہ نہ رہا بجز مجھ آوارہ گرد کے۔ میں اپنے کو اسی نام سے یاد کرتا ہوں۔ اور یہ میرا قصور نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی تک میری طلبی نہیں ہوئی۔ اور بغیر طلبی کے میں اپنی جگہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

سرجنٹ۔ (سر ہلا کر) جتنے ہیں ایک دن ہم سب لوگ وہاں جمع ہوں گے۔ لیجئے ذرا میرے تمباکو کا تو مزہ چکھئے۔ (تھیلی دیتا ہے)

کارپورل۔ آں۔

سرجنٹ۔ لیجئے تمباکو سے شوق کیجئے۔

[کارپورل بریوسٹر اپنے مٹی کے پائپ کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ گر پڑتا ہے۔ اور ٹوٹ جاتا ہے۔ کارپورل بچوں کی طرح لمبی لمبی ہچکیاں بھر کر رونے لگتا ہے]

کارپورل۔ میرا پائپ۔ میرا پائپ۔ ٹوٹ گیا میرا پائپ۔

نورہ۔ (دوڑ کر اُس کے پاس جاتی ہے اور اُس کو تسکین دیتی ہے) چچا نہ روئیے۔ نہ روئیے ہم دوسری منگوا لیں گے۔

سرجنٹ۔ اپنے دل کو رنجیدہ نہ کیجئے (پائپ دیتے ہوئے) لیجئے یہ لیجئے۔ اُمید ہے کہ آپ قبولیت کی عزت بخشیں گے۔ یہ لکڑی کا پائپ ہے اور کہربا کی منال لگی ہوئی ہے۔

کارپورل۔ (روتے میں ہنسکر۔ سرجنٹ اپنی بندوق لاتا ہے) واہ واہ یہ بہت نفیس پائپ ہے۔ لڑکی ذرا میرے نئے پائپ کو دیکھ۔ جارجی کو ایسا پائپ نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ اس میں کہربا کی منال لگی ہوئی ہے (منہ سے لگاتا ہے) تم کو یہ بندوق وہیں سے ملی ہے سرجنٹ۔

سرجنٹ۔ جی ہاں میں بارک سے واپس آرہا تھا کہ آپ سے ملنے چلا آیا۔

کارپورل۔ ذرا مجھ کو دو۔ دیکھوں تو۔

سرجنٹ۔ ضرور۔ (بندوق دیتا ہے)

کارپورل۔ یہ تو پرانے ہی زمانہ کی بندوق کی طرح ہے! ایک ہاتھ کندھے پر رہے۔ اچھا اپنے بندوق کا گھوڑا چڑھاؤ۔ لاؤ مجھ کو دو۔ ارے سرجنٹ۔

[بندوق کا کندہ سینے سے کھل گیا۔ نورہ میز پر سے دیکھ رہی تھی) آہ۔ یہ تو کندہ تو ٹوٹ کر دو ہو گیا۔

سرجنٹ۔ (ہنستے ہوئے) یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیور دبنے سے پچھلا حصہ کھل گیا یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بندوق بھری جاتی ہے۔

کارپورل۔ ہیں۔ اس غلط سرے سے بھرتے ہو۔ اچھا معلوم ہوا اس میں گرگ کیفورٹ نہیں ہے۔ میں نے لوگوں کو کہتے ہوئے سنا تھا لیکن مجھ کو یقین نہیں آتا تھا۔

سرجنٹ۔ (کھڑا ہو کر) میں نے آپ کو بہت تکلیف دی۔ اب پھر کسی روز ملاقات کرونگا۔ اور اپنے ساتھ دو ایک آدمیوں کو بھی لیتا آؤنگا۔ کیونکہ آپ سے ملنے کے بہت لوگ شائق ہیں (سلام کرتے اور جاتے ہوئے) میں تسلیم عرض کرتا ہوں۔

نورہ۔ چچا کیا وہ ایک شریف اور خلیق آدمی نہیں ہے؟ (دروازہ تک جاتی اور اس کو دیکھتی رہتی ہے)

کارپورل۔ (ہنہناتے ہوئے) لڑکی وہ جلے حاصل کرنے کے لئے بہت کم سن ہے۔

بندوقچیوں کے سرجنٹ کو سن رسیدہ ہونا چاہئے معلوم نہیں آجکل یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے (جیبڑ چیبڑ کرتے ہوئے) لیکن نورہ اُس نے مجھ کو ایک پائپ دیا ہے۔ بہت نفیس پائپ جس میں کہربا کی منہال لگی ہوئی ہے۔ بھائی جارجی کو ایسا پائپ کبھی نصیب نہ ہوا ہوگا +

نورہ- (علیحدہ دروازہ کی طرف اشارہ کرکے) وہ ساٹھ برس میں چچا کی طرح ہو جائیگا اور کسی زمانہ میں چچا اُس کی طرح رہا ہوگا (بائیں جانب بڑھ کر) وہ بہت ہی خلیق معلوم ہوتا ہے۔ مجھ کو "مس" اور چچا کو "جناب" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ایسا نفیس آدمی تو آجتک میری نظر سے نہیں گذرا +

کارپورل- لڑکی تو کیا ادھر اُدھر کر رہی ہے۔ ذرا کرسی کو دروازہ تک لے جانے میں مجھے مدد دے۔ یا تو یہ خیال کر رہی ہے کہ کرسی خود بخود چلی جائے گی۔ یہاں گرمی ہے اگر ہوا سے مکھیاں اوڑ اوڑ آئنگا تو مجھ کو تکلیف پہنچیگی۔ اس موسم میں یہ بہت ناگوار معلوم ہوتی ہیں +

نورہ- کیا چیز چچا۔ مکھیاں ؟

[وہ بہت آہستہ آہستہ اُس جگہ جاتا ہے جہاں سورج کی روشنی دروازے سے کمرے میں آتی ہے اور وہ دھوپ میں بیٹھتا ہے۔ نورہ اُس کو چلنے میں پکڑے رہتی ہے]

کارپورل - یہ بہت عمدہ جگہ ہے۔ سورج کی روشنی دیکھ کر مجھ کو ہمیشہ عزت اور ناموری کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ پادری آج آیا تھا ؟

نورہ - چچا جان وہ تو نہیں آیا (بائیں جانب جھکتی ہے)

کارپورل- تو پھر وہ کل آیا تھا۔ مجھے پڑھ کر سناتا ہے +

نورہ - چچا جان میں بھی سنا سکتی ہوں +

کارپورل- تم بھی پڑھ سکتی ہو؟ میں نے تو ایسی لڑکی نہیں دیکھی تم ریلوے ٹرین سے سفر کر سکتی ہو۔ تم پڑھ سکتی ہو۔ یہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے؟ پادری آتا ہے تو مجھ کو بائیبل پڑھ کر سناتا ہے (نورہ دوڑ کر جاتی ہے اور بائیبل لاتی ہے۔ اس کے بعد جھک جاتی ہے)

نورہ - (بائیبل کھولکر) کونسا بیان آپ سننا چاہتے ہیں ؟

کارپورل- آن- (نورہ پھر انہیں الفاظ کو دہراتی ہے)

کارپورل - لڑائی کا بیان +

نورہ - لڑائی !

کارپورل- ہاں لڑائی کا بیان۔ پادری جب آتا ہے تو اولڈ ٹسٹامنٹ مانگتا ہے اور کہتا ہے بنی اسرائیل بہت بہادر سپاہی تھے +

نورہ - لیکن چچا جان دوسری دنیا میں تو بالکل امن ہے +

کارپورل - نہیں لڑکی نہیں +

نورہ - ہاں چچا جان یقینی +

کارپورل - (کچھ ناراضگی سے اپنی چھڑی زمین پر گرا کر) میں تو کہتا ہوں لڑکی نہیں۔ میں نے پادری سے پوچھا تھا +

نورہ - پھر اُس نے کیا بتایا تھا +

کارپورل- وہ کہتا تھا کہ وہاں ایک آخری جنگ ہوگی +

نورہ - جنگ ہوگی +

کارپورل- ہاں ہاں لڑکی۔ اُس نے اُس جنگ کا نام بھی تو بتایا تھا۔ دیکھو۔ آ۔ آ

نورہ- آرمگڈن +

کارپورل- ہاں ہاں یہی نام تھا (کچھ سوچنے لگتا ہے) مجھے اُمید ہے کہ تھرڈ گارڈ بھی وہاں موجود رہے گا۔ اور ڈوک ـــ ڈوک کو کچھ نہ کچھ کہنا ہوگا۔ (کرسی میں کچھ لیٹ جاتا ہے۔ نورہ کھڑکی بند کرکے بائیبل رکھ دیتی ہے)

نورہ - آج طبیعت کیسی ہے چچا جان ؟ آپ کچھ خستہ معلوم ہوتے ہیں +

کارپورل- (ناتوانی سے) ہوا کافی لگ گئی ہے۔ اور ان مکھیوں سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا +

نورہ - چچا جان میں ان کو دور رکھونگی +

کارپورل - اس موسم میں یہ بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اچھا آؤ ذرا اس کرسی کو اُٹھاؤ تو (دستک) کرسیاں اسقدر وزنی بنائی جاتی ہیں کہ اُٹھانے میں دقت ہوتی ہے +

[اُٹھتے وقت زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے اور کرنیل ٹرونٹر شہری لباس میں داخل ہوتا ہے]

کرنیل - کیا گریگوری بریوسٹر آپ ہی کا نام ہے ؟

کارپورل - ہاں جناب میرا ہی نام ہے +

کرنیل - تو آپ وہی شخص ہیں جس سے میں ملنے آیا ہوں +

کارپورل- وہ کون ہے جناب ؟

کرنیل- گریگوری بریوسٹر اُن کا نام ہے +

کارپورل- تو میں وہی آدمی ہوں جناب +

کرنیل- آپ وہی بریوسٹر ہیں جن کا نام اسکاٹ گارڈ کے رجسٹر میں درج ہے۔

اور جو واٹرلو کی جنگ میں شریک تھے ؟

کارپورل ۔ وہی بریوسٹر جناب۔ میرے زمانے میں وہ تھرڈ گارڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ وہ بہت اچھا رسالہ تھا۔ اب صرف ان کو میری اس لئے ضرورت ہے کہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں +

کرنیل ۔ خوب۔ خوب۔ ابھی ان کو عرصہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھ کو آپ سے کچھ بات کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اس لئے حاضر ہوا۔ کیونکہ میں اسکاٹس گارڈ کا کرنیل ہوں

(کارپورل جلدی سے کود کر کھڑا ہو گیا اور فوجی قاعدہ سے سلام کیا۔ وہ گرنے کے لئے لڑکھڑایا۔ کرنیل اور نورہ نے اس کو سنبھالا۔ نورہ اُس کے بائیں طرف تھی)

کرنیل ۔ سنبھلو سنبھلو (بریوسٹر کو دوسری کرسی کے پاس لیجاتا ہے۔ آرام اور اطمینان۔ . . . . . .

کارپورل ۔ (بیٹھکر ہانپتے ہوئے) میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جناب مجھکو خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا۔ میں فلینگ کمپنی کا ایک معمولی حیثیت کا کارپورل ہوں۔ اور حضور فوج کے کرنیل ہیں۔ مجھ ناچیز کی ملاقات کے لئے تکلیف گوارا کرنا میری عزت افزائی کرنا ہے +

(نورہ میز کے داہنی طرف اس کو بیٹھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور کرنیل آتشدان کے پاس بیٹھتا ہے)

کرنیل ۔ ہم لوگوں کو لندن میں آپ کی ذات پر بہت فخر ہے +

کارپورل ۔ یہی بات تو ریجنٹ نے بھی کہی تھی "فوج کو تم پر فخر ہے" +

کرنیل ۔ آپ تو بگی مونٹ کی فتحیابی میں یقینی شریک تھے ؟

(نورہ ہتکنڈی میں سے سوئی دھاگہ لے کر میز کے بائیں طرف سینے کے لئے بیٹھتی ہے)

کارپورل ۔ جی ہاں میں شریک تھا +

کرنیل ۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ بہت آرام سے اور خوش ہونگے +

کارپورل ۔ جب موسم ٹھہر جاتا ہے اور مکھیاں ستانے کے لئے نہیں ہوتیں تو میری طبیعت اچھی رہتی ہے۔ کھانسی کی البتہ شکایت رہتی ہے۔ بلغم خارج ہونے کی دوا پیتا ہوں۔ اور جب کھانا نہیں کھاتا تو سردی پریشان کرتی ہے اب عضو بیکار ہو کر کسی کام کے نہیں رہے +

کرنیل ۔ دماغ کی کیا حالت ہے ؟

کارپورل ۔ دماغ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ میں فوج کے ہر شخص کا نام بتا سکتا ہوں

کرنیل ۔ اور جنگ کے واقعات یاد ہیں ؟

کارپورل ۔ بالکل ہو بہو ویسے ہی۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو سارے واقعات سامنے آجاتے ہیں اور اسقدر صاف اور واضح کہ آپ یقین نہیں کر سکتے اچھا دیکھئے وہ دوا کا بوتل جہاں رکھا ہے۔ اُس کے داہنی طرف ہماری فوج ہے۔ آپ دیکھتے ہیں نا۔ اور جہاں ہماری فوج ہے اُس کے داہنی طرف گولے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ اچھا جناب یہ ہو گیا۔ اب دیکھئے (سر اٹھا کر اطمینان سے بوتل کی طرف دیکھتا ہے) یہاں ہماری زد فوج ہے۔ اور یہاں پر ہماری بندوقیں وغیرہ ہیں۔ اور وہ اُس مقام پر جہاں میرا پائپ رکھا ہوا ہے فرنچ ہیں۔ اور وہ تھوک کی جگہ پر پیادہ فوجیں ہیں۔ جو ہمارے میمنہ پر حملہ کرنے آرہے ہیں۔ اُن کی بندوقوں کے دھوئیں کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ (نورہ اُس کو کرسی پر بیٹھنے میں مدد دیتی ہے)

کرنیل ۔ اچھا آپ کی زندگی میں کس بات سے آپ کے دل کو صدمہ

کارپورل ۔ مجھے جو صدمہ رہا تو تین روپے کا۔ جو میرے ہاتھ
لیکن اب جبکہ ملنا ہی نہیں ہے تو اُس کا غم کرنا بر
میں جابز اسمتھ کو قرض دیا تھا۔ اور آ
دیدونگا۔ فرق نہ پڑے گا۔ لیکن آ
وہ مارا گیا۔ بس اُس تین رو

کرنیل (ہنسکر گارڈ کے او
پیش کرنا چاہتے ہو
ادا کرنے کی ضر
(کار
ر

کارپور

کر نہ

از ایڈیٹر

کتابت کی غلطیاں

(۱) حضرت منظر صدیقی کی جو رباعیاں نیرنگ خیال عید نمبر میں شایع ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ایک رباعی یوں شایع ہوگئی ہے

تم جانتے ہو آتے ہیں محرم گھر میں

صحیح یوں ہے - تم جاتے ہو آتے ہیں محرم گھر میں

پانچویں رباعی کا پہلا مصرعہ یوں شایع ہوا ہے

جو ذریعہ التفات جاناں نہ ہوا

صحیح یوں ہے - جو فدیۂ التفات جاناں نہ ہوا

(۲) جنوری کے نیرنگ خیال میں میرزا یگانہ کی ایک غزل شایع ہوئی ہے

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

اپنے دم کی ہے روشنی ساری دیدۂ دل تو وا کرے کوئی

پہلے شعر میں وفا کی جگہ گلہ اور دوسرے میں اپنے دم کی جگہ اپنے دل چھپ گیا تھا جو غلط ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں +

(۳) نیرنگ خیال عید نمبر میں جو نعتیہ نظم بعنوان صلِّ علیٰ محمد شایع ہوئی ہے وہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب قیس شروانی کی ہے جناب امرچند صاحب قیس کا نام غلطی سے چھپ گیا ہے +

(۴) سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے مضمون میں ایک جگہ اوّل الذکر و آخر الذکر کے مخلوطے "نہیں" مگر رسالہ میں "ہیں" چھپ گیا ہے +

نیرنگ خیال کے محسن خصوصی جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم۔ جو پورٹ بلیئر میں اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ اب پھر غازی آباد میں ڈپٹی کلکٹری کی پوسٹ پر ہندوستان تشریف لے آئے ہیں +

فروری و مارچ کا رسالہ - چند اصحاب نے فروری اور چند نے مارچ کا پرچہ علیحدہ طلب فرمایا ہے۔ حالانکہ فروری اور مارچ کے مشترکہ نمبر کا نام عید نمبر تھا +

پشاور کا رسالہ ادیب بند نہیں ہوا۔ نیرنگ خیال عید نمبر میں کسی مضمون کے سلسلہ میں پشاور کے مشہور رسالہ ادیب کے متعلق شایع ہوا تھا کہ وہ نقصانات کی وجہ سے بند ہوگیا ہے۔ الحمد للہ کہ یہ خبر غلط نکلی۔ ادیب کی اشاعت میں جو التوا ہوا ہے وہ عارضی ہے اور عنقریب رسالہ ادیب ہمارے عزیز دوست حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری مصنف شاہنامۂ اسلام کی زیر ادارت بڑی شان و شوکت سے شایع ہوگا۔ صوبہ سرحد سے اُردو سے ایک بلند پایہ رسالہ کا شایع ہونا ترقی اردو کے لئے اشد ضروری ہے۔ اب ادیب ایسے ہاتھوں میں آگیا ہے جو اس کی ترقی کے ضامن ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ جدید انتظامات کے ماتحت پہلے سے بھی زیادہ مقبول و معروف ہوگا +

ناظرین نیرنگ خیال کے نام | نیرنگ خیال کو سب سے زیادہ محکمۂ ڈاک کی طرف سے نقصان پہنچا ہے۔ نیرنگ خیال کی جاذب نظر تصاویر اور اُسکے دلچسپ مضامین اُسکی زندگی کے لئے بلائے جان ثابت ہو رہے ہیں۔ ہر ماہ دو تین سو پرچے دوبارہ بھیجنے پر بھی شکایات کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ہر ڈاک نئے خریداروں میں اضافہ کرتی اور ہر ماہ کے پرانے خریداروں کی واپسی ایک معتدبہ کمی پیدا کر دیتی ہے۔ اگر نیرنگ خیال کے پرچے ڈاک میں چوری نہ ہوا کریں تو بلاشبہ نیرنگ خیال کی اشاعت دس ہزار ہو جائی۔ اس لئے ہم ناظرین نیرنگ خیال کی خدمت میں اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں ہمارے ساتھ تعاون کریں اسکی تدبیر یوں ہے کہ (۱) وہ خیال رکھیں کہ رسالہ لاہور سے ۲۴ تاریخ کو روانہ ہوکر انہیں ۱۰ تاریخ تک ملگیا ہے یا نہیں اگر رسالہ ۱۰ تاریخ تک نہ ملے تو ایک کارڈ لکھ کر دوبارہ دفتر سے طلب کریں اور ساتھ ہی ایک لفافہ لکھکر محکمۂ ڈاک سے بازپرس کریں۔ اس قسم کے شکایتی خطوط پر ٹکٹ نہیں لگانا پڑتا البتہ وہ پوسٹ ماسٹر کے نام لکھے گئے ہوں (۲) اگر آپکا پتہ تبدیل ہو تو اسکی اطلاع دیجئے (۳) عدم رسیدگی

افسانہ

تحفہ

از جناب سید خیرات علی صاحب زیدی۔ حیدرآباد دکن

رشید بھائی اور میں دونوں مل کر بازار کی سیر کو چلے۔ اس لئے کہ آج عید کا دن تھا۔ اور ہمارے پاس کچھ روپے بھی تھے۔ اور رشید بھائی کا دل بہلانا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ اُن کی منگیتر رشیدہ کا خیال رہ رہ کر ان کو ستا رہا تھا۔ جب سے وہ تین ماہ ہوئے دو سو روپے اپنے اور ایک سو روپے رشید بھائی کے لے کر ــــ جو انہوں نے اپنی جائداد فروخت کرکے اُسکو دئیے تھے ــــ اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی۔ اور یہاں رشید بھائی اُس کے فراق میں گھلے جا رہے تھے۔ ان کے نام حال میں اُس کا ایک خط آیا تھا کہ وہ چل بھی ہے اور عنقریب حیدرآباد پہنچکر رشید سے نکاح کرلیگی۔ پھر اس کے بعد سے اُس کا پتہ ہی نہ تھا۔ خدا جانے کہاں تھی۔ رشید بھائی انتظار کرتے کرتے تنگ آ گئے اور رشیدہ کا کہیں پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

پھر اس پر غضب یہ ہوا کہ آج عید کا دن۔ رشید بھائی اُس کی صورت کو ترس رہے تھے۔ اس لئے میں اُنہیں بازار لے گیا۔ میں نے سوچا کہ وہاں جاکر گھومنے اور کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھنے سے ان کا دل بہل جائے گا۔ مگر رشید بھائی کا دل بہت مغموم تھا۔ اور وہ کسیطرح خوش نہ ہوتے تھے۔ جو چیز بھی ان کے سامنے آتی وہ غصہ سے اُسے دیکھنے لگتے۔

اس لئے میں اُنہیں مجمع سے نکال کر علیحدہ کھلے مقام پر لے گیا۔ ایک دوکان پر آکر وہ رک گئے اور کسقدر نرمی سے مجھ سے کہنے لگے:۔

"یہاں البتہ میرا دل بہلیگا۔ چلو نجومی کو ہاتھ دکھائیں۔ دیکھیں کیا کہتا ہے"۔

رشید بھائی ایسی باتوں کے بڑے معتقد تھے۔

غرض وہ اور میں مل کر دوکان کی طرف چلے۔ دوکان پر ایک تختی لگی تھی

نجومی برہمن
دل کے معاملے۔ قسمت کے کھیل

ہم دوکان میں داخل ہوئے۔ ایک چٹائی پر دھوتی باندھے ایک برہمن مہاراج بیٹھے تھے۔ جن کے گلے میں ایک ڈوری پڑی تھی جو ان کے برہنہ پیٹ پر اُس جگہ آکر ختم ہوتی تھی۔ جہاں سے عموماً دھوتی باندھی جاتی ہے۔

رشید بھائی نے اُن کے ہاتھ میں پیسے رکھے اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مہاراج نے بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا:۔

"تمہاری قسمت کی لکیر سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا ستارہ ابتک چکر میں ہے تمہارے اوپر مصیبتیں پڑی ہیں۔ اور ابھی تھوڑے دن اور تمہارا ستارہ نحوست میں رہے گا۔ تمہارا دل ایک عورت پر ہے۔ اور اس عورت کے باعث تم کو تکلیف پہنچی ہے"۔

رشید بھائی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا اس طرح کہ برہمن بھی سن سکتا تھا:۔

"لطیف۔ یہ رشیدہ کو کہہ رہا ہے!"

"اُس عورت کا نام (ر) سے شروع ہوتا ہے"

"سن رہے ہو!" رشید بھائی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں سے دوستی پیدا کرنا چاہو گے۔ مگر وہ تم کو تکلیف پہنچائیں گے۔ ایک کالے آدمی اور ایک بھورے بال والی عورت سے دور رہو۔ یہ دونوں تم کو نقصان پہنچائیں گے۔ تم بہت جلد پانی پر سفر کروگے اور مالی نقصان اُٹھاؤگے مگر اس کے بعد تمہارا ستارہ چمکیگا۔ اور ایک مڑی ہوئی ناک والے آدمی سے تمکو نفع پہنچیگا"۔

"اُس آدمی کا نام کیا ہے؟" بھائی نے تصویر حیرت بنکر سوال کیا۔

نجومی نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا:۔ "تمہارے ہاتھ سے اُس شخص کے نام کا ٹھیک پتہ تو نہیں چلتا۔ مگر اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا نام لانبا ہے اور اُس میں حرف (س) بھی شامل ہے۔ بس اب کچھ باقی نہیں۔ آداب عرض ہے راستہ روک کر مت کھڑے رہئے۔ آنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے"۔

"حیرت ہے یہ نجومی کیسا سچ بتاتے ہیں!" دوکان سے نکلتے ہوئے رشید بھائی نے مجھ سے کہا۔

ہم نکل ہی رہے تھے کہ ایک راہگیر ہمارے بازو سے گزرا۔ جس کے ہاتھ

میں سگریٹ تھا۔ اتفاقاً وہ جلتا ہوا سگریٹ رشید بھائی کے کان سے چھو گیا پھر کیا دیر تھی۔ ایک محشر بپا ہو گیا۔ رشید بھائی نے اس شخص کا گلا پکڑ کر خوب گھونٹا۔ اور آس پاس کی تمام عورتیں خوفزدہ ہو کر چلانے لگیں۔ مگر میں نے دل کڑا کر کے بھائی کو پولیس کی آمد سے پہلے وہاں سے ہٹا لیا۔

اب ہم گھر واپس ہونے کے لئے کشتی پر سوار ہوئے۔ وہیں پر ایک آدمی زور زور سے پکار رہا تھا۔ "آیئے آیئے اس ہوٹل میں آیئے۔ عمدہ نفیس کھانے امیروں کے لائق موجود ہیں۔" رشید بھائی نے خوب گھور کر اسے دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ سب سے پہلے ہوٹل میں یہی داخل ہوں گے۔ مگر جب اس دعوے کا ثبوت دینے کے لئے اُنہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو روپے ندارد۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب رشید بھائی اُس سگریٹ والے آدمی کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ تو کسی نے چالاکی سے اُن کی جیب سے روپے نکال لئے۔

مجبور ہو کر وہ میرے قریب ایک تختہ پر بیٹھ گئے۔ اُن کی حالت بیحد تباہ تھی۔

ہمارے قریب ہی ایک بھورے بال والی عورت سرخ سرخ کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ ادھر سے گذرتے ہوئے رشید بھائی نے بے خیالی میں اُس کا پاؤں کچل دیا۔ چونکہ صنف نازک کے ساتھ ان کا سلوک نہایت شریفانہ ہوتا ہے اس لئے وہ فوراً جھک کر اُس سے معافی مانگنے لگے۔ جھکنے کی دیر تھی کہ اُن کی ٹوپی جو سر پر کسیقدر ڈھیلی رکھی تھی نیچے گر پڑی اور تیز ہوا کی وجہ سے لڑھکتی ہوئی جا کر پانی میں ڈوب گئی۔ رشید بھائی واپس آ کر میرے پاس بیٹھ گئے۔ اور میں سمجھ گیا کہ اب ان کی نگرانی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ دن کے لئے ضرورت سے زیادہ منحوس ثابت ہو رہا تھا۔ جب اُن پر زیادہ مصائب پڑتے ہیں تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں اگر وہ کسی شریف آدمی کو مار بیٹھیں تو کوئی تعجب نہیں۔

یکایک رشید بھائی نے میری آستین پکڑ کر کھینچی اور کہنے لگے:-

"لطیف تم کو معلوم ہے ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہم پانی پر سفر کر رہے ہیں!"

میں نے جواب دیا "بھائی اب خاموش بھی رہئے۔ بس کوئی دس منٹ میں ہم گھر پہنچ جائینگے۔"

مگر وہ خاموش نہ ہوئے اور کہنے لگے:-

"دیکھو اُس بھورے بال والی عورت کو۔ دیکھو جو ہمارے قریب بیٹھی ہے تم اُس آدمی کو بھول گئے جس نے سگریٹ سے میرا کان جلا دیا تھا؟ اور میرے روپے جو چوری گئے؟"

میں نے خیال کیا کہ رشید بھائی اپنی مصیبتوں کو ایک ایک کر کے گنا رہے ہیں۔ تاکہ غصہ میں آنے کے لئے کوئی اچھا بہانہ مل جائے۔ جیسا کہ عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں۔ مگر میں نے اُنہیں سمجھایا کہ ایسی باتیں روزانہ ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا خیال نہ کرنا چاہئے۔"

"سنو" رشید بھائی نے جواب دیا "تم کو در اصل نجومیوں پر اعتبار نہیں تمہارے سامنے برہمن نے میرا ہاتھ دیکھ کر کیا کہا تھا؟ دیکھو لفظ بہ لفظ وہی درست ثابت ہو رہا ہے یا نہیں؟ کیا اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ایک کالے آدمی اور ایک بھورے بال والی عورت سے ہوشیار رہو۔ یہ دونوں تم کو نقصان پہنچانے کی فکر میں ہیں۔ تم اُس سیاہ فام کو بھول گئے جس نے سگریٹ سے میرا کان جلا دیا تھا؟ اور کیا تمہارے نزدیک اُس جوان عورت سے زیادہ بھورے بال والی کوئی اور عورت ہے؟ جس کی وجہ سے میری ٹوپی پانی میں گر پڑی۔ اچھا۔ اور گھر سے چلتے وقت جو روپے میری جیب میں تھے وہ کہاں ہیں؟"

رشید بھائی نے یہ سب کچھ اس انداز سے کہا کہ معلوم ہوتا تھا کہ نجوم واقعی ایک سچا علم ہے۔ مگر پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایسے واقعات کسی شخص پر بھی گذر سکتے ہیں جو رشید بھائی کی طرح بے احتیاطی سے بازار میں پھرتا رہے۔ اور ہر کس و ناکس اس قسم کی پیشین گوئیاں کر سکتا ہے۔

بھائی پھر اُٹھ کر کشتی پر ٹہلنے لگے اور اپنی سُرخ سُرخ آنکھوں سے کشتی پر کے ہر ایک آدمی کو دیکھتے جاتے تھے۔ میں نے اُن سے اس حرکت کی وجہ پوچھی جبتک رشید بھائی اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنا لینے اُس وقت تک کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ میرے سوال کا اُنہوں نے یوں جواب دیا۔

"تم کو معلوم ہے میں نجومی کی پیشینگوئیوں پر عمل کر رہا ہوں۔ اب میں اُس مڑی ہوئی ناک والے آدمی کی تلاش میں ہوں جس سے مجھ کو نفع کی اُمید ہے بس اب اُسی آدمی سے میری ساری توقعات وابستہ ہیں۔ کیونکہ میری جیب میں جو کچھ پونجی تھی۔ چوری ہو گئی"۔

رات ہو گئی تھی اور ہم کشتی میں سے اُتر کر ایک کشادہ گلی میں سے گزر رہے تھے۔ رشید بھائی برہنہ سر تھے۔

"لطیف! کبھی تم نے اس سامنے والے آدمی سے زیادہ مڑی ہوئی ناک کسی اور کی دیکھی ہے؟" بھائی نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

گلی کے موڑ پر سڑک کے ایک چراغ کے نیچے ایک شخص کھڑا چاند کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک دراز قد آدمی تھا۔ اور نہایت نفیس لباس پہنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں سگار تھا۔ اور ایک سرسری نظر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس کی ناک دو جگہ سے مُڑی ہوئی تھی۔ رشید بھائی اس طرح ہانپ رہے تھے جیسے زین اُتارنے کے بعد گھوڑا ہانپتا ہے۔ وہ سیدھے اُس آدمی کے پاس گئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھا۔

"سلامٌ علیکم" رشید بھائی نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اُس شخص نے اپنے منہ سے سگار نکالا اور نہایت مہذب طریقہ پر جواب سلام دیا۔

"ذرا اپنا نام تو بتایئے" بھائی نے کہا "دیکھیں کتنا لانبا ہے۔ شاید آپ سے دوستی پیدا کرنا ہماری قسمت میں لکھا ہو"۔

"خاکسار کو ابوالبیان فصیح الزماں فصیح الدین صدیقی کہتے ہیں"۔

"ٹھیک۔ ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ کیا آپ کے نام میں کہیں (س) بھی آتا ہے؟"

"جی نہیں"

"کیا آپ اسے (س) سے لکھ ہی نہیں سکتے؟" رشید بھائی نے دل گرفتہ ہو کر دریافت کیا۔

"ہاں۔ اگر آپ کو زبان سے اتنی واقفیت ہے کہ (ص) اور (س) آپ کے نزدیک ایک ہیں تو جیسی آپ کی مرضی۔ آپ چاہیں تو اسے (س) سے بھی لکھ سکتے ہیں"۔

"بس بس کافی ہے" بھائی نے خوشی سے اُچھل کر جواب دیا "آپ اس وقت لطیف اور رشید کے سامنے کھڑے ہیں"۔

"یہ میری عین خوش قسمتی ہے" مڑی ہوئی ناک والے نے خم ہو کر جواب دیا۔ "اور اب چونکہ میں آپ دونوں کے اس طرح اچانک ٹپک پڑنے کا مطلب نہیں سمجھا اس لئے مجھے امید ہے کہ اس گتھی کو تو آپ سلجھا دینگے"۔

رشید بھائی نے واقعات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اُن دو علامتوں میں سے جو نجومی نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتائی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کی پیشینگوئی کی گئی ہے۔ آپ کی قسمت میں لکھا ہے کہ کالے آدمی اور بھورے بال والی عورت سے مجھے جو جو نقصان پہنچے ہیں ——— علاوہ میرے روپیوں کے جو کسی نے میری جیب سے چرا لئے ——— اُن سب کی تلافی آپ ہی کریں گے۔ ابتک نجومی نے جو جو کہا تھا سب درست نکلا"۔

مُڑی ہوئی ناک والا سگار پیتے پیتے رُک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"آپ اسمیں کچھ ترمیم فرمائینگے یا آپ بھی اپنے دوست کے ہمخیال ہیں؟ آپ کے چہرے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ زیادہ سمجھدار ہوں"۔

"میں اپنے دوست کا بالکل ہمخیال ہوں" میں نے جواب دیا "آپ کی شکل بالکل ویسی ہی ہے جیسی نجومی نے بتائی تھی۔ اور اگر آپ وہی آدمی نہیں ہیں تو یہ رشید بھائی کی بدقسمتی ہے"۔

"اچھے دیوانوں سے سابقہ پڑا" مُڑی ہوئی ناک والے نے اِدھر اُدھر پولیس مین کو تلاش کرتے ہوئے کہا "مجھے آپ صاحبوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی خدا حافظ"

یہ کہہ کر اُس نے سگار پھر اپنے منہ میں رکھ لیا اور تیز تیز آگے بڑھنے لگا۔ مگر رشید بھائی نے اور میں نے ملکر اُسے اپنے بیچ میں لے لیا۔

"ایں!" وہ ٹوپی کو پیشانی سے سرکاتے ہوئے کہنے لگا "آخر آپ دونو کا مطلب کیا ہے؟ آپ لوگ مجھے جانے دیتے ہیں یا نہیں؟ میں عرض کر چکا کہ آپ دونوں سے ملکر مجھے واقعی بے انتہا خوشی ہوئی۔ اور میں آپ دونوں کا صد درجہ ممنون ہوں۔ لیکن اب میں آپ صاحبوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔ مجھے گھر جانا ہے"۔

رشید بھائی نے اُس کی آستین پکڑ لی اور بڑی منت سے کہنے لگے:۔

"جانیے جانیے۔ ضرور جانیے اور میں دولت خانے پر جناب کے صبح برآمد ہونے تک بیٹھا رہونگا۔ کیونکہ میری قسمت میں لکھا ہے کہ آپ ہی ان نقصانات کی تلافی کرینگے جو مجھے کالے آدمی اور بھورے بال والی عورت کی وجہ سے پہنچے ہیں۔ اور نیز ان روپیوں کی بھی جو میری جیب سے چوری گئے"۔

"عجیب شخص ہے!" مُڑی ہوئی ناک والے نے رشید بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ اس طرح کہ جیسے دو دیوانوں میں سے میں کسیقدر سمجھدار تھا۔ "آپ انہیں گھر کیوں نہیں لے جاتے؟"

"سنیئے جناب" میں نے جواب دیا "رشید بھائی کچھ دیوانے نہیں۔ ان کے حواس بالکل بجا ہیں۔ وہ صرف نجومی کی بتائی ہوئی پیشینگوئیوں پر عمل کر رہے ہیں۔ سنیں آپ بھی سُن سکتے ہیں" یہ کہکر میں نے رشید بھائی اور نجومی کے سارے واقعات کا اعادہ کیا۔ اور بتایا کہ وہ وہی شخص تھا جس سے بھائی کو نفع پہنچنے کی پیشینگوئی کی گئی تھی اس کے بعد میں نے کہا:۔

"اب اس سارے واقعہ میں میرا جو حصہ ہے وہ یہ ہے:۔ میں اپنے خیال کے

مطابق رشید بھائی کا بھائی ہوں۔ امیروں کے بھائی ہونے میں نفع ہے۔ کیونکہ روپے ملتے رہتے ہیں۔ اسیطرح غریبوں سے دوستی رکھنا بھی نفع سے خالی نہیں۔ کیونکہ آپکے رحم وکرم کی شہرت دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ اور پھر آپ کا ایک مجسمہ بناکر سڑک پر کھڑا کردیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ آپ کے ہر ہاتھ میں ایک یتیم بچہ ہوتا ہے لیکن رشید بھائی جیسے خردماغ لوگوں کے بھائی یا سچے دوست ہونا بڑی مشکل بات ہے یہی حال میرا بھی ہے۔ میں بذاتِ خود پیشینگوئیوں وغیرہ کا قائل نہیں۔ اور گو آپ کی ناک بلاشبہ سارے شہر میں سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ مگر مجھے شک ہے کہ آپ سے کسی کو نفع پہنچے۔ لیکن اب اس کا کیا علاج کہ رشید بھائی سے نجومی نے صاف صاف آپ کی بابت بیان کی اور یقین دلایا کہ آپ سے ان کو نفع پہنچیگا۔ اس لئے گو میں تو اس کا قائل نہیں لیکن پوری کوشش کرونگا کہ رشید بھائی آپ پر تجربہ کرکے دیکھ لیں تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ آپ سے ان کو ایک کوڑی کا بھی فائدہ نہیں"

یہ سنتے ہی مڑی ہوئی ناک والا زور زور سے قہقہے مارنے لگا۔ اور ایک مکان کی دیوار سے لگ کر اتنا ہنسا کہ لوٹ لوٹ گیا۔ پھر رشید بھائی کی اور میری پیٹھ ٹھونکی اور ہم دونوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آگے چلا

"یہ میری غلطی تھی کہ میں نے تم دونوں کی قدر نہ کی" وہ کہنے لگا۔ "بھلا مجھے کیا خبر تھی کہ گلی کی موڑ پر مجھے ایسی عجیب ہستیوں سے سابقہ پڑے گا۔ قریب ہی میں ایک ہوٹل ہے جو تم جیسے عجیب وغریب آدمیوں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ چلو وہاں چلکر چائے پئیں اور وہیں اس مسئلہ پر گفتگو کریں"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا اور ہم دونوں کو لئے ہوئے ہوٹل کے ایک کمرہ میں داخل ہوا۔ چائے کا آرڈر دیا اور بل بھی خود ہی ادا کیا۔ ہم دونوں سے اُس نے مثل بھائیوں کے سلوک کیا اور ہم کو سگار پینے کو دئے۔ پھر یوں کہنے لگا:-

"تمہیں معلوم ہے میں زندگی کے جس شعبے سے تعلق رکھتا ہوں وہ شعبۂ تصنیف ہے۔ میں دراصل ایک مصنف ہوں۔ اور رات کو اکثر اسی لئے گھوما کرتا ہوں کہ اہل دنیا کے عجیب وغریب حالات معلوم کروں۔ جب تم لوگ آکر مجھ سے ملے تو میں اُس وقت سڑک کے منظر اور چاندنی رات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں سوچتا ہوں چاند میں رکھا ہی کیا ہے؟ ایک بے جان جسم ہے جو آسمان پر چکر لگاتا رہتا ہے۔ اسیطرح شاعری کو لے لو۔ اس میں بھی کیا دھرا ہے؟ کچھ نہیں سراسر لغویات ہے۔ لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ تحریر میں معاملہ بالکل برعکس ہوجاتا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ زندگی میں مجھے جو جو واقعات پیش آئے ہیں اُن پر ایک مکمل کتاب لکھوں"

"تو کیا آپ کتاب میں میرا بھی ذکر کریں گے" رشید بھائی نے دل گرفتہ ہوکر دریافت کیا

"نہیں نہیں مطلق نہیں۔ کیونکہ کتاب میں اتنی گنجایش نہیں ہے۔ فی الوقت تو میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ خود ہی تم سے لطف اُٹھاؤں مجھے یہ جام تنہا نوش کرنا چاہئے۔ میں واقعی تم دونوں کا بیحد ممنون ہوں"

"تمہاری باتیں سنکر" رشید بھائی نے زور سے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا "مجھے اب تاب صبر نہیں۔ نجومی کی پیشینگوئی کے مطابق تمہاری اس مڑی ہوئی ناک سے مجھے فائدہ پہنچنا چاہئے تھا۔ مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں تو اُس پیشینگوئی کو سراسر غلط سمجھتا۔ اگر اُس کالے آدمی اور بھورے بال والی عورت ——"

"توبہ توبہ" مڑی ہوئی ناک والا کہنے لگا۔ "کیا تم نجومیوں کے معتقد ہو؟ خیر میری ناک سے جسقدر فائدہ تم کو پہنچنا ممکن ہے وہ سب پہنچیگا۔ پیلو ایک دور چائے کا اور سہی۔ تمہارے جیسے عجیب وغریب آدمیوں کو جب تک تروتازہ نہ رکھا جائے لطف نہیں آتا۔ خشک آب و ہوا میں تم لوگ مرجھا جاتے ہو"

یہ کہہ کر مصنف نے ہم دونوں کو پھر چائے پلائی۔ اور چونکہ رشید بھائی کی اور میری پونجی ختم ہوچکی تھی۔ اس لئے بل پھر اُسی نے ادا کیا۔ مگر رشید بھائی رنجیدہ بیٹھے رہے

اب ہم سب باہر نکلے کیونکہ تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ مڑی ہوئی ناک والے نے گھر جانے کی اجازت چاہی اور ہم سے درخواست کی کہ ہم وہاں تک اُسکا ساتھ دیں۔ ہم ایک گلی میں پہنچے جہاں کئی اونچے اونچے مکان تھے۔ ہمارا ساتھی ایک مکان پر رک گیا اور نظر اُٹھا کر اوپر دریچوں کو دیکھا جن میں اس وقت اندھیرا تھا

"یہ غریب خانہ ہے" اُس نے کہا "اور آثار بتاتے ہیں کہ بیگم سوگئی ہیں۔ اس لئے اب میں ہمت کرسکتا ہوں کہ تم دونوں کو مدعو کروں۔ آج عید کا دن ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم سب سے نیچے والے کمرے میں چلکر کچھ کھا پیو۔ میں کس زبان سے تم دونوں کا شکریہ ادا کروں کہ تم نے میرے لئے ایک ایسا دلچسپ مشغلہ فراہم کردیا"

رشید بھائی کو اور مجھے بھوک تو خوب لگ رہی تھی اور ہم بہت خوش تھے کہ ہمیں کھانا مل رہا ہے۔ مگر بھائی پر ایک اداسی چھا جاتی تھی۔ جب اُنہیں یہ خیال

آتا تھا کہ نجومی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر جس نفع کی طرف اشارہ کیا تھا وہ فقط دو چائے کی پیالیوں اور ایک رات کے کھانے پر موقوف تھا۔

"تم لوگ نیچے کی طرف آؤ" مڑی ہوئی ناک والا کہنے لگا "میں اوپر کے دروازے سے آتا ہوں۔ ہمارے پاس تین ماہ ہوئے ایک نئی لڑکی ملازم ہوئی ہے۔ میں اُس سے کہہ دیتا ہوں کہ عید کی خوشی میں تم دونوں کو چائے بنا کر پلائے۔ رشیدہ واقعی بڑی نفیس چائے بناتی ہے۔ آؤ اندر آؤ۔ میں اُسے ابھی بھیجتا ہوں"۔

(خاص)

سید خیرات علی زیدی

قطعات

نغمۂ دل

دم تو لے، او گانے والے! دم تو لے — میرا دل بھی گا رہا ہے، سُننے دے
تیرا نغمہ بن گیا مضراب، آہ — بول اُٹھے تارِ دل کے ساز کے

بانسری

یہ تیری دلدوز تانیں پے بہ پے — ہو گیا ہوں خود بخود سرشار سے
کیا سُنانا چاہتی ہے دل کو تو؟ — یہ صدا نغمہ ہے یا فریاد ہے

دار و گیرِ ضبط

سارے دن خورشید کے جلوے رہیں — شب کو ہوں انجم کی بزم آرائیاں
آہ! داغِ دل مرے ترسا کریں — قید میں حاصل نہیں رعنائیاں

نغمۂ شام

شام، تنہائی، دُھندلکا اور سکوت — باغ میں غمگین ہے ہر ایک شے
کنجِ گل سے آ رہی ہے اِک صدا — نالہ زا ہے کل فضا میں جس کی لے
بے زباں طائر کا نغمہ ہے مگر — گوشِ دل کے واسطے افسانہ ہے

(ر۔ ح۔ س)

اختر انصاری دہلوی

فلسفۂ زرتشت

از جناب پروفیسر محمد علم الدین صاحب سالک ایم۔اے (علیگ)

بمبئی کے ایک مشہور پارسی نوشیرواں یزدانی نے "امتحان" کے نام سے ایک اشتہار شایع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ کچھ عرصہ ہوا میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ ایران کے دورِ زرّیں میں ہر ایرانی عبادت کے بعد خداوند تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرتا تھا کہ ایران قحط و وبا اور طاعون و دروغ سے محفوظ رہے۔ جھوٹ کیا؟ اور غیر حقیقت کسے کہتے ہیں؟ اے ایرانی کیا تو راست گو اور راست کار ہے؟ اس کا جواب اپنے وجدان سے پوچھ کہ آیا جو کچھ تو کہہ رہا ہے وہ راستی پر مبنی ہے یا جو کچھ تجھ سے بن آتا ہے وہ درست ہے؟ یعنی کیا تیرا ظاہر و باطن یکساں ہے؟ جب میں نے اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھا تو مجھے اپنے قول و فعل میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ تو بھی اپنے دل سے پوچھ! اگر جواب نفی میں ملے تو اسے چھپانے کی کوشش نہ کر۔ اور اگر اثبات میں ہو تو مجھے اطلاع دے تاکہ میں تیری زیارت کو آؤں۔ کیونکہ تو زیارت ہی کے قابل ہے"۔

ان سیدھے سادے فقروں نے ایک مدت تک مجھے تفکرات میں غلطاں و پیچاں رکھا۔ آخر میری روح دو چیزوں کو میرے سامنے لائی۔ ایک تو مشہور فلسفی روسو کا قول جو اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اعترافات" کے دیباچہ میں لکھا ہے اور دوسری ایران کے مشہور و معروف پیغمبر زرتشت کی روح پرور باتیں۔ روسو کہتا ہے کہ جس دن قیامت برپا ہوگی میں خداوند تعالیٰ کے سامنے یہ کتاب لے کر حاضر ہونگا اور کہونگا پروردگارا! یہ میرے فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی پر میں نے عمل کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق میں چلتا رہا ہوں۔ بار الٰہا! اپنی مخلوق کو میرے گرد جمع کر تاکہ وہ میرے اعترافات کو سنیں۔ میری تکلیفوں پر آنسو بہائیں۔ میرے بُرے اعمال پر بیٹھے ملامت کریں۔ اپنے اعمالنامے میرے سامنے پیش کریں اور جو کچھ اُن کے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے اسے بلاکم و کاست میرے روبرو ظاہر کریں۔ تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ اس دنیا میں کوئی شخص اتنی جرأت و ہمت نہیں رکھتا کہ وہ اعلان کرے "میں روسو سے بہتر ہوں"۔

روسو کے یہ اقوال آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ کیونکہ یہ اعتراف ہے ایک پاک منش بزرگ کا جس کی زندگی آلائشوں سے مبرا تھی۔ یہ اعتراف کسی گنہگاروں کا اعتراف نہیں۔ کیونکہ گنہگار اور پاک منش کے اعتراف میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ گنہگار اپنے گناہوں اور اپنی خطاؤں کا اعتراف خاص خاص موقعوں پر کیا کرتا ہے۔ اس کا اعتراف دوزخ کے خوف۔ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور نوید بہشت کے باعث ہوتا ہے۔ لیکن دانا اور عارف ان تمام چیزوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ چنانچہ خیام کہتا ہے ؎

در مدرسہ و خانقہ و دیر و کنشت — ترسندۂ دوزخ است و جویائے بہشت
آنکس کہ ز اسرار خدا با خبر است — زیں تخم در اندرون دل ہیچ نکشت

دانا آدمی کا اعتراف ایک وجدانی فریاد ہے جسے سب سے اول وجدان ثابت کرتا ہے۔ پھر بیداری اور کوشش اس کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ یہ اعتراف ایک قسم کی فداکاری ہوتی ہے۔ جسے وہ علوِ نفس کی بنا پر اختیار کرتا ہے۔

میں نوشیرواں یزدانی کا ہمنوا ہوں۔ اور انحرافِ نفس کا اعتراف کرتا ہوں۔ ایک نالہ ہے جو میری روح کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔ اس کی مثال اس پرندے کی سی ہے جو صیاد کے جال میں پھنس چکا ہو اور رہائی کے لئے پھڑپھڑا رہا ہو۔ قفس کی تیلیوں سے سر ٹکراتا ہو۔ اور اس کوشش میں ہو کہ ان کو توڑ کر اڑ جائے اور آزادی کی ناپیدا کنار فضاؤں میں چہچہاتا پھرے۔ یہ بجلی کی کڑک ہے جو میرے افکار کے تار و پود کو جلا کر زبان کے رستے باہر نکل رہی ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب طائرِ روح جسم کی اندھیری کوٹھڑی میں رہتے رہتے آزادی کا خیال بھول جائیگا اور عرفان کی تانیں اس کے لئے ایک نغمۂ خواب آفریں سے زیادہ وقعت نہ رکھینگی اس وقت وہ کہیگا ؎

کوشش ہوا تھا توڑ کر کنجِ قفس کی تیلیاں
ہائے کہہ کر رہ گیا ٹوٹے ہوئے پر دیکھ کر

ہاں تو گنہگار کا اعتراف گناہوں سے رہائی پانے کا وسیلہ یا عفو و بخشش کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن عارف کا اعتراف ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا اعتراف ایک وظیفۂ وجدانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جو اس پر فرض ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عارف کا اعتراف جہادِ نفس کا آغاز ہے۔

اگر اس مسئلہ پر زیادہ غور و خوض کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زرتشت یا زردشت بھی اسی قسم کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر اس کی تعلیم کے بموجب جہاد نہ صرف نفس ہی کے ساتھ جائز ہے بلکہ ہر اُس شے کے خلاف واجب ہے جو فساد و شر کا باعث اور نیکی کی دشمن ہو۔ زرتشت کی نظر میں اہرمن یا شیطان دنیا کو خراب کرنے یا تاریک بنانے میں ہر وقت مشغول اور شر و فساد کی اشاعت میں ہمیشہ کوشاں رہتا ہے۔ اس لئے ہر دیندار کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف جنگ کرتا رہے۔ اور اس سے کبھی مغلوب نہ ہو ✦

زرتشت صوفیائے کرام کی طرح جہان کو بہشت نہیں کہتا۔ اور نہ ہی اسکا یہ عقیدہ ہے۔ کہ ہر چیز اپنے اپنے مقام پر اچھی ہے۔ بلکہ وہ عمر خیام کا ہمنوا ہے کہ ؎

ہر چیز کہ ہست آنچناں می باید
ہر چیز آنچناں نمی باید نیست

وہ نہ تو ایرانی مسلمانوں کی طرح اجرائے قوانین و احکام دین اور بسط عدالت و دفعۂ ظلم کو صاحب عصر کے ظہور اور اُس کی تلوار سے وابستہ کرتا ہے اور نہ ہی فلسفۂ جبر و تقدیر کا قائل ہے۔ کیونکہ اس قسم کے خیالات قوّت ارادی کو سلب کر دیتے ہیں۔ دنیا کو بگاڑ دیتے ہیں اور زندگی کی جنگ۔ حصول خیر کی کوشش۔ دفعہ شر کے خیالات۔ فقر و غنا کی خواہش۔ عدل و انصاف کے ذوق و شوق اور ظلم کے استیصال کے ولولے دل میں پیدا نہیں ہونے دیتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بیکار۔ مفلس۔ حریص اور پست ہمّت ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ اس کے خلاف کہتا ہے کہ ہمارا جہان جیسا کہ ہونا چاہئے تھا ویسا نہیں ہے۔ اس میں ناپاکی و گناہ اور ظلمت و فساد کا دور دورہ گرم ہے۔ ان چیزوں کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تمام قسم کے فساد شیطان اور اُس کے پرستاروں کی بدولت آہستہ آہستہ ہویدا ہو رہے ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ جس طرح یزدان اہرمن کے ساتھ جنگ کر رہا ہے۔ ہم بھی شیطان اور اُس کے دوستداروں کے ساتھ جنگ میں مشغول رہیں اور ایسے کام کریں جو اہرمن کی مرضی کے خلاف ہوں ✦

فلسفۂ حیات میں وہ ایک نظریہ قایم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا میں اچھی اور بُری دونوں قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ہمیں اچھی چیزیں اختیار کر لینی چاہئیں۔ اور بُری چیزوں کو مٹا دینا چاہئے۔ زرتشت دنیا کو زندہ قرار نہیں دیتا۔ اور نہ ہی ہنود

(خاص)

فلسفیوں کی طرح ریاضت۔ درویشی۔ اور عطالت کا شوق دلاتا ہے۔ بلکہ وہ سعی و کوشش کو انسانی زندگی کا لازمی جزو قرار دیتا ہے۔ اور انسان کو کامیابی اور نیک بختی کا امیدوار ٹھہراتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ایک دن دنیا پر نیکی چھا جائے گی۔ بدی مٹ جائیگی۔ نیکی کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔ گناہوں کی تیرہ و تار گھٹائیں چھٹ جائینگی۔ اور یزدان اہرمن پر غالب آ جائے گا۔ اس لئے ہمیں اس وقت کے لئے کوشش کرنی چاہئے ✦

یہی فلسفۂ حیات ہے۔ اسی کو تنازع للبقا کہتے ہیں۔ یہی سعی و کوشش قہر و غلبہ اور جنگ و کامیابی کا راز ہے۔ اسی کو فلسفۂ عصر کنونی کہتے ہیں۔ انہی نظریات کی بنا پر وہ راست گوئی اور درست کاری کا حکم دیتا ہے۔ اور انہیں اپنی تعلیمات کا اہم ترین جزو قرار دیتا ہے۔ چونکہ جھوٹ تمام برائیوں اور فتنوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے وہ اسے اہرمن کا ممد و معاون سمجھتا ہے۔ آوستہ میں اس قسم کی کئی دعائیں اور مناجاتیں موجود ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو راست گوئی ہی پسندیدہ اخلاق اور اعلیٰ خصائل کا منبع ہے۔ کیونکہ جس شخص میں یہ وصف موجود ہوگا اس میں دیگر اوصاف بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو راست گو ہوگا وہ چوری، خیانت۔ غارت۔ ظلم۔ ریاکاری چاپلوسی۔ خوشامد اور اس قسم کی دیگر کمینہ خصلتوں سے پاک ہوگا۔ کیونکہ یہ چیزیں راست گوئی کے سراسر منافی ہیں۔ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر ان جرائم کا مرتکب ہوگا تو اس کا ضمیر خود بخود اسے سرزنش کریگا۔ اور جبتک وہ انہیں چھوڑ نہ دیگا اسکی روح عذاب الیم سے رہا نہ ہوگی۔ راست گوئی درست کاری کا پیش خیمہ ہے اور درست کاری انسان کو راست گو بنا دیتی ہے۔ اس لئے اگر اہل ایران اپنے بچوں کو فقط راست گوئی ہی کی تعلیم دیں تو ملک میں انقلاب عظیم برپا ہو جائے اور بچوں کے اخلاق درست ہو جائیں ✦

ایران قدیم میں دروغگوئی بدترین خصلت خیال کی جاتی تھی اور بیکار انسان شہر بدر کر دیئے جاتے تھے۔ کیونکہ انہیں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی لت پڑ جاتی تھی۔ اور ڈر تھا کہ رفتہ رفتہ یہ عادت ان لوگوں کی بدولت دوسرے لوگوں میں سرایت نہ کر جائے۔ لیکن افسوس!

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

علم الدین سالک

مبارک ہیٹ

از جناب محمد کلیم جعفری صاحب ایڈوکیٹ

میں چورنگی پر ایک روز شام کے وقت ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ کہ عقیل کو ایک بھری ہوئی موٹر "بس" پر چڑھتے دیکھا۔ اُس نے سردی سے بچنے کیلئے اندر گھسنے کی کوشش کی۔ مگر مسافروں کی کثرت اور "کنڈکٹر" کی بے رحمی سے اُسکو جگہ نہ ملی۔ اور مجبوراً اوپر والے درجہ ہی میں جانا پڑا +

میں اپنے دل میں غریب عقیل کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔ کیونکہ اُس کو بہت جلد ذراسی بے احتیاطی میں زکام ہو جایا کرتا تھا۔ اور وہ دن بھی غیر معمولی طور پر سردی کا تھا۔ بارش ہو چکی تھی۔ نہایت تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی میرے ذہن میں فوراً اس کی تصویر کھنچ گئی کہ کس طرح وہ اپنے دوستوں سے "عید مبارک" کہے گا +

یکبارگی ایک فلٹ ہیٹ کی وجہ سے میں چونک پڑا۔ جو ہوا میں میری ناک کے قریب سے اڑتا ہوا گذرا۔ ساتھ ہی سامنے والی "موٹر بس" (موٹر لاری) پر سے ایک چیخ سنائی دی۔ نظر جو اُٹھاتا ہوں تو عقیل میری طرف بے تحاشا بھاگتا اور ہاتھ سے اشارہ کرتا دکھائی دیا +

میں ہیٹ کے لئے لپکا۔ مگر وہ میرے اور دوسرے تماشائیوں کے ہاتھوں سے بچتا ہوا ایک گذرنے والی لینڈو موٹر کار کی چھت پر نہایت اطمینان سے جا کر ٹک گیا۔

اس اثنا میں عقیل ہانپتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ اور کہنے لگا:۔

عقیل۔ خدا کے لئے اس کار کو کسی طرح روکو۔ وہ ہیٹ ضرور ملنا چاہئے +

میں۔ مرد بزرگ۔ کیا وہ ہیٹ اتنا قیمتی ہے کہ اس بھری ہوئی سڑک پر اس کے لئے دوڑ کر اپنی جان خطرہ میں ڈالو۔ چلو میں تمہیں دوسرا ہیٹ خرید دوں جسے میری طرف سے تحفہ سمجھنا +

عقیل۔ عقلمند آدمی جانتے بھی ہو کہ اس ہیٹ کی اس وقت کیا قیمت ہے +

میں۔ کسی گدڑی بازار میں زیادہ سے زیادہ روپیہ سوا روپیہ کو بک سکیگا +

عقیل۔ (جسکو میں نے پکڑ لیا تھا بدحواسی سے اپنے کو چھڑاتے ہوئے) چھوڑ دو مجھے۔ اُس کے اندر سو روپے کا نوٹ تھا +

عقیل آدمی کچھ جھکّی سا ہے۔ میں حیران ہو کر اُس کا منہ تکنے لگا تو اُس نے بتایا کہ ایک بہت پُرانی اور نایاب نقشی تصویر بیچنے سے وہ روپے اُس کو ملے تھے۔ چونکہ اتنی دیر ہو گئی تھی۔ کہ وہ بنک میں انہیں جمع نہیں کر سکتا تھا۔ اور دوکان میں چھوڑنا غیر محفوظ تھا۔ اس لئے اُس نے گھر ہی لے جانا بہتر سمجھا۔ اور جب سے کسی گرہ کٹ نے اُس کی جوتی غائب کر دی تھی وہ ان سے بہت ڈرنے لگا تھا۔ اس وجہ سے اس نوٹ کو جیب میں رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح ہیٹ کے استر میں چھپانے کی ترکیب اُس کے ذہن میں آئی۔ مگر یہ نہ سمجھا تھا کہ ہوا بھی ایک دشمن ہے +

عقیل۔ (بگڑ کر) تم نے مجھے پکڑ لیا۔ دیکھو میرا کتنا بڑا نقصان ہو گیا +

میں۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس موٹر کو پکڑ لیتے۔ میں نے تم سے زیادہ حواس سے کام لیا ہے۔ اور اس گاڑی کا نمبر دیکھ لیا۔ ہم ٹیلیفون کے ذریعہ سے اس کے مالک کو اطلاع دے سکتے ہیں +

میرے اس کہنے سے عقیل کچھ خوش تو ہوا +

عقیل۔ اُس کار پر جو اتنی تیز جا رہی تھی کتنی دیر تک وہ ہیٹ قائم رہ سکتا ہے کہیں پھر اُڑ گیا ہوگا +

میں۔ جی نہیں میں نے اس کو بھی دیکھ لیا تھا کہ اُس کی چھت پر اسباب رکھنے کی جالی لگی تھی۔ تمہارا ہیٹ اسی میں پھنس گیا تھا +

اب عقیل پوری طرح خوش نظر آنے لگا۔ اس لئے سب سے پہلے ہم نے جا کر ایک دوسرا ہیٹ خریدا۔ اس کے بعد یہ طے کیا کہ دفتر سے چلکر دریافت کریں کہ اس موٹر کا مالک کون ہے۔ ہم ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ وہی موٹر پیچھے سے آ کر گذری۔ میں عقیل کو بھونچکا چھوڑ کر اس گاڑی کے پیچھے لگا بے تحاشا بھاگنے۔ میں کم دبیش میں گز پیچھے ہی رہا۔ اور اپنے دلمیں غور کرنے لگا کہ میں بھی کسقدر احمق ہوں کہ ایک موٹر کار کو پیدل چلکر پکڑنا چاہتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں رکنے والا تھا کہ خوش قسمتی سے اگلے چوراہے پر بھیڑ کی وجہ سے موٹر ٹھیر گئی۔ اور میں اُس کے قریب پہنچ گیا۔ میرے پہنچتے ہی وہ پھر چل نکلی۔ میں نے ڈرائیور سے رکنے کے لئے اشارہ کیا جسے اُس نے یا تو

دیکھا نہیں یا دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور گاڑی تیز کردی۔ میں اتنی دور بے تحاشا دوڑنے کے بعد گاڑی کو آسانی سے چھوڑنے والا نہ تھا۔ اس لئے کود کر اس پر سوار ہوگیا۔ اور ایک منٹ میں گاڑی کے اندر تھا۔ میرے کان میں ایک باریک اور سریلی آواز آئی ⁺

——— یہ کیا حرکت ہے۔ کیا دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہو؟

بولنے والی ایک نہایت حسین نوجوان خاتون تھی جو بہت قیمتی اور دلفریب لباس پہنے ہوئے تھی ⁺

میں ——— معاف کیجئے۔ آپ ... کوئی ہیٹ ... تو نہیں ... دیکھا۔

خاتون ——— ہیٹ! معلوم ہوتا ہے تم بالکل دیوانے ہو۔ کیا تیرا ہیٹ چھو نہیں گئی ہے۔

جی میں تو آیا کہ میں بھی جواب دوں۔ مگر میں نے دیکھا کہ ڈرائیور نے فوراً گاڑی سڑک کی پٹڑی پر کرکے روک لی۔ اور ادب سے پیچھے مڑ کر کہا۔

ڈرائیور ——— سرکار معاف فرمایئے۔ جب اسٹیشن پر آپ کے لئے گاڑی لیکر پہنچا تو میں نے موٹر کار کی چھت پر ایک پرانا ہیٹ پڑا دیکھا تھا۔ اسے میں نے اٹھا کر ایک شخص کو دیدیا ⁺

یہ سنتے ہی میں نے ایک سرد آہ بھری اور سمجھ لیا کہ اب روپیہ نہیں مل سکتا اس کے بعد خاتون سے جو استفار میں تھی مختصر طور سے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ میں ابھی تھوڑا ہی کہنے پایا تھا کہ اس نے تعجب سے کہا:۔

خاتون ——— مسٹر عقیل! ارے! کیا آپ ان کے دوست ہیں ⁺

میں ——— جی ہاں۔ لیجئے وہ خود ہی آپہنچے۔ کیا آپ انہیں جانتی ہیں ⁺

اتنے میں عقیل بھی پہنچ گیا۔ اور گاڑی میں جھانکتے ہی پکار اٹھا:۔

عقیل ——— اخاہ۔ مس نوشابہ۔ یہ آپ ہی کی کار تھی ⁺

نوشابہ - خدا کا شکر ہے کہ آپ سے ملاقات تو ہوگئی۔ میری خوش قسمتی ہی آپکو یہاں لائی ⁺

عقیل - جی سچ پوچھئے تو میرا ہیٹ مجھے یہاں لایا ⁺

نوشابہ - آپ کو معلوم نہیں جس وقت سے میرے والد نے آپ سے وہ تصویر خریدی آپکو تلاش کرتے کرتے پریشان ہوگئے ⁺

عقیل - (خوفزدہ ہوکر) کیوں۔ کیا اسمیں کوئی خرابی ہے ⁺

نوشابہ - جی نہیں بات یہ ہے کہ میرے والد بنک سے آج صبح سو سو روپے کے نوٹ لائے تھے۔ اسمیں سے ایک جعلی تھا۔ جو اتفاق سے آپکو دیا گیا۔ جیسے ہی ہم وہ تصویر خرید کر چلے بنک نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے نوٹ کے جعلی ہونے کی اطلاع دی اور اسے واپس مانگا۔ ہم فوراً آپکی دوکان پر گئے معلوم ہوا کہ آپ گھر چلے گئے۔ دریافت کرتے ہوئے آپکے مکان پر پہنچے وہاں پتہ چلا کہ آپ گھر گئے ہی نہیں۔ یہ اصلی نوٹ لیجئے اور مصنوعی واپس کیجئے ... ایں خیر تو ہے۔ آپ مسکرا کیوں رہے ہیں؟

عقیل - میں اس بدنصیب کا خیال کررہا ہوں جس نے میرا ہیٹ مع اس ردی کاغذ کے پایا ہوگا۔ آپ کی اس تکلیف اور عنایت کا بیحد شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیجئے تاکہ فوراً گھر جاکر میں کچھ پیش بندی کرلوں۔ ورنہ عید کے دن اگر زکام کی وجہ سے بستر میں پڑا رہا تو بڑی بدشگونی ہوگی ⁺

اب مجھے بھی ہوش آیا۔ ورنہ میں تو خاتون کی صورت دیکھنے میں محو تھا۔

میں - (ٹھنڈی سانس بھرکر) چونکہ آج کے حصہ کا اچھا کام میں نے پورا کرلیا۔ اب مجھے بھی اپنے بے رونق اور خالی مکان کا رخ کرنا چاہئے ⁺

نوشابہ - معلوم ہوتا ہے آپ تنہا ہیں۔ کیا عید کا دن بھی اکیلے ہی گذرے گا ⁺

میں - جی ہاں - اندیشہ تو مجھے ایسا ہی ہے ⁺

نوشابہ - تب تو آپ ہماری دعوت قبول فرمایئے۔ میرے والد اور میں یہاں تنہا ہیں۔ میں اپنی اس بدتہذیبی کی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے سرزد ہوئی ہے تلافی کرنی چاہتی ہوں۔ میں گرانڈ ہوٹل میں ٹھہری ہوں اور آپ کی منتظر رہونگی۔

اس کے بعد موٹر کار روانہ ہوگئی ———

(ماخوذ از السٹریٹیڈ ویکلی)

محمد کلیم جعفری

رونا

محترمہ قدسیہ بیگم کے قلم سے

جسطرح تبسم، ہنسی، قہقہہ جذبات پنہاں کے اظہار کے ذریعے ہیں "رونا" بھی ایک جذبۂ غیر اختیاری کے ماتحت ہے۔

لیکن اس جذبہ کے اسباب مختلف ہیں۔ مثلاً کسی عزیز دوست کی جدائی یا موت سے قلب متاثر ہوتا ہے اور اس کا اظہار قطرات اشک کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے کبھی غیرت وحمیت کے احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ بسا اوقات مرض کی تکلیف یا ناقابلِ برداشت درد وکرب بھی انسان کو رُلا دیتا ہے کبھی مقاصد میں ناکامیابی یا انتہائے یاس بھی تردامنی کا باعث بن جاتی ہے جسے "اشک حسرت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ضعف قلب اور خفیف سے خفیف امر سے تاثر پذیری آنسو چھلکانے کے لئے کافی ہوتی ہے ٭

وفور مسرت کا بھی اکثر مواقع پر جبکہ "تبسم" اس کے ظاہر کرنے سے معذور ہوتا ہے۔ "اشک" آئینہ دار بن جاتا ہے اور اسی کا نام "گریۂ مسرت" ہے اور بیمار آنکھوں کا "غسل صحت" اسی سے ہوتا ہے۔ جو رونا ان مختلف جذبات میں سے کسی ایک کے باعث بھی ہو قابل احترام ہے۔ اور اس کا اثر بھی دیکھنے والوں کے قلب پر خاص طور سے پڑتا ہے۔ ان حالتوں میں نکلے ہوئے آنسو "بیش قیمت اور بیش بہا آنسو" ہیں ٭

لیکن "رونے" کا دوسرا رخ اتنا ہی کریہہ اور غیر متاثر ہے جتنا اول الذکر قابل تکریم ہے۔ یہ 'رونا' دراصل ان جذبات شریفہ کی تضحیک اور توہین کا باعث ہے جو آنسوؤں کے اندر پوشیدہ ہیں، یہ رونا عرف عام میں "اختیاری یا رسمی رونے" سے موسوم ہے۔ اس قسم کے رونے کے لئے کسی نوع کے جذبات کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ بعض اوقات "بھولے بھالے" انسان اس رونے سے بھی متاثر اور مرعوب ہو جاتے ہیں ٭

یہ "رونا" بیشتر "صنف نازک" کا مایۂ امتیاز ہے اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی طبقۂ نسواں میں۔ جس سے وہ مختلف مواقع پر کام لیتی ہیں۔ "عورت" کے پاس یہ ایک ایسا حربہ ہے جس سے وہ زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتی ہے اور اس شدت سے اس کو کام میں لاتی ہے کہ نقل واصل میں تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ لیکن دراصل وہ ایک بدترین "غلطی" کا ارتکاب کرتی ہے جس کی وہ عادی ہے ٭

اس رسمی رونے کی نمائش کے لئے مواقع بھی نہایت عجیب وغریب چنے گئے ہیں منجملہ ان کے ایک گھر سے کہیں سفر کو جاتے وقت۔ خصوصاً شوہر کے گھر یا اس کے جائے قیام پر خواہ گھر سے چند ہی میل کیوں نہ ہو۔ اس وقت ماں باپ، بھائی، بہن، کھلائی، حتیٰ کہ گھر کی ماماؤں سے گلے مل مل کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی ہیں۔ گویا پھر کبھی واپس نہ آنے کے ارادے سے جا رہی ہیں۔ یا خدانخواستہ حشر ہی میں ملاقات نصیب ہوگی۔ خواہ دل میں پھولے نہ سماتی ہوں اور "میاں" کو خود آمادہ کیا ہو۔ مگر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم کو گھر والوں سے بڑی محبت ہے۔ یہ تمام سوانگ بناتی ہیں۔ پھر یہ سلسلہ اتنی دیر تک جاری رہتا ہے کہ اکثر ریل کا وقت تنگ ہو جاتا ہے۔ اور بروقت ریل نہ ملنے سے میاں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے ٭

دنیا جہان میں یہ کہیں دیکھا نہ سنا کہ پردیس سے واپسی پر کوئی مل مل کر روئے اور بین کرے۔ ہاں ہندوستانی زندگی کا یہ بھی جزو لاینفک ہے اور اسے "خوشی کا رونا" سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ خوشی کا رونا جذبۂ باطنی کا محکوم ہے جس کا ان مواقع پر اکثر فقدان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس موقعہ پر رونے کے مظاہرہ سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمجھیں کہ "شوہر" کے ساتھ بڑی تکلیف اٹھائی اور اب بھائی بہن اور ماں کو دیکھ کر وہ خیالات پھر تازہ ہو گئے ٭

رسمی رونے کا ایک دوسرا منظر تعزیت کے موقعہ پر بھی قابل دید ہوتا ہے۔ ادھر کسی کے رشتہ دار یا عزیز کی آنکھیں بند ہوئیں اور اُدھر رسمی رونے والیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر آنے والی متوفی کی ماں، خالہ، بہن یا بی بی کے گلے سو چوٹ کر چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ بھلا اس سے کیا فائدہ۔ اور ایسے گریہ کا کیا حاصل۔ ایک تو یونہی بیچارہ آدمی محزون اور دلگیر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو صبر کی تلقین کرنی چاہئے اور دلدہی کی کوشش کرنی چاہئے نہ کہ اسے اور پراگندہ خاطر کرنا۔ بصرہ کہ چلاّ کر رونے اور بین کرنے سے اجتناب کا حکم ہے۔ مگر اس کا کس کو خیال۔ وہاں تو یہ دھن ہے کہ لوگ سمجھیں کہ ہے ہے بڑی محبت کرنے والی ہیں۔ المناک ہیں، خوار ہیں، واہ ری غم خواری ٭

اس پر طرہ یہ کہ جب تعزیت کرنے والیاں موت کے چند روز بعد یا کسی دوسرے شہر سے آتی ہیں۔ ابھی گاڑی یا ڈولی سے اُتری نہیں کہ رونا شروع کردیا۔ گویا اعلان ہے اس بات کا کہ ہم تعزیت کے لئے آگئے۔ اس کا کچھ خیال نہیں کہ غیر مردوں اور راہ چلتوں کے کانوں میں آوازیں جاتی ہونگی۔ نعوذ باللہ ❊

عوام طبقۂ جہلا میں تو یہ مرض قبیح اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ راستہ میں کوئی اپنے سے بڑا بھائی۔ بہن۔ باپ عرصہ کے بعد مل گیا۔ یا مردہ کے رشتہ دار سے ملاقات ہوگئی تو وہیں اُس کے پیر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور لگیں چلّا چلّا کر رونے۔ محض اس غرض سے کہ راہ چلتے جمع ہوجائیں۔ اور تماشا کریں ❊

یہ رسمی رونا اگر یہیں تک ختم ہوجائے تو بھی خیر ہے۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ ہماری بہنیں کم و بیش اس کو جا و بیجا مردوں کے مقابلہ میں بطور ایک حربہ کے کام میں لاتی ہیں۔ اور اس کے نتائج کی قطعاً پرواہ نہیں کرتیں۔ گھریلو زندگی میں آئے دن صدہا واقعات اس قسم کے پیش آتے ہیں جن میں اس رسمی رونے کی نمائش بخوبی ہوتی ہے۔ "میاں نے نماز پڑھنے کی تاکید کی یا کسی بری بات سے منع کیا۔ بیوی نے دل میں تو اعتراف کیا۔ مگر ظاہر کرنے میں ہیٹی ہوتی ہے۔ جواب کچھ بن نہ پڑا۔ فوراً آنکھوں کے پردے نم ہوگئے اور آنسو بہنے لگے۔ اور خود کو کوسنا کاٹنا شروع کردیا۔ میاں نے روپیہ پیسے کا حساب مانگا۔ یا کسی فضول خرچی سے روکا فوراً ٹپ ٹپ آنسو چلنے لگے۔ گویا اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ ہم چور ہیں ہم پر اعتبار نہیں۔ جو ہم سے حساب مانگا گیا۔ یا اس قدر بے قدر کہ اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرسکتے۔

مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ رحمدل اور نیک مرد تو یہ سمجھ کر کہ ہمارے سخت الفاظ نے بیوی کے جذبات لطیف کو "مجروح" کردیا۔ خاموش ہو جاتے ہیں اور بیوی کی بد خصلتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ مگر عقلمند ہر عورت میں اُس کے "جوہر لطیف" کے متلاشی رہتے ہیں۔ اُن کی نظر میں بیوی کا یہ رونا اُسکی قدر و منزلت کو بتدریج گھٹا دیتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ بیوی میں نیک و بد کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں اور وہ اُسے اپنے آنسوؤں سے مغلوب کرنا چاہتی ہے۔ اور اپنے عیوب کو پردۂ بکا میں چھپانا چاہتی ہے۔ تو اُس کی محبت نفرت سے بدل جاتی ہے۔ جو عورت کے لئے "موت" کا مترادف ہے ❊

عورت یہ سمجھتی ہے کہ وہ مرد کو شکست دینے کا سامان کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ "آنسو" اُس کی کمزوری کے آئینے ہیں۔ اور اُس کے "غرور نسوانی" اس سے سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔ اور دراصل یہ "اعتراف شکست" ہے ❊

لہذا میں اپنی ہندوستانی بہنوں سے کہونگی کہ "آنسو" ایسی بیش قیمت چیز کو مہمل اور فضول طریقہ سے رائیگاں نہ کریں "جذبات لطیفہ" کے پاک ترین مرقعے کی بے قیمتی کیساتھ بیجا اور مہمل نمائش سے محترز رہیں۔ اور آنسوؤں کو صرف احساسات غیر مرئی کے "اظہار لطیف" کا ذریعہ سمجھیں۔ !!!

قدسیہ بیگم

جنگ نامۂ اسلام

فتح قسطنطنیہ

(۴)

گولہ بازی

(از حضرت طالب الہ آبادی)

توپیں یونانیوں کے پاس تھیں معمولی سب
ڈر سے سلطان محمد کے رہیں مُہر بہ لب

چند توپیں تھیں مگر ایسی کہ جو اچھی تھیں
وہ بھی اک گوشے میں بیکار مگر رکھی تھیں

نصب کرنے کی انہیں کچھ نظر آئی نہ سبیل
کہنہ تھی شہر کی دیوار تو فرسودہ فصیل

ڈر یہ تھا ان کے دھماکوں سے نہ گر جائیں کہیں
اخترِ طالعِ بیدار نہ پھر جائیں کہیں

توپخانے تھے مگر ترک کے بےمثل و نظیر
آگ برسانے میں دشمن پہ تھے ابرِ مطیر

اکسو تیس تھیں ہر ایک میں توپیں داخل
زلزلہ آتا تھا سر ہوتی تھیں جب اک شامل

ان میں سے سب سے بڑی توپ تھی اژدر پیکر
فخرِ سائنس کو تھا اس پہ تو نازاں تھا ہنر

مخزنِ برق تھی اور جوہرِ فولاد تھی وہ
خاص سلطانِ فلک جاہ کی ایجاد تھی وہ

نال میں تیس منی گولے سما جاتے تھے
جب نکلتے تھے قیامت سی مچا جاتے تھے

توپ سر ہو تو دھماکوں سے زمیں ہلتی تھی
خود مگر بال برابر بھی نہیں ہلتی تھی

گر کے پھٹ جاتے تھے گولے جو جا کر اک میل
رخنے پڑ جاتے تھے برجوں میں لرزتی تھی فصیل

ترک کرتے رہے اک سمت تو گولے بازی
انجنوں سے متواتر ہوئی سنگ اندازی

سینٹ رومینس تھا مشبک سارا
جیبِ مجنوں کی طرح برج تھے پارا پارا

رات کے کام میں رستم تھے مگر یونانی
دشتِ تاریک کے ضیغم تھے مگر یونانی

رات بھر جاگ کے کرتے تھے مرمت وہ جری
صبح کو ہوتی تھی ہر چیز بہ رنگِ اصلی

ترک خندق کے قریب آ کے کئی بار ڈٹے
بس مگر چل نہ سکا کچھ تو وہ جبراً ہٹے

تین حملے کئے دس روز میں جانبازوں نے
کچھ دقیقہ نہ اٹھا رکھا سرافرازوں نے

کام ہر حملہ میں آ جاتے تھے دس بیس ہزار
کامیابی سے مگر دور تھے ابتک جرار

کاٹ کر ڈالے تھے خندق میں ہزاروں اشجار
نخلِ محنت میں مگر آ نہ سکے پھل اک بار

پشتے کشتوں کے بھی لگ جاتے تھے جو وقتِ مصاف
انکو یونانی شبِ تار میں کر دیتے تھے صاف

پھر تو سلطان نے یہ سوچا کہ سرنگیں کھد جائیں
منہ کی شاید اسی صورت سے عدوئے دیں کھائیں

پر کچھ اس شان کی پتھریلی زمیں تھی ہر سو
چل سکا کچھ کسی پہلو سے نہ اس پر قابو

زورِ بارود کی یہ قوتیں معلوم نہ تھیں
بے نقاب آج ہیں جو قدرتیں معلوم نہ تھیں

فائدے ورنہ ضرور ان سے اٹھاتے سلطان
معجزے جنگ کے دشمن کو دکھاتے سلطان

برق تھے خوب فنِ جنگ کے اسرار میں وہ
قابلِ رشک تھے سائنس کی سرکار میں وہ

کی تھی ایجاد عجب ایک طلسمی گاڑی
خود بنائی تھی غضب ایک طلسمی گاڑی

لانبی چوڑی تھی بہت اور تھی دو منزل کی
خوب تھی بھینس کی کھالوں سے سراسر منڈھی

اسمیں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہ تھا کچھ بھی خطر
گولیاں خوب چلاتے تھے وہ بےخوف و خطر

پہلی منزل میں تھے آگے کو جو دروازے تین
بند ہونے میں وہ دلکش تھے تو کھلنے میں حسین

حملہ ور ہوتے تھے ان سب سے نکل کر مسلم
جب بہت تھکتے تھے آ جاتے تھے اندر مسلم

چشمِ غماز تھے دیوار میں صدہا روزن
گولیاں چلتی تھیں میدانِ وغا میں سن سن

عکس کیواسطے ہر گوشے میں آئینے تھے
بالا خانے پہ بھی جانے کے لئے زینے تھے

سقف پر اور بھی اک سیڑھی تھی بشکلِ ویل
صاف بن جاتی تھی پل رکھدو جو بالائے فصیل

(۵)

بحری جنگ

تھی ادھر عین جوانی میں ابھی بری جنگ
گولے بازی تھی کبھی اور کبھی بارشِ سنگ

بیڑا اک آگیا یورپ سے ادھر امدادی
پنجۂ نکر سے دشمن کو ہوئی آزادی

قیصرِ روم کے بیڑے کا تھا اک خاص جہاز
چار آئے تھے جنیوا سے بہ اخلاص و نیاز

پانچ تعداد میں تھے سو پہ مگر بھاری تھے
ان میں جو لوگ تھے تصویرِ ستمگاری تھے

جنگی سامان کے اور فوج کے مخزن تھے جہاز
جتنے مضبوط تھے اُتنے ہی مزین تھے جہاز

آن کے پلے کا جہاز ایک نہ تھا سلطانی
بڑی عجلت میں چلے آئے تھے سب عثمانی

سورما آئے تھے یورپ کے بڑے تجربہ کار
اہلِ اسلام پہ آتے ہی ہوئے آتشبار

گولے چلنے لگے بے لاگ بڑی جنگ ہوئی
بارشِ خون سے ہر موج شفق رنگ ہوئی

جنگ کو نہل سے تیار مسلمان نہ تھے
کوئی ترتیب نہ تھی رزم کے سامان نہ تھے

پھر بھی عثمانیوں نے دادِ شجاعت دیدی
جان پر کھیل گئے بات عرب کی رکھ لی

کرتے تھے نعرۂ تکبیر بڑھے جاتے تھے
صاحبِ عزت و شمشیر بڑھے جاتے تھے

دودِ باروت نے پانی کو جو گھیرا تھا تمام
باسفورس میں گھٹاٹوپ اندھیرا تھا تمام

گولے پھٹ پھٹ کے جو کرتے تھے آتشباری
بحر کی پیٹھ پہ تھا آگ کا دریا جاری

اسی عالم میں مسلمان بڑھے جاتے تھے
جوش میں حالِ ایمان بڑھے جاتے تھے

گولیاں دل سے گزر جاتی تھیں رکتی بھی نہ تھے
چور تھے پھر سے جگر ہوتے تھے جھکتے بھی نہ تھے

ہر قدم بڑھنے میں سو کا سر اڑتے تھے
رُخ دو کرتے تھے ادھر کا نہ اُدھر مڑتے تھے

ڈوب کر لاش بھی مسلم کی جو ابھری اکبار
سب نے دیکھا کہ ہے ہاتھوں میں ابھی تک تلوار

سر جدا تن سے ہوا جان سے رشتہ ٹوٹا
قبضۂ تیغ شرربار نہ لیکن چھوٹا

یہ تو سب کچھ تھا مگر آگ کا دریا بھی تھا
سامنے دود کی کثرت سے اندھیرا بھی تھا

یورشیں کرکے سمندر پہ چڑھے گو جرار
پھر طوفان میں ناکام رہے وہ دوبار

فرطِ غیرت سے عجب حال ہوا سلطاں کا
ہاتھ بے ساختہ قبضہ پہ گیا سلطاں کا

آہنی گرز ہلاتے تھے کبھی جھلا کر
تیر چلّے سے ملاتے تھے کبھی جھنجھلا کر

دل بڑھاتے تھے کبھی وعدۂ انعام سے وہ
کبھی خوش کرتے تھے آئندہ کے اکرام سے وہ

کبھی تبلاتے تھے لوگوں کو فراری کی سزا
کھینچ دیتے تھے کبھی نقشۂ سامانِ جزا

یک بیک نعرۂ تکبیر سے گونجی جو فضا
شیر کو اب دلِ بیتاب پہ قابو نہ رہا

ایڑ رہوار کو دی تول کے تیغ سر تیز
کھا کے مہمیز سمندر میں در آیا شبدیز

فتح نے قبضۂ شمشیرِ دو دم چوم لیا
آکے گھوڑے کا شجاعت نے قدم چوم لیا

حال یہ دیکھ کے آقا کا بہت جوش ہوا
بڑھ کے پھر ترکوں نے اک حملۂ خونریز کیا

وہ جری ہو گئے مجبور مگر گولوں سے
چور تھے کاسۂ سر برق اثر گولوں سے

دست و پا شل ہوئے کام آگیا آدھا لشکر
تھک کے کمزور ہوئے رک گئے وہ شیر ببر

اتنی فرصت جو ملی ہو گئے یکجا دشمن
اور بھی زور سے کرنے لگے دھاوا دشمن

باسفورس میں اُتر آیا عیسائی بیڑا
آہنی حلقہ میں در آیا عیسائی بیڑا

شومئی بخت سے ترکوں نے ہزیمت کھائی
طالعِ خفتہ نے آفت کی گھڑی دکھلائی

پھر بھی ہمت تھی قوی دین کے دیوانوں کی
جرأتیں بڑھ گئیں کچھ اور مسلمانوں کی

جھوم کر چومتے تھے قبضۂ شمشیر دو دم
زخم کھا کھا کے ہوئے اور بھی ضیغم برہم

(۶)

زمین کے جہاز

بحر کی جنگ سے نقصان ہوا ترکوں کا
فطرتاً قلب پریشان ہوا ترکوں کا

ابتو حملے کی بظاہر نہ رہی کچھ تدبیر
خندق اک سمت تھی اک سمت کھچی تھی زنجیر

اس گھڑی فہم محمدؐ نے دکھایا وہ کمال
آجتک پھر نہ زمانے میں ہوئی جسکی مثال

کی گئیں پہلے پہاڑی کی زمینیں ہموار
راستہ بن گیا دس میل تلک آئینہ وار

ختم جب کرچکے کام اپنا کدال اور پھوڑے
چوبِ دشتی کے بچھائے گئے تختے چوڑے

بھیڑ اور بھینس کی چربی سے ہُوئے وہ چکنے
سو سے زاید ہی جہاز آہنی پہیوں پہ چڑھے

کوہ پر آدمیوں نے انہیں کھینچا کئی میل
انجنوں اور گاؤں نے بھی چڑھایا کئی میل

واہ کیا جوش تھا اسلام کا کیا صبر و شکیب
سب جہاز آگئے کھنچتے ہوئے بالائے نشیب

شان و اجلال لئے آگیا ترکی بیڑا
تنگ و محفوظ جگہ پا گیا ترکی بیڑا

ایک ہی رات میں پورا ہوا یہ سارا کام
دیو زادوں سے بھی دشوار تھا جس کا انجام

صبح ہوتے ہی کٹے دلمیں عدوئے مغرور
زد سے اور آہنی زنجیر سے مسلم تھے دور

پیپے زنجیروں میں جکڑے گئے جوں دستۂ گل
اہل اسلام نے اس ڈھب سے بنایا اک پل

ساز و سامان سے آراستہ اتنے تھے جہاز
دیکھ کر انکو ہراساں ہوئے سب شعبدہ باز

ابرِ تاریک کی صورت وہ بڑھے آتے تھے
مثلِ طوفان سمندر پہ چڑھے آتے تھے۔

تاکہ قیصر نے کیا انکو جلا دینے کی
کوششیں خوب ہوئیں آگ لگا دینے کی

مسلموں کا تھا نگہبان مگر ربِ جلیل
کُل جہاز آگ سے بچتے رہے مانندِ خلیل

اُس طرف کا جو جہاز ان کی طرف آتا تھا
غرق ہو جاتا تھا یا قبضے میں آ جاتا تھا

آگئی کام جو سلطاں کی انوکھی تدبیر
حشر انگیز ہوئی چل گئی جو تھی تدبیر

زار و مجبور ہوا قیصر قسطنطنیہ
اور مجبور ہوا بیکس قسطنطنیہ

(۷)

انجام جنگ

ٹھیک بارہ بجے چھبیس مئی کی شب کو
عام دربار میں سلطاں نے بلایا سب کو

کہا۔ بھاگے گا اگر جنگ سے کوئی بزدل
پھر تو دنیا میں نہیں امن کی اُس کے منزل

غرق ہوگا غضب و طیش کی اک لہر سے وہ
پر بھی ہونگے تو بچیگا نہ مرے قہر سے وہ

سب سے پہلے نظر آئیگا جو بالائے فصیل
ایک صوبہ اسے بخشونگا میں بے قال و قیل

دُگنی تنخواہ اگر فتح ہوئی کر دونگا
دُرِ مقصود سے دامنِ طلب بھر دونگا

ہاتھ آئے گا زر و مال جواہر جو کچھ
بے تکلف تمہیں مل جائیگا سب وہ ہو کچھ

پاؤ جرأت کے صلے رنج سے آزاد رہو
ظلِ اسلام میں تم شاد ہو آباد رہو

گر ظفر ہاتھ لگے عزت و دولت پاؤ
کام آ جاؤ اگر تاجِ شہادت پاؤ

سن کے تقریر محمدؐ کی ہوئے سب مخمور
ساغرِ جوش میں لرزاں ہوئی صہبائے سرور

نعرۂ کلمۂ طیّب کا ہوا غل ہر سو
شہرِ محصور میں برپا تھا تزلزل ہر سو

سرِ دشمن پہ تسلط تھا ادھر دیو نہیب
دستِ وحشت سے بہت دور تھا دامانِ شکیب

بے ضرورت وہ سمجھتے تھے سر اندازی کو
دل سے تیار تھے ہر دم سپر اندازی کو

قلب اُلٹا تھا جگر اُلٹے تھے حالت اُلٹی
آگے قیصر سے وہ کرتے تھے شکایت اُلٹی

نہیں ترکوں سے اگر کوئی مفر کی صورت
شہر دیدیجئے پھر جنگ کی ہے کیا حاجت

آبرو ملک زر و مال جو جائیں جائیں
جان بچ جائے کسی ڈھب سے تو لاکھوں پائیں

جنگ سے ہاتھ اُٹھایا نہ مگر قیصر نے
داغ جرأت کو لگایا نہ مگر قیصر نے

سب کو بلوایا بھی اور آخری تقریر بھی کی
دیکے اُمیدِ ظفر جنگ کی تدبیر بھی کی

خود مگر فتح و ظفر سے تھا سراسر مایوس
شمعِ کشتہ دلِ مضطر تھا تو سینہ فانوس

سننے والوں میں قیامت کا بپا تھا کہرام
سارے دربار میں آفت کا مچا تھا کہرام

صوفیہ سنٹ کے گرجے میں گیا اب قیصر
آہ و زاری و عبادت میں کٹا ایک پہر

دفعتاً چرخ پہ ظاہر ہوئے آثارِ سحر
گلِ خورشید سے بننے لگا گلزارِ سحر

ترک جرّار ادھر جنگ پہ آمادہ تھے
دیر سے ان میں صفیں باندھ کے استادہ تھے

اب علمدار نے بھی سرخ پھریرے کھولے
صید کو دیکھتے ہی باز نے شہپر تولے

بجلیاں تڑپیں ہلال اور ستارے چمکے
پتلیاں جھپکیں عجب شان سے تارے چمکے

دور تک لگ گئیں خندق کے کنارے توپیں
مسکرانے میں اُڑاتی تھیں شرارے توپیں

متصل شہر کے اسلام کا بیڑا آیا
بحر و بر دونوں سے طوفان اُمنڈتا آیا

آگے آگے تھے سبھوں کے عربی اور شامی
جنگ کفار کو آئے تھے وہ صفدر نامی

اسقدر فوج مسلماں تھی اکٹھا رن میں
سر ہی سر حدِ نظر تک تھے ہویدا رن میں

عزمِ دیوار اگر کرتا تھا کوئی پر زور
گر کے خندق میں وہ ہو جاتا تھا زندہ درگور

اہلِ اسلام نے جم جم کے بہت یورش کی
اپنی جا سے نہ مگر رومیوں نے جنبش کی

حال یہ دیکھ کے سلطان فلک جاہ بڑھے
خود بخود بڑھ گئی سب فوج بھی جب شاہ بڑھے

پھر تو ہونے لگی اس زور سے گولہ بازی
جیسے کشمیر کے طوفان میں ہو اولے بازی

ڈر سے سینوں میں سماتے نہ تھے دم دشمن کے
صاف اکھڑنے لگے میداں سے قدم دشمن کے

فوج دشمن کا تھا سالارِ سپہ جسٹی نین
ہو کے مجروح ہوا درد سے ایسا بے چین

پھیر کر پیٹھ لڑائی سے فراری بھاگا
توپخانوں میں مچا شور کہ ناری بھاگا

سب سے پہلے جو دکھائی دیا بالائے فصیل
جاں نثاری تھا حسن نام کا وہ مردِ جلیل

دیو پیکر تھا سرافراز قوی ہیکل تھا
فہم و جرأت میں ابو لو تھا کبھی ہرقل تھا

داہنے ہاتھ میں تلوار تھی اُلٹے میں ڈھال
شیر کی طرح سے بپھرا ہوا تھا نیک خصال

اپنی کوشش میں وہ جانباز کئی بار گرا
بل بے ہمت ہوا مجروح مگر رخ نہ پھرا

محنتیں اس کی ٹھکانے سے لگیں آخرکار
تکیۂ پائے جری بن گیا دوشِ دیوار

تیغِ اسلام سے مجبور ہوئے یونانی
مورچے چھوڑ کے مفرور ہوئے یونانی

اسی بھگدڑ میں سنائی پڑی قیصر کی صدا
کیا نہیں آج یہاں کوئی عیسائی ایسا

سر مرا کاٹ کے شرمندۂ احسان کرے
نالہ بیکس و مجبور پہ کچھ دھیان کرے

اتنا کہنا تھا کہ بے سر نظر آیا قیصر
سپر انداز ہوا رومیوں کا کل لشکر

صوفیہ سینٹ کے گرجے میں تھے کچھ لوگ مگر
مرد و زن پیر و جواں جمع تھے بیخوف و خطر

اک فرشتہ ابھی اُتریگا انہیں تھا یہ یقیں
پھر تو یورپ میں نہ ترکوں کا پتہ ہوگا کہیں

واہ ری شوخیٔ قسمت کہ فرشتے کی جا
جاں نثاری کا جتھا قہر صفت آ پہنچا

گرز کی ضرب سے فولاد کے در چور ہوئے
مورتیں ٹوٹ گئیں کاسۂ سر چور ہوئے

عرش تک فرش سے جاتی تھی صدائے تکبیر
در و دیوار سے آتی تھی ندائے تکبیر

کعبۂ نورِ نبی منزلِ قسطنطنیہ
غیرتِ طورِ نبی منزلِ قسطنطنیہ

طالب الہ آبادی

نقد و نظر

حضرت "سنان" ایم اے کے قلم سے

تاریخ نثر اردو[1]

جناب احسن مارہروی ان باقیات صالحات میں سے ہیں جو اردو نظم و نثر کے عہد جدید کے دورِ اوّل و دورِ موجودہ کی درمیانی کڑی ہیں۔ ایک طرف انہوں نے نثر اردو میں عناصرِ خمسہ کی صحبت اور نظم اردو میں داغ و امیر کی تعلیمات سے براہ راست فیض حاصل کیا ہے۔ تو دوسری طرف مابعد کی اردو داں نسلوں کو بلاواسطہ مستفید فرماتے رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کی زیر نظر تصنیف بھی ایک بڑی حد تک ان تمام تحقیقات پر جو اردو کے تاریخی تدریجی ارتقا کے متعلق ہوئی ہے مشتمل ہے اور اس میں نویں صدی ہجری کی ابتدا سے ۱۳۴۸ھ تک کی اردو نثر کے مسلسل نمونے موجود ہیں۔ اور یہ ایک ایسا ذخیرہ اور ایسا سرمایہ ہے جس پر مستقبل کے محققین اپنی عمارتیں کھڑی کر سکتے ہیں +

زیر نقد کتاب اس سلسلہ کا پہلا حصّہ ہے اور ہم کو ابتدا ہی میں یہ ہدایت و تنبیہ کی گئی ہے کہ

"تاریخ نثر اردو کی پہلی جلد فی الحال شایع ہو رہی ہے۔ دوسری جلد زیر طبع ہے۔ اس کی اشاعت بھی انشاء اللہ تعالیٰ جلد وقوع پذیر ہوگی لہٰذا اس تحقیق کے متعلق کسی مخالف رائے کے قایم کرنے میں عجلت مناسب نہیں۔ دونوں حصّوں کو دیکھ کر مکمل رائے زنی فرمائی جائے" +

اس لئے ہم بھی مولانا کی اس نصیحت پر کہ

"مزن بے تامل بگفتار دم نکوگوئے گر دیر گوئی چہ غم"

عمل کرتے ہوئے اس کتاب کے متعلق کسی مخالف یا موافق رائے کے اظہار میں عجلت نہیں کرتے۔ اور منتظر ہیں کہ خدا کرے حصّہ دوم بھی حصّہ اوّل کی طرح ہماری اُمیدوں کے موافق معلومات کا ذخیرہ ہو تاکہ ہم دونوں حصّوں کو دیکھ کر "نکوگو" کی عزت حاصل کر سکیں لیکن فی الحال ہم اس حصّہ کے مضامین اس کی وسعت اور اس کے متعلق دوسری اہم خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اردو دوست اصحاب کو مولانا کی محنت، اُن کی کاوش، اور اُن کی ہمہ گیری کا اندازہ ہو جائے +

کتاب کی وسعت کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی مختلف فہرستہائے عنوانات ۶۲ صفحات پر مشتمل ہیں، ابتداءً عام فہرست ہے اور پھر نمونوں کے باعتبار حروف تہجی فہرستیں ہیں۔ اس کے بعد مقدمہ شروع ہوتا ہے۔ جسمیں اردو کی ابتدا اور اُس کی ارتقا کے متعلق بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد مختلف عنوانات کے ماتحت ابتدا سے لے کر گذشتہ سال تک کے نمونے دئیے گئے ہیں۔ یہ حصّہ مندرجہ ذیل چیزوں کے نمونوں پر مشتمل ہے:-

(۱) عام تصانیف و تالیفات (اسمیں تراجم بھی شامل ہیں)

(۲) دفاتر سلطنت (۳) اخبار (۴) قانونی تراجم (۵) تقریظ و تنقید۔

(۶) خطوط +

شعبہ اوّل صدیوں کے اعتبار سے ۶ دوروں پر منقسم ہے، اسیطرح دوسرے شعبے بھی مختلف دوروں پر شامل ہیں لیکن لائق مصنف نے یہ نہیں بتایا ہے کہ کیا ایک نئی صدی کا آغاز لسانی حیثیت سے بھی ایک دورِ جدید ہو سکتا ہے اور کیا غدر سے لیکر اسوقت تک اردو نے جو ترقی کی ہے وہ بتانے کے لئے کافی نہیں ہے کہ اصلاح و وسعت زبان، زمکان و مکان کے قید سے آزاد اور ایک بڑی حد تک ملک کی ذہنی بیداری و ارتقاء پر منحصر ہے۔ ممکن ہے کہ فاضل مرتب نے حصّہ دوم میں اس پر روشنی ڈالی ہو۔ اس لئے ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ تمام نمونے تاریخی حیثیت سے درج ہیں۔ اس لئے ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اُن سے استفادہ اور اصول منضبط کر سکتا ہے۔ مولانا نے نمونوں کو جس وسیع پیمانہ پر درج کرکے اردو دوست اور تحقیق پسند لوگوں کو دوسرے ماخذوں سے مستغنی کر دیا ہے۔ اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عام تصانیف کے ماتحت ۱۶۲ نمونے ہیں۔ کاغذات دفاتر سلطنت کے ۲۲، اخبارات کے ۳۶، قانونی تراجم کے ۱۵۔ تقریظ و تنقید کے ۱۶ اور خطوط کے ۶۶ نمونے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۳۱۷ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی محنت و کاوش

[1] تاریخ نثر اردو بنام تاریخی "نمونۂ منثورات" (۱۳۴۸ھ) حصّہ اوّل مرتبہ جناب مولوی محمد احسن صاحب احسن مارہروی اردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ صفحے ۶۱۰+۶۲ قیمت عـہ مصنف سے مذکورۂ بالا پتہ پر طلب کیجئے

کا اس وقت پتہ چلتا ہے جبکہ ہم ہر دور کے آخر میں مولانا کا تبصرہ اور اس دور سے متعلق مخصوص الفاظ کا لغت دیکھتے ہیں، اور یہی چیز دراصل کتاب کی جان ہے۔ اظہار رائے میں مولانا متین و سنجیدہ اور اپنی وضع قدیم کے ماتحت بہت زیادہ مہذب ہیں۔ البتہ ایک چیز کا صاف پتہ چلتا ہے کہ مولانا اردو کے وطن کا شرف کسی دوسرے حصۂ ملک کو دینے کے لئے کسی طرح بھی نظر نہیں آتے ✦

فاضل مرتب نے مقدمہ میں دکن میں اردو' اردوئے قدیم۔ سیر المصنفین اور پنجاب میں اردو کا نہ صرف تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ موخر الذکر کتاب کے متعلق اپنی کتاب کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۰ء کی بہترین تحقیقات سے اپنی بیش بہا تصنیف کو محروم رکھا ہے۔ مثلاً پرتھوی راج راسہ کے متعلق ہر حیثیت سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ عہد اکبری یا اس کے بعد کی ایک تصنیف ہے۔ اس نے اس کو پرتھوی راج کے عہد کی کتاب کی طرح استعمال کرنا صحیح نہیں۔ اسیطرح خالق باری کے متعلق مولانا کا یہ کہنا کہ وہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ اب بہت زیادہ بحث طلب ہے ✦

اسیطرح ایک آدھ جگہ ناموں کی کتابت اور نمونہ کی ترتیب میں بھی غلطی رہ گئی ہے۔ جو صرف نظر کی غلطی ہے۔ اور اس سے نفس کتاب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مثلاً خیالات آزاد اور دیباچہ' رباعیات شہباز کے مصنف کا نام نواب سید محمود دیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کا نام نواب سید محمد صاحب تھا۔ اور وہ صوبہ بنگال بہار و اڑیسہ کے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن تھے۔ اور اینچ اور اودھ پنچ کے خاص نامہ نگار مسٹر سید حسین اڈیٹر انڈیپنڈنٹ آن کے صاحبزادہ ہیں۔ اسی طرح عام تصانیف کے دور پنجم کا نمونہ ۸۴ قبل از وقت ہے اس کو سنہ ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۴ء کے ماتحت درج کیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجمع القوانین' مجموعہ ہے ان قوانین کے تراجم کا جو شروع ۱۷۹۳ء سے آخر ۱۸۴۲ء تک صادر و نافذ ہوئے ہیں' صفحہ ۸۴ اور اس لئے اس کو نمونہ ۸۴ کی جگہ نمونہ ۲۶ ہونا چاہئے۔ بہرحال یہ غلطیاں کسی صورت سے بھی اہم غلطیاں نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ ایک ایسی اہم تصنیف میں ہیں جو آئندہ چلکر طلبہ و محققین کے لئے سند اور مخزن معلومات ہوگی۔ اس لئے اس کے پاک و صاف دامن پر یہ ہلکے سے داغ بھی اچھے نہیں معلوم ہوتے ✦

آخر میں ہم فاضل اُستاذ اُردو کو اُن کی اس بیش بہا پُر از معلومات اور کثیر المواد تصنیف پر دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ دوسرا حصہ حصۂ اوّل سے کہیں بہتر اور محاسن ظاہری و باطنی میں اس حصہ سے بدرجہا زیادہ آراستہ و پیراستہ ہوگا۔ ہر اردو داں' اردو دوست اور اردو کی تاریخی ارتقا سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے اس اہم تصنیف کا غائر مطالعہ ناگزیر و بالا ضروری ہے ✦

خزینۂ تاریخ

مرتبہ جناب سید یوسف الدین صاحب صفحہ ۱۴۰ قیمت عہ
پتہ بزم تاریخ' کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ✦

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ وہاں کے طلبہ نے ہر موضوع کے متعلق اپنی ایک مجلس قایم کر رکھی ہے۔ یہ بزم تاریخ بھی دس سال سے قایم ہے اور اس میں نہ صرف طلبہ تاریخی مضامین پر تحریر و تقریر کے ذریعہ اظہار خیال کرتے ہیں بلکہ اس کو اساتذہ و علمائے تاریخ سے بھی مستفید ہونے کا شرف حاصل ہے گذشتہ سال بزم کی مجلس کابینہ نے اپنے یہاں کے مضامین کا ایک مجموعہ شایع کیا تھا۔ اور اس سال بھی اُس نے گذشتہ سال کے سات مضامین اور سات تاریخی نظموں کا یہ مجموعہ تاریخ دوست اصحاب کے لئے پیش کیا ہے۔ مضامین عمدہ اور پُر از معلومات ہیں نظمیں بھی دلچسپ اور موثر۔ ابتدا میں ایک مختصر دیباچہ میں بزم کی کارروائیوں پر تبصرہ ہے۔ اور آخر میں سالانہ اجلاس کا خطبہ صدارت' ہمکو امید ہے کہ تاریخ دوست اصحاب بزم کی اس سالانہ تصنیف کو خرید کر نہ صرف اس سے مستفید ہوں گے بلکہ ہندوستان کے آئندہ مورخین کی ہمت افزائی بھی کریں گے ✦

فلسفہ شوپنہار

مصنفہ جناب احمد صدیق صاحب مجنوں گورکھپوری صفحہ ۱۲۰
مجلد قیمت عہ۔ پتہ ایوان اشاعت گورکھپور ✦

گذشتہ سال سے گورکھپور کے چند جوان ہمت ادب نواز بزرگوں نے اردو کی علمی و ادبی توسیع کے لئے ایوان اشاعت کے نام سے ایک مجلس قایم کر رکھی ہے۔ اس کا مقصد اردو کے خزانہ کو ہر قسم کی اعلیٰ تصانیف سے مالا مال کرنا ہے اور یہ تصنیف اس مجلس کا پہلا کارنامہ ہے ✦

جناب مجنوں گورکھپوری رسالہ نگار کے ممتاز افسانہ نویس و مضمون نگار ہیں۔ ان کا طرز انشا سلیس پر زور اور دلکش ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں روانی ہے۔ اور وہ زبان پر کامل اختیار رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس تصنیف میں بھی جو ایک خشک فلسفیانہ زندگی پر ہے۔ ان کی شگفتگی غیر مجروح طور پر اسیطرح صحیح و سالم ہے ✦

شوپنہار اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعرانہ ولولہ بانہ انداز کا فلسفی تھا۔ اُس کی زندگی کے حالات نے اُسے قنوطیت کا شکار بنا دیا تھا۔ اس لئے اُسکا تمام تر فلسفہ

اسی حرماں نصیبی کی تفسیر ہے۔ اور اس موضوع خاص میں وہ شاید اپنے اُستاد کانٹ سے بھی سبقت لے گیا ہے۔ اُس کے خیال میں دنیا ایک دارالمحن اور مصیبت گاہ ہے انسان کی پیدائش ایک قصور کی "سزا" اُس کی زندگی تمام تر مصیبت اور اُس کی موت ایک یقینی واقعہ ہے +

فاضل مولف نے اس خیال سے کہ فلسفہ سے بیگانہ اصحاب بھی اس مایوس فلسفی کو سمجھ سکیں۔ ایک پُرازمعلومات مقدمہ کے ذریعہ فلسفہ کی تدریجی ترقی کو جو اُس کے عہد تک ہوئی تھی بتایا تھا۔ اس کے پہلے ایک مختصر دیباچہ ہے اور نفس صاحب سوانح کے متعلق پانچ باب ہیں ۔ ہم کو امید ہے کہ ادب و فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے علم دوست اصحاب نہ صرف اس کتاب سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ بلکہ علمی حیثیت سے اس نوزائیدہ مجلس کی حیات آئندہ کا بھی سامان مہیا کریں گے ۔ کہ ملک کو ایسے اداروں کی اشد ضرورت ہے ۔ ادارہ کے متعلق تمام معلومات اُس کے سکریٹری سے مذکورہ بالا پتہ سے حاصل کئے جاسکتے ہیں +

قصے اور ڈرامے

پُرانا خواب اور دو افسانے ۔ از جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی ۔اے صفحہ ۱۰۲+۱۲۲+۹۰+۲۲۴ قیمت عہ ۔ پتہ مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ +

وہ کون شخص ہے جو اردو ادبیات سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اور اردو کے اس اعلیٰ انشا پرداز اور اُس کے خاص طرز نگارش و اصول تصنیف سے واقف نہ ہو۔ مذکورہ بالا کتاب مجموعہ ہے ایک ڈراما (پُرانا خواب) اور دو افسانوں کا (۱) آسیب الفت (۲) مطلوب حسیناں۔ یہ چیزیں علیحدہ علیحدہ بھی شایع ہو چکی ہیں یہ تینوں افسانے ترکی زبان سے ترجمہ کئے گئے ہیں اور ان کا مطالعہ نہ صرف ذہنی مسرت اور اردو کی چاشنی کا سبب ہے۔ بلکہ اس سے ترکی ادبیات و معاشرت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان تین افسانوں کی خوبی خود صاحب ترجمہ کی ذات ہے اُن کی دوسری کتابوں کی طرح یہ بھی نہایت اچھی طرح چھپا ہے +

نوائے تلخ | از جناب اشفاق صاحب صہ ۱۶۸ قیمت ۱ر پتہ گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز و پبلشرز' لاہور +

اس کتاب میں چند خیالی تقریریں اور متعدد خطوط ہیں ۔ اور ان کا ظاہری مقصد حمایت نسواں اور غریب و مظلوم بے کس و مجبور عورتوں کو مردوں کے آہنی پنجہ اور ظلم وستم کی زنجیروں سے چھڑانا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن اشفاق صاحب نے اپنی خیالی تقریریں جو رویہ اختیار کیا ہے ۔ اور جس طرح معاشرت و مذہب کا مضحکہ اُڑایا ہے ۔ وہ اُن کے اس تمام اصلاح کو بڑھا کر مضحکہ بنا دیتا ہے اور ان کے اس سر میں یقینی نے تلخی پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ چیزیں ایک مرد کے لئے سب سے زیادہ مہلک اور اُس کے مشن کے لئے تباہ کن ہیں۔ عورتوں کی حمایت گناہ نہیں۔ اُن کی ترقی کے وسائل پر غور کرنا ہمارا فرض ہی نہیں ہے بلکہ آئندہ قومی حیات و انفرادی و خاندانی زندگی کے لئے بہ اشد ضروری ہے ۔ لیکن نہ اس طریقہ سے جس کا ثبوت نوائے تلخ کے مرتب نے دیا ہے +

اس کے علاوہ مرتب کی ایک اُپج یہ بھی ہے کہ وہ اردو میں اپنے قابل احترام چچا اور لائق کماندار خلیق ناظر کو "تو" سے مرتب کرتے ہیں۔ چنانچہ پیشکش کے یہ الفاظ ہیں:-

> "بخدمت مسٹر شیخ محمد ایڈوکیٹ گورداسپور' میرے عزیز اور محترم چچا۔ تیرے احسانات کا شکریہ میری توفیق سے باہر ہے ۔ پیارے رواں رواں تیری گوناگوں شفقتوں کا زیر بار ہے ۔ یہ ادنیٰ کتاب تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں'
>
> مجھ سے یہی بن آئی' یہی تیری نظر ہے"

آگے چل کر معذرت کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں:-

> "خلیق ناظر! اگر کبھی فرصت کے وقت یہ کتاب تیرے سامنے آئے اور اسے پڑھ کر تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کا کوئی حصہ تیرے پڑھنے یا تیری توجہ کے قابل ہے تو سمجھ لینا کہ مجھے اپنی محنت کا پھل مل گیا تو جانتا ہے کہ انسان سہو و خطا کا مبتلا ہے ..... مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں تجھے نصیحت کروں ...."

یہ ہے نمونہ از خروارے از خزانہ ادب وانشا کا' اور یہ ہے ادنیٰ ثبوت اُس نئی روشنی کا جسے آجکل ایک جماعت آزادی کے نام سے یاد کرتی ہے ۔ اس حصے کے خطوط نما افسانے یقیناً بعض اُن معاشرتی خرابیوں کی غمازی کرتے ہیں۔ جن کی اصلاح بہ اشد ضروری ہے اور اس کتاب سے کم از کم اس قسم کے معلومات حاصل کئے جاسکتے ہیں +

ضحاک | مترجمہ جناب اختر شیرانی صاحب صفحہ ۱۰۴ ۔ قیمت ۸ر پتہ پنجاب اردو اکاڈمی لاہور +

ایران میں موجودہ تمثال نگاری کی ابتدا گذشتہ عیسوی صدی کے نصف آخر کے کچھ پہلے شروع ہوتی ہے۔ وہاں اس کی ابتدا تراجم سے ہوئی اور اسی میں ایک ترکی ڈراما تیاتر ضحاک تھا۔ اب غالباً اسی کا اردو ترجمہ اس نام سے شایع کیا گیا ہے۔ اختر صاحب لائق باپ کے لائق فرزند ہیں۔ اور پنجاب کے

نوجوان انشاپردازوں اور شاعروں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ ترجمہ بھی ہماری توقعات کے مطابق صاف، سلیس، عام فہم اور ایک بڑی حد تک معائب سے پاک ہے۔ نثری ترجمہ کے علاوہ مترجم نے بعض جگہ نظم کا نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کتاب میں اختر صاحب کا اپنا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اُن کو اس پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھنا چاہئے تھا۔ جس میں اس فن کی تاریخ سے نہ سہی اس خاص کتاب کی خصوصیات سے بحث کرنا چاہئے تھا۔ امید کہ وہ اس کمی کو دوسری اشاعت میں پورا کردیں گے +

سرگذشت وزیر خان لنکران

مترجمہ جناب محمد عبدالقوی صاحب فانی، ایم، اے ص ۳۲+۸۴+۱۱۰ قیمت عہ۔ آسی پریس محمود نگر لکھنؤ +

یہ ڈراما بھی فارسی میں ترجمہ کے ذریعہ داخل ہوا۔ اور اب ترجمہ ہی کے ذریعہ اردو خواں اصحاب کے سامنے آتا ہے۔ چونکہ یہ تمثیل داخل نصاب ہے اور مترجم کا مقصد اوّل طلبہ کی امداد ہے۔ اس لئے اُنہوں نے کہ جامعہ لکھنؤ کے اُستاذ ہیں صرف ترجمہ ہی شایع نہیں کیا ہے۔ بلکہ اصل فارسی بھی دیدی ہے اور اسی کے مقابلہ میں اردو ترجمہ، اس کے علاوہ ابتدا میں اس فن کی تاریخ پر عموماً اور اس کے ایران میں ترویج اور زیر تنقید کتاب کے حالات پر ۲۲ صفحہ کا جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اور آخر میں اہم الفاظ اور اہم ارکان تمثیل کی تشریح و توصیف کا فرہنگ بھی شامل کردیا ہے۔ پھر بھی نفس تمثیل، اس کا مقصد، اسکا پلیٹ اور اس کے ارکان کی خصوصیات پر بحث تشنہ تفصیل ہے۔ ممکن ہے کہ وہ سی کتاب کی وجہ سے اس موضوع کو زیادہ نہ پھیلایا گیا۔ لیکن اگر یہ کمی پوری کردی جائے تو پھر یہ ترجمہ ہر حیثیت سے مکمل ہوجائے گا +

منظم

انتخاب مثنویات میر۔ مرتبہ آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا صفحہ ۴+۳۶+۱۳۲=۱۷۲ قیمت عہ۔ پتہ منیجر نظامی پریس بدایوں +

ڈاکٹر صاحب موصوف نہ صرف قانون و مغربی ادبیات کے مستند عالم ہیں بلکہ اردو نثر و نظم کے ایک بہترین نقاد اور تاریخ ادب کے بلند پایہ فاضل ہیں آج سے کچھ سال پہلے اُنہوں نے خاقانی ہند ذوق دہلوی کے قصائد کو اڈٹ کرکے شایع کیا تھا اور ملک نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اب اُنہوں نے میر جیسے بلند پایہ شاعر کی مثنویات کا انتخاب اردو دوست اصحاب کے سامنے پیش کرکے تحقیق و تفتیش کے لئے خراج تحسین وصول کیا ہے +

انتخاب سے پہلے ۲۶ صفحات کا ایک عالمانہ و ناقدانہ پُراز معلومات مقدمہ ہے۔ اور اس کے پڑھنے کے بعد بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ مقدمہ حیات میر کے متعلق بہترین ذخیرہ ہے۔ اس میں فن درائت و روائت کے اصول کے مطابق ہر بیان کو واقعات کی کسوٹی پر رکھ کر اُس کے نتیجہ کے مطابق غیر جانبدارانہ فیصلہ صادر کردیا گیا ہے۔ ہمارے نوجوان محققین و ناقدین کے لئے یہ مقدمہ مشعل ہدایت ہے۔ اور وہ اس سے تذکرہ نگاری کے صحیح اصول سیکھ سکتے ہیں۔ اس میں ۳۲ مثنویوں کا انتخاب ہے، انتخاب میں یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ جو اشعار ذوق سلیم کو گراں معلوم ہوں ان کو حذف کردیا گیا ہے۔ اور اس حیثیت سے یہ انتخاب ابتذال کی گندگیوں سے بھی پاک ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس کتاب میں فہرست موجود نہیں ہے۔ اور طباعت کی بھی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ چنانچہ ابتدا کے چار صفحات انہی اغلاط کی تصحیح کے نذر ہوگئے ہیں۔ ہم نہایت پُر زور الفاظ میں اردو ادب و نظم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب سے اس کے مطالعہ اور اس سے استفادہ کی سفارش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ فاضل مرتب اس سلسلہ کو جاری رکھینگے کہ ہماری زبان کو ایسے اصحاب فضل اور اُن کی عالمانہ تصانیف کی اشد ضرورت ہے۔

شعلہ

(ہر دو حصہ) مصنفہ جناب ماسٹر محمد حمزہ خانصاحب جذبی نظامی ص ۳۲+۴۰ قیمت ہر دو حصص ۸؍۔ پتہ، مصنف، نا ندورہ ریلوے ضلع بلڈانہ، برار +

یہ دو رسالے جناب ماسٹر صاحب کی مختلف و متعدد ادبی، تاریخی، مذہبی اور اصلاحی نظموں کے مجموعے ہیں۔ نظمیں دلچسپ، موثر اور نتیجہ خیز ہیں۔ وہ نہ صرف اس قابل ہیں کہ ان کو عام طور سے پڑھا جائے بلکہ اس بات کی مستحق ہیں کہ بچوں کو بھی پڑھایا جائے اور شاید اسی خیال سے مصنف نے ان کو جلی قلم سے لکھایا ہے اس کے علاوہ برار جیسے صوبہ کی یہ ادبی و اصلاحی خدمت ہماری ہمت افزائی کی مستحق ہے کہ صرف اسی طور سے ہم ان صوبوں میں جہاں یہ زبان محدود حلقہ سے آگے نہیں بڑھ رہی ہے اس کو عام و ہردلعزیز بنا سکتے ہیں +

زرق بلیغ

مصنفہ جناب حافظ محمد ممتاز الرحمٰن صاحب بدنام ص ۳۲، مفت۔ پتہ مصنف، قریشی محلہ امروہہ ضلع مرادآباد +

یہ چھوٹا سا رسالہ جناب شاہ صاحب کی غزلوں، ایک مناجات، اور متعدد رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ جو شعر جس حرف پر ختم ہوتا ہے۔ اُسی سے شروع بھی ہوتا ہے، حتیٰ کہ طویل مناجات میں بھی یہ صفت موجود ہے۔ اس لئے یہ رسالہ قابل مطالعہ ہے اور پھر اس پر مفت را چہ باید گفت +

محمدی بوا | مصنفہ جناب میرزا فہیم صاحب چغتائی ص ۶۸ - قیمت ۴ر - پتہ نگارستان ادب کوچہ کمان گراں - موچی دروازہ لاہور +

جناب میرزا صاحب اُن چند مخصوص افراد میں ہیں جو اس زمانہ میں دہلی کی اردو دہلی میں اظہار خیالات پر پوری قدرت رکھتے ہیں - اس رسالہ میں اُنہوں نے اپنے بچپنے کے حالات اسی خاص لال قلعہ کی زبان میں نہایت موثر پیرایہ میں بیان کئے ہیں - اور اس کا مطالعہ ادبی، اصلاحی اور لسانی اعتبار سے یکساں مفید ہے - اور یہ کتاب اس قابل ہے کہ بچوں کو پڑھائی جائے - کہ اس طرح اُن کے ذہن میں دہلی کی خالص اردو کے متعلق کچھ تو علم ہو - ورنہ ان لوگوں کے بعد کوئی بھی ایسا نہ رہے گا جو اتنا بھی لکھ سکے +

کرشمۂ تعلیم | مصنفہ جناب سید ابوالبرکات محمد شفیع احمد صاحب ص ۸۲ - قیمت ۶ر - پتہ منیجر رسالہ دستکاری دہلی +

اس رسالہ میں ایک غریب مزدور لڑکے کا قصہ بیان کیا گیا ہے - کہ وہ کس طرح اپنی ہمت واستقلال کی وجہ سے ترقی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ گیا لیکن اس کی زبان، اسکی ترتیب اور اسکے واقعات کی موجودہ صورت میں ہم نہیں سمجھ سکتے یہ کتاب کس طرح بچوں کے لئے مفید اور ان کے اندر حوصلہ وعزم پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے - لیکن چونکہ اسے ریڈنگ ریڈر کا نام اور ایک اسلامی ریاست کی حمایت حاصل ہے اس لئے یہ کتاب مالی حیثیت سے کم ازکم مصنف کے لئے تو ضرور ہی منفعت بخش ہوگی +

نسائیات | **بچوں کی تربیت** - ازجناب محمد عبدالغفار صاحب ابحری ص ۱۱۶ - قیمت ۱ر

یہ رسالہ دراصل ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ عصمت میں مصنف نے لکھے تھے، اب ان کی افادی حیثیت پر نظر کرکے اس کو مجموعہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے - یہ رسالہ دو حصّوں میں منقسم ہے - جسمانی تربیت اور تعمیر اخلاق - ان دونوں چیزوں کے متعلق اس میں تمام ضروری معلومات بہتر پیرایہ اور صاف زبان میں بیان کئے گئے ہیں - امید کہ اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے گا کہ اولاد کی جسمانی واخلاقی تربیت ہی میں والدین کی ہر گونہ فلاح اور ناموری مضمر ہے +

عصمتی کروشیا | مرتبہ جناب محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ ص ۱۲۰ - قیمت ۱۲ر +

اس رسالہ میں کروشیا اور السرشن کی شوقین بہنوں کے لئے پچاسی عمدہ نمونے دیئے گئے ہیں - یہ نمونے مختلف خواتین کی ہنر کاری کا نمونہ ہیں - ابتدا میں اس سے متعلق ہدایات بھی ہیں +

عصمتی کشیدہ | مرتبہ جناب محترمہ آمنہ نازلی صاحبہ ص ۶۰ قیمت ۸ر

یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے - اور اسمیں کشیدہ کاری کے تقریباً ڈیڑھ سو مختلف نمونے درج ہیں - اس کی ابتدا میں بھی ہدایات ہیں - ہم ان دونوں بہنوں کو اُن کی ان مساعی جمیلہ پر مبارکباد دیتے ہیں - اور امید کرتے ہیں کہ ان کی تصانیف سے پورا پورا فائدہ اُٹھا کر ان کی محنت اور جوش خدمت کی داد دیجائیگی +

مذکورۂ بالا تینوں کتابیں سلسلہ عصمت کی تین کڑیاں ہیں اور منیجر عصمت بک ایجنسی، کوچۂ چیلاں دہلی سے مل سکتی ہیں +

(باقی آئندہ)

"سنان"

غزل

اُس کی فطرت میں ہے شامل بھول بھی اور یاد بھی — اس لئے رہتا ہے دل ناشاد بھی اور شاد بھی
کوئی کیا سمجھے گا ان خاموشیوں کا مدعا — جن میں آہیں بھی ہیں نالے بھی ہیں اور فریاد بھی
پیکرِ صد بے نیازی اور تصویرِ نیاز — ہوں اسیرِ دام بھی اور دام سے آزاد بھی
وہ بھی عالم تھا کہ دم بھر بھی جدا ہوتے نہ تھے — یہ بھی عالم ہے نہیں آتی تمہاری یاد بھی
شکر ہے گلشن میں مجھ کو اب کوئی حسرت نہیں — برق بھی ہے بادِ صرصر بھی ہے اور صیاد بھی
رنج کا غم کا الم کا یاس کا مسکن ہے دل — یہ وہ بستی ہے کہ ہے آباد بھی برباد بھی
درد کی حسرت تھی پہلے رشک سے جلتا ہوں اب — آہ وہ کرنے لگے اغیار پر بیداد بھی
بال و پر کنج قفس میں باغ میں آڑتا ہے دل — کیا تماشا ہے مقید بھی ہوں اور آزاد بھی
برق کا کھٹکا، ہوا کا خوف، ڈر صیاد کا — قیدیوں سے کم مصیبت میں نہیں آزاد بھی
لے اُڑا مجھ کو تصورِ یار کا اب اُس جگہ — جس جگہ ہیں طفل مکتب قیس بھی فرہاد بھی

(خاص)

امر چند قیس

دُرِ یگانہ

(از حضرت میرزا یگانہ لکھنوی)

دُکھتا ہوا دل ٹٹول لینے والا — آنکھوں آنکھوں میں تول لینے والا
دل کی آواز گوشِ دل سے سُنکر — کیا ہے کوئی درد مول لینے والا

ولہ

بادل کو لگی کُھلتے برستے کچھ دیر — دل کو نہ لگی اُجڑتے بستے کچھ دیر
بچّوں کی طرح موم ہوا ہوں ایسا — روتے کچھ دیر ہے نہ ہنستے کچھ دیر!

ولہ

اپنی حد سے گذر گئے اب کیا ہے — منجدھار سے پار اُتر گئے اب کیا ہے
اے شوقِ وصال اے تمنّائے سکوں — دونوں پلّے تو بھر گئے اب کیا ہے!

ولہ

یارانِ چمن یہ رنگ و بو مجھ سے ہے — تم سے کیا ہوگا؟ لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جانِ سخن ہوں بلکہ ایمانِ سخن — دنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

ساجن کو سکھی منا لو پھر سو لینا — سوتی قسمت جگا لو پھر سو لینا!
سوتا سنسار، سننے والا بیدار! — اپنی بیتی سُنا لو پھر سو لینا!
اُٹھو سکھی پھر سو لینا

یگانہ — (خاص)

غزل

از جناب حامد اللہ صاحب افسر۔ بی۔ اے

بت بنے، بت کا پُجاری بنے، بت خانہ بنے
لاکھ گو تجھ سا بنے کوئی پہ تجھ سا نہ بنے

یا تو ہونا نہ تھا ہر ذرّہ میں یوں جلوہ نما
یا یہ کہنا تھا کہ ہر ذرّہ میں بُت خانہ بنے

ہائے وہ جس کی اُمیدیں ہیں خزاں پر موقوف
شاخِ گل سُوکھ کے گِر جائے تو کاشانہ بنے

اُف ارے وحشت! کوئی پردہ نہیں رہتا باقی
ہوش کی جس کو تمنّا ہو وہ دیوانہ بنے

کیف ساماں کوئی مجھ سا بھی نہ ہوگا افسر
آنکھ جس پھول پہ ڈالوں وہی پیمانہ بنے

(خاص)

افسر

غزل

از جناب حامد اللہ صاحب افسر۔ بی۔ اے

جب دل کی بے کلی کا سبب پوچھتا ہوں میں
کہتا ہے کوئی درد نہیں ہوں دوا ہوں میں

ہوں میں بھی اپنے ڈھونڈنے والوں میں دیکھنا
شاید یہ ہوش ہے کہ کہیں کھو گیا ہوں میں

غمخوار بھی ہو کوئی تو کیوں کر سمجھ سکے
کیا جانے بے خودی میں یہ کیا کہہ رہا ہوں میں

خودداریاں یہ میرے تجسّس کی دیکھنا!
منزل پہ آ کے اپنا پتہ پوچھتا ہوں میں

اُن پیاری پیاری آنکھوں پہ الزام کیا رکھوں
دل سے ستم ظریف کا مارا ہوا ہوں میں

رکھ کر نظر کے سامنے تصویر خواب ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

افسر ہو کیوں کوئی مری رندی پہ حرف زن
میں نے یہ کب کہا کہ بڑا پارسا ہوں میں

(خاص)

افسر

جوشِ جنوں

(از جناب امر چند صاحب قیس جالندھری)

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی　　آہ بھی کی تو با اثر نہ ہوئی
بے خبر کو کبھی خبر نہ ہوئی　　شبِ فرقت مری بسر نہ ہوئی
لاکھ چاہا مگر سحر نہ ہوئی

مجھ سے خوش کوئی خوش نظر نہ ہوا　　میں نے جو چاہا عمر بھر نہ ہوا
میرا مرنا بھی کارگر نہ ہوا　　اُس پہ مرنے کا بھی اثر نہ ہوا
اُس کو مرنے کی بھی خبر نہ ہوئی

ولولے سب مٹا دئے دل کے　　داغ دل سے اُٹھا دیئے دل کے
دل میں ارماں دبا دئے دل کے　　جس نے پُرزے اُڑا دیئے دل کے
پھر وہ برچھی ہوئی نظر نہ ہوئی

مجھ کو گھر سے نکال کر رہنا　　مجھ کو محفل سے ٹال کر رہنا
اب طبیعت سنبھال کر رہنا　　آج سے دیکھ بھال کر رہنا
پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

اس قدر شوخ اس قدر طرّار　　اتنا چالاک اس قدر ہشیار
پہلے دل لینے سے کیا انکار　　باتوں باتوں میں پھر بتِ عیّار
لے گیا دل مجھے خبر نہ ہوئی

(خاص)　　قیس

حکایتِ گُل

از حضرت محمود اسرائیلی

گُل کا بلبل نے گریباں چاک دیکھا تو کہا کیا ترے ننھے سے دلمیں غم ہے ایسا جانگداز؟
کیوں ہے یہ شیرازۂ اوراق ایسا منتشر میں تری شیدا ہوں کہدے مجھ سے اپنے دل کا راز
کیا مری کم التفاتی کی شکایت ہے تجھے کیا نہیں بخشی ہے فطرت نے مجھے خوئے نیاز؟
کیا مری اُلفت نہیں ہے تیری شوخی کی کفیل کیا مری ہمّت سے بڑھکر ہو چلے ہیں تیرے ناز؟
گل نے بلبل سے کہا تجھ سے کوئی شکوہ نہیں میں ترا مطلوب ہوں اور تو ہے میری دلنواز
صرف ہے میری پریشانی کا باعث یہ خیال کیوں نہیں انسان کو نیکی بدی کا امتیاز؟
فصلِ گُل آتے ہی گلچیں آیا صحنِ باغ میں پھول کھلتے ہی کیا دستِ ہوس اپنا دراز
میں عرق آلودہ ہو جاتا ہوں خوفِ مرگ سے پڑتی ہے گلشن میں اس جانب جو چشمِ نیم باز
خود غرض ہے رحم کی بُو اُس کی فطرت میں نہیں اُس کے دل میں کچھ نہیں خوفِ خدائے کارساز
اک مجھی پر کیا ہے بلبل محفلِ عالم کو دیکھ شمع میگوید باہل بزم با سوز و گداز

سر بُریدن پیش ایں سنگیں دلاں گلچیدن است!!

(خاص)

محمود اسرائیلی

قطرۂ شبنم

از جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانسن کالج آگرہ

آہ اے شبنم کے قطرے تیری حالت دیکھکر
پانی ہو ہو کر بہے جاتے ہیں میرے دل جگر

عمر کم کو ساتھ لے ناداں کیوں لایا ہے تو
ایک شب کیواسطے دنیا میں کیا آیا ہے تو

ہائے مل جائینگے سب ارمان تیرے خاک میں
صبح اب نزدیک ہے سورج ہے تیری تاک میں

بے ثباتی اور پھر ایسی ۔ ہزار افسوس ہے
زندگی مختصر پر لاکھ بار افسوس ہے

دیکھ کر تجھ کو نکل آئے یہ آنسو کس لئے
چل گیا دل پر ہمارے تیرا جادو کس لئے

آبداری میں ہے بڑھ چڑھ کر دُرِ غلطاں سے تو
کیا مُشابہ ہے کسی کے گوہرِ دنداں سے تو

یا پسینہ ہے کسی کے رشکِ گل رخسار کا
یا کوئی قطرہ ہے دودِ آہِ آتش بار کا

تجھ میں یہ دل بستگی آئی کہاں سے کیا ہے تو
باغ میں جاکر جو دیکھا حُسن کا دریا ہے تو

گود میں لیتے ہیں تجھ کو جان تو پھولوں کی ہے
تیرے دم سے تیرے باعث آبرو پھولوں کی ہے

زرد پتّا ہوگیا تھا رُوئے پُر انوارِ گل
شرم رکھ لی تو نے بن کر غازۂ رُخسارِ گل

لیلئ شب باغ میں آتی ہے دن کو ٹال کر
موتیوں کا تیرے ہار اپنے گلے میں ڈال کر

پھول ۔ پتے ۔ سبزۂ خوابیدہ کی تو جان ہے
آبداری تجھ پہ صدقے ۔ تازگی قربان ہے

پلتی ہے ہر اک کلی تیری بغل میں رات بھر
رہتی بستی ہے ترے موتی محل میں رات بھر

الغرض بالیدگی پودوں کی تیرا کام ہے
چشمۂ آبِ خضر تیری تری کا نام ہے

ساری رونق گلشن عالم کی تیرے دم سے ہے
تازگی سبزہ و گل قطرۂ شبنم سے ہے

(خاص)

شریر بیوی کا دیباچہ

از جناب ریاض حسین صاحب بی۔اے

مغرب میں فسانہ نویسی کا مقصد محض تفریح و تفنن نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر بلند پایہ فسانہ نویس اس سے بلند و برتر مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ اور اپنے فسانوں سے سوسائٹی کی اصلاح و درستی اور نئے خیالات کی ترویج و اشاعت کا مفید کام لیتا ہے۔ وہ سوسائٹی کے عیوب و نقائص کو بے نقاب کرتا ہے لوگوں کی سماجی زندگی کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ اور ایسے دلکش پیرایہ میں ان کی کمزوریوں سے ان کو آگاہ کرتا ہے۔ کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم ہی اس بیدردانہ تنقید کے تختۂ مشق ہیں۔ ان سب باتوں کو نہ صرف مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ بلکہ اندر ہی اندر ان کا دل ان باتوں سے متاثر ہوتا جاتا ہے یہانتک کہ ان کے خیالات و افکار میں غیر محسوس طور پر انقلاب سا آجاتا ہے اس طرح فسانہ نویس اپنے ملک اور قوم کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اردو زبان میں اگرچہ مولنا نذیر احمد مرحوم۔ مولنا راشد الخیری۔ مرزا محمد سعید اور دیگر ایسے مقتدر اہل قلم نے اس نوع کے متعدد کامیاب فسانے لکھے ہیں۔ اور وہ اردو کے لئے سرمایۂ ناز ہیں لیکن ایسی تصنیفات کی تعداد اسقدر کم ہے۔ کہ وہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ اور ابھی ضرورت ہے۔ کہ اس طرف مزید توجہ دی جائے۔ اور اردو کے دامن کو اس متاع سے بھی مالا مال کیا جائے +

مرزا عظیم بیگ صاحب بی اے۔ ایل ایل بی کا ہمیں ممنون ہونا چاہئے۔ کہ انہوں نے "شریر بیوی" ایسی دلکش کتاب لکھ کر اسی نوع کی تصنیفات میں ایک قابل قدر اضافہ فرمایا ہے +

یہ ایک المناک حقیقت ہے۔ کہ ہندوستان میں مسلمان عورتوں کو رسمی پردہ کی جکڑ بندیوں نے بہت حد تک عضو معطل بنا رکھا ہے۔ اور اس کا مضر اثر مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے ہر شعبہ پر پڑ رہا ہے۔ عورتیں مردوں کی رفیق اور معاون ہونے کی بجائے اکثر آن کے لئے وبال ثابت ہوتی ہیں کہنے کو تو بیوی کے لئے "رفیقۂ حیات" اور "مونس زندگی" ایسے خوش آئند القاب موجود ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں یہ الفاظ شرمندۂ معنی نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عورت کا مخصوص دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری ہے۔ اور اس کو فطرت نے "شمع انجمن" بننے کی بجائے "چراغ خانہ" بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ منزل زندگی میں مرد کی سچی رفیق اور حقیقی معاون بننے کی بجائے اس کے لئے بار دوش بنی رہے۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ عورت شرعی پردہ کی پوری پوری پابندی کرتے ہوئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھے وہ ہر وقت اور ہر جگہ مرد کے طاقتور اور مضبوط بازو کا سہارا ڈھونڈھنے کی عادی نہ رہے۔ کارزار حیات کی کٹھن منزلوں کو طے کرنے اور ناگہانی مصیبتوں کا وقت پڑے پر تنہا مقابلہ کرنے کے بھی قابل ہو۔ صنف نازک کے لئے ضرور نہیں کہ وہ صنف ضعیف بھی ہو۔ اس کی شرم و حیا بدنصیب معصومہ کی طرح اسے بیکس و بےبس نہ بنادے۔ کہ وہ ہر بدمعاش کی ہوسناکی کا آسان شکار بن جائے بلکہ اس کی شرم و حیا اس کے لئے ایک حصن حصین کا کام دے۔ جس پر بدمعاش اور بدطینت لوگوں کو نظر ڈالنے کی جرأت ہی نہ پڑے۔ آوارہ لفنگوں کے لئے اس کی ایک پرملامت نگاہ حوصلہ شکن اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ ہمت فرسا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ ضرورت کے وقت وہ ایسی کارروائی کرنے سے بھی گریز نہ کرے۔ جس کے ذریعے بدمعاش کو اس کی بدمعاشی اور بدطینتی کی سزا دی جاسکے +

"شریر بیوی" ظرافت کے پیرایہ میں ازدواجی زندگی کا ایک دلکش مرقع ہے۔ جس میں شوہر اور بیوی دو زندہ دل بے تکلف دوست ہیں۔ جو بازو میں بازو ڈالے ہنسی خوشی زندگی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ شوخئ طبع اور زندہ دلی نے ان کی زندگی کو ایک مسلسل قہقہہ بنا رکھا ہے۔ بیوی صحیح معنوں میں رفیقۂ حیات اور شوہر کی دمساز ہے۔ شوہر بھی اسے زرخرید لونڈی یا ناقص العقل ہستی نہیں بلکہ اصلی معنوں میں شریک زندگی سمجھتا ہے۔ اور زندگی کی مسرتوں اور خوشیوں میں اس کی معیت کو ناگزیر خیال کرتا ہے۔ وہ بیوی کو اے۔ اجی جی۔ وغیرہ کے بھدے الفاظ سے نہیں بلکہ دوست کے سے بے تکلف لفظ سے خطاب کرتا ہے۔

وہ بیوی کا ذکر کرنے میں رسمی جھجک اور تصنع سے کام نہیں لیتا۔ اسے اپنی بیوی کی پاکبازی اور نیک نیتی پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اور وہ اس کی عقل و فراست کا قائل ہے۔ اسی لئے وہ بعض اوقات بیوی کو نہایت خوفناک مگر دلیرانہ تجربے کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں وہ کہیں کہیں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔ چنانچہ خود مصنف کو اس کا اعتراف ہے اور "دوست کی حماقت" کے خاتمہ پر وہ رقمطراز ہے:۔

"اس تجربہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ در اصل ہمارا اور ہماری بیوی کا اصول غلط تھا۔ شرارت اور آزادی کی ضرور کوئی حد ہونا چاہئے۔ اور اس حد آزادی کو ہر شخص اپنی ضروریات کے مطابق مقرر کر سکتا ہے۔"

ایک مغربی مصنف کا قول ہے۔ کہ "شوخ و شریر لڑکیاں نیک اور فرمانبردار بیویاں بنتی ہیں"۔ شریر بیوی کا کردار اس مقولہ کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔ اس میں شوخی ہے لیکن وہ شوخی جو حسن و رعنائی کا خاصہ ہے۔ اس میں شرارت ہے لیکن وہ شرارت جو زندہ دلی اور ظرافت کی پیداوار ہے۔ تمام شوخی و شرارت کے باوجود اس کی شوہر سے محبت پرستش کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ ان خوبصورت لفظوں میں اقرار کرتی ہے۔ کہ

"جو تم کہو۔ وہ صحیح ہے۔ کہہ چکی۔ کہ میرا مذہب ہو تو تم ہو۔ اور ایمان ہو تو تم ہو۔ مگر میں اب بغیر اپنی آنکھیں پھوڑے نہ رہونگی۔ میرا مذہب ہے کہ اگر ایک چیز میری آنکھیں دیکھیں کہ ہے۔ مگر تم کہو کہ نہیں۔ تو میری آنکھیں جھوٹی اور تم سچے"۔

وہ شوہر کی رضاجوئی کو اپنا ایمان سمجھتی ہے۔ اور اپنے جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے عام عورتوں کی سطح سے بلند ہو کر خاوند کے لئے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار یوں کرتی ہے:۔

"جسیں تم خوش ہو۔ اسیں میں خوش اور میرا خدا خوش۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو میاں کو خواہ مخواہ تنگ کریں۔ میں خوب جانتی ہوں۔ کہ تم میرے ہی ہو۔ خواہ بدچلنوں میں بیٹھو۔ خواہ نیک چلنوں میں۔ میں اگر تم کو روکونگی۔ تو خوشامد اور خدمت سے۔ نہ کہ لڑ جھگڑ کر۔ مگر افسوس تو مجھ کو اپنی قسمت پر آتا ہے۔ کہ تم نے میری قدر نہ کی۔ مجھ کو کم ظرف سمجھا اور مجھ سے سچ سچ نہ کہا۔ یہ تو تمہارے دوست کی رنڈی ہے۔ اگر کہیں خدا نہ کرے تمہاری بلائی ہوتی۔ تو کیا میں اس کی یا تمہاری خدمت نہ کرتی۔ خدا نہ کرے۔ کہ ایسا ہو۔ مگر بخدا اگر ایسا ہوا۔ تو تم مجھے ثابت قدم پاؤ گے"۔

اگر عورتیں اپنے بدچلن شوہروں کو درست کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کریں۔ اور شریر بیوی کے جادو بھرے لفظوں میں ان سے اپیل کریں۔ تو یقین ہے کہ انہیں سو فیصدی کامیابی ہوگی۔

جس قدر شریر بیوی کی طبیعت میں شوخی اور شرارت ہے۔ اسیقدر اسکا دل حساس اور رقیق واقع ہوا ہے۔ غلط فہمی کے سبب اسے خیال ہوتا ہے کہ میرا شوہر خفیہ خفیہ کسی رنڈی سے ملتا ہے۔ تو وہ رنج و غم سے نڈھال ہو جاتی ہے لیکن اس کا رنج و غم رقابت کی وجہ سے اتنا نہیں جتنا اس وجہ سے ہے کہ شوہر نے اس راز کو اس سے چھپائے رکھا۔ وہ شوہر کے اعتبار کو سرمایۂ زندگی سمجھتی ہے۔ اور اس اعتبار کا اٹھ جانا اس کے لئے ہلاکت سے کم نہیں۔ چنانچہ وہ کہتی ہے:۔

"تمہارا اعتبار جب میرے اوپر سے اٹھ گیا۔ تو میں کیونکر زندہ رہ سکتی ہوں۔ اگر کسی بازاری عورت سے تم ملو اور مجھ سے کہدو۔ تو خیر کچھ نہیں۔ لیکن وہ گھر میں آئے اور تم مجھ سے چھپاؤ۔ تو اس کے یہی معنی ہیں کہ میری موت قریب ہے۔ مجھ کو اب تک فخر تھا۔ کہ میں تمہاری رازدار ہوں"۔

الغرض شریر بیوی کا کردار اپنے اندر ایک جاذبیت اور دلکشی لئے ہوئے ہے وہ شریر ہوتے ہوئے بھی بہترین اوصاف کی مالک ہے۔ اور ان خوبیوں سے وہ اپنے شوہر کی زندگی کو بہشت بنائے ہوئے ہے۔ اس کے کارناموں کو پڑھتے پڑھتے ناظرین کے دل میں خود بخود اس کے لئے ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور دل اس کی شوخی اور شرارت پر اسے ملامت کرنے کی بجائے اس کے لئے تعریف و توصیف کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔

فاضل مصنف نے فلسفۂ عصمت پر بھی ایک چھچھلتی سی نظر ڈالی ہے۔ اور نئے زاویۂ نگاہ سے اس پر ایک لطیف بحث کی ہے۔ جس کے لئے وہ مستحق داد ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ تصنیف بہت سے لوگوں کی ازدواجی زندگی کی تلخیوں کو کم کرنے میں مفید ثابت ہوگی۔ اور انہیں اپنے طرز عمل میں بہتر تبدیلی پیدا کرنے پر مائل کریگی۔

(خاص) ریاض بی۔ اے

....

"آبحیات"

از جناب شیخ محمد عمر فاروق صاحب گورنمنٹ کالج لاہور

زمانۂ قدیم میں بلخ کے ایک عالی شان مینار کے اندر ایک شہرۂ آفاق فلسفی رہتا تھا۔ یہ فلسفی اگرچہ دن رات کیمیاگری اور شعبدہ بازیوں میں محو رہتا تاہم معزز خاندانوں کے لڑکوں کو ہر روز فلسفے کی تعلیم باقاعدہ دیا کرتا تھا۔ اس کے صرف سات شاگرد تھے۔ مگر ان میں سے ایک بھی اتنا خوش نصیب نہ تھا کہ پوشیدہ رازوں سے ذرّہ بھر بھی واقف ہو۔ ایک دن اس نے اپنے سب شاگردوں کو اپنے خاص کمرے میں بلایا۔ وہ تمام خوف وحیرت سے لرزہ براندام تھے۔ کمرے میں ایک میز پر سات شفاف بوتلیں رکھی تھیں جن میں پانی کی رنگت کی کوئی سیّال چیز بھری تھی۔ فلسفی ان سے یوں مخاطب ہوا:۔ "میرے پیارے شاگردو! تم سب کو معلوم ہے کہ میں دنیا کے راز معلوم کرنے میں روز و شب محو رہتا ہوں۔ کل تک مجھے بالکل کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن آج صبح مجھے اُمید نے جھلک دکھائی۔ میں نے سونا بنانے کی ترکیب دریافت نہیں کی۔ نہ ہی مُردوں یا بے جان چیزوں میں جان ڈال سکتا ہوں۔ لیکن کم از کم زندوں کو محفوظ ضرور رکھ سکتا ہوں۔ انسان کو حیات جاودانی ضرور بخش سکتا ہوں۔ میں نے آبِ حیات دریافت کر لیا ہے"+

بوڑھا فلسفی اپنے شاگردوں کے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ حد درجے کا استعجاب۔ اپنے اُستاد کی مسلمہ متبحر لیاقت کا یقین۔ ایک امید کی جھلک کہ شاید وہ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ ان کے چہروں سے عیاں تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ راز تم پر فاش کر دوں" بوڑھے نے کہا "ہاں! بشرطیکہ تم رضامند ہو"+

سب یک زبان ہو کر "ضرور ضرور" چلا اُٹھے +

"لیکن یاد رکھو کہ اس راز میں۔ تمام رازوں کی طرح نقصانات وخطرات بھی مضمر ہیں۔ میری اسّی سال کی عمر نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ اس واسطے میں تو حیات جاودانی کا خواہاں ہوں نہیں اور مجھے امید ہے کہ اس ساٹھ سال کے عرصے میں میری تعلیم نے تم پر یہی ثابت کیا ہوگا"+

سب بولے کہ چاہے جان جائے۔ اپنے محترم استاد کا راز معلوم کرتے رہیں گے +

"بہت خوب" فلسفی نے کہا "اب شرائط! راز کے آگاہ ہونے کی"+

سب ہمہ تن گوش تھے +

"اچھا ـــــ تم میں سے ہر ایک فوراً ان بوتلوں میں سے کسی ایک کو اُٹھا کر پی لے۔ ان ساتوں میں سے ایک میں آبِ حیات ہے اور باقی میں زہر ہلاہل ـ آؤ اپنی قسمت آزماؤ ـ آبِ حیات پیو! ہر ایک کو حیات جاودانی کا موقع دیا جاتا ہے"+

ساتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اُستاد کے چہرے کی طرف نظریں اُٹھائیں کہ شاید وہ مذاق کر رہے ہوں لیکن نہیں یہ صرف ان کا گمان تھا ـ ایک وہم تھا۔ فلسفی کے چہرے سے متانت ٹپک رہی تھی۔ وہ سب پھر بوتلوں کو غور سے دیکھنے لگے۔ لیکن سب ایک ہی رنگت کی شفاف مائع سے پُر تھیں +

"کیوں" فلسفی نے تعجب سے دریافت کیا "دیر کیسی! میرا تو خیال تھا کہ میں ابتک تم میں سے چھ کو دم توڑتا دیکھوں گا ـــ" لیکن ان الفاظ نے ان پر کچھ اثر نہ کیا۔ ان میں سے دو نے میز کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ باقی دوست ان کی تقلید پر ہرگز آمادہ نہیں شرمندہ ہوئے اور ہاتھ پیچھے ہٹا لئے۔

"جناب! یہ خیال ہرگز نہ کیجئے! کہ میں زندگی کو بہت بیش بہا خیال کرتا ہوں" ان میں سے ایک نے کہا "نہیں! میری ایک بوڑھی ماں ہے جس کی زندگی کا میں ہی سہارا ہوں"+

"میں" دوسرے نے کہا "میری ایک بہن ہے جس کی پرورش کرنا میرا فرض اوّلین ہے"+

"میں اپنی زندگی سائنس کی تحقیقات کے لئے وقف کر چکا ہوں" تیسرے نے کہا "یہ ہو سکتا ہے۔ کہ میں کائنات کے راز معلوم کرنے کے بغیر دنیا سے اُٹھ جاؤں"+

اور "میں" چوتھا بولا "جب تک چاند کے باشندوں سے باتیں نہ کر لوں +

"میری بابت؟" چھٹے نے کہا "نہ میرے والدین۔ نہ میری بہن نہ بھائی نہ دوست نہ دشمن اور نہ ہی مجھے اتنا سائنس کا شوق ہے۔ مجھے تو اپنی جان پیاری ہے۔ تف ایسی جاودانی پر جسے حاصل کرنے کے لئے جان کے لالے پڑ جائیں"+

آپ درست فرماتے ہیں "میری بھی یہی رائے ہے" ساتواں آہستہ سے بولا+

فلسفی نے برف سا سفید سر اُٹھایا۔ ان کی طرف دیکھا اور کہا "تو اس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ تم سب اتنے بزدل ہو۔ کہ تم میں سے کوئی نوجوان "آبحیات" پینے کے لئے جرأت نہیں کر سکتا"+

وہ سب خاموش تھے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ آخر ایک بولا "کیا ہم قرعہ ڈال کر باری باری ایک ایک بوتل پی لیں؟ ـــــ آگے ہماری قسمت!"

"مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں" بوڑھے نے جواب دیا۔ غرضیکہ قرعہ ڈالا گیا اور ماں کے لاڈلے بیٹے کی باری پہلے آئی۔ وہ حوصلہ کر کے آگے بڑھا۔ پہلی بوتل اُٹھائی اور رکھدی۔ اور اپنے ایک دوست کی طرف یوں مخاطب:۔

"دوست! یہ مسلمہ امر ہے۔ کہ ماں بیٹے کی محبت بہن بھائی کی محبت سے لگا نہیں کھا سکتی اس واسطے کیا آپ پہل نہ کریں گے"+

"ماں اور بیٹے کا رشتہ تو قلیل عرصہ میں ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن بہن بھائی کے رشتہ کا نسبتاً زیادہ دیر تک قایم رہنے کا یقین ہوتا ہے اس واسطے آپ ہی ہمت کریں" دوسرے نے جواب دیا+

"کیا ایسی باتیں بنانا تمہاری شایان شان ہے؟ تمھیں دنیا کے سامنے لائق فلسفی کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے ـــ تو پھر ـــ"

"نہیں نہیں" باقی سب نے کہا "ان شرائط کو پورا کرو۔ ورنہ چھوڑو اس قضیے کو"+

نوجوان شرمندہ ہو کر آگے بڑھا۔ اور ابھی میز تک بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ ایک تیز روشنی نے ان کی آنکھوں کو چندھیا دیا اور ایک کرخت بجلی کی کڑک نے اُنہیں بیہوش کر دیا+

جب اُنہیں ہوش آیا۔ تو وہ باہر کے کمرے میں تھے۔ سب نے اس بات کو راز رکھنے کا مشورہ دیا۔ اور گھروں کو واپس پھرے+

ان سات شخصوں کا راز ـــ واقعی ایک ایسا راز رہا۔ جیسے کہ سات شخصوں میں کوئی راز رہ سکتا ہے۔ ابھی سات دن بھی نہ گذرے تھے۔ کہ پانچ کے کم از کم سات ہزار انسان اس اہم راز سے آگاہ تھے۔ غرضیکہ اب یہ ساتوں کا راز ایک کھلا راز تھا+

بادشاہ وقت کو خبر پہنچی۔ 'آب حیات' کا نام سنتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ شاہی حکم صادر ہوا کہ شاہی سوار فوراً جائیں اور جس طرح ہو سکے فلسفی سے آب حیات لے کر حضور میں پیش کریں۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی+

فلسفی نے اپنے مکان کے دروازے بند کر رکھے تھے ان کے پرخچے اُڑا دیئے گئے اور شاہی ملازم نہایت جوش و خروش کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور فلسفی کو اپنے خاص کمرے میں اس زندگی سے اُکتا جانے کا مجسم ثبوت پایا۔ وہ ایک کرسی پہ بے جان پڑا تھا۔ میز پر چھ بوتلیں اسی طرح بھری ہوئیں اور ایک خالی تھی۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا۔ جس پر یہ الفاظ رقم تھے:۔

"میں نے عمر بھر علم کے بحر ذخار میں غوطہ زنی کی۔ اور اب میں در بے بہا پیش کرتا ہوں۔ میری تمام کاوشوں کا صلہ یہ چھ قاتل زہر ہیں۔ اگر میں چاہتا تو ایک ساتواں ـ ان سب سے زیادہ قاتل ـ کا اضافہ کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے دانستہ خود پی لیا ہے۔ میرے مزار پر یہ کتبہ ثبت کیا جائے:۔

'اس جگہ وہ ہستی زیر خاک سو رہی ہے۔ جس نے انسانی تکالیف و مصائب کو دائمی کرنے سے گریز کیا اور ایک مہلک و خطرناک تحفہ پیش کیا۔ صرف جس سے زندگی کی مشکلات سے چھٹکارا ہو سکتا ہے':

ع قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شاہی ملازم ایک دوسرے کی طرف متعجب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور فلسفی کے آخری الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ساتھ کے کمرے میں دو تین گلاس ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کا دھماکا ہوا اور لمحہ بھر میں ایک بندر نے کھڑکی سے کمرے میں چھلانگ لگائی۔ بندر کی غیر معمولی پھرتی اور چالاکی اس امر کی شہادت دے رہی تھی کہ فلسفی نے انسان کی کمزوریوں سے مایوس ہو کر 'آب حیات' کا ہر ایک قطرہ اس چلبلے بندر کو پلا دیا تھا+

(از برٹ ہارٹ)

شیخ محمد عمر فاروق

ٹیگور اپنے اصلی رنگ میں

خاص بنگالی زبان سے ترجمہ

بوڑھے سردار کا بھوت

از جناب ڈاکٹر ایم ضیاء الدین امرتسر

(۱)

بوڑھے سردار کی موت کا وقت آیا تو لوگوں میں کچھ پریشانی سی پھیلگئی بیچارے چلائے "سردار! ہائے سردار! تیرے چل بسنے کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا؟"

یہ واویلا سنکر بوڑھے سردار کا بھی دل بسیجا اور دل ہی دل میں فکر کرنے لگا کہ واقعی میرے بعد انہیں کون سنبھالے گا۔ خیر، موت آتی ہوئی تو ٹلتی نہیں۔ پھر بھی بھلے دیوتا کی دیا دیکھئے ــــ اوپر ہی سے بولے "کیا ہے؟ فکر کا ہے کی ہے؟ سردار بھوت ہو کر اُن کی گردنوں پر سوار ہو جائے آدمی کے لئے موت ہے۔ بھوت کے لئے تو موت نہیں"۔

(۲)

لوگ مطمئن ہو گئے۔

یہ صرف آئندہ کو ماننے ہی کی صورت میں ہے کہ فکر انسان کے لئے فکر انگیز ہوتی ہے۔ جب سردار کے بھوت کو قبول کر لیا تو پھر کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا تمام فکریں بھوت کے سر تھوپ دی جاتی ہیں ــــ اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ اس بھوت کی گردن پر سر ہی نہیں، لہذا اسے کسی کے لئے درد سر بھی نہیں۔

معاملہ کی اس صورت کو ملاحظہ کرتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اپنی فکر آپ کرنا چاہے تو بھوت ایسے شخص کی خوب گوشمالی کرتا ہے۔ خدا کی پناہ اس گوشمالی سے نہ تو کوئی بچاؤ کی صورت ہے اور گریز ممکن۔ خلاف اس طرز عمل کے نہ تو نالش کارآمد ثابت ہوئی اور نہ ثالثی۔

اب یہ ہے کہ لوگ بھوت کے زیر سایہ آنکھیں میچ کر زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ مادر وطن کے پنڈتوں کا قول ہے کہ آنکھیں میچ کر چلنا ہی اس دنیا کی قدیمی چال ہے۔ اس دنیا میں اندھے کیڑے اسی طرح کی کورچشمی پر نازاں ہیں ــــ اور سنو اسی اندھی چال کو کہتے ہیں ــــ نیبو کی چال چلنا۔ گھاس پات جھاڑیوں اور درختوں کے جانوروں میں عموماً یہی چال رائج ہے۔

یہ سنکر آسیب زدہ وطن میں اپنی ازلی شرافت کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور وہ اپنی رفتار کے خاص انداز پر فخر کرتا ہے۔

سردار کے بھوت کا نائب اعظم، بھوت کی سلطنت کے جیل خانہ کا داروغہ ہے۔ اب سنئے کہ اس جیل خانہ کی دیواریں ان خاکی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں اور یہی وجہ ہے کہ خیال میں بھی نہیں آسکتیں ــــ تو پھر کہئے کہ انہیں توڑ کر نکل بھاگنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

اس جیل خانہ کا کولہو اگرچہ سدا گردش میں رہتا ہے۔ لیکن وائے ناکامی تیل تو چھٹانک بھر بھی اس میں سے حاصل نہیں ہوتا کہ بازار میں بک سکے بالآخر جو چیز اس کولہو میں پس پسا کر بہہ نکلتی ہے وہ اس کولہو کو سدا گردش میں رکھنے والے بیچارے انسان کے جسم کی قوت ہے ــــ یہ گرمی جب ٹپک ٹپک کر بہہ جاتی ہے تو انسان ٹھنڈا سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

غرضکہ بھائی اس بھوت کی سرکار میں کچھ رہتا نہیں۔ غلہ ہو یا خوراک، پوشاک ہو یا تندرستی، کچھ نہیں۔ اور اگر فی الحقیقت کوئی چیز باقی رہجاتی ہے تو وہ اطمینان ہے ــــ شانتی، شانتی۔

کستقدر اطمینان ان کے ملک میں ہے، اس کی مثال پیش کرتا ہوں جب دوسرے ملکوں کے باشندوں نے دیکھا کہ بھوت نے آمد و رفت کا سلسلہ چھیڑا ہے، تو اُن کے یہاں فوراً حکیم اور ڈاکٹروں کی طلب ہوئی۔ لیکن بھوت کی سرکار کے سایہ میں اس قسم کا وہم و گمان بھی پیدا ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے تو حکما ئے ملک ہی کی گردنوں پر بھوت براجمان ہیں۔ وہ بیچارے خود بھی اس مرض کے مریض ہیں۔

(۳)

اسی طرح دن بسر ہوتے تھے۔ اور بھوت کی عملداری میں کوئی سرش

جملہ حقوق محفوظ — **نیرنگِ خیال ۔ مئی ۱۹۲۱ء** — اشاعت ۵۲۵۰

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اسلئے ہمیشہ اسمیں اشتہار دو

جلد ۱۱ — نمبر ۸۳

چندہ سالانہ پانچ روپے
ممالک غیر سے ۸ شلنگ

فی پرچہ ۸ آنہ
نیلم یک سال پر ۸ آنہ

ایڈیٹر: حکیم محمد یوسف حسن

"ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا"

فہرست مضامین

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور سے شایع کیا

جملہ حقوق محفوظ | **نیرنگِ خیال۔ مئی ۱۹۲۱ء** | اشاعت ۵۲۵۰

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اسلئے ہمیشہ اسمیں اشتہار دو

جلد ۱۱ | نمبر ۸۳

چندہ سالانہ ؏ | فی پرچہ ۵؍
ممالک غیر سے ۸شلنگ | ٹیلر یک شال پرچہ ۶؍

ایڈیٹر: حکیم محمد یوسف حسن

" ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا "

فہرست مضامین

گرمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال شاہی محلہ سے شائع کیا

بزمِ نیرنگ

از اسسٹنٹ ایڈیٹر

فلم نمبر کی تیاری

آپ کے ہاتھ میں مئی کا پرچہ ہے۔ اس کے بعد جون کا نمبر شایع ہوگا۔ پھر جولائی کا پرچہ فلم نمبر کے نام سے شایع ہوگا۔ اس نمبر میں متحرک تصاویر کے متعلق نہایت بیش قیمت مضامین شایع ہوں گے اور تصاویر کی تعداد بھی قریباً پچاس ہوگی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ نمبر بالکل ولایتی رسایل کی طرز پر شایع کیا جائے۔

اس کے بعد اکتوبر میں ادبائے قدیم کے طرز نگارش کے عنوان سے ایک نہایت مفید نمبر شایع ہوگا۔ جو یقیناً پڑھنے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے کے قابل ہوگا +

مفرح اعظم کے متعلق

اکثر احباب مفرح اعظم کے متعلق استفسارات کرتے رہتے ہیں۔ اس دوا کی ایجاد کا فخر ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال کو حاصل ہے جو قریباً سترہ سال سے فروخت ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے فواید اس سے زیادہ نہیں جسقدر کہ ہم نیرنگ خیال کے ضمیمہ اشتہارات میں شایع کرتے رہتے ہیں۔ ایک عام استفسار کا جواب البتہ ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ موسم گرما میں بھی یہ دوا استعمال ہوسکتی ہے۔ بلکہ موسم سرما سے زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے۔ گذشتہ ماہ ہم نے مدیر زمیندار کی خدمت میں ایک شیشی تحفتاً بھیجی تھی۔ وہاں اس شیشی نے جو رنگ جمایا وہ ذیل کے ریویو سے ظاہر ہوتا ہے جو روزنامہ زمیندار ۲۶ اپریل میں شایع ہوا ہے

"حکیم یوسف حسن صاحب مہتمم دار التجارب نے مفرح اعظم کی ایک شیشی بغرض ریویو دفتر میں بھیجی تھی اور بتایا تھا کہ اسمیں یاقوت۔ زمرد۔ مروارید۔ مشک۔ عنبر۔ زعفران وغیرہ نہایت قیمتی ادویات شامل ہیں۔ اور ہم جیسے دماغی کام کرنے والوں کی شکایات کو مدنظر رکھ کر تیار کی گئی ہے۔ اسکی خوشبو۔ خوشرنگی اور ورق طلاو نقرہ کی چمک نے کاتب حضرات سے ارکان ادارۂ تحریر تک سب کو چکھنے کی دعوت دی۔ اگرچہ سب نے ڈرتے ڈرتے مقررہ مقدار سے کم کھائی لیکن ہر شخص کو اسکا فوری اثر محسوس ہوا۔ اور فرحت اور نشاط کی مجموعی کیفیت نے اُس دن کثرت کار کے بار کا احساس نہ ہونے دیا۔ اس کے بعد بعض اصحاب نے اسے کئی دن استعمال کیا۔ مفرح اعظم دماغی کام کرنے والوں کی عام نقاہت۔ خون کی کمی۔ اعضا رئیسہ دل و دماغ۔ معدہ اور گردوں کی کمزوری کے لئے بیحد مفید ہے اور اس سے دودھ گھی اور ثقیل غذائیں بہت جلد ہضم ہو جاتی ہیں۔ اس کی خوراک نہایت قلیل ہے۔ اور کھانے کے بعد گھنٹوں منہ میں خوشبو موجود رہتی ہے۔ چار تولہ کی شیشی کی قیمت تین روپیہ ہے۔ ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے۔" زمیندار"

مہتمم دار التجارب وتہاری یونانی دوا خانہ۔ شاہی محلہ لاہور

زیر نظر نمبر

کے مضامین بیحد دلچسپ ہیں۔ اسمیں جناب میر ولی اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی کا مضمون "مولوی صاحب کا گھوڑا" اور مرزا اعظم بیگ صاحب چغتائی کا اصلاحی افسانہ "آپکا گھر" بھی شامل ہیں۔ اردو منظوم راماین کے بعض مناظر ہیں جو حضرت نفیس خلیلی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ آئندہ نمبر میں آپ کی تین جدید تصنیفات پر روشنی ڈالی جائیگی۔ تصاویر میں ایک مشہور راجپوت دیوی کی ہے۔ جس نے اکبر اعظم کے محل میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے متحدہ ہندوستان کے خواب کی سچی تعبیر پیش کی تھی۔ دوسری تصویر عید کی نسبت سے حرم کعبہ کی ہے جسکی طرف تیس کروڑ مسلمانانِ عالم کی جبینِ عقیدت جھک جاتی ہے۔ ایک تصویر اسلامی مجاہد کی ہے جو ایک لبستی کے باہر فتحمندانہ حیثیت سے کھڑا ہے۔ آئندہ نمبر کی تصاویر بھی بے حد دلچسپ ہیں۔ اور فلم نمبر کی تو اسقدر زیادہ کہ اُسے تصویر نمبر کہنا پڑیگا +

اعتذار

عید نمبر نیرنگ خیال میں ایک نظم رمضان کا چاند درج ہوئی ہے۔ اُس کے نیچے "رازق الخیری" غلطی سے درج ہوگیا ہے۔ یہ نظم حضرت مولانا محمد علی مرحوم کی ہے +

اسسٹنٹ ایڈیٹر

مولوی صاحب کا گھوڑا

از حضرت ادیب اسے آبادی

مولوی صاحب گھوڑے پر سوار ہیں۔ کیونکہ گھوڑی پر سوار ہونا آپ صنفِ نازک کی توہین خیال فرماتے ہیں۔ اور بائسکل پر چڑھنا بدعت۔ یہی وجہ ہے کہ از آدم تا ایں دم کہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۱ء کی شام کے ساڑھے پانچ بج چکے ہیں۔ مولوی قسم کا کوئی انسان بائسکل پر سوار نہیں دیکھا گیا۔ اور خداوند کریم اسلام کی کمزوری کے وہ دن نہ دکھائے کہ مولوی صاحبان بائسکلوں پر اڑتے پھرتے نظر آئیں +

مدرسے جاتے ہیں۔ سکول ماسٹر ہیں۔ اس لئے مدرسے جاتے ہیں۔ اکثر امام مسجد ہوتے تو مسجد میں تشریف لے جاتے۔ جہاں سے تنخواہ نہ ملے وہاں جانا شرعاً ممنوع ہے۔ یا کم از کم فعلِ عبث۔ کیا فرماتے ہیں عالمانِ دینِ متین و حامیانِ شرعِ مبین بیچ بارے اس مسئلے کے؟ اما بعد ہماری پہلی جماعت کے استاد پنڈت اجودھیا داس صاحب ایں جانی جو ہند و فضلائے وقت میں سے چوٹی کے آدمی ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے استاد سے اور انہوں نے اپنے استاد سے جو مولوی صاحب کے ہمعصر تھے۔ سُنا تھا کہ مولوی صاحب مدرسے صرف اس لئے جاتے تھے کہ ہو لوائن صاحب جو قدرے تلخ مزاج واقع ہوئی تھیں۔ انہیں گھر میں آرام سے بیٹھنے نہیں دیا کرتی تھیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دو تین شاگرد ساتھ ہیں۔ مصنف کے حافظے نے یہاں مصنف کا ساتھ نہیں دیا۔ اسے ٹھیک یاد نہیں کہ دو شاگرد تھے یا تین۔ اس لئے دو تین شاگرد کہہ دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دو شاگرد پورے ہوں اور تیسرا آدھا یا پونا۔ شاعروں کی طرح اڑھائی یا پونے تین شاگردوں کا ہونا تاریخ کی رو سے جائز ہے۔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں کسی شخص نے میر تقی سے پوچھا کہ کیوں صاحب آجکل شاعر کون کون ہے۔ کہا ایک تو سودا، دوسرا یہ خاکسار ہے۔ اور کچھ تامل کر کے کہا کہ آدھے خواجہ میر درد۔ وہ بولا حضرت اور میر سوز صاحب؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ اس نے کہا کہ آخر نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہیں۔ کہا کہ خیر! یہ ہے تو پونے تین سہی +

ایک ہاتھ میں کتاب ہے۔ جس کے پہلے درمیانی اور آخری اوراق غائب ہیں۔ جلد ندارد ہے۔ گو آثار باقی ہیں +

ایک کی بغل میں جزدان ہے۔ جس کے مشمولات کی فہرست یہ ہے۔ چند پھٹی پرانی کتابیں۔ جن کا اس طالب علم کے کورس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دوات جس میں گذشتہ دو ماہ سے کبھی سیاہی نہیں ڈالی گئی۔ نصف درجن قلم جو لکھ نہیں سکتے۔ ایک درجن کانچ کی گولیاں۔ ایک کاپی جو تمام لکھی ہوئی ہے۔ مگر پڑھی نہیں جا سکتی۔ اور دیگر متفرق ضروریات +

ایک برابر آ کر کچھ پوچھ رہا ہے۔ پڑھنے اور پوچھنے کے لئے گھر میں اور سکول میں کافی وقت مل سکتا ہے۔ مگر یہ برخوردار رستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہے۔ تاکہ مولوی صاحب کو یقین ہو جائے کہ لڑکا بڑا محنتی ہے۔ اُستادوں کو اس طرح بے وقوف بنانے میں لڑکوں کو ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے +

مولوی صاحب نے گھوڑا روک لیا ہے۔ اُسے بتا رہے ہیں اور خود بیوقوف بن رہے ہیں۔ اتنی تمیز نہیں کہ اُسے کہہ دیں کہ مدرسے جا کر پوچھ لینا۔ رستے میں کھڑے ہو کر پڑھنا پڑھانا آدابِ راہ (یعنی رولز آف دی روڈ) کے خلاف ہے۔ ممکن ہے کہ مولوی صاحب سب کچھ سمجھتے ہوں لیکن جس طرح لڑکے انہیں فول بنا رہے ہیں وہ شہر والوں کو فول بنا رہے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں کہ مولوی صاحب اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے ہر وقت بچوں کی تعلیم کی فکر میں رہتے ہیں +

دوسرا پیچھے کھڑا ہے کہ یہ ہٹے تو پھر میں پوچھوں۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ مصنف طفلانہ سائیکالوجی سے بالکل ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑکا جو پیچھے کھڑا ہے وہی آدھا یا پونا شاگرد ہے۔ اس کے ارادے بڑے نیک ہیں۔ اس سوچ میں ہے کہ موقع ملے تو گھوڑے کو پیچھے سے ذرا چھیڑ دوں۔ تاکہ مولوی صاحب قبلہ دھم سے نیچے آ رہیں۔ اگر یہ برخوردار اپنی نیت کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جائے۔ تو طرفہ تماشا ہو۔ اور اگر مولوی صاحب گر کر دو چار روز کے لئے

صاحب فراش ہو جائیں تو سکول کے لڑکے اس برخوردار کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر شہر میں اس کا پروسیشن نکالیں اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائیں۔

ایک نے سامنے سے آکر سلام کیا ہے ۔ یہ سلام سلام روستائی ہے۔ اسقدر جھک کر سلام کیا ہے کہ مولوی صاحب کو اس کی محنت اور ذہانت کا پورا پورا یقین ہو گیا ہے۔ اب اگر یہ لڑکا سبق یاد کرنے کی زحمت اٹھائے تو اس کا اپنا قصور ہے۔ مگر ایسا قصور لڑکوں سے شاذونادر ہی سرزد ہوتا ہے۔ سند کی ضرورت ہو تو ناظرین اپنے عہد طفلی پر ذرا نظر ڈال لیں +

یہ لڑکے بڑے شوقین ہیں ۔ بڑے ہونگے تو شوقین مزاج بنیں گے۔ باپ دادا کا نام روشن کریں گے +

مولوی صاحب کے گھر جا کر بھی پڑھتے ہیں ۔ مولوی صاحب کو اگر لڑکوں کے بغیر گھر میں بھی چین نہ آئے تو یہ بیچارے کیا کریں۔ شوق سے تھوڑا ہی جاتے ہیں۔ مولوی صاحب چاہتے ہیں کہ "جنگ زناں وگریۂ طفلاں" کے شور وغل سے بچے رہیں۔ ان لڑکوں کا شور وغل اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں فردوس گوش ہے +

راستے میں بھی پوچھتے جاتے ہیں ۔ شاید اس لئے کہ سکول میں بالکل کورے نہ جائیں +

مولوی صاحب بھی دل سے چاہتے ہیں کہ ان کو کچھ آجائے ۔ کیوں نہ آجائے گا۔ ادنیٰ جماعت میں چار سال رہیں گے تو ساری ابجد یاد ہو جائے گی +

کبھی پڑھانے اور سمجھانے میں دریغ نہیں کرتے ۔ پڑھانے اور سمجھانے میں دریغ کریں تو سکول سے نکالے جائیں اور چوبیس گھنٹے گھر میں رہنا پڑے۔ یہ دن رات کا قید خانہ ان کے لئے ایسا ہی ہوگا جیسا لڑکوں کے لئے سکول +

گھر ہو یا باہر ہو ۔ مولوی صاحب کے لئے دونوں برابر ہیں۔ بلکہ گھر سے باہر اچھا +

مدرسے کا بھی خیال ہے کہ وقت پر پہنچ جائیں ۔ تاکہ لڑکے ان کی غیر حاضری میں سکول کو آگ نہ لگا دیں +

وہاں بہت سے شاگرد بیٹھے راہ دیکھ رہے ہونگے ۔ کہ کب بلا نازل ہوتی ہے +

مولوی صاحب بڑے لئیق اور محنتی ہیں ۔ لئیق بھی ہیں اور شفیق بھی۔ گذشتہ تیس سال سے اردو کا قاعدہ پڑھا رہے ہیں۔ اور آج تک ایسی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی کہ مولوی صاحب نے سبق میں کوئی غلطی کی ہو +

ہمیشہ ان کی جماعت کے لڑکے امتحان میں پاس ہوتے ہیں ۔ کیونکہ پالا ؤ خوردہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر عموماً بڑے ہمدرد ہوتے ہیں۔ لوگ کچھ کہیں مگر ان بیچاروں کو ہندوستانی بچوں کے مستقبل کا ہمیشہ خیال رہتا ہے +

ننھو میاں لڑکو۔ علم بڑی دولت ہے ۔ دنیا کی دولت کو جو جھوٹی دولت کہلاتی ہے۔ پاس بھٹکنے نہیں دیتی۔ بھوکے رہو نگے رہو مگر یہ دولت جمع کرتے جاؤ۔ پچھلوں کے کام آئیگی +

جہاں تک ہو سکے حاصل کئے جاؤ ۔ اور فقر و فاقہ کی پرواہ نہ کرو +

اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے گھر ہو یا مدرسہ ہو وقت کو ضائع نہ ہونے دو ۔ یعنے کتابوں کے کیڑے بن جاؤ۔ رزاق خدا ہے +

پڑھنے لکھنے کی یہی عمر ہے ۔ پھر شادی ہو جائے گی +

پھر ایسی بے فکری کہاں ۔ **بڑے ہو کر دنیا کے دھندوں میں پھنس جاؤ گے** ۔ اور پھر عمر بھر رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔ دن رات غالب کا شعر پڑھتے رہو گے +

قید حیات وبند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس وقت نہ پڑھا تو عمر بھر پچھتاؤ گے ۔ اور اگر جورو بی۔ اے پاس مل گئی۔ تو پشیمانی کے علاوہ ندامت بھی ہوگی +

ع بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(خاص)

ادیب الہ آبادی

"پاسِ عُرف"

"لاتنابزوبالالقاب"

از جناب سیّد مقبول حسین صاحب بی۔ اے۔ احمد پوری

ہر ملک کے آدمیوں کی بول چال اور انداز گفتگو کا ایک خاص معیار ہوتا ہے جس سے اُن کی سوشل حیثیت کا اندازہ کیا جا سکے۔ زبان اور طرز بیان میں معاشرتی اختلافات کا اندازہ ہندوستان ہی کے مختلف حصّوں سے کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب والوں کی گفتگو اور اُن کے برتاؤ میں بے تکلفی کی حد نہیں، بنگالیوں کی چال ڈھال ہی نرالی ہے۔ پہلے تو وہ خشک مزاج اور بے مروّت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر رسم تعارف ہوجانے کے بعد اتنی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ عیاذاً باللہ۔ بنگال اور پنجاب کے درمیان خطۂ اودھ کے لوگ اس اعتبار سے بالکل متوسّط ہیں۔ نہ تو وہ زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ نہ انکی بات چیت میں اچانک بے تکلّفی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ان کے برتاؤ میں تکلّف کی کچھ انتہا ہی نہیں رہتی۔ اودھ کا مرکز لکھنؤ اس اعتبار سے مشہور بھی ہے، لکھنؤ کے "تکلف" پر لوگوں نے عجیب عجیب لطیفے بنائے اور خود لکھنؤ کے نام کو "اظہار تکلف" کا زبان زدِ عام تکیہ کلام بنالیا۔ اس میں شک نہیں لکھنؤ کے اصل باشندے اب بھی اپنی گفتگو میں "پاسِ عرف" کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ خواہ وہ اعلیٰ طبقہ سے ہوں خواہ عوام میں سے[1]۔ آجکل پرانے لکھنؤ کی حالت بالکل ایک اُجڑے نگر کی سی ہے۔ نئے لکھنؤ کو بنگالیوں اور عیسائیوں نے خراب کر رکھا ہے۔ مگر اب بھی پُرانی روش کا بہت کچھ اثر باقی ہے خاص کر شرفائے کایستھ اور اہل تشیع میں، یہ بات البتہ قابلِ افسوس ہے کہ اب صرف تکلف ہی تکلف رہ گیا ہے۔ قدیم اخلاص و محبت کا اثر دن بدن زائل ہوتا جاتا ہے +

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی معاشرتی حیثیت عموماً لکھنؤ اور دلّی ہی سے ظاہر ہوئی۔ "تکلّف" اور "بے تکلّفی" کے اعتبار سے دیکھئے تو اردو زبان کی ٹکسالی اہمیت انہیں دو بڑے شہروں میں پائی جائے گی۔ لکھنؤ میں "تکلّف" کی انتہا نہیں "دلّی" میں بے تکلّفی بہت زیادہ ہے۔ لیکن چونکہ بے تکلّفی دنیا کی ہر زبان میں ہوتی ہے اس لئے ہم کو صرف "تکلّف" اور "تادیب گفتگو" پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جہانتک لفظِ "ادب" کے معنی کا تعلّق ہے۔ "تادیب و تکلّف" کا خیال کئے بغیر لفظ کا اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ ادب یا لٹریچر میں اس مفہوم کی وہی حیثیت ہے جو "علم" میں "عقل" کی اور لفظِ "ادب" کے اس مفہوم کی بنا پر صحیح معنیٰ میں "ادیب" وہی شخص ہوسکتا ہے جو الفاظ کی ساخت، اُن کی آواز، آواز کی ترتیب، ان کے موقع و محل کی مناسبت اور اس مناسبت کی خصوصیت پر بھی غور و خوض کرے۔ "لٹریچر" کی تعریف کرتے ہوئے جان رسکن نے لکھا ہے کہ:۔

"میں آپ سے نہایت یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپکو الفاظ پر بہت زیادہ غور و خوض کرنے کی عادت ڈالنا اور ان کے معانی پر پوری پوری آگاہی حاصل کرنا چاہیئے۔ لفظ کے جزو جزو ہی پر نہیں بلکہ حرف حرف پر غور کیجئے کیونکہ صرف نشان کا ذریعہ ہونے والی حروف کی ترتیب اور نشان کا ذریعہ ہونے والی حروف

[1] بطور تمثیل یہاں لکھنؤ کے ایک سبزی فروش کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جو امین آباد پارک کے چاروں طرف اسطرح اکثر چلاتا ہوا نظر آتا ہے کہ:۔ "کیوں جناب دو پیسہ سیر آلو لیجئے گا" "کیوں جناب پیسہ میں دو نارنگیاں لیجئے گا" + اس سبزی فروش کا مقابلہ ایک پنجابی حلوہ فروش سے کرنا اور بھی دلچسپ ہوگا جو ہر صبح یہ چلاتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ:۔ "آگیا پنجا بڑا۔ حلوے کا میرا بچّا" ان مثالوں کے اظہار میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں اور ان سے یہ بات مسلّمہ طور پر ثابت ہوتی ہے کہ باوجود موجودہ عہد بے مروّتی کے لکھنؤ کے بول بڑے سہانے ہیں +

کی آواز ہی کو بہ اعتبار علم مطالعہ لٹریچر کہا گیا ہے ۔ ۔ ۔ لیکن
" برٹش میوزیم" کی تمام کتابیں پڑھ لینے کے باوجود آپ
[illegible] ہی کہلائیں گے جب تک آپ حرف
بحرف الفاظ کی ساخت اور ان کی ترتیب پر غور نہ کریں "+

اور علم مطالعہ کی اس ضرورت کو مدنظر رکھ کر اردو زبان کی چھان بین کرنا اگر اب نہیں تو کبھی آئندہ ضرور مفید ثابت ہوگی ۔ آئندہ اس وجہ سے کہ فی الحال ان باتوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جاتی +

غرض ہم نہایت یقین کے ساتھ ایک نئی تحقیق کی صورت میں "ہندوستانی زبان" یعنی اردو زبان" کی اُس امتیازی خصوصیت کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جسکو شاید دنیا کی کسی دوسری زبان میں اس نمایاں حیثیت کے ساتھ دخل نہیں وہ نمایاں خصوصیت "پاس عرف" ہے

زبان میں" پاس عرف" سے ہمارا مطلب گفتگو میں "حفظ مراتب" کا خیال رکھنا ہے ۔ ابھی تک اردو قواعد میں بھی اس خصوصیت کو نمایاں طور پر کسی خاص بیان میں واضح نہیں کیا گیا ۔ اگرچہ "یائے تعظیمی" اور یائے تصغیری" وغیرہ کے ذریعہ سے اس مفہوم تک کچھ کچھ پہنچ ہوگئی ہے +

یہ بات اور بھی زیادہ قابل غور ہے کہ زبان میں" پاس عرف" کا مقابلہ" تذکیر و تانیث" کی امتیازی علامتوں سے کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس قسم کا امتیاز انگریزی زبان میں بھی ہے اور عربی میں بھی ۔ گو فارسی میں نہیں ۔ لیکن گفتگو میں مخاطب کی وجاہت اُس کی رفعت اور اُس کے مرتبہ و اقتدار کا لحاظ دوسری زبانوں میں اس خصوصیت کے ساتھ نہیں رکھا جاتا نہ اس قدر انکسار و تکلف برتا جاتا ہے جو اردو زبان اور خصوصاً اہل لکھنؤ کی زبان میں ہے ۔ اگر کسی اہل لکھنوی کو غصہ بھی آئے گا تو بجائے سخت سست کہنے کے اُس کی زبان زیادہ سے زیادہ یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ :-

"جناب والا اپنی زبان مبارک کو زیادہ تکلیف نہ دیجئے ورنہ
مجھے بھی آپ کی شان میں گستاخی سرزد ہو جانیکا اندیشہ ہے"+

اسی عبارت کو عام لوگ اس طرح ادا کریں گے :-

"بس اب نہ بولنا نہیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں"

اور زیادہ اکھڑ قسم کے لوگ تو" تیری ایسی تیسی" کہتے ہوئے جھٹ دست بگریباں ہو جانے پر تیار ہو جائیں گے ۔ چاہے فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح ان کی تمام شیخی اور اکڑ فوں صرف ۔" لانا تو میری قرولی" ۔ تک کیوں نہ محدود رہے ۔

دلّی اور لکھنؤ بہ اعتبار نظم و نثر اردو زبان کے دو شاندار مرکز رہے ہیں اور عرصہ تک ان دونوں شہروں کی اردو ٹکسالی مانی گئی ہے اگر نثر کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ میر امّن سے لے کر مولانا نذیر احمد اور مرزا فرحت اللہ بیگ تک دلّی کی وہی شان ہے ۔ زبان میں بے تکلفی بے تکلفی کے ساتھ سلاست اور روانی اور روانی میں ایک قسم کا بھولا پن اور پیار اب تک پایا جاتا ہے میر امّن اپنے باغ و بہار میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

" اے یاران ! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن
ہے ۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا
اس وقت میں کوئی مہاجن بیپاری انکے برابر نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ان کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے ایک تو یہی فقیر جو کفنی
سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر ہے ۔ دوسری
ایک بہن جس کی قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی ایک شہر کے سوداگر
بچے سے شادی کر دی تھی "+

اس عبارت میں" پاس عرف" کا لحاظ گفتگو کرنے والے نے اپنے مخاطب کے "حفظ مراتب" کو مد نظر رکھ کر اپنے آپ کو" عاجز" اور" حقیر" کہہ کر قایم رکھا ہے ۔ اور یہ انکسار اردو زبان میں اب تک قایم ہے ۔ جس کا اظہار خطوط میں بہت زیادہ کیا جاتا ہے ۔ اب ذرا عورتوں کی زبان ملاحظہ ہو ۔ اسی کتاب میں لکھا ہے :-

" اے بیرن ! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی
مٹی کی نشانی ہے ۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا ۔ جب
تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں ۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن
مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے ۔ گھر میں بیٹھے رہنا
ان کو لازم نہیں "+

اس عبارت سے زبان دہلی کا بھولا پن اور پیار بخوبی ظاہر ہے ۔ یہ قدیم دلّی کی نثر ہے ۔ مولانا نذیر احمد نے اس کو اور بھی آراستہ کیا ۔ اور اب خواجہ حسن نظامی مرزا فرحت اللہ بیگ نے مردوں کی زبان میں اور آغا حیدر حسین نے نسوانی زبان لکھنے میں جو کمال حاصل کیا ہے اُس کی مثالیں پیش کرنا کچھ غیر ضروری سا ہے ۔ کیونکہ متعدد رسالوں میں ان حضرات کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں + دلّی کی نثر کے بعد لکھنؤ کی نثر کو بھی" پاس عرف" کے اعتبار سے دیکھنا چاہیئے

چاہیئے۔ لکھنؤ کے قدیم فسانہ نویس[1] مرزا رجب علی سرور تھے۔ اگرچہ انہوں نے مقفیٰ عبارت لکھی ہے۔ تاہم اِن کی عبارت سے تکلف اور آرائش کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ اور تکلّف و آرائش ہی لکھنؤ کی زبان کا حصّہ ہے۔ لیکن رجب علی سرور سے بھی بڑھ کر رتن ناتھ سرشار نے "پاس عرف" اور لکھنؤ کی زندہ دلی کو اپنی نثر میں برتا ہے۔ ایک جگہ فسانہ آزاد میں لکھتے ہیں:-

"یہ لیجئے! آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل۔ اہو ہو ہو! خدا کی قدرت مجسّم نظر آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں سے جو طرارہ بھرا تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پیر فرتوت دقیانوس کے ہم عصر بیٹھے اگلے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واللہ لکھنؤ کے کمہار بڑے نادرہ کار ہیں۔ ایسا بڈھا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے پوپلے منہ سے اب بولا۔ وہی سن کے سے بال وہی سفید بھویں! وہی چتون وہی پیشانی کی شکن وہی ہاتھوں کی جھرّیاں وہی کمر خم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واہ رے کاریگر! تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے! اور تیرا بوڑھا تو اللہ ہی اللہ"+

آجکل اگر لکھنؤ کی نثر میں آن، آتش، زندہ دلی، ظرافت اور "حیثیت عرفی" قایم ہے تو صرف "آوارہ و مجنونے رسوا سر بازارے" کی نثر میں یا نگار و مبصر کی "مولویانہ" اور "شاعرانہ" پرخاش[2] میں "پاس عرف" تو نثر۔ اور شبلی کے بعد کسی کی نثر میں واضح طور پر ظاہر نہیں۔ "الناظر" نے البتہ اس قدیم وضع کو قایم رکھنے میں بہت کوشش کی مگر ایڈیٹر کی لٹریری خدمات کے بجائے اگر قومی خدمات پر لکھنؤ کو فخر ہو تو بے جا نہیں +

دلی اور لکھنؤ کی نثر میں "پاس عرف" کا معیار مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہو گیا ہوگا۔ لہٰذا بہ اعتبار نثر اس کی دو نمایاں صورتیں ہیں :- ایک دلی کی نثر جس میں کلام کرنے والا مخاطب کے سامنے اپنے آپ کو "عاجز" "کمتر" اور "ناچیز" ظاہر کر کے اپنی انکساری کے ذریعہ سے اس کی وقعت اور وجاہت کا لحاظ رکھتا ہے۔ دوسرے لکھنؤ کی نثر جس میں کلام کرنے والا مخاطب کو "جناب"، "آپ" وغیرہ کہہ کر اس کی وجاہت کو بڑھا دیتا ہے۔ دلی کا طریقہ تو اب پرانا[3] سمجھا جانے لگا۔ لیکن لکھنؤ کا طریقہ تحریر و تقریر میں اب بھی مستعمل ہے۔ اور بعض اوقات انتہائی تکلف کی وجہ سے غیر جگہ کے لوگوں کو یہاں کے انداز گفتگو سے "طنز" اور "تمسخر" کا بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ مگر در اصل اس قسم کی غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے +

نثر کے علاوہ نظم میں بھی "پاس عرف" کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔ مگر شعر و شاعری میں اس انداز کو نمایاں طور پر دخل نہیں۔ شعرائے لکھنؤ میں بھی سوائے انیس کے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو بطور مثال پیش کیا جا سکے۔ غزل سے قطع نظر کر کے مثنوی میں اس امتیازی حیثیت کی امید کی جا سکتی تھی۔ مگر کوئی نمایاں مثال نظر نہیں آتی۔ اور اردو کیا دنیا کی کسی زبان میں ایسی نظم نہیں جو "پاس عرف" کا دعویٰ کر سکے۔ مگر زمانہ حال میں لکھنؤ نے ایک شاعر ایسا پیدا کیا ہے جس کو ہم باوجود اس کی "شاعرانہ پرخاش" کے "تکلفی شاعر" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی "تکلفات" اور "پاس عرف" کی بنا پر اس کو صاحب اسٹائل ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ نوخیز شاعر اردو زبان، اور اردو زبان میں لکھنؤ کا پہلا شاعر ہے۔ جس نے اپنی زبان کی مخصوص وضع کو بغیر یہ جانے بوجھے ہوئے کہ "میں ایک خاص اسٹائل رکھتا ہوں" اہل زبان کے سامنے ظاہر کر دیا۔ ہم آشفتہ[4] کی شاعری میں "پاس عرف" کو امتیازی طور پر نمایاں پاتے ہیں۔ غالب کے کلام میں جدّت اور رعنائی تھی۔ میر میں درد اور کیفیت حرمان، مومن میں طنز اور مظلومانہ ضد، اکبر میں ہجو ملیح یا (Parody) اگر اسی تنقیدی معیار سے آشفتہ کی غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو باوجود اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ ابھی ان کو اس شہرت کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں جو متذکرہ بالا اساتذہ کو حاصل ہے۔ یہ کہنا پڑیگا کہ ان کی غزل میں ایک دلچسپ اور عام پسند انداز ضرور ہے۔ اس لئے شہرت کی کمی پر ایک واقعی بات کو نظر انداز کرنا اپنی زبان اور لٹریچر سے بے اعتنائی برتنا ہوگی +

"پاس عرف" کو اردو شاعری میں شامل کرنے کا مشورہ دینا ہی لٹریچر میں ایک نئی تحقیق ہوگی۔ چہ جائیکہ اس کی ایک زندہ مثال کو پیش کر دینا۔ لہٰذا اس مثال سے ہمارا مطلب نہ تو کسی کی بے جا تعریف ہے نہ کسی کو "اچھالنا" مقصود ہے بلکہ پاس عرف کی امتیازی نشو و نما اور اس کی ترتیب و اصلاح کی سفارش کرتے ہوئے مشق سخن کرنے والوں کو ایک نئی شاہراہ کا مشورہ دینا ہے۔ المختصر بہ اعتبار شعر و شاعری "پاس عرف" سے ہمارا مطلب اس خاص

---

[1] لکھنؤ کی نثر کے سلسلے میں طلسم ہوشربا کو یاد دلانا نامناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب کی زبان خوب ہے۔ [2] اس سلسلہ میں "جان صاحب" کی نسوانی زبان کی یاد دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ [3] ملاحظہ ہو ہمایوں ایڈیٹوریل (جنوری ۱۹۳۱ء) [4] سب سے پہلے مرزا غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ سے اس طریقہ کو نظر انداز کرنا شروع کیا + [5] حکیم سید علی آشفتہ (ایڈیٹر مبصر لکھنؤ)

انداز بیان ایسا ہے جو مخاطب کے "حفظ مراتب" اور خطاب کرنے والے کا انکسار ظاہر کرے اور جو تمدن و تہذیب یعنی آداب معاشرت کا عکس ہو اور الفاظ سے ایسا "تکلف" ظاہر ہوتا ہو جس کو ہم لازمۂ سوسائٹی کہہ سکیں مثلاً آشفتہ کا یہ شعر ؎

دیکھئے اٹھلا کے یوں چلئے نہ اب خنجر بکف
زخم دل پھٹتے ہیں پھر آتی ہے انگڑائی مجھے

اس شعر میں الفاظ "دیکھئے" اور "چلئے" سے ہمارا امتیازی مفہوم ظاہر ہے اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا شاعر کے کلام میں ایک قسم کی "شاعرانہ پرخاش" ہے لیکن اس پرخاش کے باوجود "پاس عرف" جو لازمۂ سوسائٹی ہے ضرور قایم رہتا ہے۔ مثلاً ؎

اک تمنا ہے تلافیٔ ستم لازم نہیں
ہو سکے تو جوڑ کر دیدیجئے گا دل مجھے

یہ ظاہر ہے کہ "شاعرانہ پرخاش" طنز کا ہونا بہت ضروری ہے لیکن باوجود طنز کے "پاس عرف کو قایم رکھنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ مثلاً ؎

تربتیں روندی ہیں، گل مسلے ہیں، پھونکے ہیں چراغ
آج تو حد نہیں کچھ آپ کے احسانوں کی

الفاظ "آپ کے احسانوں" میں طنز بھی ہے۔ پوشیدہ جلن بھی ہے، دلی پرخاش بھی اور بظاہر پاس عرف بھی۔ اسیطرح ذیل کے شعر یعنی ؎

حاضر ہے دل کہ خون تمنا کرے کوئی
یہ گھر اسی لئے ہے کہ لوٹا کرے کوئی

یاس و حرمان میں طنز کی آمیزش کے باوجود لفظ "حاضر" نے شاعر کے خاص انداز کو اس شعر میں قایم رکھا ہے۔ اور ذیل کے شعر میں تو ایک پرانا فرسودہ خیال "پاس عرف" کی آرائش کے ساتھ کیا ہی دلچسپ طریقہ سے ظاہر کیا گیا ہے ؎

ولولے دونوں کو ہیں اور دونوں عالم بے نظیر
امتحاں ہم دل کا لے لیں آپ اپنے تیر کا

قدیم اردو شاعری میں سوا یاس و حرمان کے امید کو بہت کم دخل ہے۔ اگر ہے بھی تو صرف اس صورت میں جو ذیل کے شعر میں ظاہر کی گئی۔ لیکن شاعر کی وضع قایم ہے۔ مثلاً ؎

جھلک سی کچھ نظر آتی ہے آپ کے در کی
تو راس آگئیں کیا گردشیں مقدر کی

قدیم اردو شاعری میں اگر حسن طلب کو کچھ دخل ہوگا تو صرف عشق و عاشقی کے رنگ میں حسن طلب کو مدنظر رکھ کر شاعر کہتا ہے ؎

آؤ عنوان تلافی بھی بتا دیں تم کو
لو یہ دل جوڑ دو توڑے ہوئے پیمانوں سے

ضمیر "تم" سے مطلب قدرے بے تکلفی کا اظہار ہے نہ کہ "پاس عرف" کی کمی۔ اور بے تکلفی میں "آپ" کہنا دلیل معاشرت ہے۔ اس لئے شعر میں "تم" ہی زیادہ موزوں ہے۔ اردو غزل میں جہاں سب دلچسپیاں ہیں ایک موسیقی بحر بھی ہے۔ چنانچہ ذیل کے دو شعروں میں "ترنم بحر" کے باوجود شاعر نے اپنا انداز نہایت خوبی کے ساتھ قایم رکھا ہے۔ مثلاً ؎

کریں کریں قتل آپ مجھ کو یہ راز کیوں آشکار ہوگا
نہ کوئی بالیں پرست اب ہے نہ جب کوئی سوگوار ہوگا
میں کلبۂ غم میں منہ چھپا کر گذار دوں گا یہ عمر ساری
نفس نفس میری زندگی کا حضور کا پردہ دار ہوگا

خطاب حضور میں "پاس عرف" ہی نہیں بلکہ کچھ اپنی علو ہمتی پر بھی اشارہ ہے البتہ ذیل کے شعر میں "حضور" کا مفہوم بالکل مختلف ہے کیونکہ شاعر "پاس عرف" کو قایم رکھتے ہوئے مخاطب کو کچھ "جتا دینا" بھی چاہتا ہے مثلاً ؎

اک خواب میں نے دیکھا ہے تعبیر دیجئے
جیسے حضور آئے ہیں خنجر لئے ہوئے

اور یہ شعر آشفتہ کے اسٹائل کی نہایت زود فہم اور نمایاں مثال ہے۔ اس لئے اس کے بعد اور زیادہ مثالیں لکھنا طول کلام ہوگا ✦

آخر میں یہ ضرور لکھنا چاہیئے کہ "پاس عرف" کو چونکہ اردو نثر و نظم دونوں میں دخل ہے۔ اس لئے اس امتیازی خصوصیت کے ذریعہ سے زبان کی وقعت قایم رکھنا اور اس کو اشاعت دینا ملک و قوم کی عزت و حرمت کو اصلاح کے ساتھ نمایاں کرنا ہی نہیں بلکہ دنیا کی زبانوں کے سامنے اپنی زبان کو ایک نرالی صورت میں پیش کرنا بھی ہوگا ✦

(خاص) سیّد مقبول حسین

ؔ؎ بہ اعتبار عروض اس مصرعہ میں ایک قسم کا ایہام ہے۔ کیونکہ اس مصرع کی تقطیع دو بحروں میں ہوسکتی ہے ✦

آلو کا بھرتہ

از جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

غریب گھر کی لڑکی میں سسرال میں آئی تو عجیب ہی ڈھنگ دیکھے۔ میاں کو رنڈی بازی سے ہی فرصت نہ تھی۔ ساس اور سسر کو خیال ہی نہ تھا کہ ہم جس کو بیاہ کر لائے ہیں کچھ اس کا بھی حق ہے۔ مہینہ دو مہینہ کی مہمانداری کے بعد پھر خدمت گذاری کا زمانہ آیا اور پھر اس کے بعد ذلت کا۔ بڑے مکان سے چھوٹا سا ملا ہوا مکان تھا جس میں اکیلے پڑے رہنا اور گھُل گھُل کر مرنا میری تقدیر میں بدا معلوم ہوتا تھا۔ میاں کو گھر میں آنے کی قسم تھی۔ دن رات باہر ہی رہتے۔ ان کے ملازم علیحدہ تھے اور ان کا گھر بار ہی سوائے کھانے کے علیحدہ تھا۔ باپ پچاس روپیہ مہینہ دیتے تھے لیکن ماں کا یہ حال تھا کہ پانچ پانچ ہزار کی ڈگریاں چپکے سے چکاتی تھیں اور دو دو سو روپیہ ماہوار رنڈیاں لے جاتی تھیں۔ میری قسمت میں نہ ساس سے لکھا تھا اور نہ میاں سے۔ گھر میں کبھی آئے بھی تو تیزی سے نکلے چلے گئے۔ ہوتے ہوتے یہ حال ہوا کہ ایک مرتبہ پورے سات مہینے گذر گئے کہ صورت ہی دیکھنے میں نہ آئی اور پھر مصیبت پہ مصیبت یہ کہ دروازہ سے چار قدم ہی پہ باہر بیٹھے رنڈیوں سے ہنسی مذاق ہوتا رہتا۔ ان کا بندھا ہوا کھانا گھر میں سے آجاتا اگر زیادہ منظور ہوتا تو اپنے باورچی سے پکواتے۔ پان یا دوسری چیز کی ضرورت ہوتی تو وہاں سے منگواتے۔ ورنہ پاندان بھی باہر موجود تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اکیلی گھر میں پڑی کڑیاں گنا کرتی۔

سنا تھا کہ کسی رنڈی کو لے کر کہیں باہر گئے ہیں۔ دو تین روز ہو چکے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ رات کے بارہ یا ایک بجے ہونگے میں غافل پڑی سو رہی تھی۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "ذرا اٹھو تو" میں چونک کر اٹھ بیٹھی اور مارے خوشی کے میرا کلیجہ دھک دھک ہونے لگا۔ گھبرا کر میں نے کہا "کہو"

"اماں جان کے یہاں سے کچھ کھانے کو ہو تو ذرا جا کر لا دو"۔ سر کھجا کر کہا "دو تین آدمیوں کے لئے لانا اور ایسے جانا کہ کسی کو معلوم نہ ہو"۔

کیا بتاؤں میری خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ زہے قسمت کہ مجھ سے کوئی کام تو لیا۔ دبے پاؤں میں بڑے گھر میں گئی اور جا کر باورچی خانہ اور نعمت خانہ سب ٹٹول مارا۔ سوائے ایک سوکھی روٹی کے کچھ نہ تھا۔ اسی طرح چپکے سے لوٹ کر آئی اور احوال سنایا۔ میں بھیگی بلی کی طرح ڈر کے مارے چپ کھڑی ہوئی تھی کہ اتنے میں بولے "پھر کیا ہو باہر بھی کوئی نہیں ہے"۔

میں نے دبی زبان سے کہا "میں ابھی پکا دوں"

"مگر میں نہیں چاہتا کہ گھر کی ملازمہ سے کام لوں۔ وہ اٹھ کر بڑبڑائیگی"۔

میں نے کہا "جی نہیں میں خود پکا دونگی کسی کو خبر بھی نہ ہوگی"۔

"بڑی دیر لگے گی"۔ انہوں نے کہا۔

میں نے جھٹ سے کہا "ابھی ابھی پکا دوں گی۔ آلو رکھے ہوئے ہیں۔ اور دو انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ آلو کی ترکاری اور انڈے کا خاگینہ بنا کر روٹی ڈال دوں گی"۔

کچھ سوچنے لگے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ یا اللہ کسی طرح اس بات پر راضی ہو جائیں۔ آخر کو بولے کہ "ذرا اچھی طرح پکانا"۔

"بہت اچھی طرح پکاؤں گی اور ابھی لیجئے"۔ یہ کہہ کر میں سیدھی باورچی خانہ میں پہنچی۔ جلدی سے لکڑیاں جمع کر کے چولھے میں تیل ڈال کر چشم زدن میں آگ جلائی اور آلو جلدی سے چھیل کے کتر کے بہت سی پیاز اور گھی میں خوب اچھی طرح بھونے۔ دودھ بہت سا رکھا تھا اور میں نے بجائے پانی کے خوب بہت سا بالائی دار دودھ ڈال کر پکائے۔ آٹا جلدی سے گوندھا اور وہ بھی دودھ میں اور خوب بہت سا گھی ڈال کر پراٹھے پکائے۔ پراٹھے پکا ہی رہی تھی کہ میری چھوٹی نند اٹھ کر آ گئی۔ میں اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ متعجب ہو کر کہنے لگی "آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟"

"تمہارے بھائی جان کے لئے پکا رہی ہوں"۔ میں نے کہا۔

حمیدہ بولی "ارے آپ غضب کر رہی ہیں۔ بھلا یہ کس کے لئے پکا رہی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے"۔

میں نے مسکرا کر کہا "ہاں معلوم ہے۔ تمہاری دوسری بھابی جان کے لئے پکا رہی ہوں جو باہر بیٹھی ہیں"+

"خدا کی مارا اُن کمبخت پر۔ میں آپ کو اُس چڑیل کے لئے نہیں پکانے دونگی" یہ کہہ کر اُس نے آٹا گھسیٹ لیا+

"خدا کے لئے تم مجھے پکانے دو۔ آج میری قسمت جاگ اُٹھی ہے جو مجھ سے اُنہوں نے اپنے ایک کام کو کہا۔ مارے خوشی کے میری جو حالت ہے میں ہی جانتی ہوں" یہ کہہ کر میں نے اُس سے آٹا چھین لیا اور کہا "بہن ذرا تم بھی پکوا لیتیں۔ تو مجھ سے خوش ہو جاتے کہ جلدی پکا لائی"+

حمیدہ نے کہا "بھابی جان آپکا کام ہوتا تو میں کر دیتی اس چڑیل کے لئے تو میں ہرگز نہ پکاؤں گی"+

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہن بس خدا نہ ڈالے۔ وہ تو پھر بھی انسان ہے۔ اگر وہ شیطان کے لئے بھی پکوائیں تو میں پکاؤں۔ اگر وہ بھنگی اور کتّوں کے لئے مجھ سے پکوائیں تو میں پکا دوں۔ رونا تو یہی ہے کہ مجھ سے کام ہی نہیں لیتے۔ تمہیں اگر میرے اوپر رحم آئے تو میرا ہاتھ بٹا لو شاید وہ اس سے خوش ہو جائیں کہ میں جلدی سے پکا لائی"+

میرے اس طرح کہنے پر حمیدہ کو رحم آ گیا اور وہ کہنے لگی "میں تو کبھی نہ پکاتی۔ مگر لائیے آپ کی خاطر سے کر دوں"+

میں نے خوش ہو کر کہا "بہن اگر کرنا چاہتی ہو تو بس اتنا کر دو کہ چولہے کے اس طرف آنچ خالی نکل رہی ہے۔ سویّاں بھونی ہوئی ٹین میں رکھی ہیں جھٹ سے قوامی سویّاں پکا دو"+

میری خوش قسمتی تھی کہ حمیدہ کی سمجھ میں کچھ آ گیا اور وہ تیزی سے کام کرنے لگی۔ میں نے جھٹ سے پراٹھے ختم کر کے دودھ کا چھینٹا دے کر الگ رکھے۔ آلو کی ترکاری آتاری اور انڈوں کو دودھ اور بالائی میں ملا کر پھینٹا اور بہت سا گھی اور پیاز ڈال کر جلدی سے تل دیا۔ حمیدہ کہنے لگی کہ "آپ ہر چیز میں دودھ ڈال رہی ہیں۔ کہیں انڈوں میں بھی دودھ پڑتا ہے"+

میں نے کہا پڑتا تو نہ انڈوں میں ہے اور نہ ترکاری میں۔ مگر میں نے تو آج تجربہ کیا ہے۔ بالائی دار دودھ کسی میں ڈالو ضرور مزہ دے گا"+

میں نے حمیدہ سے کہا کہ تم سویّاں پکاؤ۔ میں ابھی کھانا دے کر آتی ہوں قرینہ سے ایک سینی میں میں نے سب کھانا لگایا اور چھوٹے گھر میں آئی۔ دروازہ پر کنڈی کھٹکھٹائی۔ "بڑی جلدی پکا لائیں" یہ کہہ کر اُنہوں نے دروازہ ہی پر سینی میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں دوڑی ہوئی باورچی خانہ میں آئی۔ کچھ تھوڑے سے آلو کے قتلے پتیلی میں اور پڑے تھے۔ میں نے تیزی سے سل پر اُن کو پیس کر چشم زدن میں بھرتہ تیار کیا۔ ادرک اور پیاز اور پودینہ جلدی سے ملا کر داغ کیا۔ اور ایک رکابی میں لے کر دروازہ پر پھر پہنچی۔ کان لگا کر سنا تو وہ رنڈی کہہ رہی تھی "میں نے عمر بھر میں کبھی اتنی خوش ذائقہ آلو کی بھجیا نہیں کھائی" یہ آواز میرے لئے کس قدر باعث خوشی تھی۔ بس کوئی میرے دل سے پوچھے۔ مارے خوشی کے میرا دل چلتے چلتے معلوم ہوا کہ رُک سا گیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جو میں نے نہیں سُنیں کہ میں نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی۔ کھانا چھوڑ کر دوڑے آئے میں نے رکابی ہاتھ میں دی تو کہا "کچھ اور ہے؟ آج تو تم نے کمال ہی کر دیا ہے" یہ کہہ کر رکابی لے لی۔ میں وہیں کان لگائے کھڑی رہی۔ "یہ لیجئے بھرتہ بھی چکھئے" اُنہوں نے رنڈی سے کہا+

"آخر یہ کون پکا رہی ہے؟" رنڈی نے پوچھا+

"ایک نئی ماما آئی ہے" میرے آقا نے کہا+

"مجھے ایک ماما کی خود بڑی ضرورت ہے۔ اگر آپ یہ ماما مجھے دیدیں تو بڑی عنایت ہو" رنڈی نے کہا+

"تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے" میرے مالک نے رنڈی سے کہا "میں دیدونگا۔ بشرطیکہ وہ جانے کو راضی ہوئی"+

"راضی کیوں نہ ہوگی" رنڈی بولی+

"میں تو جانتا ہوں راضی ہو جائے گی۔ میں دوگنی تنخواہ اُس کو دونگا"+

"بھرتہ بھی اُس نے کمال کا پکایا ہے۔ آپ کے سر کی قسم میں نے عمر بھر نہ تو ایسا بھرتہ کھایا اور نہ ایسا انڈا کھایا اور نہ ایسی آلو کی ترکاری کھائی۔ اور نہ ایسے پراٹھے کھائے۔ اور پھر طرّہ یہ کہ چشم زدن میں سب چیزیں آ گئیں"+

غرض میری خوب خوب تعریفیں ہو رہی تھیں۔ اور میاں تعریفیں سُن سُنکر نہال ہوئے جاتے تھے۔ اور ادھر میں مارے خوشی کے بیدم ہوئی جا رہی تھی میں باتوں میں ایسی محو تھی کہ مجھے سویّوں کا خیال ہی نہ رہا کہ اتنے میں وہ رنڈی بولی "بس کوئی میٹھی چیز اور ہوتی تو لطف آ جاتا"+

"پہلے سے تم نے نہیں کہا۔ بھلا اس وقت کیا ہو سکتا ہے"+

رنڈی نے کہا "میں نے تو یونہی کہا۔ واقعی بھلا اسقدر جلدی اور پھر اس وقت کیسے ممکن تھا"+

میں ایک دم سے باورچیخانہ میں دوری۔ وہاں حمیدہ نے سوّیاں تیار

کرکے ایک رکابی میں رکھی تھیں۔ خوش قسمتی سے میوہ کترا ہوا مل گیا تھا۔ اُس نے وہ بھی ڈال دیا تھا۔ میں پلیٹ لے کر سیدھی دوڑی ہوئی اپنے مکان میں تیر کی طرح آئی۔ بڑے بڑے دن رات کی فکر میں گھل گھل کر بیمار سی ہو گئی تھی۔ حکیم صاحب نے سیب کا مربّہ سونے کے ورق میں لپیٹ کر کھانے کو بتایا تھا۔ یہاں کس کو فکر پینے کی تھی۔ یوں کا یونہی رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک سیب کو باریک باریک کتر کے اس کو سویوں میں ملا دیا اور اوپر سے سونے کا ورق اور اُس کے گرد چاندی کے ورق لگا کر دروازہ پر پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اونہہ کرکے میاں اُٹھے اور آئے تو ذرا جھلا کر کہا کیا ہے؟ میں سہم سی گئی اور میں نے کہا "کچھ نہیں سویّاں ہیں"۔ ایک ہاتھ میں اُنہوں نے پیچھے لئے اور دوسرے ہاتھ میں رکابی لی اور کیا بتاؤں کہ کس لہجہ میں اُنہوں نے خوش ہو کر اُس سے کہا "بولو کیا دلواؤ گی اگر ہم تمہیں تمہاری مرضی کی اس وقت ایک چیز کھلائیں"۔

"تمہیں ہماری قسم" رنڈی نے کہا +

میرے مالک خوش ہو کر بولے "واللہ ابھی لو"

یہ کہہ کر اُنہوں نے رکابی رکھ دی۔ کیونکہ فوراً ہی اُس نے کہا "قسم کھا کر کہتی ہوں میں نے کبھی ایسی سویّاں نہیں کھائیں"۔

میرے مالک خوش ہو کر بولے "تمیز بھی ہے۔ یہ مربّہ کا مزعفر ہے"۔

میں برابر اپنے پکانے کی تعریفیں سنتی رہی اور وہاں یہ طے ہوا کہ اکثر اس ملازمہ کے ہاتھ کی چیزیں پکا کریں گی اور خاص طور پر آلو کی بُھجیا اور بھرتہ۔ میں نے جیسے ہی آہٹ سنی کہ کھانا کھا چکے ہیں ویسے ہی میں دروازہ سے ہٹ آئی۔ تھوڑی دیر بعد برتن لے کر آئے تو میں نے دبی زبان سے کہا:۔

"آپنے کیوں تکلیف کی صبح کو آجاتے"۔ میں نے ہاتھ سے برتن لئے تو اُنہوں نے خوش ہو کر میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے کہا "شاباش تم بڑی اچھی بیوی ہو"۔ کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہو گیا جھٹ سے میں نے برتن تخت پر رکھ دیئے اور اس ہاتھ کو پکڑ کر چومنے لگی۔ میرا ایکدم سے دل بھر آیا اور اُن کے ہاتھ پر گرم گرم آنسو گرے۔ شاید وہ گھبرا سے گئے کہ ایکدم سے نرمی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور یہ کہتے چلے گئے کہ "برتن اندر ابھی رکھ آنا"۔ میں برتن لے کر گئی اور چولھا وغیرہ بجھا کر واپس چلی آئی +

چارپائی پر لیٹی ہیں اس واقعہ پر غور کر رہی تھی۔ اور اسقدر خوش تھی کہ بیان ہی نہیں کر سکتی۔ نمعلوم کتنی دیر تک سوچ سوچ کر دل خوش کیا کی۔ میں دل میں کہتی تھی کہ مجھ سے زیادہ اور کون خوش قسمت ہو سکتا ہے۔ جب سے بیاہ کر آئی آج مجھ سے ایک کام کو کہا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ ہو گیا۔ اور اچھی طرح اور سرخروئی سے +

(۲)

صبح ہوئی اور میں منتظر تھی کہ شاید آئیں۔ مگر توبہ کیجئے دو تین روز نہ آئے خدا بھلا کرے اُس رنڈی کا کہ اُس نے پھر اُسی بھرتہ کی فرمائش کر دی۔ میری قسمت جاگی اور ایک روز صبح آئے۔ میرا خوشی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ اور میں نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ مسکرا کر کہنے لگے "جیتی رہو"۔ میں دل میں خوش خوش چپکی ہاتھ باندھے کھڑی رہی کہ بولے "وہ جو بھرتہ اُس روز تم نے پکایا تھا"۔

میں نے دبی زبان سے کہا "آپ کہیں تو آج پھر پکا دوں۔ وہ تو جلدی میں پکایا تھا۔ آپ کو پسند آیا"؟

وہ بولے "ہاں بہت اچھا تھا۔ پرسوں پکوانا ہے۔ مگر تھوڑا سا آج بھی پکا دینا۔ تاکہ اطمینان سے دیکھیں کہ کیسا پکتا ہے"۔

"بہت اچھا ابھی پکاتی ہوں" میں نے خوش ہو کر کہا +

وہ بولے "بس میرے کھانے کے ساتھ بھجوا دینا" +

بیویاں اپنی سوتوں کو زہر دیا کرتی ہیں اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ میری قسمت ہی عجیب تھی۔ مجھے اپنی ناجائز سوت کو عمدہ کھانے کھلانے میں مزا آتا تھا اور میری عقل نہ کام کرتی تھی کہ کیونکر سوت کو زہر دے کر طبیعت خوش ہو سکتی ہے۔ کچھ بھی ہو مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ ایک نایاب نسخہ ہاتھ لگا ہے یعنی یہ کہ آلو کے بھرتہ میں دودھ اور بالائی ڈالنا۔ آج میں نے اور ہی ترکیب کی۔ چھٹانک بھر بالائی اور چھٹانک بھر بادام اور پستہ ڈالے۔ اور خوشبو کے لئے تھوڑا سا ناریل پیس کر ملایا۔ اور ان سب چیزوں کو ملا کر خوب پیسا۔ اس کے بعد آدھ سیر گوشت کی یخنی تیار کر کے آلوؤں کو اُس میں دودھ ڈال کر اُبالا اور سب پسی ہوئی چیزیں یعنی بالائی اور بادام وغیرہ میں ملا کر ایسا پیسا کہ یکجا کر لیا۔ اُس کے بعد بہت سے گھی میں پیاز سرخ کر کے بھرتہ کے تمام مصالحہ کے ساتھ دھیمی آنچ پر بھون کر اُتار کر پودینہ وغیرہ ملا دیا۔ اب جو اس کو میں نے چکھا تو خود میری عقل حیران ہو گئی کہ یا الٰہی یہ کیا معجون مرکب بن گئی۔ میں نے دل میں کہا کہ اُس روز بھرتہ پراٹھے کے ساتھ کھلایا تھا۔ اگر آج روٹی ہو گی تو شاید کچھ ذائقہ دب جائے۔ لہٰذا میں نے دودھ اور گھی اور بچی ہوئی یخنی سے

آٹا گوندھ کر پراٹھے بھی پکا لئے۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ یہ چیزیں بھی باہر گئیں +

رنڈی نے جو کچھ تعریف کی وہ کی خود میاں چکر میں آگئے۔ اور نتیجہ نکلا کہ کھانے کے بعد ہی آئے۔ چہرہ سے خوشی ظاہر تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ بیحد خوش ہیں۔ میں دیکھ کر باغ باغ ہوگئی۔ کھڑی ہوگئی۔ تو ایک دم سے میرے ٹوٹے ہوئے میلے جوتے پر نظر پڑی اور سب بھول کر ایک دم سے بولے "تم کیا خراب جوتا پہنے ہوئے ہو" میں نے چپ ہو کر نظر نیچی کر لی۔ تو بولے "آج کا بھرتہ تو تم نے ایسا پکایا ہے کہ میں نے عمر بھر نہیں کھایا۔ بھرتہ کیا تھا کہ نعمت تھی" "بس پرسوں بھی ایسا ہی ہوگا۔ مگر سیر بھر کا ہونا چاہیئے"

میں نے دبی زبان سے کہا "اتی جان خفا ہو رہی تھیں کہ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں تم اپنے یہاں پکانا وہاں مت پکانا" یہ کہہ کر پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر دیا اور کہنے لگے "یہ لو جو کچھ خرچ ہو اور بقیہ تمہارا انعام ہے" یہ انہوں نے مسکرا کر کہا +

کیا بتاؤں میرا کیا حال تھا۔ زہے قسمت کہ مجھ سے مذاق تو کیا مگر میں نے سوکھے منہ سے کہا "آپ کیوں کسی سے کوئی چیز باہر پکواتے ہیں۔ میرا انعام تو یہ ہے کہ پرسوں دعوت کے لئے کوئی اور چیز بھی مجھ سے پکوا لیجئے"+

"نہیں اور کچھ نہیں سب انتظام ہو گیا ہے۔ تم بھرتہ ہی پکا دینا۔ یہ" یہ کہہ کر اٹھ کر چلے گئے +

میں نے دیکھا کہ یہ بھرتہ پکتا دیکھنے دو بار آ چکے ہیں لہذا کہیں اُن کی بات انہیں نہ معلوم ہو جائے جو سب حقیقت کھل جائے۔ دراصل بھرتہ پکانے میں میرا ایسا ہنر نہ تھا خوبی تھی تو بادام پستوں اور بالائی وغیرہ کی میں نے آج اور بھی محنت سے بھرتہ تیار کیا۔ اور آج چونکہ کیوڑہ اور زعفران کا چھینٹا جو اور دیدیا تو لطف ہی آگیا۔ خوب خوب رنڈیوں اور شہدوں اور بچوں نے کھایا اور داد دی۔ کسی نے کہا کہ بادام پڑے ہیں۔ کسی نے کہا کہ کھویا پڑا ہے اور کسی نے کہا کہ آلو نہیں بلکہ گوشت ہے۔ دو تین صاحبوں نے کہا کہ ہم خود ایسا پکوا سکتے ہیں۔ قصہ مختصر ایک دن مقرر ہوا کہ کسی دوسرے دعویدار کے یہاں سے بھرتہ پک کر آئے۔ میری خوش قسمتی سے اس بھرتہ کا خوب قصہ چھڑا۔ مجھ سے آ کر یہ سب کیفیت سنائی۔ تو میں نے کہدیا کہ خدا کے فضل سے آپ کی لونڈی جیسا پکائے گی کسی سے نہ پکے گا۔ ایسا ہی ہوا کہ بھرتہ آیا اور سب نے کھایا اور سب نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی نئی باورچن سے اچھا کوئی نہیں پکا سکتا۔ مجھے تو چکھایا تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ بادام ڈالے گئے ہیں اور کھویا ڈالا گیا ہے۔ مگر گوشت کی یخنی کا ذائقہ اور ناریل کی خوشبو موجود نہ تھی۔ اور علاوہ اس کے معمولی مصالحوں کی طرف غیر توجہی برتی گئی تھی اور بھرطرہ یہ کہ پیاز تلے نہ تھے +

قصہ مختصر تین جگہ سے پک کر آیا اور سب کو شکست ہوئی۔ ایک جگہ سے گوشت پسا ہوا ملایا گیا جو سب کو معلوم ہو گیا +

جوتہ میں وہی پہنے ہوئے تھی اور نتیجہ اس خدمت کا ملا کہ ایک روز شام کو دو تین جوڑی جوتے کے بھجوائے کہ اس میں سے ایک پسند کر لو۔ اب یہ دستور تھا کہ جس روز بھرتہ پکتا تھا تو اندر آتے تھے یا کسی دوسری جگہ سے بھرتہ آتا تھا تب آتے تھے۔ ورنہ نہیں آتے تھے۔ میری بدقسمتی سے بھرتہ کا خبط بھی لوگوں کو ہفتہ بھر سے بند تھا اور وہ بالکل ہی نہ آئے تھے۔ میں پژمردہ ہو رہی تھی۔ اور میں نے یہ کہہ کر جوتے واپس کروا دیئے کہ رہنے دیجئے میرے پاس ہیں۔ معلوم ملازمہ نے جا کر کیا کا کیا کہا کہ خود اندر آئے اور کہنے لگے۔ "ان جوتوں میں سے ایک پسند کر لو"+

میں نے حسب معمول دبی زبان سے کہا "میرے پاس دو جوڑی جوتے رکھے ہیں"+

ذرا تیزی سے بولے "ہائیں! تو پھر پہنتی کیوں نہیں ہو"

"میرا دل ہی نہیں چاہتا کہ کوئی اچھی چیز پہنوں" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا +

"مت پہنو چولھے میں جاؤ بھاڑ میں پڑو" یہ کہہ کر غصہ میں اُٹھ کر چل دیئے +

ایک لمحہ بھر تو میں سکتہ کے عالم میں کھڑی رہی۔ ایکدم سے مجھے رونا آگیا۔ نہ معلوم دل میں کیا سمائی کہ میں دوڑی وہ دروازہ کے پاس ہی تھے کہ میں نے پاؤں پکڑ کر روتے ہوئے کہا "خفا مت ہوئیے۔ میں ابھی پہنے لیتی ہوں"+

شاید دل پسیج گیا۔ میں نے روتے ہوئے اوپر منہ کر کے دیکھا تو مسکرا کر کہا "اچھا جاؤ۔ جاؤ۔ پہن لو" میں واپس آئی اور دیر تک روتی رہی۔ میں نے

ان جوتوں میں سے ایک رکھ لیا۔ اور دو باقی واپس کر دیئے +

(۳)

بھرتہ کا قصہ بالکل ہی سرد پڑ گیا تھا۔ اکثر کیا بلکہ رات کو ہمیشہ گھر سے غائب ہی رہتے تھے۔ لیکن کسی روز ایسا بھی ہوتا تھا کہ میری قسمت جاگتی تھی جو وہ زندگی گھر پر رہتی تھی۔ اور اُس روز مجھ سے بھرتہ کی فرمایش ہوتی تھی۔ اب میری عادت سی ہو گئی تھی کہ جس روز وہ آتی ضرور دروازہ پر کان لگا کر باتیں سنتی +

ایک روز وہ آئی اور میں نے اُس کے لئے علاوہ بھرتہ کے دو تین چیزیں خود اپنی مرضی سے پکائیں اور سب چیزوں میں اپنے خاص نسخہ اور ترکیب سے کام لیا۔ تھیں تو بہت تھوڑی تھوڑی۔ مگر نہایت خوش ذائقہ تھیں +

کھانا کھاتے ہی میں مجھے باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ اس روز سے تقاضہ کر رہی ہے کہ پکانے والی کو مجھے دیدو۔ چنانچہ اُس نے کہا کہ "یہ بھی کوئی بات ہے کہ آج کل آج کل کر رہے ہو۔ آخر اس نوکرنی کو مجھے دے کیوں نہیں دیتے" یہ کہہ کر اُس نے دیر تک نہ معلوم کیا کیا باتیں کیں اور بڑبڑایا کی اور نہ معلوم کیا کیا جواب ملے۔ لیکن آخر کو اُس نے وعدہ لے ہی لیا کہ کل ضرور اس کو یہ بھرتہ پکانے والی مل جائے گی۔ میں نے دل میں کہا یا الٰہی کیا سچ مچ مجھے اس رنڈی کو دیدیں گے۔ اگر واقعی خوش ہو جائیں تو مجھ کو یہ بھی منظور ہے۔ اتنے میں کھانا ختم ہوا اور میں کھٹ پٹ سنکر چلی آئی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد میں پھر گئی تو وہاں پھر وہی ذکر تھا کہ بھرتہ پکانے والی کو کل ضرور ضرور لاؤ۔ وہ یہ کہہ کر اُٹھے کہ میں ابھی دریافت کر کے بتاتا ہوں کہ کل آسے بھیجو اسکو نگا یا پرسوں۔ میں یہ سنکر گھبرا گئی۔ مگر سیدھی دوڑ کر اپنی چارپائی پر برآمدہ میں بیٹھ گئی۔ گھر میں کوئی نہ تھا میں نے دیکھا کہ وہ سیدھے میرے پاس آئے۔ میں کھڑی ہو گئی۔ مجھ سے بیٹھنے کو کہا اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر چپ رہے۔ میں اسی طرح مودبانہ طریقہ سے کھڑی تھی کہ پھر مجھ سے کہا بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گئی لیکن میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا کہ دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ کچھ سکوت کے بعد کہا "میں تم سے ایک بات کہتا ہوں" +

میں چپ اُسی طرح کھڑی رہی کہ وہ بولے "میں کل ایک نوکرنی لاؤنگا اُسے تم بھرتہ پکانا سکھا دینا" +

"میں خود پکانے کو حاضر ہوں" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا +

"نہیں" کچھ جھلا کر کہا "تم سے جو کہتا ہوں وہ کر دینا" +

"بہت اچھا" میں نے کہا "اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی" +

یہ کہہ کر میں ذرا قریب بڑھی اور وہ کھڑے ہو گئے۔ میں نے ہمت کر کے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر بغل میں منہ دیکر رونے لگی۔ محض چند ہی منٹ یہ گوارا کیا کہ اپنے کو یہ کہہ کر چھڑا لیا "خوب اچھی طرح سکھا دینا" میں آنسو پونچھتی کھڑی رہ گئی اور وہ چلے گئے۔ مگر میں خوش تھی۔ خدا کی شان ہے کہ کہاں تو صورت دیکھ کر ہی چڑ جاتے تھے۔ اور اب مجھ کو اتنی گستاخی کی اجازت اور کچھ نہ کہا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب کی مرتبہ کچھ دل کی بات بھی کہوں گی +

(۴)

مجھ سے سب ہی نے تو کہا کہ تو بھرتہ کی ترکیب نوکرنی کو مت سکھا۔ مگر میں نہ مانی۔ بار بار میں نے غور کیا اور سوچا اور تیار بھی ہو گئی کہ نہ بتاؤنگی۔ مگر پھر بھی خیال آیا کہ انہوں نے تاکید سے کہا ہے ایسے سکھانا کہ کوئی شکایت نہ ہو۔ میں نے آخر کو طے کر لیا کہ خواہ کچھ ہی ہو۔ میں تو اپنے میاں کو دھوکہ نہ دونگی جو قسمت کا ہوگا وہ ویسے ہی سامنے آ کے رہے گا۔ میں نے خوب خوب اُس نوکرنی کو ترکیب سکھا دی لیکن یہ ضرور اُس سے کہہ دیا کہ حتی الامکان تو اس کی ترکیب کسی کو نہ بتانا۔ قصہ مختصر یہ ملازمہ سکھا پڑھا کر یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ یہی بھرتہ پکانے والی ہے +

پہلے روز اُس نے بھرتہ یوں بگاڑا کہ بادام بلکہ کرنہ ڈالے اور کڑوا کر دیا۔ دوسرے روز جو اُس نے پکایا وہ زرا جل گیا۔ کیونکہ دھیمی آنچ پر نہیں پکایا گیا۔ تیسرے روز جو اُس سے مختلف سوال کئے گئے تو بھانڈا پھوٹ گیا۔ کہ اصل پکانے والی کی بجائے دوسری عورت بھیج دی گئی ہے۔ آئی گئی آفت میرے سر عجیب طرح آئی۔ رنڈیوں کے نخرے اور فرمایشیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ اور پھر اُن کے چوچلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محض اس بات پر وہ اتنی بگڑی کہ نہ معلوم یہ خفا ہو کر رات ہی کو چلے آئے۔ یا اُس نے نکال دیا۔ قصہ مختصر رات کے بارہ بجے میرے اوپر آ کر پھٹ پڑے۔ میں سو رہی تھی کہ مجھ کو جگایا اور ترش لہجہ میں کہا "کیوں جی ہم نے تم سے کیا کہا تھا؟"

میں کانپ رہی تھی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کس بارہ میں"

"تم نے شاید اُس عورت سے کہدیا جو اُس نے وہاں جا کر کہدیا کہ میں تو بالکل نئی ہوں۔ اور مجھے ایک دوسری عورت نے بھرتہ پکانا سکھا کر بھیجا ہے"

وہ پلنگ پر بیٹھے تھے اور میں [illegible] تھی۔ میں نے ایک دم سے بیٹھ کر پاؤں پکڑ لئے اور کہا "آپ کے قدموں کی قسم جو میں نے ذرہ بھر سکھایا ہو۔ خدا مجھے آپکی خدمت نہ نصیب کرے جو میں نے ذرا بھی اس کو کسی طرح ورغلایا ہو" +

ذرا دیر چپ رہے۔ پھر پلنگ پر اپنے بیر چھڑا کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گئے۔ میں اُسی طرح کھڑی تھی۔ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے" وہ عورت بالکل گدھی ہے۔ میں نے اس کو کس کس طرح سمجھایا تھا اور پانچ روپے انعام دیا تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے کہدیا +

میں از راہ ہمدردی یہ سنکر اس عورت کو بُرا بھلا کہہ کر کوسنے لگی کہ خدا کرے اسکو اس دغابازی کا اجر ملے۔ پھر چپ پڑے رہے۔ برسات کا زمانہ تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید انہیں نیند آرہی تھی۔ کیونکہ بڑی دیر سے بالکل اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ میں کھڑے کھڑے تھک گئی تو آہستہ سے پلنگ کی پائنتی آکر زمین پر بیٹھ گئی اور ہمت کر کے دھیرے دھیرے پاؤں دبانا شروع کئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاگ رہے تھے۔ کچھ کسمسائے۔ پھر تو میں پائنتی پلنگ پر بیٹھ گئی اور اچھی طرح پاؤں دابتی رہی حتی کہ وہ سو گئے۔ میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ اٹھوں اور یہی جی چاہتا تھا کہ پاؤں نہ چھوڑوں۔ خدا کی شان تھی کہ وہ اس کے آج روادار تھے۔ اور میرے لئے اس سے زاید خوش قسمتی کا بھلا اور کونسا موقعہ ہو سکتا تھا۔ قصہ مختصر میں نے اسی طرح پاؤں دابتے ہی رات کاٹ دی۔ اور مجھکو ذرہ بھر تکان یا نیند نہ معلوم ہوئی بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وقت جلدی گذر گیا۔ صبح آنکھ جو کھلی تو کلبلا کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے۔ "ارے تم سونے نہیں گئیں" میں بھلا اس کا کیا جواب دیتی۔ جوتہ وہ دوسری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اُٹھا کر پائنتی سے پاؤں میں دیدیا۔ میں نے آنکھ کے گوشہ سے صرف اتنا چرا کر دیکھا کہ میرے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ جوتہ پہن کر سیدھے باہر چلے گئے +

(۵)

دو روز ہو گئے تھے اور چپ ستاٹے میں پڑے تھے۔ میں بار بار جھرمنگاتی معلوم ہوتا کہ چارپائی پر مغموم پڑے ہوئے ہیں۔ کیا میں خوش تھی کہ رنڈی سے لڑائی ہو گئی؟ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرا کیا حال ہو گیا۔ خوش میں ضرور تھی لیکن رنجیدہ بھی تھی۔ مجھے یہ خیال تھا کہ ان کی خوشی کا سلسلہ گیا اور لہذا اب جو مجھے خوشی کی امید ہو چلی تھی وہ بھی منقطع ہو گئی۔ اس رنڈی نے صاف کہلوا دیا تھا کہ اگر مجھ سے محبت ہے تو اصل [illegible] کاٹنے والی نوکرنی کو دو۔ اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ بوجوہ چند وہ نہیں مل سکتی۔ [illegible] رنڈی ہی ہاری اور ہار کر اس نے کہلا بھیجا کہ میں اپنی ضد چھوڑ دوں گی بشرطیکہ روزانہ مجھے بھرتہ پکوا کر بھجوا دیا کریں۔ میں دروازہ پر کھڑی سُن رہی تھی اور اس کا جو جواب انہوں نے دیا وہ ایک بیاہتا بیوی کو خوش کر دینے والا تھا۔ ایک دم سے ڈانٹ کر اس کے نوکر سے کہا "نکل جاؤ یہاں سے اور کہدینا کہ اگر ان کو ضد کرنا آتی ہے تو ہم بھی بڑے ضدی ہیں" بجائے نکل جانے کے اُس کمبخت نے رنڈی کی ماں کی طرف سے پیغام دیا کہ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کے فراق میں لڑکی کا بُرا حال ہے۔ مگر کمبخت اپنی ضد نہیں چھوڑتی۔ آپ کے لئے روتی بھی ہے۔ مگر ضد بھی کرتی ہے۔ اور بڑی مشکل سے سمجھانے بجھانے سے اب اتنا راضی ہو گئی ہے کہ کہتی ہے کہ روزانہ بھرتہ پکوا کر بھیج دیا کریں۔ مگر وہاں ایک نہیں سب کا جواب تھی۔ وہ آدمی آخر شش جھک مار کر چلا گیا +

میں بڑی متفکر تھی کہ کہیں خدانخواستہ طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ اور دوسرے روز جب میں نے دیکھا کہ وہ کمبخت اپنی ضد پہ بدستور اڑی ہوئی ہے تو آخر کو ہار کر میں نے جلدی جلدی بھرتہ تیار کیا اور چپکے سے ان کے خاص ملازم سے رنڈی کے گھر بھجوایا۔ گھر کے ملازم جتنے بھی تھے وہ دل سے میرے ہمدرد تھے۔ اور وہ بیچارہ بغیر کہے سُنے دے آیا۔ یہاں ان کو تو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ ویسے ہی اَنوائی کھٹوائی لئے ہوئے پڑے تھے اور وہاں اُس کی جو ضد پوری ہوئی تو وہ خود رات کو چلی آئی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر کوئی بات نہ سُنائی دی۔ دوسرے روز بھی میں نے بدستور چپکے سے بھرتہ بھیجدیا اور تیسرے روز بھی ایسا ہی کیا۔ میری طبیعت خوش ہو گئی کہ وہ پھر ہشاش بشاش گھومنے لگے اور ایک مرتبہ مجھ سے بات بھی کی +

چوتھے دن شاید وہاں ذکر ہوا ہوگا جو ان کو معلوم ہو گیا کہ شکست دراصل نہیں ہوئی ہے۔ اب تک وہ اسی بھول میں تھے کہ میری ضد پوری ہوئی ہے۔ سیدھے میرے پاس آئے۔ میں سمجھ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ میں نے ملازمہ سے اشارہ کر دیا وہ دروازہ بند کرتی ہوئی بڑے مکان میں چلی گئی۔ اور مکان اکیلا ہو گیا۔ آکر پلنگ پر بیٹھ گئے اور حسب عادت نہایت ترشروئی سے کہا " یہ تم تین روز سے بھرتہ بھیج رہی ہو؟"

میں ڈر کے مارے کانپ رہی تھی اور اپنی خطا کا اقبال کرتے ہوئے کہا "جی"

"کیوں؟ آخر کیوں" نہایت ہی دبنگ آواز میں غصہ سے میری طرف دیکھ کر کہا کہ "آخر مجھ سے بغیر پوچھے یہ تم نے بھیجا ہی کیوں"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "قصور ہوا"

"آخر کیوں؟ کیا سمجھ کے تم نے بھیجا" ذرا دے کر مجھ کو ڈانٹا +

"اس لئے" میں نے رُکتے ہوئے کہا "اس لئے کہ کہیں آپ کی طبیعت نہ خراب ہو جائے"

"تمہاری بلا سے" وہ جھنجھلا کر بولے +

میں نے ایک دم سے زور سے کہا "خدا کے لئے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کیجئے۔ میرا قصور معاف کیجئے" یہ کہتی ہوئی میں روتی ہوئی اُن کے قدموں کی طرف جھکی اور پیر پکڑ کر سر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ نہ بولے۔ پھر میرا سر سینے سے ہاتھ سے اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ مسکرا کر کہا "بیوقوف نہیں تو" شاید ان الفاظ میں بوئے محبت تھی کہ میں بیتاب ہو گئی اور اُن کے گھٹنے پر سر رکھ کر اس بُری طرح روئی کہ مجھے اُسی حالت میں چھوڑ کر شاید گھبرا کے چلے گئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس نامراد رنڈی سے بے طرح ان کا دل ملا ہوا تھا کہ کسی طرح اُس کو بھولتے ہی نہ تھے۔ میں دراصل دل ہی دل میں اب خوش تھی کیونکہ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ اور مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید میرے دن پھرنے والے ہیں +

(۶)

ادھر بھرتہ کا جو راز کھلا تو پھر ناچاقی ہو گئی اور بھرتہ جانا بند ہو گیا۔ تین چار روز میں نے انتظار کیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ باہر دیوانخانے میں آج رات کو ضرور جاؤں گی۔ چنانچہ میں نے خدمتگار سے چپکے سے کہلوا دیا کہ آج تو اجازت لے کر گھر چلا جانا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا +

میں نے ڈرتے ڈرتے باہر قدم رکھا۔ کیونکہ اس سے قبل ایک مرتبہ ایسا کرنے پر میری وہ خبر لی جا چکی تھی کہ خدا کی پناہ۔ میں نے دیکھا کہ ادھر اُدھر کوئی نہیں ہے۔ حقہ پی چکے تھے۔ اور ایک ہلکی سی ململ کی دلائی اوڑھے ہوئے مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں ایسے دبے پاؤں گئی کہ آہٹ تک نہ ہوئی۔ قریب پہنچ کر میں نے مچھر دانی کا کنارہ اُٹھایا تو چادر منہ سے ہٹا کر بولے "کون ہے"! میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور کچھ نہ بولی۔ کیونکہ اُنہوں نے دیکھ ہی لیا تھا پھر اُسی طرح منہ ڈھک لیا۔ میں ہمت کر کے پلنگ کی پائنتی بیٹھ گئی اور اپنا مشغلہ شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد سرک کر میں اچھی طرح بیٹھ گئی اور پاؤں دابتی رہی۔ آخر کو ہمت کر کے میں نے کہا "میں کچھ کہنا آپ سے چاہتی ہوں" +

"کیوں؟ کیا ہے؟" چادر کو منہ سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ مگر میں چپ رہی

تو پھر کہا "آخر کچھ کہتی بھی ہو"

"آپ خفا تو نہ ہونگے"؟ میں نے آہستہ سے کہا +

"آخر کیا ہے کچھ کہو تو"

"میرے اوپر رحم کیجئے" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "آپ خوش ہوتے ہیں تو یہ سنکر کہ آپ خوش ہیں میں بھی خوش ہو جاتی ہوں۔ آپ کیوں اپنے دل کو رنج دیتے ہیں"

اس کا جواب اُنہوں نے دیا "ہشت"

میں نے مزاج کی نرمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا "مجھ بدقسمت کا کیا ہے۔ آپ خفا ہو لیں گے۔ میں بھگت لونگی۔ جو چاہے میرا حال کیجئے گا" +

"تو اس سے مطلب یہ ہے کہ کل سے پھر بھرتہ بھیجو گی" اُنہوں نے کہا

"جی ہاں"! میں نے کہا "خواہ کچھ ہی ہو آپکا رنج تو دور ہو گا"

انہوں نے نرمی سے کہا "نہیں مت بھیجنا"

"پھر آپ رنج کریں گے" میں نے سادگی سے کہا +

اس کا جواب پھر انہوں نے دیا "نہیں" اور کچھ ٹھہر کر کہا "جاؤ تم سو رہو" میں نے کچھ تامل کیا تو پھر یہی کہا کہ "جاؤ اندر جاؤ" اور پھر اس لہجہ میں کہا کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں تیز نہ ہو جائیں۔ میں بادل ناخواستہ اُٹھی اور اُٹھتے اُٹھتے ایک کشش سے مجبوراً ان کا ہاتھ پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے ان کی ہتھیلی کو دابتی رہی اور چوم کر بے اختیار آنسوؤں سے تر کرتی رہی کہ اُنہوں نے پھر کہا "اب جاؤ" میں سیدھی چلی آئی اور دیر تک خوشگوار خیالات میں محو رہی۔ پھر سو گئی +

دوسرے روز صبح کو میرے اوپر خاص عنایت یہ ہوئی کہ باہر جو پاندان رہتا تھا وہ اندر میرے پاس بھجوا دیا گیا۔ قمیص میں بٹن ٹانکنے کو بھجوائے گئے۔ گو خود نہ آئے کیونکہ عادت ہی باہر رہنے کی پڑی ہوئی تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ آج تو بالکل بشاش ہیں +

رات کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے اور میں سو رہی تھی کہ دروازہ پر زور زور سے کسی کے ہاتھ مارنے کی آواز سنی۔ میں ایکدم سے چونک پڑی۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ یہ دروازہ تو [illegible] بھر کھلا رہتا ہے۔ کس نے بند کیا۔ ایک دم سے میں چونک کر اُٹھنے کو ہوئی کہ [illegible] کو جگاؤں کہ ایک دم سے برابر والے پلنگ پر سے آواز آئی "پڑے رہو۔ رہنے دو"۔ میں نے جلدی میں دیکھا بھی نہ تھا کہ کون بیٹھا ہوا ہے۔ میں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہا کہ آپ کھڑے پلنگ پر نہ بیٹھیں۔

اس کے جواب میں انہوں نے خاموشی کا اشارہ کیا کہ فوراً ہی پھر دروازہ پر کسی نے ہاتھ مارا اور زنانی آواز میں پکارا "کھولو" یہ واقعہ تھا کہ وہ رنڈی آئی ہوئی تھی اور اب یہ خود خفا ہو کر اندر دروازہ بند کر کے آ بیٹھے تھے۔ میں بلکو چکی گھڑی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں پھر دروازہ پر بڑے زور زور سے اُس نے ہاتھ مارا اور چلائی تو میں نے دبی آواز سے کہا "خدا کے واسطے آپ چلے جایئے ورنہ . . . . .

"چپ رہو" انہوں نے مجھ سے ڈانٹ کر کہا اور سیدھے دروازہ پر جا کر زور سے کہا "نکل جا چڑیل تو میرے یہاں سے ورنہ پولیس میں دیدونگا" ساتھ ہی نوکر کو اندر ہی سے آواز دے کر کہا کہ اسے جاری نکالیہ۔ نوکر نے تھوڑی دیر بعد آ کر کہا کہ وہ نہیں جاتیں اور یہیں سو رہی ہیں۔ "مرنے دو حرامزادی کو" یہ کہہ کر چلے آئے ✦

جب ذرا طبیعت سکون پر آئی تو میں نے اصرار کر کے پلنگ پر لٹایا اور گرمی تھی لہذا پنکھا جھلنے لگی۔ پانی مانگا تو اتفاق سے برف موجود تھی۔ میں نے شربت کیوڑہ کا گلاس بنا کر پلایا اور اسی طرح پھر پنکھا جھلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں طبیعت بالکل درست ہو گئی۔ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ایکدم سے ہاتھ اٹھا کر پنکھا روکا اور مجھ سے بہت محبت سے کہا "یہاں بیٹھ جاؤ" میں پٹی پر بیٹھ گئی اور پنکھا جھلنے لگی۔ میرے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر اٹھ بیٹھے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا "بیوی" میں اسی طرح دیکھ رہی تھی۔ مگر میری عجیب ہی حالت تھی کہ پھر کہا "بیوی میں نے جو کچھ بھی تمہارے اوپر ظلم کئے ہیں۔ معاف کر دو" ✦

میرے اوپر ایک بجلی سی گری۔ ایک چیخ میرے منہ سے بے ساختہ نکلی اور میں بیہوش ہو کر گر پڑی ✦

ہوش جو آیا تو دیکھا کہ وہی ظالم میاں جو کبھی خود مجھ سے پنکھا نہ جھلواتے تھے آج خود مجھے پنکھا جھل رہے ہیں۔ میں نے کمزور ہاتھوں سے روکنا چاہا مگر مگر میرے اوپر وہ رقت طاری تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید مر جاؤنگی ✦

(۸)

صبح ہونے سے پہلے ہی وہ نامراد رنڈی سونے کی گھڑی اور کچھ روپے جیب سے نکالکر بھاگ گئی۔ اُس نے بعد میں لاکھ لاکھ کوشش کی مگر بیکار۔ اُس سے ملنے تک کے روادار نہ تھے۔ دنیا میں اگر کوئی ہمدم اور جلیس تھی تو میں۔ پھر کبھی اس تاریخ سے نہ تو انہوں نے اپنے پرانے بدمعاش دوستوں سے ملاقات کی اور نہ ہی کسی رنڈی سے ✦

خواہ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو عقیدہ ہے کہ ذرا سے بہانہ پر میاں نے جو اپنی داشتہ عورت کو چھوڑ دیا تو محض اس وجہ سے کہ چھوڑنے سے پہلے میں نے ان کے دل میں گھر کر لیا۔ اُن کے سامنے دو عورتیں تھیں جو بالکل مختلف تھیں اور اس سے پیشتر اُن کے سامنے صرف ایک ہی فاحشہ عورت تھی۔ میرے علم میں ایک دو نہیں بلکہ دس پانچ ایسی ہیں جنہوں نے سندی میاں کا بازاری اور داشتہ عورتوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایسی عورتوں کو زہر دیا۔ نتیجہ خود ظاہر ہے خواہ مخواہ خاوند کو اُس عورت سے زیادہ اُلفت ہو جاتی ہے جو نام نہاد محبت کے پیچھے زہر کا یا دوسری سختیوں کا شکار بنتی ہے۔ میاں دل میں سوچتا ہے کہ یہ میری محبت میں ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا رہی ہے۔ حتیٰ کہ زہر تک اُسے دیا گیا ہے۔ لہذا یہی قابل پرستش ہے ✦

(خاص)

مرزا عظیم بیگ

S.R

جھوٹ کی خوبیاں

نفسیاتِ دروغگوئی پر مزاحیہ محاکمہ

جناب مفتی غلام جعفر صاحب۔ بی۔ اے۔ اخبار نویس

یوں تو دنیائے معاشرت میں۔ اطوارِ خوب و خوش اسلوب بہت ہیں۔ مگر جو دلفریبی اور جاذبیت ہم نے دروغگوئی میں دیکھی اور کسی طریق احسن میں نہ پائی کارآمد ہے۔ خوشنما ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سہل العمل بھی ہے +

دروغگوئی کی نوعیت

پھر اس کی نوعیت ملاحظہ ہو۔ مدارج اور اقسام پر نظر ڈالیں اور باریک بینی سے کام لیں۔ تو کیسے کیسے نفیس اور مرغوب تصورات ذہن میں آتے ہیں۔ دیکھئے جھوٹ کیا ہے؟ دوسرا نام ہے۔ بہانہ بازی کا۔ حیلہ تراشی کا۔ ٹال مٹول کا بناوٹ۔ مبالغہ۔ ظاہرداری اور "مصالحانہ" ریاکاری۔ یہ بھی جھوٹ میں شامل ہیں۔ دروغ بےفروغ میں داخل ہیں۔ پھر بیانات کو خیال کیجئے جو اکثر پیش کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں تفصیل سے پرہیز۔ تکمیل سے گریز۔ اور اجمال کے نام سے آدھے پونے واقعات کے اظہار پر اکتفا۔ اسے بھی جھوٹ کا جزو لاینفک سمجھئے۔ اور۔ ہاں ملکی معاملات میں تدبر جھوٹ کی اہم ترین شاخ ہے۔ یہ نہ ہو تو دنیا کی اقوام کا ملکی نظام درہم برہم ہو جائے۔ نیز وہ فراست اور وہ حکمت جس میں دو حصے جھوٹ اور ایک حصہ سچ کا ہوتا ہے اور جس کے بغیر احمقوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے چارۂ کار ہی نہیں +

قدرتی اور اکتسابی دروغ گوئی

انسانی طبیعت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ خوش قسمتوں کو قدرت سے ودیعت ہوئی ہے۔ مگر جو آپ کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ تو اکتساب سے بھی اس کا امکان ہے۔ ہاں کوشش و کاہش درکار ہے۔ پس آج ہی آغاز کر دیجئے انجام بخیر ہوگا۔ قصہ گوئی۔ افسانہ نویسی۔ ناٹک نگاری۔ شعر و شاعری یعنی فی الجملہ ادبیات۔ اس کا رنگ ہی بےرنگ ہو جائے۔ اگر آپ تھوڑے یا بہت یعنی حسب ضرورت جھوٹ سے کام نہ نکالیں۔ اوسط درجہ کے دل و دماغ کے آدمی کو چاہیئے کہ نہ صرف الفاظ۔ بلکہ خیالات میں بھی دروغ کا دامن نہ چھوڑے۔ اور اس میں یکسوئی اور تن دہی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ کیونکہ وہ جو اوسط سے اوپر ہیں۔ وہ قدرتاً اور بلا خاص کوشش کے اس معاملہ میں کام کے دھنی اور کاوش سے مستغنی نظر آتے ہیں +

زندگی کی دلفریبیاں

حیات روزمرہ کے تختۂ ناٹک پر جتنے کھیل یوماً فیوماً کھیلے جاتے ہیں۔ یہ اتنے جاذبِ طبع۔ اتنے مسرت بیز نہ ہوتے جتنے کہ ہیں۔ اگر جھوٹ کی تار پر سٹیج کی پتلیاں نہ ناچیں +

عشق و تعشق۔ عیش و عشرت۔ یاروں کی یاری۔ بلکہ دشمنوں کی دشمنی بھی۔ اور بندہ پرور! درس و تدریس کی نکتہ آفرینی تک۔ یہ سب کی سب چیزیں جھوٹ کے بغیر بیکار۔ دروغ سے علیحدہ رہ کر اپنے آپ سے ہی بر سر پیکار +

جھوٹ نہ ہو تو حکومتوں کی مشاورتی مجلسوں کا شیرازہ بکھر جائے۔ کوئی منصفانہ قانون بلکہ نامنصفانہ قاعدہ بھی رواج نہ پائے۔ رعایا راعی کے سر آئے اور راعی کے منصوبے خاک میں مل جائیں اور وہ منہ کی کھائے +

جھوٹ کی عالمگیری

دروغ کو فروغ نہ ہو تو عدالتوں میں اُلّو بولے۔ حکام کرسیوں پر بیٹھے مکھیاں مارا کریں۔ تجارت کی کساد بازاری ہو۔ گاہکوں کے انحطاط کا یہ حال ہو کہ دوکاندار صبح سویرے ہی دوکان بڑھائیں۔ روپیہ کی منڈی سونی ہو جائے۔ قرضدار دوڑتے ہوئے آئیں کہ قرض چکائیں۔ پھر ساہوکار روپیہ واپس لینے سے کانوں پر ہاتھ دھریں۔ ماں باپ اور اُستادوں کا رعب خاک میں مل جائے اور عشق عاشقی کا گلزار پُرخار ہو جائے +

امریکہ کی مثال

امریکہ میں امتناعِ شراب کا قانون کتابِ قانون میں کامل ہے۔ مگر کتاب کے اوراق کے باہر دیکھئے تو زاہدوں کی پگڑیاں نہیں حضرت ٹوپیاں۔ برابر اُچھلتی نظر آتی ہیں۔ رندانِ بادہ خوار دن دہاڑے بوتلوں پر بوتلیں لنڈھاتے ہیں۔ بھلا مغربی پیاسے اور "شربت آتشیں" سے شاد کام نہ ہوں؟ ناممکن۔ وہاں وسائل مسرت میں سب سے اونچا مرتبہ دختِ رز نے پایا ہے۔ چنانچہ بڑے اور چھوٹے جھوٹ کا قانونِ امتناع طمانچۂ بے عملی پر بھرا ہے۔ اور مے پرستوں کا طوطی بولتا ہے۔ غرض جتنا فروغ دروغ نے یہاں پایا۔ دنیا بھر میں کہیں اور کبھی نظر نہ آیا۔ گر عیب کردن راہنرے باید۔ اس لئے دیکھئے کہ امریکہ والوں نے اس باب میں بےمثال کمال کیا۔ کثرت رائے سے قانون بنایا اور کثرتِ عمل سے یوں اُس کے پرخچے اُڑائے کہ واہ جی وا +

امن عالم

"جمعیت الاقوام" کہتی ہے کہ جنگ سے ہاتھ اُٹھاؤ۔ اگر ہوس است ایں قدر بس است۔ مگر اسلحۂ جنگ کی تیاری سپاہ کی تنظیم اپنی تگ و دو نہیں روکتی۔ امن کے لئے زبانی جمع خرچ جتنا کہئے اور جتنا مانگئے موجود۔ مگر عمل کی جگہ اللہ کا نام یہ سب جھوٹ کی کرشمہ سازیاں ہیں +

دنیائے خیال

تخلیق شعر۔ آفرینشِ ادبیات۔ اس مرکب کو اگر کوئی چیز تازیانہ لگاتی اور آسمانوں تک دوڑاتی ہے تو وہ کیا ہے؟ یہی جھوٹ +

مصنفوں کے۔ مصوّروں کے۔ شاعروں کے شاہکار۔ ان کا وجود عرصۂ شہود میں کیونکر آتا۔ اگر دروغ ان کے قلم اور موئے قلم کا قائد نہ بنتا +

دماغی نشو ونما

کہتے ہیں کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" یہ بالکل غیر صحیح۔ قطعاً نادرست۔ ع "الغلط جھوٹ دعویٰ باطل"۔ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ سے بڑھ کر کوئی شے حافظہ کو قوت نہیں بخشتی۔ کوئی چیز یادداشت کو کثرتِ مشق سے تربیت دے تا دیب کا کامل نمونہ نہیں بناتی۔ ثبوت اس ادّعا کا ظاہر ہے۔ اگر آدمی ایک مرتبہ جھوٹ بولتا ہے تو اُس کی صحت اور صفائی کو کامل کرنے اُسے صدق و صفا کی رونق دینے کے لئے ایک جھوٹ اور بولتا ہے۔ پھر جب اسے مکتفی نہیں پاتا تو اس میں مزید اضافہ کرنے کے لئے ذہن لڑاتا ہے۔ اور اگر صاحبِ دانش ہے تو کامیاب ہوتا ہے۔ اس طرح اُس کا ذہن جدّت کی تخلیق سے قوّت پاتا ہے۔ اور یادداشت کی طاقت مشق کی کثرت سے قوی تر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ذہنیت بجائے خود بدل جاتی ہے۔ اور تخلیق دروغ کا عمل نہ صرف آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ قدرتاً ہونے لگتا ہے۔ دماغ ایک چقماق بن جاتا ہے۔ کہ بلا کوشش اور بغیر کاوش کے۔ جھوٹ اُڑ اُڑ کر آتا اور چقماق سے چھٹتا ہے +

جنابِ سعدی کا نظریہ

چچا سعدی رح یوں تو حکمت و موعظت کے سینکڑوں ہزاروں نکتوں کی وراثت ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ مگر اہم ترین اور بہترین دانشمندی اُس فقرہ میں بند کر گئے جسے آنکھوں سے لگائیے اور دل میں جگہ دیجئے یعنی "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز"۔ واقعی جس سچائی سے آدمی آدمی کا دشمن بنے کیوں نہ اُس جھوٹ کے سامنے ماند ہو جائے۔ جس جھوٹ سے کہ دوستی کا پہلو نکلے۔ تو بس لیجئے۔ انتہا ہو گئی۔ سعدی سے بڑھ کر ہم کس سرچشمۂ بینش سے سند لاتے۔

ضرورت آگہی

حقائقِ حیات بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ "آدھی دنیا (یعنی طائفہ خوشحالاں) کو یہ خبر نہیں کہ دوسری آدھی دنیا (یعنی گروہ ناداراں) کیسے زندگی بسر کرتی ہے۔ کیونکر قوت لایموت حاصل کرتی ہے۔ کن مشقتوں اور مصیبتوں کو برداشت کرتی ہے"۔ مطلب اُن کا اس سے یہ ہے کہ بے خبروں کو خبردار ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے ہم جنسوں سے ہمدردی کر سکیں اور اُن کی طرف دستگیری کا ہاتھ بڑھائیں۔ ہم کہیں گے کہ فی الواقع یہ بڑا مستحسن رویۂ حیات ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونا شان شرافت۔ مگر اس سے اہم تر حقیقت یہ ہے کہ "آدھی دنیا کو یہ آگاہی نہیں۔ کہ دوسری آدھی دنیا کس قسم کی دروغ گوئی کو شعار بنائے ہوئے ہے"۔ گویا اگر اس بات کا علم حاصل ہو جائے۔ اس نادانی کے بجائے "دانائی" کی راہ نکل آئے اور اس طرح لوگ جہالت (یعنی دوسروں کے دروغ کے متعلق جہالت) اور اُس کے منطقی نتیجہ تعصب پر غالب آ جائیں تو دنیا کا سیاسی اور اقتصادی ہیجان ایک بہت بڑی حد تک دور ہو جائے۔ مثلاً۔

قضیۂ ہند

دور ہی کیوں جائیے۔ اسی کشمکش و کشاکش بین البرطانیہ والھند پر ہی نظر ڈالئے۔ اک سیدھی بات ہے کہ اگر کانگریسیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ حکومت برطانیہ کتنا جھوٹ اور کتنا سچ بول رہی ہے یعنی یہ پتہ لگ جائے کہ فریق غالب یعنی انگریز کس حد تک مراعات دینے یا یوں کہئے کہ ہار ماننے کو تیار ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اور بدرجہ آخر کس قدر حصہ دولتِ سیاسی اور دولتِ اقتصادی کا ہندیوں کو

دے ڈالنے پر آمادہ ہیں۔ اس باب میں اُن کے دل کا عندیہ کیا ہے۔ اور اگر "تنگ آمد بجنگ آمد" کا موقع ہی آن پڑے تو اُن کا تہیّہ کس قدر اکڑ فوں دکھانے اور ہٹ دھرمی پر کاربند رہنے کا ہے۔ اور نیز برطانویوں کو بھی آگاہی حاصل ہو جائے کہ کانگریسی "دامے۔ قدمے۔ سخنے" کس حد تک ایثار کے لئے تیار ہیں اور زبانی دعووں سے قطع نظر پس پردہ کس قدر توفیق عمل رکھتے ہیں۔ کہاں تک بھارت ماتا پر "تن، من، دھن" نچھاور کرنے کے زور بل کے اہل ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گو مانگنے کو "ساری" مانگتے ہیں۔ مگر دراصل "آدھی" پر ہی قانع ہونے اور اسی کے پانے پر خوشی کے شادیانے بجانے اور اسی کو غنیمت سمجھنے کے لئے بھی برطانیہ کی طرف سر کے بل دوڑنے اور دونوں بازوؤں سے اُس کو آغوشِ شوق میں لینے کے لئے راضی ہیں۔ غرض اگر فریقِ غالب برطانیہ اور فریقِ مغلوب ہند دونوں پر ایک دوسرے کا جھوٹ واضح ہو جائے تو دیکھئے کہ چٹکی بجاتے میں یہ سارا دھندا مٹ جائے۔ یہ تمام تنازع تمت بالخیر کے ہمکنار ہو جائے +

جھوٹ بولو اور بولنے دو

دنیا میں ہم آپ سبھی یہ بات سنتے آئے ہیں کہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" یعنی "مرنجان مرنج" ہونے کی اہلیت حاصل کرو۔ یہ بھی ایک حکمتِ خوب ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر اور اہم تر جو نکتہ ہے اور مسرّت و شادمانی کا نسخہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ "خود جھوٹ بولو اور دوسروں کو بولنے دو"۔ چنانچہ اس پر عمل نہ کرنے سے ہی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ دشمنی رونما ہوتی ہے۔ دیکھئے اور غور کیجئے۔ اور نکتہ رس اور منصف مزاج تو یہاں تک کہہ ڈالیں گے کہ گریبان میں منہ ڈالیئے اور چلئے انصاف آپ کے ہی ہاتھ دیا جاتا ہے۔ کہ فیصلہ کیجئے اور بتایئے کہ آپ کو یہ حق کس طرح پہنچتا ہے کہ آپ خود تو دروغ کا شعار اختیار کئے رکھیں لیکن اپنے ہمسائے کے جھوٹ پر خفا ہو جائیں۔ نہیں۔ بندہ نواز! نہیں۔ اس دنیا میں جب تک وہ دونوں اعمال یعنی "دینا" اور "لینا" ہمراہِ کار نہ ہوں گے۔ کام نہ چلیگا۔ پس "جھوٹ بولئے اور ضرور بولئے۔ اس میں ہرگز خطا نہ کیجئے۔ مگر دوسروں کو بھی بولنے دیجئے"+

اقسام دروغگوئی

عام طور پر ہم جھوٹ کو چار اقسام میں منقسم کر سکتے ہیں یعنی

(۱) معاشرتی دروغگوئی +

(۲) کاروباری دروغگوئی +

(۳) خانگی دروغگوئی۔ اور

(۴) علمی اور ادبی دروغگوئی +

یہ جو آخری قسم کی دروغگوئی ہے۔ اس کے متعلق اسی موقع پر ہم تبصرہ کئے دیتے ہیں۔ کہ یہ احسن ترین دروغ گوئی ہے۔ وجہ یہ کہ جس طرح انسان کو نیکی محض نیکی کی خاطر کرنی چاہئے اور کسی معاوضہ ایں آنجہانی اور حتیٰ کہ آنجہانی کی بھی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ نیز جس طرح علم کی تحصیل علم کی خاطر ہونی چاہئے۔ نہ کہ طلبِ شہرت اور طلبِ زر کے لئے۔ اسی طرح علمی اور ادبی دروغگوئی خود اسکی خاطر عمل میں لانی چاہئے۔ پس جہاں آپ علم اور نیکی کو کسی مقصود کے حصول کا وسیلہ نہ بنائیں۔ بلکہ انہیں بجائے خود مقصود ٹھہرائیں۔ وہاں علمی اور ادبی دروغگوئی کو بھی اسی قبیل سے سمجھیں +

آیئے اب باقی سہ گانہ دروغ گوئیوں پر غور کریں +

فہم و فراست کا معیار

معاشرتی دروغ گوئی کی بہترین مثال یہ ہے۔ کہ آدمی فہم و فراست کو آلۂ کار بنائے اور آدھے سچ نے جھوٹ کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دے۔ پھر دونوں کو اس خوبصورتی سے زندگی کے دنگل یعنی کوشش کے اکھاڑے میں لائے۔ کہ کامرانی سے ہمکنار ہو جائے۔ فہم و فراست نام ہے اُس قوّت کا جو آدمی کو یہ اصول متعارفہ سکھاتی ہے کہ سو فیصدی سچ تو بہرحال بیکار ہے۔ اور خوبی ہے تو اس میں کہ آدمی انتہائی باریک بینی سے یہ نازک فیصلہ کر سکے کہ سو میں سے کتنے فی صدی جھوٹ لازم و لابد ہے۔ اور کتنے فیصدی غیر ضروری بلکہ ضرر رساں۔ اس فہم و فراست کو معاملات ملکی میں "تدبّر" کہتے ہیں +

محبّت اور مبالغہ

عشق و محبّت کی دنیا میں اقرارِ وفا اور اظہارِ شوق۔ اور آمادگی ایثار۔ ظاہر ہے کہ محب جب محبوب کو قبضہ میں لانے اُس کی محبّت پہ قابو پانے میں منہمک ہوتا ہے تو جتنے ادعا کرتا ہے۔ وہ سب کے سب سو فیصدی صحیح نہیں ہوتے۔ گو چونکہ وہ صاحب فہم و فراست ہوتا ہے۔ اس لئے جانتا ہے کہ معرکۂ محبّت میں ہر ہتھیار کا استعمال عین جائز بلکہ فرضِ عین ہے۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ سچ کے مدعی اُسے کیا کہیں گے۔ اُسے تو ایک جنگ کرنا اور کامیاب ہونا مدنظر ہوتا ہے پس وہ کامل راستی کی حماقت کے دام تزویر میں نہیں پھنسا۔ اور نزدیک سے نزدیک راہ (یعنی مناسب جھوٹ کی راہ) پر گام فرسائی کرتے ہوئے جلد سے جلد منزل کو جالیتا ہے +

ناخن بر جگر

معاشرتی دروغگوئی کے سلسلہ میں آپ یہ فراموش نہ کریں کہ شاید ایک دوست نے آپ کو کھانے کی دعوت دی ہے۔ کھانا بے مزہ ہے اور ٹھنڈا۔ مگر کیا آپ احمق نہ ہوں گے۔ اگر آپ میزبان یا میزبانہ کے منہ پر حرف شکایت زبان پر لائیں نہیں نہیں۔ آپ یقیناً ایک دانشمند انسان ہیں پس آپ کھانے کی تعریف کریں گے۔ اور اس میں مبالغہ سے بھی کام لیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بار بار بلائے جائیں گے۔ اور آئندہ پر تکلف اور لذیذ کھانا پائیں گے۔

کیونکہ بات یہ ہے کہ آپ کے میزبان صاحب بیوقوف نہیں۔ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ اس شام کا کھانا اچھا نہ تھا۔ اور آئندہ اسکی تلافی کرنے کا بھی ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن بیچارے آخر انسان ہیں۔ اس لئے پسند نہیں کرسکتے کہ اُن کے کھانے کی مذمت کی جائے۔ اور آپ کی دوستی ان کو دل سے بھائی اگر آپ سچ بولتے تو آپ کے الفاظ "ناخن بر جگر" ہوتے +

اقتصادی دنیا میں جھوٹ کی ضرورت

کاروباری دروغ گوئی کے انحطاط نے اکثر اوقات راستی پسند کو دیوالیہ بنایا۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ سو فیصدی دروغگوئی کو ہم آپ اپنا شعار بنائیں نہیں۔ صرف ضروری دروغ گوئی کافی ہوگی۔ اخباروں میں اشتہاروں پر نظر دوڑائیے۔ کوئی عقلمند پڑھنے والا۔ اور چیزیں خریدنے کا ارادہ کرنے والا مشتہر کے تمام بیانات کو باور نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ مشتہر کو اپنا مال فروخت کرنا ہے۔ اور اس لئے قدرتاً کچھ نہ کچھ جھوٹ ضرور بولا ہوگا۔ پھر وہ چیزوں کی قیمتوں پر غور کرتا اور فوراً سمجھ لیتا ہے کہ اُسے کیسے مال کی توقع رکھنی چاہئے جس کی اتنی اور اتنی قیمت کا مطالبہ کیا جا رہا ہے +

زن و شوہر

خانگی دروغ گوئی سے اہم تر کوئی دروغگوئی نہیں ہے۔ وہ خاوند اور بالخصوص نوگرفتار خانہ داری کسقدر بیگانۂ دانش ہوگا۔ جو گاہے گاہے اپنی بیوی کو محبوبہ کے لقب سے نہیں پکارتا اور حسب ضرورت اُس کے حسن و جمال اور سگھڑاپے اور سلیقے کی تعریف نہیں کرتا۔ اور وہ بیوی بھی کیسی دانا و کاروان قرار پاتی ہے جو اپنے ہیلوٹے بیٹے کے مزاج کی اور جسمانی خوبیوں کو اُس کے باپ سے پائی ہوئی وراثت نہیں بتاتی۔ حالانکہ اپنے دل میں کامل تیقن رکھتی ہے کہ بچے نے خوبیاں اور خوبصورتیاں تو سب کی سب مجھ سے پائی ہیں اور طرز بیان البتہ تمام و کمال جناب والد ماجد سے۔ یہ خاتون خوب سمجھتی ہے۔ اور یہ اُس کے صنف نازک اُس کی نوع لطیف کا طغرائے امتیاز ہے کہ حسب ضرورت دل کھول کر جھوٹ بولے۔ اور اس کے خلاف صنف وحشی کا یہ حال ہے کہ چاہت کی بازی میں اکثر ہارتا ہی رہتا ہے۔ وجہ یہ کہ دروغگوئی کی قابلیت اُس میں نسبتاً بہت کم بلکہ بہت ہی کم ہے

صداقتِ تلخ

الغرض کبھی نہ بھولئے گا کہ سچ بڑی کڑوی شے ہے۔ اس سے جہاں تک ممکن ہو پرہیز کریں۔ دیکھئے اگر مٹھائی کھلانے سے کوئی مرنے کو تیار ہو تو اسے تلخ زہر کھلانا کیا ضرور اور آخری بات یہ ہے کہ "عیب کردن ہنرے باید" یعنی اگر آپ سچ بولنے کے عیب کے ایسے ہی دلدادہ ہیں تو اسکے لئے بھی دروغگوئی کے ہنر کی ضرورت ہوگی پس اپنے دل و دماغ کی دنیا میں دروغ کو فروغ دیجئے

غلام جعفر بی اے

(خاص)

نیرنگ خیال۔ مئی ۱۹۳۱ء

شیطان

ایک افسانہ

(میرا چھٹا سفر)

"سیّاح عورت" کی زندگی کا اک واقعہ

محترمہ مس حجاب امتیاز کے قلم سے

۱۹۲۵ء کے موسم بہار میں جب میں بصرہ سے مکتوری آئی تو میں نے اپنی دوست خاتون جسوتی کو اعصابی کمزوری اور دماغی بیماری میں مبتلا پایا +

میں نے اپنے طبی مشیر کرنل وانس آئی۔ ایم۔ ایس سے ان کا معائنہ کرایا تو کرنل نے تبدیل آب و ہوا کی ضرورت بتائی۔ ساتھ ہی ایک پرفضا مقام کیباس کا نام بھی لے لیا جو مکتوری سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے +

لوگ کیباس کو ندی کے راستے سے جاتے ہیں۔ عموماً ادھر کے باشندے کشتی یا بجرے کے سفر کے شوقین بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ موٹر بھی جا سکتی ہے مگر پتھریلے راستوں اور ناہموار سڑکوں پر موٹر کے ٹائر خراب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ کشتی پر وہاں جسوتی کو لیجاؤں۔

خانساماں سے دریافت کرنے پر ہمیں معلوم ہوا تھا کہ کیباس ایک تفریح گاہ ہے۔ جہاں سرخ گلاب اور شاہ بلوط کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ وہاں جانے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اس سرزمین گلاب کا ذکر سنکر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ عورت سے نہ رہا گیا۔ اور جانے کا مصمم ارادہ کر لیا +

ہم نے یہ بھی سن لیا تھا کہ وہاں کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں ہے۔ اور کرائے کے مکانات بھی بمشکل ملتے ہیں۔ مگر گاؤں سے کسی قدر فاصلے پر اک پرانی عمارت خالی ہے۔ جو برسوں سے آسیب زدہ ہونے کے سبب غیر آباد پڑی ہے۔ البتہ یہ عمارت ہم کو مل سکتی ہے +

رات کے کھانے پر میں نے جسوتی سے کہا: "تم پرسوں صبح تک تیار ہو سکو گی؟ ہم کیباس جائیں گے"+

"اور قیام کہاں کریں گے؟" اس نے مچھلی کی چھری رکابی میں رکھتے ہوئے کہا +

میں نے کسیقدر تامل کے بعد کہا "پیاری جسوتی! تمہیں اعتراض نہ ہو تو اسی عمارت میں"+

"مجھے اعتراض ہے! میں ہرگز نہ چلونگی"۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا کیونکہ ان دنوں اسے درد سر کے دورے پڑتے تھے +

"کیوں؟ تمہیں اعتراض کیوں ہے؟" میں نے سوال کیا +

"کیوں کیا؟ میں نے اس عمارت کے متعلق عجیب وحشت ناک خبریں سنی ہیں اور پڑھی بھی ہیں"+

میں مسکرا کر بولی "پڑھی بھی ہیں! تعجب! ایسا کونسا فالتو اور واہیات اخبار ہو گا جسمیں شیطان کے جدید کارناموں کے متعلق خبریں چھپتی ہونگی!"

جسوتی چڑ گئی "تم کو ہنسی مذاق سوجھتا ہے! اچھی بات ہے شگفتہ خاطر رہو۔ مگر کسی کی ذاتی رائے یا خیال کو ہنسی میں اڑانا اچھی عادت نہیں"+

"میں تم سے معافی چاہتی ہوں"۔ میں نے لجاجت سے کہا +

جسوتی ہنسنے لگی "نہیں اس کی ضرورت نہیں! میں خفا نہیں ہوئی تھی۔ مگر روحی! [روحی میرا افسانوی نام] مجھے تمہاری اور اپنی زندگی پیاری ہے! اس لئے وہاں تمہیں ہرگز نہ جانے دونگی"+

مجھے بہت ہنسی آئی۔ میں نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا "دیوانی لڑکی! تم ہمیشہ کی بھولی بھالی ہو! پیاری جسوتی! اپنا چہرہ تو دیکھو! کیسا مرجھا گیا اور

نذر ہو گیا ہے! تمہاری صحت بگڑ رہی ہے! تم مالک نہ کرے صاحب فراش ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں ضرور وہاں لے جاؤں گی۔

"مگر روحی" اُس نے اپنی باریک آواز میں کہا "کیبا س جانا کیا ضرور ہے؟ کیا صحت کے لئے ہم کہیں اور نہیں جاسکتے؟

"ضرور ——— کیوں نہیں جاسکتے؟ مگر جسونتی! تم جانتی ہو کہ مجھ خواب و افسانے کی شیدائی روح کو سیر و سیاحت سے بہت دلچسپی ہے"

"خدا کی پناہ! ——— جانے تمہارا یہ شوق آئندہ چل کر کیا گل کھلائیگا! ایک دفعہ تو تم نے اسی شوق میں اپنے ساتھ مجھے بھی "جنگلی قوم" کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا تھا"

میں نے کانٹا اور چھری جوڑ کر رکابی میں رکھدی اور ہنسکر شگفتہ لہجے میں کہنے لگی:- "وہ میرا دوسرا سفر تھا! اس لئے نا تجربہ کار تھی۔ جسونتی! میں نے اس خوفناک واقعہ کا ذکر اپنے سیاحت نامے "سیاح عورت" میں بڑے پر لطف انداز میں کیا ہے۔ "بلوچی" کے عنوان سے یہ حالات قلمبند کئے ہیں۔ سچ پوچھو تو سیاحت نامے کے ایسے ہی باب سیاحوں کی زندگی کو بجائے خود ایک دلچسپ اور عجیب افسانہ بنا دیتے ہیں! مجھے افسانے کی سی زندگی بہت پسند آتی ہے۔

جسونتی نے اپنی سیاہ چمکیلی آنکھیں حیرت سے تھوڑی دیر کے لئے بند کرلیں۔ پھر بولی "روحی میں باز آئی ایسے افسانوں سے! مجھے تو اب سیر و سیاحت سے وحشت ہونے لگی ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ بغداد واپس جاؤں۔ حرم سرا کی اونچی اونچی دیواروں کی محفوظ فضا کی زندگی مجھے یاد آرہی ہے!"

"مگر مجھے ان دیواروں سے نفرت ہے۔ یہ اونچی اونچی دیواریں ہماری پیدائشی آزادی کو غصب کر دیتی ہیں! میں نے جواب دیا۔

"حیرت ہے! تمہارا ایسا خیال ہے؟ روحی! پھولدار اور مخملی قالینوں پر بیٹھے ہوئے کبھی شطرنج کھیلنا، کبھی نماز پڑھنا کسقدر دلچسپ اور پر لطف مشاغل ہیں! ——— ہائیں! تم نے اپنا کھانا ختم کر دیا باتوں باتوں میں!"

"ہاں شکریہ جسونتی! میں نے کھانا ختم کر دیا۔ ٹھیک ہے! حرم سرا کی چار دیواری میں پھولدار قالینوں پر بیٹھے شطرنج کھیلنا۔ اور قہوے کی پیالیاں خالی کرنا اگرچہ بہت پر تکلف ہے۔ اور سیاہ باریک جالی کے نقاب سے چہرہ چھپائے سرخ گلاب اور تیز بو چنبیلی کی کلیاں بھی توڑنا بہت ہی سرور آگیں زندگی ہے۔ مگر جسونتی! مشاہدات عالم اور تجربات زندگی اور آفتاب کی زرد و چمکیلی کرنوں سے بالکل بیگانہ رہنا میرے خیال میں بڑی بد نصیبی ہے!"

جسونتی ہنسکر کہنے لگی "جیسی تمہاری مرضی! تمہاری یہی خواہش ہے تو میں انکار نہیں کر سکتی! تمہاری خواہش یہی ہے تو چلو کیبا س چلیں! مگر مجھے تو زندہ رہنے کی اُمید نہیں! مجھے شیطانوں سے ڈر لگتا ہے۔

اتنے میں میری بوڑھی انّا زوناش ہاتھ میں بھُنے ہوئے گوشت کی رکابی لئے آگئی۔ اس حبشن نے بھی ساتھ چلنے سے حسب معمول انکار کر دیا۔

ہم نے کھانا ختم کر دیا تھا۔ جسونتی نے اپنا رومال لیونڈر میں بھگو کر سر پر لپیٹ لیا تھا۔ اور ایک کوچ پر نیم دراز تھی۔ میں دریچے کے آگے پتوں کی سُریلی سرسراہٹ کو سُن رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پریاں آپس میں ہنس بول رہی ہوں۔

اُس شب زوناش نے عمر خیام کے اشعار نہیں گائے بلکہ نہایت سہمی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی "خاتون! میں ہرگز نہ چلوں گی۔ میں ابھی تک پچھلے سفروں کا خیال کرکے لرزا کرتی ہوں"۔

میں مایوس اور رنجیدہ لہجے میں بولی "خیر! یہ راہ نہیں! خدا تم دونوں کو خوش رکھے مگر میں ضرور وہاں جاؤں گی۔ اور ایک دو ماہ وہاں ٹھیرونگی۔

یہ سُن کر جسونتی کو تعجب ہوا! مشرقی گرم ممالک کی آسیب پرست ہواؤں میں پلی ہوئی عورت اور شیطان سے اسقدر بیباک! تعجب!!

——— (۲) ———

تیسرے دن نور کے تڑکے ہم لوگ کشتی پر چلے گئے۔ ساتھ ہم نے زوناش حبشن کے علاوہ جسونتی کے محبوب خانہ زاد کریم کو بھی لے لیا تھا۔

موسم بہت اچھا تھا۔ ہوا خوشگوار اور سرد تھی اور آفتاب نیلے آسمان پر چمک رہا تھا۔ پانی کے سفر کے لئے ایسا موسم بہترین ہوتا ہے۔

مگر بوڑھی حبشن اس سفر سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھی۔ اُس کو سیر و سیاحت سے مطلقاً دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ گھر میں رہے اور عمر خیام کی رباعیات گایا کرے! اس وقت اُس نے ایک سرخ چادر اوڑھی تھی۔ اور کشتی کے پہلے سرے پر بیٹھی اپنی بگڑی ہوئی عربی میں ایک سُریلا مذہبی گیت گا رہی تھی۔ جو عموماً پانی کے راستوں پر اس لئے گایا جاتا ہے کہ اللہ ہماری کشتی کا نگہبان رہے اور ہم ڈوب کر نہ مریں! خانساماں کریم کشتی کے اوپر چڑھ بیٹھا تھا۔ میں بالکل درمیان میں ایک آرام کرسی پر لیٹی ہوئی آسکر وائلڈ کا ایک فسانہ پڑھ رہی تھی۔ اور ندی کی سبز اور نیلی لہروں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

مگر جسوتی پیشانی پر لیونڈر میں بھگویا ہوا رومال رکھ کر دریچے سے سر باہر نکال کر ملاحوں سے کیباس کے حالات دریافت کر رہی تھی +

"بھائی! تم اس مشہور عمارت کے متعلق کیا خیال رکھتے ہو؟" زوناش نے ایک ملاح سے دریافت کیا +

"کوئی اس عمارت میں نہیں جاتا! لوگ مر جاتے ہیں۔ ایک عجیب افسانہ بھی اس عمارت کے متعلق مشہور ہے" ملاح نے جواب دیا اور چپو چلانے لگا +

"وہ کیا افسانہ ہے؟" جسوتی نے مشتاقانہ لہجہ میں پوچھا +

یہ سن کر میں نے جسوتی کو آواز دی۔ "جسوتی ادھر آؤ۔ تم جاہلوں کی سی باتیں کرتی ہو! ایسے شیطانی اور خارج از تخیل افسانے سنو گی تو دیوانی روح! ڈر جاؤ گی" +

مگر جسوتی بدستور کشتی کی دریچی میں کھڑی حالات دریافت کرتی رہی میں اپنی کرسی سے اٹھی اور اس کے پاس آ کر کہنے لگی:۔ "اندر آ جاؤ۔ اس بیہودگی سے بہتر تو یہ ہے کہ تم دو پیالی چاء میرے اور اپنے لئے تیار کر دو" +

اس نے چاء تیار کی اور ہم دونوں نے پی +

(۳)

دن کے کوئی تین بجے ہم کیباس پہنچے +

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کیباس میں صرف تین موٹر کاریں تھیں۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور گاؤں کی پُر فضا اور خوشگوار کھیتوں ناہموار سڑکوں سے دھیرے دھیرے گذر کر کوئی ساڑھے تین بجے اس عمارت کی پھاٹک میں پہنچے +

دور سے ہم کو ایک پرانی سرخ اینٹ کی اونچی سی عمارت نظر آئی۔ جب آفتاب کی مدھم کرنیں اور بارش کے قطرے اس پر چمکتے تھے تو عجب ہولناک منظر ہوتا تھا۔ وہاں پہنچ کر کریم نے باغبان سے سنا کہ اس عمارت کے متعلق واقعی ایک ڈراؤنا افسانہ مشہور ہے +

"اور مالک مکان کون ہے؟" میں نے دریافت کیا +

"اب تو کوئی نہیں ہے! تین سال ہوئے مالک کا ہیضے سے انتقال ہو گیا تھا" باغبان نے کہا +

"اچھا! اور وہ افسانہ کیا ہے؟"

مگر اس نے واقعات بیان کرنے سے انکار کیا۔ اور ڈرنے لگا۔ وہ ایک سیاہ فام اور اونچی ٹھوڑی والا آدمی تھا۔ عموماً ایسے ہی لوگ توہم پرست ہوتے ہیں۔ کریم کی ڈیڑھ دو گھنٹہ کی مسلسل کوشش کے بعد اس نے قصہ بیان کرنا منظور کر لیا +

"یہ گھر سات سال سے غیر آباد پڑا ہے۔ اب اس کا مالک میں خود ہوں۔ کئی سال ہوئے یہاں بیس فوجی آئے تھے۔ مگر صبح کو ان سب کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ صرف تین اپنی جان بچا کر بھاگ سکے!

"مگر اس کی اصلیت کیا ہے۔ کس نے انہیں ہلاک کیا؟" کریم نے دریافت کیا +

باغبان کہنے لگا "مہینے کی آخری تاریخوں میں یہاں ایک کفن پوش روح آتی ہے۔ اس کے ساتھ دو اور کفن پوش ارواح ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک روح اس عمارت میں رہنے والوں سے خیرات مانگتی ہے۔ اور ان کی اکثر چیزیں غائب کر دیتی ہے۔ اگر اس وقت مدد دینے سے انکار کرتا ہے یا چور سمجھ کر پولیس کی امداد چاہتا ہے تو اس کی فوری موت واقع ہوتی ہے۔ گاؤں کے لوگ عموماً اسی لئے اس عمارت کی طرف رخ نہیں کرتے۔ لیکن سیاح لوگ اسمیں کبھی آ جایا کرتے ہیں!"

"عجیب بات ہے! میں نے کہا۔ اگرچہ یہ کہانی سن کر میری بھی روح لرز گئی۔ مگر بولی:۔ "خیر مضائقہ نہیں مہینے کی آخری تاریخوں میں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ کریم! دروازے کھول دو۔ فرش صاف کرو۔ اگر برقی چراغ کے بلب ٹوٹ گئے ہیں تو کہو۔ میں شہر کو تار دونگی" +

"بہت خوب"

زوناش اور کریم مکان کی صفائی اور آراستگی میں منہمک ہو گئے۔ یہ عمارت بہت اچھی جگہ تھی۔ سامنے ایک جھیل بہتی تھی۔ دونوں طرف کیلے اور امرود کے باغ تھے۔ دیودار کے درخت بھی بکثرت تھے۔ باغیچے میں مشرقی طرف انگور کی بیل تھی۔ سرخ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ چار فوارے تھے۔ جس پر خوبصورت کے بت استادہ تھے۔ خوشگوار اور تفریح بخش مناظر خوف کو کم کر دیتے ہیں۔ جسوتی کا بھی ڈر کم ہو گیا تھا +

شام کو تھوڑی دیر کے لئے نارنجی رنگ کا آفتاب اوپر نکل آیا۔ عمارت کا ایک بڑا حصہ صاف ہو چکا تھا۔ زوناش نے چاء بنائی۔ میں اور جسوتی چاء پی کر تھوڑی دیر کے لئے باغ میں گھومنے کے لئے نکل گئیں +

تھوڑی دیر میں آفتاب غروب ہو گیا۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی ہوائی اللہ

چیخیں مارنے لگے ۔ اور عجیب ہولناک خاموشی ہر طرف پھیل گئی ۔ لمبے لمبے کمرے اور دریچے کھلے ہوئے تھے ۔ ہم نے سر شام کے چراغ روشن کر دیئے ۔ مگر رات بھر مجھے شدت خوف سے نیند نہیں آئی ۔ جسوتی کے پلنگ کے قریب دریچے کے پاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کوچ پر پڑی رہی ۔ رات کے سناٹے میں جنگلی گرگٹ زور زور سے کود رہا تھا جس کی آواز کمرے میں آ رہی تھی ۔ میں بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی ۔ اور دریچے سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگتی کہ کہیں کوئی کفن پوش روح نہ آ رہی ہو ! لیکن مہینے کی آخری تاریکیاں ابھی دور تھیں ! وہاں تو صرف تاریکی میں گرگٹ کود رہا تھا ! اور کچھ نہ تھا !

(۴)

دوسرے دن جونہی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ زوناش ہاتھ میں زیتون کے تیل کا کٹورہ لئے پاشتی کھڑی کانپ رہی ہے ٭

"کیا ہے ؟ کیا ہوا ؟" کہتے ہوئے میں کاؤچ سے نیچے اتری ۔ وہ خوف سے لرز رہی تھی ۔ صرف اتنا کہہ سکی "اُف میرے خدا ــــــ !"

"کیا ہے زوناش ؟" میں نے چیخ کر پوچھا ٭

جسوتی ابھی تک سو رہی تھی ۔ آفتاب کی سنہری روشنی دریچے سے ہو کر اس پر پڑ رہی تھی ۔ میری چیخ پر دفعتاً وہ چونک پڑی اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا :-

"کیا بات ہے روحی ؟"

"میں خود نہیں جانتی جسوتی"

زوناش نے زیتون کے تیل کا پیالہ دریچے میں رکھ دیا ۔ کہنے لگی :- "خاتون جو کچھ ہم نے سنا ہے وہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے" ٭

"کیا واقعہ پیش آیا آخر ؟ ہم دونوں نے سوال کیا ٭

"دریچہ ــــــ !"

"کون سا ؟"

"باورچی خانے کے شمالی دریچے میں"

"ہاں ؟"

"جو چیز رکھی جاتی ہے ۔ وہی لمحوں میں غائب ہو جاتی ہے" ! بارے اس نے جملہ ختم کیا ٭

"تم نے کیا چیزیں رکھی تھیں ؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا ۔

"انڈے ۔ روٹی ۔ دودھ" زوناش نے ہانپتے ہوئے جواب دیا ٭

"اور یکے بعد دیگرے سب غائب ہو گئیں ؟"

"ہاں"

"تعجب ! ڈرو مت ! ہمارا کریم اس بھوتنی کو ضرور پکڑ لے گا ! میں نے ہنس کر کہا ٭

زوناش بولی "مگر مجھ سے تو یہاں نہ رہا جائے گا" ٭

میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "او تم شیطان کی پھوپھی ! تم کو ڈر آخر کس بات کا ہے ؟ ہم تو نہیں ڈرتے ! بہادر خون ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے ! جسوتی ! میری پیاری ! تم تو نہ ڈرو گی نا ؟"

"مگر روحی" اس نے طفلانہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا ٭

"ہاں جسوتی ؟"

"دل تو دھڑکتا ہے"

میں ہنسی "شرم کی بات جسوتی ! انسان ہو کر ڈرتی ہو ؟ تمہارے باپ ' تمہاری ماں غرض سب کے سب انسان تھے !"

جسوتی ہنسی ۔ کہنے لگی :- "اندیشہ ہے میں زیادہ بیمار ہو جاؤں گی ۔ مجھے ڈر لگتا ہے" ٭

جسوتی کو میں نے سینے سے لگا لیا ۔ وہ چھوٹے سے قد کی سفید چہرے والی بھولی بھالی لڑکی تھی ۔ اور بہت نرم تھی ۔ میں نے کہا "چھوٹی لڑکی ! تم ہمیشہ کی نادان ہو ! جسوتی ! قوم عرب کی بہادر لڑکی کے لئے وحشت زدہ ہونا یا ڈر جانا بڑے ہی شرم کی بات ہے ! سیر و سیاحت نے میرے دل کو پتھر کر دیا ہے ! میرے بابا بھی ایک دفعہ مجھ سے ہنسکر کہہ رہے تھے کہ میں ایک خوشرنگ پتھر ہوں جس پر زمانے کے گرم سرد جھونکوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا ! کیا وہ مبالغہ کرتے تھے ! اچھا لو ــــ اب جاؤ منہ ہاتھ دھو ڈالو ۔ غسل کر لو ۔ ناشتہ کریں گے ۔ نانی زوناش ! تم جا کے جلدی جلدی ہماری جسوتی کے لئے دودھ گرم کرو ۔ ننھی سی جان بھوکی ہے ٭

یہ سن کر بوڑھی حبشن بڑبڑاتی ہوئی بالا خانہ سے نیچے چلی گئی ۔ ادھر میں نے جسوتی کو سمجھا بجھا کر غسل خانے میں بھیج دیا ۔ جسوتی مجھ سے تین سال بڑی تھی ۔ مگر خیالات بچوں کے سے رکھتی تھی !

تبدیل لباس کے بعد تسبیح ہاتھ میں لئے میں بالا خانہ سے نیچے اتر رہی تھی کہ باورچی خانہ سے زوناش کو چیختے ہوئے سنا ٭

میں اُدھر بھاگی

وہ چوکھٹ میں کھڑی ہانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھ مشعل کی مانند روشن تھی۔ وہ دست پناہ سے چولھے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں باورچی خانے میں گئی۔ دیکھا تو دہکتے ہوئے کوئلے چولھے کے سامنے بکھرے پڑے تھے چولھا بجھ گیا تھا۔ اور دودھ کا مگونہ اُلٹا پڑا تھا ۔

"یہ کام کون نے کیا ہوگا"۔ میں نے کہا ۔

زوناش بمشکل کہنے لگی:۔ "بی بی مجھے تم مار ڈالو گی! مجھ سے یہاں نہ رہا جائے گا۔ میں تمہارے پاس بالاخانے پر آئی تھی تو زنجیر باہر سے لگائی تھی۔ صرف دریچہ کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ کوئی انسان اندر جاسکتا تھا؟ یہ کام انسان کا ہرگز نہیں ہوسکتا"۔

میں ڈرتی تھی کہ کہیں جسوتی نہ آجائے! بار بار اُس سے آہستہ کہنے کے لئے التجا کرتی تھی۔ پر وہ غصیلی حبشن چیخیں مار مار کر واقعات بیان کر رہی تھی۔ اُس صبح زوناش مجھے ہو بہو ایک جنگلی چڑیل معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ بال اُڑ رہے تھے۔ اور پیشانی پر وحشت کے نشانات تھے وہ گفتگو کرتے وقت ہاتھوں کو غیر فطری طور پر اچھالتی تھی۔ اور چلا چلا کر کہتی تھی "ناممکن! میں یہاں نہ رہونگی!

کیا یہ ممکن نہیں کہ کوّے دریچے کی راہ سے اندر آئیں"۔ میں نے پریشان ہو کر ٹالنے کے لئے کہا ۔

حبشن جھلّا کر بولی "کوّے کیا انگار کھاتے ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا سمجھ رکھا ہے تم نے؟" میں نے ہنسکر کہا ۔

"ہنسی مذاق کو رہنے دو بی بی میری کمر تو درد کرتی ہے"۔ اُس نے اپنی موٹی اور بھاری کمر پکڑ لی۔ اور لنگڑا کر چلنے لگی۔ پھر بولی:۔ "میں ناشتہ کیسے تیار کروں!! اندر کیسے جاؤں! آہ بڑی مصیبت ہے! بلند آسمان! تو ہی نجات دے!

"کریم کیا ہوگیا؟ کیا اسے بھی کوّے نے اُٹھا لیا؟"

"بازار گیا ہے شہد لانے"

"تو آؤ" میں نے کہا "میں تمہارے پاس رہونگی تم ناشتہ پکاؤ"۔

میں ایک چھوٹی سی دریچے کے آگے ایک چوکی پر بیٹھ گئی۔ اور تسبیح پھیرنے لگی۔ زوناش ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ اُس کو ڈرانے کے لئے کھڑکی کی سلاخوں پر لکڑی زور سے ماری۔ اور وہ جنگلی چھپکلی کی طرح چیخ اُٹھی۔ عجب تماشہ تھا!

اتنے میں باغ کی ایک روش سے جسوتی کی ایک سُریلی آواز آئی "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تم وہیں ٹھیرو جسوتی! آگ کے قریب نہ آؤ۔ دردسر ہوگا" میں نے چوکی سے اُٹھتے ہوئے کہا ۔

زوناش بہری تھی، اُس نے ہماری گفتگو تو سنی نہیں پر آواز کچھ کچھ سُن لی۔ اور ایک خوفناک چیخ ماری "آمی! یہ کیا آوازیں ہیں؟ کون بات کرتا ہے؟"

ناشتے کی میز پر میں نے جسوتی کو بہت ہمت دی اور پوچھا "رات کیسی کٹی؟"

وہ اپنی باریک آواز میں کہنے لگی "دردسر تو نہ تھا۔ پر نیند بھی نہ آتی تھی!! رات بھر صحرائی الو کی دہشت خیز آوازیں کمرے میں برابر پہنچتی رہیں۔ اسی لئے نیند نہ آئی"۔

میں بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی "واہ! تم تو ساری رات گھوڑے بیچ کر سوئیں! وہ میں بدنصیب تھی جو صحرائی الو کی چیخوں سے بار بار دہشت زدہ ہو کر دریچے کی طرف دیکھتی رہی —— جنگلی گرگٹ بھی رات بھر کودتا رہا! عجب بُرا جانور ہے! میں نے موم بتی جلا کر دیکھا تو دریچے کے پاس لمبی لمبی گھانس میں کیڑے تیر رہے تھے"۔

"تو یوں کہو تمہاری رات بہت بُری کٹی" جسوتی نے توس کا ایک ٹکڑا کھاتے ہوئے کہا ۔

"بہت بری" میں نے جواب دیا۔ پھر کہنے لگی:۔ "مگر جسوتی پہلی رات تھی! آج عادت ہوجائے گی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر مضمحل نہ ہونا چاہئے۔ تمہاری صحت کے لئے یہ جگہ بہت ہی اچھی ہے۔ اب تم اطمینان سے اپنا ستار بجایا کرو۔ سعدی اور عمر خیام کے اشعار گاؤ۔ اور سرخ گلاب کے باغیچے میں گھوما کرو مختصر یہ کہ ایک سلطان کی سی زندگی بسر کرو۔ کوئی حادثہ پیش آیا تو آئندہ دیکھا جائیگا"۔

جسوتی ہنس پڑی:۔ "روحی تم بڑی بےفکری ہو! تم خود ایک شیطانی عورت ہو! اسی لئے شیطانوں سے نہیں ڈرتیں"۔

"واقعی تم نے مجھے پہچاننے میں کمال کر دیا! ہاں جسوتی! میں شیطان کی خالہ ہوں"۔

"مگر روحی! یہ کیا عجب واقعات ہیں جن کو زوناش بیان کر رہی ہے؟ صبح کیا ہوا تھا؟ کون باورچی خانے میں گھس آیا تھا؟ چیزیں کس نے غائب کی تھیں"

"مجھے تو تعجب ہے جسوتی! میں تحقیقات کرونگی!! زوناش سے شیطان

کی ساس! تم جاؤ کھانا پکاؤ۔ آج مزے مزے کی چیزیں تیار کرو۔ ایک سمندری لمبی سی مچھلی کے پیٹ میں مصالحہ بھر کر خوب سرخ تلو"

جسوتی بڑی ہنس مکھ عورت تھی! بے ساختہ ہنس کر کہنے لگی: "تم نے بھی اپنی انا کے عجب مضحکہ خیز نام رکھے ہیں!"

"ہاں مجھے اس کی عادت ہے +

(۵)

تھوڑے ہی دنوں میں جسوتی کی صحت پر کیپاس کی زندگی بخش ہوا کا نمایاں اثر ہوا۔ اس نے دوائیں چھوڑ دیں۔ درد سر کے دورے بھی کم پڑتے تھے۔ رخسار گلاب کے مانند سرخ نظر آنے لگے تھے۔ اور آنکھ کی پتلیاں بھونرے کی طرح سیاہ و چمکیلی نظر آ رہی تھیں +

اس اثنا میں کوئی ایسا واقعہ بھی ظہور پذیر نہیں ہوا جو ہم کو متوحش کرتا +

اب جسوتی بھی بہت خوش تھی اور زوناش بھی بے فکر! ادھر میں بھی ان لوگوں کو مطمئن دیکھ کر اپنے ایک نامکمل ناول کے باب لکھنے لگی تھی۔ اور اکثر اوقات اپنے دار المطالعہ میں دریچے کے آگے بیٹھی گھنٹوں تصنیف و تالیف میں مصروف رہتی تھی۔ کبھی کبھی چاء اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھا لیا کرتی تھی۔ جسوتی گھنٹوں ملاقاتی کمرے میں ستار بجاتی اور اپنی باریک آواز میں گلہری کی طرح گایا کرتی۔ غرض کسی خلیفہ بغداد کی طرح بے فکری سے ہماری بسر ہونے لگی تھی مگر مہینے کی آخری تاریخوں کا ہمیں بے حد خیال تھا۔ جسوتی سے میں نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ اختتام ماہ پر میں اس کو وہاں سے لے چلونگی

مگر تین دن سے ایک عجیب واقعہ متواتر پیش آ رہا تھا۔ جس نے میرے بھی حواس گم کر دیئے تھے۔ جسوتی اور زوناش کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ کریم بھی پریشان نظر آ رہا تھا +

واقعہ یہ تھا کہ صبح کے ناشتے پر جسوتی کے توس غائب ہو جاتے تھے۔ زوناش جسوتی کے آگے توس اور زیتون کا تیل رکھتی۔ جسوتی اپنا صبح کا اخبار پڑھتی ہوئی دو چار منٹ قہوہ کا انتظار کرتی۔ قہوے کے آتے ہی جونہی وہ توس کی رکابی کی طرف دیکھتی تو رکابی خالی ہوتی! اور دوبارہ زوناش کو توس تیار کرنے پڑتے۔ کیا یہ واقعی حیرت انگیز نہیں ہے!!۔۔۔؟

جب چوتھے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ تو ہمارے حواس رخصت ہو گئے مجھ سے تو ناشتہ بھی نہ کھایا گیا۔ کیونکہ چوتھے دن توس کے ساتھ ایک انڈا بھی غائب تھا! اور چور کا کہیں پتہ نہ تھا!

دن بھر میں بدحواس ادھر اُدھر پھرتی رہی۔ اور جب رات کے وقت خوابگاہ میں گئی تو دیکھا کہ تکیوں کو کسی نے نوچ نوچ کر پھاڑ دیا ہے۔ چادر میں جا بجا سوراخ بنے ہیں۔ جیسے کسی نے دانتوں سے کاٹا ہو۔ او میرے مالک! عجیب ڈراؤنا منظر تھا۔ میرے منہ سے تو ایک چیخ نکل گئی۔ چادر جسم سے لپیٹ کر زینے سے نیچے بھاگ آئی اور زوناش سے لپٹ گئی +

ان پُر اسرار اور خوفناک واقعات کے بعد میں نے کتب خانہ میں تنہا بیٹھنا اور مطالعہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ ہم سب پر ایک دہشت طاری و ساری رہا کرتی تھی۔ ہم چاروں میں اکثر اوقات تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا +

میں بچپن ہی سے الف لیلہ کے قصوں کی عاشق زار! اس پرستان اور گورا ممالک کے دیوؤں کی کہانیاں بھی میں نے بہت پڑھی تھیں۔ اور پریوں کے افسانوں سے تو مجھے ایک خاص قسم کی دلبستگی تھی۔ مگر "شیطان" سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا +

اگرچہ آج ان عجیب و غریب واقعات کو گذرے چند سال ہو گئے ہیں۔ پر مجھے آج تک اپنی سادہ لوح سہیلی کا وہ پریشان لہجہ نہیں بھولا! اس وقت جسوتی نے کہا تھا: "روحی پیاری! کل تو توس غائب ہوتے رہتے، آج ایک انڈا بھی ان ظالموں نے اڑا لیا۔ کل ہم کو بھی ہضم کر جائیں تو کیا ہوگا"+

میں نے اس وقت بناوٹی ہنسی ہنس کر کہا تھا: "جسوتی! دوست! اس ظلم و ستم کی دنیا سے تو ہم شیطان کے پرسکون پیٹ میں ایک خوبصورت زندگی بسر کر سکیں گے"+

(۶)

اُس دن وطن سے ڈاک آئی تھی +

میں صبح ہی سے بہت مصروف تھی جن رسائل کی میں خاص نامہ نگار تھی اُن کے لئے افسانے اور نظمیں لکھنی تھیں۔ چنانچہ موم بتی جلا کر میں نے صبح کا ناشتہ کر لیا تھا اور دار المطالعہ میں چلی گئی تھی۔ جہاں کاغذات اور کتابوں کی موٹی موٹی جلدوں نے مجھے اپنے میں دفن کر لیا +

شام کے کوئی ساڑھے پانچ بجے میں ہاتھ میں بغداد ٹائمز لئے ہوئے پائیں باغ میں چلی گئی۔ بہت تھک گئی تھی +

سورج اچھی طرح چمک رہا تھا۔ پر باغ میں کسی قدر خنکی بھی محسوس ہوتی تھی۔ موسم بہت اچھا تھا۔ ہوا پھولوں کی بو سے معطر تھی۔ اور آسمان پر ایک خوشرنگ روشنی پھیل گئی تھی۔ جو عموماً مشرقی ممالک میں خزاں کے موسم میں پھیلا کرتی ہے۔

اندھیرا ہونے لگا تھا۔ میں نے اخبار کو بنچ پر رکھدیا۔ اُٹھنے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک بارگی ایک چیخ سنائی دی۔ اللہ! وہ کیا چیخ ہوگی!

شام کے سنسان سناٹے میں یہ آواز بڑی دردناک اور ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ غور سے سُنا تو جسونتی کی آواز تھی۔ اے معبود! میرے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میں بے تحاشہ اس کمرے کی طرف بھاگی جہاں جسونتی بیٹھی گارڈین کا حادثہ پکار رہی تھی۔ دیکھا تو جسونتی کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔ کریم ادھر اُدھر کونوں میں کچھ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور جس کرسی پہ بیٹھی وہ پکار رہی تھی وہ اُلٹی پڑی تھی ✦

مجھ سے کہنے لگی:۔ "روحی! عجب خوفناک حادثہ تھا! ایک دفعہ تو کسی نے مجھ کو نہ جوڑے پر سے اُٹھا لینے کی کوشش کی۔ دوسری دفعہ جب میں الماری سے مغربیات لانے گئی تو کسی نے کرسی اس زور سے گرائی کہ میں گھبرا کر باہر بھاگ گئی" ✦

"اے میرے خدا!" میں نے کہا "کس قسم کی شکل نظر آئی تم کو؟"

کریم بول اُٹھا "خاتون! ابھی میں نے اس کمرے سے ایک سایہ کو باہر نکلتے دیکھا" ✦

"سایہ!" جسونتی چلا اُٹھی ✦

"کس شکل کا تھا کریم؟" میں نے سوال کیا ✦

"صورت شکل تو میں نے نہیں دیکھی" اس نے جواب دیا ✦

"تم ہمیشہ ریوالور اپنی جیب میں رکھا کرو" میں نے تاکید کی ✦

میں مڑ ہی رہی تھی کہ دفعتاً ایک کرسی کے زور سے گرنے کی آواز آئی جسونتی سہم گئی اور برآمدے میں بھاگی۔ میں تو بُت کی طرح جہاں تھی وہیں رہ گئی ✦

"یا بلند آسمان! یہ کیا ہوا!" میں نے کریم سے پوچھا ✦

کریم کرسی کی طرف بھاگا ✦

"کرسی کے نیچے کوئی چیز ہے خاتون" کریم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ✦

"کیا ہے خدا کے لئے مجھے مت بتاؤ" میں نے کہا ✦

"اللہ! ــــــ شیطان تو نہیں؟" جسونتی نے زینے پر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا ✦

"یقیناً" میں نے جواب دیا ✦

جسونتی بولی "کریم! خدا کے لئے اس کو کنوئیں میں پھینکدو!

کریم نے بڑی ہمت کر کے کرسی اُٹھائی۔ کرسی کا اُٹھانا تھا کہ ایک عجب پُرلطف واقعہ گذرا ✦

وہاں کیا تھا؟ ــــــ شیطان!!؟

ایک لمبی دُم اور سُرخ چہرے والا اونچا سا بندر ایک ہاتھ میں ایک چمچہ لئے دروازے سے باہر بھاگ رہا تھا!

"لو! یہ رہا چور ــــــ!!" کریم نے چلّا کر کہا ✦

یہ اسقدر عجیب منظر تھا کہ میں اور جسونتی مبہوت رہ گئیں! دونوں کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں ✦

بڑی دیر بعد مجھے ہنسی آئی "جسونتی! تمہارے توس اور انڈے یہ خوب ہضم کرتا رہا۔ موٹا ہو گیا ہے۔ اسی شریر نے یقیناً اس دن کوئلے باورچیخانے میں بکھیر دئے تھے" ✦

مگر نازو ناز نے اس واقعہ کو جھٹلایا۔ کہنے لگی "تم لوگ مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ میں نے بال دھوپ میں نہیں سفید کئے"

(٧)

ایک دن دوپہر کے کھانے کے بعد جسونتی میرے کمرے میں چلی آئی۔ اس وقت میں اپنے پچھلے سفروں کے متعلق اپنی سیاحت نامے کے چند باب لکھ رہی تھی۔ مجھے مصروف دیکھ کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر جب اُس سے ضبط نہ ہو سکا تو بولی:۔ "روحی! دیکھو مہینے کی آخری تاریخیں قریب آگئیں۔ اب میرا مزاج بھی درست ہو گیا۔ اب اگر ہم یہاں سے جلد نہ چلے جائیں۔ اور خدانخواستہ اگر کوئی ڈراؤنا واقعہ پیش آجائے تو میں دوبارہ بیمار ہو جاؤں گی" ✦

"ہاں ضرور چلیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ اور دو باب "سیاح عورت" میں اضافہ کروں۔ اس کے بعد ہم چلے جائیں گے" میں نے کاغذات میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا ✦

اس گفتگو کے چند ہی دنوں بعد ہم اسباب سفر کی درستی میں لگ گئے۔ ایک دن شام کو دن بھر چیزیں بند کرتے کرتے تھک جانے کی وجہ سے میں اور جسونتی برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی اخبار انڈیا پڑھ رہی تھیں کہ مالی کا بیٹا ہوا سامنے آیا۔ میں تو لرز گئی اور کمرے میں بھاگنے کو جی چاہا۔ جسونتی

برف کی مانند سفید ہوگئی۔ کیونکہ مہینے کی ۱۵ تاریخ تھی +

میں نے پوچھا:- " مالی کیا بات ہے ؟"

مالی رونے لگا۔ بولا:- " ابھی میں نے کنوئیں سے پانی نکالتے وقت ——— دیکھا کہ وہ کفن پوش روحیں ——— تین روحیں باغ کی دیوار کے پاس کھڑی تھیں۔ کوئی دم میں وہ ادھر آئینگی +

" الٰہی تیری پناہ!" بیساختہ میری زبان سے نکلا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی:- " کریم کہاں ہے ؟"

" خدا کے لئے روحی" جسوتی نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا:- " مجھے کمرے میں لے چلو! کمرے میں!"

وہ خود کمرے میں اس لئے نہیں جاتی تھی کہ تنہا جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اور برآمدے میں اس لئے نہیں آتی تھی کہ کوئی دم میں وہ وحشت ناک شکل یہاں نظر آنے والی تھی!

اتنے میں کریم ریوالور لئے آگیا۔ کہنے لگا:- " برآمدے کی روشنی بجھادو!"

زونانش باورچی خانے کے دروازے بند کئے اندر بیٹھ گئی تھی۔ میں کرسی کے ایک ہاتھ پر عالم اضطراب میں بیٹھی ہانپ رہی تھی۔ اس وقت آپ میرے دل کی دھڑکن دیکھتے تو سمجھتے کہ میں دو ہی لمحوں میں مرجاؤں گی۔ کریم زینے پر ہاتھ میں ریوالور لئے بیٹھ گیا تھا اور ادھر ادھر دیکھ رہا تھا +

دفعتاً ——— انار کے درختوں کی آڑ میں ——— وہ خوفناک شکل نظر آئی ——— میرے خدا ——— وہ خوفناک کفن پوش شکل نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ ہمارے قریب آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی قبر سے تازہ مردہ اٹھ آیا ہے۔ مجھ سے تو آیۃ الکرسی پڑھے بغیر نہ رہا گیا۔ جتنی عربی دعائیں یاد تھیں یکے بعد دیگرے خود بخود زبان پر آنے لگیں ادھر جسوتی کا یہ حال تھا کہ بت کی طرح کھڑی تھی +

اچانک وہ خوفناک تصویر سامنے آئی۔ اور کسیقدر فاصلے پر کھڑے ہوکر ہاتھ پھیلا دیئے +

"پیسے پھینکو! اناج پھینکو ——— نہیں تو ——— !" مالی چلا اٹھا۔

جونہی اس شکل نے دوبارہ ہاتھ اٹھا کر خیرات مانگی۔ کریم نے دوڑ کر اس کو پکڑ لینے کی کوشش کی اپنی طرف اس کو آتا دیکھ کر وہ بھی کنوئیں کی طرف بھاگی۔ یہ دیکھ کر میں بھی باغ میں نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد جسوتی بھی ایک شال اوڑھے زینے پر آکھڑی ہوئی۔ مگر مالی زینے پہ کھڑا تھا اور چیخیں مار رہا تھا۔ ریگستانی ممالک کے لوگ تلوار سے تو نہیں۔ پر شیطان سے ضرور ڈر جاتے ہیں +

ہم نے دیکھا کہ وہ کفن پوش شکل سائے کی طرح نارنگی کے درختوں کے نیچے سے جلد جلد گزر رہی تھی۔ جونہی کریم کنوئیں کی طرف بھاگا وہ عجیب وغریب شکل بھی اپنے بچاؤ کے لئے درختوں کی آڑ میں چلی گئی۔ اس گڑبڑ میں وہ چادر جو بالکل کفن سے مشابہ تھی، انار کی ٹہنیوں میں الجھ کر رہ گئی۔ اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بھاگتا ہوا نظر آیا!

(۸)

یہ تھا کفن پوش شیطان کا راز!

" بھیک مانگنے کا کسقدر ناجائز طریق ہے!" میں چلا اٹھی " غریب

" غریب دیہاتیوں کو دھوکہ دیکر ان سے پیسے وصول کرنا کسقدر کمینگی ہے!" کریم نے غصیلے لہجے میں کہا۔ اس کا تنفس غصہ کی وجہ سے جلد جلد چل رہا تھا۔ اور اس وقت وہ اپنے غصہ کی وجہ اصلی معنوں میں ایک بہادر عرب معلوم دیتا تھا +

کریم نے واقعی بڑی بہادری کی! اس نے گاؤں والوں پر بڑا احسان کیا۔ ان تینوں کو اس نے حراست میں دیدیا۔ میں نے اور جسوتی نے اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی +

غرض ہم کو اس راز کے انکشاف سے حقیقی مسرت حاصل ہوئی! اور جس مقصد کو مدنظر رکھ کر ہم نے سفر کیا تھا۔ اس میں خاطرخواہ کامیابی حاصل کرکے دلی اطمینان حاصل ہوگیا +

تھوڑے دنوں کے آرام کے بعد جسوتی کو تندرست لے کر میں اپنے وطن واپس آگئی!

یہ تھا میرا چھٹا سفر! ——— چند ماہ بعد میرا ساتواں سفر شروع ہوگیا۔ جس کے حالات آپ "تباح خو[illegible]ت" میں ملاحظہ کریں گے +

(خاص)

حجاب اسمٰعیل

عازمِ جاپان

جناب بدر الاسلام فضلی لیکچرر ٹوکیو سکول آف فارن لینگویز۔ جاپان

۱۹ر نومبر ۱۹۳۰ء بروز چہار شنبہ۔ بوقت آٹھ بجے صبح میرے احباب و اقارب مجھے رخصت کرنے کے لئے دہلی کے اسٹیشن پر جمع ہوئے۔ وداعی مراسم ادا ہوئے۔ اور میں چشم پُرنم اور دل پُر از امید و بیم لئے ہوئے ان سب عزیزوں سے رخصت ہوا +

جب فرنٹیئر میل گرم رفتار ہو چکا۔ عزیزوں کی شکلیں آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئیں اور جذبات کو قدرے سکون ہوا تو میں نے اپنی گذشتہ موجودہ اور آئندہ حالتوں پر غور کرنا شروع کیا +

یکم نومبر ۱۹۳۰ء کو گورنمنٹ ہند نے میرا تقرر ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویز (درسگاہ السنہ غیر ملکی) میں اُردو کی لکچراری کی اسامی پر فرمایا۔ اس کے بعد اٹھارہ دن اس طویل سفر کی تیاری میں اسقدر مصروفیت رہی کہ خدا کی پناہ۔ بارے وہ وقت ختم ہوا۔ اب میرے سامنے مستقبل کیلئے ہزاروں منصوبے اور بے شمار تجاویز تھیں۔ اور ان سب کی تکمیل کے لئے دل مضطرب +

۲۱ر نومبر ۱۹۳۰ء بروز پنجشنبہ صبح آٹھ بجے بمبئی پہنچا۔ اور اپنے ایک عزیز مولوی نصیر احمد صاحب (انجینیر بیکلیمیشن اسکیم بمبئی) کے بنگلہ پر مقیم ہوا شام کے وقت اپنے بھائی ڈاکٹر بدل الرحمٰن صاحب (پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی) کے بنگلہ پر ملنے کے لئے گیا۔ مگر چونکہ وہ موجود نہ تھے۔ ملاقات نہ ہو سکی اور مایوس واپس آنا پڑا۔ اگلے دن صبح کو وہ خود انجینیر صاحب کے بنگلہ پر ملنے کے لئے تشریف لائے۔ ان سے تقریباً چودہ برس کے بعد ملاقات ہوکر از حد مسرت ہوئی۔ مگر دنیا کی تمام خوشیوں کی طرح یہ بھی یک چشم زدن گذر جانے والی خوشی تھی +

۹ بجے بلارڈ پائر پر پہنچے۔ طبی معائنہ کے بعد عرشۂ جہاز پر گئے۔ اور جو احباب یہاں تک پہنچانے کے لئے آئے تھے بالآخر وہ بھی رخصت ہوگئے۔ اور جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا +

ہمارے جہاز کا نام "رانچی" ہے جو پی اینڈ او کمپنی کے مشہور ترین اور بہترین جہازوں میں سے ہے۔ بارشدہ جہاز کا وزن ساڑھے سولہ ہزار ٹن ہے علاوہ ان منازل کے جو پانی کے نیچے ذخائر اور اسباب کے لئے ہیں۔ سطح آب سے اوپر پانچ عرشے ہیں۔ سب سے اوپر کے عرشے کا بیشتر حصہ کھلا ہوا ہے۔ اس کے ایک حصہ کو کھیلوں کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ ایک حصہ میں ایک بڑا حوض نہانے اور تیرنے کے لئے بنا ہوا ہے۔ باقی حصہ پر کپتان اور بحری رہنما کے کمرے ہیں اور آلات جہاز رانی نصب ہیں۔ اور تمام عرشہ کے چاروں طرف کشتیاں لٹک رہی ہیں +

اس کے نیچے الف عرشہ ہے۔ اس کے بھی تین حصے ہیں۔ سامنے کی طرف تو آلات جہاز رانی نصب ہیں۔ وسط میں اوّل درجہ کے کچھ کیبن ہیں شراب کی دوکان۔ تمباکونوشی کا کمرہ۔ موسیقی کا کمرہ۔ کتب خانہ اور پڑھنے لکھنے کے کمرے واقع ہیں۔ اور چاروں طرف برآمدہ ہے۔ جس پر لوگ چہلقدمی کرتے ہیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سمندر کی سیر دیکھتے ہیں۔ اور رات کے وقت محفل رقص سرود جمتی ہے۔ اس برآمدے کے گرد پندرہ چکر ایک میل کے برابر ہوتے ہیں +

اس کے نیچے ب عرشہ ہے۔ اس پر باورچیخانہ۔ دوسرے درجہ میں تمباکونوشی اور لکھنے پڑھنے کے کمرے کتب خانہ اور شراب کی دوکان ہے ہسپتال ہے اور پرسر کا دفتر اور جہاز کا چھاپہ خانہ ہے۔ اور وسط میں اوّل درجے کے کیبن ہیں۔ اور کھانے کے کمرے +

اس کے نیچے ج عرشہ ہے۔ جس پر اوّل اور دوسرے درجے کے کیبن ہیں۔ غسل خانے اور پاخانے ہیں اور دوسرے درجہ کا کھانے کا کمرہ ہے +

د عرشہ پر صرف کیبن۔ غسلخانے اور پاخانے ہیں +

جب ہم بمبئی سے روانہ ہوئے جہاز مسافروں سے پُر تھا۔ بہت کم لوگ کیبن کے اندر رہتے تھے۔ عرشہ الف پر ایک اژدحام رہتا تھا۔ کچھ لوگ اپنی کرسیوں پر پڑے سو رہے ہیں۔ کچھ کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ بعض عورتیں بیٹھی اونی جرابیں بن رہی ہیں۔ کچھ لوگ محض ہنسی مذاق

اور گفتگو سے دل بہلا رہے ہیں۔ بڑے بچے اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے کھیلتے کودتے پھر رہے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو اُن کی مائیں یا نرسیں گاڑیوں کے اندر لٹا کر گھما رہی ہیں۔ بعض لوگ کتب خانے میں بیٹھ کر کتب بینی اور اخبار بینی کرتے ہیں۔ یا محض اونگھتے ہیں بعض تاش و شطرنج کھیلتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر طرف زندگی کے آثار نمایاں ہیں۔ سہ پہر کو کھلی چھت پر بعض لوگ حوض میں تیرتے اور نہاتے ہیں۔ اور بعض ٹینس کھیلتے ہیں۔ جہاز پر ٹینس گیند کی جگہ رسّی کے حلقوں سے کھیلی جاتی ہے۔ جس کو کھیلنے والے ہاتھ سے جال کے اِدھر اُدھر پھینکتے ہیں۔ شب کو مغربی رقص ہوتا ہے۔ بینڈ بجتا ہے۔ دس گیارہ بجے تک چہل پہل رہتی ہے۔ پھر کچھ لوگ اپنے کیبنوں میں چلے جاتے ہیں۔ کچھ وہیں عرشہ پر کمبل بچھا کر سو جاتے ہیں +

۲۳۔ نومبر ۳ بجے جہاز کولمبو پہنچ گیا۔ مگر ساحل سے تین چار فرلانگ کے فاصلہ پر سمندر ہی میں لنگر انداز ہوا۔ جہاز سے بکثرت لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل پر گئے۔ جہاز سے ساحل لنکا دور تک نظر آتا ہے جس پر ناریل کھجور۔ تاڑ چھالیہ کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس بار ہم ساحل پر نہ جا سکے اور یہ تمنّا بشرطِ حیات واپسی کے لئے اُٹھا رکھنی پڑی۔

کولمبو سے روانہ ہو کر ۲۶ نومبر کو پنانگ پہنچے اور ۲۹ نومبر کو سنگاپور۔ یہاں تک سفر نہایت پُرلطف۔ موسم خوشگوار اور سمندر پُرسکون تھا +

پنانگ اور سنگاپور دونوں جزیرہ نمائے ملایا کی بندرگاہ ہیں۔ اور برطانوی نوآبادیات ہیں۔ دونوں جگہ علاوہ ملایا آبادی کے غیر ملکیوں میں چینی اور ہندوستانی جُزو غالب ہے۔ ملایا کی معاشرت پر ہندوستانی معاشرت کا بھی بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ ملکی آبادی تمام مسلمان ہے +

۳۰ نومبر کو سنگاپور سے چل کر چھٹے روز ۵ دسمبر کو بندرگاہ ہانگ کانگ پہنچ گئے۔ ہمارے سفر کا یہ حصّہ طویل ترین اور نہایت صبر آزما تھا۔ ہوا تند و تیز چلتی رہی اور بکثرت باد و باراں سے سمندر سخت متلاطم رہا۔ جہاز حالت وجد میں تھا۔ بیشتر لوگ دورانِ سر اور امتلا میں مبتلا تھے +

ہزار دعاؤں کے بعد آخر جہاز نے بندرگاہ ہانگ کانگ میں قرار پایا۔ طوفان دُور ہوا۔ دھوپ نکلی اور طبیعت بحال ہوئی +

ہمارے سامنے ہانگ کانگ کا جزیرہ ہے۔ جس کے ساحل پر بلند پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ ان میں سے بلند ترین کی اونچائی ۱۴ ہزار فٹ ہے اور اس کی چوٹی پر کیبل ٹرین جاتی ہے جو نہایت سرعت کے ساتھ عمودی خط میں اوپر چڑھتی ہے +

پہاڑی کے ڈھلانوں پر چوٹی سے سطح سمندر تک برابر مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ان میں شب کے وقت جب روشنی ہوتی ہے۔ تو سطح آب پر منعکس ہو کر ایک دلفریب منظر پیش کرتی ہے +

گذشتہ سترہ روز میں حیرت انگیز موسمی تغیّر ہوا ہے۔ دہلی سے روانگی کے وقت اچھی خاصی سردی تھی۔ ایک دن میں بمبئی پہنچے پہنچتے کافی گرمی ہو گئی بمبئی سے سنگاپور تک برابر گرمی بڑھتی رہی۔ اور اگر ابر نہ ہوتا تو ناقابل برداشت ہو جاتی۔ ہانگ کانگ پہنچنے تک پھر کافی سردی ہو گئی۔ اور ٹھنڈی ہوا بُری معلوم ہونے لگی +

ہانگ کانگ پہنچنے پر ہمارے جہاز کی آبادی میں اسّی فیصدی کمی واقع ہو گئی۔ مسافروں کی کمی اور سردی کی زیادتی نے جہاز کی رونق اور چہل پہل بہت گھٹا دی۔ عرشہ اوّل اب بالکل خالی پڑا رہتا ہے۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بھی خاموش نظر آتے ہیں۔ اور زیادہ وقت کیبن میں گذارتے ہیں۔ یا کتب خانے میں۔

ہانگ کانگ سے شانگھائی تک سمندر کا رنگ بجائے نیلگوں کے زردی مائل ہے۔ جس کا باعث چین کے عظیم الشان دریا ہیں۔ جو چین کی زرد مٹی بہا کر لاتے اور سمندر میں ملاتے رہتے ہیں۔ ایک اور خصوصیت اس سمندر کی یہ ہے کہ اس کا کوئی حصّہ چھوٹی چھوٹی چینی کشتیوں سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ جو ہزاروں کی تعداد میں چٹائی کے بادبان اُٹھائے نہایت بہادری اور لاپروائی سے موجوں کا مقابلہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چینی دنیا کے قدیم ترین ملّاح ہیں۔ اور مردوں سے زیادہ عورتیں کشتی بانی میں مہارت رکھتی ہیں۔ کس قدر عجیب منظر ہے کہ چینی عورت کی کمر پر بچّہ بندھا ہوا ہے۔ اور کشتی کے چپّو کو حرکت دے رہی ہے۔ دس گیارہ برس کا بیٹا یا بیٹی پاس کھڑی مدد دے رہی ہے۔ ہانگ کانگ میں مجھے معلوم ہوا کہ اس بندرگاہ میں کئی ہزار آدمی ایسے ہیں جنھوں نے اپنی ساری عمر کشتی ہی میں گذاری ہے۔ اور کبھی خشکی پر قدم نہیں رکھا +

۹ دسمبر صبح آٹھ بجے ہمارا جہاز بندرگاہ شانگھائی پر لنگر انداز ہوا۔ یہ بندرگاہ مشہور دریا یانگ ٹی سی کیانگ کی ایک شاخ وانگ پو پر ساٹھ میل اوپر کی طرف واقع ہے۔ جہاز دریا کے اندر داخل ہو کر میلوں لمبے سر بفلک پلیٹ فارم (دہارف) پر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر سر بفلک کشیدہ عمارات کھڑی ہیں۔ ان میں سے کچھ بندرگاہ کے متعلق دفاتر

اور گودام ہیں۔ اور کچھ تجارتی کوٹھیاں اور ہوٹل ہیں۔ یہاں بھی شب کے وقت چراغاں کا لطف قابل دید ہے +

عرشہ پر۔ اکثر چینی تاجر خوردہ فروش اسباب تجارت پھیلا کر فروخت کر رہے ہیں۔ ان کے پاس چینی صنعتوں کے بعض عمدہ نمونے ہیں۔ مثلاً چینی برتن۔ پیتل کے برتن۔ تصاویر اور نقاشی کے نمونے۔ مورتیں۔ کاغذ کی لالٹینیں لکڑی کے کھلونے۔ کچھ ریشمی کڑھے ہوئے کپڑے +

شانگھائی چین کا سب سے بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے۔ شہر تین حصوں پر منقسم ہے۔ بین الاقوامی نو آبادی۔ فرانسیسی آبادی۔ اور چینی بستیاں۔ کل آبادی بیس لاکھ ہے۔ بندرگاہ کی نشست پر ایک طویل بازار ہے جو براڈوے کے نام سے موسوم ہے۔ میں نے صرف ایک جزو دیکھا ہے۔ مگر یہ جزو بھی تین میل سے کم نہ تھا۔ سڑک کچھ زیادہ کشادہ نہیں۔ دہلی کے چاوڑی بازار اور لاہور کے انارکلی کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ دونوں جانب دو تین منزلہ عمارات سے لے کر چھ سات منزلہ عمارات تک کھڑی ہیں۔ آمد و رفت کی بہت کثرت ہے۔ ٹریم کاریں۔ موٹریں۔ لاریاں ٹیکسیاں بسیں۔ سائیکلیں اور رکشائیں سینکڑوں ادھر سے ادھر بھاگی پھرتی ہیں۔ دونوں طرف تنگ پٹریاں بھی پیدل چلنے والوں سے پُر رہتی ہیں۔ مگر جانوروں سے سواری یا باربرداری کا کام لینے کا رواج نہیں۔ چینیوں میں عسرت و افلاس کی زیادتی ہے۔ اس لئے چینی مزدوروں کے غول کے غول بازاروں میں پھرتے اور بھاری بھاری بوجھ لے جاتے نظر آتے ہیں۔ مگر بوجھ سر پر نہیں اٹھاتے۔ بلکہ بھاری بوجھ ایک موٹے بانس پر لٹکا کر ڈولی کی طرح دو آدمی بانس کے دونوں سرے کندھوں پر رکھ لیتے ہیں اور چلتے ہوئے زور زور سے چیختے ہیں۔ ہے ہے ہا ہا۔ ہو ہو۔ ہے ہے۔ ہا ہا۔ ہو ہو۔ ان آوازوں سے ہر وقت بازار گونجتے ہیں اور یہ نغمۂ بے ہنگام سننے والے کے دل پر عجیب دلگداز۔ پریشان کن۔ اور غنودگی انگیز اثر پیدا کرتا ہے +

چینی مرد و عورت کی جفاکشی دیکھ کر اور چین کی قدرتی دولت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ خیال گزرتا ہے۔ کہ ان کا افلاس محض جہالت اور قدامت پسندی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ دو باتیں نہ ہوتیں تو دنیا کا کوئی ملک چین کی ہمسری نہ کر سکتا +

شانگھائی میں صرافوں کی دوکانوں کی بڑی کثرت ہے۔ مگر یہاں یہ لوگ زیور بیچنے یا سود پر روپیہ قرض دینے کا کام نہیں کرتے۔ صرف سکّوں کے تبادلہ کا کام کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کی بھی از حد کثرت ہے۔ جس کی وجہ آنے جانے والے مسافروں کی زیادتی ہے +

یہاں کی پولیس میں بیشتر تعداد ہندوستانی سکھوں کی نظر آئی۔ اور اسی طرح ہانگ کانگ۔ سنگاپور اور پنانگ میں بھی بکثرت سکھ محکمہ پولیس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شانگھائی اجنبیوں کے لئے نہایت خطرناک جگہ ہے۔ اور بالخصوص موٹروں میں بغرض سیر جانا اکثر ہولناک نتائج کا باعث ہوتا ہے۔ موٹر ڈرائیور اکثر غیر معروف اور سنسان مقامات میں لے جا کر لوٹ لیتے ہیں۔ یا جان لینے کی دھمکی دے کر کسی جگہ قید رکھتے ہیں۔ اور بغیر ایک زر خطیر وصول کئے نہیں چھوڑتے +

شانگھائی میں ہندوستانی تجار کی تعداد کافی ہے۔ اور یہی حالت ہانگ کانگ سنگاپور اور پنانگ کی ہے۔ ان میں بمبئی احاطے کے پارسی۔ سندھی۔ خوجے بوہرے زیادہ ہیں۔ کچھ بنگالی اور پنجابی بھی ہیں۔ مگر افسوس کہ خالص اردو بولنے والے لوگ یہاں قطعاً نہیں پائے جاتے۔ یہ لوگ وطن کی فاقہ کشی میں مست رہتے اور ترک وطن کو موت سے بھی بدتر خیال کرتے ہیں +

۱۱ دسمبر کو شانگھائی سے روانہ ہوئے اور شام تک دریا سے گذرتے رہے۔ اس کے دونوں کناروں پر جو منظر دکھائی دیا وہ وادی گنگا سے اسقدر مشابہ تھا کہ وطن عزیز کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ وہی وسیع میدان۔ وہی نشیب و فراز کا فقدان۔ وہی لہلہاتے ہوئے کھیت اور گھنے باغات اور جنگلات

۱۲ اور ۱۳ دسمبر کو جہاز بحیرۂ جاپان سے گذرتا رہا جو دنیا کے خوبصورت ترین سمندروں میں سے ہے۔ پہلے تو سینکڑوں چھوٹے چھوٹے سرسبز جزائر سے گذرے اور پھر سمندر اتنا تنگ ہو گیا کہ جہاز سے دونوں جانب ساحل نظر آنے لگے۔ جو سرسبزی و شادابی کے باعث تصویر کی طرح دلفریب معلوم ہوتے تھے +

ہمارا جہاز جاپان کی پہلی بندرگاہ موجی کے قریب کچھ دیر کے لئے ٹھہرا۔ جاپان کی ڈاک جہاز پر آئی اور میرے لئے بھی ایک خط لائی۔ ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز کے ڈائرکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ وہ میری آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اور یوکوہاما کی بندرگاہ میں جہاز پر میرے خیر مقدم کا انتظام کریں گے۔ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ فی الحال میرے عارضی قیام کے لئے کالج کے قریب ہی ایک ہوٹل میں انتظام کر دیا گیا ہے۔ اسی مضمون کا ایک خط مجھے شانگھائی میں موصول ہو چکا تھا اور ایک روز بعد ایک لاسلکی پیغام بھی آیا تھا جس کے جواب میں مَیں بھی جہاز سے لاسلکی پیغام روانہ کر چکا ہوں +

۱۴ دسمبر صبح سات بجے جاپانی افسران بندرگاہ ہمارے جہاز پر آئے اور

ہم سب مسافر اوّل درجے کے سموکنگ روم میں طبّی معائنہ کے لئے طلب کئے گئے۔ مگر عجیب وغریب طبّی معائنہ تھا۔ سلام ومزاج پرسی کے بعد نام پوچھا گیا اور ناموں کی فہرست پر نشان لگا کر رخصت کر دیئے گئے۔ اس کے بعد دوسری جگہ پاسپورٹ دیکھے گئے اور ایک فارم بھروا کر اپنے پاس رکھ لیا اور پاسپورٹ واپس کر دیا۔ پاسپورٹ دیکھتے ہوئے ہر مسافر سے کچھ نہ کچھ سوال بھی کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ مجھ سے میرے سفر کی غرض دریافت کی۔ جواب دینے کے بعد پوچھا آپ کیا مضمون پڑھائیں گے۔ میں نے کہا کہ "ہندوستانی زبان"۔ بڑی مشکل سے اُن کے سمجھ میں آیا کہ ہندوستانی کیا چیز ہے۔ جب سمجھ گئے تو بہت محظوظ ہوئے +

نو بجے جہاز بندرگاہ کوبے پر لنگر انداز ہوا۔ کوبے بلحاظ محل وقوع وسعت اور تجارت کے جاپان کی بہترین بندرگاہ ہے۔ وسیع بندرگاہ میں چار بڑے بڑے پائر (پلیٹ فارم) ہیں۔ جن پر ایک وقت میں ۲۰ بڑے بڑے جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں +

گیارہ بجے رکشا لے کر شہر کی سیر دیکھنے روانہ ہوئے۔ شہر ہندوستان کے نئی وضع کے شہروں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور بمبئی وکراچی پر کسی طرح فوقیت نہیں رکھتا۔ عمارات بالعموم چھ سات منزلہ ہیں۔ اور پختہ اینٹ چونے سیمنٹ یا پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں لکڑی کے مکانات بھی نظر آتے ہیں۔ طرز تعمیر میں کسی قسم کی دلکشی یا آرٹ کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ سڑکیں عموماً کشادہ اور مصفا ہیں۔ مگر بعض مقامات پر تنگ وتاریک گلیاں بھی نظر آئیں۔ بازار دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر بڑی بڑی یورپین وضع کی دوکانیں واقع ہیں۔ جن میں تمام خرید وفروخت دکان کے اندر ہوتی ہے۔ دوسرے بازار خالص جاپانی وضع کے ہیں جن میں دوکانیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ بالعموم خرید وفروخت باہر ہی کھڑے ہو کر ہوتی ہے۔ رنگ آمیزی کی کثرت اور شوخی ان کی شان امتیازی ہے۔ ناموں کے بورڈ ان دوکانوں پر لکڑی یا دھات کے نہیں ہوتے۔ بلکہ لمبے لمبے سرخ کپڑوں پر سفید کپڑے کے حروف کاٹ کر چسپاں کر دیئے ہیں۔ اور ان کی لمبائی کو ایک عمودی خط میں لٹکا رکھا ہے۔ ان بازاروں میں بجلی کی روشنی کی کثرت بھی قابل توجہ ہے۔ نہایت قریب قریب دو رویہ بجلی کے کھمبے کھڑے ہیں اور ایک ایک کھمبے پر سات آٹھ قمقمے نصب ہیں۔ ان کے علاوہ دوکانوں نے علیحدہ اپنی آرائش بجلی کے قمقموں سے کی ہے۔ بعض لوگ سڑک ہی پر عارضی دوکانیں لگائے مال بیچ رہے ہیں +

بازاروں میں عورتوں کی کثرت بھی قابل توجہ ہے۔ جن کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خرید وفروخت زیادہ عورتیں ہی کرتی ہیں۔ یہاں عورتوں کی وضع پچیس تیس فیصدی انگریزی یا یہاں کے محاورے میں بین الاقوامی ہے۔ باقی خاص جاپانی لباس میں ملبوس ہیں +

مرد قریب قریب تمام انگریزی یا نیم انگریزی وضع میں ہیں۔ جاپانی لباس مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں ہوتا ہے۔ سر کا لباس کچھ نہیں۔ عورتیں اپنے بالوں کو اس طرح پھلا کر سنوارتی ہیں کہ ایک دستار کی سی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ پیروں میں بجائے جوتوں کے کھڑاؤں پہنی جاتی ہے۔ جو ہندوستانی کھڑاؤں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ایک خاص قسم کے کپڑے کے موزے بھی پہنتے ہیں اور کھڑاؤں کی وجہ سے اس موزے میں انگوٹھا دوسری انگلیوں سے علیحدہ رہتا ہے۔ جسم پر پہننے کے لئے دو قسم کے کپڑے ہوتے ہیں۔ بنیان اور جانگیہ پہن کر اوپر سے ایک قبا پہنتے ہیں جو اسقدر لمبی ہوتی ہے کہ کندھے سے ٹخنوں تک تمام بدن ڈھک لیتی ہے۔ اس کی آستینیں سب سے زیادہ عجیب ہوتی ہیں۔ یہ سب چوڑی اور کندھے کے اوپر سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ مگر بغل کی طرف سے ان کا مُنہ کھلا رہتا ہے اور نیچے کی طرف علیحدہ لٹکتا ہے۔ آگے کی طرف سے آستین میں ہاتھ نکالنے کے لئے جگہ کھلی ہوتی ہے باقی حصہ آگے سے بھی بند ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آستین جیب کا کام دیتی ہے اس قبا میں بٹن نہیں ہوتے۔ آگے سے بالکل کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ جاپانی زبان میں اس قبا کو کمونو کہتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی گون سے بالکل ملتی جلتی ہوتی ہے۔ سردی کی وجہ سے کئی کئی کمونو اوپر نیچے پہن لیتے ہیں اور پھر دونوں پیش اوپر نیچے کر کے کمر پر ایک پٹکا باندھ لیتے ہیں اور عورتیں اس پٹکے کے ساتھ کمر پر ایک تکیہ بھی باندھے رکھتی ہیں۔ جو بلوغ کا نشان خیال جاتا ہے۔ اور بچوں کو کمر پر باندھنے کے کام آتا ہے۔ کمونو کے اوپر ایک گھٹنوں تک نیچا اوورکوٹ ہوتا ہے۔ جو شکل میں کمونو سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ مگر اس کو سامنے کی طرف کھلا رکھتے ہیں۔ اور صرف ایک چھوٹا ریشمی بند دونوں پیشوں کو ملائے رکھتا ہے۔ اس اوورکوٹ کو "ہوری" کہتے ہیں۔ بالعموم عورتوں کا لباس نہایت خوبصورت ریشمی یا اونی چھینٹوں کا ہوتا ہے۔ بعض عورتیں ان میں روئی بھی ڈلواتی ہیں۔ ہر عورت شانوں پر ایک چوڑا خوبصورت گلوبند ڈالے رکھتی ہے بالحیث المجموع عورتوں کا یہ لباس نہایت نظر فریب اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ازحد درجہ ستر پوش بھی ہے۔ تمام لباس میں صرف ایک چیز

ہے۔ جو نظر میں کھٹکتی ہے۔ اور وہ کمر کا تکیہ ہے۔ اس پر جب "ہوری" پہن لی جاتی ہے تو کمر پر اچھا خاصا ایک کوہان سا کھڑا ہو جاتا ہے +

مرد خواہ انگریزی لباس میں ہوں یا جاپانی لباس میں بالعموم سیاہ رنگ بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مردانے جاپانی لباس میں کمر پر ایک لنگے کی قسم کا کپڑا اور پہنا جاتا ہے۔ یہاں کی ہر چیز زبان حال سے اس قوم کی دولت اور محنت کی شاہد ہے۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں کچھ غریب اور مفلوک لوگ سر بازار بھیک مانگتے نظر آئے۔ ان کے بعد غریب طبقہ میں رکشا اور ٹھیلے چلانے والے قلی۔ فیکٹریوں کے مزدور۔ کھیتوں میں کام کے کرنے والے ہیں۔ مگر دنیا کی اور قوموں کے غربا کی طرح۔ ان کے چہروں پر افلاس کا اثر قطعاً نہیں ان میں ہر شخص کے جسم اور لباس حد سے زیادہ صاف اور چہرے بشاش ہیں +

تعجب ہے کہ ایسے ملک میں جہاں ہر کام مشین سے ہوتا ہے۔ اور بجلی گیس۔ اور دخانی قوتیں اسقدر مستعمل ہیں۔ وہاں رکشا اور ہاتھ کے ٹھیلے بھی موجود ہیں۔ بھاری ٹھیلے گھوڑے بھی کھینچتے ہیں۔ جو بہت جسیم اور قوی معلوم ہوتے ہیں۔ بیل بھی باربرداری کے کام آتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کے گائے بیل ہندوستان سے بالکل مختلف شکل کے ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ عموماً بھورا ہوتا ہے۔ اور اونچے کم ہوتے ہیں۔ لمبے زیادہ۔ منہ اور جسم بھینس کی طرح بھاری ہوتا ہے۔ اور گردن بالکل کمر کی سیدھ میں ہوتی ہے +

آمد و رفت کی بڑی کثرت ہے۔ ریلیں بیچ شہر سے گذرتی ہیں۔ ٹریم کاریں موٹریں۔ ٹیکسیاں۔ بسیں بے شمار ادھر سے ادھر دوڑتی پھرتی ہیں۔ چوراہوں پر جاپانی پولیس مین نیلی وردی پہنے بڑی ہوشیاری سے ان بے شمار گاڑیوں کو ادھر اُدھر گذارتا ہے۔ ہر قسم کی گاڑیاں چلانے والے بڑی احتیاط سے ان کو چلاتے ہیں اور بائیں کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر رکشا چلانے والے اس عام قاعدہ سے بالکل بے نیاز ہیں۔ عموماً بیچ سڑک میں چلتے ہیں۔ کبھی داہنی طرف بچتے ہیں اور کبھی بائیں جانب۔ پیدل چلنے والوں کے لئے سڑکوں کے دونوں جانب پٹریاں ہیں۔ مگر پیدل چلنے والے بھی عموماً بیچ سڑک پر چلتے ہیں +

غروب آفتاب کے بعد میں پھر تنہا ٹہلنے کے لئے شہر کی جانب چلا گیا۔ اور یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ بندرگاہ کے قریب کے بازاروں میں بیشتر دکانیں سرِشام سے بند اور بڑی بڑی عمارات بالکل بے چراغ تھیں سڑکیں عموماً سنسان پڑی تھیں۔ اور ان پر کافی روشنی بھی نہ تھی +

۱۶ ردسمبر کو ہمارا جہاز منزل مقصود یعنی بندرگاہ یوکوہاما پہنچا۔ پروفیسر گامو صاحب جو مجھے لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ جہاز پر آئے۔ اُن سے تعارف ہوا۔ پھر اُن کی زیر نگرانی ہمارا اسباب جہاز سے اُتر کر کسٹم ہاؤس پہنچا اور بعد معمولی معائنہ کے وہاں سے رخصت ہو کر ہم سب یوکوہاما کے ریلوے اسٹیشن پر آئے اور الکٹرک ٹرین میں بیٹھ کر ۴۴ منٹ کے بعد دارالسلطنت جاپان ٹوکیو آ پہنچے اور تھوڑی دیر بعد اپنے عارضی قیام گاہ یعنی ہوزن کا ہوٹل میں پہنچکر ایک بڑے اور آرام دہ کمرے میں مقیم ہو گئے +

(خاص) بدر السلام فضلی

"شکست"

از حضرت خلیل۔ بی۔اے۔ منٹگمری

بوڑھے کا دس سال کا ہنستا کھیلتا اکلوتا بچہ سنتو اُس کے ہاتھ سے چھن گیا۔ موت کے اٹل قانون نے اس کی گریہ و زاری، چیخ و پکار، بیکسی پیرانہ سالی پر کوئی توجہ نہ دی۔ بوڑھے کی آنکھوں میں دنیا ماتم خانہ ہوگئی۔ اس کے پاس سب سے بڑی دولت یہی تھی۔ وہ کھوئی گئی۔

سنتو کی ماں ارتھی کے ساتھ ساتھ آہ و بکا کرتی ہوئی اپنی کھوئی ہوئی دولت کو الوداع کرنے جا رہی تھی۔ بوڑھے کی کمر پہلے ہی خمیدہ تھی۔ بیٹے کے غم سے اور کبڑی ہوگئی۔ اس کے پاؤں کی قوت سلب ہوگئی۔ اس میں اتنی ہمت نہ رہی کہ وہ بیٹے کی ارتھی کے ساتھ جاتا۔ تھوڑی دور رینگتا ہوا ساتھ آیا۔ پھر لاٹھی ٹیک کر گلی میں کھڑا ہوگیا۔ جب تک ارتھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوئی وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اُسے حیرت تھی کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے لوگ اُس کے پیارے بچے کو جلانے کے لئے لئے جا رہے ہیں۔ کیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ اسے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔ آخری منظر بھی آنکھوں سے دور ہوگیا تو بوڑھا اپنا عصا زمین پر پھینک کر بیٹھ گیا کمر خمیدہ ہونے کی وجہ سے اُس کا سر دونوں گھٹنوں کے درمیان اٹک رہا تھا۔ آنکھیں فرطِ کرب سے بند تھیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اسکے کمزور سینہ میں طوفان خیز تلاطم پیدا ہوا۔ کشتیٔ حیات پر ایک غیر معمولی دباؤ پڑ گیا۔ اُمید ایک دُھندلی سی شے بن کر اُس کی نظروں سے دور غائب ہو رہی تھی۔ دنیا اس کے لئے ایک گلا سڑا گوشت کا لوتھڑا تھی۔ دنیا کے تمام تاریک پہلو اس کے دماغ میں روشن ہوگئے۔ یاس کی رہبری میں اُس نے ایک نیا رستہ ڈھونڈا۔

بوڑھا لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ اب اُس کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتقام پر تُلا ہوا تھا۔ اُس نے قسمت کو خوب آزما لیا۔ اب خدا سے مدد مانگنی فضول ہے۔ اُس کے ذہن سے خدا کا لفظ حرفِ مکرر کی طرح محو ہوگیا۔ مذہب اُس کو ایک من گھڑت ہوا نظر آنے لگا۔ وہ خدا کی دنیا سے برسرِ پیکار رہنا چاہتا تھا۔ اُس نے مشیتِ ایزدی کو شکست دینے کا ارادہ کر لیا۔

بوڑھا اور اس کا اکلوتا بیٹا سنتو اور بوڑھے کی بیوی ایک صاحب کے بنگلے میں رہا کرتے تھے۔ سنتو بڑا سریع الفہم اور چست چالاک لڑکا تھا۔ باپ بیٹا دونوں گھاس چھیل کر صاحب کے گھوڑے کو ڈالدیتے اور صاحب اُن کو اتنے پیسے دیدیتا کہ تینوں کا پیٹ بھر جاتا۔ اب سنتو کے مرنے سے بوڑھے میں پہلے کی نسبت آدھی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ جب صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کے گھوڑے کو اب پیٹ بھر کر گھاس نہیں ملتی تو اُس نے بوڑھے کو صاف جواب دے دیا۔

بوڑھی بہتیری چلائی "حجور! ہم پہ دیا کرو۔ اب اس عمر میں ہمیں کون نوکر رکھیگا۔ بڑی "مہروانی" ہوگی۔ ہمارا ایک اور "رشتے دار" ہمارے ہاں آ جائے گا۔ پھر حجور کے گھوڑے کو پہلے جتنی گھاس ملیگی۔ اب اس وقت ہم کہاں جائیں کاہے کو ہمیں لات مار کر نکال رہے ہو۔ بچوں کا دُکھ رام کسی کو نہ دکھائے ہم دونوں مرنے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ حجور کے دوارے پڑے رہیں گے۔ جو روکھا سوکھا ہو ہمیں دیتے جانا رام آپ کو بدلہ دیگا"۔

لیکن صاحب نے ایک نہ سُنی۔ بوڑھی پھر بولنا چاہتی تھی لیکن بوڑھے نے اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا:-

"جیادہ بولنا فجول ہے۔ اپنا تواپرات سنبھال لو"۔

بوڑھے نے اپنا میلا چکٹ بستر سر پر رکھ لیا۔ تمباکو کی تھیلی ایک کونے میں لٹکی ہوئی تھی۔ اس کو اس نے کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ بھگوت گیتا اور رامائن کی دونوں پستکیں ایک ہی غلاف میں بند تھیں وہ بھی اپنے گلے میں ڈال لیں۔ گڈوی اور عصا ایک ہاتھ میں۔ ناریل کا حقّہ دوسرے میں۔ بوڑھا ان تصویروں پر جو کہ سنتو نے کپڑے کے تھانوں سے اُتار کر دیوار پر آٹے سے چسپاں کی ہوئی تھیں آخری نظر ڈال کر باہر نکل آیا۔ بوڑھی نے کھانے پینے کے برتن اور

جو کچھ اس سے ہو سکا اٹھا لیا۔ دونوں آہستہ آہستہ بنگلے سے باہر نکل آئے۔ بوڑھا مطمئن تھا اور بوڑھی بے چین۔ بوڑھے کو خیال تھا کہ جس دنیا میں اکلوتے بیٹے جیسی عزیز شے ہاتھوں سے چھینی جاتی ہے۔ اس دنیا میں صاحب کا نوکری سے برطرف کر دینا معمولی بات ہے۔ لیکن بوڑھی کو فکرِ معاش بے چین کر رہا تھا رات کو روٹی کہاں سے کھائیں گے۔

"ہمارے کچھ پیسے بھی تو صاحب کی طرف نکلتے تھے وہ بھی نہ لئے۔ بڑا مورکھ ہے۔ یہ پیسے والے لوگ غریبوں کو تو کتے کے ماپھک سمجھتے ہیں"

"جس کے دل میں اتنا بھی دھرم نہیں کہ کشٹ والے غریب کا جی کیسے رکھا جاتا ہے۔ اس سے پیسے مانگنا فضول ہے"

"آج کے لئے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بنیا بھی صاحب کے محتاج سے ادھار دیا کرتا تھا اب کاہے کو دیگا"

بوڑھا "ایشور مالک ہے" کہہ کر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا یوں اپنے سے باتیں کر رہا تھا:-

"اس مایا روپی سنسار میں دکھ اور جنجال کے بندھنوں میں سے نکلنا بڑا مشکل ہے۔ سنتوا کی ماں آج تک تو میرا یہ دھرم تھا کہ آتما کی شانتی اس وقت تک نہیں ہو سکتی ہے جب تک آدمی کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار کا نشٹ نہ کر دے۔ سکھ سنتوش اور مکتی اس شخص کو ہوگی جس نے من کے چکر کو وشواس کے ساگر میں نہ پھنسنے دیا۔ اور جیون کو سدا گیان روپ میں لگائے رکھا"

"تو کیا آج تمہارے دھرم میں کچھ فرق آگیا ہے۔ تم تو بڑے بھگت تھے۔ آج کیسی باتیں کر رہے ہو"

"ہاں سنتوا کی ماں! اب میرے دھرم میں بڑا فرق ہے۔ اب میں نے بڑے وچار کے بعد یہ دھارن کیا ہے کہ کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار ان پانچوں کے سوا اس جگت میں نبھاؤ بڑا کٹھن ہے۔ جب تک چت کے لگن کے سامان نہ ہوں تب تک اس چت روپی سمندر میں من کا جہاز شانت نہ بہے گا"

بوڑھے کی اندرونی دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا تھا اس کی آنکھوں میں انتقام کی چمک دوبالا ہو رہی تھی۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ دنیا میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں۔ ہر ایک۔۔ دوسرے کو شکست دینے کے درپے ہے۔ جبر و استبداد کامیابی کا راز ہے۔ سب سے بڑا مورکھ سب سے بڑا کامیاب آدمی ہے۔ ایک دوسرے کو کچلنے کا نام "دنیا" ہے۔ پہلے وہ ایک بڑا دھرمی اور سادہ لوح انسان تھا۔ اب یاس آشنائی سے اسے دنیا انتقام گاہ نظر آتی تھی۔ وہ گناہ کو مفاد کے نظریہ سے جائز خیال کرتا تھا اس پر یہ راز کھل گیا کہ حصولِ لذت و مسرت میں سرگرمی کرنا دنیا کا سب سے بڑا مستحسن فعل ہے۔ اور جلبِ منفعت نیکی یا بدی کی جان ہے۔

بوڑھا انہیں خیالات میں غرق تھا کہ سامنے گلی میں ایک گھر کے سامنے تین چار سال کا بچہ کھیلتا ہوا دکھائی دیا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دزدیدہ نظریں دوڑائیں اور موقع پا کر بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بوڑھی سہمی ہوئی بڑبڑا رہی تھی۔

"کیوں مفت میں جان جوکھوں میں ڈالتے ہو۔ بڑھاپے میں یہ کلنک کا ٹیکا ماتھے پہ لگاتے ہو۔ کسی امیر کا لونڈا معلوم ہوتا ہے۔ تجھے جیل میں پہنچا کے چھوڑیں گے"

لیکن بوڑھا بچے کو چمکارتا ہوا دلاسا دیتا ہوا بہت دور تک لے آیا۔

"سنتوا کا غم دور کرنے کے لئے اسے پالوں گا۔ میں اکیلا کشٹ کاہے کو جھیلوں۔ اس کے ماں باپ بھی ذرا ساری عمر تڑپیں گے۔۔۔"

(۳)

دن گذرتے گئے۔ گھڑیاں دنوں میں اور دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ بوڑھا ایک اور صاحب کی کوٹھی پر جا کر ملازم ہو گیا تھا۔ وہ بچہ جو بوڑھا اٹھا کر لایا تھا اس کا نام اس نے گردھاری رکھا اور آج اس کی عمر دس سال کی ہو گئی تھی۔ وہ بوڑھے کے ساتھ گھاس چھیل کر لاتا۔ بظاہر بوڑھا مطمئن تھا لیکن دل سے سنتوا۔۔ کا غم نہ مٹ سکتا تھا۔ لڑکا بھی اسے باپ کہہ کر پکارتا اور بوڑھا بوڑھی دونوں بیٹوں کی طرح اس سے محبت کرتے۔

بوڑھی نے چلم پر تمباکو ڈال کر حقہ بوڑھے کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"کیسا سندر لڑکا ہے۔ اور کیسا دل لگا کر کام کرتا ہے۔ اس کے ماں باپ بیچاروں کا کیا حال ہوگا۔ روتے ہوں گے۔ بیٹے کا غم پرماتما کسی کو نہ دکھائے آج اس لونڈے کی عمر بھی اتنی ہو گئی ہے جتنی سنتوا۔۔ کی مرنے کے وقت تھی"

بوڑھا اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھا۔ وہ گردھاری کے والدین کو دکھ دینے میں کامیاب ہوا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ "خوب گریہ و زاری کرتے ہوں گے" اس خیال سے بوڑھے کی گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ اور جھریوں والے چہرے پر ایک غیر معمولی تمتماہٹ نمودار ہوتی۔ اور گردھاری کی طرف دیکھ کر مطمئن ہو

میں کھانس لیتا +

اتنے میں گردھاری گھاس چھیل کر اندر داخل ہوا +

"دشنوا کی ماں! ذرا میری لاٹھی دینا۔ باہر گھومنے کو دل چاہتا ہے۔"

"ہاں! اب بیٹھنے کو جیت کاہے کو کرے گا۔ بیٹا گردھاری گھاس چھیل ہی لاتا ہے۔ تم گھر بیٹھے حقہ پیو یا باہر گھومو" +

بوڑھا لاٹھی لے کر باہر نکل آیا۔ اور ایک فتح مند سپہ سالار کی طرح قدم مارتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ گھر سے کسی خاص ارادہ سے نہ نکلا تھا۔ لیکن نفس اسے بہکاتا ہوا ضمیر کو پھسلاتا ہوا۔ گردھاری کے والدین کے گھر کی طرف لے چلا۔

اُس کا منہ چھوہارے کی طرح سوکھا ہوا بار بار دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا +

اس کا سر اس کے بدن سے اسقدر آگے بڑھا ہوا تھا۔ کہ دور سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی گرا۔ بوڑھے کا نفس اور ضمیر اب کبھی برسرِ پیکار نہیں ہوئے تھے۔ مدت ہوئی وہ ایک فیصلہ کن گوشہ میں امن و امان سے بسرام تھے۔ کیف آور مسرت ہر وقت اُس پر طاری رہتی تھی۔ آج وہ گردھاری کے والدین کو دیکھ کر اپنی مسرت کی انتہا دیکھنا چاہتا تھا کہ اُن کو گریہ و زاری میں مبتلا اور پریشان حال دیکھ کر اپنی مسرت کو دوبالا کر سکے۔ "ذرا میں بھی دیکھوں یہ شہرت اور ثروت والے کس طرح روتے ہوں گے۔ شور مچاتے ہوں گے"

وہ لاٹھی کو کھٹ کھٹ کرتا ہوا آنے جانے والوں سے بے پرواہ گذرتا جا رہا تھا جیسے بھولا ہوا مسافر اچانک اپنی منزلِ مقصود کو یاد کر کے تیز گامی سے کام لیتا ہے +

بوڑھا جب اس گلی میں آیا تو غیر متیقن قدم رکھتا ہوا دھیرے دھیرے لاٹھی ٹیکتا ہوا ٹھٹک کر گردھاری کے والدین کے مکان سے دور رک کر کھڑا ہو گیا

اُس کی حالت اُس بھگوڑے طالب علم کی سی ہو رہی تھی جو صبح مدرسہ کو دور سے دیکھ کر بھاگنے کا خیال دل میں لا رہا ہو +

گناہ کا احساس ہر ایک آدمی کو ہوتا ہے۔ بدترین اخلاقی مجرم میں بھی وہ احساس جو ضمیر سے اُٹھ کر نفس کے مقابل ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے نمودار ہو کر اسے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن گناہ کی کثرتِ عادت اس احساس کو غالب نہیں ہونے دیتی۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ تاریک ترین کوٹھڑی میں ادنےٰ سی چمک بھی پیدا ہو اور روشنی نہ ہو +

بوڑھا جھجک جھجک کر مکان کے نزدیک کھسکتا آ رہا تھا کہ یکایک ایک شخص اُسی مکان کے اندر سے نکلا۔ ایک دودھ پیتا بچہ اُس کی گود میں تھا۔ دو تین اور بچے اُس کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہنستے کھیلتے باہر نکلے۔ اس شخص کے چہرے پر مسرت لہریں مار رہی تھی۔ وہ اسقدر شاداں و فرحاں نظر آتا تھا گویا آج تک وہ کسی غم یا مصیبت میں گرفتار نہیں ہوا +

یہ گردھاری کا باپ تھا +

بوڑھا حیرت سے اپنے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ "کیا اس سنسار میں یوں بھی ہوتا ہے۔ کیا اس شخص کو اس کا بچھڑا ہوا بیٹا بھول گیا" بار بار اس کے مرتعش ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ اُس کے انتقام کا جذبہ اُس کے عمیق دل کی رگِ پنہاں میں ڈوب گیا۔ اُس نے اردگرد اچٹتی ہوئی نظریں دوڑائیں پھر اُسی شخص پر پیوست ہو گئیں۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا بوڑھے کے نزدیک آ گیا۔ اور اُسے فقیر سمجھ کر ایک پیسہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ کر بچوں کو ہمراہ لئے ہوئے دور نکل گیا۔ بوڑھے پر بالکل سکتہ کی حالت طاری تھی۔ خفیف سے خفیف جنبش بھی نمایاں نہ تھی +

ضمیر نے نفس کا گلا گھونٹ کر مغلوب کیا۔ اس کے سینے میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ وہ دنیا سے، دنیا والوں سے۔ مشیتِ ایزدی سے انتقام لینے کے لئے اس بدترین فعل کا مرتکب ہوا تھا لیکن آہ! کیا یہی دنیا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ وہاں سے واپس مڑا۔ اس کی حالت اس وفادار ملازم جیسی تھی جس کو مالک نے بغیر قصور کے مار مار کر گھر سے نکال دیا ہو۔ اور پھر بھی اُس کا دل وہاں سے جانے کو نہ چاہتا ہو اور بار بار مڑ مڑ کر اُس گھر کو دیکھتا ہو۔ طالب علم کو بڑے انتظار کے بعد اپنی ناکامیابی کی خبر پہنچی تھی وہ اُس کتے کی طرح تھا جو طاقتور کتوں کو دیکھ کر دور ہی دور جا رہا ہو اور کبھی کبھی پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا ہو۔ بوڑھے کو شکست ہوئی۔ پسپا ہو کر گھر کو لوٹا۔ ضمیر اُسے اندر ہی اندر بیقرار کر رہا تھا۔ پشیمانی سے اُس کی پیشانی پر پسینہ کے دریا بہہ نکلے۔ اُسے اپنے ضمیر سے شرم آ رہی تھی۔ وہ اپنے ضمیر سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ گردھاری کو اُس کے والدین کے روبرو حاضر کریگا۔ اگر وہ یہ کریگا تو سپاہی .... جیل .... قید .... بلاشبہ ان سب مصیبتوں کو بھگت لے گا۔ لیکن وہ ضرور گردھاری کو واپس کر دے گا۔ اور صاف طور پر ساری حقیقت بیان کر دے گا۔ ذرہ بھر جھوٹ نہ بولے گا۔ سچ بولنے سے اُس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا +

وہ انہیں خیالات میں غرق اپنے مکان کے نزدیک پہنچ گیا تو اُسے بوڑھی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ بوڑھے نے تیز تیز قدم اُٹھائے۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ گردھاری نیم جان گھاس پر پڑا ہوا ہے۔ اور بوڑھی آہ و بکا کر رہی ہے۔ اسے معلوم ہوا۔

کہ لڑکا گھاس چھیل رہا تھا یکا یک آسے سیاہ زہریلا سانپ ڈس گیا ۔ تھوڑی دور ایک گوالا رہتا تھا کہ سانپ کا منتر جانتا تھا ۔ بوڑھا اُسے دوڑ کر بلا لایا ۔ وہ کئی بار لڑکے کے کان میں چلّایا ۔ شور مچایا ۔ پانی کے گھڑے سر پر اونڈیلے ۔ ہزار جتن کئے ۔ لیکن بازیافت نہ ہوئی ۔ لڑکا آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوگیا ۔ بوڑھا سر پیٹ کر بیٹھ گیا ۔ اُسے شکست ہوئی ۔ اور فاش شکست ہوئی ۔ مشیتِ ایزدی کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ تھا ۔

(خاص) خلیلؔ بی ۔ اے

مُلوکیت

از جناب غلام موسیٰ خاں کلیمؔ بی ۔ اے

اندوہ کے بادل چھائے تھے تنویرِ مسرت عام نہ تھی
تذلیل تھی ہر سو انساں کی کچھ منزلتِ عوام نہ تھی

دریائے ستلج ہر تنکے کو لہروں میں بہلائے جاتا تھا
آزادی کی مے عالم میں مدت سے رہینِ جام نہ تھی

شیرازۂ عمر پریشاں تھا خاموش تھے ہر سو سازِ تپش
یخ بستہ تھا ہر اک ذرہ کچھ گرمئے زیرِ دام نہ تھی

مزدورِ غریب و بیکس پر پیوستہ جفائیں ہوتی تھیں
ہر نوعِ ستم محبوب رہی اور رسمِ جفا بدنام نہ تھی

خواجہ کے نہالستانِ طرب پیتے تھے لہو مزدوروں کا
ہر جانب قہر برستا تھا خونخواریٔ انساں رام نہ تھی

آزادیٔ فطرت نالاں تھی تقدیر کی اس رُخ گردش پر
سب حور و ملک تھراتے تھے کیوں محویتِ انجام نہ تھی

کب گرد غریبوں کے سر پر اُڑتی نہ کلیمؔ یتیمی کی !
کب صبحِ ضعیفاں دنیا میں بازوئے ستم سے شام نہ تھی

(خاص) کلیمؔ

راجکمار اور شیلا

از جناب محمد نواز خاں صاحب اسلامیہ کالج لاہور

(۱)

جب رات کی شہزادی اپنا فسوں پڑھتی ہوئی آتی۔ اور کائنات پر اپنی تاریک نقاب ڈال دیتی۔ عین اُس وقت اودے پور کے شاہی محلات سے ایک مغموم نغمے کی دھیمی دھیمی صدا بلند ہوتی۔ شہر کے درو دیوار پر سکون و خاموشی کا سماں طاری ہو جاتا۔ پرندے دفعتاً نیند میں محو ہو جاتے۔ کمسن بھولی بھالی لڑکیاں نیند کی آغوش میں سو جاتیں۔ اور سوائے اُس پر درد نغمہ کی خاموش صدا کے جو گلی کوچوں میں گھومتی ہوئی آبادی سے دور جنگل کی طرف نکل جاتی۔ ہر شے پر نیند کا خمار چھا جاتا ——— یہ ایسا مغنی اودے پور کی ریاست کا چشم و چراغ تھا ——— بانکا چھبیلا جوان، حسن ظاہری و باطنی سے آراستہ خلق و مروت کے جوہر سے پیراستہ، اور فہم و فراست کے زیور سے مرصع۔ جس طرف سے گذرتا، مہ جبین ذرشتہ خصلت لڑکیاں، کواڑوں میں چھپ چھپ کر اس کی من موہنی صورت کا نظارہ کرتیں۔ اس لئے نہیں کہ عنفوان شباب کی اُمنگوں سے بیقرار تھیں۔ نہیں محض اس لئے کہ اُس چاند سے مکھڑے پر حسن کی ضیا پاش کرنوں میں نہاں ایک روحانی نور ان کو نظر آتا تھا۔ اور وہ خیال کرنے لگتی تھیں کہ یہ دیوتا، یہ مجسمہ نور جسے وہ ذریعہ پرستش بنانے کو بیتاب تھیں، عنقریب راجستھان کی پرانی عظمت کو بیدا کرے گا! ———

وہ صرف لمبی لمبی زلفوں، بانکے سجیلے متناسب اعضا اور موٹی موٹی سیہ چمکدار آنکھوں والا جادوگر ہی نہیں تھا۔ بلکہ جنگ کے اصولوں سے واقف، تیر و سنان کا ماہر، تلوار کا دھنی، نڈر شہسوار اور میدان جنگ میں گرجتا ہوا شیر اور جنگجو راجپوت تھا۔ حمیت و حریت کا گرم اور پاک خون اسکی رگوں میں موجزن تھا۔ اپنے دیس کے زن و مرد کے نام و ناموس کی حفاظت میں ہمیشہ سرگرم اور خدمتِ ملک و قوم میں ہمیشہ منہمک تھا۔ راجستھان کی سرزمین کا چپہ چپہ اُسے اُس کی سوئی ہوئی عظمت و جہانداری کی یاد دلا دلا کر خون کے آنسو رلاتا تھا۔ اس خطۂ پاک کو جو شجاعت و مردانگی کا گہوارہ تھا۔ وہ ..... آزاد دیکھنے کے لئے بیچین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف اپنی راجدھانی بلکہ راجستھان کی کل آبادی کا مایۂ ناز راجکمار تھا۔ ریاستوں کے راج اس کو پیار کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اس کی تعظیم کو ثواب خیال کرتے تھے۔ اور حور صفت دوشیزہ شہزادیاں اُس سے غائبانہ عشق رکھتی تھیں۔ منتیں مانتی تھیں مندروں پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔ تاکہ وہ سندر صورت راجکمار اُنہیں اپنی خدمت میں قبول کرلے۔ لیکن وہ عورت اور محبت کے لفظ سے متنفر تھا۔ اسکے نزدیک ملک و قوم کی خدمت کرنا بہ نسبت الفت کی الجھنوں میں پڑنے کے زیادہ ضروری اور اہم تھا۔ اسی لئے اُس نے کتنے ہی شادی کے پیغام صرف ہنس کر رد کر دیئے تھے۔

گو زندگی کی لطافتیں اور عیش و عشرت کے سبھی سامان مہیا تھے۔ لیکن اُس کے دل میں ایک ہیجان سا تھا۔ جسے دور کرنے کے لئے کسی برابر کی حساس طبیعت کا ہونا ضروری تھا۔ اور اسی کی اُسے تلاش بھی تھی! وہ جویا تھا کسی ایسے صمیم کسی ایسے مشیر کا جو اُس کے سینے کے تلاطم کو فرو اور اس کے دل کے اندرونی خلا کو پر کردے۔ یعنی اُسے اس رمز سے آشنا کردے، اُسے وہ شراب ناب پلادے۔ جس سے وہ خیالات کی پیچیدہ گتھی کو سلجھا سکے۔ ——— آرام و آسایش سے اُسے نفرت تھی۔ دن بھر غربا و مساکین کی امداد کرتا بیکس اور محتاجوں کی دستگیری کرتا۔ اور جب کبھی دل برداشتہ ہو جاتا۔ تو باہر باغات کی فضاؤں کی طرف نکل جاتا۔ پانیوں کے دلکش منظر اور باغوں کے جانفزا نظارے دیکھ دیکھ کر اُس کے دل پر ٹھیس لگتی کہ ہیں یہ جنت نظیر خطہ اور فلاکت و تباہی کا مسکن! ——— الغرض دن بھر قوم کے منتشر شیرازہ اتحاد کو ایک سلک نظم میں منضبط کرنے کے وسائل سوچتا اور جب شام ہوتی تو بانسری سے روح نواز راگ گاتا ہوا پھر جنگل کی طرف نکل جاتا۔ اور سپیدۂ سحر کے آغاز پر واپس آجاتا۔

جب شام کے وقت وہ حسب معمول اپنی دُھن میں مست بازار سے گذرا کرتا تو اُس کے کانوں میں کبھی کبھی کسی نغمے کی خفیف سی صدا گونج کر رہ جایا کرتی اور اُس کے خاموش تخیل کو ایک لمحہ کے لئے مضطرب کردیتی۔ لیکن جلد ہی وہ...

تخیلات کی فضاؤں میں محو پرواز ہو جاتا۔ اور پھر جب صبح کے وقت وہ کھلی فضاؤں سے آبادی کی طرف قدم بڑھاتا۔ تو پھر اُسی نغمہ کی دھیمی صدا اُس کے کانوں سے ٹکراتی لیکن وہ اپنے خیالات میں اتنا محو ہوتا کہ اسے اس کا ہلکا سا احساس تک نہ ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اُس کے دماغ کے پچھلے پردہ میں اس آواز کا ہلکا ہلکا اثر آہستگی سے گونجتا رہ جاتا ——— ! جب آخر شب کے وقت شہزادیِ شب رخصت کی تیاریوں میں مصروف ہوتی اور صبح کے آثار قریب تر ہو جاتے۔ راجکمار آہستہ آہستہ بہنے والی ندی کے کنارے اُس کی سرگوشیوں کو سنتا ہوا مشرق کی طرف کو چلنے لگتا' تو وہی آواز اُس کی یکسوئی میں خلل انداز ہوتی۔ اس صدا میں کچھ غیر معمولی دلکشی او کشش ہوتی اور راجکمار کا دل بیقرار ہو کر ناچنے لگتا۔ حتیٰ کہ اُس کے کان اس پیاری آواز سے اسقدر مانوس ہو گئے کہ اُس کے دل سے خود بخود صدائیں آنے لگیں کہ یہی وہ صدا ہے جس میں تیری تمنا کا حل موجود ہے !

ایک رات کہ ابھی تاریکی کے آثار نمودار تھے۔ چھٹے ماندے تارے قریب قریب معدوم ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ گم ہونے والی اُداسی لحظہ بلحظہ بڑھنے والی ضیائے سحری کے آگے ماند پڑ رہی تھی۔ راجکمار اُس سمت کو چل پڑا۔ جدھر سے اُن دلکش نغموں کی صدا آ رہی تھی ——— ندی کا صاف شفاف پانی اور اس کی خاموش روانی' کنارے پر اُگی ہوئی گھاس اور ہرے بھرے درختوں کا پانی میں مخمور عکس' اور اُجلی ریت پر سیپیوں کا چمکدار منظر دیکھ کر راجکمار کچھ عجیب مسرور رہوا۔ اور اس کے قدم عالم انبساط میں مستانہ وار پڑنے لگے۔ گونجتی ہوئی دور سے آنے والی صدا رات کے خاموش منظر میں کچھ عجیب بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ جوں جوں وہ نزدیک ہوتا گیا۔ وہ ان ہوش کن نغموں کے اثر سے بہوت بنتا گیا۔ کبھی چلتے چلتے کھڑا ہو جاتا۔ غرض اسی مجنونانہ انداز میں وہ اُس نغمہ کے قریب پہنچ گیا۔ اور حریص نگاہوں سے اُس منظر کا معائنہ کرنے لگا۔ جو اُس کے پیش نظر تھا ——— ندی کے کنارے ایک خوشنما چٹان پر بیٹھی ہوئی ایک حد سے زیادہ حسین صورت اپنے ستار سے نغمات کی روح فضا میں بکھیر رہی تھی۔ اُس کے پاؤں بہتے ہوئے پانی سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ اور پانی بھی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا اُس کے قدموں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ وہ بظاہر اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھی۔ اور ستار کے تاروں کو عجب شان دلربائی سے حرکت میں لا رہی تھی۔ سادگی اور معصومیت کا عالم اُس کے حسن پر عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ راجکمار کا دل نئے حسیات کے برقی اثر سے مضطرب ہو رہا تھا۔ اُس نے کتنی دفعہ ارادہ کیا کہ اپنے آپ کو اس آسمانی حور کے حضور میں حاضر کرے لیکن اُس کے ضمیر نے اس کا اثر اس کے دل سے زائل کر دیا لیکن اس منظر کا دھندلا سا نشان اُس کی روح پر مسلط رہ گیا۔ اور اس صورت کی تڑپتی ہوئی یاد اُس کے دل میں ———!!

———(۲)———

شیلا قدرتاً حساس اور رنگین طبیعت تھی۔ موسیقی اور شاعری سے خاص دلچسپی بلکہ عشق رکھتی تھی۔ وہ ہر شے میں سادگی کی جھلک کو پسند کرتی تھی۔ زیب و زینت کے اسباب سے متنفر تھی لیکن قیمتی اور پر تکلف لبوسات کے بغیر بھی اُس کے حسن میں وہ دلکشی اور جاذبیت تھی کہ آسمانوں کی معصوم مخلوق بھی اس ارضی حسن کو دیکھ کر محو حیرت تھی۔ اس قدرتی حسن پر اضافہ وہ خوبیاں تھیں جو شریف خاندانوں میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ شہر بھر میں اس کی خوبیوں اور حسن آفرینیوں کے چرچے تھے۔ اور کئی شہزادے وزیر کی اکلوتی لڑکی کی محبت میں گرفتار تھے ——— وہ صحیفۂ قدرت کا ہر وقت مطالعہ کرتی تھی' اور قدرت کی ہر ایک حسین شے پر دل و جان سے فریفتہ تھی۔ جب وہ قدرتی مناظر میں سلسلۂ اتحاد کو دیکھتی تو اُس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ اور آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچتی کہ ضرور انسانی ہستی کی بقا کا راز بھی باہمی الفت میں پوشیدہ ہے۔ الفت جس کا معیار بلند ترین ہو۔ جب کتابوں کے مطالعہ سے گھبرا جاتی۔ تو اپنی لگائی ہوئی پھلواڑی میں آ جاتی۔ اور گھنٹوں محو تخیل رہتی۔ جب شام ہوتی تو ستار کو اُٹھاتی اور اپنی سفید اور لمبی لمبی انگلیوں سے اُس کے تاروں کو چھیڑتی۔ وہ حرکت میں آتے اور فضا میں نغمات کی روح طاری ہو جاتی !

جب رات قریب الاختتام ہوتی تو وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ندی کے گھاٹ پر اشنان کرنے جایا کرتی۔ سہیلیوں سے الگ ہو کر ایک چٹان پر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتی۔ کبھی ندی کی سرگوشیوں کو سنتی اور کبھی کوہسار کی خاموشی پر حیران ہوتی۔ اور کبھی چمکتے ہوئے ستاروں سے ہمکلام ہوتی لیکن جب اُس کے تخیل کا طلسم ٹوٹتا تو پکار اٹھتی "اے الیشور! ان مناظر میں محبت کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں"!

ایک رات کہ بہار کی تمام تر رنگینیاں کائنات پر چھائی ہوئی تھیں۔ شیلا کی شاعرانہ طبیعت بھی اپنی مستی کے انتہائی منازل پر پہنچی ہوئی تھی جیسا کا عجب عالم تھا۔ کہ ذرا سی تحریک سے بھی اُس کے تخیل کا چشمہ اُبل پڑتا!

کسی طرف کو بہہ نکلتا کہ راجکمار مستی کے عالم میں ادھر سے گذرا۔ اُس کے نغموں کے میٹھے میٹھے تاثر نے شیلا کی روح کو گرما دیا۔ وہ فوراً ہی اُڑی اور اُڑ کر راجکمار کے جسم میں داخل ہوگئی۔۔۔۔ !!!

جس دن سے شیلا نے راجکمار کے آسمانی نغموں کو سنا تھا اُس کی روح بے چین تھی۔ وہ ستار کو اُٹھاتی تو اُس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ اور راجکمار کے بے لوث نغموں سے مرعوب ہوکر رہ جاتے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ پاکیزہ نغمے اُسے اپنی طرف پکارتے ہیں۔ ان میں محبت کی کشش ہے اور اُنہیں سمیٹ لینے کی کوشش کرتی تاکہ صرف اپنی بیتاب روح کے لئے وقف کرلے مگر راجکمار آتا اور اپنی دھن میں سرمست نکل جاتا۔ مگر آہ! اُسے کیا خبر تھی کہ کسی پر کیا کیفیت طاری ہے! اور شیلا بیچاری انجان شیلا کا معصوم دل کن شورشوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اور اس میں اس کی محبت کا اتنوا بیج بویا جاچکا ہے۔ اور محبت کے لطیف حیات اور میٹھے میٹھے تاثرات قلبی نے اُس کے نظامِ حیات کو کس طرح بدل دیا ہے!۔۔۔ بھولی بھالی شیلا جو نہیں جانتی تھی کہ اب اس کا دل کیوں اس طرح تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ اندر ہی اندر تلملاتی۔ کلیجے کو ملتی۔ میٹھا میٹھا درد رہ رہ اُٹھتا اور وہ مضمحل۔ مگر جوں جوں بانسری کی صدا مدہوش دور ہوجاتی۔ اُس کا اشتیاق زیادہ بھڑکتا حتیٰ کہ تاثرات کی تیزی میں اسقدر بہ جاتی کہ اس بانسری والے کو اپنے پاس محسوس کرنے لگتی اور اُس کے قدموں پر گر کر کہتی "اے کرشن کنہیا مجھے اپنی جوگن بنا لو" لیکن جونہی یہ طلسم ٹوٹتا۔ وہ پھر مادی دنیا میں واپس آجاتی اور اس پہلی حالتِ جذب کا خیال کرتی، تو کلیجہ پکڑے کھڑی رہ جاتی۔ مگر پھر بھی خوش ہوتی کہ اس کی محبت کا مرکز ایسا شخص ہے جو اُس کی اندرونی گہرائیوں میں ایک نرم و لطیف نغمے کی طرح جذب ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ نازاں تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے پاک اور بے لوث محبت ۔۔۔۔ لیکن اس جانکاہ زندگی اور امید و بیم کی کشمکشوں سے وہ تنگ، بہت تنگ آچکی تھی۔ اور اُس کی مایوسی انتقام کے درجے کو پہنچ چکی تھی۔ وہ پایانِ کار ارادہ کرچکی تھی کہ اپنی طاقت کو بھی آزما دیکھے!!!

ایک رات کہ ماہِ منور اپنی پوری رعنائیوں سے نیلگوں آسمان پر جلوہ فرما تھا۔ زمین و آسمان پر دلفریبیاں اور گلکاریاں چھائی ہوئی تھیں شیلا نے اپنے نازک کانپتے ہوئے ہاتھوں کو مضبوط کرکے اپنے جادو اثر ستار کو اُٹھایا۔ جونہی کہ راجکمار کا نغمہ کانوں میں پڑا وہ کانپ اُٹھی۔ اور قریب تھا کہ رباب ہاتھوں سے گر پڑے۔ کہ نسوانی عزم و استقلال نے دامن پکڑا اور جھٹ سے اُس کے ہاتھ نے ستار کے تاروں کو جنبش دی۔ پھر کیا تھا۔ لطیف راگنیاں نکل کر فضا میں محیط ہوگئیں۔ فضا مخمور ہوگئی۔ اور فرشتوں نے جھانک جھانک کر دیکھنا شروع کیا کہ کسی بربط نواز نے مستی، مخموری اور خواب کا سا عالم طاری کردیا!۔۔۔ شیلا جس کی تمام روح سمٹ کر ستار کے تاروں میں آگئی تھی۔ اور جس نے حیات و موت کا راز معلوم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ زور اور پوری طاقت سے اپنی چمکتی ہوئی سفید انگلیاں اُن پر دوڑانے لگی۔ آسمان پر مستی طاری ہوگئی۔ دیوتا انگشت بدنداں کہ ایسا سخت مقابلہ! لیکن رفتہ رفتہ راجکمار کے نغمے ڈھیلے پڑنے لگے۔ اور آخرکار ایک مے نوش کی طرح مخمور ہوکر اُس کی بانسری سے ایک مبہم اور بے ترتیب سا کانپتا لرزتا ہوا نغمہ نکل کر وہ بت کی مانند کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اور حیران کہ کیا ماجرا ہے!

"اُف نغمہ اور اتنا مکمل! درد انگیزی سے لبریز! سوز و الم سے بھرپور، لحن داؤدی میں ڈوبا ہوا نغمہ کتنا پرکیف اور خالقِ جذبات!۔۔۔۔۔۔۔

ہاں یہی وہ نغمہ جسے میں نے اوّل اوّل ندی کی دلفریب کھلی فضاؤں میں تھرتھراتے ہوئے سُنا تھا! یہی نغمہ جس کا اثر میری روح پر مسلط رہ گیا تھا۔ آہ وہ منظر جسے پھر دیکھنے کے لئے میں ابتک تڑپ رہا ہوں!۔۔۔۔ میں محو ہوا جاتا ہوں اور مخمور۔ میری روح کو یہ جانگداز نغمے کیسے کھینچے لئے جاتے ہیں!۔۔۔۔ اور ہاں میرے سینے کا تلاطم فرو ہوا جاتا ہے۔ میرے دل کا ہیجان دور ہوتا جاتا ہے۔ میری روح کو تسکین اور سرور حاصل ہو رہا ہے۔ ہاں میں اب اپنی منزل کے قریب پہنچ رہا ہوں!" تھوڑی دیر محوِ تخیل رہ کر "کون ہے وہ جس کی الم ریز موسیقی میری روح کی عمیق ترین گہرائیوں میں سرایت کررہی ہے ضرور وہ کوئی آسمانی حور ہوگی۔ اے کاش وہ میری نظروں کے سامنے آسکے!۔۔۔

یہاں پہنچکر راجکمار کا تخیل ٹوٹا اور فوراً وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگا۔ ایک طرف عشق و محبت کی دیوی اور دوسری طرف فرض شناسی کا دیوتا! شیلا اس کشمکش جذبات کو برداشت نہ کرسکی۔ ستار کے نغموں کے ساتھ ساتھ اپنی موسیقار آواز کے سریلے اور دانش فریب سروں کو نکالنا شروع کیا۔ کائنات سوز و الم کے مدوجزر میں پنہاں ہوگئی اور راجکمار مخمور شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ شیلا جو اس وقت مجسم موسیقی بنی ہوئی تھی اُس نے فتح، مکمل فتح حاصل کرنے کے لئے نغموں کے سوز و گداز کو اور تیز کیا۔ موسیقی سے در و دیوار گونجنے لگے۔ راجکمار کی روح میں عشق کی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں اور شعلے بن کر چمکنے لگیں۔۔۔ عین اُس وقت شیلا فاتحانہ انداز میں مسکرا کر شوخی سے لرزتی ہوئی

اٹھی اور فرطِ مسرت میں دریچہ سے جھانکا تو راجکمار مستانہ وار کہہ رہا تھا:۔ ”اے حسینہ! میں تیری شمعِ حسن کا پروانہ بن جاؤنگا۔ ہم نغمے گائیں گے اونچے اونچے سربفلک پہاڑوں کی چوٹیوں پر، سرسبز و شاداب مرغزاروں میں، شوخ اور خوشبودار پھولوں سے لدی ہوئی خیابانوں میں، بہتے ہوئے صاف شفاف پانیوں میں، گائیں گے ہم عشق و محبت کے ترانے گائیں گے۔ پُر فضا وادیوں، سایہ دار جنگلوں میں ہر طرف نغمات کی روح دوڑائیں گے لیکن اے حسینہ دیکھ کہ تارے میرے ایک ایک کرکے ٹپکنے والے آنسوؤں کی طرح گم ہو رہے ہیں، آ کہ صبح ہوتے ہوتے تاریک دنیا سے دُور کسی رنگین بستی میں پہنچ جائیں!

——”اے خوبصورت نوجوان! میں اس قابل نہیں کہ تیری شریکِ حیات بن سکوں۔ کتنی ہی پر جمال شہزادیاں تجھ پر فریفتہ ہیں۔ جا اُن سے رسمِ الفت استوار کر۔ میں آسمانی مخلوق ہوکر زمین پر کس طرح قدم رکھ سکتی ہوں میرا مسکن آسمان کی دلکش فضا میں۔ بہتے ہوئے چمکدار پانی۔ پھولوں سے مہکتی ہوئی وادیوں اور پھلوں سے لدی ہوئی خیابانوں میں ہے۔ نہیں نہیں جا ملک و قوم کو تیری ضرورت ہے۔ جا انہیں خطروں سے بچا“——

”متاعِ جان و مال! میں تیری زلفوں کا اسیر ہو چکا۔ میری روح کی زبردست تمنا تھی، کسی ایسے ہمدم کے لئے جو میرے سینے میں سُلگتی ہوئی آگ کو بجھا سکے۔ اس میں جو تلاطم بپا ہے اُسے فرو کر سکے۔ میرے دل میں خواہش تھی ایک ایسے مونس کے لئے جو میرے غم و درد میں شریک ہو کر میرے ارادہ کو تکمیل تک پہنچائے اور اس تکمیل کا راز میرے سنہری خوابوں کی تعبیر فقط تم ہو! بیشک ملک و قوم کو میری ضرورت ہے لیکن تجھ بن اس فرض کو پورا نہ کر سکونگا۔ آجتک میرے ارادوں کی تکمیل کے لئے۔ انہیں عملی صورت میں متشکل کرنے کے لئے۔ مجھے کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی۔ میں سوچتا تھا، تدبیریں ڈھونڈھتا تھا لیکن دل کی آتش کو زیادہ بھڑکانے کے سوا ان سے کوئی کام بن نہ پڑتا تھا لیکن آہ! آج مجھے وہ راز معلوم ہو گیا۔ وہ اکسیر مل گئی۔ جس سے میرے ارادوں کو تکمیل کی لذتوں سے ہمکنار ہونا ہے۔ آہ! مجھے تجھ سے محبت ہے! آ کہ غمہائے دنیا کو فراموش کرکے زندگی کے دن خوشی کو نذر کریں۔“

شیلا ان الفاظ کو زیادہ دیر تک سن نہ سکی۔ راجکمار کے اضطراب کو دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ اور خوشی اور محبت کے موتیوں کو بکھیرتے ہوئے کہنے لگی:۔ ”راجکمار! تیری شیلا تیرے سوا کہاں جا سکتی ہے!“ راجکمار کے تخیل کا طلسم ٹوٹ گیا——”ہیں کون شیلا؟“——”ہاں شیلا ہی جس نے یہ راز کسی جذبہ سے متاثر ہو کر بہت پہلے معلوم کر لیا تھا، مگر دیکھ رات کا آخری تارا ابھی تقریب قریب مٹا چاہتا ہے، نا معلوم صبح ہم پر کن کن مصیبتوں سے طلوع ہوگی!!——

(۳)

حسبِ معمول جب ساحرۂ شب صفحۂ دنیا پر تاریکیوں کی چادر پھیلا دیتی فضا میں وہ تھرتھراتے ہوئے نغمے بلند ہوتے اور دونوں متضاد سمتوں سے در و دیوار پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ زمین کانپتی اور آسمان کے مضبوط ستون ہلنے لگتے جب دونوں نغمے یکجا ملتے۔ اُن کی سنہری موجوں سے فضا مرتعش ہو جاتی۔ اور دنیا نغمہ زار میں تبدیل ہو جاتی۔ عشق و محبت کی باتیں، درد و غم کی حکایتیں۔ دوری و جدائی کی شکایتیں، ایک دوسرے تک پہنچاتے۔ اپنی بے بسی کا رونا روتے اور فلک ستم شعار کی کج نظری کا شکوہ کرتے——خلقت حیران ہوتی کہ کیا ماجرا ہے۔ دو سمتوں سے نغمہ اُٹھتا ہے اور ایک ہو جاتا ہے۔ آسمان پر دیوتاؤں کے سینے کانپ کر رہ جاتے جب آسمان بیخود ہو کر جھومنے لگتا! اور سوز و گداز کی تانوں سے فضائے عالم پر سکوت چھا جاتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا میں حیات کی کشمکشوں اور ہنگامہ آرائیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے!——

مہارانا اور زیادہ دیر تک اس بھید سے بے خبر رہنا گوارا نہ کر سکا۔ اور ایک رات اس کے انکشاف پر کمربستہ ہو کر اس طرف کو چل پڑا جدھر سے موسیقی کی آواز اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ اور آخر کار اس مقام پر پہنچا جہاں راجکمار اپنے نغموں کے تلاطم میں مستغرق بیٹھا آنسوؤں کے ہار پرو رہا تھا۔ مہارانا ان نغموں کے اثر سے مخمور ہو کر سکتہ کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ اور اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ مغنی کس وقت وہاں سے اُٹھ کر اس خوشنما چٹان کی طرف تنا جو پھلدار درخت کے نیچے گنگناتی ہوئی ندی کے کنارے واقع تھی۔ چلا گیا تھا!۔ لیکن جس وقت وہ ہوش میں آیا تو فوراً نغموں کی کشش سے خود بخود کھنچتا ہوا اُدھر کو چل پڑا۔ اور وہاں اس نے جو منظر دیکھا۔ اس کی دلکشی اور جاذبیت سے مدہوش ہو کر مستانہ وار جھومنے لگا!—— اوپر آسمان پر تارے دم بخود تھے۔ نیچے ندی کا پانی خاموشی کی لے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور چٹان کے دونوں طرف سے راجکمار اور شیلا اپنی اپنی موسیقی کی طاقتوں میں پنہاں ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھائے چلے آتے تھے۔ گویا سازِ محبت کے دو نغمے خاموش فضا میں گونجنے کے بعد ایک دوسرے کی آغوش میں ایک

ہو رہے ہیں۔ اتنے میں ندی کے پانی میں حرکت پیدا ہوئی اور اس منظر کی کیف آور موسیقی سے بیقرار ہو کر ایک لمحہ کے لئے چٹان کی طرف اُچھلا اور پھر ساکت ہو گیا۔ تارے ایک لمحہ کے لئے پھر چمکے اور چک کر وم بخود ہو گئے۔ اور اپنی راگنیوں کو بند کر لیا! ـــــ اس مدہوش منظر نے مہارانا کی روح کو کچھ عجیب طرح مسحور کر لیا۔ اور جونہی کہ راجکمار اور شیلا دونوں کے مشتاق تھمکنے کو تھے اُس نے فوراً ہی دونوں گراں دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ اور رشتۂ محبت کو استوار کرنے کے لئے اسے ہر طرح سے مکمل کر دیا! . . . راجکمار اور شیلا دونوں مہارانا کے قدموں پر گر پڑے . . . . . .

آسمان پر تاروں نے چمکنا اور اپنا رقص از سرِ نو شروع کر دیا۔ ندی کا پانی حالتِ سکون سے بیدار ہو کر تیزی سے دریا کی طرف بہنے لگا۔ کوہسار کی خاموشی بند ہو گئی۔ اور لطیف راگنیاں فضا میں مدھرنے لگیں۔ ریت کے سفید اور پاکیزہ فرش پر پریوں کے رقص اور گیتوں نے مدہوشی و مخموری کا منظر پیدا کر دیا۔ گویا ہر طرف زندگی لہرانے لگی . . . . . .

آج بھی، کہتے ہیں کہ اودے پور کی فضا میں وہی عشقِ حقیقی سے لبریز نغمے سننے میں آتے ہیں۔ اگرچہ اس افسانۂ محبت کو ختم ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں! اور جو لوگ اس جگہ سیر کو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ندی کے کنارے ایک ویران سی شکستہ چٹان کے نشان موجود ہیں۔ جس پر اگرچہ بے کسی برستی ہے۔ لیکن چاندنی رات میں وہ کیف آور سماں ہوتا ہے۔ کہ آسمان بھی اُسے دیکھ کر آتشِ حسد میں جلنے لگتا ہے ـــــ !!!

(خاص) **محمد نواز خاں**

نیرنگ خیال بک ڈپو میں نئی کتابیں

ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آہستہ آہستہ نیرنگ خیال بک ڈپو کو اسقدر مکمل کریں کہ ہندوستان کے تمام مصنفین کی کتابیں ہماری معرفت ناظرین نیرنگ خیال کو دستیاب ہو سکیں۔ کیونکہ کتابیں خریدنے اور پڑھنے سے بہتر نہ کوئی شغل ہے نہ مصرف۔ ہمارے دفتر میں حال ہیں مندرجہ ذیل کتب پہنچی ہیں۔ ناظرین طلب فرما کر نیرنگ خیال بک ڈپو کی امداد کریں اور خود بھی فائدہ اُٹھائیں۔

(۱) تاریخ اسلام پانچ حصوں میں۔ از جناب مولوی ابو المحمود محمد حامد خانصاحب مکمل سیٹ حجم ۶ سو صفحہ۔ قیمت صہ

(۲) تقاریر مولانا محمد علی۔ مولانا محمد علی کی مشہور تقریروں کا مجموعہ۔ ہر گھر میں موجود رہنا چاہئے۔ قیمت ۸ر

(۳) مشاطۂ سخن، مرقع ادب حصہ اوّل و حصہ دوم ۵۰۰ صفحے قیمت ہے۔ بزم خیال ۱۶۰ صفحہ۔ قیمت ۸ر۔ یہ تینوں کتابیں حضرت صفدر مرزاپوری کی ہیں۔

(۴) انشائے نسواں۔ عورتوں کے لئے خط و کتابت کا ڈھنگ سکھانے کے لئے۔ قیمت ۸ر

(۵) مقدمہ شرح دیوان غالب حضرت نیاز فتحپوری مدیر نگار کے قلم سے ۸۰ صفحہ قیمت ۸ر

(۶) علمی کہانیاں حجم ۷۶ صفحہ۔ ابتدائی تعلیم کی رام کہانی۔ از منشی رام پرشاد۔ حجم ۹۰ صفحہ قیمت ۸ر۔ یہ دونوں کتابیں محکمہ تعلیم میں منظور شدہ ہیں۔ طالبعلموں اور لائبریریوں کے لئے بیحد ضروری۔

(۷) نگارستان۔ حجم ۳۰۰ صفحہ عا۔ گہوارۂ تمدن عا۔ ۲۴۸ صفحہ۔ شہاب کی سرگذشت صفحہ ۱۹۲ عہ، یہ تینوں کتابیں مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار کے قلم سے ہیں اور بیحد مقبول و معروف ہیں۔

ناول: اسرار بالشوزم ۸ر۔ حکایات شرلک ہومز عہ۔ حاجی بغلول ۱۲ر۔ دلکش کامل ۳۰۰ صفحہ عا۔ ڈلگدا نافسانے ۲۰۰ صفحہ عہ۔ انقلاب فرانس صفحہ ۲۰۰ ۸ر۔ ملک العزیز ورجنا صفحہ ۲۳۴ عہ۔ بہرام کی رہائی ۸ر۔

صحابیات۔ از مولانا نیاز فتحپوری۔ حجم ۲۴۰ صفحہ۔ قیمت ہے۔

تاریخ اسلام ہر دو حصہ۔ از مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی۔ قیمت مے۔

تذکرہ اولیائے ہند۔ حجم ۴۰۰ صفحہ۔ قیمت عہ۔

سیر الصحابہ۔ ۵۶۶ صفحہ۔ قیمت للعہ

سپاہیانہ زندگی۔ حجم ۱۳۶ صفحہ۔ قیمت عہ۔

دختران شمشیر۔ حجم ۱۰۸ صفحہ۔ قیمت عہ۔

پتہ:۔ منیجر رسالہ نیرنگ خیال بک ڈپو شاہی محلہ۔ لاہور

رامائن کے چند مناظر

از حضرت نفیس خلیلی، امرت سر

پیدائش رام

گیسوئے شادی ہیں لہرائے ہوئے
چہرۂ گیتی پہ بل کھائے ہوئے
چاندنی ہے اور منظر آزاد ہے
یہ سماں تازہ تریں ایجاد ہے
آنکھ پیمانہ ہے مے نظارگی
گردشوں کا نام ہے سیارگی
لحنِ فطرت اس بلا کا سادہ ہے
پیرِ گردوں رقص پر آمادہ ہے
ظلمتِ عصیاں میں ضو پیدا ہوئی
اور بحظِ ماہِ نو پیدا ہوئی
چشم و دل کے درمیاں پیدا ہوئی
دفعتاً تصویرِ جاں پیدا ہوئی
رنگ نکھرا ہے رخِ ایجاد کا
شور سنتا ہوں مبارکباد کا
قصرِ شاہی میں طلب ہے شاہ کی
راہ تکتے ہیں ستارے ماہ کی
ذکر انعاموں کا سکھیوں میں ہوا
فیصلہ اس کا کنکھیوں میں ہوا
گود میں کوشلیا کی چاند ہے
ماند ہے خورشیدِ گردوں ماند ہے
آج سچ مچ کی مہارانی ہوئی
پہلا موقع ہے کہ من مانی ہوئی

رام کا جنگل سے سوئمبر کیلئے روانہ ہونا

راہِ حق میں راہ رو دیکھا کئے
اہلِ بینش سو کے سو دیکھا کئے
دیر تک اور دور تک دیکھا کئے
آہو، آنکھوں کی چمک دیکھا کئے
ذرّے ذرّے کو طلائی کر دیا
دشت کے دامن کو زر سے بھر دیا
چہچہاتے ہیں پرندے دیکھ کر
سہم جاتے ہیں درندے دیکھ کر
ساتھ ساتھ اُن کے چکور آتے رہے
چال پر مٹنے کو مور آتے رہے
ابرِ رحمت کی گھنی چھاؤں میں تھا
خیر مقدم اس کا صحراؤں میں تھا

رام کی آمد کی اطلاع سیتا کو

صبحدم تازہ ہوا کھانے چلے
آنکھ کو پھولوں سے بہلانے چلے
کون اس گلشن میں جلوہ گر ہوا
باغ رضواں سر بسر منظر ہوا
جھک کے شاخِ گل نے نرگس سے کہا
"کوئی آیا ہے پیاری دیکھنا"
گل کا یہ عالم ہمہ تن گوش ہے
سوسنِ جادو بیاں خاموش ہے
بوئے گل نے راہ میں روکا نہ کیوں
عندلیبوں نے انہیں ٹوکا نہ کیوں
پھول نے غصہ سے رنگت لال کی
"خوب غمازوں نے ہم سے چال کی"
نو عروسانہ حیا چھائی ہوئی
پیاری پیاری آنکھ شرمائی ہوئی
طبع نازک سخت گھبرائی ہوئی
سانس پھولی شکل کملائی ہوئی
روئے گلگوں پر عرق آیا ہوا
آنکھ نے دل پر ستم ڈھایا ہوا
حاضرِ خدمت سہیلی ہو گئی
بوجھنے کو اک پہیلی ہو گئی
جانکی بولی "دہن تو کھولئے!
کچھ میاں منھ سے زباں سے بولئے
کچھ تو کہہ آخر نگوڑی کیا ہوا
کنج گلشن سے جو دوڑی کیا ہوا؟"
بولی "آنکھوں کو زباں حاصل نہیں
لذت حاصل ہے بیاں حاصل نہیں
حسن کو ظاہر زباں کیوں کر کرے
بات اَن دیکھی بیاں کیوں کر کرے
بولتی ہے، دیکھ سکتی کاش وہ
دیکھتی ہے جو، چھلکتی کاش وہ
کاش! تم سنتیں زبانی آنکھ کی
دیکھتیں جادو بیانی آنکھ کی
چشمِ نگراں کو زباں کیونکر کروں
میں نے کیا دیکھا، بیاں کیونکر کروں
رکھ نہ دی قادر کلامی آنکھ میں
رہ گئی یہ ایک خامی آنکھ میں"
"پھول دو کھلتے ہوئے دیکھ آئی ہوں
نور دو ملتے ہوئے دیکھ آئی ہوں
چاند کے ٹکڑے سکھی آئے نظر
آج شاید ہو گیا شق القمر
جلوہ پاشی میں وہ دونوں برق ہیں
مہوشوں میں صرف قد کے فرق ہیں
شکل پائی ہے تمہاری شان کی"
نیچی نظروں مسکرائی جانکی
کیا ہی پیارے ہیں وہ دونوں نیک سے
کاش بیاہی جاؤ ان میں ایک سے
شرم کے مارے سیا شرما گئی
حسن کی سکھیوں میں شامت آ گئی

....

[دھنک کو توڑنے سے جب تمام شہزادے عاجز آ جاتے ہیں تو مہاراجہ انہیں کمزور اور بزدل کا خطاب دیتے ہیں۔ اسوقت لچھمن طیش میں اٹھتے ہیں]

رام، لچھمن کو بٹھاتے ہی رہے
حشر کا دامن دباتے ہی رہے
پُر غضب آواز آئی کان میں
دفعتاً گونجی ترائی کان میں

چشمِ خونی صید سے پیوست کی
اور درندے نے اچانک جست کی
دفعتاً میں ضرغام پیدا ہوگیا
خطرۂ جاں، عام پیدا ہوگیا
یک بیک ہیبت جو چھائی شیر کی
غل ہوا ناگہ! دُہائی شیر کی
شاہ سے بولا "تلافی کیجئے
بزدلی کے لفظ واپس لیجئے"
شیر کو صورت سے پہچانا نہیں؟
آپ نے صحرا ابھی چھانا نہیں
شیر کی ہے گر ضرورت، دیکھ لیں
آنکھ اٹھا کر میری صورت، دیکھ لیں
"یہ، جو اک بویا ہے کانٹا آپ نے
جس پہ ہم سب کو ہے ڈانٹا آپ نے
یہ، جو خم کھائی ہوئی دیوار ہے
یہ، جو بوسیدہ ہے اور بیکار ہے
یہ، جو اک سوکھی ہوئی سی چوب ہے
خاک پر عقرب سا پائے کوب ہے
یہ، جو اک تنکا سا یاں موجود ہے
آج جو سدِ رہِ مقصود ہے
آنکھ کا شہتیر سمجھے ہیں جسے
آپ ٹیڑھی کھیر سمجھے ہیں جسے
تیر آنکھوں کا اشارہ جوڑ دے
توڑنے کی فکر اس کو توڑ دے
شیر اس محفل میں دو موجود ہیں
گر ہمارے امتحاں مقصود ہیں
سرکشوں کو پاؤں میں روندا گیا
بارہا ہم نے فلک اوندھا گیا

چشمِ لچھمن، خوں فشاں ہوتی گئی
تیغ ابرو کی رواں ہوتی گئی
پُرغضب شیرِ ژیاں ہوتا گیا
دم بدم ہیبت فشاں ہوتا گیا
شاہ کچھ محجوب سے ہوتے گئے
حاضریں مرعوب سے ہوتے گئے
کانپ اُٹھی دل کے اندر جانکی
خشمناکی دیکھ کر مہمان کی
اہلِ محفل نے یہ دیکھا غور سے
کچھ دھنش سمٹا ہے اپنے طور سے
شیر غراتا ہوا آگے بڑھا
وشوامتر آتا ہوا آگے بڑھا
روکتا تھا، ایک ہلچل مچ گئی
موت کے پنجے سے محفل بچ گئی
بولا وشوامتر جانے دیجئے
رام کو یہ پیش تحفہ کیجئے
وہ بڑے بھائی ہیں، اُنکا حق ہے یہ
اُن کا آنا ہے کہ از خود شق ہے یہ
اب رگھوبر کا نکلنا دیکھئے
خامشی دیکھی، مچلنا دیکھئے
دھجیاں اُڑتی دھنک کی دیکھئے
جشن آرائی جنک کی دیکھئے
عجز سے، ہاتھوں کو جوڑا فقیر نے
توڑنے کا خیال چھوڑا شیر نے
اژدہے پر شیر نے حملہ کیا
لے کے پنجے میں جو اک جھٹکا دیا
ٹکڑے کر کے پھینک دی انبوہ پر
برق جیسے کوند جائے کوہ پر

واں نہ پھر پھولی سمائی جانکی
ہار پہنانے کو آئی جانکی

ضروری نوٹ:- ایک روپیہ سے کم قیمت کا وی پی ارسال نہیں کیا جائیگا۔ جو صاحب ایک روپیہ سے کم قیمت کی کتابیں خریدنا چاہیں۔ وہ قیمت کتاب معہ محصول بذریعہ ٹکٹ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔ آرڈر جلد بھیجئے ؎

ایک روپیہ (عہ) کی کتابیں تین (۳؍) آنے میں

رعایتی اعلان یہ کتابیں جو ہر ایک پہلو سے نہایت سبق آموز عمدہ اور ملک میں مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ اور جو پوری قیمت پر فروخت ہو رہی تھیں صرف فائدہ عام کی خاطر ایک روپیہ کی کتابیں مجسا تین آنے میں دی جائینگی مگر بہت جلد بھیجیں۔ جو کتاب ختم ہو جائیگی جتنی موجود ہونگی اتنی ہی رعایت کی جائیگی۔ یہ کتابیں ایک روپیہ سے کم نہیں بھیجی جائینگی۔ جو قیمت بدیع اشتہار ہے اُس سے کم ہرگز نہ لی جائیگی جو صاحبان پانچ روپیہ سے زیادہ رقم کا آرڈر دیں گے ان کو چاہیئے کہ چوتھائی قیمت بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال فرمائیں پیشگی کاٹ کر باقی کا وی پی کیا جائے گا۔ محصولڈاک بذمہ خریدار۔ پتہ خوشخط تحریر کریں ؎

مسٹریز آف انڈیا ہر دو حصہ
مسٹریز آف لاہور
مسٹریز آف پشاور ہر دو حصہ
مسٹریز آف افریقہ
مسٹریز آف کوہاٹ
مسٹریز آف پنجاب
مسٹریز آف ساگر
مسٹریز آف انگلینڈ
مسٹریز آف کابل
مسٹریز آف دہلی
مسٹریز آف پولیس
مسٹریز آف جہازات
مسٹریز آف شالامار باغ
مسٹریز آف دنیا
مسٹریز آف سمرقند
مسٹریز آف جاپان
مسٹریز آف کشمیر
مسٹریز آف لوڈ
مسٹریز آف خانگی
مسٹریز آف بیلی
اسرار لندن
مسٹریز آف پیرس

مسٹر رینالڈز کے ناول

خوفناک انتقام
طرحدار معشوقہ
عاشق وطن
نیا اسرار لیڈی
شب محبت
خانہ بدوش لڑکا
نوجوان ایڈیٹر
جانباز سپاہی
بُت شکستہ
قمار باز
نپولین بونا پارٹ
باوفا عاشق
حور حرم
شوق وصل
حسین کی معشوقہ
اسرار حرم
جنت الفردوس
عمر پاشا ملی
اشتاق کام
سپاہی کی دلہن

عجیب و غریب دلچسپ ناول

ریشم تارا
کشمیری کوتوال
[illegible]
چالاک مجنون کا مرقع
آغاز عالم

خون آرزو
نقاب پوش قاتل
فقیری چال
حجاب محبت
ناول اکبر
زینبا کا سفر
کشیدہ بھر خون
بیزار خاوند
ایک انوکھی عورت
گستاخ عورت
وہ عورت جس نے کرکے دکھایا
ایک عورت چار خاوند
خوبصورت مالن
بے صبر عورت
وفادار عورت
چالاک عورت
اکسیر نسواں
فریبی عورت
شیر دل راجکماری
زبردستی کی شادی
محروم وصل
شتر کینہ لڑکی
رشیداں بیگم
یار بیوفا
شیرنی کی گرج
بہن کا سرمایہ
بھائی نے اڑایا
انتخاب دلہن
مایوس دلہن
الف لیلیٰ بطرز ناول
شوہر کی بیٹی
کرنیل کی بیٹی
عالمگیر کی پیاری
بیٹی زیب النساء
خون عاشق
نامراد عاشق
کامیاب عاشق
نیرنگ عشق
آئینہ عشق
گلزار عشق
انجام عشق
شعلۂ عشق
قتل عشاق
عاشق صادق
ناکام محبت
بدقسمت معشوقہ
انجام الفت
راز دل
گلدستہ پارسائی

نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب	نام کتاب
وصل ممتاز	ہیر رانجھا بطرز ناول	جنٹلمین بنے کیوں	ملک عدم کی خبریں
عورت کا قاتل	خون مظلوم	میری مٹی خراب کی	فاتح بنگال
انجام محبت	کنیز فاطمہ	شکوک پولیس	بارہ مصالح کی چاٹ
کشتۂ محبت	کامنی	پھر تو آج سے	محبوب کشمیر
شہید ادا	شمشیر ہر دو حصہ	میری زوجہ نہیں	ناول مریم
رشک قمر	لال کپتان	ناول دلسوز	بھائی کا جھگڑا
کامل عیار	نیم حکیم خطرہ جان	گدڑی میں لعل	قیامت ناول
خوبصورت ڈاکو	جانگاہ	واقعات عجیب یورپ	بنگالی دیوی
انارکلی کلاں	جفائے پدر	امیر [illegible]	مریض الفت
راز محبت	درگیش نندنی	سچی قربانی	نیا اسرار سوسائٹی
اسرار حسن	نقلی بابو	عیار [illegible]	جواہرات کا ڈبہ
انمول ہیرا	بنگالی جنٹلمین	[illegible]	فسانہ نکات تصدق
یوسف زلیخا ناول	زن جورو کا شوہر	عزیزہ بانو	ہم خرما و ہم ثواب
نظارہ عبرت	منوہر لتا	مسعود و جمیلہ	فاتح ملتان
چھماتا مرگ	خودکشی	سنہری چڑیا	گمشدہ جواہرات
میرے خاوند کا راز	صبح زندگی	بائسکل کا شوقین	مرقع اقوام عالم
جمیل و شکیلہ	رسم و رواج	تحفہ جہانبان	نتیجہ بدی
[illegible] بطرز ناول	چالاک مرد	سفید ڈاکو	مرزا [illegible]
سچ دلال	رشک حور	انجام ستم	گورو گوبند سنگھ جی
نزاکت حسن	فریب محبت	عبداللہ و مہرالنساء	گورو تیغ بہادر
عبرت انگیز ناول	نل دمینتی	احمد خان کابلی	مہاراجہ رنجیت سنگھ
[illegible]	موت پر فتح	ناول ثریا	ہری سنگھ نلوہ
محبوبہ کا قاتل	جوہر زندگانی	گنجینۂ سخن	مہارانا پرتاپ سنگھ
خدائی توپ	قتل سکندر	حکیم صاحب	گورو نانک دیو جی
حسن کشمیر	ممتاز ناول	آسمان کی سیر	مہاراج
شہنشاہ جہانگیر	عشرت و نزہت	[illegible]	راجہ [illegible] راج
محبوبہ گردش	جان اسیر	[illegible] برباد	مہارانا امر سنگھ
انتقام ہر دو حصہ	آفت نصیب	[illegible]	سری کرشن جی
روح پیلے	نیرنگ دنیا	رئیس ننگ	مہاراجہ سری رام
تقدیر کا چکر	من موہنی	عقل کی مشین	چندر جی
دھوکہ یا کمالات	[illegible] دھرم	دہلی کا مظلوم [illegible]	راجہ ہری چند
انگلستان	مذہبی قربانی	خوفناک قتل	بکرماجیت اعظم
جادوگر	عیار ملزم	حنیف ستمگر	مہاتما بدھ
آہ مظلوم	شیخ عرب	[illegible] صورت	مہاراجہ بھوج
گردش تقدیر	شادی غم	[illegible]	رانا سانگا
ہفت عجائبات عالم	[illegible] دلنواز	نتیجہ بعد کیا ہوگا	سوامی دیانند سرسوتی

ہنومان کا جیون چرتر
راجہ بیربل
حیات [illegible]
ملا دو پیازہ
حالات تان سین
تانتیا بھیل
کولمبس
جلال الدین محمد اکبر
شہنشاہ ہند
سکندر اعظم
شیخ ابوالفضل
حضرت ابوبکر صدیق
حضرت عثمان رض
دوست محمد خان
قطب الدین بختیار کاکی
حیات حیدر
حیات ٹیپو سلطان
شہنشاہ بابر
حیات اورنگ زیب
حاتم طائی
آئینہ سکندر
قیس عامری مجنوں
پدمنی
چنچل کماری
گوکلا کماری
تارامتی سیوبا
مہارانی اودے پور
ارگل کی رانی
قزاق کی بیٹی
خواتین اسلام
حیات ملکہ چین
نواب زینت النساء بیگم
نورجہاں جہانگیر
[illegible]
بھارت کی مشہور دیویاں
شکنتلا ناٹک
پھول بھلیاں
گلزار زینہ
خون دلربا
مرد بیوفا
اٹھا جنازہ
دارالقضاہ
خوبصورت بلا
ساجد بھرتری
انجام حاسد
انجام ظلم
کنک تارا
اسیر حرص
ستارہ گردش
حقیقت [illegible]

موتیوں کی لڑی
جنتر درپن
گلزار لطیف
آئینہ رسائش
شفائی ہند کے اسباب
فرائض والدین
گلشن بہار
رنگین سخن
میرا کھیل
کھلونا عجیب
شعرا کی نازک خیالیاں
قانونی تحفہ
تندرستی کے راز
[illegible]
بن سکتے ہیں
ایک روپیہ سے
ایک لاکھ روپیہ
معلومات ترکی
کریم اللغات
معلم ہارمونیم
ہنسانے کی کل
میوہ جات ہندوستان
قارون کا خزانہ
قانون اغذیہ
رسالہ خضاب
[illegible] اور اُس کا علاج
اردو سائیکلو پیڈیا ہر دو حصہ
پرورش اطفال
زیبا بیٹھک شکیلی
جوانی دیوانی
بچوں کے کھیل تماشے
لاہور گائیڈ
ترکی اور اس کا سلطان
[illegible] جنگ
نافرمان بیٹا
سفاک عاشق
گلدستۂ عقل
پیاری جان
[illegible] دلگداز
سچی پتی ورتا
[illegible]
چلتا پرزہ
امید و غریب
حسن و عشق دست و گریبان
اس عالم میں میں نے کیا دیکھا
انگلینڈ کی تباہی
جام الفت
بیگناہ کا خون
عورت کی تعریف
قاتل کی تلاش

ملنے کا پتہ کے آر مہرہ برادرس بکڈپو شاہ عالمی گیٹ لاہور

رباعیاتِ مزاحیہ

از میرزا یگانہ علیہ السلام

تقدیر پہ کیا زور ہے کھوٹی ہی سہی
بوٹی نہ ملی تو روکھی روٹی ہی سہی
چرخہ تو چلائے جاؤ گاندھی جی کا
دھوتی نہ سہی تن پہ لنگوٹی ہی سہی

(ولہ)

دِلّی سے اُدھر وہ غیرتِ حور چلا
میں نشۂ شوق میں اِدھر سے چور چلا
چلتی گاڑی میں منہ چڑھانا اُس کا
میں دور سے دانت پیستا گھورا چلا

(ولہ)

شاہوں سے مری کلاہ ٹیڑھی ہی رہی
بدمغزوں سے رسم وراہ ٹیڑھی ہی رہی
ٹیڑھے مرزا کو کون سیدھا کرتا
سیدھی نہ ہوئی نگاہ ٹیڑھی ہی رہی

یگانہ

(خاص)

معنیٔ بیگانہ

از میرزا یگانہ علیہ السلام

آپ میں کیونکر رہے کوئی یہ ساماں دیکھ کر | غنچہ غنچہ میں بہارِ صد گریباں دیکھ کر
دل کو بہلاتا ہوں کیا کیا آرزوئے خام سے | امرِ ناممکن میں گویا رنگِ امکاں دیکھ کر
کیا عجب ہے بھول جائیں اہلِ دل اپنا بھی درد | حُسنِ مستانہ کو آخر میں پشیماں دیکھ کر
بیدلوں نے ہنستے ہنستے مار ڈالا بے اجل | اہلِ دل کو مبتلائے درد و درماں دیکھ کر
دل جلا کر وادیٔ غربت کو روشن کر چلے | خوب سوجھی جلوۂ شامِ غریباں دیکھ کر
ڈھونڈھتے پھرتے ہو اب ٹوٹے ہوئے دل میں پناہ | درد سے خالی دلِ گبر و مسلماں دیکھ کر
پیرہن میں کیا سما سکتا حیاتِ جاں بلب | ہستیٔ موہوم کا خوابِ پریشاں دیکھ کر
امتیازِ صورت و معنی سے بیگانہ ہوا | آئینہ کو آئینہ حیراں کو حیراں دیکھ کر
صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے | اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

خوب ہاتھ آئی یگانہ دردِ عصیاں کی دوا
(خاص) کیا غزل یاد آئی واللہ فردِ عصیاں دیکھ کر — یگانہ

نیرنگِ خیال

کے

تین خاص نمبر

ناظرین نیرنگ خیال یہ سنکر خوش ہوں گے کہ جو لوگ اپریل یا مئی سے خریدار ہو جائیں گے۔ یا رسالہ کے خریدار ہیں انہیں اختتام سال تک تین خاص نمبر حاصل ہونگے

جولائی کا پرچہ فلم نمبر ہوگا

جسمیں کم از کم پچاس تصویریں ہونگی اور متحرک تصاویر کے متعلق نہایت لاجواب مضامین ہوں گے۔

اکتوبر کا پرچہ ادبائے قدیم کے طرز نگارش کے نام سے ایک خاص نمبر ہوگا جسمیں ہندوستان کے دور اوّل کے تمام ادیبوں کے لاجواب اور دلچسپ شاہکار ہونگے۔ اس پرچہ کا حجم نیرنگ خیال کی عام ضخامت سے قریباً ڈیوڑھا ہوگا۔

عید نمبر ۱۹۳۲ء تیسرا خاص نمبر ہوگا جو فروری کے آخر میں شایع ہوگا۔ تینوں خاص نمبروں کی تیاریاں زور شور سے شروع ہیں۔ اس لئے نیرنگ خیال کے خریدار اپنے سلسلۂ خریداری کو قایم رکھتے ہوئے اپنے مفت خورے دوستوں کو رسالہ کی خریداری کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اتنے قلیل چندہ میں اتنا اچھا رسالہ ہر ماہ پڑھنا اور خاص خاص موضوع پر قیمتی مضامین کا مطالعہ کرنا کسیطرح بھی گراں نہیں۔ آج ہی کم از کم دو خریدار بنا کر توسیع اشاعت کیجئے۔

نیرنگِ خیال کے خاص نمبر

دفتر نیرنگ خیال نے آج تک مندرجہ ذیل نمبر شایع کئے ہیں

عید نمبر ۱۹۲۶ء - ایڈیٹر نمبر ۱۹۲۷ء - عید نمبر ۱۹۲۸ء
سالنامہ ۱۹۲۸ء - عید نمبر ۱۹۲۹ء - عید نمبر ۱۹۳۰ء
سالنامہ ۱۹۲۹ء - سالنامہ ۱۹۳۰ء - عید نمبر ۱۹۳۱ء
سالنامہ ۱۹۳۱ء - ایڈیٹر نمبر جولائی ۱۹۳۰ء

ان میں سے صرف مندرجہ ذیل قلیل تعداد میں موجود ہیں:-

عید نمبر ۱۹۲۹ء قیمت ۱۲ محصول ۴ رعایتی قیمت ۸ مع محصول
سالنامہ ۱۹۳۰ء ۸ ؍ ؍
سالنامہ ۱۹۳۱ء ۸ ؍ ؍

۱۹۳۰ء کا مکمل فائل یعنی جنوری سے لے کر دسمبر تک جس میں عید نمبر ۱۹۳۰ء شامل ہے۔ قیمت ۳ ۴
ایڈیٹر نمبر جولائی ۱۹۳۰ء ۵

سالنامہ ۱۹۳۲ء کی تیاریاں

زور شور سے شروع ہیں۔ اس دفعہ ہر چیز میں جدت ہوگی۔ نئی تجاویز زیر عمل ہیں۔ نئے نئے ادیبوں اور زبردست انشا پردازوں سے مضامین حاصل کئے جا رہے ہیں۔ سالنامہ کی خوبیوں میں اس دفعہ چار چاند لگ جائیں گے۔ ہم کامل رازداری سے کام لے رہے ہیں۔ صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ آپ دیکھ کر ششدر رہ جائینگے۔

جن لوگوں نے سالنامہ ۱۹۳۱ء خریدا تھا ان کے نام رجسٹر میں درج ہیں۔ ان کو بغیر طلب وی پی ہوگا۔ باقی جس کو طلب کرنا ہو اپنا نام درج کرا لے۔ قیمت ۱۲

خاکسار

مینجر رسالہ نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور

افسانۂ بہار

طیور کی زباں پر ترانۂ بہار ہے / یہی ترانۂ سرخیِ فسانۂ بہار ہے
ہر ایک غنچہ مست ہے ہر ایک پھول وجد میں / یہ کیف ریزیِ شرابخانۂ بہار ہے
جواہرات سے دہن ہر ایک گل کا بھر گیا / چمن پہ آج لطفِ غائبانۂ بہار ہے
کبھی میں اپنا جامۂ وجود ہی نہ پھاڑ دوں / شباب کی ترنگ ہے زمانۂ بہار ہے
وہ "ایک" صد ہزار رنگ میں ہوا ہے جلوہ گر / ظہور کے لئے فقط بہانۂ بہار ہے

غزل میں فطرت آجکل بکھیرتا ہے پھول کیوں؟
ضرور اس پہ لطفِ غائبانۂ بہار ہے

(خاص) فطرت

بھولنے والے کی یاد میں

امید یہ تھی کہ جلد لوٹ آؤ گے / آنکھوں میں نگاہ بن کے بس جاؤ گے
خط کیسا، کہاں کا نامہ، کس کا پیغام / ہم کیا ہیں ہمیں جو یاد میں لاؤ گے

دمِ واپسیں

کوئی دم میں پلٹنے کو بساطِ زندگانی ہے / سرِ بالیں ہجومِ دوستاں ہے، نوحہ خوانی ہے
بظاہر منقطع ہیں سلسلے سب عمرِ فانی کے / جو اب بھی زندہ رہ جاؤں تو اُسکی مہربانی ہے

(خاص) حمید جالندھری

غزل

از خامہ حضرت ہادیؔ مچھلی شہری مدظلہٗ

جلوۂ طور کا ذرّے میں اثر ہوتا ہے — حوصلہ دیکھنے والوں میں اگر ہوتا ہے
شبِ تاریک میں بھی رنگِ سحر ہوتا ہے — حُسن کا راز فقط حُسنِ نظر ہوتا ہے
قدر کر اے ستم آرا مری پیشانی کی — اس کا ہر نقش ترا حاصلِ در ہوتا ہے
دیکھ لیتے ہیں تجھے دیکھنے والے یوں بھی — ذوقِ جلوہ کہیں پابندِ نظر ہوتا ہے
میری تقدیر بدل جائے تو میں بھی جانوں — لوگ کہتے ہیں دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
درد وہ درد ہے بن جائے جو فطرت دل کی — وہی پیکاں ہے جو پیوندِ جگر ہوتا ہے
میری مایوسئ نظارہ کی مشکل ہے یہ!! — حاصلِ جلوہ فقط دیدۂ تر ہوتا ہے
رحم آتا نہیں آشفتہ سروں پر کس کو — نالہ بے ربط سہی پھر بھی اثر ہوتا ہے
کس طرح دیکھنے والے ترے دیکھیں تجھ کو — حوصلہ بڑھ کے پشیمانِ نظر ہوتا ہے
تیری امید کے قابل تو نہ تھا دل لیکن — ذوقِ راحت ہو تو صحرا میں بھی گھر ہوتا ہے
شب گزر جاتی ہے آغوشِ تصور میں اگر — دن تری یاد کے پہلو میں بسر ہوتا ہے
بے کسی رنگ دکھاتی ہے بالآخر اپنا — نالۂ مایوس اثر ہو تو اثر ہوتا ہے
اس سے پہلے ترے بسمل کی حقیقت کیا تھی — اب تری تیغ سے اندازۂ سر ہوتا ہے
کس طرح حُسن کو آزاد سمجھ لے کوئی — اس کا ہر جلوہ گرفتارِ نظر ہوتا ہے
اپنی تخریب میں ہے ایک طرح کی تعمیر — دل جو جلتا ہے تو آہوں میں اثر ہوتا ہے
سعئ ناکامِ اثر دل کی حقیقت معلوم؟ — دیکھئے رُخ مری حالت کا کدھر ہوتا ہے
میگسارِ تپشِ سوزِ محبت ہوں میں — قطرۂ اشک مرا آتشِ تر ہوتا ہے
فطرتِ حُسن ہے عاشق کی پریشانئ دل — رہ کے خاموش بھی یہ فتنہ اثر ہوتا ہے

کیا کہوں اُس کے تبسم کی حقیقت ہادیؔ
چاک جس طرح گریبانِ سحر ہوتا ہے

ہادیؔ

(خاص)

نقد و نظر

حضرت "سنان" ایم اے کے قلم سے

مذہبی جناب حاجی کے' محی الدین صاحب سوداگر و تاجر کتب[1] اُن صالح و باحوصلہ تاجروں میں ہیں جن کی تجارت حسن نیت' فلاح قوم اور صالح حمیت کی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ ان کا مقصد جلب منفعت و حصول زر نہیں۔ بلکہ یہ ذریعہ ہے اُن کے مخلصانہ حصول مقصد کا اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جنوبی ہند میں اسلامی علوم اور اردو زبان کی ترویج' توسیع اور قیام میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور ہندوستان کے اس حصہ میں اُن کی دوکان اسلامی سامان کا بہترین مخزن ہے۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ جس صورت سے بھی ہو اسلامی تعلیم اردو کے ذریعہ عام ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے اُنہوں نے متراجم و تصانیف کا ایک سلسلہ قایم کر رکھا ہے۔ جن میں سے بعض پر ہم آج کی صحبت میں مختصر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں +

اس سلسلہ میں اوّلین چیز خطبات جمعہ وغیرہ کے مترجم اڈیشن ہیں۔ ان میں سے ایک **جامع الخطب** کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی ترتیب و تنظیم کی عزت آگرہ کے تعارف سے مستغنی "عالم" شاعر جناب شیخ عاشق حسین صاحب **سیماب** کو حاصل ہے۔ اس میں قرآن مجید' احادیث نبوی' اقوال صحابہ وغیرہ سے خطبے مرتب کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ اس مذہبی خدمت کے وقت بھی آگرہ کا یہ شاعر اپنے تبختر و خود ستائی کو نہیں بھولتا۔ چنانچہ سیماب صاحب لکھتے ہیں: -

"میں (الحمد للہ) ایک ایسے قابل ناز شہر کا رہنے والا ہوں جہاں اُردو زبان کہلاتی ہے اور جہاں کی بولی ٹھولی مستند اور ٹکسالی مانی جاتی ہے لیکن اس مجموعۂ نظم میں میں نہایت مجبور ہوں کہ لطف زبان' سلاست بیان' شوکت الفاظ اور فصاحت کلمات نہ دکھا سکا' کچھ اس لئے نہیں کہ میں فصاحت نمائی یا شوکت فزائی سے مجبور تھا۔ بلکہ حقیقتاً (حقیقتہً؟) اس لئے کہ اگر ان تکلفات کا انتظام رکھا جاتا تو نظم ترجمہ ہر جاہل اور پڑھے لکھے کی سمجھ میں بہت کم آتا۔ اور ایسا ہونے سے وہ مطلب پھر فوت ہو جاتا۔ جس کے لئے مجھے تکلیف تنظیم اٹھانی پڑی ہے۔" صفحہ ۲ +

کیا خطبات کے سلسلہ میں اخلاق حسنہ کی یہ پہلی تعلیم بھی داخل ہے۔ رہا اردو کی صحت کا یہ حال ہے کہ ہر خطبہ کی سرخی غلط اردو کی زندہ مثال ہے نہ لفظ جمعہ مونث ہے اور نہ لفظ خطبہ' لیکن ہر خطبہ کی سرخی اس طرح ہے: -

"پہلا خطبہ ماہ محرم الحرام کی پہلی جمعہ کا"

وقس علیٰ ذالک +

جاہلوں کے سمجھنے کیلئے جو منظوم تراجم دیئے گئے ہیں اُن کا پہلا ہی مصرعہ یہ ہے ع۔ ہے سزاوار ثنا وہ خالق ارض و سما +

اس کتاب میں ۱۴۶ صفحہ ہیں۔ قیمت ۴/ +

دوسرا مجموعہ **خطب حمیدیہ** ہے۔ اس کے مترجم و ناظم جناب محمد عبد الحمید خاں صاحب ہیں۔ صفحہ ۱۴۴۔ قیمت ۱۲/۔ اس میں بھی اوّل الذکر مجموعہ کی طرح ہر مہینہ کے چار خطبے دیئے گئے ہیں۔ البتہ ترجمہ میں چار پانچ خطبوں کو ایک ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اور اس سے ترجمہ کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ اور وہ وقت کا طالب ہے۔

تیسرا مجموعہ **اللطائف المستحسنہ مجمع خطب السینہ** مولفہ مولنا ابو الحسنات محمد عبد الحیٔ فرنگی محلی۔ صفحہ ۲۹۲۔ قیمت ۴/۔ ان دونوں سے کہیں بہتر اور جامع ہے اس کے مترجم بھی اسی خانوادۂ علم و فضل کے ایک مرحوم رکن مولوی محمد یونس ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی ہمارے تعارف کے محتاج نہیں اور مولوی محمد یونس مرحوم تو اپنی روح اجتماع و ابن رشد کی وجہ سے اردو دوست طبقہ میں بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے ترجمہ صاف نثر میں کیا ہے۔ اس مجموعہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر مہینے کے لئے ۴ کی جگہ ۵ خطبے ہیں۔ اور خطبہ ثانیہ بھی ہر تین مہینوں کے بعد بدل دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان مجموعوں میں عیدین اور نکاح کے خطبے بھی ہیں +

[1] ان کا پتہ یہ ہے: - ۳۹۹ موچی بازار منگلور +

اطیب النغم فی مدح سیّد العرب والعجم۔ از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مترجمہ جناب دوست محمد صاحب اجمیری صفحہ ۹۴۔ قیمت ۸ر۔ جناب شاہ صاحب نے حضرت سرور کونین صلعم کی مدح میں دو عربی قصیدے مع شرح لکھے تھے پہلے کا نام قصیدۂ بائیہ ہے اور دوسرے کا ہمزیہ دونوں کی ابتدا میں شاہ صاحب کے مختصر دیباچے بھی ہیں۔ یہ کتاب انہی قصائد اور ان کی شرح کا اردو نثر میں ترجمہ ہے۔ جناب شاہ صاحبؒ کے بعد آن کے لائق فرزند و جانشین جناب شاہ رفیع الدین کی باری ہے اور مذکورہ بالا مترجم ہی نے آن کے دو مختصر رسالونکا اُردو میں ترجمہ کیا ہے +

(۱) مجموعہ رسائل تسعہ۔ صفحہ ۴۸۔ قیمت ۴ر۔ اس میں نو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں (۱) حل معمہ یہ حضرت بندہ نواز سید گیسو دراز کے ایک معما کا حل ہے (۲) شرح چہل کاف (۳) بارہ سوالات کے جوابات (۴) مکتوب بجواب غلام علی صاحب (۵) نذور بزرگان (۶) رسالہ بیعت (۷) مسالۃ العرش (۸) اذان و نماز (۹) فوائد نماز +

(۲) فتاوی۔ جناب شاہ رفیع الدین رح سے مختلف اشخاص نے سولہ مختلف سوالات کئے تھے۔ اور انہوں نے ان کے جوابات دیئے ہیں۔ بعض استفسارات عہد موجودہ میں بھی اپنے اندر خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ صفحہ ۲۴۔ قیمت ۲ر +

اسی خاندان کے دوسرے چشم و چراغ جناب مولانا شاہ عبد العزیزؒ ہیں انہوں نے بستان المحدثین کے نام سے تمام کتب احادیث ان کی بعض اہم شرحوں اور محدثین کے حالات فارسی میں لکھے تھے اور مولوی عبد السمیع صاحب دیوبندی نے اس کو **ریاض الریاحین** کے نام سے اُردو لباس میں پیش کیا ہے صفحہ ۲۱۶۔ قیمت ۱۲ر۔ اب جبکہ یہ خزینۂ معلومات ہر اُردو داں کی دسترس کے اندر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کا مطالعہ ہر حدیث دوست کے لئے بہا ضروری ہے۔ ترجمہ بھی صاف اور رواں ہے +

محدثین کے بعد ائمہ اربعہ کا درجہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہمارے سامنے **چہار گلشن** مولفہ جناب شاہ عبد الحی صاحب واعظ ہے صفحہ ۳۰۲ قیمت ۱۲ر۔ یہ کتاب چار حصّوں پر منقسم ہے (۱) تذکرۃ المجتہدین۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں ائمہ اربعہ۔ حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک اور حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم کے حالات صحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ہر بزرگ کا حال ایک گلشن پر مشتمل ہے اور ہر گلشن علی الترتیب مختلف خیابانوں گلوں اور شگوفوں میں منقسم ہے۔ (۲) منتخب تذکرۃ المحدثین ہے۔ یہ بھی نظم میں ہے۔ اس میں اصحاب صحاح ستہ کے حالات مستند طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں (۳) گلدستۂ ولبستہ یہ رسالہ وجوب تقلید کے متعلق ہے اور (۴) رسالہ میزان المحققین ہے اسمیں اختلافی مسائل کا بیان ہے +

ہندوستان کے غزالی اور اُن کے خاندان کی تصانیف کے بعد اسلام کے سب سے بڑے عالم امام غزالی رح کی ایک کتاب کا اُردو ترجمہ ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ کتاب دراصل ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو امام صاحب نے مختلف ملوک، وزراء امراء ائمہ و فقہا کے نام لکھے۔ ان کے علاوہ آخر میں چند فصلیں متفرق نصائح پر مشتمل ہیں۔ اس مجموعہ کو امام صاحب کے بھائیؒ نے مرتب کیا تھا۔ اور اس میں ہر خط کے متعلق حالات بھی جمع کر دیئے تھے۔ سر سید مرحوم نے اس کو فضائل الانام میں رسائل حجۃ الاسلام کے اصلی نام سے شایع کیا تھا۔ اور اب جناب حافظ فیض احمد صاحب نے اس کا ترجمہ معہ حواشی کے **فتح المعالی (فی ترجمہ) صحف الغزالی** کے نام سے کیا ہے صفحہ ۲۳۸۔ قیمت عہ۔ یہ مکاتیب تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے بہت اہم ہیں۔ علامہ شبلی رح نے الغزالی میں ان سے کام لیا ہے۔ اور فاضل مترجم نے اپنے حاشیوں کے ذریعے ان مکاتیب کو بہت زیادہ پر از معلومات بنا دیا ہے۔ اسلام کے سب سے بڑے فاضل امام کی حیات اور آن کے عہد کی سیاسی مذہبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ترجمہ منفعت بخش اور دلچسپ ہے +

اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا انسانوں کے متعلق تھا۔ لیکن جو کتاب اب پیش ہونے والی ہے وہ جنوں کے متعلق ہے۔ اعلیٰحضرت نظام الملک میر محبوب علی خاں مرحوم کے اُستاذ محترم مولانا حاجی محمد زماں خاں مرحوم نے بستان الجن کے نام سے جنات کے متعلق ایک کتاب دو حصّوں میں لکھی تھی جن میں ان کی فطرت، ان کے مذہب۔ ان کی زندگی۔ ان کے عادات و اطوار وغیرہ کے متعلق مذہبی حیثیت سے معلومات جمع کئے تھے۔ جناب قاضی محمد عبد اللہ حسین خلیل صاحب نے اس کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور اس کو **منظہر المحاسن** کے نام سے موسوم کیا ہے صفحہ ۲۹۶۔ قیمت ۲ر۔ عالم آتش سے دلچسپی رکھنے والے خاکیوں کے لئے اس میں کافی سامان فکر ہے +

کتب حاجی محی الدین صاحب کی شایع کردہ زیر تنقید کتابوں کی آخری کڑی جو ہمارے سامنے ہے **حضرت اویس قرنی** رح کی سوانح عمری ہے۔ اس کی صحت اور خوبی کے لئے مولٰنا مناظر احسن صاحب گیلانی کا نام نامی کافی ضمانت

ہے۔ مولانا نے محدثانہ، مورخانہ اور صوفیانہ تینوں حیثیت سے اس سوانح عمری کو لکھاہے۔ اس لئے تینوں جماعتوں کے لئے یکساں قابل مطالعہ ہے +

مذکورہ بالا کتابیں حاجی صاحب موصوف کی شایع کردہ ہیں۔ انہیں سے مل سکتی ہیں اور ہمارے ابتدائی دعویٰ کا بین ثبوت ہیں۔ اب ہم دوسرے مذہبی رسایل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں +

تعلیم اسلام | مرتبہ جناب سید معین الدین صاحب صفحہ ۵۶۔ قیمت ۴ر۔ پتہ نیجو نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں۔ جناب سید صاحب تاریخی کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے اُردو داں حلقہ میں متعارف ہیں۔ اس چھوٹے سے رسالے میں انہوں نے مذہب کے چار اہم بنیادی ارکان پر بحث کرکے یہ بتایاہے کہ ان کے استحکام کے ذرائع اسلامی تعلیمات میں مضمر ہیں۔ اور مسلمان صرف اسی اصلی حقیقی تعلیم کی روشنی اور اسی اصلی حقیقی تعلیم کی روشنی اور اسی حقیقی روح اسلام کی زیر ہدایت اپنے اصلاحی مقاصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ یہ رسالہ مذہب سے بے خبر نئی نسل کے لئے لکھا گیاہے اور امید کہ یہ جماعت اس سے مستفید ہوگی +

محاسن اسلام | تقریر مرزا عبدالقادر بیگ صاحب ایم۔ اے وکیل صفحہ ۴۲ قیمت ۳ر پتہ دفتر تبلیغ الاسلام اجمیر۔ ۴ مارچ ۱۹۲۸ء کو آریہ سماج اجمیر کی دعوت پر مرزا صاحب نے "تعلیم اسلام کا قومی اخلاق پر اثر" کے موضوع پر ایک پُر از معلومات تقریر کی تھی۔ اور اب انجمن تبلیغ الاسلام نے اس کو مذکورہ بالا نام سے ایک رسالہ کی صورت میں شایع کیا۔ اسلام دوست اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب ہے +

تحفہ معراج النبی | مولفہ جناب احمد علی صاحب صفحہ ۲۲ قیمت ار۔ پتہ انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور۔ لاہور میں مذکورہ بالا نام کی ایک انجمن ہے جس کا مقصد خود اُس کی زبانی "مسلمانوں میں اصلاح رسوم اور احیائے دین کا سر انجام" دیناہے۔ اور اس مقصد کے لئے یہ انجمن چھوٹے چھوٹے رسالے شایع کرتی رہتی ہے۔ یہ رسالہ اس سلسلہ کی پندرہویں کڑی ہے +

طبقات | مہاجرین (حصہ دوم) از جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین صفحہ ۲۹۴۔ قیمت ہے۔ پتہ نیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ دارالمصنفین نے دوسرے اہم مذہبی و تاریخی کاموں کی طرح حضرات صحابہؓ کے مستند حالات کا سلسلہ بھی مرتب کرنا شروع کیا ہے۔ اور اس کی متعدد جلدیں اس وقت تک شایع بھی ہوچکی ہیں۔ موجودہ جلد مہاجرین کی تیسری جلد ہے کہ حصہ اول دو جلدوں میں تقسیم کردیا گیاہے (۱) خلفائے راشدین (۲) بقیہ عشرہ مبشرہ۔ اب یہ جلد اُن ۱۰۱ اصحاب نبوی ﷺ کے حالات اور نورانی تذکروں سے روشن ہیں، جنہوں نے فتح مکہ کے پہلے اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ ہی ہجرت کا شرف بھی حاصل کیا۔ ان میں سے ہر بزرگ کے حالات، اخلاق وفضائل، ان کا مذہبی، علمی، سیاسی، مجاہدہ اس قابل ہے کہ ہماری تاریک زندگی کے لئے شمع ہدایت بنے۔ کیونکہ مسلمانوں کی انتہائی ترقی اس وقت ہوگی جب وہ چودہویں صدی سے واپس ہوکر "خیرالقرون قرنی" کی سرحد سے جاکر مل جائیں گے۔ اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہمارے ساتھ اُس قرن مقدس کے بزرگوں کے صحیح حالات، انکی زندگی کے واقعات ایک ایک کرکے ہمارے سامنے ہوں۔ اور دارالمصنفین نے اس سلسلہ کو قایم کرکے در اصل ذہنی طور سے اس ترقی کی طرف دعوت و ہدایت کا کام انجام دیاہے۔ کتاب کی صحت، اُس کی وسعت، اُس کی ترتیب اُس کی طباعت، غرضکہ تمام محاسن ظاہری و باطنی کے لئے دارالمصنفین کا نام کافی ضمانت ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعہ نے کہ اس کے مولف جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ہیں، اُن کی ادبی خوبیوں کو دہ چند کردیاہے کہ دارالمصنفین کے موجودہ نوجوان رفقا میں وہی مصنف ہیں جن کے پاس ایک دردمند دل اور بلند ترین انشاپردازی کا صحیح ترین تخیل موجود ہے۔ ان کی عبارت شگفتہ، لیکن سنجیدہ، صاف لیکن موثر اور محاسن ادب و انشا سے پُر رہتی ہے۔ ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ بسا ضروری ہے +

ادب عالیہ | افادات مہدی۔ مرتبہ محترمہ مہدی بیگم صاحبہ صفحہ ۲۷۰ قیمت ہے۔ پتہ: نیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ +

اردو کے اُن چند مشہور انشا پردازوں میں جو اپنی ادبیات عالیہ، انشائے لطیف، دلکش انداز بیان، زور تحریر، ندرت اور تخلیقی قوت کے لئے مشہور ہیں اور جن کا ایک ایک لفظ اُس وقت تک کہ اردو کا وجود ہے۔ خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا، وہ ہستی بھی تھی جسے دنیائے اردو ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی کے نام سے جانتی ہے۔ مہدی مرحوم مصنف نہ تھے اور اُن کی علمی کائنات بیس تیس مضامین ہیں لیکن بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی یہ تحریریں بہتوں کی بیس تصانیف اور بیسیوں سالہ ادبی خدمات سے کہیں زیادہ اہم اور بالاتر ہیں۔ انہوں نے اس وقت اپنے ذوق سلیم سنجیدگی

رائے اور وسعت معلومات کا احسن طریقہ سے اظہار کیا۔ جبکہ اُردو موجودہ درجہ تک پہنچنے کے لئے قدم اُٹھا چکی تھی۔ افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھ نے بہت جلد ہم کو ان کے علمی فیوض سے محروم کردیا۔ مرحوم کے انتقال کے بعد ہی آن کی حرم محترمہ نے اُن کے مضامین کو مذکورہ بالا نام سے شایع کیا تھا۔ ابتدا میں مرحوم کے حالات زندگی بھی دیئے ہیں اور اُس سے خود آن کی قابلیت و صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ضمیمہ کے طور پر مولٰنا عبدالماجد صاحب بی اے کا وہ مضمون ہے جو اُنہوں نے صدم میں مرحوم کے متعلق شایع کیا تھا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہوگیا تھا۔ اور لوگ دوسری طباعت کے لئے بے چین تھے۔ بہرحال ادب عالیہ کا یہ گرانمایہ خزانہ ایک مرتبہ پھر پرستاران ادب کو صلائے پرستش کر رہا ہے +

متفرقات

ہندوستان کی آئینی اصلاح - مصنفہ جناب میرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب۔ رئیس جماعت احمدیہ صہ ۴۶۰ قیمت ؎ پتہ مصنف، قادیان، پنجاب +

اس وقت ہندوستان جس انقلابی دور سے گذر رہا ہے۔ اور جس سیاسی آزادی کے لئے محوِسعی ہے۔ اُس کا مقتضایہ ہے کہ اس مسئلہ پر ہر حیثیت سے نظر ڈالی جائے۔ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں اپنا مسلک و مطمح نظر مقرر کرلیا ہے۔ اور گول میز کانفرنس میں اس کو پیش بھی کردیا ہے۔ مگر ابھی اس بات کی ضرورت باقی ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نگاہ کو واضح طور سے اسباب و علل اور دلائل وثبوت کے ساتھ پیش کردیں۔ تاکہ جب تفصیلی آئین و دستور مرتب ہونے لگے تو اس وقت کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ جناب میرزا صاحب نے یہ ضخیم کتاب اس غرض سے لکھی تھی کہ کانفرنس کے شرکاء اور انگلستان کے ارباب حل وعقد کو صحیح طور سے مسلمانوں کے خیالات ومطالبات کا علم ہوجائے اور اگرچہ اب کانفرنس ختم ہوچکی ہے۔ پھر بھی آپ کی یہ تصنیف مسلمانوں کی ایک جماعت کی حیثیت سے لائق مطالعہ اور لائق غور ہے۔ کتاب ایک پیشکش، ایک دیباچہ اور دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل میں آٹھ ابواب ہیں اور ثانی میں ہر موضوع پر ایک خاص نقطۂ نگاہ سے مفصل بحث کی گئی ہے +

کلید امتحان مرتبہ اختر۔ صہ ۴۴ قیمت عہ پتہ:- اسٹنڈرڈ بکڈپو لاہور۔

سول سروس کمیشن کے امتحانات میں ایک پرچہ عام معلومات سے متعلق ہوتا ہے۔ مرتب نے اس میں اختصار کے ساتھ انہی معلومات کو جمع کر دیا ہے۔ اور آخر میں گذشتہ تین سال کے سوالات وغیرہ بھی دیدیئے ہیں۔ یہ رسالہ انگریزی زبان میں ہے اور اس امتحان کے امیدواروں کے لئے بسا مفید +

نیرّ عروض مصنفہ جناب سیدحسن مرتضٰی صاحب شفق صہ ۴۸ قیمت ۴؍ پتہ:- کے، حاجی محی الدین صاحب تاجر کتب نمبر ۲۹۹ موچی دروازہ، معسکر بنگلور +

اس مختصر رسالہ میں جناب شفق نے نہایت آسان اور عمدہ طریقہ سے عروض کے قواعد، بحور، اور تقطیع وغیرہ کے متعلق معلومات جمع کردئے ہیں۔ امید کہ طلبہ اور نوآموز شعرا کے لئے مفید ہوگا +

پروفیسر ضامن اور عینل کانفرنس میں۔ نوشتہ جناب سراج الحق صاحب مچھلی شہری صہ ۳۰ - قیمت ؎ پتہ مصنف۔ گورنمنٹ کالج الہ آباد +

۱۹۲۶ء میں الہ آباد میں مذکورہ بالا کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اُس میں جناب پروفیسر ضامن صاحب نے واقعہ کربلا پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ اب جناب سراج الحق صاحب نے چار سال کے بعد یہ پتہ لگایا ہے کہ یہ مضمون شیعی تعصبات سے پُر ہے۔ اور اپنے خیال میں اُنہوں نے اس مضمون اور مضمون نگار دونو کا خوب مضحکہ اُڑایا ہے۔ نفس مسئلہ کو چھوڑ کر جناب سراج کا طرز تحریر اسقدر دل آزار اور پایہ تہذیب سے گرا ہوا ہے کہ یہ اُس جماعت کے لئے جس کی حمایت کے وہ دعوٰی دار ہیں۔ کوئی قابل فخر بات نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مضمون کو مقامی حالات وتعلقات سے بہت کچھ واسطہ ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ قصہ زمین برسرِ زمین ہی طے ہو جائے اور یہ بلا دوسری جگہوں تک متعدی نہ ہو +

دولت کمانے کی کل دفعہ چہارم مصنفہ جناب شیخ کریم بخش صاحب۔ صہ ۹۶ قیمت عہ پتہ۔ حکیم محمد رحمت علی صاحب چک ۵، گ، ب، ضلع لائل پور +

اس رسالہ میں بعض صنعتوں اور مرضوں کے نسخے ہیں۔ بعض نسخوں کے متعلق انعامات بھی ہیں۔ لیکن نہ تو اس کتاب میں کوئی خاص بات ہے اور نہ اس کی ضخامت، طباعت یا کاغذ ہی اس قابل ہے کہ اس کی اتنی زیادہ قیمت ہو۔ لیکن اس کو کیا کیجئے گا کہ یہ اس کتاب کا نواں اڈیشن ہے اور وہ بھی گیارہ ہزار +

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

"سنان"

جملہ حقوق محفوظ — نیرنگ خیال ـ جون ۱۹۳۱ء — اشاعت ۵۲۵۰

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے اس لئے ہمیشہ اسمیں اشتہار دو

جلد ۱۱ — چندہ سالانہ ۳ روپے — ممالک غیر سے ۸ شلنگ

ایڈیٹر:- حکیم محمد یوسف حسن

نمبر ۴ ۸ — فی پرچہ ۵ ر — ویلریک سٹال پر ۶ ر

"ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا"

فہرست مضامین

جولائی نمبر نیرنگ خیال کا فلم نمبر ہوگا

جس میں ہندوستان اور یورپ کے قریباً پچاس ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصاویر اور حالات ہونگے اس کے علاوہ بیش قیمت مضامین سے یہ پرچہ مرصع ہوگا۔

اگست میں مشہور افسانہ مہارانی کا خواب از مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے ایل ایل بی درج ہوگا ناظرین منتظر رہیں

کریمی پریس لاہور بیرون دروازہ شیرانوالہ سرکلر روڈ میں صاحبزادہ قدرت اللہ پرنٹر نے چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر و پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور سے شایع کیا

بزمِ نیرنگ

از اسسٹنٹ ایڈیٹر

نیرنگ خیال کے مضامین

نیرنگ خیال جن خوبیوں سے مالامال ہے اُن میں سب سے نمایاں چیز اُس کے مضامین ہیں۔ نیرنگ خیال کا ہر معمولی نمبر علم و ادب کا ایک بحرِ ذخار ہوتا ہے۔ جس سے ہر تشنہ اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ بلاشک و شبہ نیرنگ خیال کے کسی معمولی نمبر کا کسی دوسرے رسالے کے خاص نمبر سے مقابلہ کرکے دیکھ لیجئے۔ تصاویر کی کثرت یا حجم کی زیادتی کو اگر بالائے طاق رکھدیا جائے تو معمولی نمبر کو فوقیت دینی پڑیگی۔ آپ کسی اردو رسالے کے خاص نمبر کے تمام مضامین پڑھ جایئے تو آپ کو نیرنگ خیال کے معمولی نمبر کے مضامین میں زیادہ خوبیاں جلوہ فرما نظر آئیں گی۔ زیرِ غور نمبر ہی کو دیکھ لیجئے۔ اس میں جناب کلب علی خاں فائق نے ایک مضمون ایران کے مشہور علمی رسالہ گلشن سے ترجمہ کرکے بھیجا ہے۔ جو اس قابل ہے کہ ہندوستان کے فارسی داں اس کا بغور مطالعہ کریں۔ اور اُس تحریک سے باخبر ہوں جو آجکل ایران میں ہندوستانی فارسی کے متعلق پیدا ہو رہی ہے۔ جناب اشفاق حسین صاحب نے ایک افسانہ ستی کے نام سے بھیجا ہے جو مہارانی کوچ بہار کے نو دلکش افسانوں میں سے پہلا ہے۔ ہندو علم الاصنام کے متعلق اس سے بہتر اور اس سے دلچسپ افسانہ اردو زبان میں اس سے پیشتر شایع نہیں ہوا۔ اگر اشفاق حسین صاحب باقی کے آٹھ افسانے بھی اسی طرح سے ترجمہ کردیں تو اردو پر احسان عظیم ہوگا۔ یورپ کا انحطاط ایک سیاسی تبصرہ ہے۔ جو مشہور نوجوان سائنسدان ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب ڈی ایس سی پیرس نے لکھا ہے۔ آپ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے پیرس یونیورسٹی سے سائنس کی انتہائی ڈگری حاصل کی ہے اور ہم کارکنانِ اسلامیہ کالج کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنہوں نے کہ اُنہوں نے اسلامیہ کالج کے شعبۂ سائنس کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں دیدی ہے ڈاکٹر صاحب نیرنگ خیال کے لئے کئی مضامین لکھ رہے ہیں جو انشاءاللہ شایع ہوتے رہیں گے۔ جناب انیس مجتبٰی زبیری بی اے کا ڈراما منطقی ایک دلچسپ منطقی لطیفہ ہے۔ اسیطرح دو اور چھوٹے چھوٹے مضامین "میری شادی" اور "کہانی کا فلسفہ" اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتے ہیں جو نکتہ رس طبیعتوں کو "فلک پیما" بنادینے کے لئے کافی ہیں۔ حضرت سجاد کا افسانہ آپ بیتی بے نظیر ہے یہ عربی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ نیرنگ خیال میں آپ بیتیوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو کچھ ابتک شایع ہوچکا ہے وہ ایک دلچسپ کتاب کے قیمتی مواد کے برابر ہے۔ بازارِ حسن از منشی پریم چند۔ یہ مضمون آغا عبدالحمید صاحب گورنمنٹ کالج کے فہم و تدبر کا نتیجہ ہے۔ گورنمنٹ کالج کے بعض نوجوان اردو میں مضامین لکھنے لگے ہیں جو تمام تر پروفیسر سید احمد شاہ بخاری کی علم نوازی کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایسے نوجوانوں کی ایک کلب قایم کردی ہے۔ جو اردو میں مضمون نویسی کی مشق کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ مہینہ میں اس کلب کے ایک جلسہ میں جناب مولانا عبدالمجید صاحب سالک۔ پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم اے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔اے۔ پروفیسر سید احمد شاہ بخاری ایم اے۔ اور حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال موجود تھے۔ آغا صاحب نے یہ مضمون پڑھا تھا جسے اس نمبر میں شایع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ گورنمنٹ کالج کے علم دوست طلبا پروفیسر بخاری صاحب کی زیر قیادت ادبی میدان میں کسی دوسرے کالج سے پیچھے نہ رہیں گے + کیا ہندو جہازرانی جانتے تھے؟ یہ مضمون جناب مالک رام صاحب ایم اے کی انتہائی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ جو امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

نیرنگ خیال کا آیندہ نمبر فلم نمبر ہے جس کی "دلچسپیاں اور خوبیاں" صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انشاءاللہ آپ اسے ہر پہلو سے مفید پائیں گے +

اسسٹنٹ ایڈیٹر

حاجتِ علمی ہندوستان بہ ایران

آقای داعی الاسلام مؤلف فرہنگ نظام کے ایک فارسی لیکچر کا ترجمہ

حاضرینِ جلسہ! آج رات کا موضوع۔ حاجتِ علمی ہندوستان بہ ایران ہے۔ لفظ علمی اس واسطے رکھا ہے کہ حاجتِ طبیعی سے مستغنی ہو۔ ہندوستان؎ کو اللہ تعالیٰ نے سرسبز و شاداب ملک بنایا ہے۔ جس کی وجہ سے حاجتِ طبیعی کسی ملک سے نہیں رکھتا ہے لیکن اتفاق سے یہی سرسبز و شاداب ملک اپنے کانوں کو کاسۂ گدائی بنائے ہوئے ہے تاکہ ایران سے فیضیاب ہو۔ اس لئے کہ شیریں تر فارسی ایران میں بولی جاتی ہے اور فارسی میں بہترین نثر ایرانی لکھتے ہیں۔ حاجتِ علمی و ادبی ہندوستان کی موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئی ہے۔ کوہ ہمالیہ باوجود اس عظمت کے زبانِ حال سے اپنے چھوٹے بھائی کوہ دماوند سے معاونت چاہتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری سے کہ ایرانیوں نے ہندوستان میں اقتدار پایا۔ ایک صدی قبل تک ہندوستانی ایران سے حاجتِ علمی نہیں رکھتے تھے۔ اور ہندوستانی تکمیلِ علوم اور تمدن میں ایرانیوں کے مقابل تھے۔ اس جگہ جو ایرانیوں کا ہندوستان میں اقتدار پانا لکھا ہے۔ ممکن ہے تاریخدان حضرات اس پر اعتراض کریں کہ ایرانیوں کے ساتھ ترک اور افغان بھی تھے۔ جواب یہ ہے کہ اُس وقت ترکستان اور افغانستان حکومتِ خراسان کے دو صوبے تھے اور تاریخ ایران میں جس جگہ بھی خراسان دیکھا جائے تو اُس میں ترکستان اور افغانستان بھی شامل ہیں۔ اور اُس جگہ کے علما و فضلا خراسانی مانے گئے ہیں۔ بہرحال میں نے عرض کیا کہ ہندوستان اپنی ابتدائی فارسی میں ایران کا محتاج نہ تھا۔ اگر دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ہندوستان کوشش کر کے ہمیشہ ایران کے برابر رہا۔ مثلاً ساتویں صدی ہجری کے آخر میں جبکہ سعدی علیہ الرحمۃ کی شہرت ایشیا میں پھیل گئی تھی۔ خان شہید جو ملتان کا حاکم تھا۔ اُس نے ایک نسخہ دیوان سعدی علیہ الرحمۃ کا ایران سے منگا کر امیر خسرو علیہ الرحمۃ کو دے کر کہا کہ اس کا جواب لکھو۔ امیر خسرو دہلوی نے سعدی علیہ الرحمۃ کی تمام غزلوں کا جواب لکھا۔ اور دواوین امیر خسرو علیہ الرحمۃ سے وہی جزو بہترین ہے۔ خان شہید نے وہ دیوان ایک خط کے ساتھ سعدی علیہ الرحمۃ کو بھیجا۔ اُس کے جواب میں سعدی شیرازی نے بہت تعریف لکھ کر بھیجی اور خان شہید کو لکھا کہ امیر خسرو کی تربیت کرے۔ یہاں تک تاریخی بات تھی +

اور روایت یہ ہے کہ سعدی علیہ الرحمۃ نے امیر خسرو دہلوی کی ملاقات کے واسطے ہندوستان کا سفر کیا۔ اور خود سعدی علیہ الرحمۃ نے بوستان میں اپنے سفرِ ہند کے بارے میں ایک برہمن کے مار ڈالنے کا واقعہ لکھا ہے۔ لیکن وہ قتل حفاظتِ جان کے لئے کیا +

گیارہویں صدی ہجری تک ہندوستان میں فارسی بولی جاتی تھی۔ اس کے بعد اردو نے بول چال میں فارسی کی جگہ لی لیکن پھر بھی فارسی زبان علمی و حکومتی تھی +

پیدائش اردو زبان کی اس طرح ہوئی کہ ایرانی لوگ ہندوستانیوں سے فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ اور وہ ہندی میں جواب دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک تیسری زبان پیدا ہوئی جو دونوں جماعتوں کی زبان بن گئی اور وہ اردو ہے مثلاً ایک ترکی بچہ اور ایک ایرانی بچہ کو ایک جگہ بند کر دیں تو ایک مدت کے بعد ایک تیسری زبان بولنے لگیں گے جو فارسی و ترکی پر مشتمل ہوگی +

اردو زبان کے موجد مسلمان ہیں۔ اس لئے کہ اردو کی بنیاد فارسی پر رکھی گئی ہے اور فقط بعض الفاظ اور روابط ہندی ہیں اور باقی الفاظ اور خط اور تخیل و طرزِ ترکیب تمام فارسی ہے۔ بلحاظ افکار اور اوزان و اصول شعری اردو شاعری فارسی شاعری سے ماخوذ ہے۔ مثلاً ہندی شاعری کا ایک اصول یہ ہے کہ شاعر ایک عورت ہے اور معشوق ایک مرد اور عاشقہ عورت اپنے تمام تخیلات کو معشوق مرد سے منسوب کرتی ہے۔ اب اگر شاعر مرد ہو تو اس کے لئے لازم ہے

؎ یہاں سے چند سطریں حذف کر دی ہیں جنمیں ہندوستان کی جغرافیائی حالت بیان کی ہے

کہ شاعری میں اپنے آپ کو عورت فرض کرے اور تخیلات زنانہ ادا کرنے کی کوشش کرے کہ بہتر شاعر ہو۔ فارسی شاعری میں عاشق مرد اپنے تمام تخیلات عورت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اب اگر ایک عورت فارسی میں شعر کہے تو اُس کے لئے لازم ہے کہ اپنے آپ کو ایک عاشق مرد تصوّر کرے اور معشوق کی نسبت تخیل ادا کرے +

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں کے شاعر (ایرانی) ہندی زبان میں شعر کہنے پر مجبور نہیں ہیں۔ ورنہ لازمی ہوتا کہ وہ عورتیں بن جاتے +

اس بارے میں مجھے ایک حکایت یاد آگئی کہ شاہجہان کی مجلس میں ایک گویئے نے امیر خسرو دہلوی کا ایک شعر گایا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ اے معشوق تو جو اپنے پریشان بالوں میں کنگھی کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رات غیر کے پاس رہا۔ شاہجہان یہ شعر سنکر بہت غضبناک ہوا کہ امیر خسرو بے غیرت تھا جو اپنی عورت سے کہہ رہا ہے کہ تو رات غیر کے پاس رہی ہے۔ گویئے نے جواب دیا حضور کے قربان ہوں یہ شعر امیر خسرو دہلوی نے ہندی زبان کے لحاظ سے کہا ہے۔ جس کے لحاظ سے عورت عاشق ہوتی ہے اور مرد معشوق۔ عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ رات تو دوسری عورتوں کے پاس گیا تھا +

بعض مورخین کا یہ عقیدہ ہے کہ اردو گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں شاہجہان کے ایک لشکر سے پیدا ہوئی جو ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ لیکن تاریخ ہند میں غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کی بنیاد ایرانیوں کے ہندوستان میں جانے سے پڑی اور گیارھویں صدی ہجری میں تکمیل کو پہنچی +

اردو زبان کی پیدائش نے فارسی پر زیادہ اثر نہیں ڈالا اس لئے کہ آج مسلّم ہے کہ جو شخص فارسی نہیں جانتا وہ اردو بھی نہیں جانتا۔ اور بہترین اردو نویس وہی لوگ تھے جنہوں نے فارسی زیادہ استعمال کی۔ اردو زبان کی تکمیل کے بعد بھی ایرانی و ہندوستانی تعلقات قایم تھے۔ خصوصاً دسویں صدی ہجری میں ایران اور ہندوستان کے تعلقات بہت مستحکم تھے۔ دونوں ملکوں میں علما و فضلا کا قافلہ چل رہا تھا اور رونق فارسی کی دربار تیموریہ میں صفویہ دربار سے کم نہ تھی۔ اُسی زمانہ میں صائب ایک غزل میں معشوق سے کہتا ہے ؎

ہمچو شوق سفر ہند کہ در ہر سر ہست   شوق سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

اگرچہ اورنگ زیب کی تخت نشینی دربار میں فارسی کے تنزل کا باعث ہوئی لیکن امرائے ملک پہلے کی طرح فارسی زبان میں کوشش کرتے تھے۔ اورنگ زیب باوجود درجۂ سیاست و دلیری اس معاملہ میں متعصب تھا۔ شاعر اور مورّخ کو دوست نہیں رکھتا تھا۔ کہتا تھا کہ دونوں خوشامدی اور جھوٹے ہوتے ہیں۔ ملک الشعرائی کا عہدہ جو شاہجہان کے عہد تک بڑا عہدہ تھا۔ توڑ ڈالا۔ باپ دادا کی طرح رات کو ادبی مجلسیں نہیں کرتا تھا۔ اس سبب سے ہندوستانی ادیبوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ فارسی شاعری طالب آملی پر ختم ہو گئی جو شاہجہان کے عہد میں ملک الشعرا رہا اور ایران اور ہندوستان میں شاعر حقیقی معنوں میں پیدا نہیں ہوا اور ایران میں شعرائے متاخرین متقدمین کے پیرو ہیں +

ادبائے مذکور کا یہ مقصد ہے کہ فارسی شاعری رودکی کے زمانہ سے جادۂ تکمیل میں رہ کر فصاحت الفاظ کی سیر کرتی تھی۔ اور فغانی کے بعد بلاغت معنی میں پڑ گئی۔ درجات کاملیت کو طالب آملی تک طے کر لیا۔ اور ایک جگہ پر قایم ہو گئی کلیم اور طالب آملی نے ہندوستان میں تقلید انہیں شعرائے متوسطین کی رہی اور ایران میں یکایک تمام درجات تکمیل طے کر کے بلاغت میں مصروف رہ کر سبک قدیم سے فصاحت کی طرف رجعت قہقری کی۔ موجودہ رائے صحیح ہے یا غلط ہے یہ موضوع سے خارج بات ہے اور دوسرے خطبہ کی محتاج ہے۔ اب ایک صدی کا زمانہ گذرا کہ ربط ادبی ایران و ہندوستان کا بالکل منقطع ہو گیا۔ اگر بعض فضلائے ایران ہندوستان میں جاتے ہیں تو کوئی خبر اُن کی ایران میں نہیں آتی۔ ایرانی فضلا کو کوشش کرنا چاہئے کہ پھر ہندوستان اور ایران میں علمی ربط قایم ہو جائے اور ایرانی ادیب ہندوستان میں فارسی جاری کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے کہ اب سفر بہت آسان ہو گیا ہے۔ اور علم کا چرچا ہر جگہ ہو گیا ہے۔ اس وقت میں پیش قدمی کرنا بہت آسان ہے۔ ایرانی سیاست دانوں میں سے نہیں ہیں کہ ایک جگہ تو ان کو آنے دیا جائے اور دوسری جگہ منع کیا جائے اور تیسری جگہ قید کیا جائے۔ ایرانی دانشمندوں کی مثال ستاروں کی مانند ہے جو اپنی روشنی سے ہر جگہ کو روشن کرتے ہیں۔ اور اہل سیاست کی مثال جاندار مخلوق کی طرح ہے کہ ایک نوع دوسری نوع کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں مصروف ہے۔ ہندوستانی ادیب ایرانی ادیبوں کے محتاج ہیں کہ اُن کی فارسی ایرانی فارسی کی طرف لوٹ آئے۔ ہندوستان منتظر ہے کہ ایرانی فارسی سے فیضیاب ہو۔ ایرانی ہمیشہ سے سخی ہیں۔ اسوقت

انہیں خاموش رہنا چاہئے۔ جب ہندوستانیوں نے ایرانی فضلا کے بلانے کے واسطے روپیہ پانی کی طرح بہایا اُس وقت تو ایرانی فضلا دوڑے ہوئے گئے اس وقت جبکہ اُن کے پاس روپیہ پیسہ نہیں۔ کوئی اُن کے پاس نہیں جاتا۔

ہندوستان کی تاریخیں اُٹھا کر دیکھئے جن میں سے اکثر فارسی میں ہیں اور بعض ان میں سے شایع بھی ہو گئی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی فضلا کی بہت عزت کی جاتی تھی اور ایرانی نہایت متمول ہو جاتے تھے۔ تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ شہنشاہ اکبر (معاصر شاہ صفوی) نے اپنے وزیر سے کہا کہ میں نے تمام ایرانی فضلا کو بلا کر فیض پہنچایا۔ لیکن محتشم کاشی جو میرے دربار میں نہیں آیا ہے۔ وہ میرے انعام سے کس لئے محروم رہے۔ پھر کثیر رقم دی کہ محتشم کاشی کو بھیجدی جائے +

خزانہ عامرہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جس کا مولف غلام علی آزاد بلگرامی ہے۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی شعرا نے بے انتہا فائدہ ماہی ہندوستان سے اُٹھایا ہے۔ اب کوشش کرنے کا وقت ہے کہ ایرانی بغیر استفادہ مادی ہندوستان کی خدمت علم میں کوشش کریں۔ ایک مثال ہم خزانہ عامرہ سے نقل کرتے ہیں کہ تغلق شاہ ہند نے ساتویں صدی ہجری میں تاج جمال الدین کے ایک شعر کے صلہ میں حکم دیا کہ اشرفیاں اُس کے سر تک چُن دیں؟

ہندوستان کے مزے ہمارے اسلاف نے لوٹے۔ اب ہم کو تکلیف گوارا کرنا چاہئے۔ ہندوستان میں فارسی کی اہمیت کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی تاریخوں میں قمری مہینے مسمٰی بہ ہلالی اور فارسی مہینے (فروردین وار دی بہشت) ماہہائے الٰہی سے مسمٰی ہوئے +

ایرانی شعرا جو ہمارے نزدیک رند ہیں۔ یا عام لوگ ہیں۔ وہ ہندوستانیوں میں اولیاء اللہ شمار کئے جاتے ہیں اور سعدی علیہ الرحمۃ جو ہمارے یہاں رند مشہور رہے۔ ہندوستانیوں کے نزدیک صاحب کشف و کرامات ہے۔ فال لینا دیوان حافظ سے عام ہے۔ اسلامی بچوں کی پرورش خانگی ایرانی قصوں سے ہوتی ہے اور بچے داستان رستم و سہراب اور قصہ نوشیرواں و بزرجمہر کو جانتے ہیں +

خصوصاً شاہنامہ کو اردو میں نظم کیا ہے تاکہ جو لوگ فارسی نہیں جانتے وہ بھی استفادہ کریں۔ چونکہ ہندوستانی کتب خانے فارسی ادب کے خزانے ہیں۔ اس لئے وزارت معارف کو چاہئے کہ جسطرح سے تحقیق کتب فارسی یورپ کے واسطے آدمی بھیجے ہیں۔ اسی طرح کتب فارسی ہند کی تحقیق کے لئے آدمی بھیجے جائیں۔ بہت سی ادبی کتابیں نظم و نثر ہندوستان کی ہمارے یہاں نہیں ہیں +

ہندوستانی فارسی کا ایرانی سے جدا ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ فارسی کی پُرانی کتابیں مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ یعنی جب سے انگریزی حکومت قایم ہوئی ہے۔ ہر شخص انگریزی کی تحصیل پر مجبور ہوا۔ اس لئے انگریزی اوّل زبان ہوئی اور فارسی زبان دوسری۔ آہستہ آہستہ سنسکرت اور دوسری مردہ زبانوں کی طرح فارسی بھی پڑھائی جانے لگی یعنی بذریعہ کتب معدودہ و بغیر گفتگو اور بغیر ربط جدید ایرانی فارسی کے +

نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہندوستانی ادیب کافی الفاظ نہیں رکھتے اور بات چیت نہیں کر سکتے ہیں نیز ان کی نظم و نثر میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو بے موقع استعمال کئے گئے ہیں۔ درحقیقت ہندوستان میں ایک دوسری فارسی زبان پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن ہندوستانی ادیبوں نے احساس کیا ہے کہ ان کی فارسی پھر ایرانی فارسی کی طرف لوٹے اوراً ایرانی فضلا کی امداد کے منتظر ہیں +

ایرانی اخلاق سے جو دنیا میں مشہور ہے بعید ہے کہ وہ مدد کے واسطے نہ کھڑے ہوں +

ترجمہ رسالہ گلشن (طہران ایران)

کلب علی خاں فائق رامپوری



ستی

مہارانی کوچ بہار کے نو دلکش افسانوں میں سے پہلا افسانہ

یہ اُس زمانہ کا قصہ ہے جبکہ دنیا نئی نئی تھی اور ہمارے ملک میں دکش پرجاپتی کا راج تھا۔ ان کی سلطنت ھمالیہ پہاڑ کے دامن تک پھیلی تھی۔ اور اُن کی راجدھانی گنگا کے کنارے اُس جگہ تھی جہاں پر اب ہردوار آباد ہے۔ دکش پرجاپتی کا شمار جمبودویپ (یعنی ہمارے ہندوستان) کے عظیم الشان مہاراجاؤں میں تھا اور اُن کی ماہ جبین لڑکیوں کی وجہ سے اُن کی اور بھی زیادہ عزت ہوتی تھی۔ جیوں جیوں وہ لڑکیاں جوان ہوتی گئیں دکش راجہ اُن کو کسی باوقار دیوتا سے بیاہتے گئے۔ بھلا اتنے دیوتاؤں کے خسر کے سامنے کون سر اُٹھا سکتا تھا +

ستی دکش راجہ کی سب سے چھوٹی اور سب سے خوبصورت لڑکی تھی اور بچپن سے وہ اپنے باپ کی چہیتی تھی۔ اُس کا حسن ایک حور کا حسن تھا جو دنیا میں کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ اُس کا باپ اُس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور اپنے پر ناز کرتا تھا۔ گویا کہ ستی کا حسن یکتا اُسی کا کرشمہ تھا جب وہ جوان ہوئی تو ادھر دکش راجا بر کی تلاش میں تمام دیوتاؤں اور بادشاہوں کی خوبیوں کا اندازہ اور مقابلہ کرنے تھے۔ ادھر خود ستی کے دل میں ایک پاک اُمنگ مضبوط جڑ پکڑتی جاتی تھی +

اُس زمانہ میں دیوتاؤں کے گھر ہمالیہ کے عالی شان برف پوش پہاڑوں پر تھے۔ سب سے بلند کیلاش کی چوٹی تھی۔ جہاں تمام دیوتاؤں کے دیوتا شیو کا راج تھا۔ بچپن میں جب ستی کی ماں اوس کو زمین اور آسمان کے قصے سُنایا کرتی تھی تو وہ کیلاش ہی کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی کو تکا کرتی تھی اور تمام قصوں میں اُس کو شیو ہی کا قصہ سب سے زیادہ پسند تھا +

شیو دنیا کو مٹا دینے والا! ... شیو دنیا کو پھر زندہ کرنے والا! ...

بہار کے بعد جب خزاں میں پرہنہ درختوں کے پتے زرد اور ارغوانی رنگ اختیار کرتے ہیں تو ستی کو بتایا جاتا تھا کہ شیو ہی سب کچھ کرتا ہے۔ جب وہ پتے زرد ہو کر گرتے ہیں تو اُس کو بتایا جاتا تھا کہ وہ شیو ہی کی بھینٹ ہیں۔ جب کوئی مرجاتا تھا تو بھولی ستی اپنے بچپن کی معصومیت اور خوش اعتقادی میں یہی سمجھتی تھی کہ پتیاں خود شیو پر اپنی جان دے دیتی ہیں تاکہ اُن میں وہ پھر تازہ روح پھونکے۔ اسی طرح جب بسنت میں پہاڑ اور کھیت نئے نئے نازک اور رنگ برنگے کپڑے پہنتے تھے۔ تو ستی یہی سمجھتی تھی کہ یہ سب شیو ہی کی مرضی اور حکم سے ہوتا ہے۔ یوں ستی بچپن ہی سے اپنے دل میں مہادیو شیو کی پوجا کرتی تھی۔ اور اپنے ننھے ننھے نازک ہاتھوں کو اُٹھا کر دعا مانگا کرتی تھی۔ کہ اے شیو مہادیو میرے مالک میرے ایشور میری مدد کر اور مجھے حقیقی یوگ کا سبق دے! اُس کی یہ دعا قبول ہوئی۔ مہادیو دکش آئے اور معصوم بچی کو اپنی گود میں بٹھا کر اُنہوں نے اُس کو حق کی راہ بتائی۔ اس طرح مہادیو اکثر اُس کے پاس آتے رہے۔ اور تعلیم کے شروع ہی میں اُس کی روح اور دیوتا کی روح ملکر ایک ہوگئیں +

اس طرح برسوں گذر گئے اور ستی کے بیاہ کے دن آگئے۔ مگر ستی تو اپنا دل اپنی روح اپنی ہستی کا ذرہ ذرہ ہمیشہ کے لئے مہادیو کی نذر کر چکی تھی۔ پھر وہ کسی دوسرے کے ساتھ بیاہ کرنے پر کیسے راضی ہوسکتی تھی۔ جب دکش راجا کو ستی کے دل کی بات معلوم ہوئی تو اُس کی ناراضگی کی کوئی انتہا نہ رہی اور اُس نے نہایت حقارت سے کہا "کیا میری پیاری ستی اُس فقیر دیوتا شیو سے بیاہ کرنا چاہتی ہے؟ ہرگز نہیں! میں حشر تک اسکی اجازت نہ دونگا!"

یہ واقعہ تھا کہ مہادیو جیسا غریب کوئی بھی دیوتا نہ تھا۔ ساری دنیا اُس کی تھی مگر پھر بھی وہ کسی چیز کا مالک نہ تھا۔ کیونکہ اُس نے سب کچھ دوسروں کو دے دیا تھا اور اپنے پاس صرف ایک بیل رکھ لیا تھا جس پر وہ اُن گلیوں میں گھوما کرتا تھا۔ جہاں سے انسان خوف اور کراہت کے مارے بھاگتے ہیں۔ اُن گلیوں کو شمشان کہتے ہیں۔ جب روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے۔ تو امیر و فقیر، پنچ و بزرگ سب وہیں خاک کر دیئے جاتے ہیں اور ایک خاک اور دوسری خاک میں کوئی فرق نہیں ہوتا

ہے۔ انہیں جگہوں میں شیو گھوما کرتا تھا۔ مُردوں کی خاک اپنے بدن پر ملتا تھا۔ اور ان خاک کے ذرّوں کو اپنے جواہرات سمجھتا تھا۔ کیونکہ روحیں اپنے تمدّن کی صرف مصیبت اور موت کی آگ اور شمشان کے شعلوں ہی میں سے گزر کر پہنچ سکتی ہیں +

شیو کی ایک عجیب شان اور عظمت تھی۔ اُس کے سر پر لپٹے ہوئے کالے ناگوں کا ایک تاج تھا اور اُس کا بدن چیتے کی کھال سے ڈھکا ہوا تھا۔ دنیا، آسمان اور سمندر اُس کے ہاتھوں میں تھے۔ اور اُس کی تین آنکھوں[1] کے سامنے ماضی حال اور مستقبل ایک صاف تصویر کی طرح نظر آتے تھے۔ ستی کے دل پر اسی کا سکّہ جما ہوا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اُس کو کسی دوسرے کے ساتھ بیاہ کرنے پر راضی نہیں کر سکتی تھی۔ بالآخر دکش راجا کو ہار ماننا پڑی اور ستی کی شادی مہادیو کے ساتھ ہو گئی۔ مگر دکش راجا کی ناراضگی دور نہ ہوئی +

شادی کے رسوم ادا ہوتے ہی ستی اپنے شوہر کے ساتھ کیلاش چلی گئی۔ کیلاش ہمالیہ پہاڑ پر اسی جگہ واقع تھا جہاں اب شملہ ہے۔ ستی کے لئے تو وہ جگہ جنّت تھی۔ اُس کے چاروں طرف سدا بہار برف تھی اور ستی کی کٹی ہری ہری بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کٹی کے آگے رودر آکش کے درختوں کا سایہ تھا۔ پہاڑ کی شاندار چوٹیاں "کیلاش بھون" کے اِدھر اُدھر سنتری کی طرح پہرہ دیتی تھیں۔ کوئی بادل کی پگڑی باندھے، کوئی برف کا ٹوپ اوڑھے۔ اور جب سوریا دیوتا (سورج) کا ظہور ہوتا تھا۔ تو ان کی پوشاک کے رنگ عجیب عجیب ہو جاتے تھے۔ کچھ نیلے، کچھ سنہرے، کچھ سبز۔ مگر سب خوشنما اور سب خالق یکتا کے ثناخواں اور سب ستی کو اپنی چمک دمک سے خوش کرنے کے کوشاں۔ یہ "کیلاش بھون" کے سامنے ہی بہت سے چشمے پھوٹ نکلے تھے اور سب ملکر ایک خوبصورت جھیل بن گئے تھے جس پر مدار کے پھول پھیلے ہوئے آنکھوں اور روح کو تازہ کرتے تھے۔ جھیل کے پاس ایک جنگل تھا جس میں ہرن اور مور جین کے ساتھ خوش خوش پھرا کرتے تھے۔ جنگل کے آگے ایک اور جھیل اچھودہ تھی جس پر کنول کے پھول تاروں کی طرح چمکتے تھے اور اُس کے آگے کا تو دامان پہاڑی تھی۔ جہاں مہادیو کا بیل رہتا تھا۔ ستی اکثر وہاں جا کر اُس کو ... دکھلاتی تھی اور اُس سے شیو کی تعریفوں کے گیت سنتی تھی۔ پچھم کی طرف آدون پہاڑ تھا جہاں بیش بہا جڑی بوٹیاں سوریا دیوتا کے عصا کی جنبش سے لال لال چمکنے لگتی تھیں۔ اُس کے آگے تنہ نگوان کی سنہری چوٹیاں سر اُٹھائے اپنے پربت پوش ہمسایہ۔ سرو سدھ سے مقابلہ کرتی تھیں۔ ستی ان سب کا نظارہ کیا کرتی تھی اور اُس کے سامنے گنگا مائی کی سات شاخیں نیچے (ہندوستان) کو بہتی جاتی تھیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ گنگا مائی اپنے سات ہاتھوں کو بڑھا کر غریب ہندوستان کے مختلف خطوں کو نعمت پہنچاتی تھیں +

کیلاش کے فردوس میں رنج و غم کبھی داخل ہی نہیں ہونے پاتے تھے نہ کوئی ناگوار آواز اُس پاک فضا میں خلل انداز ہوتی تھی۔ ہاں، اگر وہاں کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو جھرنوں کے نغموں کی، یا چڑیوں کے چہچہانے کی، یا ستی کی پیاری اور دلکش ہستی کی یا شیو کے بھجن کی۔ شیو روز صبح تڑکے اُٹھ کر دھیان یوگ کرتا تھا[2] اور نہایت لطیف اور پُر درد بھجن گاتا تھا۔ ایسے گیت اب بھی ہمارے ملک میں شیو کے پجاری اپنے دیوتا کی تقلید میں علی الصبح اُٹھ کر گاتے ہیں۔ اور اس صبح کی عبادت کو بھیروی کہتے ہیں +

ستی اکثر اپنے معبود اور محبوب کے ساتھ باہوں میں باہیں ڈالے بیل کے باغوں میں گھوما کرتی تھی۔ اور جب وہ اپنی پھولوں سے لدی ہوئی کٹی پر واپس آتے تھے۔ تو شیو کچھ چمپا کے پھول توڑ کر ستی کے بالوں کو اُن سے سنوارتا تھا اور ستی دھتورے کے پھولوں کا ہار بنا کر اپنے پتی کو تاج پہناتی تھی۔ اسی لئے آجتک دھتورے کا پھل شیو کے لئے مخصوص ہے اور اس کے پوجا میں نذر چڑھایا جاتا ہے +

صبح کو جب شیو رودر آکش کے درخت کے نیچے دھیان میں مصروف ہوتا تھا تو ستی اکیلی جنگل میں گھومنے چلی جاتی تھی اور ... ہرنوں کو بلا کر اُن کے ساتھ نندن کے درختوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔ یا شفاف چمکتے ہوئے چشموں کے ساتھ دوڑ لگاتی تھی۔ اور جب وہ چشمے کسی پہاڑی میں غوطہ لگا کر غائب ہو جاتے تھے تو ستی پلٹ آتی تھی۔ اور راستہ میں تتلیوں کو بلاتی جاتی تھی کہ وہ آکر اُس کے گھر کی دیواروں کو سنواریں۔ بھلا اس دعوت کو کون نہ قبول کرتا۔ تمام ہی تتلیاں اپنے اپنے پھولوں کو چھوڑ کر اُس کی کٹی

---

[1] ہندی میں شیو کی تین آنکھوں کو تیرنیتر کہتے ہیں + [2] دھیان یوگ کرتا تھا۔ سمادھی لگاتا تھا +

کی دیواروں کو رنگارنگ کر دیتیں۔ اور اس شوق سے گویا کہ وہ ستی کی نظروں سے شہد حاصل کرنے آئی ہیں۔ اُدھر پھول شوقِ دید سے بیتاب ہوکر چڑیوں سے منت کرتے تھے کہ "جاؤ دیکھ آؤ، ہماری دیوی کیا کر رہی ہیں۔ کیا آج تتلیوں کا دربار ہو رہا ہے؟" چڑیاں تب جاکر کٹی کا محاصرہ کر لیتیں۔ اور خوب زور زور سے چہچہانے لگتیں۔ حتی کہ ستی اُن کو دانہ ڈالنے کے لئے باہر نکل آتی۔ پھولوں کی تمنائیں اور بھڑک اُٹھتیں اور وہ جھوم جھوم کر بصد ناز و ہزار انداز ستی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ✦

شیو کبھی کبھی برف کی مانند سرد ہوتا تھا۔ مگر ستی سورج کے مانند اُس برف کو پگھلا دیتی تھی۔ شیو ایک خشک پتھر کی چٹان کی طرح ہوتا تو ستی ایک چشمہ کی طرح، جو اُس چٹان کو نرم کر دیتا ہے۔ شیو ایک بلند شاندار اور با عظمت درخت تھا۔ اور ستی ایک خوبصورت نازک بیل۔ شیو سورج تھا اور ستی چاند ✦

مہادیو نے ایک مرتبہ کہا "ستی میری جان ہے۔ وہ نہ ہو تو میں بھی نہ رہوں۔" ستی نے بھولے پن کے تعجب سے پوچھا "میرے پرماتما! میں آپ کی جان کیسے ہو سکتی ہوں۔ جب آپ ساری دنیا کے خالق ہیں؟" شیو مسکرائے اور اپنی بھاری مردانہ آواز میں بولے "ستی تم اس لئے میری جان ہو کہ تم مجسم میری محبت ہو اور محبت کے بغیر نہ دنیا ہے نہ زندگی۔ روح محبت سے وابستہ ہے اور محبت کے ختم ہوتے ہی زندگی بے رونق اور خالی ہو جاتی ہے" ✦

جب آسمان کے بادشاہ اندر کی اجازت سے بادل آزاد ہوتے تھے اور کیلاش کی چوٹیوں اور وادیوں پر چھا جاتے تھے تو شیو ستی کو ایک غار میں لے جاتا تھا اور جبتک کہ پہاڑ اور جمبو کے میدان دھوئے جاتے وہ دونوں وہیں رہتے تھے۔ یہ غار پہاڑوں میں چھپا تھا اور اندر جانیکا راستہ دیودار کے شاندار درختوں سے ڈھکا تھا۔ اور اس کے دروازہ تک شیو اور ستی کے چلنے کے لئے بڑی بڑی گھاس کے قالین بچھے تھے۔ غار کی چھت گنبد کی مانند بلند اور شاندار تھی اور گویا اپنی چاند اور سورج کا گنبد تھا۔ مگر [illegible] پتھروں سے سارا [illegible] منقش تھا۔ اس عالی شان غار کے [illegible] میں ایک

نہایت خوبصورت جھیل تھی۔ جس کے چاروں طرف طرح طرح کے رنگ برنگی پودوں کی کیاریاں لگی تھیں۔ کچھ سفید، کچھ سنہرے۔ کچھ نیلے، کچھ آسمانی، کچھ ہرے۔ غرضکہ طرح طرح کے رنگ دل لبھانے کو موجود تھے۔ اس جھیل کے نزدیک ایک چھوٹا سا پدم کا تالاب تھا۔ اور اُس تالاب کے پاس ایک چاندی محل۔ اسی ہوشربا محل میں شیو اور ستی اپنا زیادہ تر وقت یوگ میں صرف کرتے تھے۔ ستی کے کنول جیسے ہاتھ عبادت میں مشغول اور اُس کا سارا تن من اُس کے خیال میں محو۔ جو اسکا شوہر تھا۔ اُس کا خدا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اُسکا سب کچھ تھا

ستی اور شیو کی شادی کے تھوڑے عرصہ بعد برگھو نامی ایک منی نے ایک یگن کیا اور تمام دیوتا اور مہاراجہ اُسمیں شریک ہوئے۔ دکش راجہ سب کے بعد پہنچا اور اُسکے آنے پر سب تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے سوائے اُسکے داماد شیو کے۔ دکش راجا اپنی اِس ہتک پر بے انتہا ناراض ہوا اور اُسیوقت اسکا بدلہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ دن بعد اُس نے ایک یگن کا انتظام کیا اور نوید دینے کا کام نارد "گوشیہ منی" کے سپرد کیا۔ آسمان کے تمام دیوتا اور زمین کے تمام بادشاہ اور شہزادے بلائے گئے سوائے ایک کے۔ وہ ایک مہادیو تھا۔ نارد کو ادھر کی بات اُدھر لگانے کا بڑا شوق تھا۔ اور اسکو اس فن میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اسی لئے دکش راجا نے نوید دینے کا کام اُس کے سپرد کیا تھا۔ جب نارد کو کوئی ایسی چٹ پٹی بات معلوم ہو جاتی تو اُنکے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے۔ اور جبتک وہ ساری دنیا کو ایک ایک کرکے بتا نہ آتے اُنکو چین نہیں ملتا تھا۔ اسلئے وہ بیتاب تھا کہ کسطرح جلد سے جلد کیلاش پہنچکر ستی اور شیو کو اُس یگن کی خبر سنائے جس میں وہ بلائے نہیں جا رہے تھے۔ مگر شیو تو دیوتاؤں کا سردار تھا۔ اور اُس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کے خسر کے ملک میں کیا ہو رہا ہے اور نارد کیلاش کیوں اسقدر بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔ پھر بھی جب "گوشیہ منی" نے آکر ڈنڈوت کیا تو اُس نے نہایت شفقت سے پوچھا کہ "بیٹا نارد کیسے آئے؟" نارد نے سر جھکا لیا۔ شیو کی مزاج پرسی کی اور کہا کہ "کیا حضور کو اس کی خبر نہیں ہے کہ آپ کے خسر ایک بہت بڑا یگن کر رہے ہیں۔ اور اُس میں تمام دیوتا، مہاتما، مہاراجہ اور جمبو کا ایک ایک شخص سب بلائے گئے ہیں۔ مہادیو یہ خبر سنکر بالکل متعجب یا پریشان نہیں ہوئے۔ البتہ نارد کو منع کر دیا کہ وہ ستی سے اسکا ذکر نہ کرے۔ مگر نارد تو ستی کو یہ خبر سنانے کے لئے خاص طور پر بیچین تھا۔ اس لئے وہ فوراً اُٹھ کر چلا گیا۔ گویا کہ اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ ستی اُس وقت اندر بیٹھی تھی۔ مگر منی کی آواز سنکر وہ برآمدہ میں نکل آئی۔ نارد اُس کی طرف جلدی سے

بڑھا بستی نے گھونگٹ نیچا کر لیا اور پوچھا کہ "پتاجی اور ماتاجی کیسے ہیں؟" نارد نے نہایت ادب سے جھک کر پرنام کیا اور کہا "ماتا ستی! دونوں بخیریت ہیں۔ بلکہ آپ کے پتاجی تو ایک بہت بڑا یگن کر رہے ہیں اور مجھے حکم ملا ہے کہ سارے دیوتاؤں اور بادشاہوں کو نوید دے آؤں" +

"ہاں! اور آپ ہم کو بُلانے آئے ہیں۔ ہم ضرور آئیں گے" +

مگر نارد بجائے عام پیامبروں کی طرح نوید دینے کے یہ کہہ کر کہ "اب مجھے اجازت دیجئے مجھے ابھی کئی جگہ جانا ہے" اُبار گی چلدیا ستی نارد کی اس عجیب حرکت سے پریشان ہوئی اور سوچنے لگی کہ اُس نے نوید بھی نہیں دیا۔ مہادیو نے نارد کو ستی کے برآمدہ کی طرف جاتے دیکھا تھا مگر اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اُس کی تیسری آنکھ کے سامنے سارا مستقبل ایک کھلی کتاب کی طرح عیاں تھا۔ اس لئے وہ چٹان پر اپنے چیتے کی کھال پر بیٹھا رہا +

جب نارد چلا گیا تو ستی اپنے شوہر کے پاس گئی۔ اور حسب معمول اُس کے زانو پر بیٹھ کر پوچھنے لگی "تم نے سُنا ہے کہ پتاجی ایک بڑا یگن کر رہے ہیں۔ ہم تم بھی چلیں گے نا؟"

مہادیو نے اُس کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت نرمی سے جواب دیا "میری جان! میں اس لئے نہیں بُلایا گیا ہوں کہ میں ایک غریب داماد ہوں۔ اور تم اس لئے نہیں جا سکتی ہو کہ تم میری بیوی ہو" اتنا کہہ کر اُس نے ستی کے دماغ کو بہتر اور اعلیٰ خیالات کی طرف رجوع کر دیا اور وہ یگن کو بالکل بھول گئی +

مگر چند ہی روز بعد "کیلاش بھون" میں پالکیوں کی ایک قطار کی قطار آ پہنچی۔ اور اُن میں سے ستی کی کئی زرّیں پوش بہنیں اُتر پڑیں۔ اُن کی رنگا رنگ ساریوں اور بیش بہا زیورات سے ساری جگہ جگمگا اُٹھی۔ کہیں ہیرے اپنی چمک دمک دکھا رہے تھے۔ کہیں زمرّد ایک نے سُرخ یاقوت کا شوق کیا تھا۔ دوسری اپنے گلے اور ہاتھوں میں ستاروں کی مانند سفید موتی پہنے تھی۔ جن کی لڑیں اُس کی کمر سے لپٹ رہی تھیں۔ اِدھر لہسونیا اپنی خوبصورتی کی نمائش کر رہا تھا۔ اُدھر نیلم کی رونق ہو رہی تھی۔ ایک نے فیروزہ کو پسند کیا تھا اُس کے قریب دوسری نے مونگے اور سیپ کے زیور پہنے تھے۔ سب بہنیں ایک ساتھ محبت کے جوش میں ستی پر ٹوٹ پڑیں۔ "پیاری بہن! ارے تم ابھی تک پتاجی کے یگن چلنے کے لئے تیار نہیں ہوئیں؟" ستی نے جواب دیا "میری پیاری بہنو! میں وہاں نہیں جا رہی ہوں"

"کیا؟ پتاجی یگن کر رہے ہیں سب ہی وہاں ہوں گے اور تم اُن کی بیٹی کہتی ہو کہ تم جاؤ گی نہیں" +

"نہیں میں نہیں جا رہی ہوں کیونکہ میرے شوامی جی غریب ہیں اور اس لئے پتاجی نے ہم کو نہیں بُلایا ہے۔ تم سب امیر دیوتاؤں کی بیویاں ہو" +

اُس کی بہنوں نے پھر ہمزبان ہو کر کہا "فضول مت بکو جلدی سے تیار ہو اور چلو" +

ستی بولی "نہیں میں نہیں جا سکتی۔ پتاجی کو مجھے دیکھ کر شرم آئیگی اور میں اُن کے منہ سے اپنے شوامی جی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتی ہوں" اُس کی بہنیں اُس کے انکار کی اصل وجہ یہ سمجھیں کہ اُس کے پاس زیور نہیں ہے۔ اس لئے اُنہوں نے آپس میں کچھ چپکے چپکے مشورے کئے اور پھر ستی سے بولیں "ہم سب تم کو ایک ایک زیور دیدیں گے اور تمہارا پورا سنگار ہو جائے گا۔ اب ہم جاتے ہیں اور تمہارے شوامی جی سے تم کو لے جانے کی اجازت مانگ لیں گے" مگر ستی نے پھر انکار کیا اور کہا "پیاری بہنو مجھے اپنے شوامی جی پر ناز ہے۔ اس لئے اگر میں گئی تو اُن کی عورت کی حیثیت سے جاؤنگی۔ اور آپ کے زیور میرے لئے موزوں نہ ہوں گے۔ میں آپ کی محبت اور آپ کے خیال کی ممنون ہوں اور اس لئے مجھے اور زیادہ افسوس ہے کہ میں اس باب میں آپ کا کہنا نہیں مان سکتی ہوں۔" مگر اُس کی بہنوں نے ایک نہیں سُنی۔ اور شیو کے پاس اجازت حاصل کرنے چل دیں۔ شیو اُس وقت ایک رودراکش کے درخت کے نیچے دھیان میں محو تھا۔ لڑکیوں کی ہمّت نہ پڑی کہ مخل ہوں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی نظر ایک بڑے سے تھیلے پر پڑی۔ جو شیو کے قریب ایک ڈال پر لٹکا تھا۔ اُن بہنوں میں سے ایک نے یونہی اُس کو کھول کر دیکھا تو وہ بے بہا جواہرات اور زیور سے بھرا تھا۔ اُن کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا اور آپس میں چپکے چپکے باتیں ہونے لگیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شیو واقعی کوئی غریب دیوتا نہیں ہے: جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے۔ اب تو وہ خوش خوش ستی کے پاس واپس گئیں اور جب انتہائی اصرار پر بھی ستی نہ مانی تو وہ آخرکار افسوس کرتی ہوئی۔ اُس کے بغیر چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد ستی اپنے آقا کے پاس گئی۔ اور اُس سے ناز اور منت سے کہنے لگی "میرے مالک! میں پتاجی کے یگن میں ہو نہ آؤں؟"

شیو اُس کی طرف مڑا نہایت پیار سے اُس کو اپنے سینے سے لگایا اور بولا "میری جان! تم کیسے جا سکتی ہو۔ جب تم بلائی نہیں گئی ہو۔ ایسے بڑے جلسے میں بغیر بلائے نہیں جاتے ہیں"۔

ستی نے کہا کہ میں اپنے باپ کی لڑکی ہوں۔ اور ہم کو آپس میں ایسا تکلف نہ برتنا چاہئے۔ میرا جانے کو بے انتہا جی چاہتا ہے"۔

اُس کے شوہر نے پھر سمجھانے کی کوشش کی "میرا دل نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔ تمہارے پتاجی تمہاری شادی سے ناراض ہیں۔ اس لئے وہاں سے الگ رہنا ہی اچھا ہے۔ خصوصاً جبکہ ہم بلائے نہیں گئے ہیں۔ میری پریتما مان جاؤ اور یہیں میرے ساتھ رہو"۔

مگر ستی اپنا خوبصورت سر ہلا کر منت کرتی گئی "وہاں میری سب بہنیں موجود ہونگی۔ اگر میں ہی اکیلی نہ ہونگی تو کچھ عجب سا معلوم ہوگا۔ میرے پیارے ہاں کہدو"۔

مہادیو نے نہایت سنجیدہ ہو کر کہا "تمہاری بہنیں امیر آدمیوں کی بیویاں ہیں اور بلائی گئی ہیں۔ ہم غریب ہیں اور الگ کردیئے گئے ہیں، پھر وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

مگر ستی نہیں مانی اور خوشامد کرتی گئی "میرے دل و جان کے مالک مجھے ایک غریب دیوتا کے ہونے کی کوئی شرم نہیں ہے۔ بلکہ دنیا میں مجھ جیسی خوش اور مطمئن عورت کوئی بھی نہ ہوگی۔ میں اسی لئے تو اور جانا چاہتی ہوں کہ سب کو دکھادوں کہ مجھے اپنے شوامی پر کتنا ناز ہے۔ مجھے جانے دیجئے"۔

بالآخر شیو راضی ہوگیا۔ "خیر میری جان! جب تمہاری یہی خوشی ہے تو میں اب کچھ نہ کہونگا۔ گو میرا دل نہیں چاہتا ہے کہ تم جاؤ۔ البتہ اگر تم جاتی ہو تو میری بیوی کی حیثیت سے جاؤ۔ اپنے باپ کی بیٹی بن کر نہیں۔ میں نندی اور بھرنگی کو تمہارے ساتھ کردونگا"۔

مہادیو کے چیلے نندی اور بھرنگی حاضر ہوئے اور اس کے حکم کے مطابق اُنہوں نے کیلاش بہون کے بہترین پھولوں سے ایک تاج اور کئی ہار اور کنگن غرضیکہ ہر قسم کے زیور بناڈالے۔ دوسرے دن صبح کو اس پھول کے گہنے میں ستی بے انتہا بھلی لگتی تھی۔ مگر اس کو ایسا معلوم ہوا کہ شیو اُس کی طرف کچھ غمگین نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے غم کو دور کرنے کی غرض سے ستی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی "میں تم سے بہت دن جدا نہ رہونگی"۔

پھر اُس کے سامنے جھکی۔ آشیرواد مانگی اور پاؤں چھو کر ہاتھ جوڑے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ پھر بیل کی طرف بڑھی جو اُس کے لئے تیار کھڑا تھا۔ شیو نے اُس کو اُٹھا کر بیل پر بٹھادیا اور اُس سے چپکے سے کہا "میری جان! کیلاش کی مہک کیلاش کا نور اب تم مجھ سے چھینے لئے جارہی ہو"۔ ستی اپنی اس محبت بھری تعریف سے دل ہی دل میں خوش ہوئی اور شرما کر بولی "میرے پیارے میں وہاں زیادہ نہ رہونگی۔ مگر شیو کو کب تسلی ہوسکتی تھی۔ اُس نے بہت سنجیدہ اور بھاری آواز میں کہا "تم مجھے اکیلا چھوڑے جارہی ہو اور میں بغیر تمہارے زندہ نہیں رہ سکتا ہوں"۔

ستی، نندی اور بھرنگی کے ہمراہ رخصت ہوئی اور شیو اس مختصر قافلہ کو پہاڑ سے اُترتے ہوئے بڑی دیر تک حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھتا رہا جب آخرکار وہ اپنی کٹی کی طرف مڑا تو "کیلاش بہون" ایک بالکل دوسری جگہ معلوم ہوتی تھی۔ جو پھول رہ گئے وہ مرجھا رہے تھے۔ چڑیوں نے اپنا چہچہانا بند کردیا تھا۔ مور گھبرا گھبرا کر چیخ رہے تھے۔ ہرن خوف سے درختوں کی آڑ میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ سورج ایک سیاہ بادل کے بڑے سے ٹکڑے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ہر چیز پر اُداسی چھائی ہوئی تھی اور ایک ہیبتناک سناٹے کا عالم تھا۔ شیو ان تمام بدشگونیوں کے اصلی معنی خوب سمجھتا تھا۔ اور آخرکار ایک ٹھنڈی آہ بھر کر وہ درخت کے نیچے ایک پتھر کے ٹکڑے پر بیٹھ گیا۔ درخت کی پتیاں تھرتھرا رہی تھیں۔ گویا کہ وہ شیو سے انسان کے افعال کا افسوسناک قصہ بیان کرتے ہوئے جھجکتی تھیں۔ خود شیو آنکھیں بند کرکے دھیان میں معروف ہوگیا۔

ستی کو راستہ میں دہن کے دیوتا کوبیر نے دیکھ لیا۔ اُس نے فوراً دوڑ کر پرنام کیا اور پھر درخواست کی کہ اُسے اور اُس کی بیوی کو یہ عزت بخشی جائے کہ وہ اپنی دیوی اپنی ملکہ کو گہنے کے لئے کپڑے پہنائیں۔ اُسکی بیوی جو اُس کے پیچھے پیچھے آئی تھی التجا کرنے لگی "ماتاجی! میرے شوامی جی دہن کے دیوتا ہیں۔ مگر اُن کا تمام خزانہ ہیچ اور بیکار رہے۔ اگر وہ آپکو زیور نہ پہنا سکیں۔ بہت منت کے بعد آخرکار ستی راضی ہوگئی۔ اور کہنے لگی "خیر جو تمہارا جی چاہے کرو۔ مجھے میرے بچّے بے انتہا عزیز ہیں۔ اور ان کو خوش کرنے میں میری خوشی ہے۔ پھر کیا تھا کوبیر اور اُس کی بیوی اپنے خزانے

کے بہترین جواہرات اور سب سے خوبصورت زیور لے آئے اور اپنی ملکہ کو زربفت کے لباس اور بیش بہا زیورات سے آراستہ کیا۔ نندی اور بھرنگی اپنی دیوی کو اُس کی شان کے مطابق پوشاک پہنے دیکھ کر مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے +

جیسے ہی ستی چلنے لگی کوویرا اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر درخواست کی کہ اُسے آرایش کو مکمل کرنے کی اجازت دی جائے۔ ستی ہنسکر کہنے لگی کہ "آخر باقی ہی کیا رہا ہے؟ تمہارے دیوی جی نے تو مجھے سب کچھ اچھی سے اچھی طرح پہنا دیا ہے"۔ کوویرا نے عرض کیا "صرف ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ آپ کے پیروں کی زینت"۔ یہ کہہ کر اُس نے دو کھلے ہوئے کنول کے پھول نکالے۔ اور ستی کے دونوں پیروں میں لگا دیئے۔ اس کے بعد اٹھا جھک کر آداب بجالایا اور کہنے لگا "ماتا جی اب آپ کی آرائش پوری ہو گئی اور تکمیل کا سہرا آپ کے غلام ہی کے سر رہا۔ ستی ہنسی اور کوویرا اور اُس کی بیوی کو دعائیں دیکر پھر روانہ ہوئی +

دکش راجا کا عالیشان محل مہمانوں سے بھرا تھا۔ دیوتا۔ مہاراجہ، گرو اور رشی تمام ہی شرکت کے لئے آئے تھے اور یگن کا انتظار کر رہے تھے۔ محل گنگا کے کنارے تھا یہ دریا کا وہ حصہ تھا جو تین دھارا کہلاتا ہے۔ تھوڑی دور پر پہاڑیاں تھیں۔ اور آگے بڑھ کر نیلگوں آسمان کی گود میں ہمالیہ کے برف پوش پہاڑ اپنی سفیدی سے دھوپ میں چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ دکش راجا کی راجدھانی ایک لاجواب جگہ تھی۔ تمام عمارتیں پتھر کی تھیں اور وہاں کی پرانی پتھر کی سڑکوں کے بچے ہوئے ٹکڑے اب تک اُس کی قدیم شان و شوکت کی گواہی دیتے ہیں۔ خود شاہی محل ایک نہایت خوبصورت اور عالی شان عمارت تھی۔ اُس میں متعدد برآمدے اور وسیع چبوترے تھے اور جگہ جگہ کشادہ صحن تھے۔ دربار ہمیشہ باہر کے صحن میں ہوتا تھا۔ اور اس موقع پر وہ یگن کے لئے خاص طور سے آراستہ کیا گیا تھا وہاں ہر چیز اسقدر قیمتی اور شاندار تھی کہ ہزاروں مہمانوں کی زبانیں اور نگاہیں تعریفیں کرتی تھیں۔ اور رکز نہ چکتی تھیں۔ دکش راجہ کبھی اندر جاتا کبھی باہر آتا تھا۔ اور سب انتظام دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا کہ اس یگن سے اُس کے مغرور داماد شیو کو ایک ایسا اچھا سبق مل جائے گا۔ کہ پھر [illegible] (دکش راجا کی) توہین کرنے کی جرأت نہ کرے گا +

دکش رانی کو اُس کے شوہر نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لئے جب اُس کی سب لڑکیاں پہنچ گئیں اور ان سے سُنا کہ اُس کی سب سے چھوٹی اور چہیتی لڑکی موجود نہ ہو گی تو سخت حیران اور رنجیدہ ہوئی اور بار بار پوچھتی تھی کہ ستی کیوں نہیں آئی۔ ایک روز وہ پھر پوچھ رہی تھی کہ آیا ستی کے آنے کی کوئی امید ہے کہ اتنے میں محل کے پھاٹک میں ایک نورانی سواری بیل پر آتی دکھائی دی۔ رانی فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو ستی ہے اور جلدی سے اُس کو پیار کرنے کو لپکی۔ تھما ہوا دریا بہہ نکلا "میری بچی میری پیاری ستی تم اتنی دیر میں کیوں آئیں؟ تم کتنی سُندر لگ رہی ہو۔ اور دیکھو تو تم کتنے قیمتی زیور پہنے ہو"۔ غرضکہ ماں نے اپنی بیتاب خوشی میں ستی کے وہ وہ دُلار کئے کہ اور لڑکیاں جلنے لگیں اور بے انتہا خفا ہوئیں۔ کہ ان کی ماں نے اُن سب سے زیادہ آؤ بھگت کی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کی بہن جو ایک مفلس دیوتا کی بیوی تھی پوشاک اور زیور میں ان سب سے زیادہ بڑھی چڑھی تھی۔ پھر کیا تھا اُنہیں فوراً اس بات کا خیال آ گیا کہ ستی یگن میں بلائی نہیں گئی تھی اور انہوں نے اپنا یہ فرض محسوس کیا کہ اپنے باپ کو وہ اس بات کی خبر کر دیں۔ جب دکش راجہ کو اطلاع ہوئی تو اُس کے غصہ کی آگ بھڑک اُٹھی اور وہ چلانے لگا "کیا ستی آئی ہے؟ وہ بہت دیر نہ رہنے پائے گی۔ یہاں آنے کی اُسے ہمت کیسے ہوئی جب اُسے اور اُس کے شوہر کو کسی نے بلایا نہیں تھا۔ کوئی غیرت دار عورت ہرگز وہاں نہ جائے گی جہاں اُس کا شوہر نہ پوچھا جائے۔ میں اُس فقیر دیوتا شیو سے ہرگز کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا ہوں جس کی ستی بیوی ہے وہ فوراً میرے محل سے نکل جائے۔ اُس نے اپنی چھوٹی لڑکی کو فوراً دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا +

دربار میں تمام مہمانوں کے تخت اُن کے وقار کی مناسبت سے لگے تھے اور جب ستی اُن کے درمیان سے ہو کر گذری تو سب کی نگاہیں اُسی پر تھیں اُس نے گھونگٹ نکال لیا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی چال ڈھال تو چھپ نہیں سکتی تھی۔ تمام دربار کی اس وارفتگی نے دکش راجہ پر تازیانہ کا کام کیا جب ستی اُس کی گدی کے نیچے پہنچی تو وہ غصہ میں تو بھرا ہی تھا فوراً برس پڑا۔ پہلے تو تعجب کا اظہار کیا کہ اُس نے بغیر بلائے یگن میں آنے کی جرأت کیسے کی۔ پھر اُس کو اُس کی شادی پر لعنت ملامت کر کے شیو کو برا بھلا کہنے لگا جب تک وہ یہ غصہ کی آگ اگلا کیا ستی خاموش سر جھکائے سنا کی۔ مگر جیسے

ہی وہ چپ ہوا - اُس نے سر اٹھا کر جواب دینا شروع کیا - اور اس کی صاف اور بلند آواز سے سارا دربار گونج اُٹھا ؛

"پتا جی! آپ میرے شوامی جی کو کیوں اسقدر بُرا بھلا کہتے ہیں ؟ کیا آپ بھول گئے کہ وہ مہادیو ہے - وہ بھکاری ضرور ہے - مگر محبّت کی بھیک مانگتا ہے' اور محبت بھی اپنے بچّوں کی - صرف اس کی اسے خواہش ہے" اتنا کہہ کر وہ رُکی اور رُک کر پھر بولی - "مجھے آپ کے خیال سے سخت رنج ہوتا ہے - جو گستاخی آپ سے مہادیو کی شان میں ہوئی ہے - وہ ایک انسان کے لئے ناقابل معافی ہے" ستی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ تمام سہمے ہوئے درباریوں کے سامنے دکش راجا کی شکل بدل گئی - اور اُس کا سر ایک بکرے کا سر ہوگیا - مگر اُس کرشمہ کی اس وقت کسی کو خبر نہ ہوئی - سب پر ستی کی آواز کا جادو چھایا ہوا تھا - وہ آواز پھر سُنائی دی - "خود مجھے اب زندگی دوبھر ہے - میں ہمیشہ اُس کی لڑکی کہلاؤں گی جس نے اپنے ایشور میرے محبوب مہادیو کو گالیاں دیں - یہ کہہ کر وہ گھٹنیوں کے بل گر پڑی اور ہاتھ باندھ کر اور آسمان کی طرف نگاہ بلند کر کے دعا مانگنے لگی "مہے [illegible] ماتما - میرے [illegible] تمہاری مرضی کے خلاف یہاں کیوں آئی ؟ میرے شیو! میرے [illegible] پتا جی کی ان گالیوں کے بعد جینا مجھ پر بار ہے - اے تم جلد [illegible] مجھے یہاں سے لے جاؤ" اتنا کہہ کر وہ زمین پر آہستہ آہستہ گر پڑ[illegible] اُس کے ہاتھ بندھے رہے - اور آسمان کی طرف اُٹھے تھے اسی حالت [illegible] اُس نے آخری مرتبہ پکارا "مہادیو' میرے ایشور' میرے پتی مجھے [illegible] اس دنیا میں میرے آخری خیالات تمہیں سے وابستہ ہیں [illegible] تمہاری ہی یاد سے' تمہاری ہی محبت سے معمور ہے - میرے مالک [illegible] آخری درخواست تم سے یہی ہے کہ اپنی ستی کو بھول نہ جانا"

[illegible] ستی کی دلکش اور دلسوز آواز رُک گئی - اور سارے دربار پر ایک ہیبت [illegible] ہوگئی - اُس کے ماتھے پر ایک نہایت چمکدار ستارہ نمودار تھا - اور جب کسی نے آخر کار اُس کے قریب جانے کی ہمّت کی تو معلوم ہوا کہ اُس کی روح اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی - مگر پھر کسی کی اتنی جرأت نہیں ہوئی جو اس خوبصورت جسم کو چھوتا - جواب بے جان پڑا تھا - تمام دیوتا شیو کے غیظ و غضب کے خیال سے تھرا رہے تھے - اور بادشاہ' شاہزادے' فقیر اور دیوتا سب دربار سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے ؛

نندی اور بھرنگی دکھ کے مارے گھر واپس گئے - مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شیو کو یہ کیسے بتائیں کہ کیلاش کی دیوی اس دنیا سے چل بسیں - جب وہ بھون پہنچے تو مہادیو درخت کے نیچے اپنی پتھر کی چٹان پر بیٹھا یوگ میں مصروف تھا - اُس کو دیکھ کر بھرنگی رو رو پکارنے لگا "ستی دیوی ستی دیوی آپ کہاں ہیں ؟ آپ کہاں چلی گئیں ؟" جب ان نالوں کی آواز شیو کے کان میں پڑی تو اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں - اور دیکھا کہ نندی اور بھرنگی اُس کے سامنے سربسجدہ زمین پر پڑے رو رو کر چلّا رہے ہیں -

"ماتا جی! ماتا جی!"

شیو اُٹھا اور اپنے پتّھر کے تخت سے اُتر کر نندی کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ "آخر ماجرا کیا ہے ؟" اس کا سارا بدن بید کی طرح لرز رہا تھا - نندی اور بھرنگی نے اپنی مصیبت کی کہانی جیسے تیسے بیان کی - وہ شیو کی ہیبت ناک صورت دیکھ کر سہم گئے تھے ؛

آج شیو کی جو حالت تھی وہ اُنھوں نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی - غم اور غضب نے اُس کو ایک دوسرا شخص بنا دیا تھا - اپنے بالوں کو اُس نے ایک مرتبہ جھٹکا دیا اُس کی تینوں آنکھیں مثل تنور کے بھڑک رہی تھیں - کالے سانپ جو اُس کے سر کا تاج بنے ہوئے تھے اپنے پھن نکالکر غیظ و غضب کی مورتیں بن گئے تھے - شیو کبھی اُتر کی طرف دیکھتا تھا' کبھی دکھن کی طرف - کبھی پورب' کبھی پچھم اور اس کی آواز میں آسمان کی گرج تھی - "میری ستی مجھ سے جدا ہوگئی - میری ستی مجھ سے چھن گئی" شیو کی صورت اُسوقت اسقدر ہیبت ناک تھی کہ ایک معمولی انسان دیکھنے کی تاب نہ لاسکتا تھا ؛

جب وہ بولتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ بادل گرج رہے ہیں - شیو اس وقت زندگی بخشنے والا مہادیو نہ تھا - جو روحانیت میں ڈوبا رہتا تھا' بلکہ دنیا کو سنگھار کرنے والا شیو جو غیض و غضب کے جذبات کا مجسّمہ تھا - اُس کے دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ وہ سڑی سا ہوگیا تھا اور جوشِ انتقام سے اُبل رہا تھا - اسی حالت میں اُس نے ایک بار چیخ کر پکارا "بادل اور بجلی! طوفان اور زلزلہ! تم سب کہاں ہو؟ میری مدد کو آؤ اور اس دنیا کو نیست و نابود کردو!" اُسکا حکم دینا تھا کہ تمام عناصر اُس کے سامنے حاضر ہوگئے اور سجدہ بجالائے - پھر کیا تھا شیو اپنا ترشُل ہاتھ میں لئے پہاڑوں کو باندھتا ہوا دکش راجا کے محل میں جا پہنچا - اُس کے قدم قدم پر دنیا ہلتی اور لرزتی تھی' بادل گرجتے تھے' بجلیاں چمکتی تھیں اور چمک کر گر پڑتی تھیں - بارش وہ موسلا دھار کہ گویا آسمان پھٹ گئے - سارے

کیا ہندو جہاز رانی جانتے تھے؟

از جناب مانک رام صاحب ۔ ایم ۔ اے

(۱)

ایک زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کی تاریخ اسکندر اعظم کے حملہ (۳۲۶ء قبل مسیح) سے شروع کی جاتی تھی ۔ اس سے پہلے ویدوں اور ان کے متعلق چند اور کتابوں کا ذکر ہوتا تھا ۔ مہاتما بدھ کی ہستی تسلیم کی جاتی تھی ۔ اور بس ۔ ماسوائے اس کے سب تاریکی اور ظلمت تھی ۔ بعد کی کتابوں میں دیئے ہوئے واقعات افسانوں سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے ۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ تاریکی کے پردے دور ہونے لگے ۔ واقعات افسانوں سے گذر کر تاریخی اہمیت حاصل کرنے لگے ۔ وہ ہستیاں جنہیں دیومالا سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی تھی ۔ ان کا وجود اندرونی اور بیرونی شواہد سے ثابت ہونے لگا ۔ حتی کہ آج ہم اس قابل ہیں کہ اسکندر سے پہلے کے ایک طویل زمانہ کی بہت حد تک مسلسل تاریخ پیش کر سکیں +

یہی نہیں ۔ کہ ہم حکمران خاندانوں کے افراد گِنا سکتے ہیں ۔ ان کے زمانۂ حکومت کی تعین کر سکتے ہیں ۔ اور ان کی خانہ جنگیوں اور بیرونی دشمنوں سے مدافعانہ لڑائیوں کا حال بیان کر سکتے ہیں ۔ بلکہ گذشتہ نصف صدی میں ہندوستانی اور یورپی فضلاء کی ان تھک کوششوں نے پُرانے علم و ادب کے وہ جواہر ریزے ملکِ عام کر دیئے ہیں ۔ کہ بلاخوف تردید آج ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم اپنے تہذیب و تمدن کی تاریخ کے لئے اسقدر مسالہ مہیا نہیں کر سکتی ۔ جسقدر ہمارے ہاں موجود ہے +

یہ خیال کہ ہندوؤں میں مادۂ اقدام کی کمی تھی ۔ یا وہ کبھی ہندوستان سے باہر گئے ہی نہیں بے بنیاد اور غلط ہے ۔ یہ ثابت ہو چکا ہے ۔ کہ ہندو جہاز رانی سے واقف تھے ۔ وہ جہاز سازی کے علم سے بہرۂ وافر رکھتے تھے ۔ اُنہوں نے نہ صرف تجارتی جہاز تیار کئے ۔ بلکہ جنگی جہازوں کا استعمال بھی کیا ۔ اور جزائر شرق الہند میں ...... ہندوستانی نوآبادیاں قایم کیں ۔ ان جزائر کا موجودہ تمدن اور وہاں کے آثارِ قدیمہ زبانِ حال سے یہ بتا رہے ہیں ۔ کہ ہم اپنے وجود کے لئے کس کے شرمندۂ احسان ہیں +

چند سال ہوئے ۔ پروفیسر رادھا کمد مکرجی نے ہندوؤں کی جہاز رانی پر ایک کتاب لکھی تھی ۔ اس میں اُنہوں نے ازمنۂ قدیم سے لیکر انگریزوں کی آمد تک کی ہندوستان کی تاریخ جہاز رانی دی ہے ۔ میرے اس مضمون کے کئی حوالے اسی کتاب سے لئے گئے ہیں ۔ کئی جگہ ان کے حوالوں پر میں نے اضافہ کیا ہے ۔ اور کئی نئے حوالے اپنے پاس سے دیئے ہیں +

(۲)

کلکتہ کے سنسکرت کالج کی لائبریری میں ایک قلمی کتاب[۱] ہے جس کا نام "یکتی کلپ ترو" ہے اس کا مرتب و مؤلف "بھوج نرپتی" ہے ۔ اسمیں جواہرات تلواروں ۔ گھوڑوں ۔ ہاتھیوں ۔ زیورات ۔ جھنڈوں ۔ چھتریوں ۔ وزیروں اور جہازوں وغیرہ کا ذکر ہے ۔ مؤلف نے اپنے سے پہلے کے مصنفوں کے کثرت سے حوالے دیئے ہیں ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ان علوم پر اس سے قبل کتابیں موجود تھیں +

ہم اس میں سے صرف جہازوں کی نسبت دی ہوئی معلومات پر اکتفا کریں گے ۔ ہندوؤں نے جس طرح چار حصوں میں جماعتی تقسیم کی ۔ اسی طرح نباتات میں لکڑی کی بھی چار قسمیں مقرر کیں ۔ سب سے اوّل برہمن قسم کی لکڑی ہے ۔ یہ ہلکی اور نرم ہوتی ہے ۔ اور دوسری لکڑیوں سے بآسانی پیوست ہو جاتی ہے ۔ دوسری کشتری یہ ہلکی اور سخت ہوتی ہے ۔ اور دوسری لکڑیوں سے جڑ نہیں سکتی ۔ تیسری ویش نرم اور بھاری ہوتی ہے ۔ اور چوتھی شودر ۔ سخت اور بھاری + ایسی لکڑی بھی گنائی گئی ہے ۔ جسے دوج کہتے ہیں ۔ یعنی جس میں دو اقسام کی خصوصیات پائی جائیں +

بھوج کے خیال میں کشتری لکڑی سے تیار کیا ہوا جہاز خوشی اور

---

[۱] یہ کتاب نرندر ناتھ لا صاحب نے شایع کر دی ہے ۔ اور انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی کے دفتر سے دستیاب ہو سکتی ہے +

دولت کا حامل ہوتا ہے۔ اور ایسے جہاز ہی بڑے سمندروں میں استعمال کرنے چاہئیں۔ طرح طرح کی لکڑی سے بنا ہوا جہاز کسی کام کا نہیں ہوتا نہ وہ پائیدار ہوتا ہے اور نہ ہی پانی کے زبردست تھپیڑوں کے سامنے اس کے ٹکڑے اپنی جگہ پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جہاز بنانے والوں کو بھی ایک عجیب ہدایت کرتا ہے۔ کہ جہاز کے مختلف ٹکڑے لوہے سے نہ جوڑے جائیں۔ کیونکہ اس طرح مقناطیسی پہاڑیاں جو سطح سمندر کے نیچے چھپی ہوتی ہیں جہاز کو اپنی طرف کھینچ لینگی۔ اور وہ ان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ۔

کتاب میں وزن اور حجم کے اصول پر جہازوں کے نام رکھے گئے سب سے اوّل جہاز دو قسم کے ہیں:-

(ا) سامانیہ (معمولی جہاز جو دریاؤں یا ایسی ہی اور کم غیر محفوظ جگہوں میں استعمال ہوتے ہیں)

(ب) وشیش (خاص جہاز جو سمندر میں چل سکتے ہیں)

پہلی قسم کے جہازوں کی پھر دس قسمیں ہیں۔ ان کے نام معہ ان کی جسامت کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

(ا) سامانیہ کی اقسام (ہاتھ = ۱½ فٹ)

نام	طول	عرض	گہرائی
(۱) کشُدرا	۱۲- ہاتھ	۴- ہاتھ	۴- ہاتھ
(۲) مدھیما	۲۴ "	۱۲ "	۸ "
(۳) بھیما	۴۰ "	۲۰ "	۲۰ "
(۴) چپلا	۴۸ "	۲۴ "	۲۴ "
(۵) پٹلا	۶۴ "	۳۲ "	۳۲ "
(۶) بھیا	۷۲ "	۳۶ "	۳۶ "
(۷) دیرگھا	۸۸ "	۴۴ "	۴۴ "
(۸) پترپتا	۹۶ "	۴۸ "	۴۸ "
(۹) گربھرا	۱۱۲ "	۵۶ "	۵۶ "
(۱۰) منتھرا	۱۲۰ "	۵۶ "	۵۶ "

اوپر کی فہرست میں سے (۱)، (۶) اور (۹) غالباً بے ڈول ہونے کی وجہ سے خراب اور منحوس بتائے گئے ہیں ۔

(ب) وشیش کی اقسام:-

یہ جہاز پہلے دو بڑی قسموں میں منقسم ہیں (۱) دیرگھا جو غالباً لمبے ہوتے ہیں اور (۲) اُنتا جو لمبائی چوڑائی کی بجائے زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ اوّل کی پھر دس قسمیں ہیں۔ اور دوسرے کی پانچ۔ تفصیل حسب ذیل ہے

	نام	طول	عرض	گہرائی
(ا)	دیرگھا	۲۴ ہاتھ	۵ ۱/۴ ہاتھ	۴ ۱/۵ ہاتھ
	(۱) دیرگھکا	۳۲ "	۴ "	۳ ۱/۵ "
	(۲) ترانی	۴۸ "	۶ "	۴ ۴/۵ "
	(۳) لولا	۶۴ "	۸ "	۶ ۲/۵ "
	(۴) گوتورا	۸۰ "	۱۰ "	۸ "
	(۵) گامنی	۹۶ "	۱۲ "	۹ ۳/۵ "
	(۶) تاری	۱۱۲ "	۱۴ "	۱۱ ۱/۵ "
	(۷) جنگھالا	۱۲۸ "	۱۶ "	۱۲ ۴/۵ "
	(۸) پلاونی	۱۴۴ "	۱۸ "	۱۴ ۲/۵ "
	(۹) دھارنی	۱۶۰ "	۲۰ "	۱۶ "
	(۱۰) بیگنی	۱۷۶ "	۲۲ "	۱۷ ۳/۵ "

ان میں سے (۳)، (۵) اور ۸ بُرے گنے جاتے تھے ۔

(۲) اُنتا کے اقسام:-

نام	طول	عرض	گہرائی
(۱) اوردھو	۳۲ "	۱۶ "	۱۶ "
(۲) انوردھو	۴۸ "	۲۴ "	۲۴ "
(۳) سورن مکھی	۶۴ "	۳۲ "	۳۲ "
(۴) گربھنی	۸۰ "	۴۰ "	۴۰ "
(۵) منتھرا	۹۶ "	۴۸ "	۴۸ "

ان میں سے (۲) (۴) اور (۵) بُرے اور (۱) بہت اچھے خیال کئے جاتے ہیں ۔

کتاب میں جہازوں کی آرائش وغیرہ کے متعلق کافی ہدایات ہیں۔ چاندی سونے اور تانبے اور ان تینوں کے مرکب سے سامان کی تیاری کی سفارش کی گئی ہے۔ جہازوں کو چار طرح کا رنگ کیا جاتا تھا۔ چار مستولوں والا سفید تین والا سرخ۔ دو والا پیلا۔ اور ایک والا نیلا ہوتا تھا۔ جہازوں کے سرے جانوروں کی شکل کے بنائے جاتے تھے۔ ان میں سے مینڈک مچھلی، شیر ببر، بھینس، سانپ۔ ہاتھی اور شیر جانوروں میں سے راج ہنس اور طوطا

پرندوں میں سے زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ بعض دفعہ انسان کی شکل بھی بنائی جاتی تھی۔ اس سے فن تعمیر اور بت تراشی میں تنوع اور ترقی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض دفعہ ان شکلوں کے گلے میں سونے اور جواہرات کے نقش و نگار بھی کئے جاتے تھے ٭

وہ جہاز جن کے تمام عرشے پر کمرے ہوتے تھے "سرب مندرا" کہلاتے تھے۔ ان میں شاہی خزانہ گھوڑے اور مستورات لے جائی جاتی تھیں۔ وہ جن کے صرف درمیان میں کمرے ہوتے تھے۔ اور جو برسات کے لئے زیادہ مفید ہوتے تھے اور بادشاہوں کی سیر و تفریح کے کام آتے تھے "مدھیہ مندرا" کہلاتے تھے۔ وہ جو لمبے سفر کے کام آتے تھے اور لڑائی بھڑائی میں استعمال ہوتے تھے۔ ان میں کمرے ایک سرے پر ہوتے تھے۔ ایسے جہازوں کو "اگرمندرا" کہتے تھے۔ مہابھارت (آدی پرب) میں غالباً ایسے ہی جہاز کا ذکر ہے۔ جب پانچوں پانڈو بھائی بدر کی نصیحت پر دشمنوں سے بچنے کے لئے بھاگ گئے تھے۔ یہ جہاز خاص اسی مطلب کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اور ہر طرح کے سامان سے لیس تھا۔ اسلحہ وغیرہ کافی تعداد میں مہیا کر لئے گئے تھے۔ تاکہ وقت پڑنے پر دشمنوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ رامائن (ایودھیا کانڈ: ۸۴ : ۸) میں بھی ایسے ہی جہاز کا ذکر ہے۔ بنگالیوں نے بھی راجہ رگھو کا مقابلہ ایسے ہی جہازوں میں کیا تھا۔ (رگھو ونش: ۴ : ۳۶)

لیکن یہ تو ایک ایسی کتاب کا حال ہے۔ جسمیں دیگر علوم کے ساتھ ضمناً جہازوں کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ ورنہ یوں تمام سنسکرت علم و ادب ایسے حوالوں سے بھرا پڑا ہے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہندو جہاز رانی کے فن سے کماحقہٗ واقف تھے ٭

رگوید (۱: ۲۵ : ۷) میں ورن ان تمام سمندری راستوں سے بخوبی واقف ہے۔ جن سے جہاز سفر کرتے ہیں۔ (۲ : ۴۸ : ۳) میں تاجروں کا ذکر ہے۔ جن کی حرص انہیں غیر ملکوں کو جہاز بھیجنے پر مجبور کرتی ہے۔ (۱ : ۵۶ : ۲) میں ان سوداگروں کا بیان ہے۔ جن کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے۔ اور جو نفع کی خاطر ہر جگہ جانے پر تیار ہیں۔ اور سمندر میں اکثر سفر کرتے رہتے ہیں۔ (۷ : ۸۸ : ۳-۴) اور (۱: ۱۱۶ : ۳) میں بھی جہازوں کا تذکرہ ہے۔ موخرالذکر میں جب راجہ بھوجیو کا جہاز تباہ ہو جاتا ہے۔ تو اسے دونوں اشون بھائی اپنے جہاز میں بچاتے ہیں۔ جس میں سو چپو استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی جگہ ویدوں میں جہازوں کا ذکر ہے۔

رامائن کا ایک حوالہ تو اوپر گزر چکا ہے۔ اور بھی کئی جگہ پر ہندوستان اور غیر ملکیوں کے درمیان بحری آمد و رفت کا ذکر ہے۔ کشکندھا کانڈ (۴۰ : ۲۵) میں جب سگریو اپنے افسروں کو سیتا جی کی تلاش کے لئے روانہ کرتا ہے۔ تو دوسری جگہوں کے ساتھ سمندری جزیروں میں بھی تلاش کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ شلوک ۲۳ میں ایک ایسی جگہ کی طرف اشارہ ہے جہاں کیڑوں کے ذریعہ ریشم پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے اصطلاح ایسی برتی گئی ہے جو سنسکرت کی دوسری کتابوں میں صرف چین کے ریشم کے لئے ہی استعمال کی گئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اس وقت لوگ چین سے واقف تھے۔ اور وہاں سے آمد و رفت جاری تھی۔ اسی جگہ جاوا اور سماٹرا کا ذکر بھی ہے۔ ایودھیا کانڈ کا ایک حوالہ جس میں بحری لڑائی کا ذکر ہے۔ اوپر درج ہو چکا ہے۔ منو (۷ : ۱۹۲) میں مختلف قسم کی لڑائیوں کے قبیل سے بحری جنگ کا ذکر بھی ہے ٭

مہابھارت (سبھا پرب) میں جب سہدیو فتوحات سے مراجعت کرتا ہے تو مفتوحہ علاقوں میں چند جزیرے بھی ہیں۔ جہاں کے ملیچھ باشندوں نے شکست کے بعد اس کی حکومت تسلیم کر لی۔ ایسے ہی درون پرب۔ کرن پرب شانتی پرب۔ آدی پرب وغیرہ میں بھی جہازوں اور سمندری مہموں کا ذکر ہے ٭

اس کے بعد جب ہم سوتروں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو وہاں بھی قدم قدم پر ایسے نشانات ملتے ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جہاز رانی سے بخوبی واقف تھے۔ بودھاینا دھرم سوتر (۲ : ۲) میں برہمن کے لئے سمندری سفر کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن (۱: ۲ : ۴) میں وہ مانتا ہے کہ "شمالی (یعنی آرین نسل کے) لوگ سمندری سفر کے بہت شوقین ہیں" (۱ : ۱۸ : ۱۴) اور گوتم دھرم سوتر (۱۰ : ۳۳) میں ان محصولوں کا ذکر ہے جو "جہازوں کے مالک راجہ کو ادا کرتے ہیں" منوسمرتی (۳ : ۱۵۸) اس برہمن کو شرادھ کرانے کے ناقابل تصور کرتی ہے۔ جس نے سمندری سفر کیا ہو۔ آٹھویں باب میں منو کہتا ہے کہ اگر کسی کو روپیہ جہاز بنانے کے لئے قرض دینا ہو تو شرح سود مقرر کرنے میں ایسے شخص سے مشورہ لیا جائے۔ جو بری اور بحری تجارت کی کیفیت سے پورا واقف ہو۔ اسی باب میں دریاؤں اور سمندروں میں چلنے والے جہازوں پر شرح کا اصول درج ہے۔ (۸ : ۴۰ : ۹) میں وہ ایک عجیب قاعدہ لکھتا ہے۔ کہ اگر ملاحوں کی غفلت سے کسی مسافر یا سوداگر کا کچھ نقصان ہو جائے۔ تو وہ تمام ہرجانہ کے ذمہ دار ہیں لیکن اگر

اس کی وجہ "دیوتاؤں کی مرضی" ہے۔ تو اس کے لئے وہ قصور وار نہیں گردانے جا سکتے۔ یگیہ ولکیہ بھی لکھتا ہے کہ لوگ نفع کی خاطر مصائب سے بے پروا سمندر میں سفر کرتے ہیں ◆

علم ہیئت کی کتابوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ درہت سنگھتا (۴ : ۸) اور (۷ : ۶) اور (۹ : ۳۱) میں ایسے ستاروں کا ذکر ہے۔ جن کی وجہ سے جہاز رانوں پر مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ (۱۰ : ۳) میں ایسے چھوٹے جہازوں کا ذکر ہے۔ جو صرف اندرونی تجارت میں مفید ہیں (۱۰ : ۱۰) میں سمندری بیماری کی وجہ بیان کی گئی ہے ◆

پرانوں میں بھی جا بجا سمندری سفروں کا ذکر ہے۔ وایو۔ مارکنڈے بھاگوت - ورآہ وغیرہ میں اکثر ایسی کہانیاں ہیں۔ جن میں جہاز رانی کا بیان ہے۔ ورآہ پران میں ایک ایسے سوداگر کا حال درج ہے۔ جو دوسروں کے ساتھ اس لئے سمندر میں گیا۔ کہ وہاں سے موتی نکالے۔ اور اس کے ہمراہی موتیوں وغیرہ کا پورا علم رکھتے تھے ◆

لیکن یہ تو محض مذہبی یا نیم مذہبی کتابوں کی نسبت ہے۔ سنسکرت ادب میں بھی اس ذکر کی کمی نہیں۔ کالیداس کے رگھوونش کا ایک حوالہ اوپر درج ہے۔ دوسری جگہ راجہ رگھو کے فارس فتح کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن وہ خاص طور پر لکھتا ہے کہ راجہ نے خشکی کے راستہ سے چڑھائی کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمندری راستہ سے بھی ناواقف نہ تھے۔ "شکنتلا" ناٹک میں چین کی ریشم کا ذکر ہے۔ راجہ ہرش کے ناٹک "رتناولی" میں لنکا کے راجہ وکرم واہو کی بیٹی کے جہاز کی تباہی کا بیان ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ کس طرح کوسمبھی کے تاجروں نے جو لنکا سے واپس آرہے تھے۔ اسے بچایا اور اپنے ساتھ لے آئے۔ اسی طرح ڈنڈی کے "دس کمار چرتر" میں رتن بودھ نامی سوداگر کے ایک جزیرے میں جا کر شادی کرنے اور واپسی پر جہاز کی تباہی کا ذکر ہے۔ ایک اور جگہ ایک دوسرے سوداگر متر گپت کا حال درج ہے۔ ماگھ شاعر کی کتاب "ششوپال بدھ" میں تاجروں کے باہر سے مال لانے اور یہاں سے باہر بھیجنے کا ذکر ہے ◆

کشمیری شاعر سوم دیو کی "کتھا سرت ساگر" (۹ : ۱) میں پرتھوی راج کے جزیرہ مکتی پور میں جانے کا بیان ہے۔ اسی طرح (۹ : ۲، ۴، ۷) میں سمندروں کے سفروں کا حال درج ہے۔ "ہت اپدیش" "اور پنچ تنتر" (مصنفہ بھرتری ہری) میں سمندر کے پار جانے کے لئے جہاز کی ضرورت بتائی گئی ہے کلہن کی "راج ترنگنی" (منظوم تاریخ کشمیر) میں ایک شاہی سفیر کی مشکلات کا بیان ہے جو اسے سمندر میں پیش آئیں ◆

سنسکرت کی اور کتابوں مثلاً ورآہ مہر۔ گروڑ پوران۔ بھوج وغیرہ میں موتی نکالنے کا ذکر ہے۔ اس مقصد کے لئے انہیں خلیج فارس تک جانے میں عار نہیں تھی۔ لنکا کے نزدیک لوکیکا۔ سوراشٹر۔ تامرپرنی وغیرہ موتی نکالنے کے مرکز تھے۔ اگستیہ کے قول کے مطابق لنکا۔ عرب اور فارس کے قریبی سمندروں کے موتی خاص طور پر پسند کئے جاتے تھے۔ لنکا کے قریب کی خلیج منار کو سلابھم (نفع کا سمندر) بھی اسی وجہ سے کہتے تھے ◆

اگر جگہ اجازت دیتی۔ تو میں باقی کتب (مذہبی اور غیر مذہبی) کے حوالوں سے بھی عنوان محولہ فوق ثابت کرتا۔ لیکن ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے

(۴)

گزشتہ صفحات میں ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اس کے ثبوت میں ایک اور شہادت ہندوستان کی پرانی عمارات۔ تصاویر اور سکوں سے جمع کی جا سکتی ہے۔ اس باب میں محکمہ آثار قدیمہ کی مساعی کا جسقدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ کہ انہوں نے ہندوستان کی گمشدہ عظمت کو ایک بار پھر منصۂ شہود پر لانے میں اسقدر کام کیا ہے ◆

سانچی کے استوپ موریا عہد کی یادگار ہیں۔ ان کا زمانۂ تعمیر دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح کے درمیان ہے۔ استوپ نمبر ۱ کے مشرقی پھاٹک پر ایک کشتی کی تصویر ہے۔ یہ دریا کو عبور کر رہی ہے۔ اسمیں تین آدمی فقیرانہ لباس پہنے بیٹھے ہیں۔ دو اور چپو لئے ہوئے ہیں۔ درمیان کی شکل کا منہ کنارے کی طرف ہے۔ جہاں چار آدمی ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں کننگھم کا یہ خیال کہ یہ تصویر مہاتما بدھ اور اس کے دو پیروؤں کے کسی جہازی سفر کی یادگار ہے غلط ہے۔ کیونکہ دوسری صدی قبل مسیح میں مہاتما بدھ کی تصاویر بنانیکا رواج ہی نہ تھا۔ اسی استوپ کے مغربی پھاٹک پر ایک اور چھوٹے سے جہاز کی تصویر ہے۔ جس کا ایک سرا مچھلی کی دم کی شکل کا ہے۔ اور دوسرا شیر ببر کے سر کا جس کے کندھوں پر پر لگے ہیں۔ درمیان میں ایک سائبان ہے جس کے نیچے ایک تخت ہے۔ دو آدمی چھتر اور چوری لئے کھڑے ہیں بلا شبہ یہ کسی شاہی جہاز کی تصویر ہے۔ جیسی آجکل بھی کئی ہندوستانی راجہ اور نواب استعمال کرتے ہیں۔ سرے بالکل ان جانوروں کی شکل کے

ہیں۔جن کا ذکر "کیتی کلپ، ترو" میں ہے۔کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں۔کہ کتاب اس سے پہلے کی تصنیف ہے ؟

سانچی کے بعد بمبئی کے قریب جزیرہ سالسٹ کی غاریں ہیں۔انکے کتبے دوسری صدی عیسوی کے ہیں۔جن میں ست کارنی خاندان کے بادشاہوں وششٹ پتر (۹۲ - ۱۳۳ء) اور گوتمی پتر شانی (۹۲ - ۱۰۶ء) کا ذکر ہے۔یہاں ایک تصویر ہے جس میں ایک تباہ شدہ جہاز دکھایا گیا ہے۔ دو ڈوبتے ہوئے آدمی اپنی جان کے لئے دعا کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جگن ناتھ پوری (اڑلیسہ) کے مندر میں ایک شاہی جہاز کی تصویر ہے۔ ملاح بڑی سرگرمی سے چپو چلا رہے ہیں۔ درمیان میں سائبان کے نیچے غالباً راجہ بیٹھا ہے نشست غالباً گدے دار ہے۔ جو حرکت کی وجہ سے اوپر نیچے ہوتی ہے۔ اور بیٹھنے والے کے گرنے کا امکان ہے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر چھت سے کوئی چیز لٹکائی ہوئی ہے۔جسے اس آدمی نے پکڑ رکھا ہے۔تمام تصویر نہایت بے نظیر اور خوبصورت ہے +

اجنٹا کی غاروں میں بعض بعض جگہ پر جہازوں اور کشتیوں کی نہایت نفیس تصویریں ہیں۔میں یہاں ان غاروں کی خوبصورتی اور فنی کمال کا کوئی ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ میرے موضوع سے باہر ہے۔ ان کا زمانہ تعمیر دوسری صدی قبل مسیح سے لیکر ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک ہے۔ سب سے پہلی غاریں ستکارنی خاندان کے اولین فرمانرواؤں کے عہد کی یادگار ہیں۔جو پہلی اور دوسری صدی قبل مسیح میں حکمران تھے۔ اور سب سے بعد کا زمانہ ۵۰۰ - ۶۲۵ء ہے۔کیونکہ چینی سیاح ہیون سانگ کے وقت میں جو ہندوستان میں ۶۴۲ء تک سفر کرتا رہا۔ان کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔اس نے اپنے سفرنامہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ (ترجمہ بیل جلد دوم صفحہ ۲۵)

یہی زمانہ تھا جب ہندوستان کی بحری قوت اپنے انتہائی کمال کو جا پہنچی اور ہندوؤں نے جزائر شرق الہند میں جا کر بستیاں قایم کرلیں۔اور وہاں حکومت کرنے لگے۔ان تصویروں میں جہازوں پر اونچے اونچے مستول اور چوڑے چوڑے بادبان ہیں۔ایک تصویر میں بادبان کھلے ہیں۔ہوا موافق ہے۔جہاز تیزی سے چل رہا ہے۔ چپو اپنی جگہ پر بے کار پڑے ہیں۔ اور ملاح اور مسافر آرام کر رہے ہیں۔دوسری میں ایک راجہ تفریح کی خاطر سمندر میں جا رہا ہے۔تیسری میں راجہ وجے کا لنکا میں داخلہ دکھایا گیا ہے۔ اس مہم کے حالات پالی کتب مثلاً "مہاونس" "راج ولیہ" وغیرہ میں مفصل دیئے ہوئے ہیں۔غرضیکہ ان غاروں میں جہازوں کی متعدد تصویریں ہیں۔ بعض جگہ جہاز کھڑا ہے۔اور بعض جگہ چل رہا ہے۔ اور بعض جگہ کھڑا ہونے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔بادبان سمٹے جا رہے ہیں۔ لنگر گرایا جا رہا ہے اور لوگ اترنے کی فکر کر رہے ہیں +

مدورا کے بڑے مندر کے تالاب کی غلام گردش میں بھی سمندر اور جہاز وغیرہ کی تصویریں پائی جاتی ہیں +

غالباً یہ بتانا بے محل نہ ہوگا۔کہ ان تمام تصویروں میں پانی کی خاصیت کیسے ظاہر کی گئی ہے۔تازہ اور بحیرہ کا پانی ہمیشہ مچھلیوں۔کنول کے پھولوں اور اس طرح کی دوسری سبز آبی پیداوار کے ذریعہ دکھایا گیا ہے جہاں کہیں بھی سمندر دکھانا منظور ہوتا ہے۔مگرمچھ اپنے خوفناک جبڑے کھولے ہوئے نظر آتا ہے۔ یا سمندری پرندے اڑتے ہوئے پائے جاتے ہیں +

ان تصویروں کے علاوہ مشرقی گھاٹ پر اندھرا خاندان کے کچھ سکے ملے ہیں۔جو یگیہ سری (۱۸۴-۲۱۳ء) کے عہد کے ہیں۔ ان سکوں میں سے بعض پر جہازوں کی تصویریں ہیں۔" جو اس امر کا ثبوت ہیں۔ کہ یگیہ سری کی حکومت خشکی تک ہی محدود نہ تھی" (ہندوستان کی قدیم تاریخ سمتھ صفحہ ۲۰۲) اور کہ" کارومنڈل کے ساحل پر پہلے دوسری صدی عیسوی میں بحری تجارت ہوتی تھی" سیول صاحب لکھتے ہیں "اندھرا خاندان کے عہد میں مغربی ایشیا۔یونان۔روما اور مصر کے علاوہ مشرق اور چین کے ساتھ بھی بری اور بحری دونوں راستوں سے تجارت ہوتی تھی" (امپیریل گیزیٹر۔جلد ہفتم صفحہ ۳۲۵)

ایسے ہی سکے پلوا خاندان کے عہد کے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن پر دو مستولوں والے جہازوں کی تصویریں ہیں +

(۵)

لیکن یہ سب تو اپنوں کی شہادتیں ہیں۔ ممکن ہے۔کوئی انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھے۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب میں بیگانوں نے بھی وہی لکھا ہے۔جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں +

جب ہم ہندوستان کا حدود اربعہ دیکھتے ہیں۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے قدرت نے اسے باقی دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے لئے بنایا ہے۔شمال کی طرف پہاڑوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔جو دنیا میں سب سے

زیادہ بلند ہے۔ جنوب میں سمندر ہے۔ اندرون ملک میں ہر طرح کا اناج پیدا ہوتا ہے۔ پہاڑوں میں ہر قسم کے معدنیات موجود ہیں۔ باشندے کفایت شعار اور محنتی ہیں۔ غرضیکہ انہیں ضروریات زندگی میں سے سب اشیا مہیا ہیں۔ اور باہر والوں کا محتاج ہونے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہم یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ کہ باوجود اس ظاہری "خلوت" کے جتنی "جلوت" ہندوستان کی سرزمین نے دیکھی۔ دنیا کے کسی اور ملک کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ تو مشکل ہے اور غیر ضروری بھی۔ کہ میں بدو آفرینش سے آجتک کے حملہ آوروں کے کارنامے گنانے لگوں۔ لیکن اس سے ایک بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ شروع سے ہی ہندوستان کے بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان باہر سے آنے والوں میں سے بعض نے ہندوستان کی نسبت کتابیں بھی لکھیں۔ اور ان میں سے چند کتب ہمیں آج بھی مل سکتی ہیں۔ جو تلف ہوگئیں۔ ان کا اندازہ مشکل ہے۔ خدا معلوم وہ کیں یا دہ سو ×

لیکن کتابوں کے علاوہ اور ذریعوں سے ہندوستان کے دوسرے ممالک کے ساتھ بحری تعلقات کا ہونا ثابت ہوتا ہے ×

شام میں شہر "آمد" کی کھدائی ہو رہی ہے۔ یہ کام گذشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ دیگر اشیا کے ساتھ وہاں سے ہندوستانی ساگوان کی لکڑی بھی ملی ہے۔ شامیات کے ماہر ڈاکٹر سیتس کی رائے میں یہ لکڑی صرف سمندر کے راستے وہاں پہنچ سکتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ساگوان صرف مالابار ساحل پر پایا جاتا ہے۔ اور ان قدیم ایام میں اسے وہاں سے شام تک خشکی کے راستے سے لے جانا بہت زیادہ خرچ اور اس کے مقابلہ میں بہت کم نفع والا ہوگا۔ ان کے خیال میں یہ تجارت حضرت مسیح سے کئی ہزار برس پہلے ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ فرماتے ہیں کہ بابل کے کپڑوں کی ایک پرانی فہرست میں ململ کے لئے لفظ "سندھو" استعمال ہوا ہے۔ وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ "بابل اور کسی ایسی جگہ کے درمیان تجارت تھی۔ جہاں آریون زبان بولی جاتی تھی۔ اور جہاں سے موجودہ دریائے سندھ گزرتا تھا"۔ اور ہیوٹ صاحب لکھتے ہیں۔ کہ اگر یہ تجارت بڑی راستہ سے ہوتی۔ تو ژند کے قاعدہ کے مطابق 'س' کو 'ہ' سے بدل کر سندھو کی بجائے 'ہندو' لکھا جاتا (جرنل رائیل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۸۸ء) صفحہ ۳۲۵) بخت نصر کے محل سے بھی

ہندوستانی دیودار کی لکڑی دستیاب ہوئی ہے۔ اُور کے چاند دیوتا کے مندر کی دوسری منزل کے شہتیر ہندوستانی لکڑی کے ہیں۔ یہ مندر بخت نصر نے مرمت کرایا تھا۔ اور اس کا زمانہ حکومت ۵۶۲ – ۶۰۴ ق م ہے۔ یونان کے دارالخلافہ ایتھنز میں ہندوستانی چاول۔ مور اور صندل کی لکڑی کا وجود ۴۳۰ ق م میں ثابت ہے۔ ان کے نام بھی ہندوستانی تھے۔ اور یہ یہاں سے ہی لے جائی جاسکتی تھیں۔ کیونکہ یہ نہ ایران میں پیدا ہوتی ہیں۔ نہ یونان میں اور چونکہ یہ ہم جانتے ہیں کہ بابل اور ہندوستان کے تعلقات ۵۸۰ ق م کے قریب منقطع ہوگئے۔ اس لئے ضرور ہے کہ یہ اشیا ایران سے یونان میں چھٹی صدی قبل مسیح میں پہنچی ہوں۔ ورنہ ۴۳۰ ق م میں انکا وہاں اس عمومیت سے استعمال ممکن نہیں ہو سکتا ×

ہم دوسری شہادتوں سے جانتے ہیں۔ کہ اسی زمانہ میں ہندوستانی لوگ عرب اور مشرقی افریقہ اور چین میں آباد ہوئے۔ کوئی تعجب نہیں کہ انہوں نے بابل میں بھی ڈیرا جمالیا ہو۔ (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۸ء)

سید سلیمان ندوی صاحب نے ہندوستانی اکیڈیمی کے سامنے "عرب و ہند کے تعلقات" پر تقریریں کی تھیں۔ جو اب کتابی صورت میں شایع کردی گئی ہیں۔ اس میں انہوں نے عربی ماخذوں سے استفادہ کرکے ہندوستان کے عرب کے ساتھ تجارتی۔ علمی اور مذہبی تعلقات کا حال بیان کیا ہے۔ کیا بلحاظ اہمیت مضمون اور کیا بلحاظ محنت کے جو اسکی ترتیب میں صرف کی گئی ہے۔ کتاب بے نظیر ہے اور بے اختیار مولف کی کاوش اور خلوص نیت کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس کتاب (صفحہ ۶۲) میں انہوں نے عربی میں جہازرانی کے بعض ہندی الفاظ کا پتہ لگایا ہے۔ صفحہ ۸۱ پر "کیا اہل ہند بھی جہازراں تھے؟" کے عنوان کے ماتحت یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ واقعی ہندو جہازرانی سے واقف تھے۔ انہوں نے تجارتی تعلقات (۴۴-۹۶) میں بالتفصیل تجارتی اشیاء کا ذکر کیا ہے ×

اور تو اور ہم خود انجیل (۲۰: ۲۵) میں ہندوستانی تجارت کی طرف اشارہ پاتے ہیں ×

کتاب پادشاہاں میں حضرت سلیمان کے حال میں ایسی چیزوں کا ذکر ہے۔ جو ہندوستان سے لائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عبرانی انجیل میں دراوڑی زبان کے کئی لفظ موجود ہیں (دراوڑی زبان کی صرف و نحو مصنفہ کالڈول۔ صفحہ ۹۱،۱۲۲)

غرضیکہ اس سے مغربی ایشیا اور فلسطین وغیرہ سے ہندوستانی تجارت ثابت ہوتی ہے ٭

یونانی مورخوں میں ہیرودوطس (۴۵۰ ق م) کیخسرو کی فوج میں ایک ہندوستانی پلٹن کا ہونا بیان کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ وہ تیر کمان سے مسلح ہیں۔ اور ان کے تیروں کے پھل لوہے کے بنے ہیں۔ (پانچویں صدی ق م میں ہندوستانیوں کا اس حد تک لوہے کے استعمال سے واقف ہونا بجائے خود ایک کارنامہ ہے) وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ دارا کی سلطنت کا ایک صوبہ ہندوستان میں واقع تھا۔ آگے چل کر لکھتا ہے۔ کہ ہندوستان کے درختوں پر ایک قسم کی "اون" لگتی ہے۔ جو بلحاظ خوبصورتی و نفاست کے بھیڑوں کی اون سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہاں کے لوگ اس سے کپڑے تیار کرتے ہیں۔ وہ یہاں کی معدنی پیداوار کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اور دارا کی سلطنت کے خراج کے بیان میں لکھتا ہے۔ کہ تمام سلطنت میں صرف ایک ہندوستانی صوبہ ہی ایسا ہے جو خراج سونے میں ادا کرتا ہے ٭

جب اسکندر اعظم چوتھی صدی قبل مسیح کے اواخر میں یہاں آیا۔ تو اس نے دریائے سندھ کو کشتیوں کے ذریعہ عبور کیا۔ یہ کشتیاں اسے یہاں کے لوگوں نے مہیا کی تھیں۔ دریائے جہلم بھی ایسے ہی پار کیا گیا۔ واپسی پر جب اس نے سمندر کے راستہ جانے کا ارادہ کیا تو اسے اور بھی زیادہ کشتیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وجہ سے اس نے یہاں کی تمام کشتیاں ضبط کر لیں۔ جن کی تعداد بطلیموس کے مطابق دو ہزار تھی۔ جن میں آٹھ ہزار سپاہ۔ کئی ہزار گھوڑے۔ اور بے اندازہ مال غنیمت لادا گیا۔ یہ تمام بیڑا یہاں کے لوگوں نے تیار کیا۔ فوج کا ایک حصہ خشکی کے راستہ سے بعد از خرابی بسیار بابل پہنچا۔ اور یہ بیڑا بھی قریباً اسی کے ساتھ ساتھ خلیج فارس کے راستہ سے وہاں پہنچ گیا ٭

یونانی مورخوں نے کئی جگہ ہندوستانی جہازوں کا ذکر کیا ہے میگاستھنز جو چندرگپت موریا کے دربار میں سیلوکس نکاطور کی طرف سے سفیر تھا۔ لکھتا ہے۔ کہ جہاز بنانے والے حکومت کے ملازم ہیں۔ اور انہیں دوسرے لوگوں کے لئے کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن سٹریبو (۱۵: ۴۶) لکھتا ہے کہ تاجروں اور مسافروں کو کرایہ پر جہاز دیئے جاتے تھے ٭

چندرگپت موریا (از ۳۲۲ تا ۲۹۲ ق م) کا وزیر کوٹیلا اپنی مشہور کتاب ارتھ شاستر میں حکومت کے محکموں کا ذکر کرتا ہوا بحری محکمہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اور اس کے متعلق تفصیل سے جملہ قوانین بتاتا ہے۔ کتاب کا انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو (۲: ۲۸)

اطالوی مورخ پلائنی (۶: ۲۲) پہلی صدی عیسوی میں سیلون کے جہازوں اور جہازرانوں اور وہاں کے اردگرد کے سمندر کا ذکر کرتا ہوا شکایت کرتا ہے کہ "ہندوستانی تجارت ہر سال ہمارا اسقدر سونا کھینچ رہی ہے" (جنوبی ہند سے اس عہد کے اطالوی سنہری سکے بیشمار تعداد میں ملے ہیں) ہندوستان سے گرم مصالحہ وعطریات۔ جواہرات اور موتی۔ ریشمی و سوتی کپڑا۔ اور روئی وغیرہ برآمد کئے جاتے تھے ٭

"خوش قسمتی سے تامل خطہ ان میں سے تین چیزوں کی پیداوار کے لئے ذمہ دار تھا۔ یعنی سرخ مرچ اور موتی اور فیروزہ۔ سرخ مرچ ان دنوں یورپ کی منڈیوں میں حیرت انگیز طور پر مہنگے داموں فروخت ہوتی تھی۔ جنوبی سمندر کے موتی نکالنے کی جگہیں قرنوں سے کام کر رہی ہیں۔ اور لوگ دور دور سے یہاں قسمت آزمائی کو آتے تھے۔ کوئمبٹور ضلع میں پدیار کی کانیں ہی ازمنۂ قدیم میں عمدہ فیروزہ حاصل کرنے کا ذریعہ تھیں۔ اور ہندوستانی اور رومن بہت کم کسی اور جواہر کو فیروزہ پر ترجیح دیتے تھے تامل ریاستیں ایک طاقتور جہازی بیڑے کی مالک تھیں۔ اور مشرق و مغرب سے جہاز ان کے ہاں آتے تھے۔ یورپی تاجر بڑے شوق سے یہاں کی یہ چیزیں خریدتے تھے۔ اور ان کے عوض میں سونا چاندی اور یورپی مصنوعات پیش کرتے تھے" (ہندوستان کی قدیم تاریخ مصنفہ سمتھ۔ صفحہ ۴)

متعدد اور حوالے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر طوالت کا خیال کر کے صرف ایک اور اقتباس دے کر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ چینی سیاح فاہین ۳۹۹ء سے ۴۱۴ء تک ہندوستان میں سیر کرتا رہا۔ واپسی پر تری کے راستہ سے چین گیا۔ اس نے بنگال سے سیلون۔ سیلون سے جاوا اور وہاں سے چین تک تمام سفر جہازوں پر طے کیا۔ اس سفر کے دوران میں اسے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ لکھتا ہے۔ جاوا میں پانچ ماہ کے قیام کے بعد میں نے ایک تجارتی جہاز میں چین کا راستہ لیا۔ ایک ماہ کے بعد ایک رات سخت طوفان آگیا۔ تمام مسافر اور تاجر پریشان ہو گئے۔ میں بھی دعائیں مانگنے لگا۔ دن نکلنے پر برہمن جو جہاز پر سوار تھے۔ جمع ہوئے اور کہنے لگے۔ اس سرمن (فاہین) کی تختۂ جہاز پر موجودگی ہماری بدقسمتی اور مصیبت کا موجب ہوئی ہے۔ آؤ اسے کسی جزیرے پر ڈال دیں اور خود

چلتے بنیں - ہمیں ایک آدمی کے لئے اتنوں کی جان خطرے میں نہیں ڈالنی چاہئے۔" لیکن ان میں سے ایک فاہین کا دوست تھا - وہ کہنے لگا - اگر تم اسے چھوڑنا چاہتے ہو - تو مجھے بھی اس کے ساتھ ہی اتارنا پڑیگا - ورنہ منزلِ مقصود (چین) پہنچنے پر میں شہنشاہ سے تم سب کی شکایت کرونگا۔" اس پر وہ لوگ حیران ہوگئے - اور انہیں فاہین کو جہاز سے اتارنے کی جرأت نہ ہوئی (ترجمۂ لگ ۱۸۸۶ء صفحہ ۱۱۱-۱۱۳)

(۶)

سطور مندرجہ بالا سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں - کہ ہندؤں پر

یہ الزام کہ وہ جہاز رانی سے ناواقف تھے - یا انہوں نے کبھی ہندوستان سے باہر قدم نہیں نکالا - کہاں تک درست ہے - ہم نے ہندوستان کی مذہبی و غیر مذہبی کتب (اور ان میں سے بعض دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں) اثری دریافتوں - غیر ملکوں میں دستیاب شدہ اشیاء اور وہاں کے سیاحوں اور مصنفوں کی کتب سے یہ ثابت کیا ہے - کہ ہندوستان ازمنۂ قدیم سے بیرونی ممالک سے سیاسی اور تجارتی تعلقات رکھتا آیا ہے +

مالک رام - ایم اے (خاص)

نیرنگ خیال بک ڈپو میں نئی کتابیں

ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آہستہ آہستہ نیرنگ خیال بک ڈپو کو اسقدر مکمل کرلیں کہ ہندوستان کے تمام مصنفین کی کتابیں ہماری معرفت ناظرین نیرنگ خیال کو دستیاب ہوسکیں - کیونکہ کتابیں خریدنے اور پڑھنے سے بہتر نہ کوئی شغل ہے - نہ صرف - ہمارے دفتر میں حال میں مندرجہ ذیل کتب پہنچی ہیں ناظرین طلب فرما کر دفتر کی امداد فرمائیں؛

۱ - **تاریخ اسلام** (پانچ حصوں میں) از جناب مولوی ابوالمحمود محمد حامد خاں صاحب مکمل سیٹ حجم ۶½ سو صفحہ - قیمت صہ

۲ - **تقاریر مولانا محمد علی** - مولانا محمد علی کی مشہور تقریروں کا مجموعہ ہر گھر میں موجود رہنا چاہئے - قیمت ۸ر

۳ - **مشاطۂ سخن یہ مرقع ادب** حصہ اول و دوم ... ۵ صفحے - قیمت ۸ر - بزم خیال ۱۶۰ صفحہ - قیمت ۸ر یہ تینوں کتابیں حضرت صفدر مرزاپوری کی ہیں +

۴ - **انشائے نسواں** - عورتوں کے لئے خط و کتابت کا ڈھنگ سکھانے کے لئے - قیمت ۸ر

۵ - **مقدمہ شرح دیوان غالب** - حضرت نیاز فتحپوری مدیر نگار کے قلم سے ۴۰۰ صفحہ - قیمت عہ

۶ - **علمی کہانیاں** - حجم ۶۰ صفحہ - ابتدائی تعلیم کی رام کہانی از منشی رام پرشاد حجم ۸۰ صفحہ قیمت ۸ر - یہ دونوں کتابیں محکمۂ تعلیم میں منظور شدہ ہیں - طالب علموں اور لائبریریوں کو لئے بیحد ضروری

۷ - **نگارستان** حجم صفحہ ۳۰۰ ع - گہوارۂ تمدن عاصفحہ ۲۴۸ - شہاب کی سرگذشت صفحہ ۱۹۲ عہ یہ تینوں کتابیں مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار کے قلم سے ہیں اور بیحد مقبول ہیں،

۸ - **صحابیات** - از مولانا نیاز فتحپوری - حجم صفحہ ۴۰۸ - قیمت سے،

مولانا نیاز فتحپوری کی دیگر کتابیں

گہوارۂ تمدن - اردو زبان اپنے موضوع کی پہلی قابل قدر کتاب جسمیں دکھایا گیا ہے کہ دنیا کی تہذیب اور شائستگی عورت کی کس درجہ ممنون احسان ہے - اور زندگی کے ہر ہر شعبہ میں عورت نے کیا کیا اصلاح کی ہے - یہ کتاب کتب خانوں کے لئے سرکاری طور پر منظور ہے - بڑی کاوش سے لکھی گئی ہے قیمت عہ

نگارستان - مولانا نیاز فتحپوری کے ادبی شاہکاروں کا مجموعہ جن میں دلاویز مضامین بھی ہیں اور پرلطف افسانے بھی - اس کتاب نے بقول پبلشر ادب لطیف اور انشاء لائقہ کی دنیا میں ہلچل ڈالدی ہے - بچیوں کے مطلب کی نہیں ہے - بڑی عمر کی عورتیں اور مرد منگائیں دوسری مرتبہ نہایت آب و تاب سے شایع ہوئی ہے - قیمت صرف ع

شہاب کی سرگذشت - اس افسانہ میں چند ایسی خصوصیات ہیں جو دوسرے افسانوں میں بہت کم ملینگی - ازدواجی زندگی کی حقیقت کیفیات خوشی اور غم پر محیر العقول کارنامہ کہا جاتا ہے - بیحد دلچسپ ہے قیمت صرف عہ - یہ بھی بچیوں کے مطلب کی نہیں +

ناول - اسرار بالشوزم ۸ر - حکایات شرلک ہومز عہ - حاجی بغلول ۱۲ر - دلکش کامل صفحہ ۳۰۰ ع - دلگداز فسانے صفحہ ۲۰۰ عہ - **انقلاب فرانس** صفحہ ۲۰۰ عہ - ملک العزیز ورجنا صفحہ ۲۰۰ عہ - بہرام کی رہائی قیمت ۸ر +

ملنے کا پتہ :- **منیجر رسالہ نیرنگ خیال بک ڈپو شاہی محلہ لاہور**

"میری شادی"

(ایک نا کتخدا کے قلم سے)

از جناب شرف الدین احمد صاحب بی اے علیگ عظیم آبادی

میں ابھی نام خدا کوئی تئیس چوبیس سال کا ایک نوجوان طالب علم ہوں اور اگر حسن کا معیار ہر شخص کے نقطۂ نظر پہ منحصر ہے تو میں اپنے نقطۂ نظر سے حسین بھی ہوں۔ یوں تو ایک لڑکا جس وقت اسکول کے ابتدائی درجوں سے نکل کر انٹرنس میں قدم رکھتا ہے۔ اُسیوقت سے لوگ اُسے تعلیم یافتہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ تعلیم یافتہ ہو جانے کے بعد عام طور پر یہ لڑکے پھر فوراً شوہر بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اُسی وقت سے ساری قوم کو اُس لڑکے کے رشتہ کی فکر ہو جاتی ہے۔ اور آئے دن نئے نئے پیغام آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ اللہ کا اتنا فضل ضرور رہا کہ لوگوں نے مجھے دو سال تک اور پڑھنے کا موقعہ دیدیا۔ لیکن "انٹرمیڈیٹ" پاس کر کے جب میں بی اے کے لئے علی گڑھ چلا گیا۔ تو قوم نے اپنے فرض کو یکایک محسوس کیا۔ اور پھر کچھ نہ پوچھئے کہ میں سارے شہر میں کتنا لائق، سنجیدہ، شریف اور تعلیم یافتہ "لڑکا" مشہور ہو گیا " لڑکا علی گڑھ میں پڑھ رہا ہے"۔ یہ بہت ہی مخدوش فقرہ ہے۔ کیونکہ صاحبزادے وہاں کیا کرتے ہیں اس کا اندازہ سال میں ایک مرتبہ امتحان کے نتیجہ کے موقعہ پر کچھ یونہی سا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر جس طرح لڑکا پڑھ رہا تھا۔ پڑھتا رہتا ہے۔ چونکہ میں بھی ایک ایسا "لڑکا" تھا جو علی گڑھ میں پڑھ رہا تھا۔ اس لئے ہفتہ میں کم سے کم میری تین نسبتیں ضرور آ جاتی تھیں۔ پہلے تو لوگ میرے بزرگوں ہی سے کہہ کر رہ جاتے تھے۔ لیکن بعد کو... خود مجھ سے بالمشافہ باتیں ہونے لگیں۔ اور چونکہ میں شادی کے ذکر کو اب تک ایک شرمناک فعل سمجھتا رہا تھا۔ اس لئے جب لوگ مجھ سے اس قسم کی باتیں کہتے تھے تو میں کبھی تو شرما کر خوش ہو جاتا تھا۔ اور کبھی ذرا نظریں نیچی کر کے ایک خاص انداز سے کہدیتا تھا کہ صاحب، خدا کے فضل سے میرے ہاں گھر میں اماں اور باہر میں بھائی جان موجود ہیں۔ آپ لوگ اُن سے کیوں نہیں کہتے؟ یہ لوگ میرے بزرگ ہیں ان کو اختیار ہے جو چاہیں فیصلہ کریں۔ میں ہر طرح تیار ہوں۔ میرے اس جواب سے لوگوں کے دلوں پہ میری سعادت کا اور بھی سکہ جمتا جاتا تھا.... میں نے حساب لگایا تو فی ہفتہ ایک نسبت کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک تو یہی حال رہا کہ جب میں چھٹیوں میں گھر آتا تو لوگ میرے سامنے مختلف نسبتیں پیش کرتے اور میں شرماشرما کر ان کو جواب دیتا۔ لیکن علی گڑھ کی مختلف سوسائٹیوں میں رہنے کے بعد مجھ پہ ایک عجیب حقیقت کا انکشاف ہوا۔ یعنی یہ کہ شادی ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ اور اس کے متعلق انسان کی ایک خاص رائے ہونی چاہئے۔ چونکہ کسی مسئلہ کے متعلق بھی میری کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی۔ اس لئے اس حقیقت کے ظاہر ہوتے ہی میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے مسئلہ شادی کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے لگا۔ تاکہ ان کوششوں میں خود اپنی ایک رائے قایم کر سکوں۔ کامل ایک سال کی بہم ملاقاتوں کے بعد میں آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اپنی رفیق زندگی کے انتخاب میں سب سے پہلی شرط تعلیم ہونی چاہئے۔ اور جبتک اپنی نامزد کے خیالات اور مذاق طبیعت سے پوری واقفیت نہ ہو لے رشتہ کرنا مناسب نہیں۔ میرے دوستوں نے مجھ سے یہ بھی کہدیا تھا کہ بہتر ہے تم براہ راست خود اس لڑکی ہی سے خط و کتابت کرو اور اس طرح اپنے خیالات کو اُس پر ظاہر کر کے اُس کے خیالات سے واقفیت حاصل کرو۔ میں نے ان لوگوں کی اس متفقہ رائے کو بہت پسند کیا۔ کیونکہ میں ٹھہرا مضمون نگار آدمی۔ اس طرح مجھے اس میں اپنی قابلیت کا رنگ جمانے کا اچھا موقع ملتا۔ چونکہ بی۔ اے میں میں نے فلسفہ لے رکھا تھا۔ اس لئے اپنی طبیعت کو حسن پرستی کا عادی بنا رہا تھا اس خیال سے میں نے رفیق زندگی کے لئے حسین ہونا بھی ضروری قرار دیا۔ لیکن اپنے نقطۂ نظر سے۔ اب جب کبھی کوئی مجھ سے کسی نسبت کا ذکر کرتا۔ تو میں فوراً اُس کے سامنے اپنی شرائط نمبروار پیش کرنی شروع کر دیتا تھا۔ بہت

دنوں تک لوگ میری ان شرائط کا مضحکہ اُڑاتے رہے۔ کوئی کہتا ان کی شادی جنت میں حوروں سے ہوگی۔ کوئی کہتا انہیں بی بی سے ملازمت کرانی ہے۔ جب ہی تو انہیں تعلیم یافتہ بی بی کی تلاش ہے۔ لیکن میں تھا اپنے اصول کا پکا۔ ان سبھوں کے طعن و تشنیع کو سنتا اور ٹال جاتا۔ آخر "دیر آید درست آید" کا مقولہ صحیح نکلا۔ اور ایک ایسی جگہ سے میری نسبت آئی جہاں لوگوں نے میری تمام شرائط کو بخوشی منظور کر لیا۔ اور بغیر میری فرمائش کے میرے پاس ایک بند لفافہ بھیجدیا جس پہ لکھا ہوا تھا "اسے صرف آپ دیکھ سکتے ہیں" میں نے سمجھا کوئی خط ہوگا۔ لیکن کھولا تو اندر سے ایک تصویر نکلی۔ جس کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"مس شاکرہ۔ عمر سترہ سال۔ انٹرنس کے امتحان کی تیاری کر رہی ہیں"

چونکہ مجھے خط و کتابت کی پوری آزادی تھی۔ اس لئے میں نے اسی وقت سے اس تصویر کے تیور اور ایک ایک خد و خال کو ایک قابل مصوّر کی طرح دیکھنا شروع کیا۔ کیونکہ میں خط لکھنے سے پہلے اُس تصویر کو دیکھ کر مس شاکرہ کی "سائیکالوجی" دریافت کرنا چاہتا تھا۔ آخر تمام دن کے غور و خوض کے بعد میں نے شب کے وقت اپنی نامزد کے نام اس مضمون کا ایک خط لکھا۔

محترمہ مس شاکرہ صاحبہ۔ تسلیم!

میں اس وقت کیوں، اور کس حیثیت سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ اس کے اعادہ کی شدید ضرورت نہیں۔ خدا بھلا کرے ہماری سوسائٹی کا جس نے ہمیں آج اس قابل بنا دیا کہ ہم لوگ ایک دوسرے سے اس آزادی کے ساتھ خط و کتابت کر رہے ہیں۔ میں اس وقت زیادہ لکھ کر آپ کی سمع خراشی کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا آپ کو بھی مضمون نگاری سے کوئی دلچسپی ہے یا نہیں۔ کیونکہ خود میرے لئے تو یہ بہترین مشغلہ ہے۔ اور اس میں خدا کے فضل سے میں اب روز افزوں ترقی بھی کر رہا ہوں۔ آپ کے ہاں سے جواب آنے پر پھر انشاء اللہ میں دوسرے ضروری مسائل پر بھی تبادلہ خیالات کی جرأت کروں گا۔

ناچیز شرف

میں نے دوسرے روز یہ خط صبح سویرے ہی روانہ کر دیا۔ لیکن لفافہ کے اندر اپنی چھوٹی سی تصویر بھی رکھدی۔ اور اُس کے نیچے لکھدیا:۔

"شرف الدین احمد۔ بی۔ اے میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس کے بعد ایم اے کا خیال ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ولایت جانے کے لئے بھی کوشاں ہیں"۔

میرے خط کا جواب تیسرے ہی روز آگیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا جسمیں ایک نہایت عمدہ کاغذ پر بہت ہی خوشخط یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

ڈیر مسٹر شرف۔ تسلیم

آپ کے گرامی نامہ نے عزت بخشی۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ آپ کون ہیں میں جانتی ہوں۔ اور مجھے خط کیوں لکھ رہے ہیں۔ اس کی بھی مجھے خبر ہے۔ سوسائٹی کی ممنون احسان مردوں سے زیادہ عورتیں ہیں۔ ورنہ پہلے ان غریبوں کی سنتا ہی کون تھا؟ میں آپ کو بحیثیت ایک ہونہار مضمون نگار کے بہت دنوں سے جانتی ہوں اور آپ کے دلچسپ مضامین برابر میری دلبستگی کا باعث ہوتے رہے ہیں۔ "اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ!" مجھے خود بھی مضمون نگاری کا شوق تو بہت ہے بلیکن اس فن سے واقف نہیں ہوں۔ کیا آپ اس کام میں میری مدد فرما سکتے ہیں؟ اگر آپ کے گرامی نامے میری سمع خراشی کا باعث ہوسکتے ہیں تو میں کہونگی کہ مہربانی فرما کر آپ برابر میری سمع خراشی فرمایا کیجئے۔

راقمہ شاکرہ

اس خط کے ملتے ہی میں نے دوسرا خط لکھا۔ اور اس کا جواب بھی وہاں سے فوراً آگیا۔ غرض اس دلچسپ خط و کتابت کا سلسلہ پابندی کے ساتھ پورے چھ ماہ تک جاری رہا اور اس ذریعہ سے میں نے فلسفۂ زندگی سے لیکر مرغی کی تجارت تک پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ اور اُنہوں نے بھی اپنی کوئی بات مجھ سے چھپا نہ رکھی۔ جب تمام مسائل آپس میں طے پا گئے تو ہم "لڑکے" اور "لڑکی" نے اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا۔ اور ہم لوگوں کی شہ پاکر ہمارے بزرگوں نے آخر ایک تاریخ بھی مقرر کردی۔ تعیین تاریخ سے تقریب شادی تک کے واقعات بہت زیادہ غیر معمولی نہیں۔ اس لئے کہ جب میں تعلیم یافتہ ہوں اور اپنی آیندہ زندگی میں "ریفارمری" کا خیال ہے۔ تو ظاہر ہے کہ میری شادی کیسی ہوئی ہوگی۔ شادی کے بعد اپنی بی بی سے میری پہلی ملاقات ہندوستان کی آیندہ تاریخ کا یقینی ایک یادگار واقعہ ہے۔

جس وقت میں اپنی بی بی کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ کرسی پر ایک خاتون تشریف فرما ہیں۔ چونکہ اس کمرے میں کسی اور کے ہونے کا گمان نہیں ہوسکتا تھا اس لئے میں نے اندازے سے سمجھا کہ وہی خاتون میری بی بی ہیں۔ اُن کی صورت کو

اُس تصویر سے جو میرے پاس تھی کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اور مجھے بے ساختہ اُس فوٹو گرافر پر جس نے ان کی تصویر لی تھی غصہ آرہا تھا کہ کمبخت نے تصویر اتنی خوبصورت کیوں اتاری جس سے میں ایک ناقابلِ تلافی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بھی مجھے بھیا نک نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ میں دیر تک کھڑا رہا لیکن وہ متوجہ نہ ہوئیں۔ آخر میں نے گھبرا کر پوچھا "کیوں صاحب، کیا آپ نے ابتک مجھے نہیں پہچانا؟ کہنے لگیں "شاید آپ ہی میرے شوہر ہیں"۔ میں نے عرض کیا "جی ہاں اگر آپ واقعی میری بی بی ہیں تو میں بھی آپ کا شوہر ہونے کی عزت رکھتا ہوں"۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ یہ محض فوٹو گرافر کا انتہائے کمال ہے۔ ورنہ ہم لوگ دراصل وہی ہیں جو ایک دوسرے کو سمجھ رہے ہیں۔ لیکن مزید اطمینان کے لئے اپنی اپنی جیب سے تصویر نکالی اور دیکھتے ہی کچھ دیر تک دونوں طرف ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ انتہائے شوق میں آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ جو تصویر اُن کی مجھے دی گئی تھی۔ وہ دراصل اُن کی ایک قبول صورت سہیلی شاہدہ کی تھی اور جو تصویر میں نے خود اُن کو بھیجی تھی وہ میرے ایک حسین دوست اشرف کی تھی۔ اب جو غصہ میں ہم لوگ اپنے اپنے اثاث البیت کی تلاشی لیتے ہیں۔ تو دونوں کے پاس اپنی اپنی تصویر موجود ہے۔ غرض اس طرح مجھے اپنی ایک شرط میں تو سخت ناکامیابی ہوئی۔ اب میں نے اپنی آیندہ زندگی کو خوشگوار بنانے کی دوسری کوششیں شروع کیں۔ میں نے اپنی بی بی سے کہا "حسن محض ناپائدار چیز ہے۔ اس کا چنداں خیال نہیں ہونا چاہئے۔ اب یہ بتاؤ کہ میں جو زنانہ اخبار نکالنے والا ہوں اس کی اڈیٹری کے لئے تم تیار ہو یا نہیں"؟ "وہ" بولیں "خیر اڈیٹری وغیرہ تو بعد کو ہوتی رہیگی، پہلے یہ بتایئے کہ آپ کوئی ملازمت کیوں نہیں کر لیتے"؟ میں نے کہا "ابھی تو میں تعلیم ہی حاصل کر رہا ہوں۔ اس کے بعد خیال ہے کہ کوئی ایسا کام کروں جس سے اپنی قوم کو کچھ فائدہ پہنچے اسی وجہ سے تو میں نے اخبار وغیرہ کے متعلق تم سے گفتگو شروع کی تھی۔ ملازمت کی ابھی ایسی جلدی کیا ہے۔ ہوتی رہیگی"۔ میرے اس جواب سے میری بی بی کی تشفی نہیں ہوئی۔ اور اب اُنہوں نے کچھ تُرش رُو ہو کر کہا "خیر، اگر آپ کو اپنی قوم کی لیڈری ہی کرنی تھی تو ایک غریب لڑکی کو اس طرح ستانے سے آپکو کیا فائدہ ہوا؟ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ حضور کے دل میں قوم کا درد اپنے متعلقین کی محبّت سے زیادہ ہے تو میں کبھی اس سخت جال میں نہیں پھنستی۔ جایئے آپ قوم کی رہبری کیجئے یا دل چاہے دن رات بیٹھے مضمون نگاری میں اپنا وقت برباد کیجئے لیکن مجھے خدا کے لئے اجازت دیجئے کہ جہاں سے آئی ہوں وہیں ابھی فوراً چلی جاؤں"۔ میں نے کہا "خیر، تم کو اختیار ہے لیکن ابھی رات کے وقت تم کو جانے میں تکلیف ہوگی۔ گھر میں سب لوگ سو چکے ہیں۔ میں کسی کو تمہاری مصیبت سے آگاہ بھی نہیں کر سکتا۔ میری رائے ہے کہ تم کسی طرح یہ شب تو یہیں گذار دو۔ کل صبح کوئی انتظام کر دونگا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ میں اشرف یقینی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے بھی تو دیکھو کہ میں کس استقلال کے ساتھ تمہیں ابتک شاہدہ ہی سمجھ رہا ہوں"۔ میرے ان الفاظ نے میری بی بی کے جذبۂ خودداری کو ایک سخت ٹھیس لگائی۔ اور وہ ایک انتقام آمیز تیزی کے ساتھ یہ کہتی ہوئی اُٹھنا چاہتی تھیں کہ "نہیں، اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ لیکن میں نے فوراً ان کو پکڑ کر بٹھایا اور تھوڑی دیر کی منت و سماجت کے بعد آخر یہ بات طے پائی کہ "تم اپنا مُنہ اُدھر کر لو، ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں"۔ میں نے اب ایک فاتحانہ کروٹ لی لیکن خدا جانے کیوں یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں نے اپنے آپ کو لحاف سے لپٹا ہوا اپنی مسہری کے نیچے پڑا ہوا محسوس کیا .... خیر اللہ کا شکر ہے کہ میں ابتک نا کتخدا ہوں +

(خاص) **شرف الدین احمد**

سر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف لپی پیکا سے
بنگالی سے براہ راست ترجمہ

کہانی کا فلسفہ

از جناب ڈاکٹر ایم۔ ضیاءالدین صاحب۔ امرتسری

(۱)

بچے نے جونہی زبان کھولی، بولا "قصہ کہو"

نانی اماں سُنانا شروع کرتی ہیں:۔ "ایک تھا شاہزادہ، ایک نواب زادہ اور ایک تھا سوداگر کا بیٹا" بچے کے اُستاد نے بلند آواز سے ڈانٹا:۔ "تین چوکے بارہ"۔

اُستاد کی چیخ سے کہیں بلند اور زبردست چیخ ہے دیو کی:

"ہاؤں ماؤں کھاؤں ...... آدم بو" ہندسوں کے رٹنے کی الاپ بچے کے کان تک نہیں پہنچتی۔

جو لوگ بچوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ وہ بچوں کو اندھیری کوٹھری میں بند کرکے سنجیدہ طور پر سمجھاتے ہیں ـــــ "دیکھو بچے، "تین چوکے بارہ" سو یہ تو ایک حقیقت ہے، اور "وہ شہزادہ، نواب زادہ سوداگر کا بیٹا" سب جھوٹ ہے۔

لڑکے کا دل اس اثنا میں جغرافیائی تخیل سے آزاد ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی تین چوکے بارہ کی حقیقت بچے کے پیچھے پیچھے سفر کرتی ہے۔ لیکن ہندسوں کی کشتی کے پتوار بچہ کے تخیل کے سمندر کو عبور کرانے سے قاصر ہیں۔

خیر خواہ سمجھے کہ یہ تو صریح شرارت ہے۔ اس بچے کو بید سے خوب پیٹنا چاہیئے۔

نانی اُستاد کے اس رویہ کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی لیکن مشکل کچھ آسان ہوتی ہوئی نظر نہ آئی۔ قصہ خواں[1] صاحب تشریف لے آئے اور آسن جما کر بیٹھ گئے۔ ایک شہزادی کی جلاوطنی کا قصہ شروع ہوا۔

"جس وقت دیو کی ناک کاٹی جا رہی تھی، بچے کے خیر خواہ نے کہا: اس بات کا تو کوئی ثبوت نہیں۔ جس حقیقت کا ثبوت ہر جگہ مل سکتا ہے۔ وہ تین چوکے بارہ ہے۔

اسی اثنا میں ہنومان جی چھلانگتے ہیں اور راستہ ربلند کر تاریخ نہیں اس کا جواب نہیں۔ مدرسے سے اسکول اور اسکول سے کالج تک لڑکے کے دل کو کلِ حکمت کے ذریعہ تربیت کیا جاتا ہے۔ کیمیاوی عمل کشید و تقطیر کے ذریعہ اس کے دل کو کتنا ہی صاف کیوں نہ کیا جائے۔ لیکن یہ بات "قصہ کہو" اس کے دل سے محو نہیں ہوتی۔

معلوم ہوا کہ انسان صرف بچپن ہی میں نہیں بلکہ تمام عمر قصہ کہانیوں ہی میں پلتا ہے۔ اسی لئے اس دنیا میں انسان کے گھر گھر ہر زمانہ میں ہر تحریر میں اسقدر قصے کہانیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ کہ انسان نے اس دنیا میں جو کچھ جمع کیا ہے۔ یہ کہانیاں اُس سے کہیں زیادہ ہیں۔

ہمدرد، اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں لیتے کہ قصہ گوئی اس دنیا کے خالق کا آخری جنون ہے۔ کسی کو سمجھائے بغیر سزا دینا اور اس طرح اُسے راہ پر لانے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔

ایک دن تھا کہ باری تعالیٰ اپنے کارخانے میں بیٹھے آگ سے پانی اور پانی سے مٹی بنانے میں مشغول تھے۔ بھاپ کے بوجھ سے بیقرار دھائیں پتھر اوپر تلے رکھے جاتے تھے۔ چاروں طرف خام مادہ بکھرا ہوا تھا۔ اُس دن خالق کائنات کو دیکھ کر کسی کو شبہ تک نہ ہوا۔ کہ اس فعل میں بھی کچھ بچپن ہے۔ وہ تھا کارخانے کا کام دھندا۔ گھاس پیدا ہوئی۔ درخت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حیوان چلنے پھرنے لگے۔ پرندوں نے اڑنا شروع کیا کوئی تو زمین پر پابزنجیر ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ کوئی آزاد زمین کی وسعت پر اپنی نسل کو ترقی دیتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی فضا میں پر کھولے سورج کے حضور میں اپنے نغمے نذر کر رہا ہے۔ کوئی پانی کی تہ کے نیچے خاموش رقص میں مصروف ہے۔......

غرضکہ اُس دن خالق کائنات کے چنچل بچپنے کا کسی کو شُبہ تک نہ ہوا۔

[1] ہندوؤں کے گھروں میں داستان گو پنڈت مقرر ہوا کرتے تھے جو مذہبی روایات اور قصے سناتے تھے۔

اسی طرح بہت سا زمانہ گزر گیا۔ دفعتاً خالق باری کو ایک نئی بات سوجھی اُس نے پانچ قسم کی ہواؤں کو طلب کیا۔ ان سب کو ملا کر انسان بنایا۔ اتنی مدت بعد یہ قصہ پھر شروع ہوا۔ بہت سے دن اس کے علم و عرفان کی تحصیل میں گئے فنون میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد ادب کا دور آیا۔ خالق نے انسان کو قصے کہانیوں میں پرورش کرنا شروع کیا۔ حیوان کی زندگی کا مقصد تھا کھانا پینا اور نسل کو ترقی دینا۔ انسان کی زندگی کا مقصد قرار پایا قصہ۔ کتنے دُکھ درد بھرے واقعات ہیں! محبت ہے۔ عشق ہے۔ عداوت ہے۔ نفرت ہے۔ بُرا بھلا۔ کتنی مار پیٹ۔ شوق و ذوق ہے۔ محنت کے ساتھ طبیعت کا لگاؤ۔ خوشی کے ساتھ رنج و غم . . . . . . ندیاں جس طرح بہتے پانی کے دھارے ہیں۔ ویسے ہی انسان کی تہذیب کے دور قصے کہانیوں کا بہاؤ ہیں ان کا تصادم ہیں +

اسی لئے جب دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو یہی پوچھتے ہیں:- "کہو بھائی کیا خبر ہے۔ ہاں تو پھر اس کے بعد اچھا؟ پھر کے ساتھ پھر کے موتی پرو پرو کر دنیا میں انسان کے بنائے ہوئے قصوں کی مالا پروئی جا رہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں "آپ بیتی" اسی کو کہتے ہیں "تاریخ" خالق کی تاریخ۔ انسان کی آفرینش کے قصے۔ یہی دونوں انسان کی دنیا کے جزو ہیں! انسان کے لئے صرف راجہ اشوک یا اکبر بادشاہ ہی کا قصہ سچ نہیں وہ شہزادہ جو ہفت قلزم کا سفر کرتا ہے۔ ہفت اقلیم کی دولت کی تلاش میں ہے۔ وہ بھی سچ ہے۔ اور وہ ہنومان جو خالق کی عبادت میں مستغرق ہے۔ اس کی سیدھی سادی کہانی بھی سچ ہے۔ اور وہ ہنومان جو گندھمان پہاڑی کو ایک ہاتھ پر اُٹھا کر ہوا میں اُڑتا ہوا لے آتا ہے۔ وہ بھی درست ہے۔ انسان کے لئے جس طرح اورنگ زیب سچ ہے۔ دریودھن بھی سچ ہے۔ کسی کا تاریخی ثبوت کم ہے کسی کا زیادہ۔ تاریخی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ قصہ کی رو سے۔ انسان کے لئے قصہ کا ثبوت سب سے بڑا ثبوت ہے، خدا کی ادبی دنیا میں انسان کا وجود ایک قصہ ہے۔ اس لئے نہ تو وہ صرف مادہ سے بنایا گیا ہے۔ اور نہ محض حقیقت سے +

بہت سی کوششوں کے بعد بھی خواہ "استاد" میں یہ بات پیدا ہوئی کہ اپنے پند و نصائح کو اُس نے قصوں کی صورت میں کہنا شروع کیا۔ یعنی قصے اور اخلاق کو ملا دیا۔ لیکن اُس ازلی نقص کی بنا پر جو کہ انسان میں موجود ہے یہ کام اچھی طرح نبھ نہ سکا اور قصے کی مٹی پلید ہوئی +

بچے کے لئے کوئی کام نہیں لیکن شوق طرح طرح کے ہیں نصیحت کا اثر اس پر کچھ کم ہے +

پند و نصیحت قصے میں خرافات کی طرح باقی رہ جاتی ہے +

(اخاص)

ڈاکٹر ایم ضیاءالدین

آپ بیتی

از جناب قاضی زین العابدین صاحب سجاد - میرٹھ

آج سے چند روز پہلے - میرے مکان کے سامنے والے مکان میں سب سے اوپر کی منزل پر - ایک دبلا پتلا اُنیس بیس سال کی عمر کا نوجوان لڑکا رہتا تھا - غالباً وہ کالج یا یونیورسٹی کا طالب علم تھا - میری لائبریری کے کمرہ کی کھڑکی اس کے کمرہ کی کھڑکی کے بالکل سامنے کھلتی تھی - اس لئے مجھے اکثر اُسے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا - میں نے جب کبھی اُس کو دیکھا تو لیمپ کے سامنے بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یا اپنی یادداشت کی کاپی میں کچھ لکھتے ہوئے یا اپنے سبق کو دُہراتے ہوئے ہی پایا - مگر میں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی +

چند روز کی بات ہے کہ میں ان جلنے کے جاڑوں میں - پچھلی رات کو ایک کام سے فارغ ہو کر گھر آیا - اور کسی ضرورت سے اپنی لائبریری کے کمرہ میں گیا - میں نے دیکھا کہ سامنے کمرہ میں روشنی ہو رہی ہے - نوجوان اپنے پڑھنے لکھنے کی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے - اور اس کا سر میز کے اوپر پھیلے ہوئے کاغذات پر رکھا ہوا ہے - میں نے خیال کیا کہ طالب علم محنتی ہے مسلسل محنت اور متواتر شب بیداری کی وجہ سے وہ تھکا ہوا ہوگا اس لئے نیند کے سخت حملہ کی مدافعت نہیں کر سکا - اور جہاں بیٹھا تھا وہیں سو گیا +

میں ابھی اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس نے اپنا سر میز پر سے اُٹھایا اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے - اور میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کے حروف جگہ جگہ سے مٹ گئے تھے - اُس نے اپنے آنسو رومال سے پونچھے اور پھر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گیا - جاڑوں کی اس خوفناک اندھیری رات میں پچھلے پہر کی اس وحشتناک خاموشی میں جبکہ ساری دنیا میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی - اس غریب طالب علم کو روتے دیکھ کر میں بے چین ہو گیا - میں نے اپنے دل میں کہا ضرور اس غریب پر کوئی ایسی ہی مصیبت پڑی ہے جو اس کے آنسوؤں کی جھڑیاں تھمنے پر نہیں آتیں - اور اسکا جسم ٹوٹے ہوئے خیمے کی طرح گرا جاتا ہے - کچھ دیر بعد اُس نے اپنی کتاب بند کر دی - لیمپ کی روشنی کم کر دی اور میز پر سے اُٹھ کر اپنے بچھونے پر جا لیٹا - رات کا اکثر حصہ گزر چکا تھا - صبح کاذب کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی - میں بھی اپنے سونے کے کمرہ میں جا کر اپنے تھکے ہوئے جسم اور مضطرب دل کو کچھ سکون دینے کے لئے بستر پر دراز ہو گیا +

اس واقعہ کے بعد میں نے کئی دفعہ اُسے سر جھکائے کسی فکر میں مستغرق بیٹھے - کبھی آہیں کھینچتے ہوئے - کبھی آنسو بہاتے ہوئے - کبھی بستر پر لیٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے - اور کبھی دیوانوں کی طرح اپنے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے اور پھر تھک کر کرسی پر لیٹ کر روتے ہوئے دیکھا - میں دل کا بہت کمزور ہوں - معمولی سے معمولی واقعات مجھ پر غیر معمولی اثر کرتے ہیں - یہ حسرتناک مناظر مجھے بے چین کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھے - چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ جب نوجوان اپنے کمرہ میں رو رہا تھا - تو میں بھی اپنے کمرہ میں رو رہا تھا +

میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ میرے دل میں اس بات کی کتنی خواہش تھی کہ میں اس سے اس رنج کا سبب معلوم کروں - جو اسے ہلکان کئے دیتا ہے اور ایک دردمند دوست کی طرح تسلی دلا سے سے اُس کا غم بٹانے کی کوشش کروں لیکن محض اس خیال سے کہ شاید وہ اپنے معاملہ میں میری مداخلت کو پسند نہ کرے - اور اپنے راز کو مجھ جیسے اجنبی پر ظاہر کرنے کو اچھا نہ سمجھے - میں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے سے قاصر رہا +

کل رات جب میں دو بجے کے قریب اپنی لائبریری کے کمرہ میں آیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کے کمرہ میں معمول کے خلاف اندھیرا گھپ ہے - میں نے خیال کیا کہ شاید وہ کسی کام کے لئے باہر گیا ہوگا - تھوڑی دیر بعد اسی طرف سے میرے کانوں میں کسی کے آہستہ آہستہ کراہنے اور رونے کی آواز آئی - اس آواز کو سن کر میں بے چین ہو گیا - میں نے اپنے دل میں کہا

کہ نوجوان ضرور کچھ بیمار ہے۔ اور اس کے پاس کوئی تیماردار بھی نہیں ہے۔ اسی لئے ابتک لیمپ بھی روشن نہ ہوسکا۔ مجھے اب توقف مناسب نہیں ہے۔ فوراً اُس کے پاس پہنچ جانا چاہئے۔ میں اپنے نوکر کو لالٹین لانے کا حکم دے کر اس کے کمرہ کے دروازہ پر پہنچا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ کمرے میں قدم رکھتے وقت، مجھے ایسی وحشت محسوس ہوئی۔ جیسی میّت کے قبر میں اُتارنے والوں کو قبر میں داخل ہوتے وقت ہوا کرتی ہے لیکن میں ہمّت کرکے داخل ہوگیا +

نوجوان اپنے پلنگ پر غفلت کی حالت میں اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا۔ یکایک اپنے گپ گھپ اور تنہا کمرہ میں روشنی کی چمک اور کسی کے قدموں کی آہٹ سُنکر وہ ڈر گیا اور چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ بہت دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھتا رہا۔ اگرچہ اُس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر میں نے اُس کی نظروں سے معلوم کر لیا کہ وہ یہ جاننے کے لئے بے چین ہے کہ میں کون ہوں ؟

میں اُس کے پلنگ کی طرف بڑھا۔ اور اُس کے پاس جاکر بیٹھ گیا، اور ہمدردی کے لہجہ میں کہا "بھائی جان! میں تمہارا پڑوسی ہوں۔ سامنے کے مکان میں رہتا ہوں میں نے اس وقت تمہارے کراہنے کی آواز سُنی۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ تم اس کمرہ میں تنہا رہتے ہو۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ تمہاری خیریت معلوم کروں۔ اور اگر تم بیمار ہو تو اپنی مقدرت کے مطابق تمہاری کچھ خدمت انجام دوں۔ تو کیا تم کچھ بیمار ہو ؟"

نوجوان نے اپنے مُنہ سے کچھ جواب نہ دیا، بلکہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کو اُٹھا کر اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو اُس کی پیشانی پر رکھ کر دیکھا۔ تو اُس میں آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں وہ نہایت تیز بخار میں مبتلا تھا +

میں نے اپنے نوکر کو حکم دیا کہ وہ میری الماری میں سے بخار کی دوا نکال لائے۔ نوکر دوڑا ہوا گیا اور دوا نکال لایا۔ میں نے اُس کے چند قطرے اُس کے حلق میں ڈالے۔ دوا پینے کے بعد مریض نے کچھ افاقہ محسوس کیا۔ اُس نے محبّت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، اور نحیف آواز سے کہا، جناب میں آپکی اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں"+

میں نے ہمدردی کے لہجہ میں کہا "بھائی! تمہیں کیا شکایت ہے؟"

اُس نے لرزتی ہوئی آواز سے جواب دیا "کچھ نہیں"

میں نے کہا "پھر تمہاری یہ حالت کیوں ہے ؟"

اُس نے جواب دیا "مجھے خبر نہیں"

میں نے کہا "میرے نزدیک تمہارے لئے ڈاکٹر کو بُلانے کی ضرورت ہے۔ تمہیں نبض دکھانے میں کچھ عذر تو نہ ہوگا ؟"

مریض نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "ڈاکٹر کو وہ نبض دکھائے جسے زندہ رہنے کی تمنّا ہو۔ اور پھر بدستور پہلے کی طرح غوطہ میں چلا گیا +

مریض کی کمزوری کی یہ حالت دیکھ کر میں نے نوکر کو دوڑایا کہ فوراً ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کمرہ کے نیچے آکر رکی اور وہ ہزار نخروں کے ساتھ، جاڑوں میں آدھی پچھلی رات کو تکلیف دینے اور کچی نیند میں جگانے کی شکایت کرتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے میں خاموشی سے ان کی شکایتیں سنتا رہا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس لئے کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی شکایتوں کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہے +

ڈاکٹر صاحب نے مریض کی نبض دیکھ کر آہستہ سے میرے کان میں کہا "جناب! آپ کا مریض خطرہ میں ہے۔ بظاہر اس کا جانبر ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں"۔ یہ فرما کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے کمپونڈر کے نام، مریض سے زندگی کا آخری جرمانہ وصول کرنے کے لئے ایک طویل حکم لکھا۔ اور مجھ سے وہ مادّی معذرت قبول کرنے کے بعد جس کے وہ خواہشمند تھے۔ اپنے گھر کو چلے گئے۔ میرا نوکر دوا لینے کے لئے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد دوا لے کر واپس آگیا +

جاڑوں کی طویل رات میں نے مریض کے سرہانے بیٹھ کر اسطرح آنکھوں آنکھوں میں کاٹی کہ کبھی اس کے حلق میں دوا کے قطرے ٹپکاتا تھا اور کبھی اپنے رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے +

خدا خدا کرکے صبح ہوئی اور نوجوان نے ساری رات بیہوشی میں گذار کر اپنی آنکھیں کھولیں۔ مجھے سرہانے بیٹھا دیکھ کر اُس نے اپنی نحیف آواز سے کہا "کیا آپ ابتک یہیں تشریف رکھتے ہیں ؟"

میں نے آہستہ سے جواب دیا "ہاں میں یہیں ہوں ———— مجھے امید ہے کہ اب تمہاری طبیعت پہلے کی بہ نسبت اچھی ہوگی"+

نوجوان نے جواب دیا، بیشک اب خدا کا فضل ہے"

نوجوان کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی دیکھ کر میں نے اُس سے لجاجت سے کہا

" عزیز بھائی ! کیا تم مہربانی کرکے مجھے بتاؤ گے کہ تم کون ہو ۔ کہاں کے رہنے والے ہو ۔ اسی شہر کے رہنے والے ہو یا پردیسی ہو ؟ اور تمہیں بیماری کیا ہے ۔ کوئی جسمانی بیماری ہے یا روحانی ؟"

نوجوان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا " مجھے دونوں بیماریاں ہیں "

میں نے اُس سے دلسوزی کے لہجہ میں کہا " میرے اچھے بھائی ! تو تم مجھ سے اپنے حالات بیان کردو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارا سچا دوست ہوں ۔ سچے دوستوں سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتے " +

نوجوان نے میرے چہرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا " میرا واقعہ ایک راز ہے ۔ جسے میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا ۔ لیکن آپ نے مجھ بے کس کے حال پر اتنی عنایتیں کی ہیں کہ میں آپ کی بات کو رد نہیں کرسکتا ۔ میں آپ کو اپنی درد بھری داستان سُنانے کے لئے تیار ہوں ۔ بشرطیکہ آپ وعدہ کریں کہ اگر خدا نے مجھے اچھا کردیا تو اس راز کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں گے ۔ اور اگر اسے کچھ اور منظور ہوا تو پھر میری وصیت کو پورا کردیں گے " +

میں نے جواب دیا " میں وعدہ کرتا ہوں "

نوجوان نے کہنا شروع کیا :-

" میرا نام اختر احمد ہے ۔ میرے والد کا نام عبدالرحمٰن تھا ۔ میں ابھی چھ سال ہی کا تھا کہ ان کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا ۔ خدا بخشے میرے والد بڑے خرچیلے تھے ۔ اس لئے جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا بند بند قرضہ میں جکڑا پڑا تھا ۔ ان کے مرتے ہی قرضخواہوں نے ایک ایک حبہ جائداد نیلام کرائی ۔ اور میرے پاس دنیوی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی وسیلہ نہ چھوڑا +

میرا چچا بڑا نیک دل ، خداترس اور شریف النفس انسان تھا ۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد وہ مجھے اپنے مکان پر لے آیا ۔ اور میرے ساتھ ایسی محبت سے پیش آیا کہ میں تھوڑے ہی دنوں میں والد مرحوم کو بھول گیا ۔ وہ ہر وقت میری نازبرداری میں مصروف رہتا تھا اور میرے دل پر کسی قسم کا میل نہ آنے دیتا تھا ۔ اس نے کبھی مجھ میں اور اپنی اکلوتی لڑکی میں جو مجھ سے کچھ ہی چھوٹی تھی ۔ کسی بات میں فرق روا نہ رکھا ۔ اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس کی دائیں آنکھ تھی تو میں اس کی بائیں آنکھ ضرور تھا ۔ خدا نے اُسے اولاد نرینہ سے محروم رکھا تھا ۔ اور اُس کی دلی تمنا تھی کہ خدا اُسے بیٹا دے ۔ لیکن جب سے میں اُس کی زیر تربیت آیا تھا ۔ یہ خواہش اُس کے دل سے دور ہوگئی تھی ۔ اور وہ مجھے ہی اپنا حقیقی بیٹا سمجھنے لگا تھا +

چچا کی لڑکی شمیم کی اور میری ایک ساتھ بسم اللہ ہوئی اور ایک ساتھ دونوں مکتب میں بٹھائے گئے ۔ مجھے اس کے ساتھ حقیقی بہنوں سے زیادہ محبت تھی ۔ اور میں اس کے ساتھ بات چیت کرنے میں ، کھیلنے کودنے میں ایک خاص کیف محسوس کرتا تھا ۔ ہم دونوں ایک ساتھ مدرسہ جاتے ۔ ایک ساتھ مدرسہ سے آتے ۔ ایک ساتھ صحن میں کھیلتے ۔ ایک ساتھ پائین باغ میں ٹہلتے ۔ ایک ساتھ مطالعہ کرتے . . . . اور ایک ساتھ کھانا کھاتے ۔ میرا بغیر اُس کے اور اُس کا بغیر میرے کسی کام میں جی نہ لگتا تھا ۔ محلہ والے جب ہمیں ہر وقت ایک ساتھ دیکھتے تو حیرت سے کہتے تھے ۔ " اُن دونوں میں کیسی محبت ہے " ! اور جب محلہ میں کوئی دو بہن بھائی لڑتے تو اُن کی ماں ملامت کرتے وقت ہم دونوں کے اتفاق کو بطور مثال کے بیان کرتی +

میری اُس کے ساتھ یہ وارفتگی کچھ بیجا نہ تھی ۔ دنیا کی جسقدر خوبیاں ایک لڑکی کے ظاہری و باطنی حسن کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں ۔ وہ سب اس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں ۔ کیا تہذیب و تمیز ۔ کیا اخلاق و عادات ۔ کیا شرم و حیا ۔ کیا عصمت و عفت ۔ کیا تعلیم و تربیت ہر اعتبار سے وہ محلہ کی لڑکیوں میں ممتاز تھی +

آہ ! ہجر و فراق کی اس اندھیری رات میں بھی ۔ میں وصل کی اس نورانی صبح کا تصور کرکر کے مزے لوٹ رہا ہوں جس کی روشنی کا پرتو ہمارے آئینہ کی طرح صاف دلوں پر پڑ کر انہیں جگمگا دیتا تھا ۔ اور رنج و الم کے یہ کڑوے گھونٹ بھرتے ہوئے بھی ، مجھے عیش و عشرت کی ان لذیذ شرابوں کا مزہ یاد ہے ۔ جو ہم دونوں نے بچپن کے زمانہ میں ایک جگہ بیٹھکر ایک ساتھ لنڈھائی تھیں !

آہ کوٹھی کے سامنے کا وہ سرسبز و شاداب پائین باغ ، جو ہماری لذتوں کا گہوارہ اور ہماری مسرتوں کا مرکز تھا ۔ آج بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہے ! اس کے درختوں کی بوقلمونی ۔ اس کے پھولوں کی رنگارنگی ۔ اس کے پانی سے بھرے ہوئے حوضوں کی چمک دمک میں آج بھی عالم خیال میں دیکھ رہا ہوں !

اس کی وہ مرمریں بنچیں جن پر بیٹھ کر ہم دونوں یا کوئی کتاب پڑھا کرتے تھے ۔ یا کوئی تصویر دیکھا کرتے تھے یا کہانیاں کہا کرتے تھے یا باغ میں سے توڑے ہوئے پھولوں کے گلدستے بنایا کرتے تھے ۔ مجھے آج بھی یاد ہیں !

اس کے وہ سایہ دار درخت جن کے سایہ میں بیٹھکر ہم دوڑ کی ایک بازی

ختم کرنے کے بعد ستایا کرتے تھے - اور وہی سکون محسوس کیا کرتے تھے جو پرندوں کے بچے اپنی ماؤں کے پروں کے نیچے بیٹھ کر محسوس کیا کرتے ہیں۔ مجھے آج بھی یاد ہیں!

اس کے وہ گہرے گہرے گڑھے جنھیں ہم حوضوں اور نالیوں کے کنارے کھودا کرتے تھے اور ان میں پانی بھر کر مچھلیاں چھوڑا کرتے تھے - اور پھر ان مچھلیوں کو پکڑ کر خوش ہوا کرتے تھے - مجھے آج بھی یاد ہیں!

اس کے وہ خوبصورت سنہری پنجرے جن میں ہم نے رنگ برنگ کی چڑیاں پال رکھی تھیں - اور جن کے پاس بیٹھ کر ہم گھنٹوں ان کا پانی سے بھری ہوئی کٹوریوں میں ڈبکیاں لگا لگا کر نہانے کا دلچسپ منظر دیکھا کرتے تھے - اور جن کو ہم اپنے رکھے ہوئے ناموں سے پکارا کرتے تھے - اور جب پرند چہچہاتے تھے تو یہ سمجھ کر کہ انہوں نے ہماری بات کا جواب دیا ہے خوش ہوا کرتے تھے آج بھی یاد ہیں!

ہم دونوں کے اختلاط و یگانگت کا یہی عالم رہا - حتّٰی کہ وہ پردہ میں بٹھا دی گئی - میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اس واقعہ کے بعد کئی روز تک اسکول میں میرا ذرا دل نہ لگا - اور وہاں میں عجب قسم کی بے چینی محسوس کرتا رہا - اگرچہ میری نظر کتاب پر ہوتی تھی - مگر میرا دماغ گھر پر ہوتا تھا - چنانچہ کئی دفعہ استاد نے پڑھنے سے بے التفاتی کے جرم میں مجھے سزا بھی دی ◆

میرے اور اس کے دل کو محبّت کی فولادی زنجیروں نے اس مضبوطی کے ساتھ جکڑا تھا - کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں جدا نہ کر سکتی تھی - اس کی شیرینیٔ گفتار میں میرے لئے دنیا بھر کی لذتیں حل کی ہوئی تھیں اور اس کی ضیا پاشیٔ تبسم میں مجھے سکون و اطمینان کی روشنی چمکتی نظر آتی تھی ◆

میں نہیں سمجھ سکتا کہ جو تعلق مجھے اُس کے ساتھ تھا - اسے اخوت و محبت کے نام سے تعبیر کروں یا عشق و فریفتگی کے نام سے؟ لیکن یہ بالکل واقعی بات ہے کہ اگر وہ عشق تھا تو بلا کسی امید کے، اور اگر وہ فریفتگی تھی تو بغیر کسی آرزو کے ◆

میں نے آج تک کبھی اس سے یہ نہیں کہا کہ مجھے تجھ سے عشق ہے - اور نہ کبھی اس کی طمع کی کہ اس کی زندگی کے رشتہ کو اپنی زندگی کے رشتہ کے ساتھ ملحق کردوں - اور میں ایسا کرتا ہی کیوں؟ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں غریب ہوں اور وہ امیر - آسمان حسن کا وہ چمکدار تارہ مجھ جیسے خاک نشین کی گود میں اُتر کر نہیں آسکتا - اور اُس کے والدین اپنے اس قیمتی ہیرے کو مجھ جیسے بھکاری کی گود میں نہیں ڈال سکتے ◆

میں نے کبھی اسے اس طرز خطاب سے مخاطب نہیں کیا جو عاشقوں میں مروج ہے - اور میں نے کبھی اس سے عاشقانہ راز و نیاز کی وہ گفتگو نہیں کی جو سلگتی ہوئی محبّت کی چنگاریوں کو بھڑکا دیا کرتی ہے - اور میں ایسا کرتا ہی کیوں؟ اپنی زبان سے ایسی باتیں نکالنے کو میں اُس کی توہین سمجھتا تھا ◆

میں نے کبھی اس کے دل کو ٹٹول کر یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس میں میری طرف سے کس قسم کے جذبات پنہاں ہیں - جذبات محبّت یا جذبات عشق؟ اور میں نے اس کی نظروں کو کبھی اس حیثیت سے جانچنے کی کوشش نہیں کی کہ میں یہ معلوم کروں کہ یہ الفت کی نظریں ہیں یا وارفتگی کی؟ کیونکہ میرا مقصد یہ نہ تھا کہ اگر وہ مجھ سے وارفتگی رکھتی ہو تو میں اس کے اس جذبہ کو اس کے حاصل کرنے کے لئے وسیلہ بناؤں - بلکہ اس کے ساتھ میری محبّت ایسی ہی تھی جیسی کنواری مریم کے بت کے ساتھ راہب کو ہوتی ہے - وہ ہر وقت اس کی پرستش کرتا ہے - مگر کبھی اس کو چھونے کا ارادہ نہیں کرتا ◆

پردہ میں بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ مجھ سے پردہ نہ کرتی تھی اور میرے اور اُس کے پاک تعلقات بدستور قایم تھے - حتّٰی کہ میرا چچا ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوا اور چند دن بیمار رہ کر راہی ملک بقا ہوگیا - مرتے وقت اُس نے مجھے اپنے پاس بلایا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی بیوی سے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے - میں نے اسے اپنے حقیقی بیٹے کی طرح پالا ہے - افسوس میں مرگ ناگہانی کے سبب اس کے لئے کچھ نہ کر سکا - لیکن مجھے امید ہے کہ تم اس کے ساتھ حقیقی ماں کا سا سلوک کروگی - اور اسے میرا مرنا محسوس نہ ہونے دوگی" مگر افسوس کہ ابھی میرے چچا کا چہلم بھی نہ ہوا تھا کہ میں نے چچی کی نظریں بدلی ہوئی دیکھیں - اور عمر میں سب سے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ میں یتیم ہوں!

ایک دن صبح کے وقت، میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا - کہ میرے چچا کے گھر کی ایک پرانی ماما جو مجھ سے بہت محبّت کرتی تھی میرے پاس روتی ہوئی آئی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "میاں! بیگم صاحبہ نے مجھ سے یہ کہلا کر بھیجا ہے کہ ان کا ارادہ عنقریب اپنی لڑکی کی شادی سے فارغ ہونے کا ہے - ممکن ہے کہ اس کی سسرال والے اس بات کو ناپسند کرتے ہوں کہ لڑکی کے باپ کے انتقال کے بعد کوئی غیر مرد اکیلے گھر میں لڑکی کے ساتھ رہے - لہٰذا ان کی رائے یہ ہے کہ آپ اس کمرہ کو خالی کردیں اور شہر میں کوئی مکان کرایہ پر

لیں اور وہاں بود و باش اختیار کریں۔ مکان کا کرایہ اور آپ کے اخراجات ؤ
اکریں گی"+

یہ الفاظ ماما کی زبان سے نکل کر میرے دل میں تیر کی طرح لگے میرا دل
بھنے لگا۔ اور میرا سر چکرانے لگا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھال کر
اسے کہا "چچی جان سے کہدینا کہ میں اُن کے حکم کی تعمیل کروں گا"۔ ماما چلی
گی اور میں کمرہ میں تنہا رہ گیا۔ اب مجھ سے اپنی ناکامی و نامرادی پر جتنا رویا
یا رویا۔ حتیٰ کہ روتے روتے رات ہوگئی۔ عشاء کے بعد جب سب سو گئے
ں نے اپنے ہینڈ بیگ میں دو جوڑی کپڑے اور پڑھنے کی چند کتابیں رکھیں
ر اپنے دل کو یہ سمجھا کر کہ جب میری زندگی کی سب سے بڑی متاع ہی مجھ سے
ین لی گئی تو مجھے کسی اور چیز کا کیا افسوس کرنا۔ اپنے کمرہ سے نکل آیا +

قریب ہی چچا کی لڑکی کا کمرہ تھا۔ اپنے کمرہ سے نکل کر میں اُسے
خری مرتبہ الوداع کہنے کے لئے اس کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ سراپا حُسن
لکے ریشم کا دھانی دوپٹہ اوڑھے ہوئے عجیب انداز سے مصروف خواب ناز
ھی +

حسن و جمال کا یہ مہ کامل ابر کے ہلکے ہلکے پردوں میں سے چمک چمک
ر دنیا کو جلوہ زار بنا رہا تھا۔ اور دلآویزی و رعنائی کی یہ شراب ناب جام
ریں میں سے چھلک چھلک کر عالم کو غرق مے کر رہی تھی +

تھوڑی دیر تک میں حسرت کی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر
یری آنکھوں میں آنسوؤں کے تارے جھلملانے لگے۔ اور یہ آفتاب نظروں
سے اوجھل ہوگیا۔ میں آنسو پونچھتا ہوا کمرہ سے باہر نکل آیا۔ آہ یہ میری زندگی
ں سب سے بہترین کائنات پر سب سے آخری نظر تھی!

رات کی خوفناک اندھیری میں۔ میں نے اس طرح روتے ہوئے
پنے چچا کی کوٹھی کو چھوڑا جس طرح آدم نے جنت کو چھوڑا تھا۔ مگر آدم کے
تھ ان کی دلبستگی و دلداری کے لئے حوا تھی اور میرے ساتھ کوئی نہ تھا!

چچا کی کوٹھی کو چھوڑ کر جب میں نکلا ہوں تو میرے پاس آن کے
انہ کی کچھ رقم تھی۔ رات تو میں نے جوں توں کر کے گذار دی۔ صبح ہوتے ہی
ان کی تلاش کرنی شروع کی اور یہ کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ جس کی تمام عمر قصرِ
نزل جیسی روح افزا کوٹھی میں بسر ہوئی ہو۔ اور جس کی رفیق زندگی شبنم
یسی بناں پرورش پا رہی ہو۔ اُس کا دل اس تنگ و تاریک کمرہ میں کیا لگتا؟

میں گھنٹہ بھر بھی یہاں بیٹھنے نہ پایا تھا کہ انتہائی وحشت کے عالم میں ایک طویل
سفر کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا کہ شاید مختلف مقامات کی مختلف دلچسپیاں
میرے رنج و غم کو کچھ کم کر سکیں +

میں مسلسل دو مہینے تک مختلف شہروں کا سفر کرتا رہا۔ جہاں جاتا وہاں
کے بہترین قدرتی مناظر سے اپنے دل کو بہلاتا اور وہاں کی بہترین تفریح
گاہوں سے محظوظ ہوتا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے مضطرب دل میں کچھ سکون محسوس
کیا۔ وہی سکون جو پلکوں میں اٹکے ہوئے اس آنسو کے قطرہ کو حاصل ہو
جاتا ہے جو نہ بہتا ہے اور نہ خشک ہوتا ہے +

اب کالج کی چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں اور نیا سیشن شروع ہونے والا تھا
میں نے اس سکون کو غنیمت سمجھا۔ اور سمجھا بجھا کر اپنے دل کو اس بات پر آمادہ
کیا کہ اپنے وطن کو لوٹ جاؤں۔ اور تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھوں۔ چنانچہ
میں یہاں آکر کالج میں داخل ہوگیا۔ اور اس کمرہ میں رہنے لگا۔ میں نے ارادہ
کر لیا کہ دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے بالکل بے تعلق رہونگا۔ سوائے تعلیم
کے کسی چیز سے سروکار نہ رکھوں گا۔ اور حتی الوسع پرانے واقعات کو بھلا دینے
کی کوشش کرونگا +

ایسا ہی ہوا میں نے بالکل راہبانہ زندگی بسر کرنی شروع کردی۔ میں
اپنے کمرہ سے نکل کر کالج یا ہوٹل کے سوا کہیں اور نہ جاتا۔ بعض اوقات
انتہائی بے چینی کے باوجود میں نے کبھی اس جنت ارضی کی طرف بھی
جانے کی کوشش نہ کی۔ جہاں عرصہ دراز تک عیش و عشرت کی شرابیں
اُڑ رہی تھیں۔ اور اس حور کے جلووں سے متمتع ہونے کا بھی قصد نہ کیا۔
جو وہاں میری ساقی گری کرتی تھی۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے دل
کے پرانے زخم جو اب کچھ بھرتے آرہے ہیں پھر ہرے ہو جائیں اور میری
رگِ جان کا خون جو بہتے بہتے تھم گیا ہے پھر رسنے لگے +

عشق و محبت کی وہ آگ جس نے میرے دل کو بھٹی بنا رکھا تھا اب
مندی پڑ گئی تھی۔ اور اگر اس کی دبی دبائی چنگاریاں کبھی بھڑکنے بھی لگتی
تھیں تو میں آنسوؤں کے چھینٹے دے کر انہیں بجھا دیا کرتا تھا +

اس حالت میں زندگی بسر کرتے ہوئے مجھے کافی عرصہ گذر گیا تھا کہ
کل یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میری پونجی ختم ہوگئی ہے۔ اور اب میرے پاس
اتنا بھی باقی نہیں رہا ہے کہ اس مہینہ کا ہوٹل کا بل اور کالج کی فیس بھی ادا
کرسکوں۔ میں سخت پریشان تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ بہت دیر سوچنے

کے بعد یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ مستقل طور پر گذر معاش کے لئے تو کوئی ٹیوشن تلاش کر لوں ۔ اور فی الحال کام چلانے کے لئے اپنی کتابیں بیچ دوں ۔ چنانچہ میں اپنی تمام غیر درسی کتابوں کو ایک کپڑے میں باندھ کر بازار لے گیا ۔ اور صبح سے شام تک سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے مختلف تاجروں کو اپنی کتابیں دکھاتا رہا ۔ مگر افسوس کہ کسی اللہ کے بندہ نے کتابوں کی چوتھائی قیمت بھی نہ لگائی ۔ شام کو میں کتابوں کی بکری سے مایوس ہو کر رنجیدہ و مغموم ، اپنی بدبختی پر ماتم کرتا ہوا اور اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہوا اپنی جائے قیام پر واپس آیا +

میں دروازہ پر پہنچا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک عورت سڑک پر کھڑی ہوئی محلہ والوں سے مجھے دریافت کر رہی ہے ۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہی ماما نکلی جو چچا کے ہاں کام کاج کیا کرتی تھی ۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا نام لے کر کہا فلانی + [illegible]

اُس نے جواب دیا " ہاں میاں "

میں نے اُس سے پوچھا " کیسے آئیں ؟ "

اُس نے جواب دیا " مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے "

میں اُسے اپنے کمرہ میں لے آیا ۔ اور جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئی تو میں نے اُس سے کہا " کہو "

ماما نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا " میاں ! تم کہاں تھے ؟ مجھے آج تین دن کامل تمہیں تلاش کرتے کرتے ہو گئے ۔ سارے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا ۔ مگر تمہیں نہ ملے ۔ آج بالکل مایوس ہو جانے کے بعد اتفاقیہ طور پر تمہارے مکان کا پتہ معلوم ہوا اور میں یہاں تک پہنچ گئی " یہ کہہ کر ماما زار زار رونے لگی ۔ ماما کے رونے سے میں گھبرا گیا اور فوراً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا خیر کرے ۔ کہیں اس گھر میں جو میری آرزوؤں کا مرکز اور حسرتوں کا گہوارہ ہے ۔ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا ہے ۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا " ماما کیوں روتی ہو خیریت تو ہے ؟ "

ماما نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا " تمہیں کچھ نہیں معلوم ؟ "

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا " کچھ نہیں ، خدا کیواسطے جلدی بتاؤ "

ماما نے اپنی چادر میں ہاتھ ڈالا اور اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک سربند لفافہ نکال کر مجھے دیدیا ۔ میں نے جلدی سے لفافہ پھاڑ کر اس میں سے خط نکالا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو اُس نے میرے نام لکھا تھا ۔ اس کی عبارت جو قیامت تک میرے حافظہ میں محفوظ رہے گی یہ تھی :-

" میرے دلدار !

تم مجھ سے جدا ہو گئے ۔ اور چلتے وقت ملے تک نہیں ، خیر میں تمہاری اس خطا کو معاف کرتی ہوں ۔ اب میں اس دنیا سے رخصت ہونے کو ہوں اور قبر میں جانے کو تیار بیٹھی ہوں ۔ اگر اس وقت بھی تم نے وہی بیوفائی برتی اور مجھے رخصت کرنے کے لئے نہیں آئے تو میں تمہارے اس گناہ کو ہرگز معاف نہ کرونگی "+

خط کو اپنے ہاتھ سے پھینک کر میں جلدی سے دروازہ کی طرف جھپٹا ۔ لیکن ماما نے دوڑ کر میری شیروانی کا دامن پکڑ لیا ۔ اور مجھ سے پوچھنے لگی " میرے آقا کہاں جاتے ہو ؟ "

میں نے کہا " چھوڑ دے ماما میرا دامن چھوڑ دے ۔ شمیم بیمار ہے اس نے مجھے بلایا ہے ، میں اس کی عیادت کو جاتا ہوں "+

ماما نے رو کر کہا " اب آپ کا وہاں جانا فضول ہے ۔ اب وہاں کون بیٹھا ہے ۔ چھوٹی بیگم تو اللہ میاں کے گھر سدھار گئیں "+

آہ میں نہیں بیان کر سکتا کہ ان الفاظ کو سن کر میری کیا حالت ہوئی ۔ روح کھنچنے لگی ، دل بیٹھنے لگا ، سر چکرانے لگا ۔ پاؤں ڈگمگانے لگے ۔ اور میں دھڑام سے زمین پر آ رہا ۔ پھر اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ۔ رات کو دس بجے کے قریب جب مجھے ہوش آیا ۔ تو میں نے دیکھا کہ میں چارپائی پر لیٹا ہوں اور ماما میرے سرہانے بیٹھی رو رہی ہے ۔ میں نے پوچھا " اچھی ماما کیا تو سچ کہہ رہی ہے ؟ "

ماما نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا " ہاں سرکار "

میں نے کہا " اچھا تو پھر واقعات کچھ تفصیل سے بیان کرو "+

ماما نے کہا " سرکار آپ کے پیچھے چھوٹی بیگم نے دنیا کی کسی خوشی میں حصہ نہ لیا ۔ جس رات آپ سدھارے ہیں اُس کی صبح کو انہوں نے مجھ سے آپ کے چلے جانے کا سبب پوچھا ۔ میں نے اُن سے سارا قصہ بیان کر دیا ۔ اس پر انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا " ہائے افسوس ! خدا جانے اس غریب کی قسمت میں کیا کیا ٹھوکریں لکھی ہیں ۔ ان نادانوں کو کیا خبر کہ میرا اور

اس کا کیا تعلق ہے؟"

اس دن کے بعد پھر ہم نے اُن کی زبان پر آپ کا نام آتے نہیں سُنا ہاں البتہ ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ آپ کے چلے جانے کا انہیں بڑا صدمہ ہے جسے وہ چھپانا چاہتی ہیں۔ مگر چھپ نہیں سکتا +

چند ہی روز بعد اُن کو حرارت رہنے لگی۔ جس نے رفتہ رفتہ پُرانے بخار کی صورت اختیار کر لی۔ اُن کے پھول سے رخسار کُملا گئے۔ اُن کے غنچہ سے لب مرجھا گئے۔ اور اُن کی نرگسی آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر بڑی بیگم صاحبہ کے چھکّے چھوٹ گئے۔ بیاہ شادی کا ذکر چھوڑ وہ اس کے علاج معالجہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ شہر کا کوئی حکیم، کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا جس کا علاج نہ کرایا ہو۔ مگر مرض میں روز بروز افاقہ کی بجائے ترقی ہی ہوتی رہی۔ اور چھوٹی بیگم تھوڑے ہی عرصہ میں چارپائی سے لگ گئیں۔ اب ان کی یہ حالت تھی کہ نہ کھایا جاتا تھا نہ پیا جاتا تھا۔ نہ اُٹھا جاتا تھا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ دو دو آدمی اُنہیں ملکر اُٹھاتے بٹھاتے تھے۔ اور کئی کئی دن تک دوا کے چند قطروں کے سوا اُن کے حلق میں کچھ نہ جاتا تھا۔ حکیم ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تھا۔ اور گھر والوں کو اُن کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی +

آج سے چند رات پہلے۔ پچھلے پہر کو۔ میں نیم غنودگی کی حالت میں اُن کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ مجھے پلنگ پر اُن کے حرکت کرنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں فوراً ہشیار ہوگئی۔ اور اُن سے پوچھا "کیوں بیگم کیا بات ہے؟" اُنہوں نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا کر اشارہ سے اُٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اُنہیں اُٹھا کر بٹھا دیا۔ اور ایک گاؤ تکیہ اُن کے پیچھے لگا دیا +

اُنہوں نے مجھ سے پوچھا "اس وقت کیا بجا ہوگا؟"

میں نے جواب دیا "کوئی چار بجے کا عمل ہوگا" +

اُنہوں نے کہا "ماما کیا تم یہاں تنہا ہو؟ کوئی اور تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا نہیں کوئی اور نہیں ہے۔ گھر والے سب سو گئے ہیں۔ تمہاری امّاں بھی کوئی رات کے بارہ بجے یہاں سے اُٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی تھیں +

اُنہوں نے رُک رُک کر کہا "اچھی ماما کیا تمہیں معلوم ہے کہ ... کہاں رہتے ہیں؟"

اس کلمہ کو آج سب سے پہلی مرتبہ اُن کی زبان سے سُنکر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ لیکن میں نے اپنے تعجب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے فوراً جواب دیا "ہاں معلوم ہے"

میرے آقا! سچی بات تو یہ ہے کہ میرے فرشتوں کو بھی آپ کے مکان کی خبر نہ تھی۔ مگر میں نے سوچا کہ اگر اس وقت میں اس سوال کا جواب نفی میں دیتی ہوں، تو یاس و حسرت کی اس اندھیری رات میں اس کی امید کا آخری تارا ابھی غروب ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسکی زندگی کی شمع بھی خاموش ہو جائے گی۔ اس لئے میں نے اثبات ہی میں جواب دیا +

اُنہوں نے لجاجت سے کہا "کیا تم میرا ایک خط اُنہیں پہنچا دو گی؟"

میں نے جواب دیا "بیگم یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بھلا مجھے تمہارے کسی کام سے انکار ہو سکتا ہے؟"

اُنہوں نے مجھے قلمدان اور کاغذ لانے کا اشارہ کیا۔ میں دونوں چیزیں لے آئی۔ پھر اُنہوں نے آپ کے نام وہ خط لکھا جو آپ کے سامنے ہے +

صبح ہوتے ہی میں خط لے کر آپ کی تلاش میں نکلی۔ شہر کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں لوگوں سے آپ کا نام لے کر آپ کا پتہ پوچھتی تھی کہ شاید کوئی آپ کا جاننے والا نکل آئے۔ اور ہر ہر بازار اور ہر ہر سڑک پر گھنٹوں آنے جانے والوں کا منہ تکتی تھی، کہ شاید ان میں آپ بھی ہوں۔ مگر آپ کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔ آخر کار مایوس ہو کر تقریباً عشاء کے بعد گھر لوٹ گئی۔ مگر آہ ابھی دروازہ ہی پر پہنچی تھی کہ رونے پیٹنے کی آوازیں میرے کان میں پڑیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ شمع حسن جس سے ساری محفل کی رونق تھی۔ آج جھلملا جھلملا کر خاموش ہوگئی ہے۔ اور وہ غنچۂ جمال جس سے سارے چمن کی زینت تھی آج کُملا کر گر گیا ہے

میں نے اُنہیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ مجھے ان کی جوانمرگی ہی کا صدمہ کیا کچھ کم تھا۔ لیکن میرے لئے رنج پر رنج یہ تھا کہ میں اُن کی آخری حسرت بھی پوری نہیں کر سکی تھی۔ ہائے افسوس، تم سے ملنے کی تمنا ان کے کفن میں ہی لپٹی چلی گئی۔ اور تمہیں دیکھنے کی آرزو ان کے ساتھ ان کی قبر ہی میں دفن ہوگئی!

میں نے خط کا راز اپنے دل ہی میں رکھا اور تمہاری تلاش میں مصروف رہی۔ حتیٰ کہ آج تم مل گئے۔ مگر افسوس کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے!"

میں نے ماما کے اس احسان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور اُسے واپس جانے کی اجازت دیدی۔ اس لئے کہ رات کافی گذر چکی تھی۔ ماما لوٹ گئی۔ ماما کے جاتے ہی میں نے محسوس کیا کہ کالے کالے بادل چاروں طرف سے

اُمنڈے چلے آرہے ہیں۔ حتیٰ کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ سارے کمرہ میں چھاگئے۔ اور میری نگاہوں سے ہر چیز اوجھل ہوگئی۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا اور کیا نہیں۔ ہاں اتنا ضرور معلوم کہ جب آنکھ کھلی تو آپ میرے سرہانے تشریف رکھتے تھے۔

نوجوان نے یہ کہہ کر ایک لمبی سانس کھینچی۔ میں سچ کہتا ہوں۔ کہ اس کے منہ میں سے سانس کے ساتھ ایسی بو آئی جیسی جلے ہوئے گوشت کی ہوتی ہے میں نے اُس سے پوچھا۔ بھائی جان! کیوں کیا بات ہے؟"

اُس نے کہا "کچھ نہیں، ایک آنسو نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جلے ہوئے دل کی گرمی کچھ کم ہو۔ مگر نہیں نکلتا" یہ کہکر خاموش ہوگیا۔

(عربی سے) (خاص)

سجّاد

غزل

اللہ اللہ یہ اثر جلوۂ یکتائی کا
اِک جہاں محوِ تماشا ہے تماشائی کا

نفس چند کے مہماں ہیں مجروحِ نگاہ
جنبشِ لب یہی موقع ہے مسیحائی کا

آنکھیں پتھرا گئیں رُخ زرد ہے نبضیں ساقط
حال اچھا نہیں اب تیرے تمنائی کا

پس پردہ ہی سہی دیکھ تو او پردہ نشیں
اُٹھنے والا ہے جنازہ ترے شیدائی کا

سرگذشتِ دلِ مضطر نے کیا اُن پہ اثر
سُن کے رو دیتے ہیں قصّہ شبِ تنہائی کا

جب کھلی آنکھ نظر جانبِ در جا پہنچی
نزع میں بھی ہے یہ عالم ترے شیدائی کا

مدوا ے جوشِ جنوں پاؤں نہیں اُٹھ سکتے
شوق دل میں ابھی باد یہ پیمائی کا

حیف صد حیف وہ پیمانِ وفا کرتے ہیں
آخری وقت ہے جب اُن کے تمنّائی کا

حشر کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں اے فرہاؔد
دوسرا نام ہے صبحِ شبِ تنہائی کا

(خاص)

سیّد عبدالغنی فرہاؔد

منظومات

ادب و تاریخ

"یوگی راج کرشن"

از حضرت نفیس خلیلی

جنم

کئے چاند نے چرخ پر کچھ اشارے — فرشتے ہوئے دفعتاً جمع سارے
وہ ازواج مہ پیکرانِ اطاعت — وہ پھیلی ہوئی قدسیوں کی جماعت
کچھ اس لحن میں بزمِ انجم نے گایا — پسِ پردہ نورِ خدا مسکرایا
سرِ عرش ہے بزمِ حق لاجواب آج — زبردست ہادی کا ہے انتخاب آج
لباسِ فنا میں بقا آ رہی ہے — صدا بانسری کی غضب ڈھا رہی ہے
وہ مرلی منوہر چلا آسماں سے — گہر نور کے قلزمِ بیکراں سے
سعادت نصیبی کی شب آن پہنچی — معاً ساعتِ پُر طرب آن پہنچی
گھٹائیں اٹھیں مینہ گوکل میں برسا — زمیں بھر گئی۔ نورِ حق جل میں برسا
فرشتوں نے گل پھینکے یومِ ولادت — مشیت ہنسی زیرِ لب حسبِ عادت
سروں پر کھنچا نور کا شامیانہ — منور ہوا ظلم کا قید خانہ
خوشی، روزنِ سقف سے مسکرائی — غریبوں کی امیدِ رحمت بر آئی
ضعیفوں کا والی جنم لے چکا ہے — بزرگ ... والی جنم لے چکا ہے
جنم لے چکا ہے منوہر بہاری — جنم لے چکا ہے کرشنا مراری
برج لعل، گھنشام تشریف لائے — شہنشاہ خوش کام تشریف لائے
گگن اور گیان کی بانسری کا بجیّا — ہوا عرشِ اعظم سے نازل گھنیا
جو رقصاں ہیں پریاں تو گاتی ہیں حوریں — پرے باندھے جنت سے آتی ہیں حوریں

ہے محبوبِ داور یشودھا کے گھر میں — جنم کا سنا اور یشودھا کے گھر میں

یشودھا ہے مرلی منوہر کی دایہ — یشودھا کے ہمرہ ہے رحمت کا سایہ
یشودھا کی جاگی ہے تقدیر خفتہ — یشودھا کے دل کی کلی ہے شگفتہ
یشودھا نے بیٹی نثار ان پہ کردی — تو خالق نے مہتاب سے گود بھردی
مقدر عجب تو نے پایا یشودھا — گھنی شام حصے میں آیا یشودھا
وہ گل آج گوکل میں ہم دیکھتے ہیں — "خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں"

بچپن

گھنیا کی آنکھیں ہرن سے نشیلی — گھنیا کی شوخی کلی سے رسیلی
گھنیا کی خوش لہجگی دامِ فطرت — گھنیا کی زلفِ سیہ شامِ فطرت
گھنیا کی چھب دل اڑا لینے والی — گھنیا کی صورت لبھا لینے والی
گھنیا کا بچپن، شرارت کا عنواں — گھنیا کی عشوہ گری حشر ساماں
گھنیا کا نقشہ ہے صنعت خدا کی — گھنیا کا عالم حسیں جس کے شا کی
گھنیا کی ہر بات میں ایک رس ہے — گھنیا کا دیدار سیمیں قفس سے
کبھی گوپیوں میں جو پنگھٹ پہ آئے — وہ نخرے میں آئیں تو یہ ہٹ پہ آئے
کسی کا سلامت دوپٹہ نہ چھوڑا — جو بھاگیں تو کنکر سے مٹکوں کو پھوڑا
جو ہاتھ آئی اس کی مروڑی کلائی — بہت کسمسائی نہ چھوڑی کلائی
بٹھایا زمیں پر پکڑ کر کسی کو — رکھا بانسری سے جکڑ کر کسی کو
وہ کہتی ہیں اب شام ہوتی ہے پیارے — یہ کہتے ہیں کیوں آئیں جمنا کنارے
ہیں کپڑوں کی طالب حسینانِ گوکل — چھپا ہے مگر ماہِ تابانِ گوکل
گوالن کا مکھن چرا کر جو بھاگے — وہ لائی شکایت یشودھا کے آگے

کہا تیرا موہن ستاتا بہت ہے
چُراتا تو ہے پر گراتا بہت ہے

کئی ایک پہلے سے گھر میں کھڑی ہیں
یشودھا سے سب باری باری لڑی ہیں

وہیں ناگہاں نند کا لال آیا
قیامت کی چلتا ہوا چال آیا

کہا دور سے جھوٹ کہتی ہیں۔ ماتا
اسی تاک میں یہ تو رہتی ہیں ماتا

شکایات ارزاں، مذاق ان کے سستے
کہیں جاؤں تو روک لیتی ہیں رستے

یہ چھیڑیں مجھے اور دہائی نہ دوں میں
جو ٹھوکر جھٹک کر بلائی نہ دوں میں

جو پنگھٹ پہ ان کو دکھائی نہ دوں میں
جو مرلی بجاتا سنائی نہ دوں میں

جو تعلیم نغمہ سرائی نہ دوں میں
اگر جلوۂ دلربائی نہ دوں میں

تڑپتی ہیں بےچین ہوتی ہیں کیا کیا
مرے غم میں آنسو پروتی ہیں کیا کیا

نہ شب کو ملا ہوں نہ دن کو ملا ہوں
مہینوں کے بعد آج ان کو ملا ہوں

یہ جھوٹی ہیں گر شکوہ برلب ہیں آئیں
مجھے دیکھنے کے لئے سب ہیں آئیں

(خاص)

نفیس خلیلی

خمخانہ جاوید

نہ چمن میں سیرِ بہار ہے نہ خزاں کا دل پہ ملال ہے
مری کشمکش میں ہے زندگی نہ عروج ہے نہ زوال ہے

فلک و زمیں کو خدا کہوں میں بتوں کو سجدے کیا کروں
ترا رازِ حسن نہ فاش ہو مجھے صرف اس کا خیال ہے

گل و لالہ ہیں جو یہ خوبرو۔ ہے نسیمِ باغ جو مشکبو
ہوا منکشف جو کی جستجو کہ یہ تیرا فیضِ جمال ہے

نہ یہاں ہے کشمکش عدو نہ ہے دردِ ہجر کی گفتگو
تمہیں پھر نہ کیوں میں دوں دعائیں کہ یہ میری بزمِ خیال ہے

ترے ظلم کا نہ گلہ کرے ترے غم میں درد سہا کرے
دمِ نزع تک جو وفا کرے تو یہ عاشقی کا کمال ہے

تمہیں کارزارِ حیات میں کبھی لطف و عیش کی منزلیں
مجھے دو گھڑی کو جو چین ہے۔ تو یہ صرف میرا خیال ہے

چلو آج سیرِ چمن کریں وہاں ساتھ مینا کو لے چلیں
رہے شغلِ ساغر و میکشی کہ یہ روزِ عید حلال ہے

(خاص)

انیس مجتبیٰ مینا زبیری علیگ

غزل

(از حضرت جلیل قدوائی - بی اے)

آپ کو میری وفا یاد آئی — خیر ہے آج یہ کیا یاد آئی
پھر مرے سینہ میں اک ہوک اٹھی — پھر مجھے تیری ادا یاد آئی
بے رخی پر تری جب غور کیا — مجھ کو اپنی ہی خطا یاد آئی
خوش ہوا تھا نگہ لطف سے دل — کہ تری طرز جفا یاد آئی
ہاتھ میں ساغر مے آتے ہی — نگہ ہوش ربا یاد آئی
آپ تک جس سے رسائی ہوتی — کوئی ایسی نہ دعا یاد آئی
کیوں کسی سوچ میں بیٹھے ہو جلیل — کیا پھر اس بت کی ادا یاد آئی

جلیل

(خاص)

غزل

چلا ہے بتکدے کو نذر لے کر اپنے ایماں کی — عقیدت دیدنی ہے اے برہمن اک مسلماں کی
جو چاہوں جذب کر لوں بجلیاں انوار امکاں کی — قیامت خیز ہیں گنجائشیں چاک گریباں کی
دکھایا رفتہ رفتہ جذب وحشت نے اثر اپنا — مرے گھر میں پڑی بنیاد کہسار و بیاباں کی
ستارے ٹوٹ کر گرتے رہے انوار کی بارش — رہی شب بھر چراغاں میں فضا گور غریباں کی
سحر بھی فرط غم سے اپنا دامن چاک کر لے گی — تڑپ دیکھی نہ جائے گی مریض شام ہجراں کی
نشیمن کے تصور میں لہو آنکھوں سے بہہ نکلا — قفس میں کھچ گئی تصویر سی صحن گلستاں کی
جدھر جاتا ہوں میں پیش نظر ہے آستاں انکا — مری دانست میں دنیا زمیں ہے کوئے جاناں کی

مجھے پہلو میں ہو جاتا ہے اکثر چاند کا دھوکا
وہ ہنستے ہیں ظفر جب روشنی میں ماہ تاباں کی

سراج الدین ظفر

(خاص)

انسان!

از سید احمد اللہ صاحب قادری نائب ایڈیٹر تاریخ حیدرآباد

یہ سراپا برق یا سیماب ہے ۔۔۔ یا کسی روشن کرن کی تاب ہے
اس کے اندر اک جہان آباد ہے ۔۔۔ جو کبھی خوش اور کبھی ناشاد ہے
گاہ یہ اک محرمِ اسرار ہے ۔۔۔ گہ سراپا مطلع الانوار ہے

الغرض بیحد یہ حیرت خیز ہے
ہر ادا اس کی عجب انگیز ہے

نغمۂ الفت

(۱)

نباتِ حسن میں کوئی نہیں جواب ترا ۔۔۔ کسے نصیب فسونِ جہاں خراب ترا
یہ سطحِ بحر پہ جو خامشی سی طاری ہے
ہوا کی روح میں مستی سی ایک ساری ہے
نباتِ بحر کی خاموش سحر کاری ہے
کہ سیل نغمۂ امواج آج جاری ہے ۔۔۔ مگر ہے اس سے کہیں دلرُبا رُباب ترا

(۲)

قمر کا نور جو پھیلا ہوا ہے آج کی رات ۔۔۔ سکونِ بحر میں محشر بپا ہے آج کی رات
کشش سے نور کی اُٹھتی ہیں دلربا موجیں
شرابِ عشق سے مخمور فتنہ زا موجیں
اسیطرح سے مرے دل کی جانفزا موجیں
تجھے سناتی ہیں الفت کا ماجرا موجیں ۔۔۔ کہ میری روح میں ہیجان سا ہے آجکی رات

(بائرن)

عزیز احمد عزیز کمتعلم جامعہ عثمانیہ

بازارِ حسن از منشی پریم چند

از جناب آغا عبد الحمید صاحب گورنمنٹ کالج لاہور

منشی پریم چند جن کا اصلی نام دھنپت رائے ہے۔ ۱۹۳۷ سمبت بکرمی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد منشی عجائب لال بنارس کے قریب ایک گاؤں پانڈے پور کے رہنے والے تھے۔ سات آٹھ سال فارسی پڑھنے کے بعد آپ نے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی اور بنارس کالجیٹ سکول سے انٹرنس پاس کیا۔ سات برس کی عمر میں والدہ کا۔ پندرہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ نے کچھ عرصہ کے لئے صیغہ تعلیم میں نوکری کر لی تھی۔ آپ کی ادبی زندگی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب آپ نے زمانہ میں مضامین لکھنے شروع کئے ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول پرتیا لکھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں جلوہ ایثار اور ۱۹۱۸ء میں بازارِ حسن لکھا آپ ہندی کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ اور اپنے ناول دونوں زبانوں میں شایع کرتے ہیں۔ چنانچہ سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم اور کایا کلپ آپ کے مشہور ہندی ناول ہیں۔ اس کے علاوہ آپ مختصر افسانے لکھنے میں بھی ماہر ہیں اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اردو زبان کو ان سے بہتر مختصر افسانہ نویس ابتک نصیب نہیں ہوا۔ لیکن ہمیں یہاں صرف ان کے ناول بازار حسن سے بحث ہے۔

بازار حسن ایک طویل ناول ہے جو دو حصّوں میں شایع کیا گیا ہے۔ لیکن باوجود اس طوالت کے اس کا شاید ہی کوئی صفحہ دلچسپی سے خالی ہو مختصراً اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک اچھے خاندان کی لڑکی سمن اپنے دارو غہ کرشن چندر کے رشوت کے مقدمہ میں قید ہو جانے پر ایک غریب تنگ نظر اور تنگدل شخص گجادھر سے بیاہ دی جاتی ہے۔ لڑکی نازک اندام چنچل شریر، متکبر اور نفاست پسند ہے۔ وہ اپنے خاوند کے ہاں جہاں اُسے نہ کھانے کو اچھا ملتا ہے نہ پہننے کو خوش نہیں ہے۔ اس کے مکان کے سامنے ایک طوائف بھولی بھائی رہتی ہے۔ جو بڑے عیش کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اسی محلّہ میں ایک وکیل پدم سنگھ رہتے ہیں۔۔۔۔ جو ایک نہایت ہی شریف رحمدل اور ہمدرد انسان ہیں۔ سمن پدم سنگھ کے گھر جایا کرتی ہے۔ آخر اپنی زندگی سے تنگ آکر اور بھولی بھائی کی ترغیب سے سمن بھی بازار حسن میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور اپنے حسن ملیح کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور ہو جاتی ہے۔ پدم سنگھ کا بھتیجہ سدن سنگھ جو اپنے چچا کے پاس رہنے لگتا ہے سمن پر عاشق ہو جاتا ہے۔ بڑی کوشش کے بعد پدم سنگھ اور بٹھل داس ایک خادم قوم سمن کو اس گناہ کے غار سے نکال لیتے ہیں۔ سدن سنگھ کی نسبت سمن کی چھوٹی بہن شانتا سے ہو جاتی ہے۔ لیکن بارات ان کے گھر جا کر لوٹ آتی ہے۔ کیونکہ انہیں کوئی سمن کی بابت بتا دیتا ہے۔ آخر میں سدن اپنے والدین کی مرضی کے خلاف شانتا سے شادی کر لیتا ہے۔ سمن لڑکیوں کے بورڈنگ کی معلّمہ بن جاتی ہے۔ سدن سنگھ کے گھر لڑکا پیدا ہونے پر اُس کے والدین اُس سے راضی ہو جاتے ہیں۔

کتاب کی تین خصوصیات خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ سیرت نگاری انسانی جذبات و نفسیات کا گہرا مطالعہ اور طرز تحریر۔

اس ناول میں مصنف نے ہمارے تمدّنی اور معاشرتی نقائص کو بہت واضح طور پر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کا موضوع بازار حسن ہے مصنف کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح ایک بھولی بھالی لڑکی ہماری بُری رسموں سے تنگ آکر ایک بازاری عورت کی زندگی کو جو دور سے نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ "مجھے کتنا دھوکا ہوا۔ یہ مقام دور سے کتنا دلفریب کتنا سہانا نظر آتا تھا۔ میں نے اسے پھولوں کا باغ سمجھا۔ لیکن ہے کیا؟ ایک خوفناک بیابان۔ خونخوار درندوں اور زہریلے حشرات سے پُر۔ یہ ندی دور سے چاندنی کی

چادر سی بچھی ہوئی کیسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ پر اس کے اندر کیا ہے بڑے خوفناک دریائی جانوروں کا مسکن یا بدکرداریوں اور بدمعاشوں کا تختۂ مشق اور جائے تفریح"+

بازارِ حسن کے تمام کردار جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ پریم چند کے کردار فسانۂ آزاد کے کرداروں کی طرح مضحک تصویریں یعنی کارٹون نہیں ہیں اور نہ عام ناولوں کے کردار کی طرح کاٹھ کی پتلیاں ہی ہیں۔ بلکہ گوشت و پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں جن کے دکھ کے ساتھ ہمیں ہمدردی ہوتی ہے۔ جن کے غم سے ہم غمگین ہو کر اس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اور جن کی خوشی سے ہمیں راحت ہوتی ہے۔ پریم چند کم درجہ کے افسانہ نویسوں کی طرح ہماری پہچان کے لئے لیبل نہیں لگا دیتے۔ ہمارے ہاں عام ناولوں اور افسانوں میں یہی سب سے بڑا نقص ہے کہ ان میں ہمیں جیتے جاگتے انسان نہیں ملتے اوّل تو مصنف کو سیرت نگاری کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنے کردار پر لیبل لگا دیتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم ان کے کردار کو کسی خاص حرکت یا کسی خاص مجموعۂ الفاظ کی تکرار سے پہچانتے ہیں ہندوستانی ناٹک میں یہ نقص خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں اگر کوئی شخص برا ہے تو اس میں کسی قسم کی خوبی کا نشان بھی نہیں اور اگر کوئی شخص نیک ہے تو وہ اپنی نیکی سے فرشتوں کو مات کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جس طرح نیک سے نیک انسانوں میں بھی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اسیطرح برے سے برے انسان میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے بازارِ حسن پڑھنے کے بعد ہم کو خیال ہوتا ہے کہ ہم سمن۔ پدم سنگھ وٹھل داس اور سدن کو ایک مدت سے جانتے ہیں۔ ہم ان کی خوبیوں اور نقائص سے پورے واقف ہیں اور ہم ان کو اپنے اچھے سے اچھے دوستوں کی نسبت بھی زیادہ جانتے ہیں۔ کیونکہ ان کے جذبات ان کی نفسیاتی کیفیت سے ہم پورے واقف ہیں۔ جس طرح روزمرّہ کی زندگی میں ہم مختلف انسانوں کو چاہے وہ کسی لباس میں ہوں کہیں ہوں اور کسی موضوع پر گفتگو کریں پہچان لیتے ہیں۔ اسی طرح پریم چند کی دنیا کے رہنے والے بھی کسی لیبل کے محتاج نہیں ہیں۔ فارسٹر کی تفریق کے مطابق وہ کاغذ پہ کھنچے ہوئے نقش نہیں ہیں۔ جو ہمیں ایک ہی رخ پیش کرتے ہیں۔ بلکہ جسم و جان والے زندہ انسان ہیں جنھیں ہم ہر روز ملتے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ سیرت نگاری کے لحاظ سے اردو زبان میں پریم چند سے بڑا افسانہ نویس پیدا نہیں ہوا+

پریم چند کی دنیا فسانۂ آزاد کی طرح ایک غل غپاڑے والی اور ہنگامہ خیز دنیا نہیں ہے بلکہ مقابلتاً ایک دیہاتی اور خموش دنیا ہے۔ جہاں غریب کسان تصنع سے پاک جذبات سے متاثر ہوتے ہیں+

بازارِ حسن کے چار دلچسپ کردار سمن، پدم سنگھ، وٹھل داس اور سدن سنگھ ہیں+

سمن، نازک اندام، چنچل، شریر، متکبّر اور نفاست پسند ہے۔ وہ ان صابر عورتوں میں سے نہیں ہے جو اپنے خاوند کے لئے خواہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو سب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ وہ مغرور ہے اور چاہتی ہے کہ جہاں رہے رانی بن کر رہے۔ اس کی طبیعت میں سکون نہیں ہے۔ اور ہر ایک چیز کا اثر جلد قبول کر لیتی ہے۔ بہت ظاہردار ہے اور دنیاوی اعزاز پر فخر کرتی ہے۔ اس لئے اسے اپنے خاوند کا گھر برا لگتا ہے۔ اور وہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ اس کی بجائے اگر اس کی بہن شانتا جو ایک صابر اور حلیم طبع لڑکی ہے ہوتی تو ساری عمر رو رو کر گذار دیتی۔ لیکن اُف نہ کرتی۔ اس کے خیال میں خاوند مجازی خدا ہوتا ہے۔ لیکن سمن اس کی ہم خیال نہیں وہ خاوند کو آرام و عیش کا ایک ذریعہ خیال کرتی ہے۔ اپنی حیات کے المناک انجام کی وہ خود ذمہ دار ہے۔ پریم چند یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہماری سیرت ہی ہماری تقدیر ہوتی ہے یعنی Character is fate گو ان کا اصل مقصد ہمارے معاشرتی نقائص دکھانے کا ہے یعنی یہ کہ اگر ہم میں سے ایک شخص گناہ کر بیٹھتا ہے تو ہماری معاشرت اسے ذلیل تر بنا کر اسے زیادہ نیچے جانے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ وہ گرے ہوؤں کو اٹھانے کی بجائے ٹھوکر مار کر گزر جاتی ہے۔ ہمارے رواج ایسے بیہودہ ہیں کہ ہم ایک گنہگار سے ہمدردی کی بجائے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن وہ شروع سے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہماری سیرت ہی ہماری تقدیر ہے اور ہمیں زندگی میں ہر قسم کے موقعے ملتے ہیں۔ اس وقت گرنا یا سنبھلنا یہ ہماری سیرت پر منحصر ہے۔ اس بات کو وہ صرف سمن ہی کی سرگذشت سے واضح نہیں کرتے بلکہ ناول کے تمام بڑے بڑے کرداروں کی سرگذشت سے بھی اسی بات پر زور دیتے ہیں۔ وہ ہارڈی کی طرح ایسے مہیب اور اٹل موقع پیدا نہیں کرتے جن سے نکلنا دشوار ہو+

جیسے کہا جا چکا ہے سمن کسی چیز کا اثر جلد قبول کر لیتی ہے۔ گجادھر کے وعظ سے وہ نیک ہو گئی ہے اور رامائن پڑھنے لگ گئی ہے۔ لیکن جب دیکھتی ہے کہ بھولی بھائی کی عزت صرف عیاش لوگ ہی نہیں کرتے بلکہ مذہب

بچاری تک اسکے دیوانے ہیں تو وہ فوراً خیال کرتی ہے یہ بہت اچھی زندگی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:-

"سمن نے گھر آکر راماین بستہ میں باندھ کر رکھ دی۔ گنگا اشنان کرنا چھوڑ دیا کشتیِ لنگر شکستہ کی طرح اس کی زندگی پھر ڈانواڈول ہوگئی"۔ اس مختصر سے فقرے میں مصنف نے اس کی سیرت اور اس کی نفسیاتی کیفیت خوب واضح کردی ہے +

سمن جتنی جلد برائی کا اثر قبول کرتی ہے۔ اتنی ہی جلدی اس سے متنفر بھی ہوجاتی ہے۔ زود پشیمان سمن کی نسبت ایک اور جگہ جہاں وہ گناہ کے غار میں بازار حسن سے نکل رہی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"تھوڑی دیر کے بعد سمن اوپر سے اُتری وہ صرف ایک سادہ سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ اُس کا چہرہ اُداس تھا۔ لیکن اس لئے نہیں کہ سامان عیش اس سے چھوٹ رہا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس آتشیں غار میں گری کیوں تھی۔ اس اداسی میں حسرت نہیں ہمت تھی یہ کسی شرابی کے چہرہ پر چھانے والی زردی نہ تھی۔ یہ وہ زردی تھی جو شادی کے وقت دولہا اور دلہن کے چہرے پر چھا جاتی ہے۔ جس میں ساری زندگی کے نیک ارادے اور آنے والی ذمہ داریوں کی فکریں پوشیدہ رہتی ہیں"۔

پدم سنگھ ایک نہایت شریف اور ہمدرد انسان ہیں لیکن ساتھ ہی کمزور طبع اور بہت سریع الحس شخص۔ جب پارک میں سمن اُن سے ملتی ہے اور اُن سے شکایت کرتی ہے کہ میری تباہی کا نتیجہ تم ہو تو ان پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ قابل مصنف ان کی سیرت کو ان کی کمزور طبیعت کو خوب واضح کرتا ہے +

یہ کہہ کر سمن چلی گئی۔ شرما جی کچھ دیر تک تو بیٹھے رہے پھر بنچ پر لیٹ گئے۔ سمن کا ایک ایک لفظ ان کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ وہ اس وقت تک تخیلات میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ اگر کوئی آکر ان کے سامنے کھڑا ہوجاتا تو بھی انہیں خبر نہ ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کلیجہ پر کوئی چوٹ لگ گئی ہے۔ وہ سریع الحس آدمی تھے۔ سبھدرا اگر شکر رنجی میں کوئی لگتی ہوئی بات کہہ دیتی تو انہیں ہفتوں اختلاج قلب ہوتا رہتا تھا۔ انہیں اپنی طرز زندگی پر اپنے اطوار پر اپنے خیالات پر فرض شناسی پر غرور تھا۔ آج وہ غرور ریزہ ریزہ ہوگیا۔ جس الزام کو انہوں نے جگہ دھرادھر ٹھل دا اس کے سر منڈھ کر اپنے دل کو تسکین دی تھی۔ وہی الزام آج سو گنے بوجھ کے ساتھ ان کے سر پر لد گیا تھا۔ اب سر ہلانے کی بھی جگہ نہ تھی۔ وہ اس بار گراں کے نیچے دبے جاتے تھے۔ تخیلات نے تصوّر کو جگہ دی۔ تصوّر نے واہمہ پیدا کیا۔ کہیں بہت دور سے آواز آئی "وہ جلسہ نہ ہوتا تو آج میں اپنے جھونپڑے میں مگن ہوتی" +

اتنے میں ہوا چلی پتیاں ہلنے لگیں۔ گویا کالے کالے درخت سر ہلا ہلا کر کہتے تھے "سمن کی یہ درگت تم نے کی ہے" +

شرما جی گھبرا کر اُٹھے۔ سامنے گرجا گھر کی اونچی چوٹی تھی۔ اس میں گھنٹہ بج رہا تھا۔ گھنٹہ کی سریلی صدائیں کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ "سم - نی کی یہ درگت تم نے کی ہے"۔ اُنہوں نے خیالات کو پھر سمیٹ کر آگے قدم بڑھایا آسمان پر نگاہ پڑی سیاہ کاغذ پر سفید روشن چمکتے ہوئے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "سمن کی یہ درگت تم نے کی" +

جیسے کسی چٹیل میدان میں سامنے سے اُمڈی ہوئی کالی گھٹا کو دیکھ کر مسافر دور کے اکیلے درخت کی طرف قدم بڑھائے ہوئے چلتا ہے۔ اسی طرح شرما جی لمبے لمبے قدم اُٹھائے ہوئے آبادی کی طرف چلے۔ لیکن تصوّرات کو کہاں چھوڑتے۔ سمن ان کے پیچھے پیچھے آتی تھی۔ کبھی سامنے سے آکر راستہ روک لیتی۔ اور کہتی "میری یہ درگت تم نے کی ہے"۔ کبھی اس پہلو سے کبھی اُس پہلو سے سامنے نکل آتی۔ اور یہی الفاظ دہراتی۔ شرما جی چپکے چلے آتے تھے۔ جیسے کوئی جگر کا مضبوط آدمی پیچھا کرنے والے کتوں کے سامنے دوڑتا نہیں ڈانٹتا ہوا قدم آگے بڑھاتا ہے۔ بارے بہ ہزار مشکل یہ راستہ طے ہوا۔ شرما جی گھر آئے۔ کمرے میں منہ ڈھانپ کر سو رہے۔ سبھدرا نے کھانے کے لئے اصرار کیا تو اُسے سر درد کا بہانہ کرکے ٹالا۔ ساری رات سمن اُن کے دل میں بیٹھی ہوئی اُنہیں کوستی رہی۔ "تم کو اپنے علم و عقل پر ناز ہے۔ لیکن تم پھونس کے جھونپڑوں کے پاس بارود کی ہوائیاں اور پھلجھڑیاں چھوڑتے ہو۔ اگر تم اپنی دولت پھونکنا چاہتے ہو۔ تو جاکر آبادی سے دور کسی میدان میں پھونکو۔ غریب دکھیاروں کا جگر کیوں جلاتے ہو انہیں کیوں اجاڑتے ہو +

اگر تمہارے پاس پیسے ہیں تو شوق سے مٹھائیاں کھاؤ۔ لیکن دیکھو تمہارے سامنے ایک بیکس یتیم کھڑا ہے۔ اس کی نگاہوں کا خیال رکھو۔ اسے للچاؤ مت۔ اسے دے نہیں سکتے تو اس کی آنکھیں بچا جاؤ +

علی الصباح شرما جی تجمل داس کے مکان پر جا پہنچے +

ان کی جگہ اگر تجمل داس ہوتا تو ہرگز کچھ خیال نہ کرتا۔ بلکہ کوئی نہ کوئی عملی طریقہ سوچتا۔ تجمل داس "قوم کا خادم اور تمدنی نقائص کا دشمن تھا۔ فراخدلی اور کم ظرفی کا ایک عجیب مجموعہ تھا۔ اس کے وسیع دل میں ساری دنیا کے لئے ہمدردی تھی مگر اپنے مخالف کے لئے ذرا بھی جگہ نہ تھی +

ساتھ ساتھ ہی مختلف کردار کی سیرت کا ارتقا بھی بڑی نفاست سے دکھاتے ہیں۔ سدن سنگھ جو ایک ضدی اور اکھڑ نوجوان ہے پہلے سمن اور پھر شانتا سے محبت کرکے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے +

پریم چند ایک فلسفی ہیں جو زندگی کے ہر ایک پہلو کو غور سے دیکھتے ہیں اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں۔ ہر ایک چیز خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو ان کے مشاہدے سے نہیں بچتی۔ وہ انسانی کمزوریوں کو ایک فلسفی کی دریا دلی سے دیکھتے ہیں۔ وہ ان جذبات سے بہہ جانے والے انسانوں میں نہیں ہیں جو کسی بری چیز کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا دوسرا رخ دیکھے بغیر یہ خیال کر لیتے ہیں کہ اس میں کچھ اچھائی نہیں یا ایک چیز دیکھ کر بالکل دیوانے ہو جاتے ہیں۔ اور اسے ہر ایک برائی سے مبرا خیال کر لیتے ہیں۔ وہ ایک ہی بات کی نسبت اپنے دو کرداروں سے اس کے دونوں رخوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا دماغ کچھ یونانی طرز کا ہے اور ان پر میتھو آرنلڈ کا فقرہ جو اس نے سفوکلیز کی نسبت کہا تھا He saw life steadily and saw it whole بالکل پورا اترتا ہے +

زندگی کے متعلق ان کا نظریہ ایک تندرست دماغ کا نظریہ ہے۔ وہ قنوطی نہیں ہیں۔ لیکن کہیں کہیں کلبی یعنی Cynical جھلک پائی جاتی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں دنیا میں آکر ایشور بھی اہل دنیا کی پیروی کرتے ہیں۔

وہ کسی قوم مذہب یا فرقے کی طرفداری نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اپنے کسی کیریکٹر کی کسی ناشائستہ بات کو کوئی اور رنگ دے کر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن وہ غریبوں اور دیہات کے لوگوں سے بہت ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کا جی شہر سے باہر دیہات کی صاف و پاک ہوا میں لگتا ہے۔ جہاں کے لوگ سادہ اور تصنع سے پاک ہیں۔ غریبوں پر ظلم ہوتا دیکھ کر ان کا دل دکھتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی ہر ایک چیز کو پسند کرتے ہیں۔ وہ یورپ زدہ ہندوستانیوں کو پسند نہیں کرتے۔ انہیں اپنے ملک اور اپنی دیسی زبانوں سے محبت ہے +

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ بازار حسن کے مصنف کردار کی نسبت ہمارے معاشرتی اصول اور رسم و رواج میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک ڈرامیٹک سچوایشن پیدا کرتے وقت ان کو کسی سیرت پر روشنی ڈالنے کی بجائے کسی معاشرتی اصول یا کسی رواج کی بیہودگی دکھانی مقصود ہوتی ہے تو چند انسانوں کو رسم و رواج کے جال میں پھنسا کر وہ اس گتھی کو سلجھانے میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:-

ہماری عادتیں کتنی ہی استوار کیوں نہ ہوں۔ ان پر صحبت کا اثر ہونا ضروری ہے۔ سمن اپنی ہمسایوں کو جتنی تعلیم دیتی تھی اس سے بہت زیادہ خود حاصل کرتی تھی۔ ہم اپنی خانگی زندگی کی طرف سے کتنے بے فکر ہیں۔ اس کے لئے کسی تیاری یا تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ گڑیاں کھیلنے والی لڑکی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے والی دوشیزہ۔ گھر کی مالک بننے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ اکثر... بچھڑے کے کندھے پر بھاری جوار کھدیا جاتا ہے ایسی حالت میں اگر ہماری معاشرتی زندگی مسرت انگیز نہ ہو تو کچھ تعجب نہیں جن عورتوں کے ساتھ سمن اٹھتی بیٹھتی تھی وہ اپنے شوہروں کو حظ نفس کا ایک آلہ تصور کرتی تھیں۔ شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اچھے اچھے گہنوں سے آراستہ کرے۔ اچھے کھانے کھلائے۔ اگر اس میں یہ قابلیت نہیں تو وہ نکھٹو ہے اپاہج ہے۔ اسے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ عزت یا محبت کا مستحق نہیں۔ سمن نے بھی یہی تعلیم حاصل کی اور گجادھر پرشاد اب اس سے ناراض ہوتے تو انہیں فرائض شوہری پر ایک طول طویل تقریر سننی پڑتی +

پریم چند نے جذبات انسانی اور نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اس لحاظ سے وہ واقعی "فطرت نگار" ہیں اور کسی کیریکٹر کے جذبات یا اس کی نفسیاتی کیفیت کمال اختصار اور سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مبالغہ اس میں ذرا بھی نہیں ہے۔ ایک مصور جب کسی انسان یا کسی منظر قدرت کی تصویر بنانے لگتا ہے تو وہ انسانی چہرہ کا ہر ایک خدوخال یا درخت کا ایک ایک پتا نہیں بناتا۔ بلکہ صرف وہی خط کھینچتا ہے جو اس کے مطلب کے ہیں۔ مصور کا کمال یہی ہے کہ اول تو وہ وہی خط کھینچے جو پوری طرح سب کیفیت ظاہر کریں اور دوسرے تھوڑے سے خطوں میں بہت کچھ بتا جائے کیونکہ فالتو خط کھینچنے سے نہ صرف وقت ضائع ہوتا ہے۔ بلکہ تصویر کی قدر و قیمت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اسیطرح ایک افسانہ نویس اپنے کردار کی زندگی سے چند

ایسے اہم واقعات لے لیتا ہے جن سے ان کی سیرت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے ۔ ایک اچھے افسانہ نویس کی طرح پریم چند بھی ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جن سے اُن کے کردار کے جذبات اور اُن کی نفسیاتی کیفیت ہم پر پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے ۔ بعض موقعوں پر وہ چند ایک فقروں میں ایک پورا منظر بیان کر دیتے ہیں جسے بیان کرنے کے لئے ایک معمولی افسانہ نویس شاید کئی صفحے سیاہ کرتا ہے +

پریم چند کا طرز تحریر بہت سادہ اور عام فہم ہونے کے بعد بہت زوردار ہے اور اس میں بلا کی آمد اور روانی معلوم ہوتی ہے ۔ وقت کی ضرورت کے ساتھ وہ لطیف سے لطیف جذبات اور گہرے سے گہرے نفسیاتی حالات کو ایک جوش سے ادا کرنے کے لئے ایک بلندی پر پہنچ جاتا ہے ۔ لطیف تشبیہ و استعارات اس میں ایک خوبصورتی پیدا کر دیتے ہیں کبھی کبھی پریم چند اس ڈر سے کہ ان کے پڑھنے والے انہیں فارسی سے نابلد نہ جانیں ۔ فارسی الفاظ بلا ضرورت استعمال کرنے لگ جاتے ہیں ۔ لیکن نفس مضمون میں اتنے محو ہوتے ہیں کہ جلد ہی بھول جاتے اور اپنی پرانی طرز پر لکھنا شروع کر دیتے ہیں ۔ ان کی تشبیہ اور استعارات کے ایک دو نمونے دیئے جاتے ہیں :-

" غم اور افسوس کی ایک موج بادل سے نکلنے والی دھوپ کی طرح اُس کے دل پر آتی ہوئی معلوم ہوتی "

" جیسے بالو پر تڑپتی مچھلی ندی میں پہنچ کر خوش فعلیاں کرنے لگتی ہے اسیطرح سمن بھی سبھدرا کے دریائے محبت میں اپنی مصیبتوں کو بھول کر محظوظ ہونے لگی "

" غرور جیسے افلاس سے دور بھاگتا ہے اسی طرح اس کا دل گھر سے دور بھاگتا تھا "

فطرتِ انسان کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" مصیبت میں انسان کے حسیات تیز ہو جاتے ہیں ۔ اس وقت بے مروتی ظلم معلوم ہوتی ہے اور تشفی احسانِ بیکراں ۔ سمن کو شرما جی سے ایسی اُمید نہ تھی ۔ اس خود غرضی کے ساتھ جو ایامِ مصیبت کے لئے مخصوص ہے ۔ اس نے انہیں بد باطن خود پرور اور بے رحم قرار دیا "

اگر ناول جیسا کہ میتھیو آرنلڈ نے کہا ہے ہماری زندگی کی تنقید ہوتی ہے ۔ تو پریم چند زندگی کے ایک بڑے ماہر نقاد ہیں ۔ انسانی زندگی کا مطالعہ وہ بہت غور سے کرتے ہیں ۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز آن کی عمیق اور ڈھونڈنے والی نظروں سے نہیں بچتی ۔ امیر و غریب ۔ نیک و بد ۔ شاہ و گدا سب کو اسی دلچسپی اور اسی غیر جانبداری سے دیکھتے ہیں جو ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔ انہیں ہمارے دماغی عدم توازن کی شکایت ہے ۔ ہماری کئی باتیں انہیں اٹکل بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں ۔ مثلاً سدن کی بارات کو دو تین فقروں میں بیان کر کے ایک مضحکہ خیز بات کو واضح کرتے ہیں +

" سدن کی شادی کا روز سعید آ پہنچا ۔ چنار سے برات امولا چلی ۔ اس کی تفصیل لکھنی تضیع اوقات ہے ۔ جیسی اور براتیں ہوتی ہیں ویسی یہ بھی تھی ۔ بجز شاہانہ تکلف اور درد انگیز پریشان حالی کا ایک عجیب اجتماع ۔ پالکیوں پر زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی ۔ لیکن کہاروں کی وردیاں بوسیدہ اور کرم خوردہ ۔ گنگا جمنی کے عصا اور علم نیم برہنہ مزدوروں کے ہاتھ میں "

اسی طرح ایک دوسری جگہ برات کے پہنچنے کی کیفیت لکھتے ہیں :-

" دوار پوجا ہوئی ۔ اماناتھ کندھے پر ایک انگوچھا ڈالے براتیوں کا خیر مقدم کر رہے تھے ۔ گاؤں کی عورتیں سائبان میں کھڑی منگلاچرن گاتی تھیں ۔ براتیوں کی نظر انتخاب بہترین حسن کی تلاش میں سرگرم تھی ادھر سے بھی آنکھوں کی کٹاریں براتیوں کا ستھراؤ کئے دیتی تھیں ۔ جانوی اُداس تھی وہ سوچ رہی تھی کہ یہ دولہا میری چندری کو ملتا تو اچھا ہوتا ۔ سبھاگی یہ جاننے کے لئے بیقرار تھی کہ سمدھی کون ہے ۔ کرشن چندر سدن کے پاؤں دھو رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے کہ یہ کیا بیہودہ رواج ہے سدن سنگھ دھیان سے دیکھ رہے تھے کہ تھال میں کتنے روپے ہیں "

بظاہر ان باتوں کا لکھنا نہایت آسان معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ ہم انہیں روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں ۔ لیکن ایک بڑا مصنف ہی اسے اپنی تصنیف میں بیان کرتا ہے ۔ ان تھوڑے سے فقروں میں برات کی کیسی مزیدار تصویر کھینچ دی ہے +

بازارِ حسن ظرافت اور درد سے خالی نہیں ہے ۔ اس کی ظرافت بڑی لطیف اور اعلیٰ قسم کی ہے ۔ عام ناولوں کا سا پھکڑ پن بازارِ حسن میں نہیں ہے ۔ کتاب پڑھتے وقت ہم کھلکھلا کر نہیں ہنستے صرف مسکرا دیتے ہیں ۔ ایک خاموش سی ہنسی ہمارے ہونٹوں پر نمودار ہوتی ہے ۔ مثلاً ایک جگہ ایک کیریکٹر کا تعارف کراتے وقت لکھتے ہیں :-

" گڑھ موتے میں ایسی خوشحال بیویاں بھی تھیں جن کا دل فراخ تھا ۔

جو۔۔۔۔انسانی کمزوریوں کو فلسفیانہ نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ ان پر اس تلاطم کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ ظہورن ایک بھاری بھرکم عورت تھی۔ پڑوس والے اسے توپ یا موٹر کار کہا کرتے تھے۔ وہ لکڑی، اوپلے، ہانڈیاں اور مٹی کا تیل بیچتی تھی۔ اس کی دوکان پر ایک خاص قسم کی عورتوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ رات دن ایک خاص قسم کے چرچے ہوا کرتے تھے۔ وہاں جیوری نے سمن کے حق میں فیصلہ دیا۔ کون بیڑہ ہے جسے کبھی ہوا نہیں لگی۔ بچہ یا اس لٹھ گنوار کے پلے پڑی تھی۔ پہننے اور اوڑھنے کو ترستی تھی۔ اب کچھ دن تو چین سے کٹیں گے۔ صورت شکل اللہ اسی لئے دیتا ہے اور کاہے کے لئے۔ موتی کی مالا سور کے گلے میں کیا سوبھا دیگی"۔

اسی طرح جب پدم سنگھ اور بٹھل داس ڈاکٹر شیاما چرن سے ووٹ مانگنے کے لئے جاتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں:-

شیاما چرن۔ آپ کی تجویز سے مجھے کامل ہمدردی ہے۔ لیکن آپکو معلوم ہے کہ میں گورنمنٹ کا نامزد ممبر ہوں۔ جب تک یہ تحقیق نہ ہو جائے کہ گورنمنٹ اس تجویز کو پسند کرتی ہے یا نہیں اس وقت تک میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

بٹھل داس نے بے تمیزانہ انداز سے کہا۔ جب ممبر ہونے سے آپ کے خیالات کی آزادی میں فرق آتا ہے تو میرے خیال میں آپ کو استعفا دیدینا چاہیئے۔ تینوں آدمیوں نے بٹھل داس کی طرف ملامت انگیز نظروں سے دیکھا۔

بازار حسن کا ترتیب قصہ یعنی پلاٹ بہت مربوط و منظم نہیں ہے۔ اس میں امراؤ جان ادا والا حسن ترتیب نہیں پایا جاتا۔ اس میں دو نقص ہیں ایک تو یہ کہ ہمیں پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف ایک خاص نتیجے کو سامنے رکھ کر اس تک پہنچنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ کتاب کے تمام واقعات ایک دوسرے کے بعد اس طرح آتے ہیں گویا ایک کا دوسرے پر انحصار ہے۔ منطق کے اصول پر ایک زنجیر کی صورت میں پیوستہ ہیں۔ اگر ایک کڑی نکال لی جائے تو باقی کے تمام واقعات گر جائیں۔ حالانکہ ہماری زندگی میں واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ اتنا نزدیکی تعلق نہیں ہوتا۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ ناول کے تمام کردار کو کسی نہ کسی ٹھکانے لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ایک قسم کا حسرت انگیز خاتمہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ کسی افسانہ کا حسرت انگیز انجام اس کا درجہ کم کر دیتا ہے۔ یا جیسا کہ عام خیال ہے الم انگیز انجام والا بذات خود زیادہ artistic ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہ جس قسم کا قصہ ہو۔ جس قسم کے کردار ہوں۔ اور جیسے واقعات اس میں رونما ہوئے ہوں۔ اسیطرح کا انجام بھی ہونا چاہیئے۔ اسے خواہ مخواہ کوشش کر کے مسرت انگیز یا المناک نہ بنانا چاہیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں اس قسم کے واقعات کا انجام اتنا مسرت انگیز نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ بناوٹ کے توازن میں ایک قسم کا خلل آگیا ہے۔ قصہ کے زیادہ واقعات حصہ اول میں انجام پاتے ہیں اور دوسرے حصے میں زیادہ طور پر ان کے نتائج بیان کئے گئے ہیں۔ یا ان کی تشریح کی گئی ہے۔ فن قصہ نویسی کی رو سے واقعات کو کتاب کے اخیر میں زیادہ سرعت سے انجام پانا چاہیئے۔

باوجود ان سب باتوں کے بازار حسن ایک زبردست ناول ہے۔ اور اردو میں اس پائے کے بہت کم ناول ہیں۔ کسی جگہ کے رہنے والوں کی ایسی سچی جیتی جاگتی اور جاندار تصویر ہمیں بہت کم ملتی ہے۔ سیرت نگاری کا اس میں کمال دکھایا گیا ہے۔ مطالعہ فطرت یا نفسیات انسانی اور زندگی کے نشیب و فراز ہماری زندگی کی اچھی اور بری باتیں ایک پر اثر اور پر جوش طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔

لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ پریم چند نے بازار حسن لکھ کر اس سے آدھا خراج تحسین بھی وصول نہیں کیا۔ جس کے وہ حقدار ہیں۔

(خاص)

لگا تا رہتا۔ وہ اسی غور و فکر میں منہمک تھا کہ اُس کے پاس سے ایک بہت فربہ انسان گزرا۔ جسے دیکھ کر اُسے اپنے پرانے بزرگوں کی ان نصائح کی ضرورت کا احساس ہوا جن میں کھانے اور پینے کے متعلق اعتدال کا ذکر تھا۔ یہ شخص ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور خدمتگار کو بلا کر چائے کے لئے کہا۔ اور ساتھ ہی بہت سی مٹھائی بھی منگوائی۔ خدمتگار سب کچھ لیکر بھاگا بھاگا آرہا تھا۔ کہ اس فربہ آدمی نے انگڑائی لی اور ہاتھ اس طرح بے تحاشا پھیلائے کہ چائے والی طشتری سے ٹکرائے۔ چائے والی طشتری سے اُلٹ کر اُس کے سر پر آپڑی اور گرم اُبلتی ہوئی چائے اُس کی گردن میں کوٹ اور قمیص کے درمیان آگری اور لگا وہ فیل پا شخص ناچنے کودنے۔ یہ بدتمیزی تو خیر اسے شاق گذر رہی تھی ہمارے سیاح نے جو مڑکر دیکھا تو اسے اپنے پاس ہی ایک جوڑا نظر آیا۔ بڑا فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھا اور نہایت مہذب افراد پر مشتمل تھا۔ یہ دونوں مرد اور عورت بھی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور یکایک دونوں کے دونوں نے سر پیچھے پھینک دیا اور منہ کھول کر عجب بے معنی آوازیں نکالنے لگے۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے۔ یہاں۔ وہاں۔ ہر کہیں۔ ہر کوئی اسی قسم کی حرکات کرنے لگا۔ تمام کمرہ اس حیوانی چیخ و پکار سے گونجنے لگا۔ سب لوگ منہ کھول کر بھونک سے رہے تھے۔ جو مہذب آدمی کے منہ سے نہایت کروہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نقشہ دیر تک سب پر قایم رہا اور ہمارا سیاح اس وحشتناک منظر سے ایسا گھبرایا کہ کانوں میں اُنگلیاں دے کر بھاگ اُٹھا اور سیدھا چڑیا گھر آکر دم لیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ دنیا میں انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ محض لباس اور ظاہری دکھاوا ہے۔ ورنہ مہذب ترین انسان حقیقت میں وہی وحشی حیوان ہے اور کچھ نہیں۔ ان خیالات نے اسے دنیا سے متنفر کر دیا۔ اور وہ فوراً اپنے ستارے مشتری میں واپس چلا گیا۔ ہمارے سیاح نے پہلی اور آخری مرتبہ قہقہے کا مشاہدہ کیا۔

ہمارے فاضل سیاح نے انسان کی بہیمیت کے متعلق جو رائے قایم کی۔ غالباً وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن قہقہہ یقینی طور پر اس رائے کی صداقت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہی ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو حیوان سے ممیز کرتا ہے۔

مخلوقاتِ عالم میں انسان ہی جی کھول کر۔ پیٹ بھر کر ہنس سکتا ہے۔ قہقہے لگا سکتا ہے۔ یہی نہیں کہ انسان کی تعریف ہنسنے والا حیوان ہو سکتی ہے بلکہ برگساں کے قول کے مطابق انسان ہی فقط وہ حیوان ہے جس پر ہنسا جا سکتا ہے۔ انسان ہی مَن ضحک مُضحِک کا صحیح موضوع ہے۔ برگساں کا اگر یہ قول پوری طرح تسلیم نہ کیا جا سکے تو بھی ظاہر ہے کہ ہنسی کا سب سے بڑا موضوع انسان ہی ہے۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب شریر لڑکے کسی کتے کی دُم سے ٹین کا ڈبہ باندھ کر اس میں پٹاخے بھر کر چھوڑ دیتے ہیں تو کتے کی سراسیمگی پر جو ہنسی اور قہقہے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ محض یہ ہوتی ہے۔ کہ دیکھنے والے کتے کو کتا نہیں سمجھتے۔ بے شعور تصور نہیں کرتے۔ بلکہ یوں تصور کرتے ہیں کہ اس میں انسانی شعور اور تمیز کا سا مادہ موجود ہے۔ مگر اُس کے باوجود اس کو کام میں نہیں لاتا۔ اور خواہ مخواہ ایک بے ضرر آواز سے سراسیمہ و حیران ہو رہا ہے۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ اگر کتے کو اس شرارت کے دوران میں کوئی ضرر پہنچ جائے۔ زخمی ہو جائے یا آگ لگ جائے تو ہنسی اور قہقہے ختم ہو جاتے ہیں۔ کتے کی سراسیمگی اور حیرانی مضحک نہیں رہتی۔ کیوں؟ —— اس لئے کہ اب ہماری کتے سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ ہمدردی ہنسی کے منافی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہنسنے والے بیدرد ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم ہنس رہے ہوتے ہیں۔ اُس وقت ہمدردی کا، بلکہ ہر قسم کا جذبہ مفقود ہوتا ہے۔ ہنسی کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہے۔ یہ ایک بے الفاظ تنقید ہے۔ جو ہم انسانی عادات و افعال پر کرتے ہیں۔

غالباً ظرافت کی سب سے بڑی مدافعت بھی یہی ہے۔ کہ یہ تنقید ہے اس سے حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ظاہری پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹ جاتے ہیں۔ نگاہیں تیز ہو جاتی ہیں اور تعمق کی گہرائیوں کو سطح پر اُبھار لاتی ہیں۔ انسان کی ظاہرداریاں۔ بناوٹ اور تصنع۔ سب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ اور ہر چیز اپنی اصلی صورت میں عریاں نظر آنے لگتی ہے۔ یعنی ہنسی میں بہت سے اہم امور تصفیہ پا جاتے ہیں۔

....

محمد دین تاثیر

"موت"

از جناب قاضی سید مختار حسن صاحب بی - اے - علیگ

میں شمعِ سحر کی طرح دم واپسیں کھینچ رہا تھا۔ دنیا کی وسعت میری نظروں میں سمٹ کر آ رہی تھی۔ عمر رفتہ کے واقعات ایک ایک کرکے میری نظروں کے سامنے سینما کے فلم کی طرح گذر رہے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ زمین۔ آسمان۔ چاند۔ ستارے۔ کہکشاں میری طرف محبت سے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور ان دلکش مناظر میں جذب رہنے سے میری روح بالیدہ ہوتی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری روح کے مقاصد اس سے بالاتر ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مناظر سے دلچسپی محض ان کی وجہ سے نہ تھی۔ جب ان کے اثر کے ساتھ ساتھ نئے حقایق میری ہستی پر منکشف تو مناظر فطرت سے اثر پذیری کا درجہ ختم ہو گیا۔ شباب کی جرأت رندانہ نے میرے سامنے تابش حیات کی سحرکاریاں جذب کرسکنے کے لئے فردوس جمالیت کا تصور پیش کیا اور میری خیالی دنیا جو کبھی واقعیت میں نمودار ہونے والی تھی حسین بن کر میرے سامنے آئی۔ لیکن اس اثنا میں واقعات مجھے اپنے تصورات کی تابناکیوں کو تاریک دیکھنے کے لئے مجبور کرتے رہے +

بالآخر ایک وقت آیا جب میرے ماحول نے میرے لئے ایسا اتفاق مہیا کیا کہ میں ایک انسانی وجود سے محبت کرسکوں اور بتدریج دلچسپی شروع ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی پہلے سے زیادہ دلکش اور میرے تصورات پہلے سے زیادہ رنگین ہو گئے۔ میرے حسن کار تخیل نے ہر چیز میں نئی خوبصورتی سے اس کی تصویر میرے سامنے پیش کی۔ میری دنیا محبت کی دنیا تھی میری زندگی میں شعریت پیدا ہو گئی تھی۔ جب ہوائیں تھم جاتیں۔ آبادیوں کا شور خاموشی میں بدل جاتا۔ چاند کی دودھ ایسی کرنیں جھاڑیوں۔ پھولوں۔ پتیوں اور پانی کی سطح پر ... سے بکھر جاتیں۔ میں ندی کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھا ہوا اُس سے محبت کا جواب محبت میں پانے کی تمنا کو کامیاب دیکھنے کا تصور کرتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ ہم دونوں غم واندوہ کی دنیا کو یکسر بدل کر اس کو اپنی مرضی کے مطابق از سر نو تعمیر کرسکیں گے۔ مگر زندگی کا یہ دور ختم ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے محبت نہ کی۔ اور اس احساس نے میری زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا +

دنیا کی کسی چیز میں میرے لئے جاذبیت نہ رہی۔ زندگی کے تمام تعلقات اور تمام پہلوؤں کے متعلق نظریات یکسر بدل گئے۔ اس مایوسی کے بعد کوئی چیز میرے لئے اپنی جگہ پر استوار مستقل اور قابل یقین نہ رہی۔ محبت کو اضمحلالِ دماغی سے تعبیر کرنے لگا۔ اور دوسروں سے توقعات وابستہ رکھنے کو جہل و نادانی سے مجھے نظام کائنات میں شیطانی قوتیں کارفرما نظر آئے۔ اور محسوس ہوا کہ کوئی اخلاقی جد وجہد اور روحانی خیر و برکت بارآور نہیں ہوسکتی۔ کامیابی ایک مہمل تصور ہے۔ وقتی اتفاقات کو لوگ اپنی تنگ نگاہی کے باعث کامیابی اور ناکامی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ نظام اخلاق کو نظام کائنات میں جھونکنے کی کوشش فطرت انسانی کی کمزوری اور مصلحت کی بنا پر ہے۔ خیر و شر کا تصور تقویت کے مرادف ہے۔ توقعات کی خوش فریبی ایسی جہالت اور نادانی کی طرف لے جاتی ہے۔ جس میں خوشگواری تو موجود ہے۔ مگر حقیقت کا پتہ نہیں . . . .

غرض کہ ان ہی تصورات کی کشمکش میں وقت گذر رہا تھا۔ دنیا کی وہ حقیقت جو مجھ پر آشکارا ہوئی تھی۔ میرے لئے سوہان روح تھی۔ ایک عرصہ تک اس کاوش میں مبتلا رہنے کے بعد موت کا سوال ذہن میں آیا جو اپنے ساتھ ہی یہ احساس بھی لایا کہ سوسائٹی میں خودکشی کو جرم قرار دینے کی علت صرف انسانی بزدلی اور لذائذ دنیاوی سے محروم ہو جانے کا خوف ہے۔ ورنہ زندگی میں اتنی بے معنویت پیدا ہو جانے کے بعد اپنے ارادہ اور اختیار سے زندگی کا خاتمہ کر دینا کسی فعل مستحسن سے کم نہیں +

ایک عرصہ ان ہی خیالات کی کشمکش میں گزر گیا۔ اور مجھے سکون نصیب نہ ہوا۔ میں نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور اپنے نظریۂ حیات پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے اپنے خیالات کی وقعت میری نظروں سے گر گئی۔ کچھ عرصہ اپنے خیالات سے نفرت پیدا ہونے والے اثرات کے تحت

خاموشی میں گذر گیا۔ اس کے بعد مجھے یقین پیدا ہوا کہ اگر انسان اپنے متاع انانیت کے تحفظ کے لئے تمام قوائے کائنات کے مقابلہ کا جذبہ اور جوش لے کر برسرعمل آئے تو دنیا کی تمام قوتیں ملکر بھی اس کو پستی کی طرف کھینچنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے اپنے ارتقاء ذہنی کے اس دور میں یکطرفہ اخلاق اور فرائض و حقوق کا معتقد رہا۔ اور میری زندگی کم و بیش اس اصول کے مطابق رہی کہ اپنی ذات سے مطالبہ حقوق و ادائیگی فرائض میں جتنا مبالغہ کروں اسی حد تک دوسروں سے توقعات رکھنے کو ناروا، ضعف فطرت اور پستی اخلاق سے تعبیر کرکے شبہ دور کرنے کی کوشش کرتا رہوں +

اب جو مہاستدی، عزائم، نصب العین، حیات اور حصول کامرانی کی تمنائیں میرے لئے بامعنی ہوگئی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی کے ایام رفتہ کا محاسبہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر اپنے مقاصد حیات سے بیگانہ رہا۔ یہ خیال آتے ہی جن مشاغل میں میرا وقت غیر دلچسپ اور غیر اختیاری طریقہ پر صرف ہوتا تھا۔ وہ میرے لئے دلچسپ ہوگئے۔ وہ مشاغل حیات جو پہلے ایک مضمحل القواء اور ماؤف الذہن انسان کے صرف اوقات کا ذریعہ ہونے کے ضامن تھے۔ اب ایک طالب علم کی منظمانہ حیات مرتقی کے اجارہ دار ٹھیرے۔ میں نے کامیابی کے ساتھ ان موانعات کا مقابلہ کیا۔ جو میری علمی ترقیات میں حائل تھے۔ اور میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوکر اعلیٰ تعلیم کے لئے ذرائع مہیا کرنے میں مصروف ہوا +

جن حالات و واقعات کو اس زمانہ سے پہلے پیش آنے پر میں محض اسباب و علل کا نتیجہ خیال کرتا تھا اب ان کو اپنے ارادہ اور توفیق ربانی سے متعلق کرنے لگا۔ حیات اجتماعی میں جہاں ماحول میرے خلاف ہوا وہاں صرف یہ خیال میرے لئے باعث سکون رہا کہ اگر تمام سوسائٹی صرف ایک بااخلاق انسان پیش کرنے میں کامیاب ہو سکی تو بھی کم قابل قدر نہیں کیونکہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ایک خیر مشیت کی حامل ہوسکتی ہے۔ ۔ ۔ ممکن ہے وہ مکمل انسان میں ہی ہو سکوں۔ بشرطیکہ میری عالی ہمتی مجھے ناگوار حالات سے بے نیاز کرا سکے۔ چنانچہ یہی خیال تھا جس نے ایک عرصہ تک مجھے یکطرفہ محاسن اخلاق کا معتقد رکھا۔ میں دوسروں کے ہر ایک ایسے طرز عمل کو جو خلاف توقع یا کسی اور بنا پر تکلیف دہ تھا۔ دوسروں کی قابل درگذر کمزوری سمجھ کر بھلا دینے کے لئے تیار رہا۔ ان حالات کے تحت میں نے تمام اُن متعلقین کے لئے جن کے ہاتھ سے مجھے تکالیف پہنچی تھیں۔ ان کی تنگ نگاہی اور نادانی کا قابل ترحم عذر پیش نظر رکھ کر اپنے دل میں ایک قسم کی ہمدردی محسوس کی۔ میرے اس عفو و کرم کے سزاوار میرے بزرگ بھی ٹھیرے +

اس عرصہ میں مجھے اپنے قواء نفسی بہت تیز رفتاری سے ترقی کرتے ہوئے معلوم ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے اپنی اس حرکت پر ندامت ہوئی کہ میں توقعات خیر اخلاقی میں دوسروں کی طرف سے جرم تشکیک کا مرتکب رہا۔ حالانکہ مجھے دوسروں کی طرف سے اس قسم کی بے اعتمادی رکھنے کا کوئی حق نہ تھا۔ ان ہی خیالات کے ساتھ دوسروں کی طرف سے اذعان خیر پیدا ہوا۔ اور ان تمام مدارج ارتقاء میں جو جو مسائل اخلاق و حیات میں حل کر سکا۔ یہ سب کچھ خدا کا کرم تھا۔ لیکن ابھی تک میں نے اپنی زندگی میں کامیابی کو توفیق ربانی سے متعلق کیا تھا۔ مگر ناکامیوں اور ناگوار حالات سے احساس رنج پر مجھے اختیار حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ تکمیل کی دوسری کوتاہیوں میں سے ایک تھی۔ میں یکایک بیمار پڑا۔ میری علالت نے طول کھینچا۔ میری موت میرے پیش نظر رہنے لگی۔ کم عمری میں مر جانے کے تکلیف دہ تصورات نے میری صحت کو گرا دیا۔ تندرستی کی اُمید کم ہوتی گئی۔ چونکہ میرا فرض میرے بعض معالجوں کے نقطہ خیال سے ترقی تھا۔ اس لئے روایتی اعتقاد کے مطابق جانبری کی توقعات بھی مایوسیوں میں تحلیل ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ مجھے یقین ہوگیا کہ ہر شخص کی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے جس کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک خدا کے نزدیک اور دوسرا انسان کے نزدیک۔ اگر انسان دونوں کو نہ سمجھ سکے تو موت کا تصور خود موت سے زیادہ تلخ اور ناگوار ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ کہ جب تک زندگی کا مقصد جو ایک خاص حد تک ترقی کرتا ہے پورا نہ ہو جائے۔ موت بے معنی تصور ہے۔ جب وہ مقصد پورا ہو چکے تو حقیقتاً زندگی بے معنی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے ایک قسم کی مسرت محسوس کی اور تقریباً ایک سال کا عرصہ ایک منٹ میں گذرتا ہوا معلوم ہوا +

میرے اعزا میری اس خاموشی کو بے ہوشی سے تعبیر کر رہے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میری کیا حالت ہے۔ مجھے یقین ہو چلا کہ اب وہ وقت قریب ہے جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤنگا۔ اس لئے میرا دل چاہا کہ اپنے عزیزوں کو آخری بار دیکھ کر ان سے رخصت ہولوں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری بہن، میرا دوست، میرا بھائی، میرا باپ یہی چار مجھے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ یہی میری قبل از وقت موت کے تصور سے غمگین

غمگین تھے ۔ میری جوان موت پر میری بہن کے احساسات ناقابل برداشت تھے ۔ اس پر اپنی بے بسی کا احساس ۔ " میرے کھلونے !.... میری دولت !..... اللہ !!! تو مجھے اُٹھا لے اسے اچھا کر دے ۔" (میری بہن نے کہا) میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں ۔ میری بہن کی التجا کیسی پُر درد تھی ۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔ میری آنکھوں کا نزع کے عالم میں بھر آنا میری بہن کے ضبط کو پاش پاش کر دینے کے لئے کافی تھا ۔ مجھے تسلی دیتی رہی لیکن اضطراب اُس کی ہر حرکت سے عیاں تھا ۔ میری موت قریب تر ہوتی جاتی تھی ۔ میرے ہونٹ بالکل خشک تھے ۔ پیاس کی شدت تھی ۔ میں نے پانی مانگا ۔ بہن نے پانی کی بوندیں میرے حلق میں ٹپکا دیں جس سے ایک گونہ تسلی ہوئی ۔ میرے بوڑھے باپ کو جس نے میری ماں ، بہن ، بھائیوں اور دوسرے عزیزوں کی موت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی ۔ یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ موت کیونکر ہوتی ہے اور میری حالت بھی جانکنی کی علامات سے خالی نہ تھی ۔ تاہم اس خیال سے موت کا نام کسی کی زبان پر نہ آتا تھا ۔ کہ مجھے تکلیف ہوگی ۔ میرے باپ کے حزن و ملال کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ دل بیٹھا جا رہا تھا اور تمام تمناؤں کا خاتمہ ہوا جاتا تھا ۔ کیونکہ میں ہی گھر کا چراغ تھا ۔ میری لیاقت اور سعادت پر فخر کرتا تھا ۔ افسوس کہ امید کی طلسم انگیزیاں ناامیدی کے تبسم میں گم ہونے سے ہمیں باز رکھتی ہیں ۔ مگر تھوڑے عرصہ کے لئے ۔ چنانچہ وہ وقت قریب تھا کہ میری جوان موت کے صدمہ سے میرے ضعیف باپ کا دل ٹوٹ جائے ۔ تمام آثار نمودار ہو چکے تھے ۔ میری زندگی کے چند لمحات باقی تھے ۔

میرا دوست مجھے دیکھ رہا تھا ۔ اُس کی زبان خاموش تھی اور آنکھیں خشک ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس پر کیا گذر رہی تھی ۔ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ کسی کشمکش میں مبتلا تھا ۔ میری کیفیت متغیر ہونے لگی ۔ رگیں کھنچ رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کا ریشہ ریشہ کسی نرم چیز سے انتہائی مضبوطی کے ساتھ بندھ کر بے حس ہوتا جا رہا ہے ۔ دل ڈوبا جا رہا تھا اور ہر حرکت پہلے سے زیادہ آہستہ ہوتی جا رہی تھی ۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سینہ پر بہت بڑا بوجھ رکھ دیا گیا ہے ۔ سینہ میں سانس بھرا ہوا ہے ۔ مگر سانس کی نالی کسی کے ہاتھ میں ہے ۔ کھلتی ہے اور بند ہو جاتی ہے ۔ پوری طرح سانس نہیں لیا جاتا ۔ میری تشنگی بڑھ رہی تھی ۔ میرے حلق میں پانی ٹپکایا گیا ۔ میں نے اپنے والد کو نزدیک بلا کر ان کی خدمت کرنے کی آرزو کا اظہار کیا اور عمر کے وفا نہ کرنے کے باعث اُس کے پورا نہ ہونے کی مجبوری پر معذرت اور اظہار افسوس کیا ۔ تاہم یہ بات زیادہ تکلیف دہ نہ تھی کہ دنیا کی ہر چیز ہماری توقعات کے مطابق نہیں ۔

آپا جان ! آج تمہارا کھلونا ٹوٹ جائے گا ۔ میری بہن کی چیخ نکل گئی ۔ میرے پھر آنسو نکل پڑے ۔ میرے بھائی نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھ دیئے ۔ میری زبان نے لکنت کی ۔ جب میں نے کہا کہ اب جا رہا ہوں پھر نہ آؤنگا ۔ آج تم اپنے ہاتھوں سے کفن اُوڑھانا ۔ یہ میری جوانی کی پوشاک ہے ۔ تم نے بچپن میں محبت سے مجھے کپڑے پہنائے تھے ۔ اس وقت بھی تم ہی یہ فرض ادا کرو ..... میری بہن پیچھے کی طرف گر پڑی ۔ اُف ! محبت موت سے کتنا ڈرتی ہے ۔ محبت اور جدائی میں کیسا ڈراؤنا تفاوت ہے ۔ میرا بھائی مجھ سے لپٹ گیا ۔ میں نے تسلی دی ۔ مگر جذبات عقل کو ٹھکرا دیتے ہیں ۔ اس لئے اس ہجوم یاس و الم میں میرا تسلی دینا بیکار ثابت ہوا ۔

میرا دوست مجھے دیکھا کیا ۔ میں نے اشارہ سے کہا میرے قریب تر آ جاؤ ۔ وہ شکستہ جان ! میرے قریب آیا ۔ آج تک میں نے اُسے روتے نہ دیکھا تھا ۔ یہ پہلا موقع تھا ۔ میں نے کہا تو نے دوستی کا حق ادا کیا ۔ میری روح تیری محبت سے شگفتہ ہوتی تھی ۔ اور میں تجھے مصیبت میں اپنے ساتھ دیکھتا تھا ۔ تو خوشی میں میرے ساتھ رہا ۔ میں خوش نصیب ہوں کہ تیرے سامنے جان دے رہا ہوں ۔ موت سے گھبرا نہیں رہا ۔ اس کا تصور میری طمانیت میں فرق نہیں لاتا ۔ موت سے قطعاً فنا ہو جانے کا تصور قریب خیال ہے ۔ اس کے بعد مجھے یکایک ایک جھٹکا لگا ۔ میرا چہرہ زرد کو نیلا کرنے کی کوشش میں تمتما اٹھا ۔ ایک لمحہ تک تشنجی کیفیت سی رہی ۔ میرے جسم کی روح کھنچ رہی تھی ۔ میں ہل نہ سکتا تھا ۔

میری نگاہوں نے میرے متعلقین سے اور بالخصوص میرے دوست سے میری گذشتہ غلطیوں کو بھلا دینے کی التجا کی اور معافی چاہی ۔ اسکے جواب میں میرے دوست نے کچھ کہنا چاہا ۔ لیکن " معصوم دوست " .... کے سوائے اُس کی زبان سے کچھ نہ نکلا ۔ یہ مطالبہ میری بہن کے لئے زیادہ تکلیف دہ تھا ۔ جس کو میں نے فوراً ہی محسوس کیا ۔ مرجانا ہی دراصل تمام خطاؤں کی تلافی سے زیادہ ہے ۔ اس کے بعد معافی کی گنجائش نہیں رہتی ۔ اس کے بعد میں نے اپنے متعلقین کو اپنے بعد دل کھول کر رونے کی تلقین کی

کیونکہ مجھے خبط گریہ کے مضر نتائج کا بھی اندازہ تھا۔ حزن و ملال کے جو آنسو ہماری آنکھوں سے نہیں بہتے وہ کاوش ذہنی اور افعال کی بے ربطی کی صورت میں بہ نکلتے ہیں۔ جو پہلے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ مجھے گوارا نہ تھا ٭

ایک شخص لیسین پڑھنے لگا۔ میں پاکیزگی قلب سے سننے کے لئے متوجہ ہوا۔ میری نظر بلندیوں پر پھر رہی تھی۔ اب کسی کے رونے کا اثر میرے دل پر نہ ہوتا تھا۔ میں دنیا سے قطعاً بے خبر ہو چلا تھا۔ آسمانی جلوے نمودار ہونے لگے۔ نورانیت برسنے لگی۔ اور پاکیزگیاں مسکرانے لگیں۔ لطیف ترین موسیقیت میری سامعہ نواز ہوئی۔ ان ہی نغمات میں سے ایک نغمہ معصوم آواز کی صورت میں میرے کانوں تک آیا۔ "بھائی جان امی جان آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کو بلانے کے لئے بھیجا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے مرحوم چھوٹے بھائی کی روح مجھے بلانے آئی ہے۔ اب رونے کی آوازیں شہر کے نواح میں دور سے گیت بجتے ہوئے آبادی کے شور و غوغا کی بے معنویت میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ مجھ پر غفلت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی مجھ سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوا کہ اب تمہاری اس دنیا کی زندگی ختم ہو گئی اور ایک لطیف سی شے میرے سینے سے ہوتی ہوئی آئی اور آنکھوں سے گذر کر کہتی ہوئی معلوم ہوئی "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

ایک مکمل سکون مجھ پر طاری ہو گیا۔ اب وقت کا اندازہ ناممکن تھا۔ اتنے میں مجھے اپنے بدن میں ایک جھٹکا محسوس ہوا۔ اور زور زور کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ اس کے بعد ایک شدید جھٹکا پھر لگا میں چونک پڑا۔ اور حیرت سے ہر طرف دیکھنے لگا۔ کہ میرے اللہ یہی وہ جگہ ہے جہاں روحیں مجھے بلاتی ہیں۔ یہ تو ہرگز مجھے پسند نہ آئیگی۔ ارے توبہ! یہاں لال لال پگڑیاں اور زرد زرد کرتے کیسے! یہ تو فرشتے نہیں علیگڑھ کے قلی ہیں۔ آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے زور سے مل ڈالا۔ ذرا ہوش درست ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ تو خواب کی طلسم انگیزیاں تھیں حقیقتاً علی گڈھ کا اسٹیشن ہے۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ گھبرا کر اپنا اٹیچی کیس سنبھالا اور گیٹ سے نکل کر ٹانگہ میں آبیٹھا ٭

فلسفہ علاج بالمثل

(مصنفہ ڈاکٹر ایم ضیاء الدین صاحب)

یورپ میں بالخصوص اور ہندوستان میں بالعموم ہومیو پیتھک طریق علاج کو بہت ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہومیو پیتھک جن اصولوں پر قائم کیا گیا ہے وہ طب مغرب و طب یونانی و ویدک سے زیادہ ٹھوس اور قرین عقل ہیں۔ ہندوستان میں ابھی تک ہومیوپیتھی کو اس لئے عروج حاصل نہیں ہوا کہ جو لوگ معالج ہیں وہ تمام کے تمام باقاعدہ تعلیم یافتہ نہیں۔ دوئم جقدر لٹریچر اردو زبان میں شایع ہو چکا ہے وہ بمنزلہ صفر کے تھا ٭

ڈاکٹر ایم ضیاء الدین نے فلسفۂ علاج بالمثل لکھ کر ہومیو پیتھک طب پر احسان عظیم کیا ہے۔ یہ کتاب بتلاتی ہے کہ ہومیو پیتھک طب کا اصول کیا ہے؟ ہر علم دوست اور ہر ہومیو پیتھک طبیب کا فرض ہے کہ وہ اس کتاب کا ضرور ہی مطالعہ کرے۔ ہمارے خیال میں اس وقت تک ہومیوپیتھی پر جسقدر کتابیں اردو زبان میں شایع ہو چکی ہیں ان میں یہ سب سے بہتر اور افضل ہے ٭

فلسفہ علاج بالمثل بالکل انگریزی طرز پر شایع ہوا ہے۔ کتابت کا غذ اور جلد سب کچھ ولایتی کے لگ بھگ ہے۔ حجم ۱۰۰ صفحہ اور قیمت صرف عہ ہے جو اس کی خوبیوں کے بالمقابل بہت کم ہے ٭

ڈاکٹر ایم ضیاء الدین - کٹڑہ مہا سنگھ امرتسر سے طلب فرمائیے ٭

ادبِ لطیف

(بنگالی زبان سے براہ راست)

گھوڑا

از جناب ڈاکٹر ایم ضیاء الدین امرتسری

جب اس دنیا کی تخلیق کا کام ختم ہونے پر آیا تو برہما کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا +

آپ نے نیجر سے بُلا کر کہا :- نیجر! جا میرے کارخانے میں سے پانچوں عنصر تھوڑے تھوڑے اُٹھا لا - ایک نیا جانور پیدا کرنا چاہتا ہوں +

نیجر نے دست بستہ عرض کی :- حضور! گستاخی معاف، جب آپ نے جوش میں آکر ہاتھی پیدا کئے، وہیل مچھلی، اژدھا، شیر ببر اور چیتے پیدا کئے تو اس وقت خرچ کی طرف آپنے ذرا توجہ نہ فرمائی۔ جسقدر بڑے بڑے اور کڑے جانوروں کا مصالحہ تھا، تمام ہوا چاہتا ہے۔ آگ، پانی اور ہوا تو مٹکوں کی تہہ میں جا لگے ہیں۔ باقی رہ گیا ہے ایتھر، سو وہ جسقدر آپ چاہیں +

برہما نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا :- اچھا، جو کچھ بچا کھچا ہے لے آ۔ دیکھا جائے گا +

اس دفعہ جانور تیار کرتے وقت برہما نے مٹی پانی اور آگ کو ذرا ہاتھ روک کر استعمال کیا - اس جانور کو نہ تو سینگ دیئے نہ پنجے۔ دانت دیئے تو ان سے چبانے ہی کا کام چل سکتا تھا، پھاڑ کھانے کا نہیں ۔ آگ البتہ اس جانور کی خلقت میں صرف کی گئی، اور یہ سب اسی سبب تھا کہ جانور میدانِ جنگ میں کچھ کام آنے کے لائق تو ہوا۔ لیکن جنگ کی خواہش اس میں باقی نہ رہی - یہی جانور ہے گھوڑا +

جو کچھ بھی ہو، دنیا کے خالق نے جی کھول کر اس میں ہوا اور ایتھر بھر دیا - اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ گھوڑے کا دل سولہ آنے آزادی کی طرف مائل ہوا۔ وہ ہوا کے بھی آگے ہی چلنا چاہتا ہے ۔ کھڑا ہے تو گویا اس لامحدود آسمان کو پار کر جانے کی دل میں ٹھان کر کھڑا ہے۔ دوسرے جانور تو کسی وجہ سے دوڑتے ہیں۔ یہ بلا کسی وجہ کے دوڑتا ہے، بس اپنے ہی آپ سے نکل بھاگنا چاہتا ہے۔ کسی کو مارنا نہیں چاہتا۔ فقط دوڑنا چاہتا ہے ۔۔ دوڑتے دوڑتے ہوا ہو جائے۔ برق ہو جائے۔ نیست ہو جائے ۔ اہلِ علم کہتے ہیں کہ دھات میں آگ اور ایتھر جب مٹی اور پانی آگ میں پورے طور پر چھوڑ دیں تو یہی ہوا کرتا ہے +

برہما خوش ہو گئے ۔ دوسرے جانوروں کو رہنے سہنے کے لئے مختلف جگہیں دی ہیں۔ کسی کو جنگل دیا ہے تو کسی کو غار۔ لیکن اس کی جو دوڑ بھاگ تھی تو اسے عنایت کیا کھلا میدان:

میدان کے کنارے ہی رہتا تھا انسان ۔ لوٹ مار کر کے وہ جو کچھ بھی جمع کرتا تھا۔ ایک بوجھ ہو جاتا تھا۔ اس لئے جب اس نے میدان میں گھوڑے کو یوں چھوٹتے دیکھا تو دل میں سوچا کہ اگر اس جانور کو کسی طرح پکڑوں تو مجھ کاروباری آدمی کے لئے بڑے ہی آرام کا باعث ہو +

ایک دن اس نے کمال عیاری سے گھوڑے کو جال میں پھانس لیا۔ پھر کیا تھا۔ اس کی پیٹھ پر زین اور منہ میں کانٹے دار لگام دے کر اسے

پیٹنے لگا۔ بوٹ سے اُسے مہمیز کرتا۔ طرح طرح سے ملتا رگڑتا +

میدان میں چھوڑ دیتا تو گھوڑے کو ہاتھ سے کھونا ہے۔ اونچی اونچی دیواریں بنا کر گھوڑے کو محفوظ کر لیا۔ شیر کے لئے جنگل تھا، وہ سدا جنگل ہی میں رہتا ہے۔ چیتے کے لئے غار تھی۔ اسے غار میں سے نکالنے والا کوئی نہیں۔ گھوڑے کے لئے کھلا میدان تھا۔ لیکن اُسے اصطبل میں لا کر باندھ دیا گیا۔ جانور کی طبعی آگ اور ہوا نے اُسے آزادی کے لئے بہت اُکسایا۔ لیکن قید سے چھوٹ نہ سکا +

جب حالت بالکل ناقابلِ برداشت ہو گئی تو گھوڑے نے دولتیاں مارنا شروع کیں۔ لیکن جسقدر اس کے پاؤں میں زخم ہوئے دیوار پر اسقدر نشان بھی نہ ہوئے۔ جب دیوار کا چونہ مٹی گر کر اصطبل کی خوبصورتی میں نقص آنے لگا۔ تو انسان کے دل میں بہت سا رنج پیدا ہوا۔ اور بولا:۔ اسے کہتے ہیں ناشکرگذاری، بے وفائی، نمک حرامی۔ دانہ پانی اسے دیتا ہوں۔ معقول تنخواہ کا سائیس اس کے لئے رکھا ہے۔ اور یہ پھر بھی مطمئن نہیں +

گھوڑے کو مطمئن کرنے کے لئے سائیس نے "ڈنڈا" اٹھایا۔ اور اس طرح پیٹا کہ گھوڑا ٹانگیں ہلانی بھول گیا۔ انسان نے اپنے ہمسایوں سے بلا کر کہا: "میرے اس جانور کی طرح اور کوئی جانور فرمانبردار نہیں" لوگوں نے بھی اس کی تعریف کی اور کہا "واقعی پانی کی طرح نرم اور ٹھنڈا ہے۔ بس بھائی تیرے ہی مذہب کی طرح ٹھنڈا اور حلیم ہے!"

پہلے تو یہ کہ اُس کے دانت نہیں۔ ناخن نہیں۔ سینگ نہیں۔ اور پھر دولتیاں بھی موقوف۔ دل کا بخار نکالنے کے لئے وہ آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر ہیں ہیں ہیں کر کے فریاد کرنے لگا۔ تب تو ہمسایوں کی نیند میں بھی خلل پیدا ہوا اور کہنے لگے "آواز تو اس کی بھلے مانسوں کی سی نہیں" اس کا منہ بند کرنے کے لئے کئی طرح کے آلے ایجاد کئے گئے۔ لیکن دم بند کئے بغیر منہ کا بند ہونا ممکن نہیں جس طرح جان کنی کی حالت میں کوئی کراہے، کبھی کبھی گھوڑے کے چیخنے کی آواز اُس کے گلے سے نکلتی ہے +

ایک دن یہ فریاد برہما کے کان میں بھی پہنچ ہی گئی۔ مراقبہ میں سے چونک کر باہر نکل آئے۔ ایک دفعہ کھلے میدان کی طرف جو نظر دوڑائی تو گھوڑا ندارد +

آپ نے موت کے فرشتہ کو طلب کیا اور پوچھا:۔ "یقیناً یہ تیرا ہی کام ہے۔ بتا میرا گھوڑا کہاں ہے؟"

موت نے عرض کی "حضور جب کبھی آپ کو شبہ ہوا ہے تو مجھی پر۔ ذرا انسان کی بستی کی طرف تو نگاہ ڈالئے"۔

دنیا کے خالق نے دیکھا ـــــــ بہت چھوٹی تنگ و تاریک جگہ ہے۔ چاروں طرف دیواریں کھڑی ہیں۔ اور گھوڑا اُس کے اندر کھڑا ہیں ہیں ہیں کر رہا ہے +

یہ دیکھ کر برہما بہت ہی بیقرار ہوئے۔ انسان کو مخاطب کر کے فرمایا: "میرے اس گھوڑے کو آزاد کر۔ وگرنہ میں شیر کی طرح اس کے دانت اور پنجے بنا دوں گا اور تیرے کسی کام نہ آئے گا"

انسان نے کہا:۔ "چھی چھی چھی ـــــ اس طرح تو تشدد اور جاندار کا آزار دنیا میں ترقی پائے گا۔ اور جو کچھ بھی ہو یہ گھوڑا تو آپ کا آزادی کے لائق ہی نہیں۔ اس کی بہتری اور بہبودی کے لئے میں نے بہت سا روپیہ خرچ کر کے یہ اصطبل بنایا ہے۔ اچھا خاصہ اصطبل ہے"

برہما نے ضد میں آ کر کہا: "گھوڑے کو تجھے چھوڑنا ہی پڑے گا"

انسان نے کہا "اگر یہی بات ہے تو چھوڑ دوں گا۔ لیکن سات دن کی مہلت چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اگر آپ نے کہا کہ میدان میرے اصطبل سے بہتر ہے تو اس ناک کو آپ کے سامنے زمین پر رگڑوں گا"

انسان نے چالاکی یہ کی کہ گھوڑے کو تو میدان میں چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے اگلے پاؤں رسّی سے کس کر باندھ دئے۔ اور گھوڑا اس طرح پھدک پھدک کر چلنے لگا کہ مینڈک کی چال اس سے ہزار درجہ بہتر ہے +

خالقِ کائنات رہتے ہیں دور ـــــ بہشت میں۔ انہوں نے گھوڑے کی یہ چال تو دیکھی لیکن اس کے پاؤں سے بندھی ہوئی رسّی پر آپ کی نظر نہ پڑی۔ اپنی مخلوق کی اس بے ڈھنگی چال کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گئے اور کہا کہ سخت غلطی ہوئی +

انسان نے کہا :- "اب میں اسے لیکر کیا کروں ؟ اگر آپ کی آسمانی بادشاہت میں کوئی میدان ہو تو کہئے وہیں روانہ کردوں +

برھما نے برگشتہ خاطر ہو کر کہا :" لے جا اسے اپنے اصطبل ہی میں واپس لے جا"

انسان نے کہا :- " برہما جی ! انسان کے سر پر جو بڑا بوجھ ہے "+

برھما نے کہا :-" یہ تو انسان کی انسانیت ہے "+

(ٹیگور)

نئی دولہن

(از ساوتری دیوی)

میں تو اس سے عاجز ہوں، یہ شرم نہ جانے کیوں میرے پیچھے پڑی رہتی ہے - جہاں جاتی ہوں میرے ساتھ لگ جاتی ہے - جو کام کرتی ہوں اس میں شامل ہو جاتی ہے - بولنا چاہتی ہوں تو لب پر مُہر کر دیتی ہے - اپنے پتی دیو (شوہر) کے پاس ہوتی ہوں تو میری آنکھ اور زبان سب کو بیکار بنا دیتی ہے - معلوم ہوتا ہے اس کو مجھ سے رقابت ہے - لیکن نہ جانے اس میں کون سی کشش اور کون سی طاقت ہے کہ سعی کوشش کرنے پر بھی اس کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتی +

اسی کی وجہ سے کل سے میرے ہردے دیو (دل کے مالک) مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں - میں نے ایک ہار گوندھ کر نوکرانی سے بھیجا - ساس نند کی شرم سے میں خود نہ جا سکی - یہ بات ان کو ناگوار ہوئی اور نوکرانی سے یہ کہہ کر کہ " میں اس سے اچھا ہار بازار سے خرید کر پہن لونگا " اُنہوں نے ہار واپس کر دیا - میں سمجھ گئی کہ میری بے جا شرم سے خفا ہو کر اُنہوں نے میرے ہار کی یہ تحقیر کی ہے - وہ جب اس کو قابل قدر سمجھتے کہ میں خود جا کر نذر کرتی +

آج میں نے طے کر لیا کہ چاہے جو بھی ہو میں خود جا کر مالا پہناؤں گی اور اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو مناؤں گی - میں پھلواری میں گئی اور ایک گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر ہار گوندھنے لگی - وہ آدھے سے کچھ اوپر گندھا تھا کہ آواز آئی - " نئی بہو " ! ابھی سب مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں - کیونکہ میں ابھی گونا ہی آئی ہوں، میں چونک پڑی اور جلدی میں ادھورے ہی ہار میں گرہ دیدی - اتنے میں میری چھوٹی نند آ کر کہنے لگی - تم یہاں چھپی ہو ماں بڑی دیر سے تمہیں بُلا رہی ہیں +

میری ساس کام میں لگ گئیں میری نند کھیل میں مصروف ہوگئی - میں نے سوچا اس وقت جا کر ہار پہناؤں - وہ اوپر تنہا ہیں - ہار بھی پہنا دوں گی - اور کل کے قصور کی معافی بھی مانگ لونگی - دبے پاؤں کمرے سے نکلی - آنگن میں آئی - چاروں طرف دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھتا تو نہیں - الہٰی کوئی کہ پاس سنّاٹا تھا جھٹ لپک کر میں سیڑھی پر چڑھ گئی - دو ہی سیڑھی چڑھی تھی کہ شریر شرم نہ جانے کہاں سے آئی اور بوجھل زنجیر بن کر پیروں میں پڑ گئی - دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے " کیسے جاؤں ؟ کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا ؟ وہ خود کیا خیال کریں گے ؟ یہ سب باتیں سوچ کر میں ایک سیڑھی نیچے اُتر آئی - پھر خیال نے پلٹا کھایا - لوگ کہیں گے کیا ؟ کچھ نہیں، اتنی شرم بھی کس کام کی - میں بڑی جرأت سے شرم کے بوجھ کو پاؤں سے جھٹک کر اوپر چڑھی - پھر ٹھٹکی، پاؤں آگے نہ بڑھ سکے - الجھن میں پڑ گئی - کیسے جاؤں ؟ کیا کہوں گی ؟ اگر وہ دروازے کی طرف منہ کئے بیٹھے ہوں گے تو اُن کے پاس کیسے جاؤں گی ؟

میں اسی مسئلہ کو حل کرنے لگی کہ اوپر جاؤں یا نیچے اُتر پڑوں - کبھی جرأت کی نگاہ اوپر اُٹھتی تو کبھی بے ہمتی کی نظر نیچے جھک جاتی - میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ دروازہ کھلا اور پیروں کی آہٹ سے میرا دل دھڑکنے لگا - اوپر سے وہی آرہے تھے +

اب کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟ اتنی جلدی بھاگ بھی نہیں سکتی - وہ زینے پر آگئے - میں گھبرا اُٹھی - کیا کرتی - وہیں گٹھری بن کر بیٹھ گئی - وہ میری سیڑھی پر آ کر رک گئے - میں نے چاہا کہ ہو سکے تو اس دیوار میں سما جاؤں یا کسی جادو کے زور سے اندیکھ ہو جاؤں - لیکن کچھ نہ کر سکی - پسینہ آگیا - اُنہوں نے میری پیٹھ پر

ہاتھ رکھ کر کہا - یہاں کیا کر رہی تھیں ؟ کیا میرے کمرے میں آنے کی قسم کھا لی ہے ؟ میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا +

اُن کے ان سوالوں پر بھی میں پتھر کی طرح خاموش ہی رہی - کچھ بھی آواز نہ نکلی - سانس کچھ زور زور سے چلنے لگی - میں چاہتی تھی وہ بھی بند ہو جائے تو اچھا ہے - وہ بار بار سوال کرتے تھے - لیکن میں لاکھ کوشش پر بھی زبان نہ کھول سکی - وہ میری اس حالت سے کبیدہ ہو کر جانے لگے - میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں - میری اس بری حالت پر میری ہمت کو ترس آگیا - اُن کے پیٹھ پھیرتے ہی میں نے چھپا ہوا گجرا نکالا اور چاہا کہ ان کے گلے میں ڈال دوں - لیکن وہ چھوٹا نکل گیا - میں نے چاہا کسی طرح گلے میں پڑ جائے - لیکن وہ گلے میں پڑنے کی بجائے ٹوٹ کر بکھر گیا - اور اُس کے آٹھ دس پھول آنگن میں بھی چلے گئے - اُنہوں نے بڑے پیار سے میری طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے چلے گئے - لیکن اب میں نیچے کیسے اُتروں ؟ ساس نند آنگن میں تھیں - چھوٹی جیٹھانی نے اُن سے کچھ ہنس کر کہا بھی - میں شرم کے مارے گڑی جا رہی ہوں ؟

ش - عا (ہندی)

مترجمہ - ابو محمد امام الدین مدیر ترجمان -

مقصدِ زندگی

ایک درخت نے،
گھنی چھاؤں کی،
بے گھروں کو ٹھکانا دیا،
دھوپ سے جلتے ہوؤں کو ٹھنڈک دی،
ٹھنڈی ہوا پھیلا کر،
دنیا کو راحت رنگیں کیا،
اور خود سخت سردی میں ——
ٹھٹھر کر جان دے دی،
پھر اپنے بے جان جسم کو،
ماگھ کے سرد موسم میں،
نذر آتش کر کے ——
غریب کسان کے بے حس جسم کو،
حس دے گیا!!
الٰہی ایسی زندگی عطا کر!!

ایک پرند
اپنے بازو پھیلا کر،
پل پل میں اترا کر،
فضا میں اُڑ کر،
ناچ کر، گیت گا کر،
میرے مکان کے صحن میں،
آ کر بیٹھتا رہا،
اور اسے نغمہ زار بناتا رہا،
آخر میں اُس نے،
شکاری کا تیر کھا کر،
اپنی ننھی سی ہستی کو ——
اُسی کی اشتہا پوری کے لئے
قربان کر دیا!!
الٰہی، ایسی زندگی عطا کر!!

ہنس (ہندی)

مترجمہ امام الدین مدیر ترجمان

پھر کاش میں تمہارے پاس ہوتا

کیا کوئی مجھے اس وقت یاد کر رہا ہے ...... کیا میں اس وقت کسی کے خیال میں گھوم رہا ہوں ... کیا کوئی میری وفاؤں کو محسوس کر رہا ہوں .... ہاں ضرور کر رہا ہے +

اگر ایسا نہ ہوتا تو اس وقت لکھتے لکھتے میرے ہاتھ سے قلم کیوں چھوٹ جاتا۔ طبیعت اک دم کیوں بیٹھنے لگتی۔ دل اک دم کیوں دھڑکنے لگتا۔ سامنے رکھی ہوئی کتاب کے الفاظ کیوں بے معنی معلوم ہونے لگتے۔ آنکھ کیوں ڈبڈبا آتی۔ بدن کیوں کپکپانے لگتا۔ ہونٹ کیوں تھرتھرانے لگتے اور دماغ غرق تخیلات موہوم ہو کر کیوں مختل ہو جاتا ...... واقعی اس وقت کوئی مجھے یاد کر رہا ہے

....

کیا کروں مجبور ہوں۔ زمانہ کی ستم شعاریاں اور اہل زمانہ کی بے اعتنائیاں زنجیر پا بن کر رہ گئی ہیں۔ چلنے سے مجبور ہوں۔ کہ کسی کے پاس پہنچ جاؤں دیکھنے سے مجبور ہوں کہ کسی کی طرف دیکھ سکوں۔ زبان خاموش ہے کہ کچھ کہہ سکوں اور ہاتھ ہجوم تخیلات و حشر انگیزی جذبات کی وجہ سے لرزہ براندام ہے کہ کچھ لکھ سکوں۔ نہیں نہیں، ٹھیک ہے ؎

ذوقِ تپش نہ ہو تو مزا کیا حیات کا   شوقِ خلش نہ ہو تو مزا کیا ممات کا

...... تمہاری تکلیفوں کا مجھے احساس ہے۔ تمہاری راحتوں کی مجھے خبر ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تمہاری دنیا بھی ایسی ہی معصوم اور حشر برپا ہے جیسے کہ میری۔ اور تمہارا دل بھی اسی طرح بے تاب و غرق تخیلات ہے جیسے کہ میرا .... کیا تم بھی میری ہی طرح مجبور و مجبور ہو ....

کاش میں تمہارے پاس ہوتا یا تم میرے پاس ! ؎

دونوں طرف دلوں میں یکساں ہے سوزِ الفت   قائم رہے الٰہی یہ رشتۂ محبت

(علی گڑھ)   آوارہ و رسوائے

پیامِ مہجور

غمگسار قاصد! وفادار نامہ بر!! جاں نثار محرم!!! آہ تجھے کس نام سے مخاطب کروں؟ تیری موجودگی میرے جذبات کی دنیا میں ایک عجیب فضا پیدا کر دیتی ہے جس کے بیان کرنے میں زبان قاصر ہے۔ تیری ہستی ایک دردمند دل کے لئے کس قدر تسکین بخش ہے اور تیرا انتظار ایک ہجراں نصیب زندگی کے لئے کیا روح فرسا!

آج تو غیر معمولی اخلاص اور ہمدردی کے ساتھ ایک تغافل شعار کے پاس خبر لے جانے کو تیار ہے۔ کیا تو حالِ زار تحریر کی صورت میں چاہتا ہے؟ نہیں نہیں مجھے اپنے دل و دماغ پر اختیار باقی نہیں۔ خدا جانے وفورِ جوش میں کیا سپرد قلم کر دوں۔ اور پھر اس کے لئے مجرم بنوں +

باغِ عالم میں بہار کا دَور دورہ ہے۔ سبزہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ صانع حقیقی کی گلکاریاں فرشِ زمین پر جنتِ نگاہ ہو رہی ہیں۔ آسمان پر کالے کالے بادل اُمڈے چلے آتے ہیں۔ مرغانِ خوش الحان شاخوں پر نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ رندانِ بادہ خوار

سرگوشیاں کرتے ہوئے باغ کی طرف خراماں خراماں جا رہے ہیں اور ہر ایک فرطِ مسرت سے یہ کہہ رہا ہے کہ

بیا بصحن چمن ساقیا و جامم دہ　　　　کہ ابر و آب رواں سبزہ و صبا اینجاست

لیکن میری بیتابی میں دم بھر سکون نہیں۔ قدرت کے رنگین نقشے دل کے شعلۂ نہاں کو ہوا دیتے ہیں اور مرغانِ باغ کی ترنم ریزیوں میں پپیہے کی "پی کہاں" کی صدائے دلکش جو یکایک ایک سمت سے بلند ہوتی ہے۔ تیرِ بے کماں کی طرح کلیجہ میں اتر جاتی ہے۔ رہ رہ کے ایک درد سا اٹھتا ہے جس کی لذت سے دل والے تڑپ اٹھتے ہیں۔ ؎ درونِ سینۂ ما زخم بے نشاں زدہٗ　　　　بحیرتم کہ عجب تیرِ بے کماں زدہٗ

مجھے اُس وفا نا آشنا سے کوئی شکایت نہیں۔ گلہ ہے تو اپنی قسمت کا۔ اور شکوہ ہے تو اپنے نصیب کا۔ اگر اُسے صحبتِ غیر میں خوشی حاصل ہوتی ہے تو میری عین مسرت کا باعث ہے۔ درحقیقت اُس کی خوشی ہی میری مسرت کا سرچشمہ ہے۔ مجھے اس خیال سے بھی تکلیف ہوتی ہے کہ میری وجہ سے کسی کا آئینۂ خاطر گرد و ملال سے مکدر نہ ہو خواہ میرا شیشۂ دل سنگِ آلام سے چور ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس سرائے فانی میں کسی متنفس کو کوئی حق نہیں کہ کسی ہستی کے لئے بیجا طور پر سنگِ راہ ثابت ہو +

ہاں تو نے کیا کہا؟ میں نے تغافل شعار اور وفا نا آشنا کے الفاظ سے کسی کی یاد کیوں کی؟ سچ ہے اگر کسی نے کوئی وفا یا ایثار یا قربانی کی تو کسی غرض سے؟ اور اپنی جاں نثاریوں کے لئے ایک خاص ہستی ہی کو کیوں مخصوص کیا؟ بالفرض اگر راہِ وفا میں ثابت قدم رہے تو اُس کے اظہار سے کیا مطلب؟ یہ ایک بڑی کمزوری ہے جس کے ظاہر ہونے سے ایثار کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر ایسی تنگ ظرفی ان لوگوں سے ظہور میں آتی ہے۔ جو ہجومِ ناامیدی سے جو کہ سعیٔ لاحاصل سے حاصل ہوتی ہے گھبرا جاتے ہیں اور ضبط سے کام نہیں لے سکتے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ جذبِ صادق بے اثر رہ جائے +

فتادگی شیوۂ عشق ہے اور ناز و تمکنت شعارِ حسن۔ اگر فتادگی حسن کا خاصہ ہوتی تو عشق اور حسن میں فرق ہی کیا ہوتا؟ عشق تو جدا رہے۔ لیکن وہ کوچۂ حسن کی گدائی کو شاہی پر ترجیح دیتا ہے۔ بس اُس کے لئے لازم ہے کہ دشواریوں کا مقابلہ استقلال سے کرتے ہوئے حصولِ مقصد کے لئے کوشاں رہے۔ اسی کا نام شانِ وفا ہے۔ اور یہی پاسِ امانت ہے +

میرے سچے ہمدرد! میں اپنی خطا پر نادم ہوں۔ اور اپنے الفاظ سے خجل۔ افسوس کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اب میں تجھے زیادہ عرصہ تک نہیں روکنا چاہتا۔ تو اُسی محفلِ عشرت میں جا اور......

گر نام و نشانِ من پرسند بگو قاصد　　　　آوارۂ و مجنونے رسوا سرِ بازارے

جنگ بہادر خاں ضبط۔ بی اے

ترکِ تقلید

ترقی کے علمبردار تقلید کے دشمن ہیں۔ قدیم اور فرسودہ اسی لئے قابلِ ترک ہے کہ وہ قدیم اور فرسودہ ہے۔ جن لوگوں نے حیاتِ انسانی کو بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید تر بنانے کے لئے نئی نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ وہ کبھی "رہِ راست برو" پہ کاربند نہ ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ تقلید سے دامن بچایا۔ مثال سے گریزاں اور معمول سے خائف رہے۔ خلقِ خدا کی رہنمائی خدا کے اُنہیں بندوں نے کی ہے۔ جنہیں اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ جو بے باک تھے۔ دلیر تھے۔ جن کو ہمیشہ نئی سوجھتی تھی۔ جن میں اُپج تھی۔ اختراع و ایجاد کا مادہ تھا۔ جو مستقل مزاج تھے باتدبیر تھے۔ جو وہاں جانے سے نہیں ڈرتے تھے۔ جہاں کبھی کوئی نہیں گیا ہے۔ جو وہ کام کرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ جو کبھی کسی نے نہیں کیا ہے +

ہر آنے والا دن ہر جانے والے دن سے بالکل مختلف ہے اور تازگی شگفتگی اور جدّت کا نمونہ ہے ۔ اپنے اسلاف کی اپنے بزرگوں کی یا اپنے ہمسایوں کی تقلید نہ کرو۔ اس سے تمہاری تخلیقی قوتیں اور تمہارا ذاتی عنصر مُردہ ہو جائے گا ۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوگی جیسے ایک چنبیلی کا پھول چاہے کہ گلاب کا پھول بن جاؤں ۔ آج تک کسی انسان نے کسی دوسرے انسان کے قدم بقدم چل کر کوئی اہم اور نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی ۔ کامیابی کی نقل کامیابی کے ساتھ نہیں اُتاری جاسکتی ۔ انسان خود اپنی مخفی قوتوں سے جتنی دور ہٹتا جائے گا ۔ اسی مناسبت سے اُس کے اور کامیابی کے درمیان فاصلہ بڑھتا جائے گا ۔

اگر کسی مصوّر نے مانی یا بہزاد یا اینجلو کی بنائی ہوئی کسی تصویر کی ہو بہو نقل اُتار لی تو کوئی بات بھی نہ پوچھے گا ۔ لیکن اگر وہ ایسی تصویر بنانے میں کامیاب ہوگیا جو آج سے پہلے ناپید تھی اور کاغذ یا کینوس کی سطح کو کبھی جس کے وجود نے سرفراز نہیں کیا تھا تو دنیا اسے آنکھوں پر بٹھائے گی +

دس ہزار انسانوں کے بے ترتیب مجمع کی قیادت صرف ایک آدمی کرتا ہے اور یہ ایک آدمی وہ ہوتا ہے جو اس مجمع سے درّانہ باہر نکل آتا ہے جو کسی کے بتائے ہوئے راستہ پر نہیں چل سکتا ۔ جو کسی کے ساتھ بھی نہیں چل سکتا ہے +

دنیا ان لوگوں کے لئے ہمیشہ گوش بر آواز ہے جو لاکھوں قدموں سے پامال ہو جانے والے راستے کو چھوڑ کر نئی نئی راہیں پیدا کرتے ہیں ۔ جو آگے بڑھنا چاہتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ : نیا ہر منٹ نئی ہے ۔ ہر لحظہ جدید ہے +

دنیا کی موجودہ ترقی نتیجہ ہے ماضی سے قطعاً بے اعتنائی کا ، ہر جگہ نئی اور جدید چیزیں پرانی اور قدیم چیزوں پر چھاگئی ہیں اور ترقی کی رفتار اگر یہی رہی تو آج کی بہتر سے بہتر مشین اور ایجادیں کل صرف گذرے ہوئے زمانہ کی یادگار اور عجائب خانوں کی زینت ہونگی +

حامد اللہ افسر

پھر آئی برسات

پھر آئی برسات ، آسمانوں پر چھائی ہوئی !
ہوا کی دھمک میں مست گڑگڑاتی ہوئی گھٹائیں پھر آئیں +
آج یہ میرا وہی پرانا دل نسیم عطر بیز کے جھونکوں میں پھر جھومنے لگا +
گھٹاؤں کی طرف نگاہیں اُٹھی ہوئی ہیں +
اور میرا دل آج اپنے آپ میں نہیں +
پھر آئی برسات آسمانوں پر چھائی ہوئی !
میدانوں پر کالی گھٹاؤں کا سایہ +
نوخیز سبزے کی پتیوں پر بیخودانہ لوٹ رہا ہے +
زندگی باواز بلند پکار رہی ہے " برسات آئی ! موسلا دھار آئی "+
" برسات آئی ! کا گیت ہر گوشہ میں ترنم ریز ہے !
آنکھوں میں ، دلوں میں سیلاب آیا !
پھر آئی ! وہ آئی ! برسات آئی ۔ آسمانوں پر چھائی ہوئی !
(ٹیگور کا ایک گیت از برہ باہی نی)

ڈاکٹر ایم ۔ ضیاءالدین امرتسری

ترانۂ حمد

(از مولانا اظہر علی صاحب آزاد)

اے وہ جس سے جہاں نہیں خالی
دل نہیں خالی - جاں نہیں خالی

پتّی پتّی ڈالی ڈالی
پتّی کی سبزی گُل کی لالی

ہے ہر رنگ میں جلوہ جس کا
اور ہر رنگ میں بُو ہے نرالی

آئیں ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی
چھائیں گھٹائیں کالی کالی

برسے۔ بھردے ابرِ رحمت
کیاری کیاری - نالی نالی

ہونے لگیں جنگل میں منگل
سبز پری ہو زمین ہریالی

پھول کھلے ہوں ڈالی ڈالی
شبنم بھردے پیالی پیالی

پی کے شرابِ نابِ محبّت
مست گرے بالی پر بالی

آئیں۔ پپیہے شور مچائیں
پھرتی ہو کویل متوالی

کلی کلی بولے ۔ بتلا دے
ان پھولوں کا کون ہے مالی

اے وہ جس کی ذات ہے عالی
اے بے بس والوں کے والی

رحمت والے رحمت فرما
تیرا گدا اک جاتا ہے خالی

آزاد اک بے بس بندہ ہے
اس بے کس کا تو ہی ہے والی

دکھلا اپنی شانِ عالی
دکھلا اپنی شانِ عالی

آزاد

ادب و تاریخ

"کُرکشیتر"

پانڈوں کی آمد ——— میدانِ جنگ میں

پانڈوں سے دلیر آتے ہیں میدانِ وغا میں بھاگڑ سی ہے دشمن کے نقوشِ کفِ پا میں
پیدا اثرِ ہنگامۂ محشر ہے فضا میں سنکتے ہیں عیاں گنبدِ گردوں کی صدا میں
اک شور سا برپا ہے اسد غار سے نکلے
تیروں سے چلے آتے ہیں تلوار سے نکلے

ایک ایک جگردار ہے ایک ایک جری ہے میداں میں ورود ان کا نحوست سے بری ہے
رتھ ہے کہ بلا ریب شرارت سے بھری ہے بجلی ہے چھلاوہ ہے تخیل ہے پری ہے
سُرعت سے نکل جائے ابھی دشتِ وغا سے
یہ کارِ عناں لیں نہ اگر موجِ ہوا سے

پُرخشم وہ تیور ہیں کہ شیروں کو ڈر آئے فوجوں کے رسالے تہ و بالا نظر آئے
جنگاہ میں کہتے ہیں سپاہی کدھر آئے ہے بھیم طلبگار کرن کا ادھر آئے
ضیغم کو عتاب آیا ہے دیکھا نہیں جاتا
نزدیک نکل سین کے کوئی نہیں آتا

دشمن کے ہراول میں بغاوت کا خطر ہے ارجن کی غضبناکی و ہیبت کا اثر ہے
غصے سے یدھشٹر کی درودھن پہ نظر ہے اعدائے بد اندیش اُدھر موت اِدھر ہے
سہدیو کا غصے سے عجب حال ہوا ہے
آنکھ آئی ہوئی۔ غیظ سے مُنہ لال ہوا ہے

پانڈوں کے تصور سے بگڑ جاتے ہیں خود سر آشفتگیٔ زلف ہے ترتیب کے اندر
مشاقِ موت ایسے میں یاد آتی ہے اکثر اک نالۂ پُرسوز ہے بھیشم کی زباں پر
اے کاش ستمگر کا نمک کھایا نہ ہوتا

یوں ان کے مقابل بخدا آیا نہ ہوتا

میدانِ جدل میں ہے بپا ایک قیامت گیسو کی طرح گھیرے ہے اعمال کی شامت
اوسان ہیں قائم نہ حواس ان کے سلامت شیروں کا تہور کہاں بودوں کی ملامت
دشمن کے قریب آئے ہیں کس فرطِ غضب سے
شیروں کے چلن سچ ہے جدا ہوتے ہیں سب سے

کوروں کی زباں پر ہے کہ لو آتے ہیں دشمن موت آتی ہے پیغام اجل لاتے ہیں دشمن
آمادۂ پیکار جونہی پاتے ہیں دشمن چھا جاتی ہے ہیبت سی لرز جاتے ہیں دشمن
روباہ صفت دل میں لعیں بھاگ رہے ہیں
بیٹھا ہے مکاں اور مکیں بھاگ رہے ہیں

آہن میں تومند ہیں ہنگامِ وغا غرق دیو اور سپاہی کی شباہت میں نہیں فرق
دیوار سے سرکش ہیں جدا غرب سے ہے شرق ڈھالوں کی گھٹاؤں میں ہے نیزوں کی ضیا برق
تیروں کی ہے بارش کا سماں مدِ نظر آج
چٹکی میں ہوا خواہوں کے اُڑ جائینگے سر آج

بے چین ہیں غمناک ہیں افسردہ ہیں بھیشم رُخ برگِ خزاں زیدہ ہے پژمردہ ہیں بھیشم
رنجیدہ ہیں خاموش ہیں آزردہ ہیں بھیشم مضطر ہیں ستمکش ہیں الم خوردہ ہیں بھیشم
یوں صید سے غافل ہے پڑا دشت صحن میں
کہتے ہیں جسے جان نہیں شیر کے تن میں

آراستہ سفاک ہیں سب دشنۂ کیں سے خاموشئ بھیشم سے ہیں دم بازخریں سے
دل مردہ سے ہیں موت گذر جائے قریں سے ہے پانچ دلیروں کی دغا فوجِ لعیں سے
مقتل کو چلے با دلِ ناخواستہ بھیشم
ازراہِ وفا بھول گئے راستہ بھیشم

پانڈوں میں تھی بھگوان کنھیا کی فقط دیر ہنگامۂ آمد سے ہوئے زیست سے جی سیر
آنکھوں میں چھلک سا گیا تلملا کے شمشیر چہرے کی چکاچوند سے چھایا ہوا اندھیر
یہ تیرگی ہے ہاتھ سجھائی نہیں دیتا
معذور ہیں مجبور کہ دکھائی نہیں دیتا

نفیس خلیلی

غزلیات

غزل

عرصۂ زندگی میں کر تگ و تاز
رہروِ جادۂ فرار نہ بن

دل کی اکسیر کو سنبھال کے رکھ
صاحبِ نقدِ کم عیار نہ بن

پست ہوتی ہے رفعتِ باطل
غرّۂ نازِ افتخار نہ بن

جذب ہو جائے گا خزاں میں یہ حسن
عاشقِ جلوۂ بہار نہ بن

پھر تجھے حاجتِ رفو ہوگی
ابھی اے دل! دلِ فگار نہ بن

دوسروں کے دلوں کو مت تڑپا
یادِ رنگینیٔ بہار نہ بن

اُن کی تصویر اور تیرے پاس؟
دلِ ناداں فریب کار نہ بن

پائے ہر سنگ پر نہ کر سجدہ
تو سرِ جوئے کوہسار نہ بن

دیکھ دیکھ اُن کو تو نہ کر رسوا
اشک اے قلبِ بیقرار نہ بن

فطرتِ غم نصیب کو نہ رلا
اے بہار اب کے تو بہار نہ بن

غزل

مقصدِ دل طلبِ یار میں حیراں ہونا
حاصلِ دیدۂ نظارۂ رخِ جاناں ہونا

بن گیا آئینۂ یار مرا دیدۂ شوق
میری حیرت نے سکھایا اسے حیراں ہونا

دل کہ اک عمر سے تھا یار کا معمورۂ ناز
ہائے اس خانۂ آباد کا ویراں ہونا

ہو اگر ہمتِ مردانہ شریکِ غمِ دل
کسی دشوار کا مشکل نہیں آساں ہونا

پھر رہا ہے مری آنکھوں میں وہ منظر اب تک
تیرے رخ پر ترے گیسو کا پریشاں ہونا

ہائے وہ اسکا اٹھانا رخِ روشن سے نقاب
حشر میں ایک نئے حشر کا ساماں ہونا

رخِ روشن سے ہو کیا زلفِ سیہ کو نسبت
ہمکو معلوم ہے کافر کا مسلماں ہونا

تھا یہی راز تڑپنے کا مرے قتل کے بعد
مجھ سے دیکھا نہ گیا اسکا پشیماں ہونا

فیض ہے حضرت "ہادی"[1] کا نہیں تو اے خیر
میں کہاں اور کہاں میرا سخنداں ہونا

خیرؔ بہوروی

ملہماتِ اطہر

کہیں ایمان سے خالی کوئی انسان ہوتا ہے
کہ پیدا ہی نہیں دل کیا تھا ہی ارمان ہوتا ہے

بہشت و حور و غلماں مزدِ طاعت میں نہ مانگو
نہیں باتوں سے تو واعظ ضعیف ایمان ہوتا ہے

بدلتا ہے ترا غافل تنفّسِ عمر میں کیا کیا
کبھی ارمان ہوتا ہے کبھی پیکان ہوتا ہے

تمہاری سرکشی سے اب نہیں رکتی مرے نالے
جھکا دیتا ہے جو سر کو وہ تو احسان ہوتا ہے

تمنا چھپ کے رہتی ہے جب ایسا نہیں تو
ہماری دل لگی کا غیب سے سامان ہوتا ہے

بلائیں حسبِ عادت آتی ہیں مجھ پر میں سمجھتا ہوں
کہ میری کامیابی کے لئے سامان ہوتا ہے

دمِ آخر وہ کیوں تکلیف فرمائیں عیادت کی
نتیجہ کچھ نہیں ہے مفت میں احسان ہوتا ہے

جواب اسکا ہے کیا وہ پوچھتے ہیں از رہِ غفلت
کسے کہتے ہیں ایماں اور کیا ارمان ہوتا ہے

غزل سو شعر کی کہنے سے کیا ہے فائدہ اطہر
اگر اچھا ہو تو اک شعر بھی دیوان ہوتا ہے

مرسلہ شوکت حسین رعنا

غزل

تیری یکتائی میں نقصان بتا کیا ہوتا
تجھ سا ہوتا جو کوئی وہ بھی تجھی سا ہوتا

جسمِ خاکی کے تعلق نے گراں بار کیا
کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

مژدۂ وصل میں لے دل تجھے دیتا تو سہی
تجھکو مجھ پر تو مجھے کس پہ بھروسا ہوتا

میں تو درد و غم و اندوہ کا پتلا ٹھہرا
بھول جاتا تجھے پر تو تو نہ بھولا ہوتا

جلوہ گر تو نہ ہوا ناز سے کیا کام کیا
میں ہوں جس طرح یونہی تو بھی تماشا ہوتا

دردِ الفت سے قوی ہوتی ہے روح اس تن میں
اور بڑھتا یہ مرض شاد تو اچھا ہوتا

مرزا محمد فیض شاد

---

[1] حضرت ہادی مچھلی شہری ۱۲

غزل

(از حضرت ریاض خیرآبادی)

کفن سر کا کے حسنِ نوجوانی دیکھتے جاؤ — ذرا آفتادِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ
لپک شعلے کی ہے یا گلفشانی دیکھتے جاؤ — کلیم اُن کی ادائے لن ترانی دیکھتے جاؤ
نئے خم میں گئے وہ جم کی نشانی دیکھتے جاؤ — جواں بوڑھے ہوں جس سے وہ پُرانی دیکھتے جاؤ
ہماری زمزمی میں آبِ زمزم بھی ہے وہ شے بھی — ہوئے ہیں جمع کیونکر آگ پانی دیکھتے جاؤ
کسے تم ڈھونڈھتے ہو دل کہاں ہے میرے پہلو میں — اب اُس کا داغ ہے اُسکی نشانی دیکھتے جاؤ
ابھی تھوڑی سی اسکو اپنی بوتل کی پلائی ہے — ذرا رندو شبابِ شیخ فانی دیکھتے جاؤ
بھرے آنکھوں میں آنسو موت کے ہیں سانس چلتی ہے — بندھے پانی میں موجوں کی روانی دیکھتے جاؤ
خضر! یہ آبِ حیواں سے بھی کچھ پہلے کی ہے شاید — پُرانے خُم میں کب کی ہے پُرانی دیکھتے جاؤ
سحر ہوتی ہے ٹھہرو رات آخر وقت آخر ہے — نہ جاؤ ختم ہوتی ہے کہانی دیکھتے جاؤ

پکارے کہتی ہے عبرت ریاضؔ آقا[۱] کی بالیں پر
ذرا آفتادِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ

ریاض

(دیوان)

۱؎ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں بہادر مرحوم والیٔ محمود آباد (اودھ) بالقابہ

تغافل کیش کی یادیں!



بساطِ آسماں انوار سے معمور ہوتی ہے! شب اپنی زلف میں موتی ستاروں کے پڑتی ہے
زمینِ فتنہ زا سے رنج وغم روپوش ہوتے ہیں جہاں کے رہنے والے نیند میں مدہوش ہوتے ہیں
جہانِ آرزو کی ہاؤ ہو موقوف ہوتی ہے تمنّا، التجا، اور جستجو موقوف ہوتی ہے!
مری خونبار آنکھیں نوحہ خوانِ خواب ہوتی ہیں بہت بیتاب کرتی ہیں، بہت بیتاب ہوتی ہیں
نزاعِ عشق وحسنِ خود نما پر غور کرتا ہوں وفا پر غور کرتا ہوں، جفا پر غور کرتا ہوں
کسی کی یاد آتی ہیں جو شرمائی ہوئی نظریں! تو اُٹھتی ہیں فلک کی سمت گھبرائی ہوئی نظریں
مرے پیشِ نظر اک منظرِ زرِ بار ہوتا ہے حسیں قدرت کی صنعت کا حسیں شہ کار ہوتا ہے
مرے برباد دل سے یہ صدا اُس وقت اُٹھتی ہے مرے ناشاد دل سے یہ صدا اُس وقت اُٹھتی ہے
تغافل کیش! تجھ کو کیا خبر یہ کیا قیامت ہے یہ اک صبر آزما غم ہے، یہ اک جانسوز آفت ہے

کسی مجبور دل کی آرزو کا خون ہو جانا
کسی بدبخت کی قسمت کا گہری نیند سو جانا

لطیف انور اسلامیہ کالج لاہور

موسمِ گُل

پھر ہوا چلنے لگی دشت میں مستانہ وار
مُرغ باغوں میں ہوئے زمزمہ پیرائے بہار

جامۂ سبز ہیں بدلے ہوئے سارے اشجار
ڈالی ڈالی میں لگے ہیں گل و برگ و اثمار

پھر زمانے کو نیا حُسن نیا رنگ مِلا
ہر طرف چلنے لگی عیش و مسرّت کی ہوا

صحنِ بُستاں میں نظر آتے ہیں منظر کیا کیا
بربط و چنگ کہیں اور کہیں دَورِ صہبا

گر اِدھر ہیں چمنستاں میں گُل و سرو و سمن
تو اُدھر نرگس و ریحان و ظہورِ سوسن

ساقیٔ مست ء قدح نوش کہیں جلوہ فگن
کہیں ہے مطربۂ زہرہ شبیہ و پُرفن

جوشِ وحشت میں چلے دشت کو پھر دیوانے
جیب و دامن کو بنا ڈالا ہے پُرزے پُرزے

کیوں پڑے پھرتے ہیں کُہسار میں مارے مارے
ہائے کس گل کیلئے ہیں یہ پریشاں رہتے

پھر مسرّت سے کوئی گاتا ہے گلشن میں ملہار
ہولیاں کھیل رہا ہے کوئی ہو کر سرشار
یادِ ایّامِ گذشتہ کی ہوئی پھر تجدید
گُلِ عشرت سے کوئی پھر ہے گلستاں بکنار

آزاد انصاری

نقد و نظر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔ ہر سال اردو زبان کو مالا مال کرتی رہتی ہے۔ ہر سال کوئی نئی تصنیف' نیا ترجمہ' نئی تالیف شایع ہوتی رہتی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے انجمن کی تین کتابیں ہیں:-

(۱) ارتقا۔ یہ سو صفحے کی کتاب ہے۔ مجلد کی قیمت ۱۲ ہے۔ اور غیر مجلد کی ۸۔ ارتقا کے مسئلہ پر نصف صدی تک سر پھٹول ہوتی رہی۔ مذہب اور سائنس کا معرکہ اسی کارزار میں ہوتا رہا۔ اسی کی بنا پر اردو میں اکبر مرحوم نے ڈاروِن پر خوب خوب پھبتیاں کہیں۔ مگر کس قدر تعجب ہے کہ آجتک اردو میں کوئی مستقل تصنیف اس موضوع پر نہ تھی۔ ہمارے پڑھے لکھے آدمی بھی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ ارتقا سے مراد "بوزنہ ہونا" ہے۔ حالانکہ یہ بالکل بے حقیقت امر ہے۔ مگر اب اس ناآگاہی کا کوئی بہانہ نہیں۔ کیونکہ مشتاق احمد صاحب وجدی نے نہایت وضاحت واختصار کے ساتھ اس مسئلے کے بنیادی اصول پر روشنی ڈال دی ہے +

(۲) دیوانِ یقین۔ انعام اللہ خاں یقین میر و سودا کا ہمعصر ایک جوانمرگ شاعر ہے۔ جسے اس کے والد نے نجانے کس بنا پر قتل کر دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ افواہ کی بنا پر ہو یا واقعات پر کوئی باپ اپنے بچے کو یونہی قتل نہیں کر ڈالتا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے یقین کا دیوان مرتب کیا ہے۔ اور اس پر بہت محنت صرف کی ہے۔ کوئی تیرہ مختلف نسخوں کو استعمال میں لائے ہیں اور صحیح حالات بہم پہنچانے کے لئے درجنوں تذکرے کھنگالے ہیں۔ معاصرین کے کلام سے کلام کا مقابلہ کیا ہے۔ قیمت مجلد کی دو روپے اور غیر مجلد کی عہر ہر وہ شخص جسے ادبیات اردو کی تاریخ سے کچھ مس ہے اُس کے پاس اس نسخہ کا ہونا ضروری ہے۔ یوں بھی یقین کے کلام میں چاشنی موجود ہے کہتا ہے ؎

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے | زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے
اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقین | ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

---

(۳) سہ نظمِ ہاشمی۔ یہ ایک زندہ شاعر کی تین نظموں کا مجموعہ ہے کتاب ٹائپ میں ہے۔ حجم ۳۲ صفحات قیمت ۱۲ چند شعر ہیں مگر خیال اور طرز تحریر دونوں مصنف (سید ہاشمی فریدآبادی) کو عام شعرا کی سطح سے بلند کئے دیتے ہیں۔ یہاں ہوا و ہوس کی بات ہو نہیں فہم و فراست کی تمکنت ہے۔ یہ وہ شاعری کا سکول ہے جس کی بنیاد غالب نے ڈالی اور اقبال نے تکمیل کی اور تخیل کا ایسا فلک بوس محل تعمیر کیا کہ اگر زمین پر رینگنے والے نقاد اس کی بلندیوں سے منکر نہ ہوں تو جائے تعجب ہے۔ اقبال کی اس تکمیل کاری کی بدولت اس نہج کے کئی اچھے شاعر کو عام نظروں میں نہیں جچتے۔ مگر کسقدر بے بصری ہوگی اگر تاج محل کے بے مثال حسن کی وجہ سے ہم ثمن برج کی دلآویزیوں سے انکار کر دیں۔ سید ہاشمی کا کلام یقیناً قابلِ مطالعہ ہے اور اس مختصر سے مجموعہ میں بہت سے شعر ایسے ہیں جو عام سطح سے بہت بلند ہیں۔ مگر کچھ ایسے شعر بھی ہیں جو تخیل کی بے حرارتی کی وجہ سے یخ بستہ ہو گئے اور ذوق کے مفلوج قصائد کی بے جان تشبیب کی طرح گو نگے بن کر رہ گئے ہیں ملاحظہ ہو ؎

خیال سرقہ کے آتے ہی ہو گئے شل ہاتھ | نگاہِ بد کے اُٹھتے ہی سلب پنج حواس
غرض ؎ یہ نظم ہو کہ ہے سرمیتکی بدخوابی | یہ شعر ہیں کہ کسی نوزاد کے انفاس

---

(۴) منتخبات ہندی کلام۔ یہ بھی دکن کی کتاب ہے۔ اور حیدرآباد بک ڈپو کے پتے سے ۱۲ کو مل سکتی ہے جس کسی کو ہندی شاعری سے محبت ہے اور وہ کون ہے جسے شاعری سے محبت ہے اور وہ ہندی شاعری کی سحرکاری کا انکاری ہے اسے یہ کتاب ضرور ضرور منگوا لینی چاہیئے۔ ڈاکٹر جعفر حسن پی۔ ایچ۔ ڈی نے ہندی شاعری سے زیادہ تر اخلاقی اور فلسفیانہ اور کچھ عشقیہ دوہے لئے ہیں اور ہندی اور اردو عبارت میں اصل دے کر ساتھ لفظی ترجمہ کیا ہے مشکل الفاظ کا حل دیا ہے اور ساتھ ضروری اور غیر ضروری ہر طرح کی تشریحات کا اضافہ بھی کیا ہے +

نقاش

جملہ حقوق محفوظ — اشاعت ۵۲۵۰

نیرنگِ خیال ستمبر ۱۹۳۱ء

جلد ۱۱ — ایڈیٹر: حکیم محمد یوسف حسن — نمبر ۸ — ۸۷
چندہ سالانہ ہے ... ممالک غیر سے ۸ شلنگ - فی پرچہ ۸ ر - ویلیو بک سٹال پر ۸ ر

"ایجاد ہمارا حصّہ ہے اور تقلید دوسروں کا"

فہرست مضامین

شذرات

از اسسٹنٹ ایڈیٹر

نیرنگ خیال کے ہر نمبر کے مضامین بیحد دلچسپ اور جاذب توجہ ہوتے ہیں - زیر نظر نمبر میں بھی کئی مضامین قابل تعریف ہیں - آئندہ نمبر نیرنگ خیال کا ایک اور خاص نمبر ہوگا - جسے " ادبائے قدیم کے طرز نگارش " کے نام سے موسوم کیا گیا ہے - اس میں اردو کے مشہور انشا پردازوں کے نہایت دلچسپ مضامین جمع کئے گئے ہیں - اس نمبر کا حجم بھی زیادہ ہوگا - کاغذ بھی ولایتی رنگین لگایا جائے گا - دسمبر میں نیرنگ خیال کا افسانہ نمبر چھپیگا - ساتھ ہی سالنامہ بھی حسب دستور شایع ہوگا - جس کے لئے اہتمام کیا جا رہا ہے کہ وہ ہر پہلو سے بے مثل اور لاجواب ہو - یہ ہمارا زبانی دعویٰ ہی نہیں نیرنگ خیال کے سالنامے اس کا عملی ثبوت موجود ہیں - ۱۹۳۲ء کا سالنامہ تو اتنا شاندار ہے کہ آپ گذشتہ سالناموں کو بھی شاید بھول جائیں +

نیرنگ خیال کے ان خاص نمبروں کے علاوہ دسمبر میں تازیانہ ریویو کا سالنامہ موسوم بہ " اسلامی دنیا " بھی شایع ہوگا - تازیانہ ریویو بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے یہانتک کہ بعض حلقوں میں اسے نیرنگ خیال پر ترجیح دی جا رہی ہے - تازیانہ ریویو کا چندہ سالانہ صرف چار روپے ہے - مگر نیرنگ خیال کے خریداروں سے صرف تین روپے لئے جاتے ہیں - اور تازیانہ ریویو کا سالنامہ موسوم بہ اسلامی دنیا بھی اسی چندہ میں خریداروں کو ملتا ہے - امید ہے کہ ناظرین نیرنگ خیال اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے +

" مرزاجی " نامی ایک کتاب مزاحیہ مضامین کا ایک نہایت دلکش مجموعہ ہے - ناظرین نیرنگ خیال جناب حضرت ایم ایم اسلم کے اسم گرامی سے ناواقف نہ ہونگے جو نیرنگ خیال کی بزم ادب کے اولین ارکان میں سے ہیں اور جن کے متعدد مضامین نیرنگ خیال میں شایع ہو چکے ہیں " مرزانہ وقتی " نیرنگ خیال کے کسی نمبر میں شایع ہوکر بیحد مقبول ہوا تھا - اسوقت ملک کے قریباً تمام چیدہ رسایل میں حضرت ایم اسلم کے مضامین شایع ہوتے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں - " مرزاجی " نامی کتاب میں اس عجیب و غریب کیریکٹر کے متعلق جسقدر مضامین لکھے گئے تھے انہیں کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے - ہر مضمون بیحد دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے - حضرت ایم اسلم صاحب نے مرزاجی نامی کتاب لکھ کر ملک کی مزاحیہ تصنیفات میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے - امید ہے کہ ناظرین اس کتاب کو خرید کر اپنی لائبریریوں کی زینت بنائیں گے - تفصیلی ریویو کے لئے آئندہ نمبر کا انتظار کیجئے +

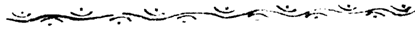
نیرنگ خیال نے سب سے اول مزاحیہ مضامین کی اشاعت کا انتظام کیا تھا - اس لئے کوشش کی جا رہی ہے کہ نیرنگ خیال بک ڈپو کی طرف سے تمام مزاحیہ کتابیں ناظرین کو مہیا کی جایا کریں - مثلاً شریر بیوی - روح ظرافت (جسمیں انگوٹھی کی مصیبت اور دیگر افسانے ہیں - از مرزا عظیم بیگ چغتائی) مضامین پطرس - انتخاب اودھ پنچ - اور مرزاجی - اس کے علاوہ حضرت شوکت تھانوی اور ملا رموزی صاحب کی مزاحیہ تصنیفات مہیا کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے +

عشق کی گولیاں والے مضمون کا بقیہ دیر سے موصول ہوا تھا - اسلئے ہم اسے اس نمبر میں شایع نہیں کر سکے - آیندہ نمبر ادبائے قدیم کے طرز نگارش ہے - اسلئے اسمیں بھی اسے جگہ نہیں دی جا سکتی - البتہ نومبر کے پرچہ میں ہم " عشق کی گولیاں " **کا** بقایا شایع کرینگے اور اس کے ساتھ مرزا عظیم بیگ چغتائی **کا ایک** نامکمل مضمون بھی شایع ہوگا جس کا بقیہ لکھنے کی دعوت انہوں نے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کو دی ہے +

ہنسی کا راز - ایک مضمون نیرنگ خیال کے گذشتہ نمبر میں شایع ہوا ہے اسمیں چیخ پکار لفظ دو جگہ استعمال ہوا ہے - کاتب نے تو دونوں جگہ چیخ پکار لکھا لیکن مصحح نے ایک جگہ چیخم پکار بنا دیا - یہ واؤ زائد ہے - ناظرین درست کر لیں + (اسسٹنٹ ایڈیٹر)

نوائے شوکت

(از حضرت شوکت تھانوی)



جو اب بھی وفا سے پشیمان ہوگا — تو مجھ پر مرے دل کا احسان ہوگا
جو یوں ہی ترا سب کو ارمان ہوگا — تو میں کیا زمانہ پشیمان ہوگا
یہ اودی گھٹا ہے یہ رنگیں فضا ہے — تو اب کون کافر مسلمان ہوگا
نہ مانا مرا دل نے کہنا نہ مانا — کہا تھا کہ اے دل پشیمان ہوگا
گھٹا گھر کے آئی ہے پھر میکدے پر — زمیں پر فلک آج قربان ہوگا
یہ محشر ہے لیکن وہ محشر کہاں ہے — جہاں اے خدا وہ پشیمان ہوگا
یہ مایوسیاں ہیں تو اب کچھ دلوں میں — نہ ہم ہی رہیں گے نہ ارمان ہوگا
جسے کفر کہتے ہیں سب بتکدے میں — حرم میں پہنچ کر وہ ایمان ہوگا
فلک پر شفق کیوں نظر آرہی ہے — یہ خونِ تمنا کا عنوان ہوگا
وہ اور اُن سے تجدید عہد تمنا — کوئی پھر تباہی کا سامان ہوگا
اُدھر باغ میں غنچہ و گل ہنسیں گے — اِدھر ٹکڑے ٹکڑے گریبان ہوگا
جہاں تک تمہاری عنایت بڑھیگی — وہیں تک تباہی کا امکان ہوگا
میں تنہا نہ چھوڑونگا تجھ کو کہیں بھی — ترے ساتھ ہی میرا ارمان ہوگا

قیامت اُسی دن سے اُٹھیگی شوکت
قیامت کا جس دل میں ارمان ہوگا

شوکت

دُرِ یگانہ

از حضرت میرزا یگانہ لکھنوی

ڈرتے ڈرتے گناہ کر لیتا ہوں
دُزدیدہ سہی، نگاہ کر لیتا ہوں
کیا کیجئے۔ دادِ حسن دیتے ہی بنی
دُکھتے ہوئے دل سے آہ کر لیتا ہوں

(ولہ)

پُتلا مٹی کا خاک ہوگا کہ نہیں
پیراہنِ عمر چاک ہوگا کہ نہیں
آلودۂ رنگ و بوئے مستانہ سہی
دل خاک میں مِل کے پاک ہوگا کہ نہیں

(ولہ)

منزل کا پتہ ہے نہ ٹھکانا معلوم
جب تک نہ ہو گم۔ راہ پہ آنا معلوم
کھو لیتا ہے انسان تو کچھ پا لیتا ہے
کھویا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم

(ولہ)

گذری ہے بہارِ عمر تنکے چُنتے
آتشکدۂ شوق میں جلتے بھُنتے
یارانِ چمن گاتے ہیں اپنی اپنی
میری سُنتے تو دیر تک سر دھنتے

(ولہ)

اُستادِ یگانہ بے گُرے کیوں ہوتے
آپ اپنی نگاہوں میں بُرے کیوں ہوتے
اُستادِ ازل کے ہیں جو شاگرد رشید
غالب کی طرح بے سرے کیوں ہوتے

میرزا یگانہ لکھنوی سب رجسٹرار عثمان آباد دکن

کیا اکبر اُمّی محض تھا؟

ایک اہم تاریخی انکشاف

از جناب ایم فضل الحق صاحب

مورخین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اکبر اُمّی محض تھا۔ نوور[1]۔ بیوریج[2]۔ اسمتھ[3] آزاد[4] اور دیگر بہت سے مشاہیر مورخین بھی اسی رائے پر صاد کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اُس وقت تک جو مواد فراہم ہوسکتا تھا۔ اُس کی روشنی میں وہ اسی نتیجہ پر پہنچ سکتے تھے اور یہ رائے رکھنے میں حق بجانب تھے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر نریندرا ناتھ لا نے اپنی کتاب

Promotion of Learning in India during Muhammadan Rule.

"عہد شاہان اسلام میں ہندوستان کی علمی ترقیاں"

میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اکبر اُمّی محض نہ تھا۔ مگر یہ حقیقت کسقدر استعجاب انگیز ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے "جعلی" تزک[5] جہانگیری کے چند فقروں پر زیادہ تر اپنے دلایل کا انحصار رکھا ہے۔ ان کی اس کمزوری کی طرف مسٹر بیوریج نے اپنی معمولی صحت کلامی کے ساتھ ڈاکٹر لا کی کتاب[6] کا دیباچہ لکھتے ہوئے موخرالذکر کو توجہ دلائی ہے۔ اس پر ڈاکٹر لا کو جواب دیتے ہوئے مسٹر بیوریج نے اسی کتاب کا جو ضمیمہ[7] لکھا ہے۔ اُس میں اُنھوں نے جہانگیر اور کیتھولک مبلغین کے اُن بیانات کو معیار تنقید پر کس کر دیکھا ہے۔ جن پر مسٹر بیوریج کی تنقید مبنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر لا نے اپنے جواب الجواب میں آئین اکبری کی کچھ عبارت بطور استدلال پیش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اکبر کو ہندسوں اور رقموں کی پہچان تھی۔ اور وہ روز مرّہ کا حساب کتاب اپنی کتابوں پر اپنے قلم سے لکھ لیتا تھا[8]

اگر میں غلطی پر نہیں تو مذکورالصدر بیان خاص صحیح بیان ہے۔ جو اس مبحث کے متعلق عام معلومات کا ماخذ و منبع ہوسکتا ہے۔ مگر حال ہی میں مجھے مزید مواد حاصل ہوا ہے جس سے مجھے توقع ہے کہ اس باب میں ہماری معلومات میں خاص اضافہ ہوجائے گا۔ اور یہ ثابت ہوجائے گا کہ یہ کتنا سخت غلطی ہے کہ اکبر اُمّی محض تھا۔ بلکہ وہ پڑھ بھی سکتا تھا اور لکھ بھی سکتا تھا۔ لیکن اصل مبحث پر اظہار خیال کرنے سے قبل میں نہایت مختصر طور پر ان مورخین کی دلائل پیش کئے دیتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ اکبر اُمّی محض تھا۔ وہ کہتے ہیں:-

---

[1] اکبر جلد دوم صفحات ۲۴۳ و ۵۶۔ [2] ۔ [3] وہ لکھتا ہے "غالب خیال یہ ہے کہ اکبر کو کبھی لکھنا اور پڑھنا نہیں آیا۔ (اکبرنامہ ترجمہ انگریزی صفحہ ۵۱۸)
[3] اپنی کتاب "اکبر" مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۹ء صفحہ ۲۲) میں وہ لکھتا ہے "اسکول ماسٹر کے نقطۂ نظر سے اکبر ایک بالکل کاہل وجود لڑکا تھا۔ اور اُس کو کتابی علم سکھانے کی جو جد و جہد کی گئی اُس کا اُس نے ایسی کامیابی سے مقابلہ کیا کہ الف۔ ب۔ ت تک بھی نہ سیکھی۔ اُس نے اپنی عمر کے آخری ایام تک بھی کچھ نہ پڑھا یہاں تک کہ دستخط بھی نہ کرسکتا تھا (خط کشیدہ الفاظ ہمارے ہیں) [4] دربار اکبری (مطبوعہ لاہور ۱۸۹۸ء) صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴۔ [5] لانگ مین گرین اینڈ کو ۱۹۱۶ء۔ [6] واقعات جہانگیری (ترجمہ میجر پرائس ۱۸۹۲ء) صفحات ۴۴ و ۴۵۔ [7] وہ لکھتا ہے کہ مسٹر لا نے اپنی کتاب میں اکبر کے متعلق جو باب لکھا ہے اُس میں وہ اکبر کے خواندہ ہونے کے قصہ پر یقین نہیں کرتے حالانکہ خود اُن کے صاحبزادہ کے اور کیتھولک مبلغین کے بیانات اکبر کے خواندہ ہونے کے موید ہیں مسٹر لا نے میجر پرائس کے ترجمہ کردہ جعلی تزک جہانگیری پر اعتبار کیا ہے۔ [8] صفحات ۲۰۷ و ۲۱۲۔ [9] صفحہ ۲۱۰

(۱) اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ اکبر خواندہ تھا تو ابو الفضل جو اکبر کے محاسن اور کارناموں کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے، اس حقیقت کو ضرور واضح کرتا +

(۲) دیگر معاصر مورخین کا اس باب میں سکوت اہمیت سے خالی نہیں +

(۳) یہ کہ کیتھولک مبلغین کی شہادت جو اکبر سے ذاتی طور پر ملتے تھے نتیجہ خیز ہے مثلاً فادر (پادری) اسے مانزریٹ لکھتا ہے۔ "وہ (اکبر) نہ لکھ سکتا ہے اور نہ پڑھ سکتا ہے۔ مگر وہ ہر بات معلوم کرنے کا بیحد آرزومند رہتا ہے۔ وہ اہلِ علم کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے[۵۱]۔ فادر (پادری) جیروم اکیسویر اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے "بادشاہ (اکبر) حیرت انگیز قوتِ حافظہ رکھتا ہے۔ یہانتک کہ اگر وہ لکھ پڑھ نہیں سکتا لیکن علماء فضلا جو کچھ اُس کے سامنے بیان کرتے ہیں اور جو کچھ اُس کے روبرو پڑھا جاتا ہے اس کو وہ یاد رکھتا ہے[۵۲] +

(۴) جہانگیر کی شہادت اس نظریہ کی کہ اکبر پڑھا لکھا تھا قطعی تکذیب کرتی ہے۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے[۵۳]:۔

"میرے والد بزرگوار ہر مذہب اور عقیدت کے علماء بالخصوص پنڈتوں اور علمائے ہند سے میل جول رکھتے تھے اور ان کے ساتھ مجالست رکھنے کے باعث ان کی استعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ کوئی شخص ان کو ناخواندہ نہ سمجھتا تھا۔ وہ نظم و نثر کے محاسن و دقائق کو اس خوبی سے سمجھتے تھے کہ اس کمی کا کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا[۵۴]"۔

لیکن جو مورخین متضاد خیال رکھتے ہیں وہ یہ دلائل پیش کرتے ہیں:۔

(۱) محض اکبر کی خاموشی اکبر کے خواندہ ہونے کے خلاف حجت نہیں ہو سکتی۔

(۲) ابو الفضل صاف کہتا ہے کہ اکبر ہندسوں اور رقموں سے واقف تھا۔

(۳) کیتھولک مبلغین کے بیان پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ عام طور پر غلط بیانی سے کام لیا کرتے ہیں +

(۴) یہ کہ "تزک" میں لفظ "اُمّی" جو استعمال ہوا ہے اور جس کے معنے ناخواندہ کے لے لئے گئے ہیں، اس کا ترجمہ "کم سخن" بھی ہو سکتا ہے +

دو مختلف رائیں رکھنے والے مورخین کے دلائل و براہین کو میں نے قارئین کے سامنے مختصر طور پر رکھدیا ہے۔ اب میں اس تمام مسئلہ کی تازہ ثبوت کے ساتھ جو خوش قسمتی سے مجھے ملا ہے۔ معیار تنقید پر جانچ کرتا ہوں +

اکبرنامہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو ۲۰ر نومبر ۱۵۴۷ء کو جو سنہ ۹۵۴ھ کی ساتویں شوال تھی مدرسہ بھیجا گیا۔ اس وقت اکبر کا سن چار سال چار ماہ اور چار دن کا تھا۔ اسی کتاب سے ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اکبر کو (تعلیم کی غرض سے) ملازادہ ملا عصام الدین ابراہیم کی نگرانی میں دیا گیا۔ اور اُن کی علیحدگی پر اس کی تعلیم کا کام مولانا بایزید کو سپرد کیا گیا[۵۷]۔ لیکن جب ہمایوں کو معلوم ہوا کہ اکبر مولانا بایزید کی نگرانی میں تعلیم میں ترقی نہیں کر رہا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ اکبر کی تعلیم پر ملا عبد القادر۔ ملازادہ ملا عصام الدین اور ملا بایزید کو مامور کیا جائے۔ اور ان میں سے جو شخص تعلیم دینے میں کامیاب ثابت ہو اُسی کو اکبر کی تعلیم کی خدمت سپرد کر دی جائے +

مولانا عبد القادر کی قسمت یاور رہی۔ وہ کامیاب ثابت ہوئے اور مولانا بایزید کی علیحدگی اور مولانا عبد القادر کے تقرر کے متعلق حکم صادر ہو گیا[۵۸]۔ مولانا عبد القادر کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے فرائض نہایت عمدگی سے انجام دیئے۔ مگر بعد میں عزم بیت اللہ شریف کے باعث ملازمت ترک کر دی

---

[۵۱] فادر اے مانزریٹ کے حالات اکبر (۲۶ نومبر ۱۵۸۲ء) جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد ہفتم و چہارم ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۹۴ (مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "عہد شاہانِ اسلام میں علمی ترقیاں" کا صفحہ ۲۰)۔ [۵۲] فادر جیروم ایکسویر مصنفہ ایچ ہیویرج جے۔ اے۔ ایس۔ بی ۱۸۸۸ء صفحہ ۳۷۔ [۵۳] تزک جہانگیری ترجمہ اے راجرس و ایچ بیویرج (اورنٹیل ٹرانسلیشن فنڈ سیریز) جلد ۱ صفحہ ۳۳۔ [۵۴] اس کے اصل الفاظ یہ ہیں "با آنکہ اُمّی بود نہا از کثرت مجالست بلدا ماپان و ارباب فضل در گفتگوہا چناں ظاہر میشد کہ ہیچ کس پے بامی بودن۔ ایشاں نے برد۔ بدقایق نظم چناں میرسید کہ مافوقی براں متصور نبود۔ ترجمہ۔ باوجودیکہ ناخواندہ تھے پھر بھی عقلا اور ارباب فضل سے کثرت کے ساتھ ملنے جلنے کے باعث گفتگو سے ایسا (علم) ظاہر ہوتا تھا کہ کسی کو ان کے اُمّی ہونے کا پتہ نہ چلتا تھا۔ نظم کی باریکیوں کو اس طرح سمجھتے تھے کہ اس سے بہتر سمجھنا تصور میں بھی نہ آسکتا تھا۔ تزک جہانگیری۔ مرتبہ سید احمد علیگڈھ ۱۸۶۴ء صفحہ ۱۴)۔ [۵۵] اکبرنامہ Bibl. Indica ملکٹ جلد ۱ صفحہ ۲۷۰۔ ترجمہ جلد ۱ صفحہ ۵۱۹۔ [۵۶] ملا عصام الدین جن کی بدایونی (لوی جلد ۲ صفحہ ۱۹۰) کے بیان کے مطابق فارسی کے برابر عربی کی تعلیم نہ تھی۔ اکبر کے سب سے پہلے اتالیق مامور ہوئے تھے۔ چونکہ ملا عصام الدین کبوتر بازی میں بہت مصروف رہتے تھے۔ خادم نے اعلیٰحضرت کے حضور میں اسکی شکایت کی۔ اس پر اعلیٰحضرت ہمایوں نے ان کو علیحدہ کر دیا اور غیر درسی تعلیم کا کام مولانا بایزید کے سپرد کر دیا (اکبرنامہ بیوریج جلد ۱ صفحہ ۵۸۸)۔ [۵۷] اکبرنامہ (Bibl. Indica ملکٹ صفحہ ۲۷۱۔ ابو الفضل ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ مولانا بایزید جو ایک مشہور طبیب تھے اعلیٰحضرت شہنشاہ اکبر (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷ پر)

تاریخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ بیرام خاں نے ۹۶۳ھ میں جب اکبر کی عمر ۱۵ سال تھی کے قریب تھی میر عبداللطیف[۵۱] کو اکبر کا اتالیق خاص مقرر کیا۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد خاں[۵۲] اور حاجی محمد خاں[۵۳] اور ملا علاؤالدین[۵۴] نے بھی اکبر کی اتالیقی کی خدمات انجام دیں +

مذکورہ بالا امور سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر کو ۴½ سال کی عمر میں مدرسہ بٹھایا گیا اور اگر زیادہ نہیں تو پندرہویں سال تک اکبر نے تعلیم پائی۔ یہ کسقدر حیرت انگیز بات ہے کہ اکبر نے ہزار ہا روپیہ پروا اور کھلاڑی لڑکا ہونے کے باوجود اتنے طویل عرصے میں اتنی تعلیم بھی حاصل نہ کی ہو کہ وہ لکھ پڑھ بھی سکتا۔ مگر اس امر واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کھیلوں میں بہت زیادہ دلچسپی لینے کے باعث اکبر نے نوشت و خواند میں بہت کم ترقی کی۔ اور علماء طفولیت میں جو کچھ سیکھا تھا اُس میں سے بھی بہت کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ ابوالفضل اپنے انداز خاص میں اس کی وضاحت کرتا ہے :-" اس ذات کے لئے جسکا خدا خود معلم ہے کونسا موقع ہے کہ مخلوق خدا اُس کو تعلیم دے یا وہ درس حاصل کرے"۔ چنانچہ اکبر کا پاک و مصفا دل اور مقدس روح خارجی تعلیم کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوتی تھی۔ مگر ابوالفضل ان الفاظ میں خود اپنی ہی تردید کرتا ہے :-

" از کتب نظم مثنوی مولوی و دیوان لسان الغیب خود بسعادت روال میخوانند و از حقایق و لطائف آں التذاذ مے یابند"۔

ترجمہ:-" نظم کی کتابوں میں سے مثنوی مولوی (مثنوی مولانا روم) اور دیوان لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؒ زفر پڑھتے ہیں اور ان کے حقایق[۵۵] و لطائف سے لطف اُٹھاتے ہیں" +

مذکورۃ الفوق بیان فیصلہ کن ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر لکھ پڑھ سکتا تھا بلکہ وہ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ جیسی مشکل کتابیں روانی سے پڑھ سکتے تھے۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ ہمارے پاس ابوالفضل کی بھی سند ہے اور ہم بیان کر سکتے ہیں کہ اکبر ہندسے اور رقوم جانتا تھا۔ اور یہ کہ وہ خود اپنے قلم سے کتب کے حواشی پر ہندسے اور رقوم لکھنے کا عادی تھا۔ اس سلسلہ میں آئین اکبری کے الفاظ یہ ہیں :-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶) کے اتالیق نامزد کئے گئے۔ اُنہوں نے ہمایوں کے دوران علالت میں اعلیٰ خدمات انجام دیں (اکبرنامہ بیوریج جلد ا صفحات ۴۹۵ و ۴۹۶) [۵۰] اکبرنامہ (Bib. Indica ٹکسٹ صفحہ ۵۸۸) ملا عبدالقادر کو ابوالفضل نے علمائے نقل کی فہرست میں شامل کیا ہے (آئین اکبری بلاکمان جلد اوّل صفحہ ۵۴۰) بدایونی (لووی جلد ۲ صفحہ ۳۲۲) ملا عبدالقادر کو شہنشاہ کا اتالیق بتاتا ہے۔ مگر نظام الدین (طبقات اکبری مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۵ء صفحہ ۳۹۲) کا بیان ہے کہ ملا عبدالقادر اخوند نائب عدل نے چند سال تک تعلیم دی اور آخر کار حجاز کو چلے گئے" یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ڈاکٹر لاکو ابوالفضل۔ بدایونی۔ اور نظام الدین کی تاریخوں میں ملا عبدالقادر کا کہیں پتہ نہ چلا وہ لکھتے ہیں کہ اردو کی تصنیف دربار اکبری ایک مولانا عبدالقادر کا اضافہ کرتی ہے۔ مگر چونکہ ملا موصوف کے متعلق جن مورخین کی سند دی گئی ہے اُن کے نام نہیں دئے گئے۔ اس لئے موجودہ مقصد کے سلسلے میں دربار اکبری کے بیان سے مجھے کوئی مدد نہیں ملی (عہد شاہان اسلام میں ہندوستان کی تعلیمی ترقیاں صفحہ ۲۱۰) [۵۱] میر عبداللطیف قزوینی شہنشاہ ہمایوں کی دعوت پر ہندوستان آئے۔ مگر اُن کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی ہمایوں کا انتقال ہو گیا اور جب وہ مع اہل و عیال کے دربار میں پہنچے تو اکبر تخت نشین ہو چکا تھا۔ اکبر نے اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال اپنا معلم مقرر کیا"۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱

بدایونی (جلد ۲ صفحہ ۴۲) اور شاہنواز خاں (ماثرالامرا' جلد ا صفحات ۸۱ و ۸۲) کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عبداللطیف اکبر کو دیوان حافظ کا درس دینے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ بدایونی لکھتا ہے" ان ایام میں بادشاہ نے میر عبداللطیف کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی اور انہی سے اُنہوں نے تصوف رکھنے والے دیوان کی تعلیم شروع کی (لووی جلد ۲ صفحہ ۴۲) مگر شاہنواز خاں مندرجہ ذیل مخصوص بیان دیتا ہے :- " آں پادشاہ والاجاہ خط و سواد نداشت۔ لکن اوقات برخی غزلہائے لسان الغیب نزد میر میخواند"۔ ترجمہ۔ بادشاہ والاجاہ ناخواندہ تھے کبھی کبھی لسان الغیب (حافظ شیرازی) کی غزلیات میر (عبداللطیف سے پڑھتے تھے"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہنواز خاں نے بدایونی سے مواد فراہم کیا ہے۔ مگر الفاظ " آں پادشاہ والاجاہ خط و سواد نداشت" شاہنواز کی حاشیہ آرائی ہے۔ بدایونی۔ ابوالفضل۔ اور طاہر محمد (روضۃ الطاہرین) ایک معاصر مورخ' میں سے کوئی بھی شاہنواز خاں کے بیان سے متفق نہیں اور ان قدیم تر مورخین کے غیر مستند بیانات کے پیش نظر ہم شاہنواز خاں کے بیان کو ماننے کو تیار نہیں مزید ثبوت کے لئے تاریخ فرشتہ (مترجمہ برگ) میں ملا عبدالقادر کے حالات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بدایونی ملاحظہ ہو وہ لکھتا ہے کہ اعلیحضرت نے دیوان خواجہ حافظ اور دیگر کتب کے متعدد اسباق پڑھے تھے۔ ملا کے متعلق مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو" فرشتہ" مترجمہ برگز جلد ۲۔ صفحہ ۲۰۰) بدایونی (مترجمہ اینکنگ جلد ۳ صفحہ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰) (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹ پر)

"وہر کتابے را از آغاز تا بہ انجام شنوند وہر روز کہ بانجا رسند۔ بشمارہ آں ہندسہ بقلم گوہر بار خود نقش کنند۔ وبحدہ اوراق آں خوانندہ زانقد از سرخ و سفید بخشش شود"+

ترجمہ۔ اور ہر کتاب کو شروع سے آخر تک سنتے ہیں اور جہانتک کتاب کو سنتے ہیں وہاں روزانہ اپنے قلم گوہر بار سے نقش فرما دیتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کو صفحات[1] کے شمار کے لحاظ سے طلائی یا نقرئی سکّے بخشتے ہیں +

اب میں قارئین کے روبرو دو اہم ثبوت پیش کرتا ہوں کہ اکبر اُمی محض نہ تھا۔ اور الفاظ اور جملے تک لکھ سکتا تھا۔ اور اُس کی خود نوشت تحریروں میں سے آجتک ایک تحریر ملتی ہے۔ جو ظفرنامہ[2] جیسی بیش بہا قلمی کتاب میں موجود ہے جو کسی وقت میں شاہان مغلیہ کے پاس تھی اور جیسا کہ میں ظاہر کرونگا اس تحریر کو وہ ایک بیش قیمت چیز سمجھتے تھے۔ یہ تحریر آٹھ تصاویر پر مشتمل ہے جو چھوٹے پیمانے پر بہزاد نے کھینچی تھیں اور فن مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بہزاد ایران کا مشہور ترین مصور تھا۔ یہ قلمی مسودہ ایک اور حیثیت سے بھی نہایت اہم چیز ہے۔ کیونکہ اس میں ایک علیحدہ سادہ ورق پر شہنشاہ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان کے قلم سے لکھی ہوئی عبارتیں ہیں۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر اسکلز نے اپنی اعلیٰ تالیف Die Persische Miniature Malerei

میں جو اس قلمی مسودہ کا چربہ اُتارا ہے وہ بہت ہی ناقابل اطمینان ہے۔ کیونکہ آخر میں مسودہ کا ایک حصّہ ٹائپ میں نہیں آسکا۔ اول ہم جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر کو لیتے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہے:-

الله اکبر

کتاب ظفرنامہ بخط مولانا
شیرعلی وهشت مجلس تصویر کار اوایل اُستاد بہزاد
از کتاب خانہ حضرت عرش آستانی پدر بزرگوار من
(داخل کتابخانہ این بندہ درگاہ الٰہی) شد +
حررہ نورالدین محمد (جہانگیر شاہ ابن) اکبر شاہ

ترجمہ

اللہ اکبر

کتاب ظفرنامہ جو مولانا شیرعلی[3] وہشت کے قلم کی لکھی ہوئی ہے اس میں آٹھ تصویریں ہیں جو اپنی دلفریبی و رعنائی میں عدیم النظیر ہیں۔ جو اُستاد بہزاد نے اپنی اوائل عمر میں کھینچی تھیں اور حضرت عرش آستانی پدر بزرگوار کے کتب خانہ میں داخل کی گئی تھیں۔ این بندہ درگاہ الٰہی کے کتب خانہ میں داخل کی گئی +

رقمزدہ نورالدین محمد (جہانگیر بادشاہ ابن اکبر شاہ)

مذکور الصدر تحریر مظہر ہے کہ یہ نسخہ شہنشاہ اکبر کے کتب خانے میں تھا +

اب دوسرا نوٹ جہانگیر کا ملاحظہ کیجئے (جسکا آخری حصہ فوٹو میں کٹ گیا ہے)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۔ جو لکھتا ہے "اعلیحضرت نے دیوان حافظ اور دیگر کتب کے مختلف سبق اس سے پڑھے تھے + [52] مُلّا پیر محمد کو جو غالباً ایک شنواری افغان تھے۔ بادشاہ کے اتالیق خاص مامور کرنے میں ترجیح دی گئی (فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۳) [53] فرشتہ (جلد ۲ صفحہ ۱۴۹) "حاجی محمد خاں سیستانی بادشاہ کی اتالیقی کے لئے مُلّا پیر محمد کے جانشین مامور کئے گئے" مآثر الامرا (صفحہ ۵۴۸ تا ۵۵۱) بھی ملاحظہ ہو + [54] مولانا نے جو مولانا جلال دوانی شافعی کے شاگرد تھے بھی کچھ عرصہ تک اکبر کے معلّم رہے (آئین صفحہ ۵۴) [55] اکبرنامہ (بیوریج) جلد اوّل صفحہ ۵۸۹ + [56] اکبرنامہ متن صفحہ ۲۷۱۔ میں نے اکبر کی فارسی اور ہندی میں شعرگوئی کو محض بحث میں لانے سے عمداً گریز کی ہے۔ کیونکہ جس مقصد پر میں پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس بحث سے اسمیں مجھے بہت کم مدد مل سکتی ہے۔ تاہم جو شائقین فن اکبر کی فارسی نظم پڑھنا چاہیں وہ اکبرنامہ پڑھ سکتے ہیں (فارسی ٹکسٹ جلد ۱ صفحہ ۲۱۸) نیز اس غرض کے لئے مجمع الفیضی (جلد ۱ صفحہ ۹) وغیرہ کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے + [57] اکبرنامہ (بیوریج) جلد اوّل صفحہ ۵۲۰۔ مسٹر بیوریج نے "رواں مے خوانند" کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حفظ پڑھ کر سناتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر بیوریج اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اکبر اُمی محض یعنی لکھنے پڑھنے سے قطعاً نابلد تھے۔ اور اس وجہ سے اُنہوں نے "حفظ سناتے ہیں" ترجمہ کیا ہے +

(حاشیہ صفحہ ۸) [1] بلاک مین نے "از قلم گوہر بار خود نقش کنند" کا ترجمہ کیا ہے "اعلیحضرت خود اپنے قلم سے نشانی کر دیتے ہیں"۔ حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "اپنے گوہر بار قلم سے ہندسے رقم فرماتے ہیں"۔ اُنہوں نے لفظ "ہندسہ" کا ترجمہ حذف کر دیا۔ لیکن اگر ہم لفظ ہندسہ کو الفاظ "بشمارہ آں" سے ضم کر دیں تو پھر ہمیں یہ فرض کرنا پڑیگا کہ قلمی مسودات جو اکبر کے روبرو پڑھے جاتے تھے اُن پر ہندسے بھی ہوتے تھے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ اُس زمانہ میں مسودات پر صفحات لکھے جانے کا بہت ہی کم رواج تھا۔ میرے اس دعوٰی پر کہ اکبر لکھتا یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ فقرہ "ہندسہ نقش کردن" بہت ہی کم استعمال ہوتا ہے۔ تو پھر "ہندسہ رقم کردن" ہونا چاہیئے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹ پر)

حسب ذیل ہے :-

"ایں کلمہ خط مبارک حضرت عرش آشیانیست و میر جمال الدین حسین انجو ایں نسخہ را در دارالخلافہ (آگرہ پیشکش نمود ....)"

ترجمہ۔ یہ کلمہ حضرت عرش آشانی (یعنی اکبر) کی تحریر ہے۔ میر جمال الدین انجو نے اس نسخہ کو دارالسلطنت آگرہ میں پیش کیا تھا"

ذیل میں ایک بالکل واضح اور فیصلہ کن ثبوت اس بات کا پیش کیا جاتا ہے کہ اکبر الفاظ لکھ سکتا تھا اور نقط

آفرودین

جو قلمی تحریر میں جس کی عکسی تصویر آپ کے سامنے موجود ہے۔ لکھا ہے کہ وہ خود اکبر ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے +

لیکن اگر ہم جہانگیر کے مذکورالصدر بیان کا (جو خود اُسی کے ہاتھ کا نوشتہ ہے) اس کی خود نوشت سوانح عمری کے الفاظ سے جن میں اُس نے لکھا ہے کہ والد بزرگوار "اُمّی" تھے، مقابلہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر خود اپنے بیان کی تردید کر رہا ہے +

البتہ یہ کہ کر جہانگیر کے ان دو متضاد بیانات میں تطابق پیدا کیا جا سکتا ہے کہ شاید اکبر کے بالکل محدود علم کو جہانگیر نے در خور اعتنا نہ سمجھ کر اُس کو اُمّی سے زیادہ لقب دینا مناسب نہ سمجھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے والد کے ان اوصاف کا اظہار کرتے ہوئے کہ وہ نظم و نثر کے حقایق و دقایق کو بخوبی سے سمجھتے تھے۔ اکبر کی علمیت کا ذکر عمداً نظر انداز کر دیا ہو۔ نیز یہ کہ کر کہ اکبر باوجود اُمّی ہونے کے شعراء و مصنفین کی سرپرستی فرماتے تھے، اکبر کے علم پرورانہ اوصاف کی اہمیت کو ظاہر کیا ہو۔ پھر بڑی چیزوں کو اور بھی زیادہ بڑی چیزوں کے مقابلہ میں ان کی وقعت کو بڑھانے کا مسئلہ ہے۔

کون نہیں جانتا کہ پیغمبر اسلامؐ کی توصیف و تحسین اُن کے اُمّی ہونے کے باعث اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ (اور بہت ہی ممکن ہے کہ پیغمبر خدا کے اُمّی ہونے کی صفت سے ایک مماثلت پیدا کرنے کی غرض سے اکبر کو اور بھی اُمّی مشہور کر دیا ہو۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ جب ایران کا قاصد ایک پیغام لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہوا اور "اکبر ناخواندہ ہونے کے باعث" نیچے کے حصے کو سر کی طرف کر کے پڑھنے لگا تو سفیر کو مائل بہ تبسم دیکھ کر ابوالفضل نے کہا "پیغمبر ما اُمّی است"۔ پھر اس لفظی رعایت کو خاص طور پر یوں بھی برتا جاتا ہو گا کہ اکبر نے دین الٰہی جاری کیا تھا۔ نیرنگ خیال)

علاوہ بریں لفظ اُمّی کے اصلی مفہوم و معنی کے متعلق ہنوز فیصلہ نہیں ہوا لہذا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کے معنی "اُمّی محض" کے ہوں +

اب دوسری قابل قدر شہادت جو عبدالباقی نہاوندی کی کتاب "مآثر رحیمی" ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں یعنی اکبر کی وفات سے صرف دس سال بعد لکھی گئی تھی۔ عبدالباقی نہاوندی نے یہ کتاب خان خاناں کے ایما پر لکھی تھی۔ اور اس وقت اُس کے پاس تدوین کتاب کے لئے اصلی کاغذات موجود تھے۔ لہذا اس کتاب میں جو فرامین نقل کئے گئے ہیں اُن کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان دو امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہم اس فرمان کو معیار تنقید پر کس کر دیکھتے ہیں جو اکبر نے ۱۰۰۹ء میں خان خاناں کے نام ارسال کیا تھا۔ اس فرمان کو مآثر رحیمی میں مندرجہ تحت عنوان کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) ابوالفضل فی الحقیقت یہ کہنا چاہتا تھا کہ اکبر کتابوں کے حاشیہ پر نشانی کر دیا کرتا تھا تو اس نے بجائے "ہندسہ بقلم گوہر بار خود نقش مے کردند کہ نقشی بقلم گوہر بار خود مے کردند" کیوں نہیں لکھا۔ ۵۲ آئین اکبری۔ بلاک مین جلد اول صفحہ ۱۰۳ + ۵۳ ظفر نامہ شرف الدین علی یزدی نے ۸۲۸ھ میں تالیف کیا تھا (شرف الدین علی یزدی نے ۸۵۸ھ میں وفات پائی)۔ ۵۴ ہر مسودہ کی تاریخ تحریر ذیل کے فارسی قطعہ میں درج ہے :- تحریر جو تقریر بہ از دُرِّ ثمین شد حیران شہ از صفائی او روح امین از دست فقیر کمترین میر علی شد اتمام کتاب است در تفصیح سنین + الفاظ "تفصیح سنین" سے مراد ۸۷۲ھ مطابق ۱۴۶۷ء ہے + میں اپنے محترم دوست پروفیسر ایچ۔ ایم شیرانی آف لاہور کا بیحد ممنون ہوں (جنھوں نے اس قلمی نسخہ کو پیرس میں دیکھا اور اس کی جانچ کی تھی) یہ قطعہ تاریخ مجھے اُن ہی سے ملا ہے۔ مشرقی فنون لطیفہ کے مشہور معروف محقق پیرس ایم ڈی وکٹر ڈی گولوبیو کے کی شاندار مجموعہ مسودات میں یہ قلمی مسودہ موجود ہے + (حاشیہ صفحہ ۹) میر جمال الدین حسین انجو فرہنگ جہانگیری کے مؤلف ہیں۔ جو انھوں نے ۱۰۲۲ھ میں شہنشاہ کے حضور میں پیش کی تھی۔ اکبر نے میر جمال الدین کو عادل شاہ شاہ بیجاپور کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ دانیال کی شادی کا معاملہ طے کرنے کی غرض سے دکھن بھیجا تھا۔ اکبرنامہ جلد ۳ صفحہ ۸۲۰) بعد میں میر جمال الدین مورخ فرشتہ کے ہمراہ شہنشاہ کے حضور میں ایک تحفہ پیش کرنے کی غرض سے آگرہ حاضر ہوا جو اس سے قبل کبھی دکھن سے نہیں آیا تھا (آئین اکبری جلد ۱ صفحہ ۴۷۵) مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میر جمال الدین نے اکبر کی خدمت میں جو تحائف پیش کئے اُن میں یہ بیش قیمت قلمی مسودہ بھی ...

"نقل فرمانی کہ بتاریخ نہصد ونود ویک ہنگام توجہ گجرات باایں سپہ سالار انشا نمودہ اند وبدستخط خاصہ ایں بزرگ کا بخطاب فرزندی سرافراز ساختہ"۔

ترجمہ" اس فرمان کی نقل جو ۹۹۱ھ میں گجرات روانہ ہوتے وقت اس سپہ سالار کے نام لکھا تھا۔ اور جس میں (اکبر نے) اپنے دستخطوں سے اس بزرگ کو خطاب فرزند سے سرفراز کیا تھا"۔

اس عنوان کے بعد مصنف اکبر کے اصل الفاظ کو نقل کرتا ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

"شرح دستخط خاصہ ایں خلیفہ الٰہی کہ بربالائے طغرا ایں والا قدر را برتبۂ فرزندی بلند مرتبہ گردانیدہ۔

آمد آنکہ:۔ فرزند عبدالرحیم بداند"

ترجمہ۔ شاہی تحریر کی نقل جو خط طغرا میں خلیفہ الٰہی (اکبر) کے دست خاص کی لکھی ہوئی تھی' اس میں اس کو (خان خاناں) خطاب فرزندی سے سرفراز فرمایا۔ اور خطاب کے الفاظ یہ ہیں:۔

فرزند عبدالرحیم بداند . . . .

یعنی فرزند عبدالرحیم کو معلوم ہو . . . .

یہ اس امر واقعہ کا ایک اور ثبوت ہے کہ اکبر نہ صرف الفاظ بلکہ جملے بھی اپنے قلم سے لکھ سکتا تھا۔

اس سلسلہ میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ اکبر نے (جس طرح بہت سے ناخواندہ اشخاص کرتے ہیں) پہلے سے لکھے ہوئے الفاظ کی نقل کی ہوگی۔ یہ خیال درخور اعتنا سمجھا جاتا۔ مگر ہمارے سامنے اکبر کے لکھے ہوئے اصلی الفاظ موجود ہیں (ملاحظہ ہو عکسی تصویر۔ اور بلاشبہہ ایک معمولی مبصر بھی الفاظ:۔

آفرور دین

معلوم کرسکتا ہے کہ نقل یا کچ عقل والے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ شانِ کتابت خاصی اچھی ہے۔ اگرچہ پختہ نہیں۔ فارسی زبان کے اکثر ماہرین ذ فاضل جنہوں نے قلمی مسودہ کو جانچا ہے اور اس مسئلہ پر مجھ سے بحث کی ہے۔ میری رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے میں اکبر کے ہاتھ کی بعض تحریروں کی طرف' جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ' اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہیں' ارباب نظر کی توجہ منعطف کراتا ہوں وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ میں جو تحریریں ہیں اور جن کو اکبر کے ہاتھ کی تحریریں بتایا جاتا ہے۔ میں نے اُن کی جانچ کی ہے۔ خواہ یہ تحریریں اصلی ہوں یا جعلی' ان قلمی مسودات میں کہیں نام ونشان کو اس کا ذکر تک نہیں کہ ان میں ایک لفظ بھی شہنشاہ اکبر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مگر شاباش ہے ان علامۃ الدہر وافاضل شخصیتوں کی دیدہ دلیری وجرأت کو جنہوں نے کارپردازان وکٹوریہ میموریل ہال کو قلمی مسودہ کے مندرجہ ذیل ذکر کو اپنی فہرست میں شائع کردینے کا مشورہ دیا ہے:۔

"فتوحات مکی کا قلمی نسخہ ۹۰۴ھ (جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے) یہ کتاب علم تصوف پر محی الدین کی تصنیف ہے جو عربی زبان میں ہے۔

جلد اوّل شہنشاہ جہانگیر کے ہاتھ کی۔ جلد دوم عبدالرحیم خان خاناں خلف بیرام خاں کی اور جلد سوم اکبر اعظم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ کتاب ہز اگزالٹڈ ہائنس نظام حیدرآباد دکن نے ۱۹۰۵ء میں میموریل ہال کو عطا کی تھی[2]"۔

میں نے اس قلمی مسودہ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی ایک ہی شخص کی تحریر ہے۔ اور جیسا کہ میموریل ہال کی شائع کردہ فہرست میں لکھا ہے کہ تین مختلف اشخاص (جہانگیر' خان خاناں اور اکبر) نے لکھا ہے غلط ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا کاتب ایک پیشہ ور خوشنویس کاتب شریف محمد ابن نصیر محمد میانجیق ہے۔ جس نے ایک جلد کے اختتام پر اپنے دستخط بھی اس طرح کر دیئے ہیں:۔

" وفد الکاتب بخط احقر عباد اللہ شریف محمد ابن نصیر محمد میانجیق"

یہاں اسقدر اور اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ کتاب کے کاغذ پر شہنشاہ جہانگیر کے قلم کے لکھے ہوں (مورخہ ۲۶ شوال ۱۰۲۰ھ) اور عبدالرحیم خان خاناں کے ہاتھ کے نوٹ درج ہیں۔

اکبر کی دوسری تحریر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ انوار سہیلی کے

---

[1] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا قلمی مسودہ (جن کی خود مصنف نے جانچ کی تھی) اس قلمی مسودہ کو پرنسپل ایم ہدایت حسین نے ترتیب دیا ہے۔ [2] وکٹوریہ میموریل ہال:۔ مسلوں کی مصور فہرست (کلکتہ ۱۹۲۵ء) صفحہ ۵۰۔

میں

کی ذہنیت اور روش یہ بتا رہی ہے کہ مقابلہ و رقابت۔ اختیارِ مشترکہ قوتِ تنظیم جس اشتراک و معاہدہ سے گذر کر جہانبانی و ملک رانی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ اب سوال اس کا نہیں ہے کہ مزدور ایک کارگہ یا کارخانے کے اندر شرکت اختیار اور دخل چاہتے ہیں۔ بلکہ سوال اب اس اجارہ داری کے ختم کرنے کا بھی ہے۔ جو سرمایہ کے سب سے بڑے ادارے یعنی حکومت نے غصب کر لیا ہے۔ باوجود اس کے کہ انگلستان کے عوام کی ذہنیت بہت زیادہ سکون پسند اور آہستہ رَو اور آئین نواز ہے۔ پھر بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ اشتراک و معاہدہ کی سب سے بہترین اسکیم جو وہٹلے کمیشن نے پیش کی تھی مدت ہوئی ناکام ہو چکی ہے۔ اگر ہندوستان کے اندر ان اصولوں نے جگہ پکڑ لی تو ۲۲ کروڑ محنتیوں کے سیلاب کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔ اور یقیناً کارخانوں کا نظم و نسق اور کھیتوں کی کاشت۔ ٹریڈ یونین کا انتظام ہرگز ہرگز جہانبانی کا متحمل نہ ہو سکیگا۔ کیونکہ دنیا کے اس اہم ادارے اور کارخانجات اشیا سازی میں بہت بڑا فرق ہے +

صدیقی مراد آبادی

برشگال

(ہندوستان کا مخصوص پُربہار موسم)

زمیں سے آسماں تک ہے بہار کی ایک موج طاری
چمن چمن صرفِ تازگی ہیں کلی کلی محوِ میگساری

فلک بھی رنگیں، زمیں بھی رنگیں، نظر بھی رنگیں سماں بھی رنگیں
حیاتِ افسردہ جاں بھی رنگیں، لباسِ ہر دو جہاں بھی رنگیں

نکھار پر ہے ہر اک گلِ تر، چمن ہے میخانۂ مسرت
طوافِ شمعِ بہار کر رہا ہے پروانۂ مسرت

ہے برق کی شعلہ تابیوں میں تبسمِ حسن کی روانی
کہ جیسے انگڑائی دفعتاً لے کوئی چمکتی ہوئی جوانی

گھٹاؤں کا اجتماع، توبہ! کہ جیسے گیسو کھلے ہوئے ہوں
ہزاروں میخوار جیسے کو فرگساریوں پر تُلے ہوئے ہوں

فضاؤں کی کیف خیز موجیں بہار کے گیت گا رہی ہیں
برس رہی ہیں جو سرد بوندیں لطیف نغمے سُنا رہی ہیں

وہ بادلوں کی سُبک روانی، کہ جیسے اک مست جا رہا ہو
جمیل گیسو بدوش ساقی گلابیاں بھر کے لا رہا ہو

گھٹاؤں کا جھوم کر برسنا، لطافتِ بے پناہ بن کر
کبھی سرورِ خیال بن کر کبھی نشاطِ نگاہ بن کے

وہ جھولنا نوجوانیوں کا، لطیف جھولوں کے پہلوؤں میں
وہ گیت کی لے کا رقص کرنا فضاؤں کی مست نکہتوں پر

شباب کا آشکار ہونا حسین چہروں کا نور بن کر
وہ سرد بوندوں کی ہلکی ہلکی پھوار پڑنا سرور بن کر

وہ مخملی فرش جنگلوں میں، وہ جوشِ کیف و نمو کا محشر
ہر ایک وادی عروسِ مطلق، ہر ایک کہسار خلد یکسر

کسان کے دل کا غم ہوا کم، اُمید کا کھل گیا گلستاں
تمام کھیتوں سے ہو رہی ہے حیات کی تازگی نمایاں

بہار کا یہ فروغِ تازہ پیام سب کو سُنا رہا ہے
کہ موسمِ برشگال ہندوستان کو جنت بنا رہا ہے

منظر صدیقی (مدیر "شاعر" آگرہ)

سُنیتی

مہارانی کوچ بہار کی "ہندوستانی عورتوں کی نو بہترین مثالیں" کی دوسری کہانی کا آزاد ترجمہ

ازجناب اشفاق حسین صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا لیکچرار سیاسیات علیگڑھ

پُرانے زمانے میں ایک بہت باخدا مہاراجہ تھا۔ اُسکا نام دھرم برت تھا۔ یوں تو اُس کی سلطنت جو جمنا کے کنارہ تھی بہت چھوٹی تھی۔ مگر ساتھ ہی اُس کے خوشحال بھی بہت تھی۔ غم اور رنج، بیماری اور تکلیف کا وہاں گذر ہی نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں کا مہربان اور رحم دل مہاراجہ ہر مصیبت زدہ کی مدد کرتا تھا۔ اور اپنی رعایا کے ساتھ ویسی ہی دلی محبت کرتا تھا جیسے کہ ایک باپ اپنے چہیتے بچوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ اُس کی دینداری اور مذہب کی پابندی کی وجہ سے اُس کی ریاست بالکل ایک تپوبن[1] معلوم ہوتی تھی۔ قدم قدم پر مندر نظر آتے تھے اور سال بھر برابر پوجا اور پُروان کا دَور رہتا تھا۔ دھرم برت گو مہاراجہ تھا۔ مگر ساتھ ہی ایک مہاتما بھی تھا۔ اُس کے نام کے معنی "ایمان کا تلاشی اور شیدا" ہیں اور وہ اسم بامسمیٰ تھا +

گو سارے راج میں ہر طرف خوشی اور امن تھا مگر ایک بات کی کمی تھی جس سے مہاراجہ کے تمام عزیز و اقارب اور رعایا کو رنج تھا۔ دھرم برت کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آخرکار ایک رات مہارانی نے خواب دیکھا کہ اُس کو وشنو کے درشن ہوئے اور دیوتا اُس سے فرما رہے ہیں "بیٹی تو غم نہ کر میں تجھ سے اور تیرے پتی سے خوش ہوں۔ اور تو بہت جلد ماں ہوگی" اور دراصل ایسا ہی ہوا۔ چند ہی مہینے گذرے تھے کہ محل میں ایک نہایت خوبصورت شاہزادی کی ولادت کے جشن ہونے لگے اُس شاہزادی کا نام سُنیتی رکھا گیا +

سُنیتی ابھی چھوٹی ہی تھی کہ ایک روز دربار میں ایک رشی تشریف لائے۔ اور اُنہوں نے شاہزادی کی آنکھ کی پتلیوں میں کنول کے پھول کا عکس دیکھ کر پیشین گوئی کی کہ وہ ایک بہت بڑی رانی ہوگی اور اس کا نام دنیا میں ہمیشہ زندہ اور روشن رہے گا۔ یہ کہہ کر وہ مسکرائے اور رخصت ہوگئے۔ اور پھر کبھی کسی نے اُن کو اُس سلطنت میں نہ دیکھا +

راج کماری سُنیتی جوان ہو کر حسن کی دیوی ہوگئی۔ مگر جتنی وہ خوبصورت اُس سے بھی کہیں زیادہ خوش سیرت تھی۔ اُس کا سولھواں سال ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ کہ اُس کی خوبیوں کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ مگر اُس کے والدین کو اُس کے بیاہ کی جلدی نہ تھی۔ اُن کی دلی تمنا یہ تھی کہ سُنیتی اُن سے کبھی جدا نہ ہو اور اُن کی یہی اُمید تھی کہ اُن کو کوئی ایسا شاہزادہ مل جائے گا جو سُنیتی کا شوہر اور اُن کا بیٹا بن کر اُنہیں کے ساتھ رہے گا۔ اور اُن کے بعد سُنیتی اور وہ دونوں راج کریں گے۔ یہ تو تھے مہاراجہ دھرم برت کے منصوبے، مگر قسمت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا +

جمنا کے کنارے ایک اور سلطنت تھی جہاں ایک جوان صالح مہاراجہ اُدھن یادو کا راج تھا۔ صورت میں، علم میں، کھیل کود میں اور اُن تمام خوبیوں میں جو خاص طور پر مردوں کے جوہر سمجھے جاتے ہیں وہ اپنا ثانی نہ رکھتا تھا ابھی تک اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور اُس نے کہدیا تھا کہ جب تک خود اُس کی مرضی کے موافق دُلہن نہ ملیگی وہ بیاہ نہ کرے گا۔ سارے ملک میں

---

[1] تپوبن = سنیاسیوں کی آبادی۔ جنگل وغیرہ میں ایسی جگہ جہاں صرف سنیاسی رہتے ہیں +

سفیر بھیجے گئے کہ وہ تمام ریاستوں کی شہزادیوں کو خود دیکھ آئیں۔ یہ سفیر ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں مارے مارے پھرے۔ مگر مہاراجہ اُدھن پاد کی پسند اتنی مشکل تھی کہ کوئی شہزادی نظر میں پوری نہ اُترتی تھی۔ اس نااُمیدی کی حالت میں وہ مہاراجہ دھرم برت کے دربار میں پہنچے۔ اُن کے دل پے در پے ناکامیابیوں سے بالکل مر گئے تھے۔ اور اُنھوں نے کسی اُمید سے نہیں بلکہ صرف اپنا فرض اور حجت تمام کرنے کے لئے وہاں کی شاہزادی کا حال پوچھنا شروع کیا۔ مگر جب اُنھوں نے اُس کی صورت سیرت اور دیگر خوبیوں کا ذکر سُنا تو اُن کے دلوں میں پھر پُرانی اُمنگیں اُبھر آئیں۔ اور نئے سرے سے پھر اُمید پیدا ہوئی کہ شاید وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے اور آخرکار اُن کو ایسی شاہزادی مل گئی جو اُن کے مہاراجہ کے قابل ہو اور اُن کی ریاست کے لئے باعثِ فخر۔ بالآخر وہ دربار میں حاضر ہوئے اور مہاراجہ کی خدمت میں بعد آداب عرض کیا کہ وہ اپنے مہاراجہ کا راجکماری کے ساتھ پیام لائے ہیں۔ مگر دھرم برت نے کہا "گو یہ میرے لئے باعثِ عزت ہے کہ اُدھن پاد جیسا بڑا مہاراجہ میرے گھر سے رشتہ چاہے۔ مگر یہ بے سود بات ہے۔ کیونکہ مہاراجہ اُدھن پاد کو ایسی شاہزادی کی ضرورت ہے جو جا کر اُس کی رانی بنے اور چونکہ میرے کوئی لڑکا نہیں ہے میری بیٹی کو میرے بعد یہ راج سنبھالنا ہے"
یہ سُنکر اُدھن پاد کے سفیر رنجیدہ واپس گئے۔ مگر اُن کے بیان نے اُدھن پاد کے دل میں ایک شوق اور گدگدی پیدا کر دی اور اُس نے اپنے سفیروں کو پھر بھیجا کہ وہ کم از کم اُس بے موتی کو ایک نظر اپنی آنکھوں سے خود دیکھ آئیں۔

سفیر اپنے مہاراجہ کے حکم کی تعمیل میں دھرم برت کے دربار میں پھر حاضر ہوئے۔ اور بہت منت و سماجت کے بعد دھرم برت اُن کو اپنی بیٹی دکھانے پر راضی ہو گیا۔ دوسرے روز صبح کو پوجے کے بعد جب اُدھن پاد کے سفیر اور تمام درباری موجود تھے۔ مہاراجہ دھرم برت نے حکم دیا کہ راجکماری دربار میں حاضر ہوں۔ دربار کھچا کھچ بھرا تھا۔ اور فضا میں گویا بجلی دوڑ رہی تھی درباری خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کیونکہ اُن کی راجکماری کے ساتھ اتنا بڑا مہاراجہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی ایک طرف یہ اندیشہ تھا۔ کہ بات اتنی بڑھ جانے کے بعد اگر شاہزادی سفیروں کو پوری طرح پسند نہ آئی تو کیا ہوگا۔ دوسری طرف یہ خیال تھا کہ اگر مہاراجہ دھرم برت نے اپنی بیٹی دینے سے انکار کیا تو گویا اُدھن پاد کی صاف ذلت اور توہین کرنا ہوگی۔ اس امید و بیم میں انتظار کا ایک ایک لمحہ پہاڑ تھا۔ دربار میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ سناٹا چھایا تھا اور سب کی نظریں ایک ہی جانب لگی تھیں۔ اتنے میں سُنتی اپنی سادگی اور بھولے پن کی شان و شوکت سے دربار میں داخل ہوئی وہ ایک ریشم کی آسمانی ساری پہنے تھی جو اُس کے بدن کو پوشیدہ اور حسن کو روشن کرتی تھی۔ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک نایاب کھلا ہوا پھول پانی کی لہر پر تیرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اور جس طرح اُس پھول کی رفتار ہوا کے جھونکوں سے ایک لرزش پیدا ہو جاتی ہے اُسی طرح سُنتی کی چال میں اُس وقت ایک جھجک تھی۔ کیونکہ اُس کو معلوم تھا کہ سارے دربار کی نظریں اُسی پر جمی ہیں۔ اور اُس کا ننھا سا دل اس کیفیت کا متحمل نہ تھا۔ مگر باپ کا حکم باپ کا حکم تھا +

جب وہ اپنے باپ اپنے بادشاہ کے تخت کے پاس پہنچی تو گھٹنوں کے بل جھکی اور سجدہ بجا لائی۔ پھر اُٹھی اور سر نیچا کئے اور ہاتھ جوڑے حاضرینِ دربار کو سلام کر کے اپنے باپ سے مخاطب ہوئی "پتاجی مہاراج آپنے مجھے یاد فرمایا؟" اُدھن پاد کے سفیر سُنتی کی صورت دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ اُس کی چال ڈھال نے اُن کے دلوں کو بالکل گرویدہ کر لیا اور جب اُس کی آواز سنی جو ایک نہایت خوش گلو چڑیا کی جیسی آواز تھی تو وہ بالکل آپے سے باہر ہو کر بھول گئے کہ وہ کہاں ہیں اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ دھرم برت اپنی بیٹی کی ایسی خود رفتہ اور بے اختیار تعریف سے خوش تو ضرور ہوئے مگر اُس کی جدائی کے خیال نے ساری خوشی خاک میں ملا دی۔ جب وہ بولے تو اُنکی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "میری بچی! چند دوست یہاں تجھ کو دیکھنا چاہتے تھے!" سُنتی شرم سے سُرخ ہو گئی اور اس سُرخی کی لہر نے اُس کے جادو بھرے حسن کو اور دوبالا کر دیا۔ اپنے باپ کے سامنے پھر سجدۂ اطاعت بجا لا کر اور درباریوں کو پرنام کر کے ہاتھ جوڑے ہوئے تخت سے اُلٹے پاؤں واپس ہوئی اور ایک دروازہ میں جو اندر زنان خانہ کو جاتا تھا غائب ہو گئی +

جب دربار کے سر سے سُنتی کا جادو اُترا تو اُدھن پاد کے سفیرِ خاص نے عرض کیا "دھرم اوتار! ہم ہزار ادب اور عجز کے ساتھ آپ سے دست بستہ معافی چاہتے ہیں کہ بغیر آپ کی اجازت کے ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پرماتما راجکماری کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ اُن کے بے نظیر حسن نے ہم پر ایسا جادو کیا کہ ہم اپنے آپ کو بھول گئے۔ اور ہم کو صرف ایک ہی بات کا خیال رہا وہ یہ کہ کسی طرح ہم جلد سے جلد اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دیں

کہ آپ کے دربار کا موتی بلاشک ایک بے بہا موتی ہے۔" مہاراجہ نے نہایت مہربانی سے جواب دیا "ایسی تعریف سے تم میری عزت افزائی کرتے ہو۔ میری لڑکی یہاں 'لکشمی مائی' کہلاتی ہے۔ کیونکہ وہ ہماری ریاست کے لئے باعث رحمت ہوئی ہے۔"

سفیروں نے گھر پہنچکر مہاراجہ اُدھن پاد کے سامنے سُنیتی کی تعریفوں کے وہ پُل باندھ دئے کہ اُس کا شوق اور تیز ہوا۔ اور اُس نے ایک دوسرا سفیر مہاراجہ دھرم برت کی خدمت میں اسی غرض سے بھیجا کہ مہاراجہ دھرم برت سے وہ اس کی اجازت حاصل کرلے کہ اُدھن پاد خود حاضر ہوکر راجکماری کے لئے درخواست کرے۔

قصہ مختصر اُدھن پاد دھرم برت کے دربار میں جا پہنچا اور مہاراجہ اور مہارانی کو اپنے شوق دید سے اتنا عاجز کردیا کہ آخرکار وہ راضی ہوگئے کہ سُنیتی کی اُس سے ملاقات کرادی جائے۔ اُس ملاقات کے لئے مہارانی نے سُنیتی کو خود اپنے ہاتھوں سے کپڑے پہنائے اور اُس کا سنگار کیا۔ کپڑے پہناتے وقت بیچاری ماں دل ہی دل میں کبھی دعائیں مانگتی تھی کہ اُس کی بیٹی مہاراجہ اودھن پاد کو پسند آجائے۔ اور کبھی ڈرتی تھی کہ کہیں اُدھن پاد کی شاندار صورت بھولی بھالی سُنیتی کے دل پر قبضہ نہ کرلے اور اُس کی بیٹی اُس سے چُھوٹ جائے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا سُنیتی اور ادھن پاد کی پہلی ملاقات ہوئی۔ مہاراجہ دھرم برت اپنے مہمان کے ساتھ ایک کھلے صحن میں بیٹھا تھا سُنیتی اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں حاضر ہوئی۔ دھرم برت نے اُس کو باتوں میں لگا لیا۔ اُدھن پاد بالکل خاموش تھا۔ تہذیب اور آداب مجلس مانع تھے کہ وہ سُنیتی سے فوراً مخاطب ہو جائے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی اُس کی فریفتگی اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ اُس وقت اُس کے لئے ایک بات بھی کرنا ناممکن تھا۔ سُنیتی کی آواز اُس کے کانوں کو دنیا کے بہترین نغموں سے زیادہ دلاویز معلوم ہوتی تھی اور اُس کا چاند سا چہرہ ریشمی ساری کے حلقہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا کہ پانی پر سفید کنول کا پھول۔ اُس کے چلے جانے کے بعد اُدھن پاد مہاراجہ دھرم برت سے مخاطب ہوکر بولا "میری آنکھوں نے ایسا حُسن آج تک نہیں دیکھا۔" اور درخواست کی کہ وہ موتی اُس کو دیدیا جائے۔ دھرم برت نے جواب دیا کہ اُس کی بیٹی اُس کے راج کی 'لکشمی مائی' ہے اور وہ اس کو اپنے سے جُدا نہیں کرسکتا۔ مگر اُدھن پاد نے منت وساجت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اور آخرکار وہی ہوا جو ہونا تھا محبت کی فتح ہوئی اور شادی کے دن تاریخ مقرر ہوگئے۔

اوس شادی کی دھوم دھام کا کیا کہنا جس میں اُدھن پاد جیسا بڑا مہاراجہ دولہا ہو اور دُلہن کا باپ محض ایک مہاراجہ ہی نہیں بلکہ اپنی رعایا کا دیوتا ہو۔ دھرم برت کی راجدھانی اس طرح جگمگا رہی تھی جیسے کوئی نئی دلہن اور رعایا میں بڑے سے چھوٹے تک ہر ایک کی یہ خوشی اور یہ ٹھاٹھ تھے کہ ہر مرد دولہا معلوم ہوتا تھا اور ہر عورت دلہن۔ اور خود دولہا کی خوشی کا کیا بیان اُس وقت وہ دنیا میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا تھا۔ اور اپنی قسمت پر ناز کرتا تھا کہ اُس جیسا خوش نصیب دولہا کوئی نہ ہوگا۔ جب اُس کو اپنی دُلہن سے خلوت حاصل ہوئی تو اُس نے ایک سونے کے صندوقچہ سے ایک بیش قیمت موتیوں کا ہار نکالا اور سُنیتی کو پہنا کر بولا "دیوی! یہ ہار ہمارے خاندان کا سب سے بیش بہا زیور ہے۔ میری ماں نے اسے مجھے مرتے وقت دیا تھا اور کہا تھا "بیٹا! اُسی سے بیاہ کرنا جو ان موتیوں کے مانند پوتر (پاکیزہ) ہو" دیوی! تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے جو اس کو پہن سکے۔" سُنیتی کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ اُس نے اُدھن پاد کے پاؤں چھوئے اور جب اُس کے دولہا نے اُسے اُٹھایا تو اُس نے شرما کر صرف اتنا کہا کہ "میرے پتی! میرے مہاراجہ! ایشور مجھے آپ کی محبت اور ان خوبصورت موتیوں کے قابل بنائے!"

دوسرے روز جدائی کا سامنا ہوا سُنیتی نے ایک ایک کرکے اپنی تمام سہیلیوں کو روتے ہوئے خدا حافظ کہا اور آخر میں والدین سے رخصت ہونے کی نوبت آئی۔ دل بھرے تھے۔ اور زیادہ الفاظ کی گنجائش نہ تھی سُنیتی نے صرف اتنا کہا "میری جان سے زیادہ پیارے، میرے پتا جی! میری ماتا جی! میں ہمیشہ کوشش کروں گی کہ آپ کی تمام نصیحتیں یاد رکھوں اور اپنے آپ کو آپکی سچی بیٹی ثابت کردکھاؤں۔ وشنو دیوتا میرے نئے گھر میں اُسی طرح میری رہنمائی کریں جیسے کہ انہوں نے اس گھر میں ہمیشہ کی ہے!" مہاراجہ اور مہارانی نے اُس کو دیکھ کر اپنے دل کا داغ چھپانے کی کوشش کی مگر دل قابو میں نہ تھے۔ کیونکہ اُن کو رہ رہ کے یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو پھر نہ دیکھیں گے۔ مہاراجہ نے آخر میں اُسے یہی کہہ کر رخصت کیا "وشنو کی رحمت تمہارے سر پر رہے اور تم جیسی تابعدار اور بے غرض بیٹی رہی ہو ویسی ہی جاں نثار اور بے لوث بیوی بھی ہو!"

اُدھن پاد کے دارالسلطنت نے جس جشن اور ساز و سامان سے اپنے

آرہا تھا - مگر ایک جام اور پلاکر بستر کردیا گیا۔ سنیتی اتنے میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور چھوٹی مہارانی سے مخاطب ہوئی "بہن! سوامی جی کو میں تم پر چھوڑے جاتی ہوں - اگر تمہاری شان میں مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو معاف کردینا"۔

اپنے کمرہ میں پہنچکر سنیتی کا ضبط ٹوٹ گیا۔ زمین پر اوندھی گر پڑی اور خوب سسک سسک کر رونے لگی "ہائے ایشور! تو نے مجھے لڑکا کیوں نہیں دیا۔ اگر آج میری گود خالی نہ ہوتی تو میں یوں نہ نکالی جاتی - یہ میری خرابیاں صرف اسی وجہ سے ہیں کہ میں ماں نہیں ہوں۔ جس عورت کے لڑکا نہ ہو اُس کی زندگی نرک سے بدتر ہے ۔ اُس عورت کو کبھی خوشی نہیں نصیب ہوسکتی - لڑکا ہی عورت کا سب سے بڑا زیور ہے ۔ اگر آج میرے بھی لڑکا ہوتا تو میرے پتی مجھ سے منہ نہ موڑتے "۔ روتے روتے پھر اُس نے اپنے دیوتا وشنو سے دعا مانگنا شروع کی "اے میرے ایشور وشنو اب مجھ سے زندگی کا بوجھ نہیں سنبھل سکتا - تو ہی مدد کر تو یہ بیڑا پار ہو ۔ ایشور میرے مجھ پر رحم کر اور مجھے راستہ بتا - میں نے کونسا ایسا پاپ کیا تھا جس کی مجھے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے! میری صرف ایک خوشی تھی کہ اپنے پتی کے پاس رہوں - اور اُن کی سیوا کروں اور اب وہ بھی مجھ سے چھینی جا رہی ہے - ہے پرماتما! مجھے بتا میں کیا کروں - چاروں طرف اندھیرا ہے ۔ مجھے راستہ بتادے ۔ اگر میں نے کوئی پاپ کیا ہو تو رحم کر اور معاف کردے"۔

دعا مانگنے سے اُس کا دل پھر قوی ہونے لگا اور اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا "رخصتی کے وقت پتاجی کا آخری حکم یہی تھا - کہ میں اپنے پتی کے ساتھ بے لوث محبت کروں - وشنو مجھے اتنی توفیق دیں کہ میں اُن کے حکم کی پوری پوری تعمیل کروں - اور ان کو میری ذات سے رنج نہ پہنچے - پرماتما میرے تو سب جانتا ہے ۔ اگر میری محبت اپنے سوامی جی سے سچی ہے تو مجھے اتنی قوت دے کہ میں اپنے تمام دکھ خاموشی سے برداشت کروں"۔ کچھ دیر بعد اس کو سکون ہوگیا اور اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے خدا نے اُسکی دعا سن لی - اب وہ اپنے چاروں طرف پہلے کی جیسی تاریکی نہیں پاتی تھی - اور اس کا اپنا فرض آئینہ کی طرح صاف دکھائی دیتا تھا۔ دروازہ کھول کر چپکے سے باغ میں گئی - ادھر اُدھر دیکھا - سارے محل میں سناٹا تھا - اپنے کمرے میں واپس آکر اُس نے تمام زیور اُتار ڈالے - صرف گلے میں منگل سوتر اور ہاتھوں میں ایک جوڑ ہلکے کڑے رہنے دئے - ایک سادی سی ساری پہنی اور نکل کھڑی ہوئی - اس محل میں جہاں وہ اصلی معنوں میں مہارانی رہی تھی اور جہاں اپنے شوہر کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی کے بہترین سال گذارے تھے - اب اُسی محل سے وہ آدھی رات کو چپکے سے چور کی طرح رخصت ہوئی اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی ۔

رات اندھیری تھی اور غریب سنیتی راستوں سے ناواقف - البتہ گھاٹ پر اشنان کے لئے جانے کا اور وہاں کے مندر میں پوجا کرنے کا اکثر اتفاق ہوا تھا - بس سیدھی دریا کی طرف چلدی - پہلے تو وہ خوفزدہ ہوئی کیونکہ غضب کا اندھیرا تھا اور عمر میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ وہ اس طرح تن تنہا اکیلی نکلی تھی - اُس نے پھر دعا مانگنا شروع کردی - اور رفتہ رفتہ اُس کا دل پھر مضبوط ہوگیا ناز و نعم کی پلی سنیتی وھرم پدرت کی راجکماری سنیتی - اُدھن پاد کی مہارانی سنیتی تمام رات پیدل چلاکی - اپنے شوہر کی ریاست سے نکل کر ایک بڑے دریا کے کنارے پہنچی جس کے دونوں طرف گھنے گھنے جنگل تھے - مگر سنیتی ارادہ کی پکی تھی اور اب اُس کا دل بھی قوی تھا - وہ پلٹنے والی نہ تھی - رات بھر کے سفر کے بعد صبح تڑکے اُس کو کچھ جھونپڑیاں دکھائی دیں ۔

اشنان اور پوجے سے فارغ ہوکر سنیتی ان جھونپڑیوں کی طرف چلی - کیا پُرسکون فضا تھی! صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی - اُس تپ ون[1] کی سادگی میں ایک عجیب کیفیت تھی - ہر طرف امن اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی - لوگ سب جاگ چکے تھے ۔ کوئی پوجا کے لئے پھول توڑ رہا تھا - کوئی ہوم[2] کے سامنے عبادت کر رہا تھا - اس روحانی فضا نے دکھیاری سنیتی کے مجروح دل کے لئے مرہم کا کام کیا اور وہ ایک کٹی کے دروازہ پر بیٹھکر اُس کا لطف اُٹھانے لگی - چڑیاں اِدھر اُدھر پھدک رہی تھیں - وہ جانتی تھیں کہ اُس تپ ون میں اُن کو کوئی نہ چھیڑیگا ہری ہری گھاس میں اور درختوں کی ٹہنیوں پر وہ اِدھر سے اُدھر اُڑتی پھرتی تھیں - اور صانع قدرت کے گیت گاتی تھیں - سورج کا ظہور پورب سے شاہانہ شان و شوکت سے ہوا اور وہ ساری خلقت اور کائنات پر اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے کوئی مہربان اور رعایا پرور بادشاہ اپنی رعایا پر فیاضی کی مسکراہٹ مسکراتا ہے - سنیتی کے دل کو لمحہ بہ لمحہ تقویت ہوتی جاتی تھی - اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے تپ ون میں کسی رنج یا تکلیف کا گذر ہی نہیں ہوسکتا - وہ انہیں خیالات

---

[1] جنگل میں سنیاسیوں کی آبادی ۔
[2] آگ جو پوجے کے لئے جلائی جاتی ہے ۔

میں غرق تھی کہ کٹی سے ایک عورت سنیاسیوں کی طرح گیروے رنگ کی ساری پہنے نکلی۔ اُس کے چہرے سے مہربانی اور شفقت مادری ٹپکتی تھی۔ سُنیتی اُٹھی اور ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کیا۔ اُس کی متانت اور نمایاں شرافت کا مُنی پتنی پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اور اُس نے نہایت شفقت سے پوچھا "بیٹی تو کون ہے؟" سُنیتی نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اس کی اجازت مانگی کہ وہ 'مائی جی' اور مُنی پر کو 'پتا جی' کہہ کر مخاطب کرے۔ سنیتی کی نرم آواز اور نازک ہاتھ پاؤں دیکھ کر مُنی پتنی کم ازکم اتنا تو سمجھ گئی کہ یہ اجنبی کوئی معمولی عورت نہیں ہے وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اُس کی درخواست کا کیا جواب دے کہ اتنے میں اُس کا شوہر کٹی سے نکل آیا۔ وہ اُس تپ وَن کا سب سے بڑا مُنی تھا۔ اور اُس کا شاندار چہرہ ایک ہمدرد، غمگسار، اور رحم بھرے دل کا پتہ دیتا تھا۔ سُنیتی نے جھک کر اُس کے پیر چھوئے اور سوال کیا "منی جی مہاراج میں ایک غریب دکھیاری عورت ہوں میرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو پتا جی کہہ کر پکاروں"۔ مُنی کے کوئی اولاد نہ تھی اور سُنیتی ہر طرح سے قابل قبول تھی۔ چنانچہ اُس روز سے وہ ان پاک ذاتوں کی بیٹی اور اُن کے بڑھاپے کا سہارا ہوگئی۔ اپنی کٹی کے پاس ہی اُنہوں نے اُس کے لئے ایک چھوٹی سی کٹی بنا دی اور وہاں ساری دنیا سے لاپتہ مہاراجہ دھرم برت کی بیٹی اور مہاراجہ اُدھن پاد کی مہارانی ایک نئی زندگی بسر کرنے لگی +

سُنیتی اپنی سَپتنی کے کوسنے نکلی ہی تھی کہ سُروچی نے لپک کر دروازہ بند کر دیا اور زنجیر چڑھا دی۔ اُس کو یقین نہیں آتا تھا کہ سُنیتی دراصل چلی گئی بہر حال اس کی ضرورت تھی کہ وہ سُنیتی کے رخصت ہونے میں اتنی تو مدد دے کہ مہاراجہ اُس کو روک نہ سکے۔ مہاراجہ کو اپنے پاس روکنے کے لئے اُس نے اپنی تریا چرتر سے پورا پورا کام لیا۔ اُس غریب نے کئی مرتبہ کہا کہ اُس کو جا کر سُنیتی سے معافی مانگنا چاہئے اور اُن تینوں کو ہنسی خوشی رہنا چاہئے۔ مگر ہر مرتبہ اُس کو سُروچی نے کسی نئی تدبیر سے روک لیا۔ کیا تھا جو اُس نے اُٹھا رکھا۔ گائی بھی ناچی بھی اور اس آزادی اور بیباکی سے کہ اُدھن پاد کو اُس روز ایک نئی سُروچی دکھائی دی۔ آخر کار عورت کی مکاری کارگر ہوئی۔ اُس کا پھیلایا ہوا شہوانیت کا جال اپنا شکار کھینچ لایا۔ اُدھن پاد کا ضمیر سُروچی کے آغوش میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اُس نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ سُنیتی نیک سُنیتی ہمیشہ کی طرح پھر معاف کر دیگی اور سب ٹھیک ہو جائے گا +

مگر باوجود اس کے کہ سُروچی نے اُسے اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ اُدھن پاد کو اپنی پہلی بیوی سے سچی محبت تھی۔ دوسرے روز صبح ہی اُس نے ایک خادمہ کو حکم دیا۔ کہ بڑی مہارانی کو بلا لائے۔ خادمہ جب واپس آئی تو اُس کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بمشکل وہ اتنا کہہ سکی "مہارانی جی اپنے کمرہ میں نہیں ہیں۔ نہ رات کو اپنے بستر پر سوئی ہیں۔ اُس پر مہارانی جی کے تمام زیور بکھرے پڑے ہیں"۔ مہاراجہ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اُٹھا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور سُروچی سے بغیر ایک لفظ کہے ہوئے اُنتہ پُر سے چلا گیا۔ تمام محل میں، باغوں میں مہارانی کا کہیں پتہ نہ چلا۔ شہر اور ریاست میں سب جگہ آدمی دوڑائے گئے۔ دھرم برت کے راج میں بھی آدمی بھیجے گئے۔ مگر سب بے سود +

جب مہاراجہ دھرم برت اور اُن کی مہارانی کو خبر ہوئی تو اُنہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اُن کے صدمہ کی نہ کوئی حد تھی نہ انتہا۔ اور ان کو رہ رہ کر اس پیشینگوئی کا خیال آتا تھا کہ سُنیتی 'ایک بڑی رانی ہوگی'۔ وہ حیران تھے کہ اس میں کیا بڑائی ہے کہ وہ در بدر پھرے "کیا یہی بڑائی ہے کہ ایک سَپتنی کی جلن نے اُس سے اُس کے پتی کا گھر چھڑا دیا؟ . . . . . اور اب ہماری نازوں کی پالی ہماری بچی۔ ایشور جانے کہاں اکیلی پھر رہی ہے۔ ہائے وہ ہمارے پاس کیوں نہیں چلی آئی!" بیان کر کر کے دونوں روتے تھے۔ بعد کو اُنہیں معلوم ہوا کہ جب مہارانی سُروچی نے کہا کہ "ہم میں سے ایک کو اپنے گھر جانا پڑیگا"، تو سُنیتی نے کہا تھا کہ "میں اب پتا جی کے گھر کیوں جاؤں؟ اُنہوں نے مجھے میرے سوامی جی کے ساتھ بیاہ دیا اور میں نے اپنی زندگی اپنے سوامی جی کے لئے وقف کر دی۔ عورت کی محبت بے غرض اور بے لوث ہونا چاہئے"۔ سُنیتی نے یوں اپنے باپ کی نصیحت کو یاد رکھا اور اس پر عمل کیا +

ایک ایک کر کے اُدھن پاد کے سب آدمی ناکام واپس آتے گئے اور لوگوں کا خیال پختہ ہو گیا۔ کہ مہارانی سُنیتی نے ڈوب کر اپنی جان دیدی۔ سُروچی سے کسی نے کہا کہ چند ملاحوں نے آدھی رات کو ایک حسین عورت کی ایسی شکل کی دریا کے کنارے کھڑی دیکھی تھی۔ مگر اُس کو بن دیوی سمجھ کر کسی نے

اُس سے بات کرنے کی جرأت نہ کی۔ سُروجی نے اس خبر کی اطلاع مہاراجہ کو نہیں کی۔ وہ اُس سے الگ الگ رہتا تھا۔ اور سروجی نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس کو کچھ دنوں اکیلا ہی چھوڑ دے۔ سنتی کے جانے سے شروع میں تو اُدھن یاد کا بہت بُرا حال ہوا۔ اُس کی آنکھیں اب کُھل گئیں۔ اور سُنتی کو کھو کر اُس کو اُس کی سچی قدر ہوئی۔ کفِ افسوس ملتا تھا اور اپنے کو کوستا تھا کہ وہ سروجی کے جادو سے کیوں اتنا متاثر ہوگیا۔ اگر وہ خود اتنا کمزور نہ ہوتا تو رفتہ رفتہ سروجی کا حسد دور ہو جاتا اور دوسری سَوتنوں کی طرح اُس کی دونوں بیویاں بھی ہنسی خوشی ساتھ رہنے لگتیں۔ اُس نے سروجی سے خود کیوں نہیں کہدیا کہ موتیوں کا ہار خود اُس نے سُنتی کو بیاہ کی رات دیا تھا۔ بس قصہ ختم ہو جاتا۔ ہاں! بیشک ساری خطا اُسی کی تھی۔ اُس کو سروجی کی جا و بیجا ناز برداری ہرگز نہ کرنا چاہئے تھا۔ اسی ناز برداری نے سب کچھ بگاڑا۔ اب اُس کو سروجی پر ظاہر کر دینا چاہیئے کہ وہ اُس سے ناخوش ہے۔ اس لئے وہ اُس سے دُور دُور رہنے لگا اور سلطنت کے معاملات میں محو ہوگیا۔ اُس کے حسین اور شاندار چہرے پر رنج و فکر کے نشان نمایاں ہوگئے۔ اور مسکرانا تو وہ بالکل بھول گیا۔ دن سے ہفتے ہوئے، ہفتوں سے مہینے اور پھر بھی سُنتی کی کوئی خبر نہ آئی۔ اُدھن یاد کو بھی یقین ہوگیا کہ سُنتی نے خودکشی کر لی ہے۔ اس یقین سے پہلے تو اُس کے غم میں اضافہ ہوگیا۔ مگر جیوں جیوں وقت گذرتا گیا رنج بھی پُرانا اور کم ہوتا گیا۔ چاہے یہ سمجھ لیجئے کہ اُدھن یاد اپنی قسمت پر راضی برضا ہوگیا۔ اس سکون کا لازمی نتیجہ ہی یہ تھا کہ وہ سروجی کے نشہ سے پھر مغلوب ہوگیا۔ وہ تو اس وقت کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ بلی کی طرح انتظار میں جتنے صبر سے اُس نے کام لیا تھا۔ اُتنے ہی جوش سے اُس نے اپنے شکار کا استقبال کیا۔ کمزور اُدھن یاد نے اپنے کو ہاتھ پاؤں باندھ کر اُس کے حوالہ کر دیا۔ اور سروجی نے اُس کے دل میں سچی محبت کے جذبات مٹا کر شہوانی جذبات بھر دیئے۔ اور اُس کو پھر اپنا غلام بنا لیا۔ چند ہی دنوں میں سُنتی ایک پُرانا اور نہایت دُھندلا سا خواب ہوگئی۔ اور تمام محل اور سلطنت میں سُروجی باقاعدہ حکومت کرنے لگی +

وہاں کٹی کی ایک دوسری ہی دنیا تھی۔ سُنتی بہت جلد ہردلعزیز ہوگئی اور مُنی تینی اُس کا نام اور لقب ہوگیا۔ کچھ لوگ اُس کو جوشِ عقیدت سے 'مائی جی' کہتے تھے، کچھ پیار سے 'دیدی' اور کچھ اُس کی دینداری اور پاک زندگی کی وجہ سے 'دیوی'۔ اُس کی گذشتہ زندگی کی کسی کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ وہ ایک مہارانی تھی۔ اپنا رنج وہ اپنے دل میں چھپائے تھی۔ اور اپنی باقی زندگی اُس نے دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی +

سُنتی کو ہمیشہ سے پھولوں کا شوق رہا تھا۔ اور اب تو گویا وہ اُس کی جان ہو گئے تھے۔ اُن کے خوبصورت کِھلے ہوئے منہ گویا اُسے صانعِ قدرت کی خوبیوں کے گیت سُناتے تھے اور اُن کی مہک خدائے رحیم و کریم کا پتہ دیتی تھی۔ اُس نے اپنی کٹی کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ لگایا تھا۔ جو سارے تپ وَن کے لئے باعثِ زینت و فرحت تھا۔ اُس کی چھوٹی سی کٹی ننھی ننھی خوبصورت بیلوں سے لدی تھی اور اُن بیلوں میں بہت سی خوش آواز چڑیوں نے اپنے گھونسلے بنائے تھے +

اس پُرامن آشرم میں سُنتی کی روح اور روشن ہوگئی۔ اُس کے دل کا داغ مٹا تو نہیں۔ مگر اُس کا اثر اُس کی روح پر باقی نہ رہا۔ اُس کی نظر میں داغ کی اہمیت اور وقعت نہ رہی۔ زندگی کا اصلی مقصد اُس کو صاف نظر آنے لگا۔ زندگی انسان کو اس لئے ملی ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرے اور دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ اس لئے خودی کو مٹا دینا چاہیئے۔ اور خلق خدا کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھنا چاہئے۔ ان خیالات اور اُن کی سچّی اور پوری پیروی نے سُنتی کے حُسن کو ایک دوسرے اور بلند پایہ مقام پر پہنچا دیا۔ خوبصورتی میں نورانیت آگئی۔ جسمانی حُسن میں روحانی حُسن کا اضافہ ہوگیا۔ کھدر کی گیروا ساری میں گمنام مُنی تینی اُدھن یاد کی مہارانی سُنتی سے کہیں زیادہ حسین اور شاندار تھی +

اس انقلاب کو دو سال ہو گئے تھے کہ ایک روز مہاراجہ اُدھن یاد نے بہت بڑے پیمانہ پر شکار کا انتظام کیا۔ سینکڑوں آدمی ساتھ تھے اور شکار ہر طرح سے بہت کامیاب نظر آتا تھا۔ مگر کچھ روز بعد پانی برسنا شروع ہوگیا شکاری وہیں جنگل میں اسی امید پر رُک گئے کہ پانی نکل جائے گا۔ مگر بادل اور گھِر گھِر کر آتے گئے اور ایسے سیاہ کہ بہت جلد سارا جنگل تاریک ہوگیا۔ بجلی کی کارفرمائیوں سے دل دہلے جا رہے تھے۔ یہاں چمکی، وہاں گری، یہاں دھمکایا

وہاں تباہ کیا۔ القصہ اس غضب کا طوفان آیا کہ شکاریوں کو بھاگتے ہی بن پڑا۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ ہر ایک کو اپنی جان کی فکر تھی۔ اور سب کی یہی کوشش کہ کسیطرح اس منحوس جنگل سے نکل کر اپنے گھر پہنچ جائیں۔ اس گڑبڑ میں مہاراجہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور ایک طرف گھوڑے کو بھگاتا ہوا نکل گیا مگر گھوڑا بجلی سے بھڑکتا تھا۔ اندھیرا اس غضب کا کہ خود اپنا ہاتھ نہ سوجھے اور اس پر جنگل اتنا گھنا کہ اچھے خاصے دن میں راستہ کا پتہ نہ چلے۔ مہاراجہ اپنی ساری قوت صرف کئے دیتا تھا۔ مگر رفتار پھر بھی حد درجہ کی سست تھی۔ اب بجلی گری اب کہیں قریب سے کسی خونخوار جانور کی وحشت ناک آواز آئی اب معلوم ہوا کہ آندھی سارے جنگل کو گرا کر ہی چھوڑے گی۔ ادھن پاد کی رفتار سست تر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ مجبور ہو کر اس نے گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ اور خود پیدل جنگل سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈھنے لگا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ پیچھے سے ایک بھاری سانس کا اُسے احساس ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ کوئی چیتا اُسکا پیچھا کر رہا ہے۔ اُدھن پاد اپنی جان لے کر ایک طرف بے تحاشا بھاگا۔ قسمت ساتھ تھی۔ اتفاق سے وہ جنگل سے نکل آیا۔ اور بجلی کی چمک میں اُس کو سامنے ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ دوڑ کر اُس کے چھپر میں پہنچ گیا اور پکارنے لگا۔ پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ آندھی تھی کہ زلزلہ آیا تھا۔ کسی نے اُس کی آواز نہ سنی۔ اُس نے اور چیخ چیخ کر پکارنا شروع کیا "اے دھرماتما لوگو، مجھ کو اندر آجانے دو۔ میں جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ پرماتما کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ ایشور تم کو اس کا پھل دیگا"

مہاراجہ پکار ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔ کھولنے والے کے ہاتھ میں جو چراغ تھا وہ آندھی میں فوراً بجھ گیا۔ ادھن پاد دروازہ ٹٹول کر اندر پہنچ گیا اور کسی کے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ بجلی کی چمک جھونپڑی کے اندر تک آتی تھی۔ اور اُس نے اُس کی روشنی میں دیکھا کہ جس نے اُس کو پناہ دی تھی۔ وہ ایک عورت تھی۔ یہ دیکھ کر بولا "مائی جی، میں جانتا ہوں کہ تم کوئی مُنی تپنی ہو۔ تم نے مجھے پناہ دی ہے۔ ایشور تمہارا بھلا کرے گا۔ میں تم کو زیادہ تکلیف نہ دونگا۔ جیسے ہی یہ طوفان کم ہوگا۔ میں چلا جاؤنگا"

"جی نہیں، آپ ابھی جانے کا خیال بھی نہ کیجئے۔ یہاں جنگل میں طوفان اکثر کئی کئی روز رہتا ہے۔ میں اپنی ماں کی کٹی میں جاکر سو رہونگی"

ادھن پاد کو ایسا معلوم ہوا کہ اس آواز سے اس کے کان آشنا ہیں مگر اس بدحواسی میں اس نے زیادہ خیال نہیں کیا۔ اور صرف اتنا کہا "نہیں، صبح تک کھل جائے گا"

"خیر اس وقت تو آپ یہیں رہئے۔ میں اپنی ماں کے پاس جاکر سو رہونگی"

پھر وہی آواز! اُدھن پاد کو اب تو خلش ہو گئی۔ اور اُس نے کہا کہ پتہ لگانا چاہئے کہ آخر یہ کس کی آواز ہے۔ بات چیت بڑھانے کے لئے بولا "تم اس موسلا دھار میں کہاں جاؤ گی۔ اس وقت چیتے بھی مارے مارے پھر رہے ہیں"

"جی نہیں، یہاں تپ ون میں چیتے نہیں آتے۔ اور اگر آتے بھی ہیں تو پتا جی کی دعاؤں میں اتنا اثر ہے کہ وہ پالو جانوروں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو صرف امن اور آشتی ہی کا گذر ہے"

اب تو ادھن پاد کی اُلجھن اور بڑھ گئی۔ یہ دلکش آواز تو بالکل اُسکی سُنتی کی جیسی تھی۔ اتنے میں مُنی تپنی نے چراغ جلایا اور اُس کی روشنی میں اُس کے ہاتھ بالکل سُنتی کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے۔ اپنے خیال کی تصدیق کرنے کے لئے اُدھن پاد پوچھنے لگا۔ "اے مُنی تپنی، تم اکیلی کیوں رہتی ہو؟ تمہارے پتی جی کہاں ہیں؟"

سُنتی یہ سوال سنکر بید کی طرح لرزنے لگی۔ جب وہ بولی تو اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی:-

"وہ... میرے سوامی جی.... وہ...."

اُدھن پاد نے سُنتی کو اُس دلخراش جملہ کے ختم کرنے کی تکلیف سے بچا لیا۔ وہ کانپتے ہاتھ، وہ لرزتا جسم۔ وہ لڑکھڑاتی زبان، سب پکار پکار کے کہہ رہے تھے کہ وہ عورت سُنتی ہی ہے کوئی اور نہیں۔ اُدھن پاد جلدی سے بڑھا اور بڑھ کر اُس کے چہرہ سے گھونگھٹ ہٹا دیا۔ اب تو کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ "کیا سچ مچ تم ہی ہو یا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ میری پیاری، میری جان، میری رانی، میری سُنتی!" سُنتی اُس کے قدموں پر گر پڑی "ہاں، میرے مالک، میرے دیوتا، میں سُنتی ہوں، تمہاری نظروں سے گری ہوئی سُنتی"۔ اُدھن پاد نے اُس کو اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور پھر ان تمام پیار بھرے ناموں سے جو اُس کو شروع شروع میں دئے تھے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ نام اُس زمانہ کی یاد دلاتے تھے۔ جب دنیا سُنتی کے لئے جنت تھی اور جس کی یاد اب دل میں کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔ مگر بچھڑے ہوئے اتنے دنوں کے بعد ملے تھے کہ چند لمحوں کے لئے پُرانی تکلیفیں اور دلفگار باتیں سب بھلا دی گئیں۔ اس وقت تو صرف دنیا میں وہ تھے اور ملنے کی خوشی،

دونوں اپنی اپنی فطرت کے مطابق ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ اُدھن پاد تو سُنیتی کو بھینچ بھینچ کر پیار کر رہا تھا۔ اور اُس کے مُنہ کو، اُس کے رخساروں کو، اُس کی آنکھوں کو، اُس کے ابروؤں کو، اُس کی پیشانی کو، اُس کے بالوں کو، اُس کی گردن کو، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے ہاتھوں کو، اُس کے ایک ایک عضو کو بار بار چومتا تھا۔ اور پھر بھی اُسے سیری نہ ہوتی تھی۔ سُنیتی نیک عورت تھی، اپنے آپ کو پھر اُسی بیوفا شوہر کے حوالہ کر دیا۔ اور اُسے لپٹ کر پرانے غم اور نئی خوشی کے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے ٭

جب کچھ دیر بعد جب یہ مجنونانہ کیفیت کم ہوئی اور جذبات کے گہرے بادلوں میں سے ضمیر کی روشنی نے راستہ پایا تو اُدھن پاد کو اپنی تابل سزا حماقتیں اور لاپرواہیاں یاد آ گئیں اور اپنے پر جی بھر کے لعنت و ملامت کرنے لگا "تم نے مجھے کیوں پناہ دی؟ مجھے اس طوفان میں کیوں نہیں مر جانے دیا۔ میری یہی سزا تھی۔ اور وہ بھی کم ہوتی۔ میں جنگل سے کیوں نکل آیا؟ وہیں اُس چیتے نے میرا کیوں نہ خاتمہ کر دیا؟ میں ہرگز اس قابل نہ تھا۔ کہ مجھے تم جیسی دیوی ملتی۔ میں نے تم سے بیوفائی کی تم کو چھوڑ دیا۔ تم اکیلی نکل کھڑی ہوئیں اور ماری ماری پھریں۔ اور میں نے تم کو روکنے کے لئے ایک اُنگلی بھی نہ ہلائی۔ میرا یہ فرض تھا کہ میں تمہاری حفاظت کرتا۔ اور میں نے بالکل اُس کا اُلٹا کیا۔ مگر پھر بھی تم میری تمام کمزوریوں اور بُرائیوں کو بھلا دیتی ہو اور مصیبت کے وقت رحم کی دیوی بن کر میری مدد کو آتی ہو اور میری جان بچاتی ہو۔ سُنیتی سُنیتی! تم جیسی دیوی کوئی دنیا میں نہ ہو گی۔ تمہاری محبت ہمیشہ بالکل بے لوث رہی ہے تم کو نہ کبھی معاوضہ کا خیال ہوا۔ نہ تم نے کبھی اپنی فکر کی۔ میں ہرگز ہرگز ایسی محبت کے قابل نہیں ہوں" سُنیتی نے اس تمام مجذوب کی بڑ کا صرف ان چند سادے الفاظ میں جواب دیا "میرے پتی، میرے مہاراج، میرے تو جو کچھ ہو تم ہی ہو۔ اب ہو اور ہمیشہ رہو گے" صبح کو سُنیتی نے اپنے منہ بولے ماں باپ سے اپنے شوہر کو ملایا اور ان کو پہلی مرتبہ اپنا اصلی نام اور پتہ بتایا۔ اُدھن پاد بجائے واپس ہونے کے تپ وَن میں ٹھہر گیا اور وہاں زندگی کے چند بہترین مہینے گذار دیئے ٭

اس اثنا میں ایک ایک کرکے تمام شکاری گھر پہنچ گئے اور مہارانی سُروچی سے سارا قصہ بیان کیا کہ وہ کس طرح طوفان میں گھر کر اپنے آقا سے جُدا ہو گئے۔ مہارانی نے سینکڑوں ہزاروں پیدل اور سوار تلاش کے لئے دوڑائے۔ آخرکار کچھ لوگ خبر لائے کہ مہاراجہ کا گھوڑا جنگل میں اکیلا گھومتا ملا تھا۔ اور وں نے آکر یہ سنایا کہ ایک جگہ پر مہاراجہ کے قدموں کے پیچھے پیچھے ایک چیتے کے پیر کے نشان تھے۔ چاروناچار سب کے سب تھک کر بیٹھ گئے اور یہی طے کر لیا گیا کہ یا تو مہاراجہ کو کسی چیتے نے مار ڈالا یا وہ اندھیرے میں دریا میں گر پڑا۔ سُروچی اپنے شوہر کو روئی اور سلطنت کرنے لگی۔ مگر ایک روز دیکھتے کیا ہیں کہ مہاراجہ اُدھن پاد بذات خود چلے آرہے ہیں ٭

مہاراجہ کی واپسی سے رعایا میں تو بے انتہا خوشی ہوئی، خصوصاً اس وجہ سے کہ مہاراجہ خود بہت خوش اور بشاش نظر آتے تھے۔ سُروچی بھی خوش ہوئی۔ مگر اُس نے جو سوال کئے کہ وہ اتنے دن کہاں رہا اور کیا کرتا رہا تو اُدھن پاد نے ایسے ہلکے ہلکے جواب دیئے اور اتنے مختلف قصے سُنائے کہ اُس کے دل میں ایک شک پیدا ہو گیا۔ چونکہ اُسے باقاعدہ ایک خلش ہو گئی تھی۔ اس لئے گھوم پھر کر وہ پھر وہی سوال کرتی رہتی تھی۔ مہاراجہ بیچارے نے ایک مرتبہ یہ کہا کہ جب جنگل میں چیتے نے اُس کا پیچھا کیا تو وہ ایک درخت پر چڑھ گیا۔ "ہاں مگر جب صبح ہوئی تو کیا ہوا؟ آخر تم اتنی دیر میں گھر کیوں واپس آئے؟"

میری پیاری تم کو اندازہ نہیں ہے کہ جنگل کتنا گھنا ہے۔ وہاں آدمی کھو جائے تو کئی کئی دن بھٹکا پھرے" کہا تو اُس نے یہ نہایت لاپرواہی کے لہجہ میں، مگر اُس کا چہرہ بھانڈا پھوڑے دیتا تھا۔ اور سُروچی بھولی بھالی نہ تھی "وہاں کئی دن ممکن ہے بھٹکا پھرے۔ مگر مہینوں تو نہیں۔ کیا وہاں کوئی تپ وَن قریب نہیں تھا؟ آخر تم اتنے دنوں رہے کیسے؟"

یہ سوال تیر بہدف تھا۔ اُدھن پاد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ سُنیتی کے ساتھ وہ چند لاجواب مہینے اُس کے لئے ایک حسین اور دلکش خواب تھے۔ اور وہ اس خواب میں غرق ہو گیا۔ اُس کی خاموشی سے سُروچی کو پورا یقین ہو گیا کہ اُس کا شوہر اُس سے کچھ چھپا رہا تھا۔ اور اُس نے بات کی تہ تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔ "کیوں، تم چپ کیوں ہو گئے؟"

سُروچی کی تیز آواز سے اُدھن پاد چونک پڑا۔ اور گھبرا کر بولا:۔ "سُنیتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے سُروچی۔ ۔ ۔ ۔ کیا۔ ۔ ۔ کیا تم کیا پوچھتی تھیں؟"

"کچھ نہیں" کہہ کر سُسروچی غصہ میں بھری اُٹھی اور کمرہ سے چلی گئی۔ اُس کی پرانی جلن پھر تازہ ہو گئی اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "مجھ پر سُنیتی کا دعویٰ کیسے ہوا؟ اور اتنے دنوں کے بعد! آخر اتنے دنوں یہ کہاں رہے؟" صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ اُس کی پتنی سُنیتی زندہ ہے۔ اور مہاراجہ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے +

جب تک اُدھن پاد تپ وبن میں رہا سُنیتی گویا جنّت میں تھی۔ نئے نئے بیاہ کے دن یاد آتے تھے۔ جب اُس کا شوہر اُس کا تھا۔ اور صرف اُسی کا۔ پھر وہی پہلی محبت کی شیرینی تھی۔ مگر اب اس شیرینی میں جدائی اور پھر میل کی چاشنی بھی شامل تھی۔ اُدھن پاد نے رخصت ہوتے وقت سُنیتی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پہنچتے ہی اُس کے لینے کے لئے ایک لشکر بھیجے گا اور اُس کو پھر اپنی مہارانی بنائے گا۔ مگر اُدھن پاد جیسے کمزور آدمی کا وعدہ ہی کیا۔ جب سُسروچی کا سامنا ہوا تو سارے وعدے اور ارادے کافور ہو گئے۔ سُنیتی کو بلانے کی کسی طرح ہمّت نہ ہوئی۔ وہاں سُنیتی اپنی نئی خوشی کے خواب میں انتظار کے دن کاٹتی رہی۔ دن سے ہفتے ہوئے اور ہفتوں سے مہینے۔ مگر لشکر نہ آج آتا ہے نہ کل۔ البتہ کوئی اور آ گیا جس پر ہزار لشکر قربان۔ بہ الفاظ دیگر سُنیتی ماں ہو گئی +

جب ماں نے اپنے بچّہ کو دیکھا تو بیساختہ اُس کے آنسو نکل پڑے مگر وہ آنسو رنج کے نہیں خوشی کے تھے۔ بچّہ کو گود میں لے کر بولی "میرا بیٹا، میرے کلیجہ کا ٹکڑا، میری آنکھوں کا اُجالا، میری زندگی کا سہارا، تو تو میرا ہی ہے۔ صرف میرا۔ تیری محبت میں تو کوئی اور شریک نہیں ہے۔ تجھ سے تو کبھی جدائی نہ ہوگی۔ وشنو نے میری دعا قبول کی اور تجھ کو میری تنہائی کا سہارا بنا کر بھیجا۔ تو ایشور کا دیا ہوا ہے۔ میری زندگی کا تارہ، میری جان کا سہارا۔ جو کچھ ہے تو ہی ہے"+

لڑکے کی پیدائش سے اتنا تو ہوا کہ اُس روز سے پھر سُنیتی کو کسی نے رنجیدہ نہیں دیکھا۔ اُس کا دل خوشی اور شکر سے لبریز تھا۔ جدھر وہ نظر کرتی تھی ہر چیز اُس کو خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ خدا کے رحم و کرم کا بھر بھر جی شکریہ ادا کرتی تھی +

منی برنے (جس کو سُنیتی پتا جی کہتی تھی) بچّہ کا نام دُھروُ رکھا۔ اور اُس کا بچپن اُسی منی کی زیر تعلیم و تربیت گذرا۔ مگر جب وہ بڑا ہونے لگا ماں اُس کی سمجھ بچتہ ہونے لگی۔ تو سُنیتی کو اس کا قلق ہونے لگا۔ کہ وہ وہاں نہ تھا جہاں اُس کو ہونا چاہئے تھا۔ اور جہاں اُس کا حق تھا۔ اکثر راتوں کو اُس کو پیال کے بچھونے پر لیٹا دیکھ کر وہ رویا کرتی تھی۔ مگر جہاں صبح ہوئی وہ پھر ہنستی ہوئی سُنیتی ہو گئی۔ کیونکہ اُس کو خیال تھا کہ کہیں اُس کو رنجیدہ دیکھ کر بچّہ بھی نہ پریشان ہو۔ اُس کو اس کا بھی قلق تھا کہ دُھروُ اپنے باپ کی شکل کا کیوں نہ بنا۔ مگر اس میں اپنا کیا دخل۔ صورت میں۔ سیرت میں ہر طرح وہ اپنی فرشتہ خصلت ماں پر پڑا تھا۔ اور دنیا جو چاہے شگون مانے دُھروُ کے لئے یہی سب سے نیک شگون تھا +

کچھ دن اور گذرے اور دُھروُ نے اپنے باپ کی بابت پوچھنا شروع کر دیا۔ سُنیتی عجب کشمکش و پیچ میں تھی کہ کیا کہے کیا نہ کہے۔ بس یہ کہہ کر رہ جاتی تھی کہ "وہ بڑے اچھے ہیں، بڑے سُندر ہیں۔ بڑے بہادر ہیں۔ بڑے امیر ہیں" مگر دُھروُ کب ماننے والا تھا۔ پوچھتا جاتا تھا "اچھا، تو اُن کے درشن کب ہوں گے؟" "جب تم بڑے ہو گے" کہہ کر سُنیتی نے ٹال دیا +

ایک روز منی بالکوں[1] نے دُھروُ سے پوچھا کہ اُس کا باپ کہاں ہے۔ بھولے بھالے دُھروُ نے کہا "ماتا جی کہتی ہیں کہ وہ بہت امیر ہیں۔ بڑے بہادر ہیں۔ بڑے سُندر ہیں۔ بڑے اچھے ہیں۔ اور جب میں بڑا ہونگا تو اُن کے درشن کرونگا" ایک اور روز منی بالکوں نے اُس سے کہا "دُھروُ اب تم بڑے ہو گئے ہو مگر کپڑے نہیں پہنتے ہو۔ ہم کو تمہارے ساتھ کھیلتے شرم آتی ہے" دُھروُ دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا اور جو لڑکوں نے کہا تھا کہہ دیا۔ سُنیتی کے دل پر چوٹ لگی کہ مہاراجہ اُدھن پاد کا بیٹا اور وارث اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے کو ترسے۔ مگر بیچاری کرتی تو کیا کرتی اپنے رنج کو بچّہ کی خاطر دل ہی میں رکھا۔ اپنی ساری کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اُس کو دھوتی کی طرح پہنا دیا۔ اور ہنس کر بولی "لو میرے پیارے اب تو ٹھیک ہے؟ تم بھی وہی پہنے ہو جو تمہاری ماں"+

دُھروُ اب پانچ برس کا ہو گیا تھا۔ ایک دن آشرم کے لڑکوں نے اُس سے کہا "آؤ چلو دربار دیکھ آئیں" دُھروُ کبھی تپ وبن سے باہر نہیں گیا تھا۔ اس لئے خوشی سے فوراً راضی ہو گیا۔ لڑکے اپنے والدین سے رخصت ہو کر خوشی خوشی روانہ ہو گئے۔ نیا سفر تھا اور بچپن کا شوق۔ اس لئے راستہ

---

[1] منی کے لڑکے کا ترجمہ

کھلا نہیں اور منزلِ مقصود پر تازہ دم پہنچ گئے۔ بڑا شہر تھا۔ پختہ سڑکیں، بلند عمارتیں، عالی شان محل۔ ہر چیز کو دھروا بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ مگر دربار میں کسی چیز کی اُس پر ہیبت نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ ان تمام چیزوں کا پیدائش ہی سے عادی تھا +

اُس کے ساتھیوں کو اور اُس کو کسی نے بھی دربار میں جانے سے نہ روکا۔ وہ سب گیروے کپڑے پہنے تھے۔ جس کے یہ معنی تھے کہ وہ منیوں کے لڑکے تھے۔ اور منی بالکوں کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ پہرے کے سنتری، درباری، بڑے بڑے حکام، جگمگاتا تخت شاہی، ان کا اثر اور لڑکوں پر تو ضرور ہوا۔ مگر دھروا پر نہیں۔ اُس کا خون ان چیزوں کی ہیبت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے سیدھا تخت شاہی تک چلا گیا۔

اُس کے ساتھی اُس کی جرأت پر حیران تھے۔ مگر ان کے علاوہ اور تمام لوگوں کی نگاہیں بھی اُس پر جمی تھیں۔ اس توجہ کی وجہ محض اُس کی ہمت ہی نہ تھی بلکہ اُس کی شاندار شکل وصورت بھی۔ عمر کو دیکھتے اُس کا قد لانبا تھا۔ شکل و صورت کا نہایت حسین اور وجیہہ، ماں کے خون اور تربیت کے اثر سے سر سے پیر تک وہ متانت، شرافت اور اعلیٰ طبقہ کی شان کی ایک بہترین تصویر تھا۔ اُس کے سر پر کالے کالے گھونگر والے بال تھے۔ اُس کی سیاہ بولتی ہوئی آنکھیں لانبی لانبی ریشمی پلکوں سے ڈھکی تھیں اور اُس کی نرم نرم کھال اور لال لال ہونٹوں نے اُس کے چہرے کی رونق دوبالا کر دی تھی +

سب کی آنکھیں دھروا پر تھیں مگر اُس کو اس کی مطلق خبر نہ تھی کیونکہ خود اُس کی آنکھیں اُس وقت صرف مہاراجہ اُتّن پاد کو دیکھ رہی تھیں جو اُس کے سامنے تخت پر رونق افروز تھا۔ جب مہاراجہ نے اُسکو غور سے دیکھا تو اُس کے دل میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اُس کے دل کی حرکت تیز ہو گئی۔ اور چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا اور پوچھتے ڈرتا تھا "کیا یہ ممکن ہے؟ یہ لڑکا تو بالکل سُنیتی کی تصویر ہے۔ کیا یہ اُسی کا لڑکا ہے؟" اُس نے اُس کو اپنے پاس بلایا۔ دھروا بلا تامل تخت پر چڑھ کر مہاراجہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُتّن پاد نے بے اختیار ہو کر اُس کو گود میں اُٹھا لیا اور پیار کر کے پوچھنے لگا "تم کس کے لڑکے ہو؟" دربار میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس سوال کے جواب کا بے چینی سے منتظر نہ ہو۔ کیونکہ سب نے دیکھا تھا کہ لڑکے کی صورت مہارانی سُنیتی سے کہیں زیادہ ملتی تھی

اُس انتظار کی خاموشی میں دھروا کی صاف آواز گونج اُٹھی "مجھے ٹھیک معلوم نہیں، میری ماتا جی کہتی ہیں کہ پتاجی بڑے اچھے ہیں، دنیا بھر میں سب سے اچھے ہیں اور جب میں بڑا ہونگا تو اُن کے درشن کرونگا" مہاراجہ نے پھر پوچھا "تم آئے کہاں سے ہو؟" دھروا نے جواب دیا "تپ وَن سے"۔ اب تو اُتّن پاد کے دل میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ دراصل سُنیتی ہی کا لڑکا ہے +

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مہارانی سُروچی پیچھے سے داخل ہوئی مگر باپ بیٹے ایک دوسرے میں اتنے محو تھے۔ کہ ان کو خبر نہ ہوئی۔ "اور تمہاری ماتا جی کون ہیں؟" سوال تو مہاراجہ نے کیا مگر اُس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی اور ہر سننے والا سمجھ سکتا تھا کہ مہاراجہ کو کوئی خاص پریشانی یا گھبراہٹ ہے۔ "ماتا جی؟" دھروا چونک کر بولا اور اُس کی آواز میں ایک نیا جوش اور فخر تھا۔ "میری ماتا جی تو سب سے اچھی ہیں، دنیا بھر سے اچھی۔ سچ اگر آپ اُن کو دیکھیں تو اُن کی پوجا کرنے لگیں۔ . . ."

بیچارہ دھروا اپنی دیوی کی کچھ بھی تعریفیں نہ کرنے پایا تھا کہ تخت کے پیچھے سے سُروچی ایک طوفان یا زلزلہ کی طرح آ پہنچی۔ اُس کے سینہ میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اُس نے دھروا کو مہاراجہ کی گودی سے اُتار کر نیچے زمین پر دھکیل دیا۔ "تو کون ہے؟ چھوکرے؟ تیری یہ مجال کہ تو مہاراجہ کی گود میں بیٹھے؟ تو، ایک فقیر کا لڑکا! جا بھاگ جا، تیری ماں کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ تجھے اس طرح دربار میں چلا آنے دیا۔ مہاراجاؤں کی گود صرف مہاراجکماروں کے لئے ہوتی ہے نہ کہ فقیروں کے لڑکوں کے لئے"، یہ کہہ کر اُس نے اپنا لڑکا اُٹھا کر مہاراجہ کی گود میں بٹھا دیا +

دھروا ایسی سخت کلامی کا عادی نہ تھا نہ آج تک اُسے کسی نے پھول کی چھڑی سے بھی چھوا تھا۔ مہارانی کی بے درد گرفت نے اُس کی نازک باہوں پر لوہے کے شکنجوں کا کام کیا۔ اور اُس کے دل شکن الفاظ سے وہ خوفزدہ ہو گیا۔ سارا بدن کانپتا تھا اور دونوں رخساروں پر آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے۔ پھول سا چہرہ بالکل مرجھا گیا تھا۔ اور ننھا سا دل دھڑک رہا تھا۔ "ہائے ایشور! مجھ سے کیا خطا ہوئی؟" مگر کس کی اتنی ہمت تھی کہ جواب دیتا یا اُس پر رحم کھاتا۔ مہاراجہ، وہی کمزور اُتّن پاد، سر جھکائے سُروچی کے لڑکے کو گود میں لئے بیٹھا رہا اور دھروا کی مدد کو نہ انگلی ہلائی نہ زبان۔

دھروا جب دربار سے رخصت ہوا تو ایک دوسرا لڑکا تھا۔ جو دھروا

نہایت شان سے بے دھڑک داخل ہوا تھا وہ کوئی اور تھا۔ اب تو اُس بیچارے پر بیکسی چھائی تھی۔ اور وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ باہر کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھی دروازہ پر اُس کا انتظار کر رہے تھے اور جیسے ہی وہ پہنچا اُس کو ہمدردانہ انداز سے گھیر لیا اور جو قریب تر تھے اُنہوں نے بڑے بھائیوں کی طرح اُس کے ہاتھ پکڑے اور لیکر چل دیئے۔ راستہ بھر یہی باتیں رہیں کہ آخر دُھرو ا بیچارہ نے کیا خطا کی تھی۔ کسی نے رائے زنی کی کہ مہارانی بڑی بیرحم اور خراب عورت ہے۔ کسی نے کہا کہ مہاراجہ کو اُس کو تنبیہ کرنی چاہئے تھی۔ ایک بولا کہ اگر مہاراجہ کے لڑکے ہونے کے یہی معنی ہیں کہ ایسی کڑی مائیں ملیں تو ان سب کو ایشور کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ وہ راجکمار نہ ہوئے۔ دُھرو ا سب سُنتا گیا۔ مگر خود اُس نے ایک لفظ نہ کہا۔ اُس کا دل بھرا تھا۔ اور بات چیت کی تاب نہ تھی۔ جب لڑکے تپ وبن پہنچے تو جو بڑے اور سمجھدار تھے اُنہوں نے دُھرو ا سے کہا "آؤ کچھ کھیلیں اور اُس مغرور رانی کو بھول جائیں"۔ مگر اُس نے کہا "نہیں بھائی مجھے معاف کرو۔ میرا اسوقت بالکل کھیلنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ میں ماتاجی کے پاس جاتا ہوں"۔ یہ کہکر وہ جلدی سے اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگ گیا +

سُنیتی اپنے بچّہ کا دیر سے راستہ دیکھ رہی تھی۔ رات ہوگئی تھی اور اُس کا کھانا بہت دیر سے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دُھرو ا آتے ہی اُس سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کے لئے اس طرح سے رونا ایک غیر معمولی بات تھی۔ سُنیتی پریشان ہوگئی۔ کہ آخر یہ بات کیا ہے جس سے خیال ہوا کہ شاید وہ تھک زیادہ گیا ہے۔ اس لئے اُسے گود میں لے کر جھونپڑی میں چلی گئی اور کہنے لگی "میرا بچّہ تو تھک گیا ہے۔ آ، میں تجھے کھانا کھلا کر سلا دوں"۔ دُھرو ا کا رونا بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہوگیا۔ "نہیں، ماتاجی میں تھکا نہیں ہوں۔ پتاجی کو بُلا دو، میرے پتاجی کو"+

اُس وقت جو سُنیتی کے دل پر گذری اُسے سوا ایک ماں کے اور کون جان سکتا ہے۔ اور بھی ہر ایک ماں نہیں۔ جب سُنیتی نے تھوڑی دیر بعد جواب دیا تو اُس کی آواز میں ایک درد اور خوف تھا۔ جو اتنک اُس نے کبھی دُھرو ا پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ "میرے بچّے۔ میرے کلیجے کے ٹکڑے میں ضرور بلا دوں گی۔ مگر جب تم ذرا بڑے ہوگے۔ میں کتنی مرتبہ تم سے کہہ چکی ہوں"+

"ہاں، مگر میں آج اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ آج، ابھی۔۔۔۔ وہ ہیں کہاں؟ میں خود جاؤنگا۔۔۔۔ مُنی بالکوں نے بھی سب نے یہی کہا کہ میں سارا حال اپنے پتاجی کو بتادوں"؟

سُنیتی نے اُسے چھاتی سے لگا کر خوب پیار کیا۔ اور پوچھنے لگی۔ "آخر ہوا کیا؟ مجھ سے کہہ نہ دو"+

دُھرو ا نے سسکیاں لے لیکر اپنی ماں کو سارا قصہ سُنا دیا اور آخر میں کہنے لگا "اگر پتاجی کو معلوم ہو تو اُن کو بہت رنج ہو اور وہ ضرور مہارانی جی کو بتادیں کہ میں فقیر کا لڑکا نہیں ہوں"+

سُنیتی، غریب سُنیتی، دکھیاری سُنیتی! دُھرو ا کی بھولی بھالی باتوں نے اُس کے دل کا کام تمام کر دیا۔ وہ خود دنیا سے روپوش ایک جھونپڑی میں پڑی ہے۔ اُس کا بیٹا مہاراجہ اُدھن پاد کا اصلی وارث اور اُس کی گدی کا حقدار ایک مُنی بالک کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اس بن میں دنیا کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اور سُروچی اُس کا حق مارنے کی تدبیر کر رہی ہے۔ آہ ایشور یہ کیسی مصیبت ہے؟ وہ کیا کرے اور کیسے کرے؟ سُنیتی کے تمام پرانے زخم پھر اُبھر آئے۔ اور اب پہلے سے کہیں زیادہ گہرے اور تکلیف دہ تھے۔ پہلے تو فقط اپنا ہی رنج تھا۔ مگر اب اپنے لڑکے کا بھی غم تھا اور غضب تو یہ تھا کہ وہ ننھا بچّہ بھی اُس غم سے واقف ہوگیا تھا۔ اُسی بچّہ کا خیال مانع تھا کہ وہ موت کی دعا نہیں مانگ سکتی تھی۔ اُسی کی تنہائی اور بیچارگی کے خیال نے اُس کو ضبط اور برداشت کی قوت اُس وقت بھی دی+

اپنے آپ کو سنبھالکر وہ اپنے بچّہ سے پھر مخاطب ہوئی "آہ، دُھرو ا! میرے پیارے، میری جان، اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ اور اپنا کھانا کھاؤ"۔

مگر دُھرو ا نے سُنا ہی نہیں، اپنی دُھن میں پھر پوچھنے لگا "اچھا ماتاجی، یہ بتاؤ کہ اگر میں پتاجی کے پاس نہیں جاسکتا تو پھر کوئی اور ہے جو میرے جی کو اچھا کر سکتا ہے؟۔۔۔ میرا جی اب خوش نہیں ہوتا"؟

سُنیتی کے دل پر ایک تازہ اور کاری زخم لگا۔ دُھرو ا کو اپنی چھاتی سے لگایا۔ اور اس زور سے دبایا کہ بچّہ پریشان ہوگیا۔ مگر بہت جلد اُس نے پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگی "میرے بیٹے ذرا صبر کرو۔ تھوڑے دنوں میں اپنے پتاجی کے درشن کر لوگے"+

"تو کیا کوئی اور میری مدد نہیں کر سکتا؟"

دیکھا تو دوڑ کر اُس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ "سُروچی مائی! آپ کی آشیرواد کا بھکاری ہوں۔ آپ نے مجھے وہ چیز دی ہے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا اور نہ اس کا شکریہ کبھی ادا کر سکتا ہوں۔ آپ نے مجھے ہری سے ملا دیا"۔

پہلے تو سُروچی پر خوف اور شرم کا غلبہ تھا۔ مگر جب دھروا کے الفاظ اُس کے کان میں پڑے تو خوف اور شرم پہلے تعجب پر ندامت سے بدل گئے۔ اُس نے دھروا کو گود میں اُٹھا لیا اور رو رو کر اُس سے معافی مانگنے لگی۔ معصوم بچّے نے اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے اور اُس کو دلاسا دینے لگا۔ "رو نہ سروچی مائی! رو نہ! میں تم کو سچ مچ چاہتا ہوں۔ تم نے میرے ساتھ سچّی ماں کا سلوک کیا۔ اور تمہاری ہی وجہ سے مجھے ہری ملے"۔ پھر اُس کی گود سے اُترا اور اپنے باپ کے پاؤں چھو کر اُس سے آشیرباد مانگی۔

سُروچی دھروا سے مڑ کر سُنیتی کے آگے گھٹنوں کے بل جھک گئی اور رونے لگی "دیدی! دیدی! مجھے تمہارے آنے کی سچّی خوشی ہے۔ سوامی جی کے ساتھ اب گدّی پر بیٹھو اور ایشور کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کیا۔ مگر اب میں یہاں سے چلی جاؤنگی تم دیوی ہو اور میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے پاس رہوں۔ تم نے ایک مرتبہ مجھے بہن کہکر پکارا تھا۔ اور کہا تھا کہ میں تم کو اپنے دل میں جگہ دوں گی۔ اب پھر مجھے ایک مرتبہ بہن کہہ کر پکارو اور مجھے محبت کرنے کا حق دو"۔

سُنیتی نے اُس کو جلدی سے اُٹھا لیا اور نہایت پیار سے بولی "میں ہمیشہ تم کو چاہتی تھی۔ اور اب بھی تم کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتی ہوں۔ تم یہاں سے جانے کا خیال بھی نہ کرنا۔ میں رہنے کے لئے نہیں آئی ہوں۔ اب محل کی زندگی مجھے ذرا بھی نہ بھائیگی۔ پیاری سُروچی! یہیں رہو اور سوامی جی کی سیوا کرو"۔ یہ سُنکر اُدھن پاد دونوں مہارانیوں کے بیچ میں آکر نہایت غصّہ سے چلاّیا "میری سیوا کرے! میں تو اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا ہوں"۔

مہاراجہ کی کرخت آواز سے دربار تھرّا اُٹھا۔ سُنیتی نے اپنے شوہر کو کبھی غصّہ میں نہیں دیکھا تھا۔ ایسے کریہہ الفاظ سُنکر کانپنے لگی۔ سُروچی خوف اور غم سے اپنے شوہر کے سامنے گر پڑی اُس کے مُنہ میں گویا زبان نہ تھی کہ کچھ کہہ سکتی۔ اُس کا لڑکا بچّوں کی طرح اپنی ماں سے چمٹ گیا۔ اور اسکے غم زور شور سے شریک ہو گیا۔ گو غم کے سبب کی اُس کو مطلق خبر نہ تھی۔ مگر دھروا بغیر گھبراہٹ کے اپنے باپ کے سامنے جھکا اور منّت کرنے لگا "پتا جی مہاراج، خفا نہ ہوئیے۔ سُروچی مائی میری سب سے بڑی دوست ہیں۔

اُنہیں نے مجھے یہ بتایا کہ ماتا جی کی محبت میرے ساتھ کتنی سچّی اور بےغرض محبت ہے۔ ہم سب مل جلکر ایک ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟" معصوم کی منت سماجت کا مہاراجہ پر اثر ہوا۔ غصّہ فرو ہو گیا۔ بچّہ کو گود میں لے لیا اور سُنیتی جو درخواست کر رہی تھی اُسے خاموشی سے سننے لگا۔ "میرے مالک! میں محض دھروا کی وجہ سے یہاں آئی ہوں"۔ اور پورا قصّہ سُنا کر کہ دھروا کیسے ہری کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ کیسے وہ کامیاب واپس ہوا۔ اور کیوں اب سُروچی سے ملنے آیا تھا۔ بولی "میرے مالک! میرے پتی! مجھے اب تپ وَن واپس جانے کی اجازت دیجئے"۔

"ہرگز ہرگز نہیں! میں تم کو کبھی نہ جانے دونگا!" اتنا کہہ کر اُس نے سُنیتی کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔ سُنیتی نے بہت خوشامد کی "مالک میرے! اب شاہی محل میں میں خوش نہ رہ سکونگی۔ مجھے آشرم واپس جانے دیجئے"۔

اُدھن پاد بولا "خیر اگر تم جاؤگی تو میں بھی تمہارے ساتھ چلونگا۔ اب پھر میں جدائی نہ برداشت کر سکونگا"۔

دھروا خوشی سے چلاّ اُٹھا "پتا جی! پتا جی! کیا سچ مچ آپ ہمارے ساتھ چلیئے گا؟ جب آپ اور ماتا جی دونوں تپ وَن میں ہوں گے تو کتنا اچھا ہوگا!"

مہاراجہ چونک پڑا۔ اپنے فرض منصبی کا اُسے خیال آ گیا "نہیں، نہیں بیٹا، تم اب جنگل واپس نہیں جا سکتے۔ یہ گدّی تمہاری ہے اور اس پر میں تم کو بٹھا کر جاؤنگا"۔

دھروا کو یہ انتظام پسند نہ آیا۔ بولا "پتا جی مہاراج، چھوٹے بھائی کو گدّی پر بٹھا دیجئے۔ مجھے سنیاسی زندگی کہیں زیادہ پسند ہے اور وہاں ماتا جی کے بغیر مجھے چین نہ آئیگا"۔

چھوٹا راجکمار یہ سنکر بڑے بھائی سے دوڑ کر لپٹ گیا "دادا! دادا! میں مہاراجہ نہیں بننا چاہتا ہوں۔ میں تمہارا نوکر بن کر کام کرونگا۔ . . . . پتا جی مہاراج، آپ ان کی بات نہ سنیئے، ان کو ابھی گدّی پر بٹھا دیجئے"۔

[illegible] سارا دربار دنگ تھا۔ بھلا ایسے بھی راجکمار کہیں ہونگے! تعریفوں اور دعاؤں کا شور جب کم ہوا تو مہاراجہ نے اپنے بڑے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کہا "دھروا تم بڑے ہو اور اس لئے گدی کے حقدار۔ باپ جان کر آج تم سے پہلی مرتبہ ملے ہو اور تم سے میری پہلی اور آخری درخواست یہی ہے

کہ تم راج سنبھالو اور مجھ کو آزاد کردو کہ میں تمہاری ماتاجی کے ساتھ آشرم چلا جاؤں۔ اور اپنی زندگی کے آخری دن الیشور کی یاد میں گذار دوں"۔

دُھروا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر جواب صرف اتنا دیا کہ "بیٹے کا فرض ہے کہ باپ کا ہر حکم مانے"۔

دُھروا کی گدی نشینی کے سامان بڑی دھوم سے ہونے لگے۔ ہفتوں لگ گئے اور سُروچی کو موقع مل گیا کہ وہ اپنی پرانی غلطیوں کو اُن تھک اور جان توڑ خدمت سے تھوڑا بہت دھولے۔ اُدھن پاد نے اُس کو معاف تو کر دیا مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ اُس کے دل اور اُس کے خیالات میں اب سُروچی کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ سُنیتی کا دل بالکل صاف تھا۔ جب اپنے شوہر کے ساتھ تپ وَن جانے لگی تو اُس نے سُروچی سے کہا "دُھروا تمہارا لڑکا ہے۔ میں اُسے تمہارے ہی سپرد کرتی ہوں"۔ سُروچی نے عاجزی سے سر جھکا لیا اور دھروا کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا۔ اُس کا غرور ختم ہو چکا تھا اور گو دُھروا نے گدّی پر بیٹھتے وقت اعلان کر دیا کہ مہارانی سُروچی اُس کے ساتھ راج ماتا کی حیثیت سے رہیں گی۔ پھر بھی وہ عاجزی اور شرمندگی سے سر نہ اُٹھاتی تھی۔

جدائی کا وقت بھی آ گیا۔ وہ جُدائی آخری جُدائی تھی۔ سُنیتی نے دُھروا کو گود میں لے کر اُسے خوب خوب چھاتی سے لگایا اور بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ دُھروا اُس کی گردن سے لپٹ گیا۔ "ماتا جی! میری اچھی ماتا جی! یہ تمہاری ہی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ مجھے ہری ملے اور اب پتا جی کے درشن ہوئے۔ اب میرے لئے دعا کرو کہ میں ہمیشہ نیک کام کروں اور اپنے تمام فرائض کو اچھی طرح سے انجام دوں۔ مجھے سب ہمیشہ سُنیتی نندن کہیں گے۔ دعا کرو کہ میرے چلن سے اس نام کی ہمیشہ عزت رہے۔۔۔۔ الیشور تمہارے ساتھ ہے اور ہمیشہ تمہاری مدد اور حفاظت کریگا۔ تم نے بہت دُکھ اُٹھائے۔ مگر اب تمہارے آرام اور خوشی کے دن آ گئے"۔ دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے سُنیتی نے پیار کر کر کے اُن آنسوؤں کو پونچھا اور اُس کو سمجھا سمجھا کر دلاسا دینے لگی۔ "میرے چاند! میرے کلیجہ کے ٹکڑے! تم سے الیشور اپنا کام اُدھن پاد کی گدّی پر لینا چاہتا ہے۔ وہی تم کو راستہ بتائے گا۔ اور سب بُری باتوں اور آفتوں سے بچائے گا۔ یہ کہہ کر سُنیتی اپنے شوہر کے ساتھ تپ وَن کو رخصت ہو گئی۔

اُدھن پاد نے تخت و تاج چھوڑ دیا تھا۔ اور دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا تاکہ وہ اپنی زندگی کے باقی دن خدا کی عبادت اور اپنے اعمال کی صحت میں گذار دے۔ دھن دولت سب سے مُنہ پھیر لیا تھا۔ صرف شاہی جواہرات میں سے ایک چیز اپنے ساتھ آشرم لے گیا "ایک موتیوں کا ہار" ایک خاص ہار! جب اپنی کٹی پر پہنچے تو وہ ہار اُس نے سُنیتی کو پہنا دیا اور بولا "یہ ہار ایک مہاتما یا دیوی ہی پہن سکتا ہے۔ جب سُروچی نے اسے توڑ ڈالا تھا تو میں نے ایک ایک موتی چُن کر پھر اس کو گوندھا تھا۔ تب سے اسے رکھے ہوں کہ شاید تم کبھی مل جاؤ۔ لو یہ ہار اب پھر تمہارا ہے۔ تم ہی اس کو پہن سکتی ہو۔ کیونکہ تم صرف خود ہی دیوی نہیں ہو بلکہ ایک مہاتما کی ماں بھی ہو۔ الیشور نے تم کو میرا رہنما بنا کر بھیجا ہے۔ میری آنکھوں کی روشنی! میری زندگی کا سہارا! تم ہی سب کچھ ہو"۔ اُدھن پاد اور سُنیتی کی ناؤ اب طوفان سے نکل آئی تھی اور ساحل پر پہنچ گئی تھی۔ بس اب وہ تھے اور آشرم کی جنت۔

دُھروا کا راج رعایا کی خوش قسمتی سے بہت دنوں رہا اور جب اُس کی دنیاوی زندگی ختم ہو گئی تو الیشور نے اُس کے لئے ایک نیا سورگ بنایا۔ اور یہ کہہ کر اُس کو وہاں کی گدّی پر بٹھایا کہ "اس سورگ کا پرکاش (نور) ہمیشہ قایم رہے گا اور جو کوئی سچائی کی راہ تلاش کرے گا یہ پرکاش اُس کو راستہ دکھائیگا"۔ ہندو اس سورگ کو 'دُھروا لوک' یا 'دُھروا تارہ' کہتے ہیں۔ اسی کو قطب کہتے ہیں اور جب تک کہ کچھ بھی باقی ہے یہ چمکتا رہے گا۔ جب کچھ نہ رہے گا۔ اور ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ تو یہ بھی الیشور کے پرکاش میں مل جائے گا۔

اشفاق حسین

دیو صاحب!

از جناب یوسف حسین خاں صاحب

کالج کی زندگی میں رستم عباسی بھی میرے ایک دوست تھے!

رستم ان کا اصلی نام تو نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں انہیں ہر شخص اسی نام سے پکارتا تھا۔ (اور اگر سچ پوچھو تو انہیں خود بھی یہ نام بہت پسند تھا کیونکہ میں نے ایک مرتبہ کہیں اُن کے اصلی نام سے اُنہیں مخاطب کر لیا تھا۔ تو بہت دنوں تک وہ کچھ خفا سے رہے) اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا ورزشی جسم اور ڈیل ڈول اگر اُنہیں رستم نہیں تو ـــــ ایک حد تک ـــــ رستم کا شاگرد ضرور ثابت کرتا تھا!

کردار کے لحاظ سے بھی رستم کچھ بُرے نہ تھے۔ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میرے دوستوں میں سب سے زیادہ مخلص، دلچسپ اور پُر مذاق اگر کوئی تھا تو رستم۔ لیکن ان میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ ہمیشہ لڑنے کے لئے مستعد نظر آتے تھے۔ کم از کم ہم پر وہ ہر وقت یہی ظاہر کرتے رہتے تھے کہ لڑائی جھگڑے کو اُن کا جی چاہتا ہے۔

کسقدر تعجب کی بات ہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی اُنہیں کبھی لڑتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ ہاں جب کبھی ان کی زبانی ان کی ایک آدھ سرگذشت سُن لیتے تھے تو گاماں اور زبیسکو کی ہماری نظروں میں کوئی وقعت نہ رہتی تھی۔ ہمارے خیال میں دنیا میں مشہور ترین پہلوانوں کی عین خوش قسمتی تھی کہ رستم صاحب نے میدانِ عمل میں ابھی تک قدم نہ رکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رستم کی موجودگی میں ہم شرارتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔ اور پھر بھی اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتے تھے۔

ان کا اور ہمارا ساتھ کچھ تو ہم جماعت ہونے کی وجہ سے تھا۔ اور کچھ اس لئے بھی تھا کہ رستم ہر وقت ہنستا بولتا رہتا تھا۔ لیکن زیادہ تر ساتھ رہنے کی ایک اور وجہ تھی کہ وہ بہت ـــــ "دعوت نواز" واقع ہوئے تھے اور ہر وقت اپنے دوستوں کی خاطر داری میں مصروف رہتے تھے!!!

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ رستم کو لڑتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ جب کبھی تانگے والا زیادہ پیسے مانگ بیٹھتا تو ایک ڈانٹ بتلاتے تھے اور چلا چلا کر کہتے جاتے تھے:۔ "کیا پٹنے کو جی چاہتا ہے؟" اور ہر ہر لفظ پر زور بھی دیتے جاتے تھے۔ یا مثلاً ہم میں سے کوئی کہہ دیتا کہ فلاں دُکاندار ہمیں غیظ و غضب سے دیکھ رہا تھا۔ تو رستم جلدی سے جواب دیتے:۔ "چلو اچھا ہوا کہ میری اس پر نظر نہ پڑی!"

رستم عباسی کی طاقت اور دلیری کا صحیح تجربہ ہمیں ایک روز ہو ہی گیا شام کا وقت تھا اور چونکہ ذرا گرمی تھی اس لئے سیر کرتے کرتے ہم "مان سرووز" میں جا بیٹھے۔ پنکھا کھلوایا، میزوں کو بجایا اور آئیس کریم کے لئے "آرڈر" دینے ہی والے تھے کہ میری نظر ایک شخص پر پڑی جو ہم سے تین چار میز پرے بیٹھا ہوا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اسقدر قد و قامت کا انسان ابتک تو میری نگاہ سے گذرا نہ تھا۔ علی العموم لمبے آدمی دبلے پتلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شخص چھ فٹ سے زیادہ ہونے کے باوجود اسقدر تندرست اور موٹا تازہ تھا کہ اس پر کوئی مشہور پہلوان ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ لیکن اس کے چوڑے چکلے چہرہ پر صرف دو چیزیں نمایاں تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور لمبی لمبی مونچھیں جو خوب اچھی طرح تاؤ دے کر اوپر چڑھائی گئی تھیں اور اس کی وجاہت میں غیر معمولی اضافہ کر رہی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ شخص بقول میرے "دیو قامت" اور بقول رستم کے "مجسّم دیو تھا" تھا۔

ابھی ہم "معائنہ بالبصر" ہی کر رہے تھے کہ سلیم کی نگاہ اُس لڑکی پر پڑی جو دیو صاحب کی بغل میں دوسری کرسی پر ایک دلربایانہ ادا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ دیو صاحب کی "گراں ڈیلیت" نے اس مجسّمۂ حسن کو اس بُری طرح چھپا لیا تھا کہ سلیم کی نگاہ پڑتے ہی بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکلا "ارے ڈیکھنا" اور اس کے ساتھ ہی سب نے گردنیں نکال نکال کر جھانکنا شروع کر دیا۔

لڑکی کچھ شرمائی، کچھ لجائی، کچھ سمٹی لیکن جب ہم اپنی کوششوں سے باز

نہ آئے تو بیچاری نے جھینپ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا اور دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کو دیکھنے لگی۔ اب ہم بھی مجبور ہو گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔

سلیم بولا:۔ "یار ہے خوب!"

الطاف نے کہا "تم نے اس کے ہونٹ بھی دیکھے؟"

اعجاز کہنے لگا "دوست آنکھیں بڑی لاجواب ہیں!"

مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔ "کاش میں تصویر بن کے دیوار پر لٹک جاتا! ——— مگر یہ کمبخت دیوزاد......"

اب رستم کی باری تھی۔ اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا: "یہ بات ہماری بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لنگور اس حور کو کیونکر لے اڑا؟"

دیو صاحب نے غالباً یہ فقرہ سن لیا۔ کیونکہ رستم کا لہجہ نہایت بلند اور تیز تھا۔ انہوں نے گردن پھیر کر رستم پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ پھر سلیم، اعجاز، الطاف اور مجھے گھور گھور کر دیکھا، لڑکی کو کچھ اشارہ کیا اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہم ان کی خون آلودہ نظریں دیکھ کر سہم سے گئے۔ چنانچہ جب دونوں باہر جانے کے لئے ہمارے نزدیک سے گذرے تو سب کی نگاہیں سنگِ مرمر کی میز پر تھیں اور مجھے یقین ہے کہ اعجاز اور الطاف دل ہی دل میں قل اللہ کا ورد کر رہے ہونگے۔ لیکن رستم ——— ؟ رستم نے کنکھیوں سے دونوں کو دیکھا اور ایک فقرہ کس دیا!!!!

دیو صاحب ذرا ٹھٹکے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ نہایت غضب آلود نگاہوں سے رستم کو دیکھ رہے تھے۔ اور اُن کے چہرہ پر جس چیز کے آثار تھے وہ صاف بتا رہے تھے کہ "سمجھونگا" لیکن اس سے زیادہ دیو صاحب نے تجاوز نہ کیا۔ ایک سیکنڈ یا شاید اس سے بھی کم وہ رکے پھر لڑکی کو اپنے بازو پر لئے ہوئے نہایت خاموشی سے باہر نکل گئے۔

بہت دیر تک جمود طاری رہا۔

آخرکار میں نے سر اٹھا کر رستم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد ہو چکا تھا۔ ہاتھوں میں کسی قدر تشنج سا تھا اور اگر اس وقت "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" کا صحیح مصداق کوئی ہو سکتا تھا تو رستم عباسی!

الطاف نے بھی اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگا:۔ "جناب رستم صاحب۔ اس نے اچھی طرح سب کچھ سن لیا ہے۔ اور اب وہ ذرا لڑکی کو چھوڑنے گیا ہے۔ ابھی تھوڑی سی دیر میں آتا ہی ہوگا۔ پھر دیکھنا!"

رستم نے ایک قہقہہ لگایا لیکن بے روح!

میں نے کہا:۔ "ہشت، اب وہ واپس نہ آئے گا"

"آئیگا کیسے نہیں؟ کیا وہ کسی سے ڈرتا ہے۔ یا اس میں جان نہیں ہے؟ ——— کیوں ——— ذرا پانچ منٹ کے اندر اندر تم دیکھنا تو سہی!"

سلیم نے چپکے سے کہا:۔ "تم نے اس کی آنکھیں دیکھی تھیں؟"

رستم بولا "خیر ——— اگر وہ لڑنا ہی پسند کرے گا تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے"۔

اعجاز نے فوراً جواب دیا:۔ "دوست، وہ باز آنے والا کب ہے؟ ——— اگر میں غلطی نہیں کرتا تو "مان سرودر" ابھی ذرا سی دیر میں اکھاڑا بن جائیگا۔ ان میز کرسیوں کا بیمہ بھی ہو چکا ہے یا نہیں؟"

ٹھیک اسوقت آئس کریم کی چھوٹی چھوٹی پلیٹیں ہمارے سامنے چنی گئیں اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔ جس کے دوران میں رستم اور دیو صاحب کی کشتی۔ اس کا مستقبل اور اسی قسم کی گفتگو پر ہر ہر پہلو سے بحث کی گئی۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ ہم سب فلاں کیفے میں فلاں میز پر بیٹھ کر کشتی دیکھیں گے۔ اور اگر رستم نے دیو صاحب کو شکست دیدی (جیسا کہ یقین تھا) تو دوسرے دن تمام عمائدین شہر اور کالج کے اسٹاف کو ایک عظیم الشان دعوت دی جائے گی۔ دعوت کے خرچ کا اندازہ بھی ہو گیا۔ دعوت نامہ کا مضمون بھی مرتب ہو گیا اور کوئی چیز باقی رہ گئی تو ان کا چھپنا جو اعجاز کے ذمہ تھا۔ گفتگو نہایت گرمجوشی سے ہو رہی تھی لیکن رستم نے اس میں زیادہ حصہ نہ لیا۔ ابتک اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور وہ آئس کریم بھی شوق سے نہ کھا رہا تھا۔

الطاف کا اندازہ غلط نکلا۔ پانچ منٹ کی بجائے پندرہ منٹ گذر گئے اور دیو صاحب کا ابتک پتہ نہ تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا ہمارے اطمینان کے ساتھ رستم کی زندہ دلی بڑھتی جا رہی تھی۔ چہرہ کی سرخی واپس آ چلی تھی اور وہ بدستور باتیں بنانے لگا تھا۔ مثلاً ——— "دیو صاحب بڑے عقلمند تھے کہ واپس نہ آئے ورنہ ہڈی پسلی سلامت لے کر واپس نہ جاتے اور اگر بالفرض (اس بالفرض کا خیال رہے) وہ آ بھی جائیں تو پہلے اُن سے دریافت کر لینا کہ وصیت بھی کر آئے یا نہیں؟...."

"کھٹ، کھٹ!"

بھاری بھاری قدموں کی آواز ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو کانپ گیا۔

کیونکہ دروازہ میں دیو صاحب کھڑے ہم کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ باری باری سب نے انہیں دیکھا اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان خون آلودہ نگاہوں کی تاب لا سکا ہو۔ رستم کا چہرہ مردے کی طرح زرد ہو گیا۔ چمچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اور وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ سُرخ ٹوپی جو گھٹنوں پر رکھی تھی فرش پر گر پڑی ہے!

لڑکھڑاتے قدموں اور کپکپاتے جسم کے ساتھ وہ جا کر دیو صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینہ کی بڑی بڑی بوندیں نمودار ہو چکی تھیں اور وہ پورے طور پر بوکھلا رہا تھا اُس نے نہایت ادب سے کہا:۔ "ج ج ج ناب (جناب) ابھی ابھی جو کچھ ہوا اس کا مجھے انتہائی افسوس ہے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جناب اپنی "عالی نسبی" اور "فرشتہ باطنی" سے کام لے کر مجھے معاف کر دیں گے مجھ سے سخت بدتہذیبی سرزد ہوئی!"

دیو صاحب نے رستم کو پھر گھورا (مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رستم کو سخت سُری لگ رہی ہے) اس کے بعد واقعی اپنی "عالی نسبی" اور "فرشتہ باطنی" سے کام لے کر کسیقدر بھاری لہجہ میں دیو صاحب بولے:۔ "بابو ـــــ ام .... ہندوستانی .... نہی .... جانتا!"

یہ کہ کر وہ اس میز کی طرف بڑھے جہاں کچھ عرصہ پیشتر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ زمین سے ایک نازک سا رومال اُٹھایا۔ تہ کر کے احتیاط سے جیب میں رکھا اور ہمیں گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔

(ماخوذ) **یوسف حسین خاں**

خمسہ بر قطعہ حضرت لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم و مغفور

تو عزم کا تیشہ ہاتھ میں لے اور طبع کو یوں دلگیر نہ کر   اعمال میں کچھ تاثیر دکھا اقوال کی یوں تشہیر نہ کر
تدبیر کئے جا آخر تک بے حرمتیٔ تقدیر نہ کر   تو وضع پہ اپنی قائم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر

جو بے خبرِ معبود رہے بیکار رہے بے سود رہے   گر دل میں طلب موجود رہے اور حرص و ہوا مفقود رہے
کیوں رحمتِ حق مسدود رہے ناشاد تو کیوں محمود رہے   گو تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے
رکھ ذہن کو ساقیٔ فطرت کا بند اِس پہ درِ تاثیر نہ کر

رکھ حسرتِ دل دل ہی میں نہاں یہ راز کسی پر ہو نہ عیاں   کر اس کو کسی صورت نہ بیاں تشہیر سے ہو جاتا ہے زیاں
الفاظ میں یہ تاثیر کہاں کر قاصد جذبہ دل کو رواں   باطن میں اُبھر کر ضبط فغاں لے اپنی نظر سے کار زباں
دل جوش میں لا فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر

اس راہ سے لاکھوں کم ہمت گو صبح چلے اور شام چلے   پر آہ اُنھوں نے کچھ نہ کیا اور آخر سب ناکام چلے
ہستی کو مٹا گر چاہتا ہے ایوانِ جہاں میں نام چلے   تو خاک میں مِل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

محمود اسرائیلی

کتابی تصاویر یا منیچر پینٹنگ

از جناب مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال مرادآبادی

بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ نیرنگ خیال نے اپنی علمی و ادبی خدمات کے علاوہ "تصاویر" کے جس بلند معیار کو اپنے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے اور تصویر بینی اور تصویر فہمی کے جس مذاق سے پبلک کو روشناس کیا ہے۔ وہ اس کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس سلسلہ میں اگر میں اپنی علمی تحقیق کے نتیجہ کو ناظرین کے سامنے پیش کروں اور اُن کے مذاق اور تصویریت کے لئے علمی تقویت کا سامان بہم پہنچا سکوں تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا +

منیچر (تصویر کتابی) یا (MINIA TURE) لاطینی کلمہ ہے اور کلمہ می نیوم سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں "چھوٹا سا" "ننھا سا"۔ ——— اس لفظ کا استعمال قلمی کتابوں کی نقش کاری کے واسطے ہوا کرتا تھا اٹلی والوں نے اس لفظ کے استعمال کو ترقی دی اور وہاں سے یہ لفظ دوسری زبانوں میں رائج ہوگیا۔ عہد قدیم میں جبکہ کتب خانوں کا وجود نہ تھا عیسائی۔ رہبان کتابوں کو اپنے عبادت خانوں میں محفوظ رکھا کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے ان کتابوں کو "موقلم" (PAINTING BRUSH) یا آہنی قلم سے منقش کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اس نقاشی کو سُرخ رنگ سے کیا جاتا تھا۔ اس واسطے اس کا نام "رابیرا" یعنی "سرخ رنگ کی تحریر" بھی مشہور تھا +

گیارھویں صدی عیسوی میں کاتب اور منیچرسٹ[1] ایک دوسرے سے جدا نہ تھے۔ یعنی یہ صنعت فنِ کتابت کا ایک جزو سمجھی جاتی تھی ——— کاجل اور گوند کے مرکب سے سیاہ روشنائی بنائی جاتی تھی اور دوسرے رنگوں کو انڈے کی سفیدی، گوند یا سریشم سے ملا کر تیار کرتے تھے۔ چنانچہ اسکا رواج ایران میں اب بھی موجود ہے +

آہستہ آہستہ یہ کتابی گلکاری، ترقی کرکے حیوانات کی نقاشی کی صورت میں تبدیل ہوئی۔ اس کے بعد کتاب کے موضوع اور مضمون کے لحاظ سے انسان، باغ، کوہ، دریا، وغیرہ کی تصاویر بنائی جانے لگیں +

قدیم ترین منیچر، فراعنہ مصر کی قبروں میں پائے گئے ہیں، جن کی تاریخ تین ہزار سال سے کم نہیں۔ یہ ننھی تصویریں پتوں پر نقش ہیں۔ علاوہ ازیں ایک قدیم ترین مصوّر[2] کتاب موجود ہے جو رومیوں کی یادگار اور چوتھی صدی عیسوی کی نوشت ہے +

پانچویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی دو کتابیں اور ہیں۔ جن میں سے ایک فن طب میں ہے اور ویَن کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے +

آئرلینڈ کے تارک الدنیا عیسائیوں نے ساتویں اور آٹھویں صدی میں حیوانات اور گل بوٹوں کی تصویریں بنانے میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے جب انگلستان کا چکر لگایا تو یہ فن انگریزوں کو بھی سکھا دیا تھا۔ اس کے بعد یہ صنعت کاری سوئٹزرلینڈ، شمالی اطالیہ، جرمنی، فرانس، ہالینڈ وغیرہ دیگر ممالک یورپ میں پھیل گئی۔ اس زمانے کے منیچر سازی کے نمونے لندن کے عجائب خانہ

---

[1] MINIA TURIST (کتابی تصویر بنانے والا)۔ [2] مذکورہ بالا کتاب ویٹیکین کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ ویٹیکین دراصل ایک پہاڑی کا نام ہے جو روم میں دریائے ٹائیبر کے کنارے واقع ہے۔ یہاں پوپ کا محل اور ایک سلسلہ عمارات ہے جس میں عجائب خانہ، آرٹ گیلری، اور ایک کتب خانہ بھی موجود ہے +

موجود ہیں۔ اور چودھویں صدی عیسوی میں اس فن کی یورپ میں بہت گرم بازاری نظر آتی ہے ✦

قدیم ترین آثر جو جرمنی میں مصوّر ہوا، ویٹز نبرگ کے ایک راہب گا نفرید کے موقلم کا کرشمہ ہے جو ۸۶۵ء یا ۸۸۹ء میں مکمل ہے۔ یہ بھی وین کے عجائب خانہ میں موجود ہے —— ایک اور آثر بھی ہے جو ایک جرمن نقاش لینڈسبرگ نے ۱۱۷۵ء اور ۱۱۹۵ء میں تیار کیا۔ ایک اور کتاب جس کا نام "عجائب عالم" ہے ۱۳۵۰ء میں لکھی اور مصوّر کی گئی۔ اور اس سلسلہ میں بہت اہم تصوّر کیجاتی ہے ✦

اس کے علاوہ اہم ترین خطی مصوّر نسخہ جس کا نام "رُومانِ گُلِ سُرخ" ہے۔ اور جان ڈیلیم کی مخلوق فکر ہے۔ اس سلسلہ کی نادر یادگار سمجھی جاتی ہے ✦

"کتاب دعائے قیصر" میکسملین جس کو مشہور جرمن نقاش البرکٹ ڈوررز نے ۱۵۱۵ء میں مصوّر کیا اور اب میونچ کے عجائب خانہ میں موجود ہے قابلِ دید چیز ہے ✦

یورپ کے عہد تجدید میں جبکہ تمام فنونِ لطیفہ اوج ترقی پر تھے، مینیچر سازی بھی خطی کتابوں پر منحصر نہ رہی بلکہ دھلی، ہاتھی دانت، بلور، شیشہ، لکڑی پر بھی تصاویر نقش کی جانے لگیں ——

ابتدا میں مینیچر سازی بہت سادہ اور معمولی تھی۔ اور اس نے فن کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی۔ مگر چودھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک یورپ کی متمدن اقوام نے اس کو بھی فن مناظر کے اصول و قواعد سے آشنا کر دیا۔ جس کے سبب سے اب یہ فن بہت ہی دلچسپ و دل آویز ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس فن پر یورپ میں بہت سی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں ✦

یورپ میں آجکل بھی سازی کا رواج ہے اور لاپیز تک شہر میں ایک نقاش کی وہ چھوٹی چھوٹی تصاویر جو وہ ہاتھی دانت پر بناتا تھا، بہت قیمتی اور نادر تصوّر کی جاتی تھیں ——

عہد حاضر میں مینیچر سازی قرون وسطیٰ کی طرح مشکل اور دشوار نہیں ہے۔ یہ فن بھی دوسرے فنوں کی طرح قواعد و ضوابط کے سلسلہ میں جکڑ دیا گیا ہے ✦

چین اور جاپان میں بھی اس فن کی تجدید اور حفاظت کی جا چکی ہے۔ اور ان ممالک سے ہر سال ایک معقول تعداد میں صنعت کاری کے نمونے یورپ اور امریکہ کو بھیجے جاتے ہیں ✦

مرزا عاشق علی بیگ خیال

برسات کی ایک شام

ہوائیں دم بخود ہیں دم گھٹے جاتے ہیں سینوں میں
خس و خاشاک ہیں تو نسے ہوئے پتا نہیں ہلتا
دلوں کے ولولے خوابیدہ ہیں آغوشِ حسرت میں
مکانوں کے در و دیوار سے آنچیں نکلتی ہیں
نظارے ہو رہے ہیں بام پر خلوت نشینوں کے
کہاں سے دیکھ! اے دل بھولے بھالوں کی پریشانی
لپٹ دہکے ہوئے شعلوں کی آتی ہے ہواؤں میں
گلستانوں کی دنیا جب تپش سے نیم جاں دیکھی
ہجومِ یاس سے یہ قصرِ دل بیٹھا سا جاتا ہے
اداسی ہے حسینوں کی نظر کی داستانوں میں
فلک پر کالے کالے ابر ہیں چھائے ہوئے ہر سو
نکل کر جب نقابِ ابر سے بجلی چمکتی ہے

مٹے جذبات سے بے رنگ دل کے آبگینوں میں
گلستانِ تمنا میں کوئی غنچہ نہیں کھلتا
اداؤں کے شگوفے خشک ہیں باغِ نزاکت میں
پسینہ بہہ رہا ہے ہڈیاں شاید پگھلتی ہیں
تپش سے رنگ سنولائے ہوئے ہیں مہ جبینوں کے
نمی رخسارِ گلگوں پر عرق آلود پیشانی ہے
جہنم جذب شاید ہو گئے آ کر فضاؤں میں
رگِ احساں میں نسیمِ سرد نے جائے اماں دیکھی
اجی انساں تو انساں ذرہ ذرہ تلملاتا ہے
پرندے چونچ کھولے دم بخود ہیں آشیانوں میں
شرابِ سرخ سنجافوں پہ چھلکائے ہوئے ہر سو
جبینوں پر خطِ تقدیر کی سرخی جھلکتی ہے

احسان کاندھلوی

آہ! حنیف ہاشمی

ایک نوجوان ادیب کی موت پر دو آنسو

از جناب مہر محمد خاں صاحب شہاب بمبئی

مجھے کیا معلوم تھا کہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۰ء کی شام کو بمبئی آتے ہوئے دہلی کے سٹیشن پر حنیف سے جو ملاقات ہوئی تھی وہ آخری ہوگی۔ اور "باب فردوس" عنوان کا افسانہ اُس کے آخری منزل کو روانہ ہونے سے پہلے کا آخری بیان۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ راجعون ✦

میرے دو عزیز اور محترم کرمفرماؤں کے خط میرے سامنے ہیں جن میں مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ اردو کے نوخیز نوجوان ادیب برادر عزیز حنیف ہاشمی کا ۱۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو اپنے اختیاری وطن جموں میں انتقال ہوگیا۔ ان میں سے ایک خط جناب محترم حکیم محمد یوسف حسن صاحب مدیر نیرنگ خیال لاہور کا ہے اور دوسرا خط جناب مکرم عشرت رحمانی رامپوری کا۔

غالباً آج سے دو ماہ قبل میرے، ایک استفسار ہی کے جواب میں برادر محترم جناب مولوی منصور احمد صاحب مدیر ہمایوں لاہور نے مرحوم حنیف کی علالت شدید کی اطلاع دی تھی۔ اور لکھا تھا کہ یہ ہونہار (آہ جانہار) مرض سل میں مبتلا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ جوانی میں ایسے امراض یقینی موت کا پیغام ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے اکثر دست بدعا رہا کرتا کہ خونخوار موت کم از کم اس نوجوان کو تو اپنے حیات ربا تیروں کا نشانہ نہ بنائے۔ لیکن جبکہ ہماری آرزوؤں اور قضا و قدر میں ہمیشہ سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ اس لئے اگر میری یہ آرزو بر نہ آئی تو کچھ عجب نہیں۔ تاہم مرحوم کی بے وقت موت دل مجروح کے لئے مزید سامان جراحت فراہم کر گئی ✦

مرحوم کی علالت شدید کی خبر پاکر میں نے ایک خط لکھا تھا جو جناب منصور ہی کی معرفت مرنے والے کے پاس پہنچا یا نہیں معلوم کہ وہ خط ان عزیز کو ملا یا نہیں۔ مجھے اس خط کا مفہوم یاد ہے۔ اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ "حنیف مرض سل تو ظاہری مرض ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تمہارا مرض اصل میں کیا ہے کہ تم نے مجھے خود دہلی میں اپنا راز دار بنا لیا تھا" ✦

مرحوم حنیف عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ لیکن اُن کا خلوص اُن کی سادگی۔ اُن کا عزم راسخ اور ولولۂ کار اور اُن کی طبیعت کی بلندی ہمیشہ میرے دل میں اُن کے لئے جذبات احترام پیدا کرتی رہی ہے۔ اب جبکہ وہ مادّی طور پر ہماری مادّی آنکھوں سے نہاں ہوگئے۔ میں اُن کی یاد زندہ رکھنے کے لئے ذیل کی چند سطور نیرنگ خیال میں لکھ رہا ہوں۔ کہ حق دوستی کسی حد تک ادا ہوسکے اور جو لوگ حنیف کو نہیں جانتے وہ جان لیں اور جنہوں نے نہیں دیکھا وہ ان الفاظ کے پردے میں دیکھ لیں کہ یہ نوخیز نوعمر مگر پُر جوش اور محبت و عشق کا نغمہ گو اور قتیل ادیب کیا اور کیسا تھا ✦

۱۹۲۹ء کے ابتدا میں جب میں بمبئی سے اپنے وطن مالیر کوٹلہ میں پہنچا تو شاید مارچ یا اپریل کا ادبی دنیا کہ وہی اس کا پہلا نمبر بھی تھا۔ میرے ایک عزیز نے مجھے دکھایا۔ رسالہ کے اراکین ادارہ میں جو نام مندرج تھے ان میں "حنیف ہاشمی" میرے لئے نیا نام تھا کہ اب تک میں نے یہ نام اخباری دنیا میں نہ سنا تھا نہ اُن کے مضامین دیکھے تھے۔ تاہم نام دیکھتے ہی یہ خیال ہوا کہ اگر شہرت نہیں تو اور خوبیاں ہونگی (جن میں سے ایک اُن کے

دولتمند ہونے کا خیال بھی تھا) جن کی وجہ سے یک بیک ایسے ادبی رسالہ کے صفحۂ اوّل پر ان کا نام بامتیاز ثبت ہے جو بڑے بڑے ارادوں اور دعاؤں کے ساتھ پبلک میں آرہا ہے۔

تھوڑے دنوں بعد حالات نے مجھے لاہور پہنچا دیا۔ اور پہلے ہی دن حنیف سے ملاقات ہوئی۔ وہ جس کی تصویر میں نے کیا سے کیا بنا رکھی تھی۔ دیکھا تو یہ کہ بالکل ایک نوعمر لڑکا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بالکل دُبلا پتلا میانہ قد۔ مگر تیر کی طرح سیدھا۔ بڑی بڑی شربتی و خوبصورت آنکھیں۔ باریک ستواں ناک۔ باریک ہونٹ۔ چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ۔ رنگ گو سفید نہ تھا۔ مگر اسے سانولا بھی نہیں کہہ سکتے۔ پیشانی کھلی اور اُبھری ہوئی۔ سر بڑا گردن پتلی اور لمبی۔ ہاتھ خوبصورت۔ اُنگلیاں لمبی لمبی۔ بس صاف ایسا نظر آتا تھا کہ ایک تیر ہے یا ایک پتلی۔ مگر عزائم بلند۔ اپنے آپ کو عام سطح سے کچھ اونچا سمجھتے تھے۔ اور دوسرے پر بھی یہی اثر ڈالنے کی کوشش تھی کہ وہ ان کو سطح عام سے اونچا خیال کرے۔ لیکن اس میں تکلف و تصنع کا شائبہ نہ تھا چہرہ پر تبسم تھا۔ تہقہہ بھی تھا۔ مگر ان سب میں "انا" کا خیال نظر انداز نہ ہوتا تھا۔

حالات ہی کا تقاضا تھا کہ ہم دونوں قریباً ڈیڑھ مہینہ تک ایک جگہ۔ ایک مکان میں۔ ایک چھت کے نیچے ساتھ ساتھ رہے۔ گو دن کا تو کچھ حصہ اُن کے ساتھ بسر ہوتا تھا۔ مگر رات ہماری ہوتی تھی۔ اس رات میں علم کی باتیں۔ سیاست کی باتیں۔ تعلیم کی باتیں۔ روزگار کی اور روزگار سفلہ پرور کی باتیں دنیا کے نشیب و فراز کی باتیں۔ لوگوں کے اخلاق و اطوار کی باتیں۔ دنیا اور اہل دنیا کی دو رنگیوں کے تذکرے۔ کبھی کبھی فلسفہ و مذہب پہ بھی معرکے ہو جاتے تھے۔ انہی ایام میں کبھی کبھی ہمارے دوست مولوی منصور احمد صاحب بھی ہماری صحبتوں اور شام کی سیروں میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس ڈیڑھ ماہ کی مدت میں سے کچھ روز حنیف کا چھوٹا بھائی شریف سلمہ بھی کہ ان دنوں انجمن اشاعت اسلام لاہور کے ہائی سکول میں پڑھا کرتا تھا۔ ہماری اس انجمن مختصر کا چھوٹا سا رکن بن جایا کرتا تھا۔ وہ ہماری باتوں کو سنتا اور اپنے فلسفۂ طفولیت سے ہم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا کرتا تھا۔ ان لمحات فرصت میں ایک تعلیم یافتہ نومسلم عیسائی اور ان کے عیسائی بھائی بھی ہماری صحبتوں میں اکثر شریک رہتے تھے۔

ایسا گل نو رستہ عین عالم شباب میں مرجھا کر گر جائے اُس کی سوانح عمری ہی کیا ہو سکتی ہے۔ وہ جس کی زندگی کا پھول کھلتا تھا اور جس کا لمحۂ حیات شمع کی تابناکی جو خندۂ صبح پر تمام ہو گئی۔ تو ایسی مختصر زندگی کے حالات ہی کیا ہونگے مگر پھر بھی ان ہی ملاقاتوں میں ان کی زندگی کے واقعات جو انہی کی زبانی معلوم ہوئے ہیں اس موقع پر سپرد کاغذ کرتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ مرحوم کی عمر موت کے وقت پچیس سال سے یقیناً زیادہ نہ تھی۔ کم البتہ ہو تو ہو۔ ان کے تین بھائی اور ہیں۔ جن میں برادر بزرگ حکیم ہیں اور اپنے والد محترم کے علم و عمل میں جانشین۔ اُن سے چھوٹے ریاست کشمیر ہی میں کسی جگہ مدرس ہیں۔ اور تیسرے بھائی محمد شریف جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے غالباً ابھی تعلیم پا رہے ہیں۔ مرحوم کے والد جناب حکیم فتح محمد صاحب مرحوم جموں کے مشہور طبیب تھے۔ جو "دہلوی حکیم" کے نام سے مشہور تھے آپ کا اصلی وطن "منوڑ" علاقہ پٹیالہ ہے۔ بسلسلۂ ملازمت جموں و کشمیر میں چلے گئے تھے۔ علم طب میں کامل اور علوم رسمیہ کے ماہر تھے۔ ان کمالات کے ساتھ اخلاق بھی اعلیٰ پائے تھے۔ اس لئے عام و خاص کی نظر میں محبوب و مرغوب اور معزز و محترم تھے۔ جب حکیم صاحب موصوف کا انتقال ہو گیا۔ تو گھر اور گھر کے کاروبار میں بھی انقلاب آگیا۔ حکیم صاحب کو اپنے سب بچوں سے پیار تھا۔ اور یہ فطرتی امر ہے۔ مگر حنیف سے خاص طور پر الفت تھی۔ انہیں بچپن ہی سے اہل علم و فن کی صحبت میں بنظر استفادہ بٹھاتے۔ انکی ذہانت کی باتیں سنتے اور ان کی فراست پر خوش ہوتے۔ ابھی جبکہ حنیف بچہ ہی تھے۔ آپ نے انہیں اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے سپرد کر دیا کہ نشتر کا ابتدائی عملی سبق ان سے حاصل کریں۔ حنیف مجھ سے کہا کرتے تھے کہ وہ معمولی اپریشن نہایت خوبی سے کر سکتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ نے بھی تربیت کے بارے میں کبھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں کی۔ حنیف نے مجھے بتایا تھا۔ کہ کس طرح اُن کی والدہ نے ان چھوٹے بچوں کے دل میں فرض شناسی کام کا جوش اور خدمت ملت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

حالات ہی انسان سے کام کراتے ہیں۔ گھر کے بدلے ہوئے حالات ہی نے نوجوان حنیف کو جموں سے لاہور پہنچا دیا۔ اور لاہور آتے ہی اخبار کشمیری کے دفتر میں معمولی معاوضہ پر کام کرنے لگے۔ وہیں کام کیا کرتے

تھے کہ خدمت دین اور تکمیل تعلیم کے جذبہ نے اُن کو کرسی ادارت سے ہٹا کر انجمن اشاعت اسلام کے کالج کے طالب علموں کی صف میں بٹھا دیا +

اسی کالج میں حنیف نے عربی پڑھی۔ فرانسیسی زبان سیکھی۔ انگریزی کا مذاق ستھرا اور اعلیٰ تھا۔ لکھنے پر بھی قدرت تھی۔ بولنے میں بھی زبان طرار تھی۔ سُنا ہے کہ انجمن اشاعت اسلام والے مرحوم کو ولایت بھیجنا چاہتے تھے کہ اُن کے سامنے "ادبی دنیا" کی اشاعت کی سکیم آ گئی۔ اور جناب "تاجور" صاحب کے ساتھ ملکر اُنہوں نے ادبی دنیا نکالا۔ اسی ضمن میں انکی ملاقات سر اقبال اور سر عبدالقادر صاحبان سے بھی ہوئی اور ہوتی رہی۔ اقبال سے حنیف کو عشق تھا۔ حنیف کے بیانات اور خطوط شاہد ہیں کہ اقبال بھی حنیف سے خاص بزرگانہ اور مربیانہ شفقت اور لطف فرماتے تھے +

اگر ایمان اور مشاہدہ کی بات زبان پر لانا گُناہ نہیں ہے تو میں اپنے مختصر تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ادبی دنیا کو "ادبی دنیا"

اسی نوجوان کی دن رات کی لگاتار محنتوں نے بنایا تھا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے صبح سے شام تک اور گرمی کی راتوں میں رات کے بارہ بارہ بجے تک چراغ کے سامنے ادبی دنیا کے لئے حنیف کو کام کرتے دیکھا ہے۔ میں نے متعدد بار کہا بھی حنیف صحت کا خیال رکھو۔ مجھے حنیف کو یوں کام کرتا دیکھ کر ایسے لوگوں کی بے حسی پر افسوس آیا کرتا تھا جو نام بڑے اور درشن چھوٹے کے مطابق دوسروں کے دل و دماغ اور محنت و سعی کے بل بوتے پر دنیا میں تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں۔ ایسے اوقات میں حنیف کا جواب ایک ہوتا تھا کہ میں ادبی دنیا کا ملازم نہیں ایک حیثیت سے ایک حد تک مالک ہوں۔ یہ پرچہ میرا ہے۔ میں اس کی ترقی کے لئے ساعی ہوں اور کام کرنے میں تو میرے لئے زحمت نہیں راحت ہے +

آخری ایام قیام لاہور میں اُنہوں نے میرے سامنے تجویز پیش کی تھی کہ میرا نام بھی ادبی دنیا کے ادارہ میں بشرائط چند شایع ہوا کرے مثلاً ایک یہ کہ فلاں فلاں رسالے میں مَیں مضمون نہ لکھوں۔ اور میں ان لوگوں سے ذاتی تعلقات کی بنا پر یہ شرط مان نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے انکار کر دیا۔ مگر میں یہاں اپنے حالات نہیں مرحوم حنیف کے حالات لکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے ان تفصیلات سے اجتناب اولیٰ ہے +

حنیف پست ہمت نہیں بلند ہمت تھا۔ کوتاہ نظر نہیں وسیع النظر تھا گو "مذہب" کے مصطلحہ ماحول میں ہم سب کی طرح اُس نے بھی پرورش و تربیت پائی تھی۔ تاہم وہ پابندیوں پر نظر رکھتا۔ وہ الفاظ کی قیود سے الگ ہو کر معانی کی حدود کا پتہ لگانا چاہتا تھا۔ فلسفہ اخلاق و مذہب اور رومان اُس کے موضوع مطالعہ تھے۔ علاوہ ازیں وہ ماتھے کو زمین پر گھسنے کی بجائے دل کو معبود میں فنا اور بندوں کی اصلاح و فلاح کے لئے خاک میں ملا دینے کا قائل اور اسی پیرایہ انداز خود عامل تھا۔ اس کا دماغ مضبوط اور دل پرجوش تھا۔ مگر جسم نحیف تھا۔ جہاں دماغ آسمان کی سیر کرتا تھا وہاں اُس کا دل محبت و عشق کے دیوتاؤں کی پوجا یا حسن زاروں کی سیر کا بھی متمنی تھا۔ اس کا دل رموزِ عشق سے بیگانہ نہ تھا۔ ہاں اُس کا یہ دل گردہ اور قوت تھی کہ اپنی محبت کو چھپائے رکھے۔ نااہلوں سے چھپائے رکھے حتیٰ کہ بھسم ہو جائے۔ یہی آگ جو اس کے سینہ میں دبی ہوئی تھی ۱۹۲۹ء کے نصف آخر میں بھڑک اُٹھی حتیٰ کہ اس آگ کی لپٹ بمبئی میں مجھے بھی محسوس ہوئی۔ اور اسی آگ نے دل کو جلا کر "عہدِ اُلفتِ رفتہ" کی شکل اختیار کر کے اپنی سوختہ سامانیوں کے خاکستر کا ڈھیر دہلی میں مجھے دکھائی دیا تھا۔ ؎

رضا! کتنی حسین اور مختصر شرح محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے جو راس آئے تو جنت ہے

حقیقت یہ ہے کہ وہ ادنیٰ جذبات سے اتنا ہی اونچا تھا جتنی کہ اسکی طبع سلیم ادنیٰ آدمیوں کی سطح سے اونچی تھی۔ وہ بچپن سے محبت آشنا دل لایا تھا۔ اور قدم قدم پر حوادث اُسے پیش آئے تھے۔ چونکہ وہ اپنے افسانے کسی کو سُناتا نہ تھا لیکن قلم میں قدرت تھی اس لئے افسانوں کے رنگ میں اپنی ہی تصویر کھینچا کرتا تھا۔ اس کا زندہ ثبوت مرحوم کا فسانہ "بابِ فردوس" ہے جو ۱۹۳۱ء کے سالنامہ نیرنگ خیال میں شایع ہوا ہے۔ غالباً وہ اسی کی داستان تھی اور آخری بھی (جہانتک مجھے معلوم ہے) آہ! وہ یہ داستان سُنا کر حقیقتاً "باب فردوس" پر نہیں حقیقی فردوس میں پہنچ گیا +

وہ بڑا خود دار تھا۔ گداگری کا عادی نہ تھا۔ بھوک سے مر جانا قبول کر سکتا تھا۔ لیکن اپنی آن بان میں فرق نہیں آنے دیتا تھا۔ ایک ایسے ہی موقعہ کی دہلی میں اُنہوں نے مجھے اپنی داستان سُنائی تھی۔ کہ بیکاری نے اُن کا

پتلا حال کر رکھا تھا۔ کسی ضرورت سے اُنہیں پوسٹ آفس میں جانا پڑا کاؤنٹر پر لوگوں کا اژدحام زیادہ تھا۔ کلرک حنیف کو جانتا تھا۔ اُس نے انتظار کرنے کے لئے کرسی پیش کی کہ بیٹھ جائیے۔ وہاں اور چند لوگ بھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کام ہو رہا تھا۔ اتنے میں حنیف کو احساس ہوا کہ ایک معمر انگریز خاتون وہیں کھڑی ہیں اور دیر سے کھڑی ہیں۔ کسی نے ادھر توجہ بھی نہ کی تھی مگر یہ اس احساس کے ساتھ فوراً کھڑے ہوئے اور ادب سے معذرت چاہتے ہوئے کرسی خاتون کے لئے خالی کرکے الگ ہو گئے۔ اس خاتون پر بڑا اثر پڑا۔ اور وہ ان سے شفقت مادری فرمانے لگیں۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ اُنہوں نے ایک بیکار کے بیکار ہونے تک خود بخود اس کی تمام ضروریات کی بڑی ہی مسرت سے کفالت کی۔ اسے وہ لطیفۂ غیبی سمجھتے تھے +

جب میں اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ تو ایک اور لطیفہ پیش آیا تھا۔ ان کے کمرہ کا کرایہ گیارہ یا پندرہ روپیہ ماہوار تھا۔ میں نے اپنے حصہ کا کرایہ دینا چاہا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ آپ اس کمرے میں جبتک چاہئے رہئے۔ ہمیشہ رہئے لیکن اگر آپ کو کرایہ دینا ہے تو رہنے کا دوسرا انتظام کر لیجئے۔ یہ ابتدائی ملاقات کی بات ہے۔ بعد میں تو ہماری چائے، ہمارا کھانا ہمارا سیر مشترکہ ہوتی تھی۔ اور حسابِ دوستاں در دل کا مضمون رہتا تھا +

وہ چائے کے بہت عادی تھے کشمیر کی رہایش کا اثر تھا۔ لیکن صبح کے ناشتہ کے ساتھ حنیف کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے اور جموں کی باقرخانی میرے لئے لاہور کی مئی کی گرمی میں کچھ ضروری سی چیز قرار پا گئی تھی +

لاہور میں ہم جہاں رہا کرتے تھے اس کے قریب ہی ایک نعلادی کبابچی رہا کرتا تھا۔ پہلے بھی حنیف وہاں کبھی کبھی کھانا کھایا کرتے تھے۔ وہی مجھے اس کے ہاں لے کر گئے۔ وہ اُردو جانتا تھا۔ مگر اُس کی اُردو اور ہماری فارسی میں شاید اُنیس بیس ہی کا فرق ہوگا۔ تاہم میرے جاتے ہی اُردو رخصت ہو گئی اور ہماری اُس سے فارسی میں گفتگو رہنے لگی۔ وہ میرے لب و لہجہ اور زبان کی روانی سے حیران ہو کر کہتا کہ تم ایران میں کتنا عرصہ رہے ہو۔ میں کہتا کہ میں نے تو ہندوستان سے باہر قدم بھی نہیں نکالا۔ خاک ایران کو میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں ایرانیوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ضرور ہوا ہے۔ غرض وہ عرب و عجم کا سرحدی کبابچی لاہور میں ہم سے فارسی میں باتیں کرکے خوش ہوتا تھا۔ اور ہمیں لاہور میں شیراز کی زبان سننے کا مزا آتا تھا۔ کہ اُس کی ماں شیرازی تھی۔ انہی کبابوں کے کثرت استعمال نے مجھے بیمار ڈالدیا اور بیماری بھی ایسا کہ بخار نے ہوش گم کر دیئے۔ خدا شاہد ہے کہ اس حالت میں حنیف اور اُن کے بھائی شریف نے بڑے ہی پیار سے میری تیمارداری کی۔ آہ حنیف کے آخری مرض میں تیمارداری تو کیا معنے اس کو دیکھ تک نہ سکا +

اس میں کوئی شک نہیں کہ حنیف اُن دنوں "ادبی دنیا" کی ادارت پر نازاں تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص مجھ "بچے" کو دیکھے کہ "ادبی دنیا" کا ایڈیٹر "نو عمر چھوکرا" ہے تو وہ کیا کہے۔ میں کہا کرتا تھا کہ حنیف ہمارے بزرگ غلط نہیں کہہ گئے کہ "بزرگی بعقل است نہ بسال"

حقیقت میں دل و دماغ کی قیمت ہے اور خدا کا شکر ہے کہ یہ دونوں چیزیں تمہیں حاصل ہیں۔ تم ایک ادبی دنیا ہی نہیں کئی ادبی دنیاؤں بلکہ اس سے بہتر دنیاؤں کے ایڈیٹر اپنے بل بوتے پر ہو سکتے ہو۔ اور ہوگے۔ لیکن خدا کے لئے جینے کی فکر کرو +

وہ بھولا تھا اور شرافت و نجابت میں بھولا پن ضروری ہے۔ اُس نے بعض مکاروں اور عیاروں پر بھروسہ کرکے دیکھ لیا تھا۔ کہ یہ لوگ شہرت و دولت کے شکاری دوسروں کے پروں پر اُڑ رہے ہیں۔ مگر وہ اری نجابت پھر بھی ایسے لوگوں کی مخالفت سے اُس نے اپنی زبان قلم کو کبھی آلودہ نہ کیا۔ مجھ سے حنیف نے ایک زمانہ میں ایک مضمون لکھوایا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ترجمہ کرایا اور ترجمہ پر نوٹ لکھوایا۔ جب وہ ایک خاص پرچہ میں شایع ہوا تو میرے نام کی بجائے "مرغ زرّیں پر" کا نام درج تھا۔ میں نے خط میں شکایت کی کہ تم میرا نہیں اپنا ہی نام لکھ دیتے۔ مگر یہ خواہ مخواہ یعنی چہ حنیف نے خطوں میں تو جواب نہ دیا۔ مگر زبانی صرف اتنا کہا۔ کہ کیا آپ بھی دنیا کی چالاکیوں اور مخلصوں کی مجبوریوں سے اتنے ہی ناواقف ہیں؟

اُنہیں اپنے بھائیوں خصوصاً اپنی والدہ کی خدمت اور چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا۔ دولت پیدا کرنے کی بھی فکر تھی کہ جس سے وہ اپنے مقاصد عالی میں کامیاب ہو سکیں۔ مگر ابھی تو زندگی کی ابتدا تھی۔

اور یہ چیزیں جن کو ملتی ہیں۔ مدت دراز کی لگاتار محنتوں کے بعد یا چالاکیوں سے ملتی ہیں۔ چالاکی کا وہ خوگر نہ تھا۔ رہی زندگی تو ابھی اس کی آنکھ کھلی ہی تھی کہ بند ہوگئی اور ہمیشہ کے لئے +

اُس کی زندگی اور محبت بھری زندگی کیا تھی؟ خواب کا لمحۂ مختصر یا آنکھ کا جھپکنا +

حنیف نے اپنے آپ کو تبلیغ اسلام کے لئے تیار کیا تھا۔ مگر حالات نے انہیں بیرونی ممالک میں لے جانے کی بجائے ہندوستانی پریس کا رکن بنا دیا تھا۔ آخر آخر میں تو وہ یہی چاہنے لگے تھے کہ یہیں رہ کر اپنے قلم سے ہندوستان کی نئی مانگ میں خدمت کریں۔ ادبی دنیا سے علیحدہ ہونے کے بعد غالباً "طلوع شرق" کے نام سے رسالہ نکالنے کی فکر میں تھے کہ اسی دوران میں "نیرنگ خیال" میں کام کرنے لگے تھے۔ اور اس کے بعد ان کا تعلق اخبار ریاست سے قایم ہو گیا تھا۔ اور اس سے انقطاع کے بعد سفر آخرت کی تیاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ جس پر ۱۴ر جولائی ۱۹۳۱ء کو روانہ ہو گئے۔ اور یہ وہ سفر ہے جس سے کوئی پلٹ کر نہیں آیا +

جب وہ ریاست میں کام کرتے تھے اُس وقت جناب حکیم یوسف حسن صاحب مدیر نیرنگ خیال کے محاسن اور خوبیوں اور حسن معاملہ کی تعریف مجھ سے کرتے تھے۔ جب حکیم صاحب سے تعلق ہوا تھا اُس وقت وہ "حسن خاتمہ" کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ آہ انقلاب دوراں کی لہروں کے تھپیڑے کہ انسان کسی پر یقین کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور کسی پر بھروسہ کرتا ہوا تھراتا ہے۔ دنیا دم آخر تک تجربہ گاہ ہے۔ آخر وقت تک حقیقت کے جویا یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہم اپنے علم کو کامل نہیں کہہ سکتے۔ جوانی میں تو صرف ایک ضرب کے بعد دوسری کے لئے تیار رہ سکتے ہیں۔ مگر عمر کے بڑھنے کے ساتھ قوتوں میں کمزوری آنے لگتی ہے۔ اس وقت انقلاب سے خوف کھاتے اور مصائب کے نام سے گھبراتے ہیں +

ان کے مضامین مختلف الفاظ اور مختلف رنگوں میں انہی کے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا اور انہی کے نغمۂ الفت کی الاپ ہوتی تھی۔ وہ قائل نہ تھے کہ کوئی ایسی بات لکھیں جس کو وہ خود نہ مانتے ہوں۔ نہ جانتے اور محسوس نہ کرتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر وہ ترجمے کرتے تھے تو ایسے افسانوں کے جن سے ان کو مناسبت اور لگاؤ ہوتا تھا۔ یا اگر طبع زاد لکھتے تھے تو ان میں اپنا ہی دُکھ درد لکھ ڈالتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے افسانوں کا اثر یقیناً دل پر ہوتا تھا۔ اور کوئی انسان ان کو پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا +

ان کے محبت آشنا دل نے کیا صورت اختیار کر لی تھی اور محبت نے ان کو کہاں تک اپنا بنا لیا تھا! مجھے معلوم نہ تھا۔ لیکن جب ۱۹۳۰ء کے اپریل کے آخری دنوں میں وطن گیا اور دہلی میں اُن سے ملا تھا انہوں نے مجھے اپنی زندگی کا وہ بڑا راز بتا دیا جو شاید کسی کو معلوم ہو یا چند خاص لوگوں کو اس سے آگاہی ہو +

اُن کے مکان پر۔ جہاں سے جامع مسجد دہلی۔ لال قلعہ اور ایڈورڈ پارک اور ان تینوں کے درمیان کا وسیع میدان صاف نظر آتا تھا ہم دونوں بیٹھے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ ان کی سادگی سے آراستہ میز پر ایک نہایت پیاری پیاری تصویر رکھی تھی۔ جس معصوم کی تصویر۔ سادگی حسن کی نعمتوں تکمیل نسائیت کی تصویر "فرشتگی نسوانیت" کی تصویر۔ اس کے بالوں کی درازی کمر سے نیچے تک تھی۔ اُس کا چہرہ بدر کامل تھا۔ اس کی آنکھیں حسین تھیں۔ مگر ان میں رنگ یاس بھرا تھا۔ تبسم تو نہیں کہہ سکتے مگر کچھ ایسی ہی چیز لبوں پر تھی لیکن حیانیت لئے ہوئے۔ چہرہ پر خودداری کے ساتھ کچھ کچھ از خود رفتگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ یہ تصویر دیکھ کر میں نے پوچھا + حنیف یہ کیا ہے۔ یہ سُنکر حنیف آپ میں نہ تھا یا آپ میں تھا۔ بہر حال بالکل خاموش حسرت و حرمان سکوت و بے زبانی کا پیکر تھا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد حنیف نے ایک مسودہ نکالا اور "الفت رفتہ" کے عنوان سے ایک افسانہ سُنانا شروع کر دیا۔ وہ سُنا رہے تھے اور میں سُن رہا تھا اور ان کے چہرے پر غور کرتا جا رہا تھا۔ اُن کے لفظ لفظ میں جوش تھا اور ان کے لہجہ میں جوش تھا۔ اور چہرے پر ایک خاص رنگ اور خاص کیفیت تھی۔ کہیں کہیں الفاظ و جملات کی تفسیر و تشریح پر بات کہیں سے کہیں چلی جاتی تھی۔ میں جب کچھ پوچھتا تھا تو وہ بتاتے تھے اور وہ پوچھتے تھے تو میں کہتا تھا نہیں معلوم ہم دونوں اس رات کو کے بجے تک جاگتے رہے۔ اس طرح "الفت رفتہ" کی داستان الفت رفتہ کے مصنف ہی کی زبان سے میں نے سُنی تھی +

فسانہ پڑھ چکنے کے بعد بتایا کہ یہ تصویر اُس کی نہیں۔ بلکہ اُس کی شکل سے ملتی جلتی ہے۔ یا اس میں کچھ کچھ مشابہت ہے +

اس واقعہ کے بعد ان سے دو مختصر "سرراہے" ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء کے ابتدا میں وطن جاتے ہوئے اور دوبارہ اسی ماہ میں بمبئی واپس آتے ہوئے۔ دہلی سٹیشن پر جب میں بال بچوں سمیت بمبئی آرہا تھا۔ اور میں نے اپنی آمد کی اطلاع ان کو دیدی تھی۔ اُس وقت وہ ریاست سے علیحدہ ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے +

دہلی آکر اُن کے لباس میں ہلکی سی تبدیلی ہوگئی تھی۔ یعنی ترکی ٹوپی کی بجائے ہیٹ پہننے لگے تھے۔ یہ تبدیلی کسی کی خوشی کے لئے روا رکھی گئی تھی +

خلاصہ یہ ہے کہ مرحوم دین اسلام کی خدمت و تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ مگر نئے طریق سے۔ وہ دنیائے ادب میں شہرت کے طالب تھے۔ مگر نرالے ڈھنگ سے۔ ان کی بلند فطری محبت کے میدان میں بھی ان کو نادرہ روزگار دیکھنا یا دکھانا چاہتی تھی۔ یہی ان کی اُمنگیں تھیں جن کی وجہ سے مجھے مرحوم سے ایک قسم کا عشق سا ہو گیا تھا +

میرا خیال ہے کہ اگر جناب حکیم یوسف حسن صاحب اس قتیل محبت نوجوان مرحوم ادیب کے مضامین کو جمع اور مرتب کر کے شایع کردیں گے تو یہ مجموعہ واقعی اُردو میں اپنے جذبات صحیحہ اور پرجوش انداز بیان کے لحاظ سے خاص چیز ثابت ہوگا۔ اسی ضمن میں اس بات کی تصریح بھی غیر موزوں نہیں معلوم ہوتی کہ مرحوم کا جن جن اخبارات اور رسائل سے تعلق رہا ان میں بعض مضامین اُن کے نام سے ہوتے تھے اور بعض بغیر کسی کے نام کے اور بعض مضامین کے لئے مناسبت مضمون نام بھی تجویز کر لیتے تھے۔ ریاست میں جب کام کر رہے تھے تو ادیب خالد ہاشمی" کے نام سے بھی متعدد مضامین آپ نے لکھے ہیں۔ بہرحال جستجو ضروری ہے جسقدر مضامین مل جائیں اُن کا جمع ہو کر کتابی صُورت میں آجانا یقیناً مفید ہوگا۔

سُنا ہے کہ بعض "اہل زبان" نے مرحوم کی زبان پر اعتراض کیا ہے گو ہم یہ نہیں کہتے کہ مرحوم کی زبان بے عیب تھی۔ مگر اُنکے جذبات سے واقف ہونے کی حیثیت سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر بعض معمولی باتوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے سوائے اس زبان اور طرز بیان کے کسی اور زبان اور کسی اور انداز میں کہا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ بعض ترکیبیں اور تخاطب کے الفاظ انگریزی کا صحیح ترجمہ ہیں۔ انگریزوں کا طرز خطاب ہمارے لئے اجنبی سہی۔ مگر انگریزوں میں عام اور محبوب ہے۔ اور اگر ہم ان کے "باب فردوس" کو پڑھ کر انکی مجبوری کو سمجھ لیں تو پھر ان کی زبان اور اُن کا طرز بیان قابل اعتراض نہیں رہتا +

ماسوا اس کے ابھی اُن کی عمر ہی کیا تھی۔ اگر وہ کچھ اور جیتے رہتے تو یقیناً اُن کی زبان میں اور گھلاوٹ آجاتی۔ لیکن بات تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی دکھائے کہ اس عمر میں ایسا موثر۔ ایسا پرجوش اور جذبات اصلیہ کو نشانہ لکھنے والا اردو کی ادبی دنیا میں کوئی اور موجود ہے؟

جو خطوط مرحوم نے مجھے لکھے اُن کا بیشتر حصّہ میرے پاس محفوظ ہے ان میں بھی وہی جوش و خروش ہے۔ ان خطوں اور اُن کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا اور ان کے خطوط بھی شاہد ہیں کہ علاّمہ سر اقبال مدظلہ اُن پر شفقت فرماتے تھے۔ حضرت اقبال کا شاندار بڑا فوٹو مرحوم کے کمرہ کی رونق تھا۔ اور علاّمہ کی تصانیف جو خود موصوف نے حنیف کو تبرکاً اپنے دستخطوں کے ساتھ عنایت فرمائی تھیں۔ گواہ ہیں کہ واقعی اقبال حنیف مرحوم سے محبّت و شفقت بزرگانہ فرماتے تھے +

اب حنیف ہم سے جسمانی طور پر جدا ہوگیا۔ وہ ہماری مادّی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ دیر یا سویر ہم اُس سے ملنے والے ہیں۔ مرحوم کی فطرت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس کی موت بھی اس فطرت بلند کی دعوت کا ایجاب تھا کہ ایسی بلند فطرت کے لوگ اس دنیائے آب و گل میں زیادہ عرصہ نہیں رہا کرتے۔ بلکہ وہ اپنے اصلی مرکز کے نقطۂ بلند پر پرواز کر گیا +

اچھا حنیف تم بُری جگہ سے اچھی جگہ پہنچ گئے۔ اپنے دوستوں کے استقبال کو تیار رہو۔ خدائے مہربان تم کو اپنے قرب خاص میں استراحت و آرام بخشے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون +

مہر محمد خاں شہاب

"غنچۂ تبسّم" کے تبصروں پر ایک اور نظر

تصویر کا دوسرا رُخ

از ——— نقّادانِ ادب ——— لاہور

نیرنگِ خیال کے گذشتہ نمبر میں نیاز مندانِ لاہور کا ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں غنچۂ تبسّم تمکین کاظمی کے تبصروں پر تنقید کی گئی ہے۔ اور باوجودیکہ ایڈیٹر صاحب نے اپنے نوٹ میں چار چھوڑ پانچ باکمال ادیبوں کا نام لے کر جوابی مضمون لکھنے والے کو ڈرایا ہے۔ ہم تبصرہ نگاروں کی حمایت میں قلم اُٹھاتے ہیں۔ ہم نیاز مندانِ لاہور کی ظرافت نگاری و نکتہ رسی کی داد دیتے ہوئے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ تبصرہ نگار آخر مولوی تمکین کے دوست ہیں اور حق دوستی ادا کرنا کوئی ایسا سنگین جرم نہیں کہ نیاز مند یوں لٹھ لے کے پیچھے پڑ جائیں۔ ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ چند ایک باتیں لے کر اس طرح بال کی کھال اُتارنا کہ تبصرہ نویس نرے جاہل نظر آئیں۔ کہاں کا انصاف ہے +

عیب اُو جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ شیخ سعدی کا قول نہ سہی۔ صداقت سے خالی نہیں۔ سرسری نظر ڈالنے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تبصرہ نگاروں نے غیر شعوری طور پر سہی۔ سچے کی بات بھی کہہ دی ہے۔ چنانچہ مولانا نیاز اپنے دیباچے (اعلام) میں مولوی تمکین کے مجموعۂ مضامین کے متعلق لکھتے ہیں: ——— "چونکہ وہ یکسر مقامی حالات' مقامی تشخصات یا حیدرآباد کی اصطلاح میں "ملکی" افراد و مناظر سے متعلق ہیں اس لئے اُن کا پورا لطف اُٹھانا کسی غیر حیدرآبادی شخص کے لئے دشوار ہے" ——— اور جب مقامی "تشخصات" بھی مصنف کی اپنی "انجمنِ ستائش باہمی" کے ارکان ہوں تو مولانا نیاز کے قایم کردہ معیارِ لطف اندوزی کے مطابق غیر حیدرآبادی تو خیر۔ خود حیدرآباد کے معدودے چند غیر معروف اشخاص کے علاوہ کسی کا اس مجموعۂ نگارشاتِ فکاہی سے لطف اُٹھانا ناممکن ہے۔ اندریں حالات بہتر ہوتا جو یہ کتاب کسی دستی چھاپہ خانہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی اور رسلنے کے پتے دس نہ ہوتے۔ فقط ایک مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد ہوتا +

مولانا نیاز نے حضرت تمکین کے پایۂ ظرافت ہی کی حقیقت واضح نہیں کی بلکہ ان کے زباں داں اور اہلِ زبان ہونے کی قلعی بھی کھول دی ہے۔ صاف صاف لکھ دیا ہے کہ زبان کہیں کہیں نہیں اکثر جگہ غلط ہے۔ یہاں تک کہ بقولِ مولانا نیاز مولوی تمکین کی اُردو پڑھ کر "سماعت مشوش ہو جاتی ہے"۔ جب تمام مذاق مقامی ہوں اور عبارت تشویز انگیز۔ کتاب کا فکاہی تاثر ظاہر ہے۔ جیسے کوئی مردم خوار حبشی اپنی زبان میں کسی پادری کے گوشت کی ضیافت کا بیان چٹخارے لے لے کر کر رہا ہو۔ مردم خور حبشی تو شاید لذت اندوز ہوں۔ ہم غیر ملکی اس "تنقیدِ فکاہی" سے کیسے لطف اُٹھا سکتے ہیں +

مولوی تمکین نے اس زبان کے عیب کو خوبی بنانے کی کوشش ضرور کی ہے اور لکھ دیا ہے کہ اہلِ زبان اور زباندان ہونیکے باوجود عمداً "دکھنی محاورے استعمال کئے ہیں۔ مگر ہمیں تو اُن کا محققِ "دکھنیات" ہونا بھی مشکوک نظر آتا ہے۔ مولوی صاحب اپنے دیباچے (سرِآغاز) میں ایک دکھنی شعر نقل کرتے ہیں۔ ؎

ترا مُلک دکھن تو دکھنیچ بول ٹو
تجھے کیا پرائی تو اپنیچ بول ٹو

اور دکھنیچ اور اپنیچ کے معنی "دکھنی ہی" اور "اپنی ہی" دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ چ

بیچ کی مخفف صورت ہے اور پنجاب میں ابتک مستعمل ہے۔ پٹیالے میں پنجابی وِچ بچ بن جاتی ہے اور آگے چل کر بیچ۔ کیا فرماتے ہیں مولانا عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی "بیچ" اس مسئلے کے کہ اردو پنجاب سے دکن میں گئی ہے۔ یا دکن سے پنجاب میں آئی ہے +

مولوی تمکین صاحب کو "دکھنیات" کا ماہر مان لیا جائے تو بھی اُن کا زبان کا دعویٰ پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچتا۔ "گہرا مطالعہ" ہو اور وہ بھی "مادری زبان" کا اور لکھیں تو یوں:۔ ——— "ہم جیسے بوڑھوں سے کون لکھوائیگا۔ ہمارا پیٹ کیا چلیگا"۔ ... صہ ۵ + مضامین میں جس کثرت سے ناشتے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُس سے تو پیٹ چلنا کچھ مشکل نظر نہیں آتا لیکن مولوی تمکین غالباً پیٹ چلنے کے معنی قوتِ مالایموت میسر ہونا سمجھے ہیں۔ حالانکہ محاورے میں اس کے معنی دست آنا ہیں۔ دکنی محاورہ کچھ ہو ایسا مذموم طرزِ تحریر کسی زبان داں سے ممکن نہیں۔ اسی طرح صہ ۶۵ پر کسی بزرگ کے متعلق پیشہ کرنا لکھا ہے۔ تذکیر و تانیث تو بالکل فوجی گوروں کی سی ہے۔ صہ ۴۷ پر لکھا ہے:۔ "آواز دے دیا"۔ صہ ۱۶۲:۔ "ہزار احتیاط کیا"۔ صہ ۱۳۴:۔ "جھوٹ بعض وقت انسان کو بچا لیتی ہے"۔ صہ ۱۲۸:۔ "چکر کرنی پڑتی"۔ صہ ۱۴۲:۔ "بڑے بڑے خوراک"۔ صہ ۱۷۴:۔ "دال کی ماہوار منصب"۔ صہ ۱۷۵:۔ "پیٹ اکڑ گئی ہے"+ غرض یوں ہی اردو کو "دکھن" فرماتے چلے گئے ہیں۔ غلط نامے کے ہوتے ہوئے ان اغلاط کو (اور کتاب اس قسم کی لاتعداد اغلاط سے بھری ہوئی ہے) کاتب کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ ایک تبصرہ میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ اگر کوئی اغلاط ہیں تو وہ تمکین صاحب کی بشریت کا نتیجہ ہیں+

اپنا یہ حال ہے اور جا بجا پنجابیوں کی اُردو دانی پر آوازے کسے گئے ہیں۔ کوئی پوچھے۔ بھائی! اگر تم اپنی بے بصری کو "دکھنیات" کے پردے میں چھپاتے ہو (کیونکہ ہم یہ نہیں مان سکتے کہ حیدرآباد میں جو اردو کا مرکز ہو وہاں کے تعلیم یافتہ لوگ تمکین صاحب کی سی اردو بولتے ہیں) تو پنجابی اپنے خاص محاورے کیوں نہ استعمال کریں۔ جب تم خالص پنجابی محاورہ "مونہہ ہی" [صہ ۹۰:۔ "نہ تو کسی چونڈے والی سے دل لگائیں گے اور نہ ہی شادی کریں گے"] یوں بے خوف برتتے ہو تو کسی پنجابی نے "تے" غلط لکھ دیا تو کیا ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تم اس "نہ ہی" کے بعد عمر بھر اردو کو مادری زبان نہ کہہ سکوگے۔ بالخصوص جب صہ ۱۱۱ پر ایک اور ایسی ہی "غیر مادری" غلطی کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔ "عید کی نماز کو پڑھنے چلے"۔ جب مفعول غیر ذوی العقول ہو۔ تو ذوی العقول کے نزدیک "کو" کا استعمال فصیح نہیں غلط ہے +

مولوی صاحب نے نئے نئے الفاظ بھی ایجاد فرمائے ہیں مثلاً صہ ۹ پر "پراٹھا" کھانے کا ذکر ہے۔ غالباً پراٹھا مطلب ہے۔ صہ ۸ پر "پوچھ گوچھ" لکھا ہے۔ نہ جانے یہ کیا چیز ہے۔ صہ ۹۸ پر "توال شاندہ" اور پھر "دُراغہ" دونوں بوجھی پہیلیاں ہیں۔ صہ ۱۵۰ پر لکھتے ہیں: "ادھر آپ نے قدم رکھا اُدھر کیلا اچھا" خدا جانے یہ پھینے والا کیلا کیا بلا ہے؟۔ صہ ۱۶۱ پر چائے کی دکان کو "رستوران" لکھا ہے۔ اور چارلی چیپلن کے کسی تماشے کو "گولڈن رش"+ مگر یہ دونوں غلطیاں غالباً انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے سرزد ہوئی ہیں +

زیادہ قابلِ اعتراض وہ غلطیاں ہیں جن کا محاورے سے کوئی خاص تعلق نہیں محض اُردو قواعد کے خلاف ہیں۔ مثلاً صہ ۱۵۹ پر سلسلہ کا "گالی گلوچ" لکھ دیا ہے اور دو ایک جگہ "بمعہ" لکھا ہے۔ اور اس کے ساتھ "سمیت" بھی۔ "بمعہ احباب سمیت"۔ ایسی غلطیاں پنجاب کے ہندو اخبارات میں تو کیا میونسپلٹی کے اشتہارات میں بھی شاید ہی نظر آتی ہوں۔ موخر الذکر غلطی اگر عمداً ازراہِ ظرافت کی گئی ہے تو واوین کی علامت ڈال دی ہوتی۔ مگر گالی گلوچ کو سلسلے سے بذریعۂ ہمزۂ اضافت منسلک کرنا نہ ظرافت ہے نہ (بلکہ "نہ ہی") نادانی۔ ہم نے مولوی تمکین کے لئے گنجائش پیدا کر دی ہے کہ وہ ہر غلطی کو "ظرافتی" اور "عمدی" کہہ دیں +

محاورات کا استعمال تو "اکثر" غلط ہے۔ "مائیں جاگ پڑیں"۔ "پیٹ بھر کھانا کھایا"۔ "شاہ صاحب تشریف فرماتے تھے"۔ "طبیعت نکل گئی" اُردو دانی کے عام نمونے ہیں۔ صہ ۹۴ پر تو بقول کسے "حد ہو گئی ہے"۔ لکھتے ہیں: "اوروں کے عیب گنتے پھریں گے۔ مگر اپنے گریبان میں سر ڈال کے نہیں دیکھیں گے"۔ مولوی صاحب کا مطلب غالباً اپنے میں منہ ڈالنا تھا۔ لیکن لکھ گئے "سر ڈالنا" اور یہ نہ سمجھے کہ گریبان میں سر ڈالنا محاورہ ہے۔ منفکر ہونے سے یہ دو الگ الگ محاورے الگ الگ محلِ استعمال رکھتے ہیں۔ اور بیشتر فصحائے حال ان میں فرق کرتے ہیں۔ قدما میں یہ امتیاز نہ تھا +

اس قسم کی سینکڑوں غلطیاں ہیں مگر ہم انہیں اہمیت دینا نہیں چاہتے ہماری غرض تو محض حضرتِ نیازکی تنقید کی تصدیق تھی۔ یہ بتانا تھا کہ تبصرہ

نگاروں نے دیانت اور دانائی سے بھی کام لیا ہے +

مولانا نیاز کی دیانت اور دانائی تو خیر زیادہ قابل تعجب نہ تھی۔ جناب سعیدی بھی اپنے دیباچے (تقریب) میں ایک بامعنی بات کہہ گئے ہیں۔ غضبناک ہوکر فرماتے ہیں: ۔"آجکل ہیومرسٹ [خود ہی اس کا ترجمہ خوش مذاق کرتے ہیں۔ لیکن سعیدی صاحب کا ترجمے والا پہلو زیادہ اکثر واقع ہوا ہے۔ جیسا کہ تاثیر صاحب کی "ارنسٹ" والی تنقید سے ظاہر ہے] میں وہ صفات ڈھونڈھے جاتے ہیں جو ایک نقال یا مسخرے یا بھانڈ میں ہونے چاہئیں"۔۔۔ زیادہ غضبناک ہوکر فرماتے ہیں: ۔۔۔

"غضب تو دیکھئے کہ آج ہر وہ شخص ظرافت نگار بنا بیٹھا ہے۔ جو حد درجہ گرے ہوئے اور رکیک مذاق سے صرف لوگوں کو ہنسا دے"۔۔۔

نیازمندانِ لاہور غور فرمائیں۔ انصاف سے خدا لگتی کہیں۔ اس میں کیا غلطی ہے۔ کیا یہ صحیح معیار نہیں کہ مسخرہ پن اور گری ہوئی باتیں بد مذاقی کی نشانیاں ہیں۔ ظرافت نگاری ان سے کوسوں دور ہے۔ یعنی جو شخص فحش باتیں لکھتا ہے یا بھانڈوں کی طرح اپنی ذلت و رسوائی کی طرف توجہ دلا کر لوگوں کو ہنساتا ہے وہ "ہیومرسٹ" نہیں بلکہ خوش مذاق بھی نہیں۔ مثلاً پاد۔ پاخانہ، قے۔ شراب خوری، رنڈی بازی۔ زنا، شہوت۔ طلاق، چھینا یا جانا، زن مرید ہونا جیسے موضوع اعلیٰ ظرافت سے بعید ہیں۔ ان پر ہنسی تو شاید آسکتی ہے۔ مگر اپنے چھینائے جانے اور زن مرید ہونے کا ذکر بھانڈ پن ہے اور دیگر مذکورات رکیک اور بیحد گرے ہوئے مذاق کی نشانیاں ہیں +

سعیدی صاحب نے معیار قائم کر دیا ہے۔ اب یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے عزیز شریک تصنیف دوست کی تحریر کو اسی معیار کے مطابق جانچ کر دکھائیں۔ یہ ہمارا آپ کا کام ہے۔ چنانچہ ہم یہ فرض ادا کئے دیتے ہیں اور آپ سے مولوی تمکین صاحب کی خوش مذاقی کی نہ سہی سعیدی صاحب کی خوش مذاقی کی داد طلب کرتے ہیں۔ تمکین صاحب کے بیشتر مضمون [عطر دان۔ زن مرید۔ بدحواسی۔ چارلی چپلین۔ بوکھلاہٹ یعنی کیسے لکھتے ہیں۔ ہم اور ہماری عید وغیرہ وغیرہ] زن مرید اور خانہ داماد ہونے کی حیثیت سے لکھے گئے ہیں۔ جن میں بیوی بہ "اتالیق بیوی" [جو مسز کوڈل کا ہندوستانی ترجمہ ہے] کی بھونڈی سی نقل ہے۔ اور ہم یعنی مضمون نگار اس کی تقریر بازی اور بدمزاجی کا تختۂ مشق۔ خیر بیوی سے ڈرنا اور اسکا اظہار کرنا تو شاید معیوب حرکت نہ ہو مگر یہ عادت اسقدر فطرت ثانی ہو چکی ہے کہ ہم اور ہماری عید میں ایک رنڈی سے صلواتیں سننے اور گالوں پر طمانچہ کھانے کا بھی ذکر ہے۔ اور اس شیر افگنی پر فرماتے ہیں ع ہمیں جورو کو اپنے دام میں لانا نہیں آتا۔ یہ تو محض مسخرہ پن تھا۔ مگر "خانصاحب" میں تو مولوی تمکین نے تہذیب کا جامہ اُتار کر پھینک دیا ہے۔ صفحہ ۱۹۲ پر کوئی چار دفعہ پاد کا روح پرور ذکر ہے۔ باقی مضمون میں خانصاحب کی قوت مردمی کم ہونے کا تذکرہ ہے۔ طلاؤں کے نسخے اور اُن کی مفصل فہرست دی گئی ہے۔ شب زفاف اور غسل جنابت پر شعر لکھے ہیں۔ خانصاحب کی بیوی کی شہوت کا بیان ہے اور اُس پر خوب خوب دادِ سخن دی گئی ہے۔ واقعی بقولِ سعیدی۔۔۔ "آج ہر وہ شخص ظرافت نگار بنا بیٹھا ہے جو حد درجہ گرے ہوئے اور رکیک مذاق سے لوگوں کو ہنسا دے"۔ یا ہنسانے کی کوشش کرے +

اسی طرح ملا رموزی نے بھی کھری بات کہہ دی ہے۔ لکھتے ہیں: ۔۔۔ "ہم مولوی کاظمی کے قائل ہوئے تو اس لئے [یعنی اور کوئی وجہ نہیں] کہ جب دیکھا یہی کہ بس لکھ رہے ہیں"۔ یعنی اُن کی "کثرتِ نگارش" ہی وجہ پسندیدگی ہے +

احسن مارہروی نے دعا دی ہے: ۔"ان کی نثر کو بھی لسان العصر اکبر مرحوم کی نظم کے برابر مقبولیت نصیب ہو"۔ نیازمندانِ لاہور بتائیں کہ اس دعا میں ایسی کونسی نامعقولیت ہے۔ شعرا تو اس سے بڑھ چڑھ کر کہہ گئے ہیں۔ غالب نے یہاں تک کہدیا ع تا خدا باشد بہادر شاہ باش۔ مگر سعیدی صاحب نے کمال دیدہ دلیری سے اس میں تحریف کر دی ہے احسن صاحب کی دعا صفحہ ۱۴۱ پر درج ہے اور سعیدی صاحب صفحہ ۱۵ پر واوین کی علامت ہٹا کر حضرت احسن کی دعا کو قول قرار دے کر یوں نقل کرتے ہیں: ۔ ۔۔۔"تمکین کی نثر اکبر الہ آبادی کی نظم کی طرح بقائے دوام حاصل کرلے گی"۔ کہاں دُعا اور کہاں اِدّعا "نصیب ہو" اور "کرے گی"!! ۔۔۔ یا شاید یہ کوئی زبانی قول ہے۔ جسے یُوں دُہرایا گیا ہے!! ۔۔۔ واللّٰہ اعلم بالصواب +

لیکن نیازمندانِ لاہور نے جو سب سے بڑی بے انصافی کی ہے وہ حضرتِ تمکین کاظمی سے کی ہے کہ اُن کے دیباچے (اعلام) کو امانیت کا مظہر قرار دیا ہے۔ بجا! انہوں نے بوکھلاہٹ والے مضمون میں جس عاجزی اور بے بسی سے حضرتِ تاثیر کی "ارنسٹ" والی تنقید بلکہ تنقیص کی تائید کی ہے اور جس فراخدلی سے اپنی ہر غلطی کا اعتراف کیا ہے۔ اس صدی میں

تو کیا متقدمین میں بھی اس کی مثال ملنی محال ہے ۔ تمکین صاحب تو اسقدر منکسر المزاج ہیں کہ سعیدی صاحب نے جو کسی کی "یورپ زدہ ڈاکٹریت" پر اپنے دیباچے (تقریب) میں چوٹ کی ہے ۔ اس پر نوٹ لکھ کر اظہار افسوس کر دیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اسی دیباچے میں شوکت تھانوی "ناکارہ حیدرآبادی" "سیاہ ملبوترے" "محشر عابدی" "کوئی" "پطرس" اور رئیس التحریر عالمگیر پر در پردہ یا کھلم کھلا چوٹیں کی گئی ہیں ۔ اور سب بے دلیل ۔ لیکن ان گناہوں سے ان کی دوسری نیکیاں مٹ نہیں سکتیں ۔

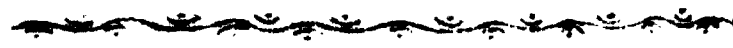
القصہ دیباچہ نگاروں نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے خنگوئی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ نیازمندانِ لاہور کو چاہیئے تھا کہ وہ مولوی تمکین کے مضامین پر تنقید کرتے ۔ تبصرہ نگاروں کی خوش اخلاقی کو مورد الزام نہ بناتے ۔

آخر میں ہم نیازمندانِ لاہور (ایک یا چار یا پانچ) کی خدمت میں ملتمس ہیں کہ وہ گمنامی کا پردہ اٹھاویں اور بے محابا میدان میں اتریں ۔

ع لطفِ تنقید تو جب ہے کہ کہو اور سنو ۔

نقادانِ ادب

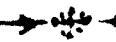
کا معیار عام مذاق سے یقیناً بلند رہتا ہے ۔ جنوری ۱۹۳۲ء سے نیرنگ خیال میں تصاویر کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ہم تصاویر کے دو ورق دیتے ہیں آیندہ سے تین ورق ہوا کریں گے۔ ان میں سے ایک ورق پر ایک سہ رنگ آرٹ کی تصویر ہوا کرے گی۔ باقی چار صفحوں پر (۱) عہد حاضرہ کے اُن نامور اصحاب کی تصاویر ہوا کریں گی جو پبلک توجہ کا مرکز بن رہے ہوں۔ اس سلسلہ میں چار یا پانچ تصویریں ہر نمبر میں ہونگی۔ (۲) مناظر قدرت اور مشہور تاریخی عمارتوں کی تصاویر (۳) نسائیات جن میں نامور عورتوں کے متعلق تصاویر ہونگی۔ (۴) متفرقات اس میں کارٹون - آرٹ - فلم تھیٹر وغیرہ وغیرہ ہر نوع شامل ہے۔ چونکہ جنوری میں تصاویر میں بہت اضافہ ہوگا - اس لئے ہم نے جاپان - امریکہ - فرانس اور برلن سے بیش قیمت تصویریں منگوائی ہیں۔ جن سے نیرنگ خیال کی خوبیوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ مگر چندہ وہی تین روپے چھ آنہ مع محصولڈاک ہوں گے ۔ اس سلسلہ میں اگر ہمارے ناظرین ہمیں کسی قسم کا مشورہ دینگے تو شکریہ کیساتھ قبول کیا جائیگا



سالنامہ نیرنگ خیال

ان دنوں ہم بے حد مصروف ہیں۔ "ادبائے قدیم کے طرز نگارش" کا اعلان کرنا تو بے حد آسان تھا لیکن اس کے لئے مواد فراہم کرنا بہت مشکل تھا۔ اس پر نیرنگ خیال کے افسانہ نمبر - نیرنگ خیال کا سالنامہ اور تازیانہ ریویو کے اسلامی دنیا نمبر کا اہتمام ہماری تمام توجہ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ سالنامہ نیرنگ خیال انشاءاللہ حسب دستور دسمبر کے پہلے ہفتہ میں دی۔ پی ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہ وی۔ پی صرف اُن کرمفرماؤں کی خدمت میں بھیجا جائے گا جنہوں نے گذشتہ سال وی پی وصول فرمائے تھے۔ جن اصحاب نے گذشتہ سال سالنامہ کا وی پی وصول نہیں کیا تھا اور وہ امسال سالنامہ خریدنا چاہتے ہوں۔ تو انہیں اپنا نام فی الفور درج رجسٹر کرالینا چاہئے تاکہ سالنامہ شایع ہوتے ہی ہم اُن کی خدمت میں بھیج دیں۔ نئے خریداروں کو بھی اس جانب پوری پوری توجہ دینی چاہئے ۔

نیرنگ خیال کے سالنامہ کا حجم دو سَو صفحہ سے زاید ہوگا - اُس میں رنگین اور یکرنگ تصاویر اس تعداد میں ہونگی کہ صرف اتنی تصویریں ہی ڈیڑھ روپیہ میں نہیں مل سکتیں۔ مضامین کے لحاظ سے بھی کوئی سالنامہ یا خاص نمبر اس کا مقابلہ نہ کرسکیگا۔ ٹائٹل نہایت نظر فریب اور دبیز ہوگا - تاکہ وہ جلد خراب نہ ہو جائے الغرض رسالہ کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ ہمارے خیال میں سالنامہ نیرنگ خیال دس پندرہ روپیہ کی کتابوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ اب صرف ڈیڑھ دو ماہ باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے اہل قلم حضرات اپنے مضامین جلد ارسال فرمائیں ۔



اردو ٹائپ

ہم مدت سے سن رہے ہیں کہ ریاست حیدرآباد نے اُردو ٹائپ کی ترتیب و اصلاح کے لئے خاص شعبہ قایم کر رکھا ہے - جس میں کئی ماہرین فن کام کر رہے ہیں۔ اگر ہماری اطلاعات درست ہیں تو ابھی تک یہ مجلس اردو ٹائپ کو تیار کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ جو نمونے حیدرآبادی ماہرین نے تیار کئے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نستعلیق اردو ٹائپ ایجاد کر لینا اُن کے لئے ناممکن سی بات ہے۔ لاہور میں حضرت نازش رضوی نستعلیق اردو ٹائپ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اُن کا تیار کردہ نمونہ مسٹر عبدالقادر، حضرت سالک، مولانا مہر اور لاہور کے دیگر سر برآوردہ اصحاب ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ حضرت نازش رضوی کا ٹائپ نہ صرف نستعلیق سے ملتا جلتا ہے بلکہ وہ اسقدر آسان ہے کہ اُن کے بیان کے مطابق اُس کے حروف کی تعداد بھی کم ہے - اور اُن کے جوڑ بھی کم ہیں - پھر کوئی وجہ نہیں کہ حیدرآباد کی وہ مجلس جو اردو ٹائپ ایجاد کرنے کی فکر میں ہے حضرت نازش رضوی کی خدمات سے فائدہ نہ اُٹھائے ۔

ایڈیٹر



تصحیح

ستمبر کے نیرنگ خیال میں حضرت یگانہ کی ایک رباعی یوں شایع ہوگئی ہے ؎

منزل کا پتہ ہے نہ ٹھکانا معلوم ۔۔۔ جب تک نہ ہو گم۔ راہ پہ آنا معلوم
کھو لیتا ہے انسان تو کچھ پالیتا ہے ۔۔۔ کھو یا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم

اسے یوں پڑھئے ؎

کھو لیتا ہے انسان تو کچھ پاتا ہے ۔۔۔ کھویا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم

اس کے علاوہ حضرت منظر صدیقی کی نظم برشگال جو صفحہ ۱۰ پر شایع ہوئی ہے۔ اُس میں متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں۔ پہلے ہی شعر میں دو جگہ نکتہ رہ گیا ہے تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں شمع بہار کے بعد "کا" رہ گیا ہے۔ آخری شعر میں ہندوستان میں نون غنہ ہونا چاہئے تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ مطبع نے یہ غلطیاں درست کئے بغیر پرچہ چھاپ دیا ✦

نیرنگ خیال اور محکمہ تعلیم

رسالہ نیرنگ خیال قریباً ہندوستان بھر کے محکمہ ہائے تعلیم میں خریدا جاتا ہے۔ سب سے اوّل کئی سال گذرے ریاست حیدر آباد کے محکمۂ تعلیم نے ایک سرکلر کے ذریعہ سے تمام مدارس کو اجازت دی تھی کہ وہ رسالہ نیرنگ خیال کو خریدا کریں، اور اس سرکلر میں نیرنگ خیال کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ بلوچستان کے محکمہ تعلیم نے بھی نیرنگ خیال کی کاپیاں خریدیں۔ پنجاب کے متعدد انسپکٹر صاحبان نے اپنے اپنے اضلاع کے مدارس اور لائبریریوں کے لئے نیرنگ خیال خریدنا منظور فرمایا ہے۔ حال ہی میں صوبہ بمبئی کے ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اُنہوں نے صوبہ بمبئی کے تمام مدارس اور لائبریریوں کے لئے جن اُردو رسایل کو منظور فرمایا ہے اُن میں نیرنگِ خیال کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ لطف یہ ہے کہ آج تک ہم نے کسی صوبہ کے محکمۂ تعلیم سے درخواست نہیں کی۔ اور جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے صرف نیرنگ خیال کے بلند معیار کے طفیل ہے ✦

ایک مبارک کام

پیکو آرٹ پریس لاہور جو آج تک بلاک سازی اور بلاک چھاپنے کے لئے لاہور میں سب سے بہتر سمجھے جاتے تھے اب اُنہوں نے مطبوعات کا کام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور سب سے اوّل اُنہوں نے یازدہ سورہ شریف (مثل پنجسورہ شریف) شایع کی ہے۔ یہ یازدہ سورہ شریف تمام کی تمام بلاک کے ذریعہ بلاک کے ذریعہ سے چھاپی گئی ہے کاغذ مضبوط اور دبیز ہے۔ خط نہایت پاکیزہ اور ہر صفحہ مطلاّ و مجلاّ یازدہ سورہ شریف قریباً پانچ رنگوں میں طبع ہوئی ہے۔ جلد اتنی مضبوط اور خوبصورت کہ ولایتی جلدوں سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ ہدیہ اس کا صرف ایک روپیہ ہے جو اس کی خوبیوں کے مقابلہ میں بالکل کم ہے۔ ہمارے خیال میں یہ یازدہ سورۂ شریف ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اسلامی مدارس اور مسلم یونیورسٹی کے ارکان کو یہ یازدہ سورہ شریف مسلمان بچوں کو بطور انعامی کتب کے بھی دینا چاہئے ✦

پیکو آرٹ پریس والے قرآن شریف کی تیاری میں بھی مصروف ہیں جس کے متعلق آیندہ لکھا جائے گا۔ پارہ اوّل تیار ہے جس کا ہدیہ ۸ر ہے - پتہ یہ ہے:- مینجر پیکو آرٹ پریس۔ بیرون موچی دروازہ لاہور ✦

بغداد پراویڈنٹ انشورنش کمپنی لمیٹڈ لدھیانہ

ہندوستان میں واحد اسلامی کمپنی ہے جو رلیف فنڈ کا کام سر انجام دے رہی ہے۔ گو اس کمپنی کو قایم ہوئے تھوڑا عرصہ ہی گذرا ہے۔ لیکن اُس کے ممبروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اب ہندو بھی اس کمپنی کے ممبر ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی تخصیص لمیٹڈ کمپنیوں کے لئے مفید نہیں ہوا کرتی۔ حال ہی میں اس کمپنی کا ایک ممبر کشمیر میں فوت ہوگیا۔ جس نے ابھی تک کمپنی کو صرف ساڑھے پانچ روپے ادا کئے تھے۔ کمپنی نے اطلاع پاتے ہی ایک سو روپے بذریعہ تار وارثوں کو بھیج دئے۔ اور بقایا رقم جو قریباً ایکسو کے اور ہوگی اُس کے وارثوں کو عنقریب بھیجی جائے گی۔ اس طرح سے وارثوں کو دوسو روپے مل جائیں گے۔ جوں جوں کمپنی کے ممبر بڑھتے جائیں گے۔ رقم جو وارثوں کو ملا کرے گی اُس میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ناظرین نیرنگ خیال پراسپکٹس طلب کرکے اس مفید کام میں شامل ہوں۔ یہ بھی ایک قسم کی امدادی برادری ہے جس کا ممبر ہونا نفع سے خالی نہیں ✦

اسسٹنٹ ایڈیٹر

ادبِ قدیم کے نادر نمونے

باغ و بہار:۔

"سُن اے عزیز! میں بادشاہ زادہ جگر سوز اس اقلیم نوروز کا ہوں۔ بادشاہ یعنی قبلہ گاہ نے میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رمال اور نجومی جمع کئے اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو اور جانچو اور جنم پتری درست کرو اور جو کچھ ہونا ہے حقیقت پل پل گھڑی گھڑی اور پہر پہر اور دن دن مہینے مہینے اور برس برس کی مفصل حضور میں عرض کرو۔ بموجب حکم بادشاہ کے سب نے متفق ہو اپنے اپنے علم کے رو سے ٹھہرایا اور دریافت کر التماس کیا کہ خدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور شبھ لگن میں شہزادے کا تولد اور جنم ہوا ہے کہ چاہئے کہ سکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیرواں سا عادل ہو۔ اور جتنے علم و ہنر ہیں ان میں کامل ہو اور جس کام کی طرف دل اس کا مایل ہو۔ وہ بخوبی حاصل ہو۔ سخاوت و شجاعت میں ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رستم کو لوگ بھول جائیں۔ لیکن چودہ برس تک سورج اور چاند دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ وسواس ہے کہ جنونی اور سودائی ہو کے بہت آدمیوں کا خون کرے۔ اور بستی سے گھبرا دے جنگل میں نکل جاوے۔ اور چرند پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔ اس کا خیال رہے کہ رات دن آفتاب ماہتاب کو نہ دیکھے بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پائے۔ جو اتنی مدت خیر و عافیت سے کٹے۔ تو پھر ساری عمر سکھ چین سے سلطنت کرے۔

یہ سُنکر بادشاہ نے اسی لئے اس باغ کی بنا ڈالی اور مکان متعدد ہر ایک نقشے کے بنوائے۔ میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حکم کیا۔ اور اوپر ایک برج نمدے کا تیار کروایا تو دھوپ اور چاندنی اس میں سے نہ چھنے۔ میں دائی دودھ پلائی اور انگا چھوچھو اور کئی خواصوں کے ساتھ اسی محافظت سے اس مکان عالی شان میں پرورش پانے لگا۔ اور ایک اُستاد دانا کار آزمودہ واسطے میری تربیت کے متعین کیا۔ تو تعلیم ہر فن اور ہنر کی اور مشق ہفت قلم لکھنے کی کرے۔ اور جہاں پناہ ہمیشہ خبر گیراں رہتے۔ دم بدم کی کیفیت روز مرہ حضور میں عرض ہوتی۔ میں اس مکان کو عالم روئے جہان کو سمجھتا اور رنگ برنگ کے پھولوں سے کھیلا کرتا اور تمام جہان کی نعمتیں کھانے کے واسطے موجود رہتیں۔ جو چاہتا سو کھاتا۔ دس برس کی عمر تک جتنی صفتیں اور تعلیمیں تھیں تحصیل کیں" (باغ و بہار صفحہ ۱۰۲)

میر امّن دہلوی

حاتم طائی:۔

"حسن بانو نے کہا کہ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے دروازہ پر لکھ کر لگا دیا ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ یہ کیا بھید ہے۔ اور اُس نے کیا نیکی کی ہے اس کی خبر لا۔ اس سخن کے سنتے ہی حاتم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور حسن بانو سے پوچھنے لگا کہ وہ شخص کون ہے اور کس طرف کو رہتا ہے۔ حسن بانو نے کہا میں نے اپنی دائی سے سُنا ہے کہ اس کی جگہ اُتر کی طرف ہے۔ بس اتنی بات دریافت کر کے وہاں سے توکل بخدا چل نکلا۔ بعد ایک مدت کے کسی جنگل ہیبت ناک میں جا پہنچا اور شام کے وقت ایک درخت کے نیچے چپکا ہو کے بیٹھ رہا کہ اتنے میں ایک آواز سوزناک درد آلودہ ساتھ آہ و زاری کے کسی طرف سے اس کے کان میں ایسی پڑی کہ جس کے سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کلیجا چلنے لگا۔ بے اختیار اپنے جی میں کہہ اُٹھا کہ اے حاتم یہ بات جوانمردی سے دور ہے کہ ایک شخص بندۂ خدا کسی آفت میں گرفتار ہو کر رووے تو اُس کی آہ و زاری نہ سُنے اور مدد نہ کرے۔ اور اُس کا احوال نہ پوچھے۔ اس کلام کو دل میں ٹھہرا کر اُس طرف کا راستہ پکڑا۔ تھوڑی دور گیا ہوگا کہ اس جگہ جا پہنچا جہاں سے رونے کی آواز آتی تھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک جوان خوبصورت سطح خاک پر بیٹھا گوہر اشک چشمۂ چشم سے اپنے گل رخسار نازنین پر بہا رہا ہے۔ اور آہیں پُر سوز بھر بھر کر یہ قطعہ پڑھتا ہے۔

قطعہ

جاؤں میں کہاں اور کہوں کس سے عزیز	ٹک سوچو تمہیں میرے دلِ زار کا احوال
جو مجھ پہ گزرتی ہے رقم کر نہیں سکتا	اور کہہ بھی نہیں سکتا زباں ہیگی مری لال

حاتم نے کہا اے جوان دردمند ایسی کیا تجھ پہ مشکل پڑی ہے جو اتنا حیران و پریشان ہے۔ اُس نے کہا اے مسافر میں سوداگر ہوں اور یہاں سے بارہ کوس پر ایک شہر ہے

وہاں حارث نام ایک سوداگر نہایت عمدہ و مالدار رہتا ہے۔ اور ایک لڑکی بھی پری پیکر رشکِ قمر رکھتا ہے۔ اتفاقاً ایک دن میں کسی طرف سے پھرتا پھرتا کچھ مال سوداگری کا لے کر اُس شہر میں جا نکلا۔ حارث کی حویلی کے نیچے مارے دھوپ کے بیٹھ گیا۔ یکایک میری نظر کوٹھے کی طرف جو گئی تو ایک عورت نازنین مہ جبین نظر آئی۔ حالت میری تباہ ہو گئی۔ تب اس شہر کے لوگوں سے پوچھا میں نے۔ یہ کون ہے اور یہ کس کی حویلی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ محل حارث کی بیٹی کا ہے۔ اور وہ بڑا مالدار ہے۔ میں نے پھر اُن سے کہا یہ لڑکی شوہر رکھتی ہے یا نہیں۔ اُنہوں نے کہا اس کا باپ اس کا بیاہ نہیں کر سکتا اور اس کا کچھ اس بات میں نہیں چلتا۔ یہ لڑکی اپنی شادی کرنے میں آپ مختار ہے اور یہ تین سوال رکھتی ہے۔ جو کوئی اُس کے سوال پورے کرے گا۔ اُسی سے بیاہ کرے گی۔ اس بات کو سنتے ہی میں اُس کی ڈیوڑھی پر گیا۔ دربان نے خبر کی۔ اُس نے مجھے اندر بلوایا۔ اور ایک فرش پاکیزہ پر بٹھلا کر کہلا بھیجا کہ اگر تو اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے تو میں اپنے سوالوں سے تجھے آگاہ کروں۔ میں نے کہا فرمائیے دل و جان سے قبول کیا۔ اُس نے کہا اگر تو کہنا میرا کرے گا تو میں تیری ہی ہو کر رہونگی اور جو یہ بھید نہ کھولے گا تو تجھے اپنا ہی جانونگی۔ میں نے اس کو قبول کیا اور قول دیا۔ تب اُس نے کہا پہلا سوال یہ ہے کہ قریب اس شہر کے ایک غار ہے وہاں آج تک کوئی نہیں گیا۔ اور معلوم نہیں کہ اُس کی انتہا کہاں تک ہے۔ دوسرا یہ کہ شب جمعہ کو ایک آواز جنگل سے آتی ہے کہ نہ کیا وہ کام میں نے جو آج کی شب کام آتا میرے۔ تیسرا یہ ہے کہ وہ مہرہ جو صاحب کی بیٹھک پر ہے مجھے لا دیوے۔ اس بات کے سنتے ہی اور بھی رہے سہے حواس میرے گم ہو گئے۔ میں نے ٹک ایک پاؤں کھینچا۔ اُس نے دستِ تظلم سے میرا مال و اسباب و زر و جواہر لوٹ لیا اور مجھ کو بھی اپنے شہر سے نکال دیا۔ میں لاچار ہو کر اس جنگل میں آ پڑا۔ ایک تو مال گیا۔ دوسرے رسوا ہوا۔ تیسرے عشق کے تیر نے کلیجہ چھلنی کر ڈالا۔ ہمراہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میں فقیر ہو گیا۔"

سید حیدر بخش حیدری

ترجمہ گلستاں :

حکایت۔ ایک دوست سے میں نے کہا کہ چپ رہنا میں نے اس سبب سے اختیار کیا ہے کہ بولنے میں اکثر اوقات نیک و بد کا اتفاق ہو جاتا ہے اور آنکھ دشمن کی سوائے بدی کے کچھ نہیں دیکھتی۔ بولا وہ کہ اے برادر دشمن وہی بہتر ہے کہ نیکی نہ دیکھے۔ ؎

ہے بڑا عیب ہنر دشمن کی آنکھوں میں   پھول ہے سعدی پر آنکھ میں دشمن کی خار

بیت   گو جہاں روشن ہے سورج سے سدا   پر چھچھوندر کی نظر میں ہے بُرا

حکایت۔ ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ کہا اُس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے ؎

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے   اُس کے تقوے کا تو نہ کر انکار

کھوج مت کر کسی کے باطن کی   محتسب را درونِ خانہ چہ کار

حکایت۔ ایک فقیر کو میں نے سنا ہے کہ فاقہ کی آگ میں جلتا پیوند پر پیوند گانٹھتا اور تسلی اپنی خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا ؎

لباس فقر و نانِ خشک پر میں   یہ لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت

ہر اک کی منتوں کا بوجھ اُٹھانا   ہے بہتر یا کہ اپنا بارِ محنت

کسی نے کہا اس سے کیا بیٹھا ہے تو۔ فلانا شخص اس شہر میں ایسا صاحبِ ہمت ہے کہ دستِ کرم اپنا اُس نے کھول دیا ہے۔ اور اپنی کمر کو آزادوں کی خدمت کیلئے باندھ لیا ہے۔ اگر صورتِ حال پر تیری اطلاع پا دے تو اپنے پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت جانے۔ کہا اُس نے چپ رہ کہ فقیری میں مرنا اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لیجانا چنانچہ کہہ گئے ہیں ؎

پیوند گانٹھ صبر کا کونہ کر اختیار   پر اغنیا سے کر نہیں جامہ کی التجا

مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب   جانا ترا جو گھُسنی فردوس میں ہوا

میر شیر علی افسوس

فسانۂ عجائب:۔۔۔۔۔۔۔

جوگی سے ملاقات

وہ رات کی رات بہ ہزار عقوبات تڑپ تڑپ کر سحر کی۔ نمازِ صبح کے بعد پہاڑ کی راہ لی۔ چار دن میں ناچار وہ راہ طے کی۔ پہاڑ پر پہنچا۔ سنگِ سفید کا پہاڑ دیکھا آبدار مانند ہمت جواں صاحب باطن سربلند۔ اور مثالِ طبعِ سخنوراں فرح افزا و دل پسند۔ دامن ہائے فراخ کشادہ روشن۔ جوشِ نباتات و ریاحین و لالہ سے اور طرح طرح مرغانِ خوش الحان سے رشکِ گلشن۔ چشمہ ہائے سرد و شیریں جابجا۔ نہروں کی روح کا ٹھیکہ۔ ہر قسم کا میوہ دار درخت قدرتِ حق سے اُگا۔ پھولا پھلا۔ پتھر ہر ایک معدنِ لعل۔ ہر پرند چرند صاحبِ حسن و جمال۔ یہ سیر دیکھتا چلا۔ ایک طرف درخت گنجان۔ گھنے پختہ مزار۔ بیدار دلوں کے بنے۔ اور منڈھی کا گنبد۔ گنبد گرد اس بے ستون کا جواب بنا ترسول گڑا۔ گیروے کی جھنڈی پھر پھرا رہی۔ کلمۂ شہادت بخطِ جلی لکھا۔ جب اُس کے نزدیک آیا۔ دور دور تک مکان صاف۔ صحن شفاف پایا اس کے روبرو درخت کے تلے چبوترے کے اوپر ایک جوگی سوا سو برس کا سن و سال مگر متانت کمال۔ داڑھی ناف سے بڑھی۔ گرہ لگی۔ جٹا ہر ایک راکھ سے بھری۔ تہ بند ہوا سے پاؤں پر پڑی۔ پلکیں دیدۂ حق بیں کا اظہار چھپانے کو چشمِ حاسد سے گزند بچانے کو مونچھوں سے ملیں۔ جسم میں موجِ دریا کی طرح جھریاں پڑیں۔ کمر میں کردھنی موٹی سی مونج بان کی۔ عجب آن بان کی۔ گلے میں محمودی کی کفنی۔ حقہ چوگانی منہ سے لگائے۔ افیونی کی شکل بنائے۔ شیر کی کھال بچھائے بھبوت رمائے۔ اور بیداو اوپر سے بظاہر آنکھیں بند۔ مگر دیدۂ دل کھلا۔ خاموشی پسند۔ دل بولتا سوتا نہ جاگتا۔ آسن مارے دنیا سے کنارے بیٹھا۔ پیٹ پیٹھ سے لگا۔ تیر سا قد راست مثلِ کمان خمیدہ۔ گویا چلّہ کھینچ چکا ہے۔ زنّار آسا رگیں عیاں۔ کھال سے ہڈیوں کے جوڑ مثلِ تارِ نفس نمایاں۔ تسبیحِ سلیمانی ایمان کی نشانی ہاتھ میں۔ ہر بھجو بھجو تکیہ کلام بات بات میں۔ قشقہ ٹیکا ماتھے پر ہندوؤں کا سا۔ اور سجدے کا گٹا بدرِ کامل کی صورت چمکتا۔ زرد دھتی بدن میں۔ ذکرِ حق دل و دہن میں۔ کبھی مصلّے پر تسبیح و سجادہ گاہ رکھی۔ کبھی کپڑے کی جا نماز۔ کبھی کسی جا پوتھی کھلی۔ دھونی رمی۔ دونوں سے راہ رکھی۔ عجب رنگ کا انسان۔ خلاصہ یہ کہ نہ ہندو نہ مسلمان۔ بقولِ مرزا سودا

؎ کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ　　تو کہے گبر مجھے گبر مسلمان مجھ کو

ایک طرف تکیے میں دو چار کیاریاں۔ بیلے چنبیلی کی بہار گلکاریاں۔ کہیں مرشدوں کے ڈھیر۔ گرد کی چھتری بزرگوں کے مزاروں پر مولسری کے درخت سایہ دار قطار قطار۔ درختوں کی ٹہنیوں میں پنجرے لٹکتے۔ باہم بحث کرتے اٹکتے۔ فاختہ کی کوکو۔ قمری کی حق سرہ۔ کوکا کے دم ستانے کا عالم۔ کہیں مرگ چھالا بچھا۔ شیر چوکی دیتا۔ دھونی لگی۔ لکڑ سلگتا۔ کسی جا ببر کی کھال کا بستر۔ آہوئے صحرائی اُس پر بیٹھا۔ اودا سا تونبا بے بنیاد دھرا۔ ایک سمت بھوانی کا مٹھ۔ تلسی کا پیڑ ہرا ہرا۔ گرد چشمہ کا پانی بھرا جائے دلچسپ مکان رعب دار۔ تُکِل خورد کی جا بہار۔ ایک طرف بھنڈارا جاری۔ کڑھاؤ چڑھا۔ دہن بھوگ ملتا۔ کہیں پلاؤ قلیے کی تیاری۔ چھنڈا بٹ رہا تھا۔ کچھ مہنت بالکے۔ کچھ مرید حال قال کے۔ کوئی چلّے میں بیٹھا۔ کوئی دنیا سے ہاتھ اٹھائے کھڑا۔ کسی کے خرقہ و تاج سر و تن میں۔ کوئی جوگن میں۔ کہیں کتھا ہوتی۔ کوئی وعظ کہہ رہا۔ ایک طرف کھنجری بجتی۔ طنبورا چھڑتا۔ بھجن ہوتے۔ ایک سمت حلقۂ مراقبے کا بندھا۔ نوحہ پڑھ رہے۔ لوگ روتے۔ عجیب وہ گرو مرشد۔ غریب یہ مرید چیلے۔ روز ایک دو کو مونڈتا۔ تیسرے چوتھے دن عرس میلے۔ حاصلِ کلام یہ کہ وہ عجب جلسہ تھا۔ کہ دیکھا نہ سنا۔ یہ اجتماعِ نقیضین آرام چین سے۔ شہزادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی۔ مردِ آگاہ دل روشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اٹھائی۔ آنکھ ملائی۔ دیدے لال لال چہرے پر رعب پر جلال۔ جانِ عالم کو بغور دیکھا۔ اُس نے جھک کر مؤدب سلام کیا۔ اُس خوش تقریر شیریں مقال نے کہا "بھلا ہو بچا۔ بڑی مصیبت فلک نے دکھائی۔ جو یہ صورت یہاں تک آئی۔ آؤ بیٹھو گرو بھلا کرے۔ مرشد کی دعا سے حق حاجت روا کرے۔ ہم تمہارے امانت دار ہیں۔ سواری کھڑی ہے۔ چلنے کو تیار ہیں"۔

جانِ عالم متعجب ہو رہا تھا اور زیادہ حیران ہوا۔ کہ یہ کیا اسرار ہے۔ پاس جا بیٹھا۔ جوگی اٹھا۔ چشمے میں جا کر نہایا۔ گیروا چادر پھینک سفید اوڑھ۔ عطر لگا۔ جانِ عالم کے نزدیک آ یہ نکتہ زبان پر لایا "بابا ایک دن ذوق شوق کے عالم میں ہمارے مرشد گرو نے تیرے حال سے خبر دی تھی۔ کہ ایک شہزادہ کا جہاز تباہ ہو جائے گا۔ وہ بہ سراغِ مطلب یہاں آئے گا۔ اس کا کام تجھ سے تیرا کام اُس کے سامنے پورا ہو جائے گا"۔ اس بات کے سننے سے شہزادے کو نہایت مسرت ہوئی۔ کہا "جوگی جی تمہارے نام سے میری زندگی ہوئی۔ ورنہ دو چار دن میں گریبان صبر چاک ہو جاتا۔ سر پٹک کر ہلاک ہو جاتا"۔

خوبصورتی کا بھی عجب مزا ہے۔ جہان اس کا شیدا ہے۔ عالم کو مرغوب ہے۔ طرح دار سب کا محبوب ہے۔ پیر فقیر غریب امیر سب کو عزیز ہے۔ اس کا خواہشمند

ہر باتمیز ہے۔ جوگی سمجھانے لگا۔ کہ یہ اضطراب بیجا ہے۔ دیر آید درست آید۔ بابا دنیا کا یہ نقشہ ہے۔ گاہ خوشی کبھی غم۔ یہ دونوں امر باہم ہیں۔ آدمی جب رنج سے گھبرائے۔ اور غم مفارقتِ دوست جان ہونٹوں پر لائے۔ دل کو یہ تسکین دے کر سمجھائے۔ چناں نہ ماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند ع۔ در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائینگے دن فصلِ گل جیتوں کو پھر اگلے برس آئیگی

تو نے اُن دونوں بھائی جو توام پیدا ہوئے تھے اُن کا قصہ نہیں سنا۔ کہ پہلے اُنہوں نے کیا کیا صعوبت اُٹھائی۔ پھر ایک نے سلطنت پائی۔ دوسرے کے ہاتھ شہزادی آئی۔ جانِ عالم نے کہا ارشاد ہو کیونکر ہے؟

مرزا رجب علی بیگ سرور

طلسم ہوش رُبا

چالاک بن عمرو کی عیّاری اس طرح دکھاتے ہیں کہ افراسیاب خانہ خراب گہر ملک کو پکڑ کر اپنے باغ سیب میں چلا گیا۔ چنانچہ جب کچھ رنج والم اُسکو کم ہوا تو پھر عازم لشکر حیرت ہوا۔ اس طرح چالاک بن عمرو جو بارگاہ مہرخ میں آیا تھا جب اُس نے سنا کہ خواجہ عمرو بن اُمیہ پدر بزرگوار قید افراسیاب نابکار سے رہا ہوئے۔ پس یہ بارگاہ سے اُٹھا کہ میں بھی چلکر کوئی کارنمایاں کروں۔ سوچا کہ کسی طریقہ سے صحرا میں قریب دریائے خون رواں ٹھہرا۔ حال اُسکا ناکارہ ہوگا۔ لیکن تا طلسم جب دریا سے اس طرف آیا دور سے ایک ساحر ذیوقار کو بامانِ شہریاری صحرا میں بیٹھے پایا۔ اُسی طرف یہ بھی چلا جب قریب اُس ساحر کے پہنچا دیکھا کہ برہمن روئیں تن پیر بھائی امیرا اور کوکب کا ہے۔ بادشاہ مذکور نے ہنس کر اُس سے پوچھا کہ اے برہمن آج یہاں کیوں آئے ہو اُس نے کہا کہ اے بادشاہ میں کوکب سے ناراض ہو کر یہاں آگیا تھا۔ اب اپنے گھر جانے کو تھا۔ آپ کو آتے دیکھا ٹھہر گیا ہوں۔ بادشاہ نے کہا اگر تم اپنے یار وفادار کو کب کو چھوڑ کر میرے یہاں رہو تو جو کچھ میسر ہے حاضر ہے۔ اور اگر غور کرو تو کچھ ہم میں اور اُس میں فرق نہیں ہے۔ ایک مکتب کے دو شاگرد۔ ایک گھر کے دو چراغ۔ ایک درکے دو داغ۔ ایک گلبن کے دو شجر ایک شجر کے دو ثمر ہیں۔ برہمن نے عرض کیا کہ مجھے آپکی اطاعت سے کیا انحراف تھا یعنی شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا۔ یہ کہہ کر اُٹھا اور قدم پر گرنے چلا۔ بادشاہ نے سر اُس کا اُٹھا کر سینے سے لگایا۔ برہمن نے مُنہ میں سفوف بیہوشی پھونکا کہ بادشاہ چھینک مار کر زمین پر گرا۔ اُس وقت برہمن نے نعرہ کیا کہ منم چالاک بن عمرو اور خنجر کھینچکر چلا تھا کہ سر کاٹ لوں۔ اُسوقت پُشت پر سے نعرہ ہوا کہ باش باش ماہم رسیدیم صبا رفتار عیار پہنچے بہت جلد قریب اُس کے پہنچے اور خنجر کھینچکر حملہ آور ہوئے۔ چالاک بھی لڑنے لگا۔ لیکن صبا رفتار نے لڑتے لڑتے ایک بیضہ بیہوشی کے دفع کا منہ پر شاہ جادواں کے مارا۔ بادشاہ کو بھی ہوش آگیا۔ چالاک یہ حال دیکھ کر جست کناں بھاگ کر درۂ کوہ میں مخفی ہوا اور صبا رفتار نے سب ماجرا بادشاہ سے کہا۔ شاہ نے فرمایا کہ تو نے پہلے بمقابلہ برق اں بھی کارنمایاں کیا تھا۔ اور اب بھی وقت پر پہنچے۔ دونوں مرتبہ کا انعام میں تجھ کو بارگاہ حیرت میں چل کر دوں گا۔ کیونکہ دونوں مرتبہ سامری نے مجھ کو بباعث تیرے بچا لیا۔ اچھا تو جانب بارگاہ ملکہ مذکور چل۔ میں بھی آتا ہوں۔ عیار دستِ تسلیم کر کے روانہ ہوئی اور شاہ بھی اُسی طرف چلا۔ ادھر چالاک فکرِ عیاری میں اور روانہ ہوا۔ اس کا بھی ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ مگر حال شاہ جادواں بیان ہوتا ہے۔ کہ یہ اُس صحرا سے بزور سحر پرواز کناں لشکرِ حیرت میں آیا۔ ملکہ حیرت اور مصور وصورت نگار وغیرہ نے بارگاہ سے نکل کر استقبال کیا۔ اور اندر بارگاہ کے لاکر بعظمت تمام تر تخت پر بٹھایا اور عرض کیا کہ اے شہنشاہ سامری حضور کو ہمیشہ خوشنود رکھے اوّل مرتبہ جو آپ تشریف لائے تھے تو بہت خوش تھے لیکن اس وقت چہرہ حضور کا بہت متغیر معلوم ہوتا ہے۔ شاید پہلے کوئی تدبیر قتل سکہ رامان روسیاہ ٹھہرائی تھی۔ اب اس میں کچھ فرق پڑ گیا۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ کنیزوں سے بھی ارشاد فرمائیے۔ کہ آپ کی خوشی سے ہم بھی خوشی کریں اور اس کے رنج کے شامل رہیں۔ بہرصورت دامن گلہائے مراد ومقصد سے بھریں۔ بادشاہ نے یہ کلمات سُن کر اک آہ کی۔ اور کہا کیا کہوں کہ پہلی مرتبہ جو میں آیا تھا تو برآن دختر کوکب کو زندانِ طلسم میں قید کر آیا تھا۔ اور اس مرتبہ بھی سامری نے مجھکو بچایا تھا۔ وہ ناشدنی لڑکی بلائے بدتھی۔ بڑی دیر تک لڑی اور بسبب اختر مروارید کے مجھ پر غالب آئی تھی وہ تو صبا رفتار عیارہ وقت پر پہنچی اور اُس نے بیہوشں کیا۔ میں اُس کو قید کر آیا۔ اب مہرخ سحر چشم جو اُس کی بڑی حمایتی اور طرفدار ہے اور کوکب روشن ضمیر باپ اُس کا اُس کو ایک داغ تازہ میں نے دیا ہے۔ دیکھوں تو کیونکر وہ میرے زندانِ طلسمات سے چھڑا لے جاتا ہے اور میرا کیا کر سکتا ہے۔ جب تو برآن بہت اُچھلتی پھرتی تھی ویسا ہی میں نے اُس کو قید کیا ہے۔ اب دم مجتمع عمرو کا بھرنا اُس کو معلوم ہوگا۔ خیر یہ باعث تو میری خوشی کا تھا لیکن اس وقت جو میں ادھر آتا تھا تو راہ میں اس طرح برہمن بنا ہوا چالاک بیٹا عمرو کا مجھ کو ملا۔ اور اُس نے مجھ کو بیہوش کر دیا۔ چاہتا تھا کہ قتل کرے۔ آج بھی صبا رفتار عیارہ

وقت پہنچی اور اُس نے میری جان بچائی۔ میں سچ کہوں یہ چالاک وہ عیار ہے کہ اس نے میرا پیچھا لیا ہے۔ نیلم کوہ سے اس مقام تک بہت عیاریاں اُس نے مجھ سے کیں سلیمان جادو کو میرے ہاتھ سے قتل کرایا۔ سلطان و سرشار وغیرہ کے مقام پر عیاری کر کے مجھکو ذلیل کیا ہمیشہ وار کیا اُس نے مارا جب میں اس چالاک کو دیکھتا ہوں خون آنکھوں میں اُتر آتا ہے اور وہ بھی ایسی برجستہ عیاری کرتا ہے کہ سامری مجھ کو بچا تا ہے۔ یہ کلمات جو زبانی شاہ ملازمان ملکہ نے سنے۔ کہا حضور پہ سے تصدق اُتر یہ واقعی موئے دشمن تو لگے ہی رہتے ہیں سچ ہے سامری جمشید شہنشاہ کے آڑے آجاتے ہیں۔ آج جو کچھ نہ صدقہ اُتارا جائے وہ کم ہے۔ حیرت نے یہ سنکر حکم دیا کہ سارے تصدق کے ٹکے لاؤ۔ لنگر جاری کرو سب سامری کی اتیت بھجن کریں حسب الحکم ملازم عمل میں لائے۔ تو جتنے ملازم تھے سب صدقہ اُتارنے لگے۔ کوئی تیل ماش لایا۔ کوئی ٹکے صدقے کے لایا۔ حیرت نے برآن کے قید ہونے کی بھی خوشی کی۔ ارباب نشاط کو بلوایا۔ جام شراب سرخ گردش میں آیا۔ سب معروف عیش و نشاط ہوئے۔ اہلکار لشکر مہرخ کے جو ہر خبر یہاں حاضر رہتے ہیں وہ جلا جلد معلوم کر کے سامنے مہرخ کے آئے۔ یہاں رہائی پانے سے خواجہ عمرو کے ہر ایک خوش تھا۔ جلسۂ عشرت جمع ہوا تھا۔ شراب ناب چلتا تھا۔ ناچ ہوتا تھا کہ اہلکاروں نے آکر مجرا گاہ پر سے تسلیم کی۔ اور وہ عاہ مخلصے پادشاہی بجالائے نظم ۔

ناخن بغیر غنچوں کے گتھائیں نہ کھل سکیں ۔۔۔ تیری شاخ جو باد سحر کی نمو سے یار

میخانۂ جہاں میں کرم سے ترے نہیں ۔۔۔ کوئی شکستہ حال بجز تو بۂ خمار

برسا اگر سحاب کرم یاں نہیں کہ اب ۔۔۔ ہوتا ہے رنگ آتش میں یاقوت آبدار

بعد ادائے دعا ثنا جو ماجرا جو زبانی شاہ جادواں کے سنا تھا عرض کیا۔ اس خبر کے سننے سے ہر ایک بحواس ہو۔ طاری عالم یاس ہوا جلسۂ عشرت درہم برہم صحبت عیش برہم کا اشعار

ہوئی وہ بزم شادی بزم ماتم ۔۔۔ بکیں خانۂ دل ہو گیا غم

شرار غم نے کی آخر شرارت ۔۔۔ بدن میں یک بیک آئی حرارت

ہم ملتے تھے سب افسوس سے ہاتھ ۔۔۔ تھے ناگاہ اس سے کیا ہے یہ بات

برق و ضرغام عیار بھی یہاں موجود تھے۔ جب اُنہوں نے مہرخ و بہار کو روتے دیکھا۔ بہت کچھ اُن کی تسکین و دلداری کی اور کہا گھبراؤ نہیں ہم ہمیشہ تم سے کہتے آئے ہیں کہ مرنا برحق ہے۔ کوئی قیامت تک زندہ نہیں رہا ہے۔ پھر غم کیوں کریں۔ ہاں غم اُس وقت کرنا چاہئے کہ جب بے عزتی کا سامنا ہو اور یہ تو امرا ایسا ہے کہ نام کر کے مر جائے۔ پھر یہ مرنا تو زندگی ہے۔ بموجب بیت

کہاں ہیں شجاعان خنجر گذار ۔۔۔ فقط نام نیک اُن کا ہے یادگار

بلکہ ہم چاہتے ہیں اور ہو سکتا ہے تو برآن عالی شان کو رہا کر کے لاتے ہیں۔ یہ کہہ کر دونوں عیار طرار قنطورے در پتا سے باندھ کے عیاری کو آراستہ ہو کر روانہ ہوئے۔

محمد حسین تجاہ

اُس کی بیداد پر تو میں مرتا ہوں ۔۔۔ تلطف کرتا تو کیا ستم ہوتا

تیرا تو مشغلہ ہے یہ تو آب رات دن ۔۔۔ میں روز سیتے سیتے گریبان تھک گیا

جو دی کا اب یہ نقشہ ہے کہ ہم ۔۔۔ شکوے کرتے ہیں تری تصویر سے

نواب خلد آشیان

الف لیلہ (اُردو):۔

قصہ حجّام کا روبرو جماعت کے

عہدِ خلافت میں مستنصر باللہ کے جو دادو دہش میں محتاجوں کی مشہور تھا۔ دس قزاق گرد نواح شہر بغداد کے رہزنی کرتے۔ اور ایک مدّت سے اُن کے ظلم سے وہاں کے باشندے شاکی اور نالاں تھے۔ خلیفہ حال قزاقوں کا سُنکر بہت غصّہ میں آیا۔ اور کوتوال کو فرمایا کہ جلد اُن دسوں قزاقوں کو گرفتار کرکے عید بقرعید کے روز حاضر کرو۔ ورنہ تیری گردن ماروں گا۔ کوتوال نے کہ بہت ہوشیار تھا فوراً اپنے سپاہیوں کو اُن کی گرفتاری کے لئے بھیجا۔ اتفاقاً نویں تاریخ ذی الحجہ کے کہ روز عرفہ کا ہے۔ قزاقوں کو پکڑ کر کشتی پر سوار کیا اور عید کے دن علی الصباح اُن دسوں قزاقوں کو مرد آدمی سمجھ کر میں بھی بے کہے سُنے اُس کشتی پر سوار ہوا۔ جب کشتی کو کھیکر خلیفہ کے محل کی طرف لے چلے۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ سب قزاق ہیں۔ واسطے قتل ہونے کے پکڑ آئے ہیں۔ جب ہم سب کشتی سے کنارے پر اُترے۔ سپاہیوں نے آکر ہم سب کو گھیر لیا۔ اور ایک ایک کی مشکیں باندھ کر خلیفہ کے حضور میں لے گئے۔ اور میں بھی باندھا گیا اور کچھ زبان سے نہ بولا۔ غرض جب ہم سب خلیفہ کے سامنے حاضر کئے گئے۔ اُس نے جلاّد کو فرمایا ان دسوں ٹھگوں کی گردن مارے۔ اُس نے ہم سب کو برابر صف باندھ کر بٹھایا۔ میری خوش نصیبی سے جلاّد نے مجھے آخر صف میں بٹھایا۔ پھر سِرے سے اُس نے گردن مارنا شروع کیا۔ جب دس سر کاٹ چکا۔ میرے پاس آیا اور ٹھہر گیا۔ خلیفہ خفا ہوا کہ کیوں ایک کو چھوڑ دیا۔ جلاّد نے عرض کیا کہ میں نے دس آدمیوں کو قتل کیا حضور گن لیں۔ بادشاہ نے دس مقتول کو دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ اے مرد پیر تو تو قزاق نہیں کیوں مقتل میں آیا۔ میں نے عرض کیا خداوند میں دھوکے سے کشتی میں بیٹھ گیا تھا۔ خلیفہ بہت ہنسا اور میرے چپ رہنے پر تعجب کیا۔ تب میں نے کہا غلام نے بخلاف اپنے چھ بھائیوں کے خاموشی اختیار کی ہے۔ جس کے سبب سے میں بہت معزز رہتا ہوں۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور فرمانے لگا اب کہو کہ تمہارے اور بھائی اسی صفت میں مثل تمہارے ہیں یا نہیں۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ وہ سب بکّی ہیں اور خلقت میں بھی میرے اور اُنکے بہت فرق ہے۔ ایک کُبڑا۔ دوسرا پوپلا۔ تیسرا کانا۔ چوتھا اندھا۔ پانچواں بوچا۔ چھٹا خرگوش کی طرح چلتا ہے۔ اُن کے حالات اگر سُنیں تو اُن کے رتبوں کو پہچانیں۔ امیدوار اجازت کا ہوں تا اُن سب کا حال جدا جدا بیان کروں۔ میں نے اس بات کو خیال کرکے کہ شاید بادشاہ اجازت کہنے کی دے نہ دے جلد کہنا شروع کیا +

مولانا محمد حامد علی خاں حامد

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

پوچھو نہ حال چشمِ دل آویزِ یار کا کھولو نہ راز گردشِ لیل و نہار کا
پیغام آرہے ہیں برابر وصال کے ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا
کٹ جاتی ہیں پہاڑ سی راتیں امید کی اللہ دے اگر تو مرض انتظار کا

شادؔ عظیم آبادی

خوش طبعی

از جناب شمس العلما مولانا محمد حسین صاحب آزاد

(مزاحیہ نگار حضرات غور سے پڑھیں)

خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ کہ وہ کیا شے ہے۔ البتہ یہ کہنا آسان ہے۔ کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں۔ تو افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایہ اور استعارہ سے بیان کروں۔ اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے وہ صفتیں منسوب کروں۔ جو کہ نسب نامہ مندرجہ ذیل میں درج ہیں۔ یہ واضح ہو کہ سچ۔ خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔ اس گھرانے میں حسنِ ادب ایک نہایت معقول شخص تھا۔ اس کا بیٹا حسنِ بیان ہوا۔ اُس نے ایک اپنے برابر کے خاندان میں شادی کی۔ اس کی دُلھن کا نام خندہ جبین تھا کہ آٹھ پہر ہنستی ہی رہتی تھی۔ چنانچہ اُن کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔ چونکہ خوش طبع سارے خاندان کا لُبِ لباب تھا۔ اور بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اُس کی طبیعت بوقلموں اور گوناگوں تھی۔ کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا۔ اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا۔ کبھی ایسا بن کر نکلتا گویا قاضی القضات یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں۔ اور کبھی ایسے مسخرے بن جاتے۔ کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے۔ لیکن چونکہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے کسی حالت میں ہو اہلِ محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا +

اسی کے ہمسایہ میں ایک مکرباز جعل ساز بھی رہتا تھا۔ کہ اُس نے بھی خوش طبع اپنا نام رکھ لیا تھا۔ اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کا قائم مقام سمجھتے تھے۔ پس اس خیال سے کہ نیک مرد۔ ناواقف اس کے دھوکے میں نہ آجائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے والے اگر کبھی کسی ایسے شخص سے ملیں تو اس اصل نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور غور سے دیکھیں کہ دور نزدیک کچھ رشتہ اس کا سچ قبیلے سے جا ملتا ہے یا نہیں۔ اور حقیقت میں وہ حسنِ ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے۔ یا کسی اور سے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہی جعل ساز بہروپیہ سمجھیں +

ایک پہچان اس کی یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی محفل میں بیٹھا ہوتا ہے۔ تو اُسی کے قہقہے کان میں آتے ہیں۔ اور گرد اس کے متین اور معقول لوگ خاموش بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور جب ظرافت اصلی محفل آرا ہوتی ہے۔ تو آپ کمال سنجیدگی سے بیٹھی ہوتی ہے۔ گرد اس کے سب ہنستے ہیں +

بلکہ اتنی بات اور بھی کہتا ہوں۔ کہ اگر اُس کے خاندان میں خوش طبعی یا خندہ جبینی یا خوش بیانی کسی کی بو نہ آئے تو اسے بھی وہی جعل ساز بہروپیہ سمجھنا چاہئے جس بہروپیہ بھانڈ کا میں نے ذکر کیا۔ وہ اصل میں جھوٹ کی اولاد سے ہے۔ اور جھوٹ حقیقت زٹل کا باپ تھا۔ زٹل سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اُسکا نام مسٹری مستان تھا۔ اسی طرح حماقت ایک بھونڈ عورت تھی۔ اور اس کی ایک بیٹی تھی جسے مسخرن دوانی کہتے تھے۔ اس سے مسٹری مستان نے شادی کی۔ ان دونوں سے عجب طرفہ معجون بچہ پیدا ہوا۔ جسے تم بہروپیہ بھانڈ سمجھتے ہو۔ بعض اشخاص کو بعض اوقات اس کے کلام میں بھی خوش طبعی یا خوش بیانی کی بو آتی ہے۔ مگر وہ حقیقت ظرافت بداصل ہے۔ اب میں ان دونوں کا نسب نامہ لکھتا ہوں:-

جھوٹ
|
زٹل
|
مسٹری مستان - مسخرن دوانی

سچ
|
حسنِ ادب
|
حسنِ بیان

ظرافت بد اصل یا نقلی	خوش طبع خاوند - خندہ جبینی بی بی
یعنی بہروپیہ بھانڈ	ظرافت اصلی یا خوش طبعی

میں اس استعارہ کو زیادہ تفصیل دیتا۔ اور ظرافت بد اصل یعنی بہروپیے بھانڈ کی اولاد جو رنگ بیابان سے بھی زیادہ ہے سب کا حال تمام بتمام بیان کرتا خصوصاً اُن لڑکے لڑکیوں کا کچھ حال لکھتا جن سے ملک وجود میں اس نے اپنی ناپاک نسل پھیلائی ہے۔ مگر اس سے جابجا حسد کی آگ اُٹھتی۔ اس لئے جی نہیں چاہتا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہونگا کہ ظرافت اصلی اور ظرافت نقلی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آدمی اور بندر میں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اُسے بندر کی طرح جھوٹ موٹ کی دغابازیاں اور ویسے ہی نقلیں کرنے کی عادت ہے۔ دوسرے اس قسم کے کام کر کے نہایت خوش ہوتا ہے۔ بلکہ دونوں باتیں اُسے یکساں ہیں۔ خواہ رسوا کردے۔ ابھی ایک شخص کو باعظمت و احترام بنا دے۔ ابھی چٹکیوں میں اُڑا دے۔ کسی کی نافہمی و بدعقلی دکھا دے کسی کی دانش و دانائی سُنا دے۔ ابھی دولت و حشمت کی مسند پر بٹھا دے۔ ابھی کنگال فقیر بنا دے۔ سبب اس کا یہ ہے۔ کہ جھوٹ کی تھیلی ہر وقت بھری ہے کبھی خالی نہیں ہوتی تیسرے ایسا کم بخت ہے کہ جو ہاتھ اسے رزق دیتا ہے۔ اسی کو کاٹ کھاتا ہے۔ اور دوست دشمن دونوں کی برابر خاک اُڑاتا ہے سبب اس کا یہ ہے کہ انسانیت سے خارج ہے۔ اس لئے خوش طبعی کئے جاتا ہے جیسی ہو سکے اور جہاں ہو سکے۔ نہ یہ کہ جیسی ہونی چاہئے۔ چوتھے چونکہ عقل سے بالکل محروم ہے۔ اس واسطے اخلاق یا صلاحیت کی نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتا۔ پانچویں چونکہ ہنسی چہل کے سوا اور کسی قابل نہیں۔ اور ہر شخص پر فوقیت کی ہوس رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا تمسخر ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے۔ یعنی کسی صاحب معاملہ یا کسی صاحب تصنیف کی ذات سے منسوب ہوتا ہے۔ نہ کہ فقط اس کی بُرائی یا اس کی تصنیف سے ۔

محمد حسین آزاد

جا سکے گلشن تلک اُڑ کر نہ ہم بے بال و پَر
ہم نے اے صیاد کیا پایا رہائی میں مزا
بیٹھا ہے مہندی لگا کر اپنے دست و پا میں تو
آج ہے اے شوخ تجھ سے ہاتھا پائی میں مزا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
جلوۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اُس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

شہنشاہ ظفر دہلوی

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دلِ پُر داغ کو کیونکر ہے عشق اس زلفِ پیچاں کا

کیوں کر مرے رونے سے دل نرم ہوا اُس بُت کا
پتھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا
کیوں فکرِ عمارت ہے دنیا میں تجھے ناسخ
ویرانے میں گھر کوئی تعمیر نہیں کرتا

تو نے شہبازِ نگاہ کو جو ادھر چھوڑ دیا
ہم نے بھی طائرِ دل باندھ کے پر چھوڑ دیا

امام بخش ناسخ

نامہذّب ملک اور نامہذّب گورنمنٹ

ازجناب سرسید احمد خاںؒ صاحب

ملک جب نامہذب ہوتا ہے تو ضرور کچھ نہ کچھ گورنمنٹ میں بھی ناتہذیبی آجاتی ہے ۔ اور جب گورنمنٹ مہذب ہوتی ہے تو کسی نہ کسی قدر تہذیب ملک میں ہوتی جاتی ہے ◆

ملک کا نامہذب ہونا تو اُس ملک کے باشندوں کا نامہذب ہونا ہوتا ہے کیونکہ جب کہیں کہ انگلینڈ ۔ فرانس ۔ جرمن ۔ امریکہ نہایت مہذب ملک ہیں تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ وہاں کے رہنے والے تہذیب و تربیت یافتہ ہیں ۔ ہندوستان کو جو نامہذب یا نیم وحشی ملک بتایا جاتا ہے ۔ اس کا بھی سبب ہے کہ یہاں کے رہنے والے نامہذب یا نیم وحشی گنے جاتے ہیں ◆

مگر ہم کو غور کرنا چاہئے کہ گورنمنٹ کا نامہذب ہونا کیا چیز ہے اور مسلمانی گورنمنٹیں جسقدر ہیں اُن کے نامہذب ہونے کا کیا سبب ہے ◆

گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کرتی ہے اُن کے حقوق کی خواہ وہ حقوق مال و جائداد سے متعلق ہوں خواہ کسب و پیشہ و معاش سے خواہ آزادئی مذہب و آزادئی رائے اور آزادئی زندگی سے ان کی محافظ ہو ۔ غیر مساوی قوتوں سے کسی کو نقصان نہ پہنچنے دے ۔ کمزور مستحق کو غیر مستحق زورآور سے پناہ میں رکھے ۔ ہر شخص اپنی ملکیت سے اپنے ہنر سے پورا پورا متمتع ہو ◆

اور اُس کا مہذب ہونا یہ ہے کہ ان تمام فرائض کے پورا کرنے کو قوانین اُس کی سلطنت میں جاری ہوں ۔ ہر شخص ادنیٰ سے اعلیٰ تک یہاں تک کہ خود گورنمنٹ بھی اُن قوانین کے تابع ہو اور وہ قانون ایسے ہوں کہ تمام رعایا کے حقوق اُسکی رو سے مساوی ہوں ۔ اور اُس کے ساتھ وہ قوت بھی ہو (جس کو گورنمنٹ کہتے ہیں) اور جو ہر شخص کو بلا لحاظ مرتبہ اُن قوانین کا پورا پورا مطیع کرے ۔ جس گورنمنٹ میں یہ چیزیں نہیں ہیں وہ گورنمنٹ نامہذب و ناتربیت یافتہ کہلاتی ہے ۔ اور اُس کے ملک میں کبھی امن نہیں رہتا ۔ ملک کی ۔ مال کی ۔ دولت کی ۔ قوم کی ۔ رعایا کی کبھی ترقی نہیں ہوتی

اس اصول کا نتیجہ تمام مسلمانی سلطنتوں میں پایا جاتا ہے کہ کوئی مسلمانی سلطنت اس وقت دنیا میں ایسی موجود نہیں ہے جس پر مہذب گورنمنٹ کا اطلاق ہوسکے یا اُس کا ملک اُس کی رعایا ترقی یافتہ حالت میں ہو ۔ یا وہاں کی رعایا کو اپنے تمام حقوق مالی و ذاتی حاصل ہوں ۔ یا اپنے مال و ذات پر بالکلیہ امن رکھتی ہو ۔ یا کمزور مستحق کو غیر مستحق زورآور کا اندیشہ نہ ہو ◆

ایسی قوم کی گورنمنٹ جو دینی اور دنیوی دونوں کاموں میں اپنے تئیں پابندہ مجبور اُن احکام کا سمجھتی ہے جس کو اُس نے مذہبی احکام تسلیم کر رکھا ہے ۔ اُس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ کوئی دنیوی کام بھی بغیر مذہبی سند یا بدون مذہبی اجازت کے نہیں کیا جاسکتا ۔ اور جس طریقہ پر کوئی دنیوی کام پہلے ہو چکا ہے ۔ اُس سے مختلف طریقہ پر کوئی دنیوی کام بھی نہیں ہو سکتا ◆

یہ لوگ اس بات کو بھی تحقیق کیا نہیں چاہتے کہ درحقیقت اُس مذہب میں جس کے وہ پیرو ہیں وہ ایک اصلی حکم ہے جس میں کچھ شبہ نہو یا نہیں ۔ بلکہ وہ صرف اگلوں کی رائے یا فعل پر بلا دریافت سبب کے اعتقاد تقلیدی رکھتے ہیں ۔ اور اُس کے برخلاف کو مذہبی حکم کی بداخلاقی سمجھتے ہیں ۔ گو کہ اصلی حکم اُس کا مذہب کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو اس قسم کے لوگوں کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ اس بات میں بھی مذہبی سند کی تلاش کرتے ہیں کہ برتیچ لوڈو بندوق کا استعمال جائز ہے یا نہیں ۔ سپاہیوں کو تنگ و چست وردی پہنانا درست ہے یا نہیں ۔ جزیرہ عرب میں ریل بنانا خلاف مذہب ہے یا نہیں ۔ یہاں تک کہ ریل میں سوار ہونے کی نسبت بھی مذہبی اجازت کے خواہاں ہوتے ہیں ◆

ایسا ملک اور ایسی قوم ہمیشہ تنزل کی حالت میں رہتی ہے ۔ تہذیب و شائستگی کی بو تک وہاں نہیں جاتی ۔ کوئی مستحکم قانون اُس کے ہاں نہیں ہوتا کسی شخص کے حقوق محفوظ نہیں رہتے ۔ کوئی شخص مال سے پورا پورا تمتع حاصل نہیں کرسکتا نہ کبھی ملک میں امن ہوتا ہے ◆

کل مسلمانی گورنمنٹوں کا جو کہ اس وقت دنیا میں موجود ہیں اُن کا یہی حال ہے سب سے مقدم و مکرم مسلمانی گورنمنٹ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے وہ سلطان ٹرکی کی گورنمنٹ ہے ۔ جس کو لوگ سلطنت روم کہتے ہیں ۔ اگرچہ سلطنت ٹرکی نے

بہت سی باتوں میں تبدیلی کی ہے جس سے جاں بلب کی حالت سے کسیقدر سنبھلی ہے۔ لیکن اب بھی اُن ہی اسباب سے مرض الموت میں گرفتار ہے ✦

کوئی سال امن کا اُس پر نہیں گذرتا کبھی کریٹ میں فساد ہے اور کبھی شام میں کبھی عرب میں تلوار چل رہی ہے اور کبھی یونان کے کنارہ میں۔ زمانہ موجودہ میں ادھر ہرزی گویا باغی ہو رہا ہے۔ اور ادھر سرویا۔ کوئی قانون دیوانی یا فوجداری کا موجود نہیں ہے۔ کوئی ایسا آزاد محکمہ جو ٹھیک انصاف کرے پیدا نہیں ہے۔ جو محکمے برائے نام ہیں وہ خود اپنے احکام کی تعمیل میں۔ ذ گریات کے اجرا میں مظلوم کو اُس کا حق پہنچانے میں قادر نہیں ہیں۔ جج جو قاضی کہلاتے ہیں آزاد نہیں ہیں۔ یا تو اپنے سے اوپر کے افسر کے یا کسی اعلیٰ اہل خاندان کے رعب میں یا کسی با قیمت شخص کی سفارش کے پھندے میں اور ان سب پر خود اپنے تعصب مذہبی کے حال میں اور اس سے بھی زیادہ رشوت ستانی کی حالت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کسی کو گورنمنٹ پر طمانیت نہیں ہے کسی شخص کو اپنا حق پانے کی پوری توقع نہیں ہے کسی غیر مذہب والے کو پورا پورا انصاف ملنے کی امید نہیں ہے۔ ملک تنزل میں ہے۔ تجارت ابتر حالت میں ہے۔ کوئی کمپنی تجارت کی اپنا کام جاری نہیں کرتی۔ ملک میں سونے چاندی۔ تانبے لوہے ٹین کی۔ کوئلے کی کانیں کی کانیں بھری پڑی ہیں۔ مگر کوئی کمپنی کھڑی نہیں ہوتی کیسی قسم کی تجارت ترقی نہیں پاتی۔ تمام ملک کی آمدنی دوسرے ملک میں یا تو قرضہ کے سود میں یا ہتھیاروں کی خرید میں چلی جاتی ہے۔ قرض پر گذران ہے۔ وہ بھی اپنے ملک میں نہیں ملتا غیر ملکوں کی رعایا سے بمنت و خوشامد لیا جاتا ہے۔ اور یہ نتیجہ تمام اسی غلط خیال کا ہے جس کے بموجب دینی و دنیوی دونوں قسم کے کاموں کو مذہب میں شامل سمجھا ہے۔ وَ اَنتُم اَعلَم بِاُمُورِ دُنیَاکُم کے جملہ کو چھوڑ دیا ہے ✦

یہ حال جو ہم نے لکھا کچھ سلطنت اسلامیہ روم ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ تمام چھوٹی بڑی گورنمنٹوں کا یہی حال ہے۔ ایران کا حال دیکھ لو۔ افغانستان و ترکستان پر نظر ڈالو۔ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کو دیکھ لو تو سب کا ایک سا حال ہے۔ ہاں بعض مسلمانی ریاستوں نے کسیقدر تبدیلی کی ہے۔ اور بقدر تبدیلی کے کسیقدر اچھی حالت میں ہوتی جاتی ہیں ✦

دنیا میں دو قسم کے امور ہیں۔ ایک روحانی اور دوسرے جسمانی۔ یا یوں کہو کہ ایک دینی اور دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امور دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ ہاں چند مخصوص باتوں کو جن کا اثر اخلاق پر زیادہ تر ہے اور گو وہ دنیاوی ہوں۔ بیان کر دیتا ہے۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ اسلام بھی جو ایک سچا مذہب ہے انہی اصول پر مبنی ہے۔ اور ہمارے رسول مقبول کا یہ قول کہ ما اٰتٰکم من امر دینکم فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔ اس پر دلیل کامل ہے۔ اور قرب زمانہ نبوت میں اسی اصول پر عمل درآمد رہا۔ اور کچھ کچھ اُس کا اثر عہد خلفا تک بھی باقی رہا جنھوں نے حد سماعت مقدمات کی تیس برس۔ اور پھر پندرہ برس۔ اور دعویٰ شفع کے لئے حد سماعت ایک مہینہ مقرر کی اور گواہ سے قسم لینے اور قرآن مجید اُس کے ہاتھ میں رکھنا تجویز کیا جس کی کوئی سند یا اجازت مذہب میں نہ تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ عمدہ اصول بالکل نسیاً منسیا ہو گیا ✦

اگلے زمانہ کے نیک اور متدین۔ مگر مذہب کی طرف زیادہ متوجہ عالموں نے یہ خیال کیا کہ جہانتک ہو سکے ہر ایک کام کسی مذہبی سند پر کیا جائے۔ پس جو واقعہ یا امر پیش آتا اُس کے لئے فکر کرتے کہ اُس کو کس مذہبی سند سے متعلق کریں۔ اور پھر خواہ نخواہ کھینچ تان کر اور تاویلات اور استدلالات دور دراز کر کے کسی نہ کسی سند سے متعلق کر دیتے تھے۔ یا کسی اصول عام کے جس کو خود اُنہیں نے قایم کیا تھا۔ تابع کر دیتے تھے۔ ان علما کے اقوال و استدلالات رفتہ رفتہ مدون ہونے لگے۔ جن کی بدولت کتب فقہ و اصول فقہ ہمارے ہاں پیدا ہو گئیں۔ اُس زمانہ میں تمام لوگ ان علما کے اقوال و استدلال کو ایک رائے سے زیادہ رتبہ نہیں سمجھتے تھے مگر رفتہ رفتہ ان علما کے اقوال بطور سند کے تصور ہونے لگے۔ اور پھر ایک زمانہ کے بعد وہی مذہب اسلام سمجھا گیا۔ اور شرع اُس کا نام ہو گیا۔ اور غیر مذہب والوں نے شرع محمدی اس کا نام رکھا اور جو نقائص اُس میں معلوم ہوئے اُس سے اسلام میں انہوں نے نقص سمجھے۔ حالانکہ اسلام اس سے بالکل بری ہے۔ اگر بالفرض تمام اجتہادات و استدلالات حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں نقص ثابت ہو جاوے تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں آتا۔ وہ جیسا خدا کے ہاں سے اترا ویسا ہی پاک صاف ہے ✦

سنہ ۱۲۹۶ھ

سر سید احمد

بھٹیارہ - میاں آیا ؎

مسافر- بھائی یہاں تو ٹپکا لگا ہوا ہے ؎

بھٹیارہ - میاں آجکل ٹپکے کی نہ کہو۔ بڑے بڑے اسٹیشنوں میں لگا ہوا ہے ؎

مسافر- ایک چارپائی تو لاؤ ؎

تھوڑی دیر میں ایک چارپائی آئی جس کے ڈوٹے پھوٹے بان بھیگ کرتن گئے ہیں۔ کمان نکلا ہوا۔ دو پایہ اونچے دو نیچے بھٹیارہ نے لاکر بچھائی۔ اور ایک ہاتھ سرہانے کے پایہ پہ دوسرا پائنتی کے پایہ پر رکھ کر زور کیا تو ایک چرا گا ہوا اور پائے کھٹ سے بیٹھ گئے ؎

بھٹیارہ - میاں دو پیسے ہونگے ؎

بھئی اچھا۔ آخر مجبوراً سی پر میلا ہوا بچھونا بچھا کر لیٹ رہا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی۔ کچھ نیند آگئی۔ رات کے دو بجے ہونگے کہ گرج کی آواز سے آنکھ کھلی۔ بجلی چمکی۔ اور موسلا دھار پانی پڑنے لگا۔ ٹپکا شروع ہوا۔ کبھی چارپائی کو ادھر کبھی اُدھر کھینچا۔ عورتوں سے سُنا کرتے تھے۔ تلے دھار اوپر دھار اور سوچتے تھے کہ یہ کیا محاورہ ہے۔ آج معلوم ہوا کہ شاید اسی موقع کو کہتے ہوں گے۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی۔ بارش ذرا تھم گئی تھی۔ مسافر غریب نے اپنی راہ لی ؎

باقر علی داستان گو

حضرت نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالبؔ کا خط

میر مہدی کے نام

سید صاحب کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو - میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں - حال سفر کا جو کچھ ہے ان کی زبانی سن لوگے میں کیا لکھوں - میں نے بھی جو کچھ سنا ہے انہیں سے سنا ہے - ان کا اسطرح نا کام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے - لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے - میں جانتا تھا - کہ وہاں کچھ نہ ہوگا - سو روپئے کی ناحق زیر باری ہوئی چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسہ پر ہوئی تو مجھے شرمساری ہوئی - میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں - جہاں ہزار داغ ہیں ایک ہزار ایک سہی میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے - وبا کو کیا پوچھتے ہو - قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا - قتل ایسا عام - لوٹ ایسی سخت - کال ایسا پڑا - وبا کیوں نہ ہو - لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا :-

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۰ھ ہجری کی بات غلط نہ تھی - مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لایق نہ سمجھا - واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی - بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا

کلیات اردو کا چھاپہ تمام ہوا ؎

اغلب کہ اسی ہفتہ میں غایت اس مہینے میں ایک نسخہ بہ سبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر - اگر ڈول بن گیا - تو وہ بھی چھاپا جائے گا - قاطع برہان کے خاتمہ میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں - اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا - مگر یہ خیال محال ہے - میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے - وَاللہ علیٰ کلِّ شئیٍ قدیر - خدا کا بندہ ہوں - علی کا غلام - میرا خدا کریم - میرا خداوند سخی - علی دارم چہ غم دارم - وبا کی آنچ مدھم ہوگئی ہے - پانچ سات دن بڑا زور وشور پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلی میں آیا - کل رات کو اس کا نو برس کا بیٹا ہیضہ کرکے مرگیا - اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون - اور میں بھی دبلا ہے الکزنڈر ہیڈرلے مشہور یہ الکہ صاحب مرگیا - واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور بزرگی خو اور مزاج میں اور مجھ میں متوسط تھا - اسی جرم میں ماخوذ ہو کر مرا - خیر یہ عالم اسباب ہے - اس کے حالات سے ہم کو کیا ؎

(غالبؔ)

جادو

از جناب خان بہادر سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گوجرانوالہ

دنیا میں اگرچہ بعض باتیں اعتقادی رنگ میں کسی وقت ایک وسعت سے مانی جاتی ہیں۔ اور اس زمانہ میں اُن کی ویسی شہرت نہیں مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ اُن کی ہستی پائی ہی جاتی ہے —— کتابوں میں ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے لوگ بھی اس کے مؤید اور مصدق بیان کئے جاتے ہیں یہ فقرہ مشہور ہے :-

"جادو برحق کرنے والا کافر"

کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس میں کسی نہ کسی رنگ میں جادو کی شہرت یا ذکر نہ ہو بعض زمانوں میں جادو کی بابت اسقدر شہرت تھی کہ عدالتوں میں لوگ نالشی ہوتے تھے کہ فلاں جادوگر نے اُس پر یا اُس کے رشتہ دار پر جادو کر دیا ہے ؛

باوجود اس کہ اس زمانہ میں عقل و فراست کی اسقدر وسعت اور شہرت ہے - پھر بھی جادو کے قائلین کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں۔ یورپ میں بھی باوجود اس ادعائے عقل و فراست اور تہذیب کے بھی اس کے معترف موجود ہیں اگرچہ یورپ کی عورتوں میں تعلیم کی ترقی ہے۔ مگر پھر بھی جادو اور منتر یا فسوں کی اُن میں سے اکثر گرویدہ ہیں اور یہ اعتقاد رکھتی ہیں کہ جادو اور منتر میں ایک طاقت ہے۔ اکثر ایسے شعبدہ باز اور جادوگر ایسے معتقدوں سے ٹکے بٹور لیتے ہیں۔ لنڈن اور پیرس کی گلیوں میں بھی یہ تماشے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگرچہ لندن اور پیرس میں بہت سے لوگ ایسی کہانیوں کی تردید اور تکذیب بھی کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی بعض لوگ اعتقاد رکھتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ یورپ کے ممالک اور اقوام میں خصوصیت سے سحر اور جادو کی گرم بازاری روکنے کی خاطر بہت کچھ کشت و خون بھی روا رکھے گئے - پھر بھی ایک مدت تک یہ ٹوٹکا چل ہی گیا - اگرچہ علمی رنگ میں جادو نے وہ جگہ نہیں لی جو دیگر علوم اور فنون کو ملی ہے اور خصوصاً آج کل کے دور میں تو اُس کی جگہ بہت ہی پیچھے رکھی گئی ہے۔ مگر پندرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے کہ یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ جادو ہے۔ انجیل نے صاف طور پر اس کی اصلیت کو تسلیم کیا ہے۔ اور مختلف ادبیات کے تحت اس کی حقیقت اور رواج پر روشنی ڈالی ہے ؛

پادریوں نے خاص طور پر اس کو روکا اور بعض وقت اہل سیاست نے بھی اس کی مزاحمت کی۔ اکثر مواقع میں اس کی تحقیق کی گئی اور جن جن پر یہ الزام ثابت ہوا۔ اُن کو سزا دیجاتی رہی ؛

اس طریق اور اس مزاحمت سے ثابت ہے کہ خاص خاص لوگ بھی۔ اس کی حقیقت کا اعتراف کرتے تھے۔ اور چونکہ اُس کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے تھے اس واسطے اُس کے اثر سے بچنے کے لئے اُس کی ہر ایک رنگ میں مزاحمت بھی کرتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو جادو کا یقین نہ ہوتا۔ اور اُن کے خیال میں وہ اسکی حقیقت محض وہم ہی خیال کرتے۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس سے یوں مقابلہ آرا ہوتے ؛

اس میں کچھ شک نہیں کہ محض تخویف اور خیالات کا پریشان کرنا بھی ایک جرم ہو سکتا ہے۔ مگر جسقدر کشت و خون اس نام سے ہوتا رہا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ اُن لوگوں کو خصوصیت سے اُس کا اعتراف تھا اور وہ اس سے ڈرتے بھی تھے ؛

جرمنی کے ہر ایک صوبہ میں جادوگروں کی تخریب اور تعذیب و تعزیر پر زور دیا جاتا رہا۔ صرف ٹریوسی میں ہی ایک دفعہ سات ہزار آدمی جلائے گئے ہمبرگ کے صرف ایک اسقف نے اس جرم میں چھ ہزار آدمی جلائے۔ واٹربرگ کے کلیسا نے ایک سال میں نو ہزار آدمی جلائے۔ ملک فرانس میں۔ پیرس۔ ٹولو بورڈو۔ ریمز وغیرہ پارلیمنٹوں نے بوجہ نقصانات کے اعتراف کی ڈگریاں دیدیں؛

ٹولو میں جو محکمۂ احتساب کا صدر مقام تھا ایک ہی وقت میں چارسو۔ اور ڈوے نے ایک ہی سال کے اندر پچاس آدمی قتل کئے گئے۔ رمی کے جج بنیس کو اس بات پر فخر تھا کہ سولہ سالہ کے عرصہ میں اُس نے ۸۰۰ آدمی مروا دیئے۔ پیرس میں چند مہینوں کے اندر اسقدر لوگ پھانسی دئے گئے کہ ایک مصنف اُس کو لاتعداد بیان کرنے پر مجبور رہا ہے۔ جو لوگ بھاگ کر اسپین چلے گئے ان کو وہاں کے محکمۂ احتساب نے گرفتار کر کے جلا دیا۔ ۱۸۰۰ء میں بھی ایک جادوگر کو جلایا گیا ؛

مسٹر ٹارکومیڈا نے جادو کی بیخ کنی پر ایک کتاب بھی لکھی ہے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کیسا بڑا جرم ہے +

اٹلی کے صوبہ کوتو میں ایک ہی سال کے اندر ایک ہزار آدمی پھانسی دیئے گئے۔ جنیوا میں جہاں ایک اسقف اُس وقت حکمراں تھا۔ تین ماہ میں پانچسو جادوگرنیاں پھانسی دی گئیں +

کانسٹنس میں اڑتالیس کو جلایا گیا۔ صوبہ سپوری کے شہر دیلائی میں اسّی جادوگرنیاں جلائی گئیں ۱۶۰۴ء میں بمقام سیوتن کی ستّر جادوگرنیاں گرفتار ہوئیں +

کلیسائے روم نے ہر ایک ممکن طریقہ سے جادو اور جادوگروں کی بیخ کنی اور روکنے کے وسائل استعمال کئے۔ جو تشدد آمیز بھی تھے۔ لوگوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ کسی جادوگر کو پناہ دینا براہ راست خدا کی ہتک کرنا ہے +

سال ۱۴۸۴ء اور ۱۵۰۴ء انوسینٹ جولین ثانی اور سال ۱۵۲۲ء میں ایڈرین ششم نے ایسے احکام صادر کئے۔ جن میں جادو کی ہستی کو تسلیم کرکے مزاحمت اور روک کی گئی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی اُس وقت تسلیم کیا جاتا تھا کہ جادو اور طلسم گویا کلیسائی تعلیم کا ایک حصہ ہے۔ ان سزاؤں اور تنبیہات کا یورپ میں رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ لوگ جادوگری کے ادعا سے تو ترک گئے لیکن ایک دوسری صورت پیدا ہوگئی وہ یہ کہ ارواح خبیثہ کا وجود تسلیم کیا گیا۔ یہ عقیدہ مذہبی رنگ میں بھی مانا گیا۔ کیونکہ انجیل شریف میں ارواح خبیثہ اور مسیح کے کہنے سے اُن کا نکلنا ایک الہامی کہانی تسلیم کی گئی ہے +

جہاں جہاں مذہب مسیحی گیا وہاں یہ کہانی بھی ساتھ لیتا گیا ۔ ۱۶ویں صدی کے بعد ارواح خبیثہ کے ماننے میں بھی اشتباہ پیدا ہونے شروع ہوگئے اور لوگوں کو یہ پتہ لگتا گیا کہ اس مسئلہ کے اعتقادات کی اصلی وجوہ کیا کچھ ہوتی ہیں +

اس مضمون میں ہم یہ بحث نہیں کرینگے کہ جادو یا سحر کی اصلی حقیقت کیا ہے۔ یہ کسی اور قسط پر چھوڑتے ہیں۔ صرف یہ کہیں گے کہ سحر اور جادو کا خیال ہر مذہب میں ہی نہیں بلکہ اُن گروہوں اور اُن قوموں میں بھی پایا جاتا رہا ہے۔ جو وحشی تھیں۔ ہندو مذہب میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے۔ اور مذہب اسلام میں بھی یہ تذکرہ آیا ہے۔ یورپ میں بھی اور ایشیائی جرگوں میں بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایشیائی حلقوں یا ایشیائی قوموں میں جادوگروں پر وہ سختیاں نہیں ہوئیں جو یورپ میں وقتاً فوقتاً کی جاتی رہی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ ایک طرف ایسا تشدد کرنے والے یا قاتل خود بھی جادو اور سحر کا اعتراف کرتے تھے۔ اور اُس کی حقیقت کے قائل تھے اور پھر بھی وہ جادوگروں کو قتل کراتے تھے۔ یہ طریق عمل سخت حیرت خیز ہے۔ ایک طرف تعلیم کلیسائی کا ایک حصہ جادو قرار دیا جاتا تھا۔ اور دوسری طرف جادوگروں کو مروایا بھی جاتا تھا +

مذہب اسلام کے شروع میں اور خود بانیٔ اسلام کے عہد مبارک میں جادو اور جادوگروں کے چرچے مختلف رنگوں میں ہوتے تھے۔ مگر کبھی جادوگروں پر وہ سختیاں نہیں کی گئیں جو یورپ میں بہ عہد سابقہ کی جاتی رہیں۔ اس سے پتہ لگ سکتا ہے کہ اسلام باوجود ایک قسم کی نفرت اور مخالفت کے بھی ایسے لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا تھا۔ اور اس قسم کے خیالات کے روکنے کے واسطے وہ کس قسم کے آلات سے کام لینے کا عادی تھا۔ باوجودیکہ انجیل میں ارواح خبیثہ کا ذکر ہے پھر بھی اُن لوگوں کو تنگ کیا جاتا تھا۔ جو ارواح خبیثہ کے قائل تھے۔ اسلام جادو اور جادوگر کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا اور اس قتل کو کسی حالت میں بھی جائز اور مشروع قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اُن کی مذمت کرتا ہے۔ اور ایک فعل شیطانی قرار دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے اس قسم کی سختیاں بھی جائز نہیں رکھتا +

بعض اوقات خود بزرگان اسلام کو یہ کہا گیا کہ فلاں شخص آپ پر جادو کرتا ہے۔ اس پر بھی اُس کے قتل کا حکم نہیں دیا گیا۔ اسلام کی تعلیم ہی کی بدولت لوگ رفتہ رفتہ اس قسم کے خیالات سے تائب ہونے لگے۔ یورپ میں ہزاروں قتل ہونے پر بھی وہ اثر نہ ہوا۔ اس سے خیال کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم اسلام میں کیا کچھ طاقت اور کیا کچھ کشش ہے۔ اور وہ کہاں تک بردبار بھی ہے۔ جادوگری ایک عمل ہے۔ اور جو لوگ اس کے عامل ہیں۔ وہ گویا اپنے نقطۂ خیال سے ایک عمل یا چند الفاظ کے ذریعہ سے دوسرے پر وار کرتے یا دوسرے کے دماغ اور ضمیر پر اثر ڈالتے ہیں۔ دوسری طرف اُن کے ایسے تصرفات کو وہم بھی خیال کیا جاتا ہے۔ بایں حالات اُن کے قتل پر زور دینا ایک بزدلی ہے کیوں ایسی تعلیم پیش نہ کی جائے جو اُن کے واسطے علمی رنگ میں ایک تبر ثابت ہو اور وہ ان مزخرفات سے رفتہ رفتہ رُک جائیں۔ اشاعت اسلام کے شروع میں ہی عرب کے اندر بھی جادو کا چرچا تھا۔ اسلام اور بانیٔ اسلام نے یورپ کی طرح جادوگروں کے قتل یا اُن پر تشدد کا زور نہیں دیا +

یہ کہکر اُس کی اشاعت اور اُس کے عملیات کو بہ اسلوبی روک دیا کہ

"وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ" "وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ"

ان چند کلمات نے اسلامی دنیا پر وہ اثر کیا کہ کبھی کشت و خون کی ضرورت پڑی اور نہ کسی سخت گیر قانون کی۔ اور جادوگری کا خیال بھی رفتہ رفتہ معدوم ہوتا گیا +

سلطان احمد

ہیرامن توتا

از جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر

ہمارے شاعروں نے بلبل اور پپیہے وغیرہ کی نغمہ سنجی وشوریدہ بیانی پر تو اپنے پرسوز کلام میں جابجا فائدہ اٹھایا۔ مگر سرخ رُو و زمرد پیرہن توتے کی طرف کبھی توجہ نہ کی جو پری جمال مہ جبینوں کا پرانا انیس صحبت اور سچا ہمدم و ہمراز ہے۔ جو لوگ سگِ لیلیٰ کے دلدادہ ہوں اُن سے اتنی بڑی اہم فروگذاشت قابلِ معافی نہیں ہوسکتی +

توتا اور مینا دونوں حسینوں کے پیارے مصاحب اور محفل جاناں کے زبان آور و بذلہ سنج قدیم ہیں۔ مگر بہشتی خلعت پہننے والے توتے کو دلدار نازآفریں کی ہم صحبتی کا جسقدر موقع ملا ہے۔ بھولی بھالی سیہ پوش مینا کو نہیں نصیب ہوا۔ ہندوستان کی مشہور و معروف مہوش پدماوت کا سب سے بڑا ہمدم و ہمراز اور دلداری کرنے والا مصاحب وہ عجیب غریب توتا تھا جس کے لئے پہلے پہل "ہیرامن" (جواہر طبع) کا خطاب تجویز کیا گیا۔ اور جس کی برکت سے اُس کی ساری نوع یعنی ہر توتے کا نام "ہیرامن" قرار پاگیا +

اور توتے تو فقط سُنے سُنائے فقرے زبان سے ادا کردیا کرتے ہیں مگر ہیرامن کو خدا نے زیور عقل سے اسقدر آراستہ کیا تھا کہ پدماوت سے بے تکلف باتیں کرتا۔ اُس کی سنتا۔ اپنی کہتا۔ اور مشکل معاملوں میں مشورہ دیتا۔ اسیقدر نہیں۔ اس توتے نے چتوڑ کے راجہ رتن سین کے ساتھ اُسکی نسبت ٹھہرائی۔ عالم حسن وعشق کا نامہ بر بنا۔ محبوب کا سفیر بن کے گیا۔ اور جواب لایا جن واقعات کو بھاکا کے جادو بیان شاعر ملک محمد جائسی اپنی منظوم کتاب پدماوت میں تفصیل وتشریح سے بیان کیا ہے +

اس توتے کے حالات کو اکثر لوگ ایک بے بنیاد کہانی خیال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر توتے کی گفتگو میں اکثر سمجھ اور ارادہ پایا گیا ہے۔ اور بعض اوقات اُس نے ایسی ہوش وحواس کی باتیں کیں کہ سننے والے دنگ رہ گئے۔ چنانچہ تاریخ گجرات "مرآۃ سکندری" میں مذکور ہے کہ دولت مغلیہ کے نامور شہنشاہ ہمایوں نے گجرات کے فرمانروا بہادر شاہ پر فوج کشی کی تو قلعہ جانپانیر کا محاصرہ کیا جو بہادر شاہ کا مستقر اور اُس کی قلمرو کا سب سے زبردست قلعہ تھا۔ اور سلطان بہادر کا معتمد علیہ سپہ سالار اور میر آتش یعنی ناظم توپخانہ رومی خان ہمایوں سے مل گیا۔ اور اپنی سازش سے قلعہ پر مغلوں کا قبضہ کرادیا۔ فتح کے بعد جب وہاں کا مال غنیمت ہمایوں کے دربار میں پیش کیا گیا تو اُس میں ایک زبان داں توتا بھی تھا۔ جو آدمی کی طرح باتیں کرتا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا۔ سلطان بہادر اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھتا تھا۔ شاہانہ اہتمام سے اُس کی داشت کی جاتی اور خلوت وجلوت میں ہر گھڑی فرمانروائے گجرات کا مونس وہمدم رہتا۔ جب وہ ہمایوں کے سامنے پیش ہوا اور اُس کی صفت بیان ہورہی تھی کہ چوبداروں نے عرض کیا "رومی خاں حاضر ہے" اُسے باریابی کی اجازت دی گئی۔ اور جیسے ہی وہ تخت شاہی کے سامنے آداب بجالایا۔ توتے نے اُس کی صورت دیکھتے ہی کہا "پھٹ پاپی رومی خان نمکحرام" توتے کے اس کلمے کے ساتھ ہی رومی خاں کی آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔ سارا دربار متحیر ہوگیا۔ اور ہمایوں نے کہا "رومی خاں چکنم کہ جانورست ورنہ زبانش می بریدم" یعنی رومی خاں کیا کروں مجبور ہوں کہ یہ جانور ہے ورنہ اس کی زبان کاٹ لیتا +

توتے کی زبان آوری وزبان دانی کے صدہا قصے ہماری صحبتوں میں مشہور ہیں جن میں چاہے کسیقدر مبالغہ ہو۔ مگر اصلیت سے خالی نہیں ہیں خود ہمارے گھر میں ایک توتا تھا جس کا پنجرا دروازے کے قریب لٹکا رہتا جہاں دروازے پر کسی فقیر نے صدا لگائی۔ وہ بے تکلف کہہ دیا کرتا "شاہ جی بیٹھ جاؤ" فقیر کسی چھوٹے بچے کی آواز خیال کرکے اُس قسم کی دعائیں دینے لگتا جیسی کہ بچوں کو دی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہی یہاں کے ایک اور معمولی توتے کا واقعہ ہے۔ کہ گھر کے تمام لڑکے ایک محترم بزرگ خاندان کو "بابا" کہا کرتے۔ توتا بھی اُن کو بابا کہنے لگا۔ ایک دن اُس کا پنجرا بالاخانے پر لٹکا ہوا تھا کہ ایک بڑا بھاری بندر آکے اُس کے پنجرے کو اُٹھالے چلا۔ ساتھ ہی توتے نے غل مچایا

"ارے بابا! ارے بابا!" سب کو خبر ہو گئی اور پنجرا بندر کے ہاتھ سے چھینا گیا۔

یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ توتا فقط بولیاں نہیں سیکھتا۔ بلکہ بعض اوقات اس میں اتنی عقل آجاتی ہے کہ سمجھ کے بات کا جواب دینے لگتا ہے۔ یا اپنی سیکھی ہوئی بولیوں کو ٹھیک موقع اور صحیح محل پر استعمال کرنے لگتا ہے۔

انگریزوں میں بھی ہمارے یہاں کی طرح توتے کے باتیں کرنے کے صدہا واقعات مشہور ہیں۔ چنانچہ رابنسن کروسو کے افسانے میں جو بعض لوگوں کے نزدیک تاریخی واقعہ ہے۔ ایک توتے کی باتوں کا ذکر ہے۔ جس نے غربت و بیکسی میں اُس کی مدد کی تھی۔

اسی وجہ سے یورپ کی مہ جبین دلربائیں بھی توتے کی دلدادہ ہیں۔ دربارِ حُسن میں توتے نے اپنی باتوں سے ایسی خصوصیت حاصل کر لی ہے کہ ہر پریجمال نازنیں کا محبوب دوست اُس کا توتا ہی ہوا کرتا ہے۔ فسانہ عجائب ایک فرضی قصّہ ہے اور اُس میں داستان کا آغاز توتے ہی سے ہوا ہے جانعالم نے ایک بولتا توتا مول لیا۔ گھر میں لایا۔ اُس کی ملکہ نے اپنے حُسن پر ناز کیا۔ توتے نے اُس کے حُسن کی مذمت کر کے ایک دوسری مہ جبین انجمن آرا کے حُسن کی تعریف کی اور جانعالم کو اُس کا عاشق بنا کے دیوانہ بنا دیا۔

اس قصّے میں توتے کا خیال غالباً پدماوت کے واقعے سے لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی حسن و عشق کے عالم میں توتا کیا چیز ہے۔ اور حسینوں کے ساتھ اُسے کیسی خصوصیت ہے۔ اسی کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ جس طرح ہندوستانی دیومالا میں حسین دیویوں کے خاص خاص شعار اور باہنے مقرر کر دیئے ہیں۔ مثلاً کسی دیوی کا شعار مور ہے کسی کا شعار یہ ہے کہ ہاتھی اُس پر ہاتھ چڑھا رہا ہے۔ اُسیطرح یہاں کی عام دلربا نازنینوں اور پری وش مہ جبینوں کا شعار اور باہنا اکثر توتا قرار پا گیا ہے۔ اگلے مصوروں نے اگر کسی معشوق کی تصویر بنائی ہے۔ تو اُس کے پاس ایک توتا بھی بنا دیا ہے جس سے باتیں کر کر کے وہ خوش ہو رہی ہے۔ عشرت کدۂ ناز میں وہی اس کا دل بہلانے والا اور مونسِ تنہائی ہے۔ اور اُسی پر اُس کے دل کے جذبات آشکارا ہوتے ہیں۔

محبوبوں کے ایسے رفیق و انیس کی طرف سے حسن پرست شاعروں کا اسقدر غافل ہو جانا بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا وہ اُسے اپنا رقیب سمجھے؟ ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لئے کہ رقابت کا وہم ادنیٰ ادنیٰ چیزوں اور معمولی باتوں پر ہو جایا کرتا ہے۔ دل اسکو مشکل سے گوارا کرتا ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں وہ کسی اور کی طرف متوجہ ہو۔ یا کسی دوسرے سے باتیں کرے لیکن ایسا تھا بھی تو توتے کی شکایت کیا کرتے۔ ہمارے عاشق مزاج رقیب سے جلتے ہیں۔ اور جلنے ہی کی وجہ سے اُس کی شکایتوں کا دفتر کھول دیا کرتے ہیں۔ مگر توتے کی رقابت میں کیا خصوصیت ہے کہ اُس کا نام بھی نہیں لیا جاتا۔

غرض ہمارے نزدیک اس کی کوئی صحیح توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اور دراصل عاشقانہ شاعری کی یہ بڑی فردگذاشت ہے۔ لہٰذا ہمارے شعرا کو چاہئے کہ اپنی اس غلطی کا اعتراف کریں۔ اور آیندہ توتا مضامینِ حسن میں ضرور شامل کر لیا جائے۔

توتا علاوہ حسینوں کا محرمِ راز ہونے کے خود بھی حسن کا ایک مکمل نمونہ ہے اُس کی سُرخ یاقوت کی سی چونچ جو پری جمالوں کی ناک کے مشابہ ہے۔ کسقدر خوبصورت ہے؟ اسکی نازک اندامی کیسی دلکش ہے؟ اور پھر اس نزاکت پر اُس کا بہشتی سبز حلّہ جو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خاص جنّت سے حوروں کے ہاتھ سے سیا ہوا جوڑا پہن کے دنیا میں آیا ہے اور جنّت سے نہیں آیا تو کسی ناز آفریں و شوخ طبع محبوبہ نے اُسے اپنا دھانی دوپٹہ اُڑھا دیا ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اس نازک اندام و خوش جمال طائر کو بجائے خود ایک محبوب دلربا ثابت کر رہی ہیں۔

عبدالحلیم شرر

نیرنگِ خیال کا افسانہ نمبر

دسمبر میں نیرنگِ خیال کے سالنامہ کے علاوہ نیرنگِ خیال کا دسمبر نمبر بھی شائع ہوگا۔ جو مستقل خریداروں کو حسبِ دستور مفت بھیجا جاتا ہے۔ اس نمبر میں کم از کم پچیس دلچسپ افسانے ہوں گے۔ جو مشرق اور مغرب کے مشہور افسانہ نگاروں کے شاہکار ہونگے۔ ناظرین دلچسپی سے انتظار کریں۔ مینجر

حضرت امیر احمد صاحب امیر مینائی کا خط

فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کے نام

بندہ نواز بسلام نیاز

ایک تحریر آپ کی تحریر کے جواب میں بھیج چکا ہوں۔ امید ہے۔ کہ اس کا جواب آتا ہوگا۔ آج حمید آپ کا ملازم قدیم میرے پاس آیا۔ مجھے اس کے دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آگیا۔ جب آپ یہاں تھے۔ اور اس یاد کی لذت میں۔ میں نے اسے گلے لگایا۔ اور اس کی آنکھوں کو جن سے وہ دس بارہ دن پیشتر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا کرتا تھا۔ میں دیر تک حسرت کی نگاہ سے دیکھا کیا۔ اور بار بار آپ کے حالات اور ضبط اوقات کے کیفیات پوچھا اور سنا کیا۔ اثنائے سخن میں معلوم ہوا کہ آپ کے داماد جن کا نام مجھے اسوقت یاد نہیں ہے۔ انھوں نے قضا کی۔ ان کی جواں مرگی اور اس نوعمر دختر نیک اختر کی بیوگی کے صدمے نے میرے دل کو چور کر دیا۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔ کے سوا اس داغ کا کوئی مرہم نہیں۔ اس لئے کہ آج وہ نہیں کل ہم نہیں۔ اللہ تعالے آپ کو اور اس بیوہ اور سب اعقاب کو صبر و جزائے صبر عنایت فرمائے۔ اور اس وقت کیا لکھوں۔ بارگاہ ارحم الراحمین میں رحم کی التجا کرتا ہوں۔ اپنے اور آپ کے اور سب عزیزوں۔ دوستوں کے واسطے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ اس کی رحمت سے امید ہے کہ بگڑے کام دین و دنیا کے سب بن جائیں۔

پیارے داغ! افسوس کہ میں نے حمید سے کوئی ساعت آپ کی خدا کی طرف مشغولی کی نہ سنی ہیں نے حدیث میں دیکھا ہے۔ کہ قیامت کے دن ہر شخص کی عمر کی ساعتیں فی ساعت ایک خزانے کے طور پر اس کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ کسی ساعت کے خزانے کو تو وہ دیکھنے والا گونا گوں انوار سے لبریز دیکھے گا۔ اور ایسا خوش ہوگا کہ اگر اس خوشی کو دوزخیوں پر تقسیم کر دے تو دوزخی عذاب نار سے بے خبر ہو جائیں۔ پھر دوسرے خزانے کا دروازہ کھلے گا۔ اس میں نری ظلمت و عفونت ہوگی۔ کہ اس کو اس سے سخت نفرت ہوگی اور ایسا مغموم ہوگا کہ اگر اس غم کو اہل جنت پر تقسیم کر دے۔ تو جنتی لوگ دوزخیوں کی طرح بے چین ہوں گے۔ پھر ایک تیسرا دروازہ تیسری ساعت عمر کا کھلے گا۔ وہ بالکل خالی ہوگا نہ اس میں نور ہوگا۔ نہ ظلمت نہ خوشبو ہوگی۔ نہ عفونت۔ اس کو دیکھ کر اس کو نہایت حسرت ہوگی۔ الغرض اس حدیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کی دولت عمر ہے اور عمر کی ہر ساعت ایک خزانہ۔ ساعت طاعت و عبادت وہ خزانہ ہے جس میں انوار نظر آئے۔ اور ساعت معصیت وہ خزانہ ہے جس میں ظلمت اور عفونت کا ذکر ہوا۔ اور جو ساعت عمر طاعت و معصیت دونوں سے خالی تھی۔ اس کا خزانہ خالی دیکھا گیا۔ جس کے رائگاں ہونے کی حسرت ہمیشہ رہے گی۔ اے میرے اللہ مجھ ناصح بے معنی کو جو خود فضیحت ہے۔ اور داغ کو نصیحت کر رہا ہے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے مرضیات میں کوشش کی توفیق دے۔ اور میرے سب عزیزوں۔ دوستوں کی عمروں کا خزانہ بھی اپنے انوار رحمت سے بھر دے آمین۔ پیارے داغ میرے لکھنے کا برا نہ ماننا۔ خوشامد کرنے والے تمھارے سیکڑوں ہیں۔ ملامت کرنے والوں میں ایک مجھ ہی کو رہنے دو۔ یہ میرا خطاب تمھاری طرف ہے۔ مگر در حقیقت اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں بڑھاپے میں کچھ منعم حقیقی کی نعمتوں کا شکر ضرور کرنا چاہئے۔ خلق کے حق میں بھلائی کرنا بڑا عمدہ شکر ہے۔ اس سے بھی قلم زبان دل کبھی نہ رکے فرزندان فقیر اور جملہ عزیزان و احباب تسلیم گذارتے ہیں۔

(امیر فقیر۔ یکم اگست سنہ ۹۲ء)

فسانۂ آزاد:—

ایک چور کو شاہ جی کا نسخہ

از پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار

ایک ذات شریف ایسے بھی نازل ہوئے جنہوں نے شاہ جی کا ناک میں دم کر دیا۔ یہ حضرت بڑے نامی گرامی چور تھے۔ شاہ جی سے کوئی بچاس بار درخواست کی کہ حضور واسطے خدا کے کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ جس کسی کے ہاں چوری کرنے جاؤں اس کو نظر نہ آؤں۔ شاہ جی نے سمجھایا کہ میاں ہمارے پاس ایسا نسخہ ہی نہیں۔ ہم تم کو کیا دیں۔ اُس نے ایک نہ مانی۔ نصیر شاہ جی نے جب دیکھا کہ ہاری مانتا ہے نہ جیتی۔ تو کہا اچھا۔ جس روز کسی کے گھر پھاندو ہم سے شام کو ول لینا۔ ہم ایک بوٹی دیں گے۔ چور انتہا کا خوش ہو کر ما لیا۔ بس اب کیا پوچھنا ہے۔ حسن آرا کا مکان تاکا اور مال دار سمجھ کر دل میں ٹھان لی کہ آج شب کو انہیں کے ہاں چلنا چاہیئے۔ رقم کثیر ملے گی۔ پو بارہ ہیں۔ شام کو شاہ جی کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت آج ایک گھر پھاندنے کی نیّت ہے۔ لائیے پھر کچھ بوٹی ووٹی دلوائیے۔ شاہ جی نے ایک ڈبیہ دی اور کہا کہ اس میں بوٹی ہے۔ مگر خبردار جبتک مال کے کوٹھے میں نہ پہنچ لو۔ ہرگز قصد نہ کرنا کہ اس کو کھولو۔ جس وقت وہاں داخل ہو جاؤ۔ ڈبیہ کو کھول کر بوٹی کو نکالو اور خوب زور سے سونگھ لو۔ مگر چاہے تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ چار پانچ مرتبہ خوب زور سے سونگھنا سمجھے؟ ہاں اس کے خلاف نہ کرنا۔ چور نے ڈبیا جیب میں رکھی۔ اور کوئی گیارہ بجے کے وقت کمند ڈال کر کھٹ سے کوٹھے پر ہو رہا۔ خیر ایک گھنٹے تک تو کوٹھے پر جا کر دبکا بیٹھا رہا اس کے بعد جب سب سو گئے۔ تو حضرت دبے پاؤں اُترے۔ چپ چاپ اور اتفاق سے اسی کمرے میں گئے جن حسن آرا اور سپہر آرا سو رہی تھیں۔ جا کر سب کے پہلے تو لمپ کو گل کر دیا۔ بعد ازاں کوٹھری کا قفل توڑا۔ وہ دونوں غافل سوئی تھیں۔ پھر آپ جانئیے اُٹھتی جوانی کی نیند۔ قفل توڑ کر حضرت دن سے کوٹھری میں داخل ہو گئے۔ بسم اللہ کہہ کر وہاں ڈبیا نکالی۔ اور اُس میں سے بوٹی لی اور لے کر خوب زور سے سونگھی۔

حضرات ناظرین ذرا ہنسی کو ضبط کیجئے گا۔ کچھ سمجھے بھی۔ وہ بوٹی کیا تھی نک چھکنی۔ ارے اُف۔ غضب کیا واللہ۔ اچھیں آچھیں چھیں چھیں۔ ادھر حسن آرا خواب پریشان سے بیدار ہوئیں۔ اُدھر لمپ گل اور کوٹھری سے چھینک کی آوازیں آ رہی ہیں۔ حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ چور گھبرا کر کوٹھری سے نکلا۔ تب حسن آرا بیچاری کانپنے لگی کہ خدا ہی بچائے۔ چور کو اُس وقت اپنی ہی ناک کی پڑی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو ناک کاٹ کر پھینک دیتا۔ اتنے میں حسن آرا پلنگ پر سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور غل مچانے لگیں کہ چور۔ چور۔ چور۔ کانپتی جاتی تھیں اور غل مچاتی۔ سپہر آرا بھی ہائیں ہائیں خیر تو ہے کہتی ہوئی اُٹھ بیٹھیں۔ اور گھر بھر میں جاگ ہو گئی۔ لینا لینا۔ چور۔ چور۔ چور۔ آپ جانئیے ایک ہی اُستاد لپک کر وہ ہو رہا۔ دروازہ کھولا۔ اور تڑک کر پھاٹک کے باہر۔ چوکیدار اور خان صاحب اور دربان سب پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ مگر اس کے سایہ کو بھی نہیں پاتے۔ لیکن دس قدم بڑھا اور آچھیں۔ وہ جاتا ہے وہ جاتا ہے۔ چور بے تحاشا بگٹٹ بھاگا جاتا تھا۔ مگر چھینک آئی اور لوگوں نے غل مچایا کہ وہ ہے وہ ہے۔ پھر نظر سے غائب۔ تھوڑی دور تک جھپٹ کے نکل گیا اور پھر چھینکا وہ گیا۔ وہ گیا۔ لینا لینا۔ آخرکار ایک مقام پر اس چھینک نے دھروا ہی دیا۔ پکڑے گئے حضرت۔ لوگ گرفتار کر کے تھانے پہلے جاتے تھے کہ اتنے میں کانسٹبل ملا اور چوکی پر لے چلا۔

چور اپنے دل میں سوچتا جاتا تھا کہ بھئی واہ اچھے شاہ صاحب ہیں۔ ماشاءاللہ کیا اچھی بوٹی دی ہے۔ ناک نے اس وقت ناک میں دم کر دیا۔

رتن ناتھ سرشار

علم کی حقیقت

از حضرت مولانا شبلی نعمانی

علوم جدیدہ کے مسائل بعض ایسے ہیں جو بالکل حال کی ایجاد ہیں۔ اگلے زمانہ میں ان کا نام ونشان تک نہ تھا۔ بعض ایسے ہیں جو پہلے بھی موجود تھے لیکن آج ان کی تشریح جس طرح کی جاتی ہے۔ اگلوں نے نہیں کی تھی۔ اس سلسلہ کی ابتدا ہم پہلے اسی قسم کے ایک مسئلہ سے کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے قدیم وجدید کے موازنہ کا موقع بخوبی مل سکتا ہے +

علم کی حقیقت یونانیوں نے یہ بیان کی تھی کہ کسی چیز کی صورت جو ذہن میں حاصل ہوتی ہے اُس کا نام علم ہے۔ اس کے متعلق حصولی، حضوری، حصول اشیا بانفسہا اور باشباہہا کی طویل طویل بحثیں تمام متداول کتابوں میں مذکور ہیں +

حکمائے حال نے علم کی جس طرح تشریح کی ہے اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

انسان کو خدا نے مختلف حواس دیئے ہیں اور ہر حواس کے مدرکات جدا ہیں۔ قوت سامعہ صرف آواز کو محسوس کرتی ہے۔ اجسام یا رنگ اور خوشبو وغیرہ کو ادراک نہیں کرسکتی۔ شامہ آواز صورت کا احساس نہیں کرسکتی +

اکثر چیزیں مختلف چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ جو مختلف حواسوں سے محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً شہد میں لزوجیت ہے جس کو لامسہ محسوس کرتا ہے۔ رنگ ہے جو آنکھ سے محسوس ہوتا ہے۔ خوشبو ہے جس کو شامہ سے تعلق ہے۔ وزن ہے جس کا ادراک لامسہ کی استعانت سے ہوتا ہے +

جب ہم کسی چیز کو مختلف حواس سے محسوس کرتے ہیں تو جو کیفیتیں محسوس ہوتی ہیں وہ ہمارے حافظہ کے خزانہ میں جمع ہوتی ہیں۔ اب ان میں سے جب کسی ایک کا احساس ہوتا ہے۔ تو اُس چیز کی باقی کیفیتیں ہم کو یاد آجاتی ہیں۔ مثلاً ہم نے کسی وقت شہد کو دیکھا چکھا اور سونگھا تھا۔ اس سے شہد کی نسبت ہمارے حافظہ میں تین کیفیتیں جمع ہوئیں۔ رنگ، مزہ، خوشبو۔ اب فرض کرو کہ ہم نے دور سے شہد کو دیکھا اور اُس کی خوشبو یا مزہ ہم کو محسوس نہیں ہوا۔ تاہم اس کا مزہ اور خوشبو خود بخود ہم کو یاد آجائیگی۔ اس بنا پر احساس اور ادراک کے متعدد مدارج ہیں +

(۱) محض احساس بالفعل مثلاً ہم ایک سیب کو دیکھ رہے ہیں (۲) احساس سابق اور احساس بالفعل دونوں۔ مثلاً ہم نے شہد کو دیکھا اور اُس کا مزہ جو پہلے ہم نے چکھا تھا اُس وقت یاد آگیا تو اس کی رنگت کا ادراک موجودہ احساس کے ذریعہ سے ہے اور مزہ کا ادراک گذشتہ احساس کی یاد ہے۔ (۳) محض تصور مثلاً ہم نے شہد کو کبھی سونگھا اور چکھا تھا۔ اب شہد ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن ہم کو یاد آگیا اور اس کے ساتھ اس کا رنگ، مزہ، خوشبو سب یاد آگئی۔ یہاں میں کوئی چیز موجود بالفعل نہیں۔ بلکہ احساس سابق کا تذکرہ ہے۔ اور اس لحاظ سے اس وقت ہم کو شہد کا محض تصور ہی تصور ہے +

یہاں یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ جو علم احساس بالفعل سے حاصل ہوتا ہے وہ قطعی اور یقینی ہے۔ جس میں گذشتہ احساس سے کام لینا پڑتا ہے وہ یقینی نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ گذشتہ احساس کی یاد میں ہم نے غلطی کی ہو۔ ادراک اور احساس کی نوعیت کے متعلق ایک عام غلطی کی جاتی ہے۔ کہ جب ہم مثلاً سیب کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ مجکو سیب کا علم ہوا تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ علم بدیہی ہے۔ کیونکہ بالذات حواس ظاہری کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سیب کا علم یہاں صرف حواس سے نہیں حاصل ہوا ہے حواس نے صرف رنگت اور شکل محسوس کی ہے۔ باقی اس کا مزہ اور خوشبو تو چونکہ اس کا احساس پہلے ہو چکا تھا اس لئے ہم نے قیاس کر لیا کہ جب صورت اور رنگ وہی ہے تو مزہ اور خوشبو بھی وہی ہوگی۔ اس لئے محسوس بالفعل صرف شکل اور رنگ ہے۔ باقی گذشتہ محسوس کی یاد ہے۔ اب جبکہ ہمارے سامنے سرے سے ایک شے موجود نہیں لیکن اس کے مختلف آثار ہم پہلے محسوس کر چکے ہوں۔ اور اس لئے اس کا خیال ہمارے ذہن میں آئے تو یہ تصور ہوگا۔ اس بناء پر تصور کی تعریف یہ ہوگی۔ کہ کسی شے سے گذشتہ احساسات کی یاد +

ان بیانات سے ثابت ہوگا۔ کہ تصور کی تعریف جو یونانیوں نے کی تھی

یعنی کسی شے کی صورت جو ذہن میں حاصل ہو وہ کئی لحاظ سے غلط ہے ◆

پہلی غلطی تو یہ ہے کہ ذہن یا عقل کوئی مادی شے نہیں جس میں صورت کا انعکاس یا انطباع ہو۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ تصور کے وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک حاصل شدہ صورت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ہمارے حافظہ میں بہت سے معلومات ہیں۔ جب ہم اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے اُن کا تصور کیا۔ اب اگر تصور کی حقیقت وہ ہو جو یونانی بیان کرتے ہیں تو معنی یہ ہونگے کہ اُس وقت کوئی نئی صورت حاصل ہوئی ہے حالانکہ اس وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ جو صورت پہلے سے حاصل تھی اُسی کی طرف ہمارا ذہن متوجہ ہوا ہے۔ کیونکہ کسی شے کی صورت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ شے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو ◆

اس مباحث کی وجہ یہ ہے کہ کسی شے کی حاصل شدہ صورت کی یاد دلانے کا بڑا ذریعہ بصارت ہے۔ اور بصارت میں اشیاء کی صورت آنکھ کے پردہ میں منطبع ہوتی ہے۔ اس لئے احساس بصری میں جو صورت حاصل ہوتی ہے۔ وہ تصور نہیں بلکہ تصور کی پیدا کرنے والی ہے۔ لیکن یہ تمام ادراکات یعنی احساس بالفعل احساس مرکب تصور محض سب ادراک کے ابتدائی درجے ہیں یعنی یہ سب جزئیات کے ادراک کے طریقے ہیں ◆

کلیات کا ادراک اس طرح ہوتا ہے کہ ہم بہت سے جزئیات کو دیکھتے ہیں۔ ان سب میں بعض چیزیں مشترک پاتے ہیں۔ یہ قدر مشترک کوئی موجود خارجی نہیں ہے۔ نہ کسی خاص موجود خارجی کے مطابق ہے۔ لیکن ایک قسم کا وجدان ہے جو بہت سے جزئیات کو دیکھنے اور ان میں سے بعض اوصاف کے مشترک پانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وجدان کا نام تعقل ہے۔ اور اسی کو کلیات کا ادراک کہتے ہیں ◆

منطق میں جس چیز کو تصدیق کہا جاتا ہے وہ تصور نہیں بلکہ یہی تعقل ہے۔ کیونکہ تصور کے لئے صورت کی ضرورت ہے اور کلیات کے ادراک میں کوئی خاص صورت نہیں حاصل ہوتی بلکہ بہت سے جزئیات کے استقرار سے اس طرح منتزع ہوتا ہے کہ ہم افراد کے خصوصیات کو حذف کرتے جاتے ہیں اور ایک مفہوم عام پیدا کر لیتے ہیں۔ ہم نے زید، بکر، عمر کو دیکھا۔ ان میں جو الگ الگ خصوصیتیں تھیں مثلاً قومیت وطن جسمانی ترکیب وغیرہ وغیرہ سب کو حذف کرتے گئے تو صرف انسانیت ایک ایسی چیز باقی رہی جو سب میں مشترک ہے۔ یہ انسانیت خارج میں موجود نہیں۔ اور اس لئے وہ کسی حاسہ سے محسوس نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جزئیات کے دیکھنے سے منتزع ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو تصور نہیں بلکہ تصدیق یا تعقل کہنا چاہئے

شبلی

نیرنگ خیال بکڈپو میں نئی کتابوں کا اضافہ

ستمبر کے مہینہ کی کتابیں

لیلائے نجد } از جناب مولانا عظمت علی حسرت لکھنوی۔ ایک دلچسپ تاریخی ناول ہے جسمیں نجد و حجاز کے دلکش مناظر جنگ و جدال اماکن مقدسہ سے بے ادبی مسلمانوں پر مظالم حجاز و یمن کی آویزش اور حسن و عشق کی دلفریب داستانیں ہیں حجم دو سو صفحہ قیمت عمہ

تہذیب کی سرگذشت ۔ حضرت ساغر نظامی کا دلچسپ افسانہ ہے۔ حجم ۱۰۰ صفحہ۔ قیمت عہ

بیوی کے فرائض ۔ میاں اور بیوی دونوں کے لئے قابل مطالعہ۔ قیمت ۸ر

مولانا محمد علی کی سوانح حیات ۔ قیمت ۸ر — **مولانا محمد علی کی تقاریر** ۔ قیمت ۸ر

مفتاح الصحت ۔ مہاتما گاندھی کی مشہور کتاب شاہراہ تندرستی کا جواب ہے۔ قیمت ۱۲ر

شمس الطب ۔ علاج شمسی کا پورا پروگرام۔ یعنی صرف رنگوں اور سورج کی شعاعوں سے ہر مرض کا علاج۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: **منیجر نیرنگ خیال بکڈپو شاہی محلہ لاہور**

کارخانۂ قدرت

از شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد صاحب

کسی کتاب میں نظر سے گذرا کہ زمانہ حال کا کوئی فلسفی خوردبین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ سو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہاں ایک بوند میں مشکل شمار کر سکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہو گی؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرداگرد ۴۵ میل کے دَل کا ہوائی کُرّہ ہے۔ اور اس میں بھی جانداروں کی (ایسی ہی یا اس سے زیادہ) کثرت ہے۔

ہر چند کارخانۂ قدرت الٰہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہے۔ مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اُس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور ماندگی اور بے وقعتی کا تیقن پیدا ہو گا۔ جس کو میں دینداری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہئے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ اپنی عظمت کیسی ہو گی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بے شمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکر میں ہیں۔ خدا جانے کب سے؟ اور کیوں؟ اور کب تک؟ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں۔ اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے۔ تو سینکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشینگوئی ہو سکتی ہے کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہو گا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ اور سکنڈ کیا اسکنڈ کے ہزارویں حصے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہو سکتا۔

یہاں روئے زمین پر ایک جنگلے۔ ایک دانے۔ ایک پھل۔ ایک پنکھڑی گھاس کے ایک ڈنٹھل۔ چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی نظر غور سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و غایت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اُس چیز میں موجود ہے۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے۔ تو اُس کے پاؤں کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پھولے ہیں کہ ریت میں نہ دھنسیں۔ اُس کی گردن بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے۔ اُس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے جس میں کئی کئی ہفتوں کے لئے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس کوہان کا گودام ہے۔ کہ اگر اس کو ایک عرصۂ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان کی چربی بدل یا تحلیل کا کام دے۔ ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں۔ تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لئے پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں۔ ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے۔ جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے۔ پرندوں کے جسم ست بک ہیں۔ تاکہ ہوا میں اُڑ سکیں۔ دریائی جانوروں کے پنجے کھال سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپو ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے پنجے اور دانت اُن کی غذا کے مناسب ہیں۔ نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں۔ خول ہیں۔ سرد ملک کے جانوروں کی اون بڑی بڑی اور گھنی ہے۔ کہ جاڑا نہ کھائیں۔ جتنے جاندار معرض تلف میں ہیں۔ اُن میں توالد و تناسل کی کثرت ہے تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے۔ آدمی چونکہ ابقائے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہنچا سکتا ہے۔ سینگ اور پنجے اور اون اس قسم کے سامان قدرتی اُس کو نہیں دیئے گئے۔ جس ملک میں نباتات کی کثرت ہے وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ملک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے۔ تو اُس کا ایک ایک رُواں صانع قدرت کی کمال دانشمندی اور رعایت پر گواہی دے رہا ہے۔ اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پُرزہ ہاتھ ہے۔ کہ دنیا میں جسقدر انسان کے تصرفات ہیں (اور انسان کی بساط پر غور کرو۔ تو ان تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔) سب اسی پرزے کے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ کلیں بنائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کلوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شد و مد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک کمبیڑا ہے کہ بگھیوں زمین پر پھیلا ہے۔ سیکڑوں پرزے ہزار ہا پیچ۔ بیلن۔ پہیئے۔ چرخیاں۔

کمانیاں۔ خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کئے ہیں۔ تب کہیں جاکر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے جس کے لئے کل بنائی گئی ہے۔ یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ۔ کہ ہزار ہا قسم کے کام اس سے نکلتے ہیں۔ اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کف دست ہے اور تین تین جوڑ کی پانچ انگلیاں۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ انسان کے بدن میں ایک اور ذرّے بھر کی چیز آنکھ ہے۔ اُس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔ اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے۔ مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو۔ کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاواک ہے جس میں نگینے کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے۔ اوپر بھوؤں کا چھجے دار سائبان۔ سامنے پپوٹوں کا پردہ۔ پردے میں پلکوں کی جھالر۔ پھر پپوٹے کے اندر منافذ ہیں جن میں سے آئینۂ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رِستی رہتی ہے یہ وہی رطوبت ہے جو زیادہ ہو کر آنسو بن جاتی ہے۔ جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے۔ گویا اتنی ہی دفعہ آئینہ پر پچارا پھرتا ہے۔ گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ پچارا کافی نہیں۔ بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے ◆

میرا تو کیا منہ ہے کہ موجوداتِ عالم میں جو اسرارِ حکمت مضمر ہیں اُن کا ایک کرشمہ بھی بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اسی قدر ہے کہ دنیا کے کارخانے کو اِس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ کل میں نے آیت اللہ کا سبق سنا دہ عجائب قدرت پڑھتا ہے کسی شخص نے نیچرل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اردو میں ترجمہ کر دیئے ہیں۔ اسی میں لکھا تھا کہ مچھر کے منہ کے آگے جو ایک پتلی سونڈسی ہوتی ہے۔ وہ حقیقت میں ایک ناوا ہے۔ اس ناوے میں تین اوزار ایک تو سوئی جس کو مچھر مسام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آری کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو تو اُس سے کام لے۔ اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوستا ہے۔ اُس میں اتنی بات اور بھی تھی کہ اس شکل خاص میں مچھر کی مدت حیات صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا کہ تیتری کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار ڈیولیاں ہیں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر سننے جیسی کہ اُسکی عادت ہے تو ہر ذرہ اس بات کی گواہی دیگا کہ اُس کو کسی بڑے قدرت والے دانشمند ہمہ داں حاضر ناظر سمیع و بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا؟ ممکن نہیں کہ انسان صمیم قلب سے موجودات عالم میں غور اور خوض کرے اور اُسکا دل اندر سے نہ بولنے لگے کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ باین عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعات اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اُن میں قاعدہ کہاں بنا۔ اور انضباط کا کیا ذکر۔ اور قاعدہ انضباط بھی کیسا؟ کہ دنیا کی ابتدا سے لیکر آج کی گھڑی تک اُس میں رتی برابر فرق نہیں پڑا ◆

نذیر احمد

یادِ گُل

از ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم

وہ گالوں پہ زردی کہ جوں زعفراں   پڑی تھیں جہاں اور تہاں تیّیاں
اُڑی ایک اتنے میں سوتے نہال   دیا اپنی باہوں کو گردن میں ڈال
وہ پتّی نہ تھی بلکہ تھی تیتری   تصوّر میں تھی گل کا مُنہ چومتی

——— (از جاپانی) ———

ملکۂ محبت

از جناب مولانا راشد الخیری صاحب دہلوی

آفتاب و ماہتاب کچھ کے کچھ ہو جائیں۔ زمانہ کی رفتار میلوں اور کوسوں آگے بڑھ جائے۔ آسمان کروٹوں پر کروٹیں لے اور زمین چکروں پر چکر کاٹے مگر قانون قدرت کے سنگلاخ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں۔ چاند کی آب و تاب تاروں کی چمک دمک سورج کی طلوع و غروب کی سمتیں جو آج سے ہزار برس پہلے تھیں وہی آج ہیں اور اُس وقت تک اسیطرح رہینگی جبتک کسی سیارہ کی ٹکر یا صانع حقیقی کا حکم ان تمام اسباب کا خاتمہ نہ کر دے +

کائنات دہر کے متضاد نتائج حیات انسانی کی مختلف حالتیں انواع و اقسام کے تماشے رنگ برنگ کی کیفیتیں پیش خیمہ ہیں اُس انقلاب کا جو عمر کے باقی حصہ میں ہونے والا ہے۔ اور خبریں ہیں اُس وقت کی جب جسد خاکی ان تغیرات سے بے تعلق ہوگا +

یہ واقعات اگر صنعت تسلیم کر لئے جائیں تو لاجرم اس کو صانع ماننا پڑیگا۔ وہ نیچر ہو یا خدا۔ مگر اس استادی کے قائل ہیں کہ باعتبار ضرورت پارس بنا کر بھیجا اور کندن بنا کر چھوڑا۔ کچھ ایسا دلچسپی کے سانچے میں ڈھالا کہ اس حیات ناپائدار پر کیسی ہی تکلیفیں اور کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ گزریں آفتوں پر آفتیں آئیں مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹیں۔ چاہو کہ اس پیرزال کی نیرنگیوں سے دل اُکتا جائے ممکن نہیں +

اسی منزلگاہ راحت و عیش میں جہاں باجے گاجے کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ وہاں شہر سے باہر ایک کونہ میں چھوٹا سا قبرستان بھی ہے۔ جسمیں ٹوٹی پھوٹی پرانی قبریں ان خوشیوں کی بے ثباتی کا پتہ دے رہی ہیں! یہ مٹی ہوئی صورتیں جو آج اس سنسان میدان اور ہُو کے عالم میں بیخبر پڑی ہیں کل اسی منزلگاہ میں شاداں و فرحاں پھر رہی تھیں! فارغ البالی کے چنور اُن کے سروں پر سایہ کئے تھے۔ اور حیات مستعار ان پر راحت و اطمینان کے پھول برسا رہی تھی۔ عزیزوں و تعلقات کا اثر جیسا تم پر ہے۔ ایسا ہی ان پر بھی تھا۔ جسطرح تمہارے دلوں میں ارمان ہیں۔ ان کے بھی تھے۔! بادِ صبا کی اٹکھیلیاں جس طرح تمہارے ساتھ ہیں اسیطرح ان کے ساتھ بھی تھیں۔ یہی چاند تارے جو آج تمہارے سامنے ہیں ان کے سروں پر بھی تھے۔ یا قدرت کی تمام دلچسپیاں جوں کی توں ہیں۔ مگر اس کی بہار دیکھنے والے بدل گئے! یہ بلند کے متوالے جن کے ڈھیر پیش نظر ہیں اس فراق ابدی سے خوش نہ تھے! جاگ سکیں تو ان کو اُٹھاؤ اور ان سے پوچھو۔ کس دل سے گئے اور کس حال میں رہے۔ بڑی طاقتور تھی وہ چیز جو ان غریبوں کو ایسی چہل پہل سے اُٹھا لائی اور اس جنگل بیابان میں لا لٹایا۔ فاختہ کی کوکو نے ان نووارد مہمانوں کو لوری دی املی اور نیم کی پتیاں ان کو تھپکنے لگیں! گو یہ پیاری صورتیں ہمیشہ کو چھوٹ گئیں۔ ان کے شکوے شکایت سب ختم ہوئے۔ اور اب ہمیں ان سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ مگر نہیں۔ کبھی تو ان کی بھی خاطر منظور تھی! زندگی کی ملاقات کا لطف تو بہت اُٹھایا۔ آؤ آج ان مُردوں کی صحبت میں بھی شریک ہوں +

کیسی بارونق محفل جمی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے بڈھے جوان ایک لباس۔ ایک وضع ایک قطع۔ ننگے سر۔ ننگے پاؤں اپنے اپنے کارناموں پر فخر کر رہے ہیں۔ بہت سے خلوص و محبت کے بندے ہیں۔ جو انہی پیش بہا زندگی دوسروں پر نثار کر گئے۔ گو خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ آئے۔ مگر ایسے خزانے اپنے ساتھ لائے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ کیسے مستقل مزاج لوگ تھے مصیبتیں جھیلیں۔ آفتیں بھگتیں۔ مفلس جئے قلاش مرے۔ مگر خلوص کے لہلہاتے پھول جو ماں کے پیٹ سے لائے تھے انہیں نہ مرجھانے دیا۔ دیکھو اور نظر غور سے دیکھو۔ زندگی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ جیتے جی تو ان کی کچھ وقعت نہ تھی۔ مگر آج ان کی صورتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ بڑے بڑے عبادت گذاروں کی ٹکٹکی ان کے چہروں پر بندھی ہوئی ہے اور یہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ حاصل عمر دوسروں کی نذر کر دیا۔ عزت کے خواہاں رہے۔ نہ دولت کے طالب۔ ان کی آرزوئیں ان کے ارمان۔ ان کی خواہشیں ان کی اُمنگیں جو کچھ تھیں یہ تھیں کہ وہ دوستوں کا دم بھرتے پیاروں کا نام لیتے دنیا سے رخصت ہو جائیں! خوش نصیب تھے یہ آپ اور غنیمت تھی ان کی زندگی!

جنگل بسانے والو! گو ہم سے رخصت ہو گئے اور ایسے رخصت ہوئے کہ

اب نظر نہ آؤ گے۔ مگر زیست تو تمہاری۔ اور انسان تھے تو تم۔ یہ چوتھی کی دلہن یہ حسین ملکہ جو آج سنہری کٹہرے میں تمہارے پاس آرام کر رہی ہیں۔ تمہارے ہی قابل تھی۔ اب اس کے قدر دان کہاں اور پوچھنے والے کدھر۔ خدا جانے کس صورت شکل کی عورت ہوگی۔ جس کی قبر پہ یہ کچھ نو برس رہا ہے۔ دو رویہ گملوں کی قطاریں رنگ برنگ کے پھول مقناطیسی اثر دکھا رہے ہیں۔ سرہانے سنگِ مرمر کا ایک پتھر ہے جس پہ کندہ ہے "ملکۂ محبت کی آرامگاہ"

راشد الخیری

شہیدِ جفا

از جناب حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی

پائی نہ تیغِ عشق سے ہم نے کہیں پناہ
قربِ حرم میں بھی ہیں تو قربانیوں میں ہم

۳۔ جنوری ۱۶۶۱ء

شاہجہان بادشاہ کی چاہیتی بیوی جس کا خطاب ممتاز محل تھا۔ جب مرنے لگی اور اُس کا دم کھنچکر سینہ میں آگیا تو لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہنے لگی اچھی ذرا کوئی جہاں پناہ کو تو میرے پاس بلا لائے۔ مجھے کچھ وصیت کرنی ہے۔ بادشاہ سلامت اُسیوقت محل میں تشریف لائے۔ اور ممتاز محل کو جاں کنی کی حالت میں دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ ممتاز محل نے کہا۔ جہاں پناہ! میں نے اپنے بچوں کو بڑے چاؤ چونچلوں سے پالا ہے۔ اور ہاتھوں چھاؤں کی ہے۔ اگر میرے پیچھے یہ بیچین ہوئے تو مجھے قبر میں بیچینی ہوگی۔ خدا کو مان کے ان کو پیٹھ نہ دینا۔ اور ان کی ہر طرح دلداری کرتے رہنا"

بادشاہ سلامت۔ بیگم! تمہاری اولاد تو میری آنکھوں کا تارہ اور کلیجہ کا ٹکڑا ہے۔ تمہارا کدھر خیال ہے۔ میری جان تک اُن کے لئے حاضر ہے۔

ممتاز محل۔ حضور خدا رکھے آپ ٹھیرے مرد۔ مرد ان باتوں کو نہیں جان سکتے۔

سوکن کو سوکن کی اولاد ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے اور میاں کی پہلی بیوی کے بچوں کو بن ستائے رہتی ہی نہیں۔ بی سارہؑ نے بی ہاجرہؑ کے جیتے جی حضرت اسمٰعیلؑ کو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں سُنسان جنگل میں جلتی جھلستی ریت پر پھکوا دیا تھا اور موئے پیچھے تو کون کسی کا کہا کرتا ہے اور۔ وہ گئی تو دنیا دار بادشاہ میں کون اور تو کون۔ دیکھئے میری آنکھ بند ہوتے ہی ان پر کیا گزرتی ہے۔ اور میرے لاڈلے بچوں کو کس کس کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں"

بادشاہ سلامت۔ تم خاطر جمع رکھو۔ میں انشاء اللہ تعالٰی دوسری شادی ہی نہیں کرنے کا جو تمہارے پیچھے سوکن آئے اور تمہارے بچوں کو ستائے۔

ممتاز محل۔ بھلا قسم تو کھائیے۔

بادشاہ سلامت۔ خدا کی قسم۔ رسول کی قسم۔ بس؟

ممتاز محل۔ ہاں بس۔ اب مجھے یقین آگیا۔ اور اب میں اطمینان کے ساتھ خدا کے ہاں سدھارتی ہوں۔ لو اللہ بیلی۔ یہ کہتے کہتے ممتاز محل کا دم ہوا ہوگیا۔

ممتاز محل ماتا کے کارن اولاد کے آرام کے لئے کیا کیا بندوبست نہ کر گئی۔ مگر خدا کے سامنے نہ کسی شہزادی کی پیروی چلتی ہے نہ کسی ملکہ کی۔ ممتاز محل کو اس بھید کی خبر نہ تھی کہ تیری کوکھ سے پیدا ہوئے بچے جن سب نے تیرے ہی پیٹ میں پاؤں پھیلائے ہیں۔ جو سگے بھائی بہن کہلاتے ہیں ایک دوسرے کے نگلنے کے لئے سانپ کے سپولئے اور اژدھے بن جائیں گے۔ اور ایک ایک کے خون کا پیاسا ہوگا۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹے گا۔ سولی پہ چڑھائے گا۔ آنکھوں کو نکلوا کر پاؤں سے روندیگا۔ مردے کو بازاروں اور گلی کوچوں میں گھسٹوائے گا۔ جو کچھ کربلا میں ہوا ہے وہ دہلی آگرے میں پھیر ہو گزرے گا۔ بوڑھا باپ شاہجہان آگرہ کے جیلخانہ میں نوجوان اور رشکِ قمر بیٹوں کی تسناؤنی پر سناؤنی سنیگا اور کچھ نہ کر سکیگا۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کیا لکھیں۔ اسکول کے اُردو پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں کہ حضرت عالمگیر متقی اور درویش صفت بادشاہ نے داراشکوہ، میرزا شجاع، میرزا مراد وغیرہ کے قتل کرنے میں جس بے رحمی اور سنگدلی سے کام لیا اُس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سنتا ہے کہ داراشکوہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام [illegible]

کا نام سلیمان شکوہ تھا۔ سپہر شکوہ نے دارا شکوہ کا مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا اور دارا شکوہ کی شہادت کے بعد وہ گوالیار کے جیل خانہ میں مدت تک جیتا رہا۔ سلیمان شکوہ جان بچانے کے لئے بے نام و نشان ہو گیا۔ اور عالمگیر کے ہاتھ نہ لگا۔ مہینوں جنگل بیابانوں میں پڑا پھرتا رہا۔ انسان کی صورت سے ایسا ڈرتا تھا جس طرح جنگلی ہرن پرچھائیں سے بھڑکتا ہے۔ قضا و قدر اُسے سری نگر کی سرحدوں لے پہنچی۔ صبح کا سہانا وقت تھا ایک چشمہ کے کنارے پتھر کے سہارے سے گھاس کے مخملی بچھونے پر بیٹھا ہوا اپنی صورت پانی کے آبدار آئینہ میں دیکھ رہا تھا کہ سری نگر کا راجہ بیش گھوڑے پر سوار شاہانہ لباس پہنے ہتیہ رنگ سے ہاتھ پر باز بٹھائے شکار کھیلتا ہوا اتفاقاً آن پہنچا سلیمان شکوہ کی دلفریب شکل بڑی بڑی تیموری غلافدار آنکھیں - سیاہ اور کمان جیسی کھنچی تنی بھویں۔ اونچی ناک۔ چھوٹا دہانہ۔ پتلے ہونٹ۔ لال لال رخسار چاند سی پیشانی۔ سر سے پاؤں تک نور کے سانچہ میں ڈھلا ہوا۔ دیکھ کر حیران ہو گیا۔

راجہ - تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئے ہو +

شاہزادہ - سچ سچ کہوں یا جھوٹ +

راجہ - سچ ہی کہو۔ سچ دنیا میں بڑی چیز ہے +

شاہزادہ - سچ کہنے میں مجھے جان کا خوف ہے +

راجہ - جان کا خوف دل سے نکال ڈالو۔ اب تم سری نگر کی حد میں آگئے ہو۔ خدا چاہے تو تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا +

شاہزادہ میرا نام سلیمان شکوہ ہے۔ شاہجہان بادشاہ دہلی کا پوتا اور دارا شکوہ کا بیٹا ہوں۔ مگر قسمت کا ہیٹا ہوں۔ باپ کا قتل۔ بھائی کی گرفتاری چچا کی غداری اپنی مصیبت اس طرح سُنائی کہ راجہ روتے روتے دیوانہ ہو گیا۔ اور بڑی تعظیم تکریم سے شہر میں لے گیا اور خاص محل میں ٹھیرایا اور فرمایا جب تک میری جان میں جان ہے میں آپ کا حامی اور مددگار رہوں۔ آپ پاؤں پھیلا کر بے کھٹکا سوئیے اور جو کچھ وال دلیا موجود ہے۔ وہ کھائیے۔ سلیمان شکوہ نے کچھ کم تین برس بسم اللہ کے گنبد میں کاٹے اور سری نگر میں رہ کر راجہ کی بدولت خوب خوب عیش کئے۔ مگر عالمگیر اس کی فکر سے غافل نہ تھا۔ اور آخر اُس نے معلوم کر لیا کہ میرا شکار سری نگر کا راجہ لے اُڑا ہے۔ پہلے تو صلح و آشتی کے خط راجہ کو بھیجے کہ ہمارا آپ کا واحد معاملہ ہے۔ اچھے دل برے نہ کرو اور سلیمان شکوہ کو میرے پاس بھیجدو۔ مگر جب دیکھا کہ راجہ کسیطرح نرم نہیں ہوتا اور میٹھا سا جواب دیتا ہے تو لشکر کشی کی دھمکی دی۔ مگر راجہ بات کا پکا اور قول کا سچا تھا۔ وہ عالمگیر کے اس ڈراوے کو کبھی خاطر میں نہ لایا اور سلیمان شکوہ کو نہ بھیجنا تھا اور نہ بھیجا۔ اورنگ زیب کے دل میں بھتیجے کی زندگی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ اُس نے اُس کے پکڑوا بلانے کیواسطے ایک اور چل کھیلا اور ایک اور راجہ کو جو بڑا مدبر اور عقیل تھا۔ اور سری نگر والے راجہ سے اُس کی دانت کاٹی روٹی تھی بیچ میں ڈالا اور سلیمان شکوہ کے بھیجدینے کی اُس سے سفارش چاہی۔ مدبر راجہ نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور دوست کو ایسا جھانسا دیا کہ اُس نے بے گناہ سلیمان شکوہ کو پا بہ زنجیر کر کے دہلی روانہ کر دیا۔ سلیمان شکوہ کا دہلی میں داخل ہونا حضرت یوسف علیہ السّلام کے پہلے پہل مصر میں داخل ہونے کے برابر تھا۔ بازاروں میں خلقت کے ہجوم ٹھٹھ لگ گئے تھے۔ تھالی پھینکو تو سروں پر ہی جاتی تھی۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ در و دیوار اور چھت اور کوٹھوں پر عورتیں اور بچے پٹے پڑے تھے اور اُس نامراد کی نوجوانی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے۔ جب اُس کی سارے شہر میں تشہیر ہولی تو نواب سعد اللہ خاں وزیر کو حکم ہوا کہ تم جاؤ اور اُس نالائق کا سر اپنے روبرو کٹوا کر ہمارے سامنے لاؤ۔ مگر جب سعد اللہ خاں نے جا کر سلیمان شکوہ کی پیاری صورت دیکھی تو جی جان سے اُس پر فدا ہو گیا اور اُس کا دل بھر آیا۔ کئی گھنٹہ تک اس سوچ میں رہا کہ اس یوسفِ ثانی کو بے سبب بے وجہ کیونکر جلّاد کے حوالہ کر دوں۔ آخر کار رحمدل وزیر ایک منصوبہ سوچ کر حضور میں حاضر ہوا اور دست بستہ عرض کی۔ جہاں پناہ قیدی سے حسب دستور پوچھا گیا کہ اگر کوئی ارمان یا حسرت تیرے دل میں ہو تو بیان کر۔ قیدی نے کہا کہ میری آخری آرزو یہ ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار بادشاہ ظل اللہ کا دیدار دیکھ لوں۔ چونکہ حجّت شرعی تھی اس لئے اُس کے قتل میں درنگ کی گئی۔ اب جو حکم سلطانی ہو بجا لائیں +

عالمگیر - (ناک بھوں چڑھا کر) خیر اب تو مغرب کا وقت قریب ہے۔ اس وقت ہم اُس ناشدنی کو اپنے سامنے نہیں بلا سکتے۔ کل دس بجے دن کے اُسکو اور جلّاد دونوں کو دربار میں حاضر کرو۔ سعد اللہ خاں سلام کر کے دل میں خوش ہوتا ہوا اُلٹے پیچھے ہٹا اور رات کی رات سلیمان شکوہ کی جان بچ گئی۔ سعد اللہ خاں نے یہ تدبیر محض اس مصلحت سے کی تھی کہ شاید عالمگیر اپنے بھتیجے کے حسن و جمال کو دیکھ کر پسیج جائے اور اس بے خطا کی خطا معاف ہو جائے۔ بات کی بات میں صبح ہو گئی اور گل نے کسی مقتول جفا کے ماتم میں اپنا نازک پیرہن چاک کر ڈالا۔ اور باغ کا پتّہ پتّہ اُس کے آنسوؤں سے رونے میں مشغول ہوا۔ آفتاب نکل آیا اور اُس کی لمبی کرنیں جو شفق کی سرخی طے کر کے زمین پر پہنچیں تو یہ معلوم ہوا کہ کسی

نوجوان خورشید رخسار کا سر نیزہ پر چڑھایا گیا ہے۔ جس کی شہ رگوں سے خون ٹپک رہا ہے ٭

دیوان عام میں اورنگ زیب عالمگیر نے تخت جواہر نگار پر جلوس فرمایا وزیر۔ امیر۔ منصبدار۔ ہفت ہزاری۔ پنجہزاری۔ خاص و عام اپنے اپنے رتبہ اور عہدہ کے مقاموں پر دست بستہ کھڑے ہوئے۔ جس وقت سلیمان شکوہ دس سپاہیوں کی حراست میں تلواروں کے سایہ تلے دیوان عام کی تیسری سیڑھی پر پہنچا تو اتفاقاً اُس کی آہنی بیڑی پتھر سے جا لگی اور اُس کی جھنکار سے سارا ایوان گونج اُٹھا۔ بیڑی زبان حال سے ظفر کا یہ شعر پڑھ کر عالمگیر کو سنا تی تھی ؎

ہائے کوہاں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

حکم ہوا کہ بیڑی کاٹ دی جائے۔ صرف ہاتھوں میں سونے کی زنجیر پڑی رہے سلیمان شکوہ نے جب اپنے تئیں عالمگیر کے آگے اور جلاد کو ننگی تلوار لئے پیچھے دیکھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ چاند سے چہرے کو گہن لگ گیا منہ کے اندر زبان خشک ہو گئی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ سر پھرنے لگا۔ سارا دربار پیکر تصویر بن گیا تھا اور اُس مظلوم کا منہ تک رہا تھا۔ عالمگیر نے جھلا کر سلیمان شکوہ سے کہا۔ کہو برخوردار کیا حال ہے ٭

سلیمان شکوہ۔ (شعر)

حال من از ہجر دارا کمتر از یعقوب نیست او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام

عالمگیر۔ سعد اللہ خاں تم نے دیکھا موت سر پہ کھیل رہی ہے اور حواس درست ہیں کہ شعر تصنیف ہو رہے ہیں۔ اور جو زندگی کی کچھ دنوں آس ہو تو شاید آسمان کے تارے توڑ لائے۔ یہ زندہ رکھنے کے قابل ہے؟ توبہ توبہ! افعی کشتن و بچہ اش را نگاہ داشتن کار خرد مندان نیست" بہت اچھا اگر آپ ابا جان کے فراق میں بے چین ہیں۔ تو ہم آپ کو ابھی اُن کے پاس ہمایوں کے مقبرہ میں دست بدست پہنچوائے دیتے ہیں ٭

سلیمان شکوہ۔ عالمگیر سے مخاطب ہو کر شعر

نیں زمردان گر آئی بے مروت بر مزار من بتعظیم تو خوش مستانہ برخیزد غبار من

عالمگیر۔ جلاد سے مخاطب ہو کر ہوں۔ ہوں کے ساتھ پیچھے سے جلاد کی تلوار سلیمان شکوہ کی گردن پر پڑی۔ اور اُس بیکس کا سر تن سے جدا ہو کر چار قدم دور جا پڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٭

میری جان! یہ جھوٹی کہانیاں نہیں ہیں۔ سچے قصے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو میرے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں تشریف لے چلئے۔ مقبرے کے صحن میں سنگ مرمر کی مزار کے پاس جو دارا اصل دارا شکوہ کا مرقد ہے ٭

میں آپ کو اس نامراد کی قبر دکھا سکتا ہوں جس پر حسرت کا شامیانہ کھنچا ہوا ہے اور یاس و الم کی جھالر لٹک رہی ہے ٭ داغ

حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر
کہتے ہیں سب یہ قبر کسی نوجواں کی ہے

ناصر نذیر فراق

گُل کی فریاد

از جناب پنڈت شیو نراین صاحب شمیم ایڈووکیٹ

اے حضرتِ انسان تو اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی ہے۔ میری دانست میں تو سخت خودغرض اور نفس پرور ہے۔ اور میرے لحاظ سے تو تو سخت ظالم ہے۔ تجھ کو یہ غرہ ہے کہ کائنات میں جو شے موجود ہے۔ وہ سب تیری آسائش و استعمال کے لئے ہے۔ یہ خیال دراصل غلط ہے۔ فی الحقیقت نیچر میں ہر شئے کے لئے اپنا اپنا کام مقرر ہے اور اُس کی ہستی اپنے لئے ہے۔ زبردستی یا ظلم سے کسی کا استحقاق زائل کرنا اشرف المخلوق کے رتبہ سے تجھے گرا دیتا ہے۔ میں بُلبل کو تجھ سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دیکھ! وہ میرے رنگ و بو پر کیسی دلدادہ ہے۔ صبح و شام میرے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ میری بہارِ حسن سے اپنے دل و جان کو تازہ کرتی رہتی ہے۔ فی الواقعہ وہ اربابِ معنی سے ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کہ وہ مجھے ٹہنی سے جدا نہیں کرتی۔ میرا جوبن لوٹتی ہے لیکن کس خوش اسلوبی سے۔ اُس حبشی کالے کلوٹے بھنگے کو دیکھ جسے لوگ بھونرا کہتے ہیں کس طرح وہ ارد گرد دیوانہ وار گردش کرتا ہے۔ مجھے صانعِ قدرت کی ایک حسین مخلوق سمجھ کر میرے طواف میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی حالت میں مست ہے۔ موسیقار کے مانند گنگناتا ہر وقت وجد میں رہتا ہے۔ میری ایذا کے درپے ہونا تو درکنار میرے گن گاتا رہتا ہے تو اس سے ہی سبق لے +

او ظالم! نیچر نے تجھے جتلا دیا ہے کہ میرے خار میری حفاظت کے لئے بنائے گئے تھے۔ تو انہیں بھی توڑ دیتا ہے۔ تیرا چاقو بے زبان جانوروں کی جان لینے سے نہ ٹلا تو میں کس گنتی میں ہوں۔ کیا یہ حظ تیرے لئے کافی نہیں کہ تو میری بوباس سے فردوسِ دماغ بنا۔ میری خوش رنگی سے جنت نگاہ بنا لیکن مجھے ٹہنی سے جدا نہ کر +

او ظالم! میری شکایتیں بیشمار ہیں۔ کاش میری فریاد سننے والا کوئی ہوتا تو وہ دل تشنہ تا لعد [illegible] باہم۔ تاہم تجھے ہی سناتا ہوں تاکہ شاید تیرا سنگین دل نرم ہو۔ ممکن ہے کہ تو اپنی زبردستی سے باز آجائے۔ آخر میری زندگی نہایت مختصر ہے۔ عمر طبعی چند گھنٹے ہے۔ کاش تو مجھے چند گھنٹے جینے دے۔ اب میری فریاد سن :-

۱۔ جب تجھے کسی دیوتا۔ پیر فقیر یا مرقد سے التجا کرنی ہوتی ہے۔ اُنکی خوشنودی مزاج مطلوب ہوتی ہے۔ مجھ غریب کی جان پر بن آتی ہے۔ میں چڑھاوے کا کام دیتا ہوں +

۲۔ جب تجھے وارفتگان کی تربت پر جانے کا موقع ہوتا ہے مجھ بیکس کو مُردوں کے سینے پر چھوڑ آتا ہے۔ میری بھی وہیں ہوائی تربت بن جاتی ہے +

۳۔ جب تجھے کسی اپنے سے بزرگ بنی نوع انسان کی تکریم و تحسین منظور ہوتی ہے مجھ پر آفت آنے لگتی ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے جس طرح سے میرے سینے میں سوئیاں چبھو چبھو کر ہار بنائے جاتے ہیں۔ اور ظالمانِ درجہ اولیٰ کے زیب گلو ہوتے ہیں +

۴۔ جب آدمی زاد بیاہ شادی کرتے ہیں تو بارانِ گلاب و بارشِ گُل شروع ہو جاتی ہے اور مجھ کس مپرس کی شامت آتی ہے۔ کہیں سہرے پر لٹک رہا ہوں کہیں گجرے میں جکڑا ہوا ہوں کہیں سیج میں پائمال ہو رہا ہوں +

۵۔ واہ رے تیری آسائش پسندی! تجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تو میرے پاس آکر میرے حسن و جمال سے حظ حاصل کرے۔ نہیں۔ مجھے ٹہنی سے توڑ مجھے گلدستہ بنا گول کمروں اور کھانے کے کمروں میں رکھ دیتا ہے۔ جہاں مجھے مرگِ مفاجات جلد آجاتی ہے۔ تیری خود غرضی یہاں تک ہے کہ دستنبو بنا کر مجھے بٹن ہول میں لگا کر مجھ نیم مردہ کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ واہ رے تیری فردِ محبت!

۶۔ تو کن کن غیر جنسوں کے ساتھ مجھے ہم آغوش کرتا ہے کبھی تکلون میں مجھے ہم خواب کرتا ہے۔ کبھی سرسوں سے میری صحبت ہوتی ہے تاکہ میرے جوہر ان میں منتقل ہوں۔ میری روح ان کے جسم میں داخل ہو۔ اور بقول تیرے وہ تیس ہائیں ہو۔ میں خانہ برباد ہو جاؤں +

۷۔ کبھی تو مجھے روغنوں میں حل کرتا ہے۔ میرا رنگ زائل کر دیتا ہے۔ بلبل کی بددعائیں تجھ پر اثر نہیں کرتیں۔ میری روح تن سے جدا کر کے مجھے

دوغن میں مقید کر دیتا ہے۔ اس فرطِ الفت کا نام تو نے عطر کہہ چھوڑا ہے۔

۸۔ کبھی تیری رحم دلی اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ مجھے قرع انبیق میں ڈال آتشِ سوزاں پر رکھ کر جوشش دیتا ہے۔ اس پر بھی صبر نہیں۔ پھر دو آتشہ کرتا ہے۔ اس پیار کے اظہار کا نام عرق ہے۔ او ظالم! تیری جبیں پر کاش عرقِ انفعال آتا۔ مگر کہاں ◆

۹۔ او ظالم! تو مجھے میری موت کے بعد بھی نہیں چھوڑتا۔ تجھے یقین نہیں آتا کہ میں کماحقہ مرا ہوں۔ میری پتیاں سکھاتا ہے۔ پھر مجھے نسخوں اور معجونوں میں ڈالتا ہے۔ اور ان معدوں کی امداد کرتا ہے جن میں تیرے خنجر نے اور ذی روح ہلاک کر کے داخل کئے ہوئے ہیں ◆

۱۰۔ او بے رحم آدمی زاد۔ تو تو انسان بھی کہلانے کا مستحق نہیں اشرف المخلوقات تو تیری لغات میں نہ ہونا چاہئے۔ حق تو یہ ہے کہ تیرا کیا قصور ہے۔ یہ معما کسی کی سمجھ میں نہیں کہ کیوں کسی کی اذیت میں دوسرے کا عیش ہو۔ اور مجھے تو ذوق کا یہ شعر پڑھنا کافی ہے ؎

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

شمیم

"برق"

از جناب مولانا اظہر علی صاحب آزاد

اے برق یہ تیرا مسکرانا اٹھلا کے ادا سے منہ چھپانا
یہ تیری تڑپ یہ اضطراری تو اور یہ تیری بیقراری
اک نور بنی چمک رہی ہے بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے
حسنِ بے پردہ پر ترا ناز طراری کے یہ سارے انداز
سرعت تری سحرِ سامری ہے چھل بل میں تو آتشی پری ہے
جلوے ترے حسن کی جھلک کے چھنتے ہیں سحاب کی تہوں سے
ہلکا پھلکا سحاب منھ پر یا ہے آبِ رواں کی چادر
ہے جس سے برس رہا ترا نور فانوس میں یا ہے شعلۂ طور
یہ تیری ادا یہ تیرے انداز کتنوں کو کریں گے کشتۂ ناز
ساری خلقت کو کر کے شیدا تڑپا نہ دکھا دکھا کے جلوا
اور اک نے لاکھ خاک چھانی کرتی ہی رہی تو آنا کانی
پیچھے ترے وہم گو دواں تھا اس کا بھی شکست کارواں تھا
عشاق کے دل کی بیقراری تشبیہ میں بھی تھی تجھ سے عاری
اللہ اللہ ری چلتر! ممکن ہی نہیں کہیں مقرر
ڈھونڈے تو کہاں تجھے کوئی پائے خفت کے سوا نہ ہاتھ کچھ آئے
قابو میں تھی کس کے آنے والی بادل کو ہوا بتانے والی

آزاد

ندی کا راگ

(از جناب مولانا ظفر علی خانصاحب)

بگلوں اور چھوں کے نشیمن سے نکل کر ناگہاں
سبزہ کے فرشِ استبرق پر مثلِ درارئے غلطاں
کتنی گھاٹیوں کے دامن کو راہ میں آتی جھٹک کر میں
بیسیوں گاؤں اور قصبوں کے پہلو سے نکلی مٹک کر میں
زید کے کھیت کے نیچے سے تھوڑی سی دور پہ آخر کار
زید و عمر کی ہستی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار

تان کھرج کی یا پنچم کی چھیڑتی ہوں یوں ہو کر
پاؤں پہ جھانجھ بھنور کی پہنے اوڑھے لطافت کی چادر
بن کر میں مشاطہ کبھی الجھاتی ہوں گیسوئے ساحل
اور کبھی ساقی بن کے مرتب کرتی ہوں سبزہ کی محفل کو
گاتی بجاتی جشن مناتی تھوڑی سی دور پہ آخر کار
زید و عمر کی ہستی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار

زیبِ بدن کر کے آبِ رواں کا پاک لباس
اپنے آنچل میں بھر لاتی ہوں میں کہیں مٹی اور کہیں گھاس
کف کے عنبریں رنگ کے گالے مجھ پہ کہیں تیرتے ہیں
لوٹتے لوٹتے رستے میں بستر پہ سنہری کنکروں سے
بہتی بہتی اس انداز سے تھوڑی سی دور پہ آخر کار
زید و عمر کی ہستی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار

دشت نوردی بادیہ گردی کرتی ایک انداز سے میں
لالہ و سنبل کو جو مظاہر عاشق و معشوق کے ہیں
اڑتی ابابیلوں کے ساتھ اڑاتی اپنی زیر و بم
سورج کی کرنوں کو میں اپنے ریت کے ٹاپوؤں پہ پیہم
جھاڑوں میں جھنکاروں میں صحراؤں میں ویرانوں میں سدا
اپنے ریت کے مینڈوں پہ کچھ دیر میں لیتی ہوں ستا
کاٹتی ہوں اک چکر اور تھوڑی سی دور پہ آخر کار
زید و عمر کی ہستی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار

چشمِ زدن میں سیلِ بلا کی طرح جھپٹ کر آتی ہوں
کروٹیں لیتی ہوئی وادی پہ پہنچ کر شور مچاتی ہوں
کتنی ٹیکروں اور ٹیلوں کے تلوے سہلاتی ہوں
سینکڑوں پل ہیں مٹھی میں دل جن کا چرا لاتی ہوں
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربتِ وصل پلاتی ہوں
مجھکو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

ریزۂ سنگ سے تارِ آب پہ دلکش نغمہ لگاتی ہوں
چھم چھم کرتی ہوئی آپ اپنے حسن پہ میں اتراتی ہوں
کھیتوں کا دھو آتی ہوں منہ سبزوں کو میں نہلاتی ہوں
ساغرِ نابِ کثیر کے بنفشہ اور سمن کو پلاتی ہوں
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربتِ وصل پلاتی ہوں
مجھکو دیکھو کہ ایک روش پہ صبح و مسا چلی جاتی ہوں

ساحتِ ہاموں پہ جس دم بل کھاتی ہوئی اٹھلاتی ہوں
گودیوں میں روڑوں کو کبھی جھلانے کو کبھی میں کھلاتی ہوں
مارتی ہوں میں حباب کو گاہے اور کبھی اسکو جلاتی ہوں
میں ٹکرا کے کسی پتھر سے روپہلی چھینٹیں اڑاتی ہوں
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربتِ وصل پلاتی ہوں
مجھکو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

سبزۂ تر کو چھیڑتی ہوں اور بیدوں میں لہراتی ہوں
میٹھی نیند سے گ ا بی لے کر چلتے چلتے جگاتی ہوں
میں کبھی بہلی اور کبھی ریٹی اور کبھی آنکھ لڑاتی ہوں
رقص میں لا کر زہرہ کو افلاک پہ میں شرماتی ہوں
چاند اور تاروں کو میں اپنا میٹھا راگ سناتی ہوں
اپنے کنارے کی بوٹیوں سے دم بھر کو میں دل بہلاتی ہوں
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربتِ وصل پلاتی ہوں
مجھکو دیکھو کہ ایک روش پہ صبح و مسا چلی جاتی ہوں

ظفر علی خاں

انحطاط

از جناب میر افضل علی صاحب ایم۔ اے

میرا بی۔ اے میں آخری سال تھا۔ طالب علمی کی ضمنی دلچسپیوں میں ایسا محو ہو چکا تھا کہ اس زندگی کی انتہا فقط موت ہی پر سمجھا کرتا تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا مکتب کی درسی مشقت میں عمر گذاری۔ کچھ دھیرے دھیرے چلنے کا عادی ہو گیا۔ اس لئے دیگر ہم جماعتوں کی تیز روی پر حیران ہوا کرتا تھا۔ مگر خود اُسی چال سے چل رہا تھا۔ کالج کی زندگی سے ایسا مانوس ہو گیا تھا۔ کہ بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کے وقت بعض دفعہ اپنے دل میں کہا کرتا تھا "یا اللہ کہیں پاس ہی نہ ہو جاؤں" آخر وہی حادثہ پیش آیا۔ جس کا دھڑکا لگا تھا۔ مژدہ کامیابی نے مجھ پہ اُلٹا اثر کیا۔ اب تک میں والدین پر احسان کرتا تھا۔ کیونکہ اُن کی آرزوئے تعلیم کو کاہش دماغ سے پورا کر رہا تھا۔ فراغت تحصیل کے بعد مجھے اُن کے احسان کا احساس ہوا۔ تلاش معاش کی عبث سعی کے بعد اُن سے چند سالہ مشقت درسی کے صلہ میں پنشن کا خواستگار ہوا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں فراغ مطلق سے گھبرا کر ایم۔ اے کی تعلیم کا ڈھکوسلا کھڑا کر کے پھر کالج میں جا داخل ہوا۔

بی۔ اے کرنے سے کچھ پہلے میرے حواس پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ کیونکہ میری زندگی میں ناگوار تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ میری نشو حیات اس وقت تک فتنہ و فساد سے ہوئی تھی۔ سنجیدہ و متین آدمیوں کو چھیڑ کر میں خوش ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ دروغ محض کو گناہ سمجھتا تھا۔ لیکن تفنن طبع کے لئے حقیقت پر مبالغے کو ہمیشہ مستزاد کرتے رہنا بالیدگیٔ خیال کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔ "ضروری پیشہ" اہل اللہ کا میں دشمن تھا۔ روزمرہ کے گذارے کے لائق عبادت کو درستیٔ اخلاق کے لئے کافی سمجھتا تھا۔ لیکن ہیم در دشمن تقوٰی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ضرورت سے زیادہ شریف آدمیوں سے مجھے نفرت تھی۔ کیونکہ جن لوگوں میں مبداء فیاض سے شرارت کا مادہ ہی ودیعت نہیں ہُوا۔ اُنہیں سلیقۂ شرارت کب آ سکتا ہے۔ ایسے لوگ چونکہ اختراع شر کے قطعی نااہل ہوتے ہیں۔ اس لئے عوام کا حسنِ ظن انہیں نیک مشہور کر دیتا ہے۔ کالج میں نو وارد شریف طلبہ مجھے اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ میں بھی اُن کی یکساں خاموش زندگی پر جس میں قہقہہ یا شیون کا نام تک نہ ہوتا تھا رحم کھایا کرتا تھا۔ میں ذرا سی خوشی کے موقعہ پر تمام بورڈنگ کے مسخرے لڑکوں کو اکٹھا کر کے بزم نشاط آراستہ کیا کرتا تھا جس میں شاعرانہ عشرت کے تمام لوازمات بحسن ترتیب مہیا کئے جاتے تھے۔ چونکہ سنجیدہ مزاج طلباء کو ایسی مجالس سے نفور رہا کرتا تھا۔ اس لئے ہماری بزم نوخیز زندگی سے محفوظ رہتی تھی رنج کے موقعہ پر صبر کی تلقین کا میں سخت مخالف تھا۔ اور علی رغم و الحلیم ساتھ جا کر انہ پر خوب ہائے ہو مچایا کرتا تھا۔ میرے جذباتی کیفیات میں میرا حریف بلاغت تھا ہر حال میں مجھ سے بڑھ کر تھا۔ ایک دفعہ میں نے اُنہیں حسرت کا یہ شعر سنایا

ستم کرتے نہ تھا غالب میں تم سے مہربانی کا
مگر اس بے رُخی نے لطف کھویا زندگانی کا

شعر سنکر وہ اتنے جوش میں آئے کہ کرسی سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ دم بدم قدم تیز پڑتے تھے۔ چہرے سے جنون کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ میں نے کہا ہوش کرو۔ اور پکڑ کر بٹھا دیا۔ کہنے لگے۔ بس آج سے تم بوڑھے ہو گئے۔ مجھے بھی کچھ شبہ سا ہوا۔ کیونکہ اس سے پیشتر بارہا ہم اکٹھے ناچ کود کر عمدہ شعروں کی داد دیا کرتے تھے۔ ہم کبھی کبھی شام کو قرآن مجید کا درس سننے کے لئے مغرب کے وقت اہل اللہ کے زمرے میں بھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔ ایک روز میں بلاغت کیساتھ عشا کے وقت مینہ برستے میں مکان پر واپس آیا۔ تو مجھے ایک دیرینہ حبیب کا رقعہ ملا لکھا تھا کہ "میں ہر روز اسی وقت شاہدرے سے چل کر یہاں پہنچتا ہوں لیکن ہمیشہ مایوس واپس جاتا ہوں" میں نے بلاغت سے کہا چلو تو ذرا ان کے مکان پر ہو آئیں۔ مجھے خیال تھا بلاغت انکار کر دیں گے۔ اور نا وقت کی زحمت سے میں بچ جاؤں گا۔ لیکن بلاغت فوراً تیار ہو گئے۔ اب میں نے سوچکر کہا "چلو صبح چلیں گے۔ اس وقت انہیں کیا بے آرام کرنا ہے" بلاغت کہنے لگے "واقعی تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ ہر ایسی خواہش کے پیدا ہونے کے بعد جو عزیل شان نہ ہو انکا حصول بڑھاپے کی نشانی ہے" مجھے معلوم ہوا کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور یہ بڑھاپا آج سے

تین سال پیشتر سے میرے دل و دماغ پر پیہم وار کر رہا ہے - یہ میرے جذباتی بڑھاپے کی نشانی ہے - کیونکہ گذشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتا ہوں - اور نئے دوست پیدا کرنے کا سلیقہ اپنے میں نہیں پاتا - ایک وہ زمانہ تھا کہ ہر نئے طالب علم سے مل کر اس کے مزاج کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا - یا تو اُسے شرف دوستی بخشتا تھا یا حریفِ صحبت نہ سمجھ کر اس کے ساتھ کھلے بندوں دشمنی کا اعلان کر دیا کرتا تھا - اب میری زندگی میں سوائے نوحۂ عشرت کے اور کچھ نہ رہا - میری آرزوئیں ہمیشہ میرے دوستوں کے لئے باعثِ تکلیف ہوا کرتی تھیں - میں خواہشات پیدا کرتا تھا اور دوستوں سے متوقع ہوا کرتا تھا کہ وہ میری تمناؤں کا احترام کریں - کسی دوست سے خفیف سی اشارت انکار پا کر میں آگ بگولا ہو جایا کرتا تھا - کیونکہ "نہیں" سُننے کی مجھ میں تاب نہ تھی - بی - اے کے بعد کالج سے نکل کر میں تشنۂ آب مچھلی کی طرح تڑپتا تھا - آخر ایم اے کی آرزو کا اعلان کر کے اُسی جاں بخش درسگاہ میں شامل ہو گیا - کیونکہ میرے خیالات کو سمجھنے والے میرے جذبات کو تبسم الفت سے پرورش کرنے والے ان سب سے بڑھ کر مجھ میں شوقِ انتقام کو زندہ رکھنے والی یعنی میرے حریف وہیں موجود تھے اب کبھی کوئی آرزو پیدا بھی ہوتی ہے تو کسی دوست پر ظاہر نہیں ہو سکتی کیونکہ دفترِ زندگی نے مجھے خاموشی جہاد کا عادی کر دیا ہے - میرا دل ماضی کی آرزوؤں کا مرقد ہے - اور میرا نفسِ ناطقہ اسکا سوگوار مجاور - شاید میرے دوست خوش ہوں کہ میرے مطالبات کا بوجھ اُن کے سر سے ہمیشہ کے لئے اُتر گیا ہے - اور وہ محاربات الفت سے قطعی امن میں ہو گئے ہیں لیکن اُنہیں کیا معلوم کہ پیکارِ محبت ہی کا نام زندگی ہے - دوستوں کے درمیان سلسلۂ اصرار و انکار انہیں جوان رکھتا ہے - دائمی صلح و اتفاق انحطاط جذبات کی دلیل ہے اور قطعی انحطاط کا نام مرگ ہے

حیرت ہے یادگارِ زمانِ جنوں ہنوز　　باقی ہیں شوقِ یار کی اب تک نشانیاں

بیگانۂ آرزو ابن السبیل

ہندوستان ٹریڈنگ ایجنسی بارود خانہ لاہور

حدیثِ عشق

از خان بہادر میرزا ناصر علی صاحب دہلوی

اگرت کتابِ الفت بہ نظر رسیدہ باشد
ورقے شمردہ باشی وخطے کشیدہ باشی

فارسی میں عشق و محبت کی داستانیں اس دھوم سے لکھی گئی ہیں کہ یہ مضمون زیادہ تر اسی زبان کا حصہ ہو گیا۔ اردو میں بھی یہاں کے شاعروں نے اسے خوب نباہا۔ لیکن ہندی میں اس مضمون کو جس خوبصورتی سے ادا کیا یہ اہلِ ہند کا حق تھا۔ یہاں تک اور اب تک تو جو کچھ ہوا سو ہوا جب سے نیچرانہ شاعری کا نام نکلا ہے۔ عشق و محبت کا نام مٹایا جاتا ہے۔ زلف و سنبل کے ذکر سے پریشانی ہوتی ہے۔ خط و خال سے جی گھبراتا ہے۔ نئی تہذیب والے نہیں جانتے کہ نظم میں عشق و محبت بغیر چارہ نہیں اور نثر میں بھی اس کا ذکر بُرا نہیں ؎

احوالِ ما اگرچہ مکرر شنیدۂ
سوگند مے خوریم کہ کمتر شنیدۂ

جی چاہتا ہے کہ آج اسی ذکر سے دل بہلائیے اور اس طرح سماں باندھیے کہ شاہدانِ خیال نظارہ گیانِ آئینۂ شوق بنیں۔ وہ اچھی صورتیں جو افسانوں میں سُنیں بُلائی جائیں اور عشق و محبت کے ذکر چھیڑیں۔ اب دیکھئے آئینہ خیال کی بدولت کیسی کیسی پاکیزہ شکلیں اور دل کش صورتیں دیکھنے میں آ رہی ہیں ؎

آئینہ دارے دلِ عالم نظارہ کُن
از من مپرس دیدن و نا دیدنِ کسے

عرب سے لیلیٰ اور عجم سے زلیخا۔ گلرخانِ فارس میں شیریںؔ عذرا بتانِ ہندی میں سے دمن و پدم۔ ان کے چاہنے والے ان سے کب جدا رہ سکتے ہیں۔ فرہاد و مجنوں و نل اور ان کی گرمیٔ بازار کے باعث حضرت جامیؔ و سعدیؔ اور فیضیؔ غرض اس فن کے سب اہلِ کمال جمع ہوئے۔ اور عشق و محبت کا ذکر شروع ہوا۔ کسی نے پوچھا کہ عشق کیا چیز ہے؟ جامیؔ نے فرمایا کہ اس کا حال زلیخا سے پوچھو۔ سب سے پہلے شہادت مُندی انہیں کی ہے۔ جسے "احسن القصص" کہتے ہیں۔ زلیخا نے جواب دیا کہ یہ لوگ جنہوں نے دفتر کے دفتر عشق کے لکھ ڈالے۔ کیوں نہیں بولتے؟ اور شیخ سعدیؔ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ تم سے اس مسئلہ میں اس لئے دریافت کیا جاتا ہے کہ تم کو زمانہ کا حال بہت معلوم رہا۔ اور گو تم کسی پر مرے یا نہ مرے مگر دوسرے یہ تماشہ خوب دیکھا۔ شیخ نے جواب دیا کہ مجھ جیسے روٹیوں سے مرے ہوئے کو عشق سے کیا تعلق؟ اس مسئلہ میں میرا تو عقیدہ فلسفیانہ ہے ؏

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

میری تو عمر صرف اس فکر میں کٹی کہ ؏ مرا نان دہ و کفش برسر بزن۔
اس پر نوجوانانِ عشق بولے کہ اگر تمہیں اس کا حال معلوم نہ تھا تو گلستان میں باب پنجم کہاں سے آیا؟ شیخ نے اس بات کو اس طرح ٹالنا چاہا کہ ؎

دراں مدت کہ ما را وقت خوش بود
ز ہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود

ہجرت سے جتنے برس اُس طرف گزرے تھے۔ اُس سے زیادہ اب گزر گئے۔ وہ زمانہ نہیں رہا۔ مدت ہوئی کہ طبیعتیں بدل گئیں۔ اس پر اب مجھے میر کے دیکھنے والے بولے کہ زمانہ بدلے تو بدلے مگر دل نہیں بدلتے ؎

نگویم بے وفا گل را کہ میر بنجد دل بلبل
شکستِ حُسنِ لیلیٰ حسبِ مجنوں است و معنی

وہی بات جو لیلیٰ مجنوں، شیریں و فرہاد میں تھی۔ پدماوت نے چتوڑ کی لڑائی میں۔ رانجھے اور ہیر نے پنجاب میں کر دکھائی۔ لیکن اس بحث میں وہ سوال رہا جاتا ہے کہ عشق کسے کہتے ہیں؟ لوگوں نے قیس سے کہا کہ تم کیوں نہیں بولتے؟ قیس نے جواب دیا کہ لیلیٰ کا ذکر آئے تو مجھ سے بولا جائے ؎

سوالے کرد از مجنوں نژندے	کہ بر معشوقہ ات نا ید گزندے
خدا را می شناسی گفت لیلیٰ	کہ در ہر ذرہ اش چنیم تجلےٰ

عشق کی تعریف ہی کیا اس کا حال تو وہی جانے جو کسی پر مرے اور حضرت سعدیؔ کے فرمانے کے مطابق "زِ ہر نہ آید زِ کشتگان آواز" محبت کے مارے

ہیں۔ آج کل اپنے شوہروں کے ساتھ وہ بھی وہیں پہاڑ پر ہیں۔ سب سے ملونگی۔ میری عید خاصی مزے کی ہو جائے گی۔ انہیں میری تو کاہے کی پھڑکن تھی۔ اپنے بیٹے کی خاطر یہ ساری باتیں تھیں۔ اُن کی اس طرح کی پچر سے میری اُلجھن بڑھی۔ غرض آتو جی بولیں سرکار بسم اللہ کریں۔ اصل خیر سے سدھارنے کو کہیں۔ چلتے وقت کیوں کل کل کی اور ناحق کی ناکریں۔ آپ اجازت دیں۔ غرض اجازت ملی۔ میں نے کہا کہ نہیں آپ بھی چلیے۔ کہنے لگیں تم تو ہتیلی پہ سرسوں جماتی ہو۔ بھلا وقت کے وقت اب میں کیا انتظام کروں۔ بھرا پُرا گھر خیر سے کس پر چھوڑ جاؤں۔ مجھے لے جانا چاہتیں تو پہلے سے کہتیں۔ میں نے کہا کہ امّاں جان ابھی تو بہتیرا وقت پڑا ہے۔ کپڑے نکلوا دیجئے۔ اور آج نہیں تو کل ڈاک سے روانہ ہوں گے۔ لیکن چلیں آپ بھی۔ پھر بولیں کہ اچھی چلنے کو تو چلی چلیں لیکن ٹھیرینگے کہاں۔ کوٹھی کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ ماشاءاللہ اس دھاڑے کے دھاڑے کو کوئی ٹھیرائیگا کہاں۔ تمہاری اور تمہارے میاں کی اور بات تھی کہ اپنے ماموں کے ہاں جا ٹھیرتے لیکن میرا جانا کسی صورت سے مناسب نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر میرے ماموں ہیں تو آپ کے بھی تو چچازاد بھائی ہیں۔ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ دوسرے میں نے سنا ہے جس کوٹھی میں وہ ٹھیرے ہیں اُس کے برابر ہی ایک اور کوٹھی کسوٹی پر پری محل ہے۔ وہ ہم لے لینگے۔ اور ایک آدھ دن کی ہماری مہمانی اُن کو دوبھر نہ ہوگی۔ اور آپ ابھی اِن سے تار دلوا دیں۔ وہاں وہ سب کوٹھی کا انتظام کر لیں گے۔ بولیں میری کون سنتا ہے اور میری بات ہی کونسی چلتی ہے۔ تم خود ہی کہدو۔ یہ طعن کی بات میری طبیعت کے تو خلاف ہوئی۔ لیکن رفع شر کی وجہ سے اندر ہی اندر گھُوں کر رہ گئی اور بہت بہتر کہکر وہاں سے اپنی طرف آئی۔ اُس دن کا جانا تو یوں ملتوی ہوا۔ تار وار دلوا دلوا سارا انتظام کیا۔ میری تو ساری چیزیں بندھ گئی تھیں۔ جو جو ساتھ کے لے چلنے کی چیزیں تھیں وہ امّاں جان نے الگ بندھوائیں۔ ناشتہ تیار ہوا۔ زردے کی مٹھریاں۔ سلونے۔ سموسے قیمہ بھرے۔ بیری پراٹھے۔ کھڑا قورمہ اور سینیوں کا مرغوبا یہ سب چیزیں ناشتہ دان میں بھریں۔ کچھ ناشتہ پیٹی میں رکھیں۔ آتو جی اُن کی پوتی صغرا کی امّاں اور خالہ ان سب کو امّاں جان نے اپنے ساتھ لیا۔ باہر کے آدمیوں میں سے رحیم بخش اور حبیب اللہ خاں یہ دونوں چلے۔ گاڑیاں آئیں سارا سامان لدوا سب سوار ہوئے اور محطے کی طرف روانہ ہوئے۔ دس بجے ڈاک آئی

سٹیشن

میں اور امّاں جان تو دونوں دوسرے درجہ میں بیٹھے۔ وہ مردانے ڈبہ میں چلے گئے۔ یحیٰی کے ہاتھ میں نے اُن کی ضرورت کی چیزیں وہاں بھجوائیں۔ میری مغلانی تو بےچاری سیدھی سادی نوکروں کے درجہ میں بیٹھ گئیں۔ لیکن آتو جی اور اُن کی پوتی دماغدار تھیں۔ دونوں ڈیوڑھے درجہ میں گئیں۔ غرض گاڑی روانہ ہوئی۔ رات کا وقت تھا۔ ہم اپنی اپنی نشستوں پر اپنے بستر بچھا پڑے رہے۔ امّاں جان تو سو گئیں۔ لیکن میری پلک سے پلک نہ جھپکی۔ نیند نے آنے کی قسم کھائی تھی۔ ایک بجے گاڑی دلّی پہنچی۔ رحمت علی داروغہ فیضو کو لئے کھڑے تھے۔ میں دیکھ کر نہال ہو گئی۔ داروغہ جی نے چاہا کہ فیضو کو آتو جی کے پاس بٹھائے۔ لیکن بی فیضو پھیل پڑیں کہ میں امیر کی بچی ان غریبنیوں میں ہرگز ہرگز نہ بیٹھوں گی۔ میں نے کہا کہ نہیں بہن تم جائداد کی بچی یہاں میرے پاس آؤ۔ غرض وہ اتراتی ہوئی میرے پاس آن بیٹھی۔ ڈیڑھ حاشیہ کی توڑے پنجے کی پمپ جوتی۔ گلعاری چوڑیئے کا سیدھا پیجامہ۔ زعفرانی بابریسٹ کی محرم کرتی کنٹھی پر دو تاری پیک ٹکی۔ آب رواں کا زعفرانی دوپٹہ۔ چٹکی کا چنا ٹھپّے کی گوٹ ٹکی۔ کانوں میں پھولوں کی بالیاں۔ ہاتھوں میں مہندی پور انگوٹھی چھلّا۔ مینڈھی کا جوڑا مٹکائے۔ پان کی گلوری منہ میں اڑائے عطر میں بس رہی تھی۔ میری پڑھنے والیاں کہیں گی کہ کوئی یہ فیضو کون ہے دلّی کی کونسی زندہ دل امیر گھرانہ کی بیوی ہوگی جو فیضو سے ناواقف ہو لیکن باہر والی بیویوں کی خاطر لکھتی ہوں۔ کہ اب فیضو کی عمر پچاسی چھیاسی برس کی ہے۔ کالی بھٹ رنگت جیسے بن ہوا جانور۔ آگے کے دانت ٹوٹے گُتھا ہوا ڈیل۔ منجھلا قد۔ کاٹھی بے شل۔ کالے بھونرا سے بال۔ پھیلی پھدّی ناک۔ چھوٹی آنکھیں سیاہ پتلیاں۔ لیکن آنکھ کے ڈھیلے زرد۔ چہرے پر جھرّیاں نام کو۔ کنگھی چوٹی کا بڑا خیال۔ ہر وقت کی مانگ پٹی سے مانگ چرتے چرتے دو انگل چکلی ہو گئی ہے۔ اور چندھیا کے بال اُڑ گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں۔ بڑی چٹک مٹک۔ میاں کالے صاحب جو ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ بادشاہ کے پیر تھے۔ اُن کے ہاں کی یہ دکنی چھوکری شیدی نسل کی ہے۔ اب پیر جی میاں عبدالصمد صاحب قبلہ کے ہاں جو اُن کے نواسے ہیں۔ اس کی آمد و رفت ہے۔ اور سب جگہ اُنکا ابا بھائی کہتی ہے ◆ (باقی آئندہ)

آغا حیدر حسن

ہیں۔ آج کل اپنے شوہروں کے ساتھ وہ بھی دہلی پہاڑ پر ہیں۔ سب سے زیادہ میری عید لامسی خرچے کی ہو جائے گی۔ ابھی میری تو ساہے کی بچیاں تھی۔ اپنے بیٹے کی خاطر یہ ساری باتیں تھیں۔ لڑکی کی اس طرح کی پوشاک بنوانے کی اُلجھن بڑھی۔ غرض آتو جی بولیں سرکار بسم اللہ کریں۔ اصل خیر سے سدھاریں تو کہیں۔ چلتے وقت کیوں کل کل کی اور ناحق کی ناکریں۔ آپ اجازت دیں غرض اجازت ملی۔ میں نے کہا کہ نہیں آپ بھی چلئے۔ کہنے لگیں تم تو ہتھیلی پر سرسوں جماتی ہو۔ بھلا وقت کے وقت اب میں کیا انتظام کروں۔ بھرا پُرا گھر خیر سے کس پر چھوڑ جاؤں۔ مجھے لے جانا چاہتیں تو پہلے سے کہتیں۔ میں نے کہا کہ اماں جان ابھی تو بہتیرا وقت پڑا ہے۔ کپڑے نکلوا دیجئے۔ اور آج نہیں تو کل ڈاک سے روانہ ہوں گے۔ لیکن چلیں آپ بھی۔ پھر بولیں کہ اچھی چلنے کو تو چلی چلیں لیکن ٹھیرینگے کہاں۔ کوٹھی کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ ماشاءاللہ اس دھاڑے کے دھاڑے کو کوئی ٹھیرائیگا کہاں۔ تمہاری اور تمہارے میاں کی اور بات تھی کہ اپنے ماموں کے ہاں جا ٹھیرتے لیکن میرا جانا کسی صورت سے مناسب نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر میرے ماموں ہیں تو آپ کے بھی تو چچا زاد بھائی ہیں۔ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ دوسرے میں نے سُنا ہے جس کوٹھی میں وہ ٹھیرے ہیں اُس کے برابر ہی ایک اور کوٹھی کسوٹی پر پڑی خالی ہے۔ وہ ہم لے لینگے۔ اور ایک آدھ دن کی ہماری مہمانی اُن کو دوبھر نہ ہوگی۔ اور آپ ابھی اِن سے تار دلوادیں۔ وہاں وہ سب کوٹھی کا انتظام کر لیں گے۔ بولیں میری کون سُنتا ہے اور میری بات ہی کونسی چلتی ہے۔ تم خود ہی کہدو۔ یا ماموں کی بات میری طبیعت کے تو خلاف ہوئی۔ لیکن رفع شر کی وجہ سے اندر ہی اندر گھول کر رہ گئی اور بہت بہتر کہکر وہاں سے اپنی طرف آ گئی۔ اس دن کا جانا تو یوں ملتوی ہوا تار دلوا دیا تو سارا انتظام کیا۔ میری تو ساری ہی چیزیں بندھ گئی تھیں۔ جو جو ساتھ کے لے چلنے کی چیزیں تھیں وہ اماں جان نے الگ بندھوائیں۔ ناشتہ تیار ہوا۔ نمونے کی ٹکیاں۔ سلونے۔ سموسے قیمہ بھرے۔ میری پیاری۔ کھڑا تو سے اور بسنی نانیں مرغوب یہ سب چیزیں ناشتہ دان میں بھریں۔ کچھ ناشتہ دانی میں رکھیں۔ آتو جی اُن کی پوتی صغرا کی اماں اور خالہ ان سب کو اماں جان نے اپنے ساتھ لیا۔ باہر کے آدمیوں میں سے رحیم بخش اور حبیب اللہ خاں یہ دونوں چلے۔ گاڑیاں آئیں سارا سامان لدوا سب سوار ہوئے اور سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ دس بجے ڈاک آئی

میں اور اماں جان تو دونوں دوسرے درجہ میں بیٹھے۔ وہ مردانے ڈبے میں چلے گئے۔ قلی کے ہاتھ میں نے اُن کی ضرورت کی چیزیں وہاں بھجوا دیں میری خالہ ذاتی تو بے چاری سیدھی سادی نوکروں کے درجہ میں بیٹھ گئیں۔ لیکن آتو جی اور اُن کی پوتی وہ ماقدار تھیں۔ دونوں ڈیوڑھے درجہ میں گئیں۔ غرض گاڑی روانہ ہوئی۔ رات کا وقت تھا۔ ہم اپنی اپنی نشستوں پر اپنے بستر بچھا پڑے رہے۔ اماں جان تو سو گئیں۔ لیکن میری پلک سے پلک نہ جھپکی۔ نیند نے آنے کی قسم کھائی تھی۔ ایک بجے گاڑی دلی پہنچی۔ رحمت علی داروغہ فیضو کو لئے کھڑے تھے۔ میں دیکھکر نہال ہو گئی۔ داروغہ جی نے چاہا کہ فیضو کو آتو جی کے پاس بٹھائے۔ لیکن بی فیضو مچل پڑیں کہ میں امیر کی بچی ان غریبنیوں میں ہرگز ہرگز نہ بیٹھوں گی۔ میں نے کہا کہ نہیں بہن تم چاندا کی بچی یہاں میرے پاس آؤ۔ غرض وہ اتراتی ہوئی میرے پاس آن بیٹھی۔ ڈیڑھ حاشیہ کی جوڑے پنچے کی پھندنی جوتی۔ گلناری جوڑ پیٹے کا سیدھا پاجامہ۔ زعفرانی بابر سیٹ کی کرم کرتی کنٹھی پہ دو تاری پیک ٹکی۔ آب رواں کا زعفرانی دوپٹہ۔ چکن کا چنا۔ ٹھپے کی گوٹ ٹکی۔ کانوں میں پھولوں کی بالیاں۔ ہاتھوں میں مہندی چھلا انگوٹھی چھلا۔ مینی کا جوڑا مٹکاتے۔ پان کی گلوری منہ میں اڑائے عطر میں بس رہی تھی۔ میری پڑھنے والیاں کہیں گی کہ کوئی یہ فیضو کون ہے دلی کی کونسی زندہ دل امیر گھرانہ کی بیوی ہوگی جو فیضو سے ناواقف ہونگی باہر والی بیویوں کی خاطر لکھتی ہوں۔ کہ اب فیضو کی عمر پچاسی چھیاسی برس کی ہے۔ کالی بھٹ رنگت جیسے بدہواں جانور۔ آگے کے دانت ٹوٹے گٹھا ہوا ڈیل۔ میانہ قد۔ کاٹھی بے مثل۔ کالے بھونرا سے بال۔ پھیلی ہوئی ناک چھوٹی آنکھیں سیاہ پتلیاں۔ لیکن آنکھ کے ڈھیلے سفید۔ چہرے پر جھریاں نام کو۔ کنگھی چوٹی کا بڑا خیال۔ ہر وقت کی مانگ پٹی سی مانگ چرتے چرتے دو انگل چکلی ہو گئی ہے۔ اور چندھیا کے بال اُڑ گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں۔ بڑی گفتگو چنگی۔ میاں کالے صاحب جو ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ بادشاہ کے پیر تھے۔ اُن کے ہاں کی یہ دکنی چھوکری خیدی نسل کی ہے۔ اب پیر جی میاں عبدالصمد صاحب قبلہ کے ہاں جو اُن کے نواسے ہیں۔ اس کی آمد و رفت ہے۔ اور سب کو اپنا بھائی کہتی ہے۔ (باقی آئندہ)

آغا حیدر حسن

ازمولانا عظمت اللہ خاںؒ مرحوم

دل ٹوٹ کے آتا ہے دل ٹوٹ بھی جاتا ہے

[احساس کا دوسرا نام زندگی ہے۔ جیسے عمل ورد عمل کا تانا بانا کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے ٹیگین کا یہ کہنا کہ محبت اور نفرت ساتھ ساتھ ہیں ایک اٹل سچائی اور اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ بہشت نصیب خان صاحب نے اس نظم میں زندگی کا یہی پہلو شاعرانہ اجاگر کیا ہے +

خوبصورت، خوب سیرت شاعر نے سوچ، ترنم اور آرٹ کی خوشنما جھلیلوں میں ایک کا فرادا کو بتایا ہے کہ:-

"دل ٹوٹ کے آتا ہے دل ٹوٹ بھی جاتا ہے!"

مگر بات میں بات پیدا ہو کر بات یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ بلند خیال شاعر چاہت لم پالیتا ہے:-

"چاہت ہی صداقت ہے"
"چاہت ہی عبادت ہے"
"چاہت ہی شہادت ہے"

سچ پوچھو تو شاعری ان ہی معنوں کی حکمت ہے! سیّد وزیر حسن]

(۱)

یہ دل جو ہمارا ہے
مانا کہ تمہارا ہے
چاہو تو یہ پیارا ہے
دل ٹوٹ کے آتا ہے دل ٹوٹ بھی جاتا ہے
اک بات میں ہٹ جائے
اک بات سے کٹ جائے
اک بات پہ پھٹ جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے

(۲)

چاہو تو تمہارا ہے
چاہت کا یہ مارا ہے
چاہت کا ستارا ہے
دل ٹوٹ کے آتا ہے دل ٹوٹ بھی جاتا ہے
لہجہ پہ نکھر جائے
تیور پہ بکھر جائے

اک حرف پہ مرجائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ پھندا ہے

(۳)

کیا کھیل ہے دلداری ؟
یہ کھیل نہیں پیاری
ہے کام بڑا بھاری
دل ٹوٹ کے آتا ہے دل ٹوٹ بھی جاتا ہے
اک آن میں لڑجائے
اک پل میں اکڑجائے
اک دم میں بگڑجائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ پھندا ہے

(۴)

یہ دل کا لگانا ہے
یہ خود کا مٹانا ہے
دل ہاتھ میں لانا ہے
دل ٹوٹ کے آتا ہے دل ٹوٹ بھی جاتا ہے
ٹسوؤں سے اٹک جائے
نظروں سے کھٹک جائے
ہنسیوں سے بھٹک جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ پھندا ہے

(۵)

چاہت ہی صداقت ہے
چاہت ہی عبادت ہے
چاہت ہی شہادت ہے
دل ٹوٹ کے آتا ہے دل ٹوٹ بھی جاتا ہے
اِک بھول پہ رُک جائے
اک چوک پہ جھک جائے
پھر قصہ ہی چک جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ پھندا ہے

عظمت اللہ خاں

کلامِ گرامی

بسے ہنگامہ ہا در دل کہ برہم ساختی رفتی
رمیدی از من و با مدعی پرداختی رفتی

محبت ایں چنیں عاشق نوازی ایں چنیں باید
زدی، کشتی، شکستی، سوختی، انداختی رفتی

ہزاراں و ہزاراں جان و دل اُفتادہ در راہت
بسے اندوختی رفتی بسے انداختی رفتی

گرامی

نغمۂ جو

از جناب امیر حسن صاحب ناز

تپش آفتاب کے حسن کی منوّر شعاعیں برف کے بار دو اور سفید سینے پر مچلتی ہوئی پڑیں۔ یخ کی ساکن اور منجمد تہوں میں ایک جنبش پیدا ہوئی۔ کرنوں نے اور بھی چھیڑا۔ اور لو۔ سرد چمکدار برفوں کی بے شمار آنکھوں سے پانیوں کے ننھے ننھے چشمے بہ نکلے۔ اوپر کے پتھروں نے خنک پانی کی ان پتلی پتلی دھاروں کو اشتیاق کی گودوں میں اُٹھا کر نچلے پتھروں کے آغوشِ شوق میں ڈال دیا۔ جنہوں نے اس ودیعت کو خلوص کے ہاتھوں سے اپنے دوسرے ہمجنسوں کے حوالے کردیا روانی کے مضراب نے اپنی لرزشوں کو حکم دیا۔ اور بل کھا کھا کر بہنے والی ندیاں دھیمے سروں میں گنگنانے لگیں۔ چٹانوں نے فرطِ طرب سے اپنے بازو کھول دیئے۔ وادیوں نے شوق کے وسیع آغوش کو وا کردیا۔ کہ اُن نغموں کو جنہیں چٹانوں کی پستیوں نے فراخ سطح پر بکھیر دیا تھا ایک محدود رقبہ میں اکٹھا کرلیں۔ متحرک نغموں کی بے شمار لہریں اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی مسکراتی ہوئی مختلف سمتوں سے آئیں۔ اور اپنے آپ کو وادی کی قدرتی سبز چادر پر ڈال دیا۔ خودرو پھول جیسے شبنم روئی۔ سبزہ لہلہایا اور صحیفۂ قدرت کی جاندار تصویر اپنی دھن میں مست۔ وادی کی زمینوں سے خراج اعماق وصول کرتی ہوئی آگے بڑھی رستہ کے سنگریزوں سے ہمکنار ہوتی ہوئی اردگرد کی اونچی چٹانوں کو کل من علیہا فان کے درد انگیز نغمے سناتی ہوئی میدان میں داخل ہوئی۔ پرندے جنہیں پتھروں کی بلندیاں اپنی بار و طبیعتوں کے سبب قبول نہیں کرتیں۔ شوق کے پروں سے اُڑ کر آئے۔ کہ پہاڑوں کی اس سفید پری کی پیشانیوں کو چومیں۔ ساحل کی تمام مخلوق نے حرکت کرنے والے راگوں کو سنا اور ساکت ہوگئی۔ حباب تاثیر نغمہ کی جوش انگیز کیفیتوں کو سینوں میں لئے ہوئے اُبھرے اور فوراً اشتیاق موسیقی سے بھری ہوئی لہروں کے قدموں پر لوٹ لوٹ کر مٹ گئے۔ ہواؤں نے اپنی پُر اضطراب جنبشوں سے متحرک لہروں میں ایک نیا جوش بھر دیا۔ پیدا ہونے والے ننھے لرزاں سروں میں گنگنانے لگے۔ کنارے پر کے درخت وجد میں آکر جھوم رہے تھے ان کے سامنے جذبات سے مجبور ہوکر کانپ کانپ کر لرز لرز کر بڑھے کہ لہروں سے ہمکنار ہو جائیں۔ سبزۂ خودرو کی نازک روحوں نے نغمۂ جاری سے بالیدگی حاصل کی اور مست ہوکر لہلہانے لگا۔ تغیرات زمانہ کی افسردہ کردینے والی گردشوں سے ستائے ہوئے کنج تنہائی کے شائق انسان نے آبِ رواں کے جذبہ انگیز راگوں کو سُنا۔ اور اُس کے دُنیا کے شور و شغب کی پریشان کن صداؤں سے تھکے ہوئے کانوں نے ایک ایسی راحت کا احساس کیا جو صرف فطرت کی رنگین کیفیتیں ہی عطا کرسکتی ہیں۔ اُس کے دل میں جیسے گھبراہٹوں نے تھکا دیا تھا۔ اطمینان کا تازگی کا نور چمکا۔ اور اُس کی آنکھوں نے دنیا کو ایک ابدی سرور سے ہمیشہ رہنے والی تسکین سے معمور پایا ❖

دل غمدیدہ کی حسرت بھری حالت پر خون کے آنسو رونے والے شاعر نے اپنے نوزائیدہ نغموں کو جو خیال اور تفکر کی وسعتوں میں لپٹے ہوئے جذبات عشق کی فراوانیوں کے گلے پل رہے تھے۔ دل کی گہرائیوں سے باہر نکال کر ندی کے کنارے پر ڈال دیا۔ کہ پھر واپس نہ آنے والے بہتے پانیوں کی نغز انگیز روانیوں سے تاثیر حاصل کرکے اُن دلوں کو تڑپا دیں۔ جن کی مشہور عالم بے نیازیاں اکثروں کی زندگیاں تلخ کردیا کرتی ہیں ❖

اور نغموں کی دیوی؟ وہ تو اپنے متبسم ہونٹوں سے خشکی کو دائمی سکون کے شیریں منتر سناتی ہوئی۔ اپنی روانی میں تغیرات کا خزانہ سمیٹتی ہوئی۔ سرسبز مرغزاروں کے دلکشا گودوں میں کھیلتی ہوئی کناروں کو میٹھی لوریاں سناتی ہوئی۔ اپنے وسیع نغموں کے فراخ آغوش میں مضطرب لہروں کو خوش آہنگ صداؤں سے تسکین دیتی ہوئی تیزی اور سرعت کے دامنوں پر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی نغمہ زا اداؤں سے آگے بڑھی اور دور دراز فاصلہ پر سمندر کے عدم آباد میں مع اپنے نغموں کے فنا ہوگئی ❖

امیر حسن ناز

....

اُدبائے قدیم کے طرزِ نگارش

حصۂ نظم

بلا سے دشمنِ جانی مرا سارا جہاں ہوتا
کسی صورت سے لے جاں بچا تو جانِ جاں ہوتا
جو کوئی چوٹ دل کی ساتھ تیشے کے اثر کرتی
تو جائے آب ہر چشمہ سے شیریں خوں رواں ہوتا
صنم ہے گردشِ عالم نگاہِ مہر سے تیری
اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا
خدا کے واسطے آزاد روکو نالۂ دل کو
کہ کوئی آن میں کون و مکاں ہی لامکاں ہوتا

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی

کیا دھواں دھار مسی سے اسکی ہے تحریرِ لب
دل جلو نکلا ہے یہ دودِ آہِ دامن گیرِ لب
دانۂ خالِ لب سے اپنے دام میں باتوں کے آہ
کل دکھا کر مرغِ دل میرا کیا تسخیرِ لب
تیری تحریرِ مسی نے قتل اک عالم کیا
ہے بجا اس کو میاں کہئے اگر شمشیرِ لب
اسکی باتوں سے کلیجہ چھن کے چھلنی ہوگیا
آہ یہ باتیں نہیں ہیں بلکہ ہیں یہ تیرِ لب
لب ہلانا روبرو قائم کے ہے ترکِ ادب
عذر کر آزاد تا ہو عفو یہ تقصیرِ لب

احسان اللہ مولانا سید غلام علی واسطی بلگرامی آزاد

پلا ساقیا مئے خنک آب میں
کہ تھمتی نہیں تو یہ مہتاب میں
گیا دین کیسا حضورِ نماز
وہ یاد آئے ابرو جو محراب میں
ملے کچھ تو زخمِ جگر کا مزہ
بجھا کر رکھا تیغ زہر آب میں
الٰہی فلک جس سے پھٹ جائے دے
وہ تاثیر آہِ جگر تاب میں
بلند آشیانوں پہ بجلی گری
جو نیچے تھے ڈوبے وہ سیلاب میں
وہ عریاں ہیں سرما میں تھی جن کی شب
گزرتی سمور اور سنجاب میں
نہ آئے ہوں آزردہ لینا خبر
پڑی دھوم یہ سارے پنجاب میں

افضل العلماء مولوی مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ

صبح تو جام سے گذرتی ہے
شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

ابو المظفر گوہر شاہ عالم ثانی بادشاہ غازی آفتاب

لے اُلٹتے ہیں وہ چہرہ سے نقاب
امتحانِ طالبِ دیدار ہے
تم سے ساری خدائی مل گئی
جس کے تم ہو اسکو کیا درکار ہے

سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی

خود رکھتیر کے اشارے سے سرِ بام اٹھے
کرکے مرث کو لبِ عجز سے بہ نام اٹھے
آنکھ نیچی ہوئی راجوں کی سری رگھبر سے
راکشش سہم گئے، کانپ اٹھے، بھاگے ڈر سے

منشی دوارکا پرشاد صاحب افق لکھنوی

غنچۂ دل کو نسیمِ عشق نے وا کر دیا
میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

نفس کے تابع ہوئے ایمان رخصت ہوگیا
وہ زنانے میں گھسے مہمان رخصت ہوگیا

سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی

پریوں کی محبت میں ایک حال ہے دونو کا
فرزانہ ہوا تو کیا دیوانہ ہوا تو کیا
مینیٰ یہ عالم میں دونوں ہیں دلا یکساں
ہشیار ہوا تو کیا مستانہ ہوا تو کیا

سید آغا حسن صاحب میر آغا لکھنوی امانت

ثمرہ ترا سمجھی مگر اے شیخ غور کر
کتنا لطیف طبع تھا موجد گناہ کا

کچھ وہ کھینچے کھنچے رہے کچھ ہم کھینچے کھنچے
اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

اضطراب بیخودی شب کس کے گھر پر لے چلا
میں چلا رہبر کو لے کر مجکو رہبر لے چلا

مے پرستو دیکھنا میرا دل نازک نہ ہو
آج زاہد توڑنے کو جام پتھر لے چلا

دل لگی کا ہو بُرا کیا کیا اٹھائیں ذلتیں
غیر کے گھر سا تھ مجھ کو وہ ستمگر لے چلا

مرزا عبد الغنی صاحب ارشد گورگانی

وہ کہتے ہیں شب وعدہ میں کس کے پاس آتا
تجھے تو ہوش ہی اے خانماں خراب نہ تھا

کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا
ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

امیر الشعرا مفتی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی

ہمت کا ہارنا نہ مصیبت میں چاہیئے
تھوڑا سا حوصلہ بھی طبیعت میں چاہیئے

آ جائے راہ راست پہ کافر ترا مزاج
اک بندۂ خدا تری خدمت میں چاہیئے

حاتم کا دل ہو دولت قارون ہو عمر خضر
اے داغ یہ کسی کی محبت میں چاہیئے

دل دو طرح کا تیری محبت میں چاہیئے
راحت میں ایک ایک مصیبت میں چاہیئے

کچھ لاگ کچھ لگاؤ طبیعت میں چاہیئے
دونوں طرح کا رنگ محبت میں چاہیئے

اپنا بھی کام نکلے وہ ناراض بھی نہ ہوں
ایسے مزے کی بات شکایت میں چاہیئے

نواب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
جگر کی آگ بجھے جلد جس سے وہ شے لا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نکل کے وادی وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ روز دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درون کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

سید انشاء اللہ خاں انشا

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

مصرع ہوں صف آرا صفت لشکر جرار
الفاظ کی تیزی کو نہ پہنچے کوئی تلوار

نقطے ہوں جو ڈھالیں تو الف خنجر خونخوار
مد آ کے بڑھیں برچھیوں کو تول کے اک بار

غل ہو کبھی یوں فوج کو لڑتے نہیں دیکھا
مقتل میں رن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا

میر ببر علی انیس

تیغ میں جوہر کہاں وہ ابروئے خمدار کے
زخم دکھلائی نہیں دیتے ہیں اس تلوار کے

ہم کو در پردہ محبت غائبانہ عشق ہے
لن ترانی اس سے ہو سائل ہیں جو دیدار کے

حسن کا نظارہ وہ نعمت نہیں جو دل بھرے
سیر ہو دینگے نہیں بھوکے ترے دیدار کے

خواجہ حیدر علی آتش

وارفتہ جو کسی کی کمر اور دہاں کے ہیں
ان کو خبر نہیں کہ کہاں ہیں کہاں کے ہیں

جنت کا حال کھل گیا دور شراب سے
اس میکدے میں رند بھی سارے جہاں کے ہیں

ہم کچھ ملک نہیں جو مریں حور و خلد پر
ایک بت پہ جان دیتے ہیں ہندوستان کے ہیں

اے عندلیب تو نے کہاں سے اڑا لئے
یہ رنگ میرے نالۂ آتش فشاں کے ہیں

سید بشارت علی صاحب جالب دہلوی

سوکن نے پائجامہ پہناہے گلبدن کا
پھولوں میں تل رہا ہے کانٹا مرے چمن کا

سیدھا بنایا جائے بانکا جو ٹیڑھی بولے
شاہی میں لطف تھا کچھ اے بنّو بانکپن کا

وحشی کو رام کرکے ایسی کتھا سنائی
ہردم دوگانہ کلمہ پڑھتی ہے برہمن کا

میر یار علی لکھنوی جان صاحب

شمع ساں کس نے مجھے پھولتے پھلتے دیکھا
ہوں میں وہ نخل کہ دیکھا بھی تو جلتے دیکھا

تجکو ہم اس لئے کہتے تھے کوئی دم مت جا
چل بسے ہم نہ ترے چلتے ہی چلتے دیکھا

اس کا بیمار نہ نکلا کبھی گھر سے جرأت
گھر سے تابوت ہی آخر کو نکلتے دیکھا

جناب یحیٰی امان عرف قلندر بخش جرأت اکبر آبادی

کھڑکی لگا دیوار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے
خطرہ پڑا بازار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

گھوڑا اتو تیرا لنگ ہے کوئی نہ تیرے سنگ ہے
چلنا پڑا بازار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

میر جعفر زٹل

تیغ ادا کو دیکھو دل کی سپر کو دیکھو
تیر نگہ کو دیکھو میرے جگر کو دیکھو

دیکھو نہ آئینے میں اپنی نظر کو دیکھو
حالت ہے کیا ہماری پہلے ادھر کو دیکھو

روزِ سیہ سے میرے انساں پناہ مانگے بدتر ہے شامِ غم سے رنگِ سحر کو دیکھو
سید ضامن علی جلال لکھنوی

بارِ اندوہ و الم کا کہیں ہلکا ہو جائے پھر بہار آئے الٰہی ہمیں سودا ہو جائے
عرش سے فرش تلک چھائی ہے تاریکیِ جہل آگ دنیا کو لگا دو تو اُجالا ہو جائے
ظاہرا ہستیِ ناچیز بشر ہے کیا چیز یہ وہ قطرہ ہے جو بڑھ جائے تو دریا ہو جائے
یوں نہ انسان کا برگشتہ مقدر ہو جائے میں اگر پھول اُٹھاؤں تو وہ پتھر ہو جائے
پنڈت برج نرائن صاحب وکیل چکبست

رُخِ جہانسوز تیرا دیکھا نظارۂ فروزِ حسن چمن میں
نہ بلبل و گل میں واں تعلق نہ سرو قمری میں پیار دیکھا
جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اُسکا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا
لگن میں تیری نکل گئی جو نہ جھجکے دریائے پُرخطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کرکے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا
خبر نہیں یہ کہ کیا ہے کیا ہی کون ہے اور تو کہاں ہے
یہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اک استوار دیکھا
سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں کہ گبر ترسا ہوں یا مسلماں
نہ اُن سے کچھ تیرا بیر پایا نہ اُنسے کچھ تیرا پیار دیکھا
شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

قابلِ دید ہے یہ رُسوائی ہم تماشا ہیں وہ تماشائی
ایکے یہ جوشِ گل کا عالم ہے ہو رہی ہے بہارِ سودائی
تم کو خدہ ہو میکدے والو اُودی اودی ہے پھر گھٹا چھائی
ہیں کسی کے خیال سے باتیں یوں پسند آگئی ہے تنہائی
قابلِ داد شعر اپنے حفیظ لوگ کرتے ہیں عزت افزائی
حافظ محمد علی صاحب حفیظ جونپوری

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں قبرِ بلبل کی ہے گلزار میں
اپنے یوسف کا عزیز ہوں غلام چاہے مجھکو بیچ لے بازار میں

سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا پھل لگا ہے آج نخلِ دار میں
گرمیِ خوں کی مری تاثیر دیکھ پڑ گئے چھالے تری تلوار میں
سر کے کٹنے کا مجھے کچھ غم نہیں خم نہ پڑ جائے تری تلوار میں
قبر میں روزن مری رکھنا ضرور مر گیا ہوں انتظارِ یار میں
میرا مرنا اُن کے گھر شادی ہوئی خون کے چھاپے لگے دیوار میں
بعد مردن میرے لاشے کو تدبیر دفن کرنا کوچۂ دلدار میں
مرزا سلامت علی صاحب تدبیر

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
خواجہ میر درد دہلوی

وقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں
واعظا چھوڑ ذکرِ جنت و حور کر شراب و کباب کی باتیں
سنتے ہیں اُن کو چھیڑ چھیڑ کے ہم کس مزے سے عتاب کی باتیں
شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق دہلوی

بتوں کے در پہ سب کی جبہہ سائی ہوتی جاتی ہے
انہیں کے قبضہ میں اب تو خدائی ہوتی جاتی ہے
سنا ہے آج گردوں ہاں نے۔ تو کل وہ بھی سن لینگے
مری باتوں کی اب اُن تک رسائی ہوتی جاتی ہے
خدا جانے ہے یہ کیا بھید کیا ہو نا ہے اسے کافر
جدھر تو ہے اُدھر ساری خدائی ہوتی جاتی ہے
اُمید وصل کیا ہو عاشقِ ناکام کو اُس سے
مزاجِ یار میں اب پارسائی ہوتی جاتی ہے
پھنسا کر زلف میں دل عمر بھر اُن کی بلا رکھے
اسیری ہوتی جاتی ہے رہائی ہوتی جاتی ہے
پنڈت رتن ناتھ سرشار

کیا غضب ہے کہ جا ر آنکھوں میں — دل چُراتا ہے یار آنکھوں میں
چشمِ کیفی کے سرخ ڈوروں سے — چھا رہی ہے بہار آنکھوں میں
گر پڑا طفلِ اشک یہ مچلا — میں نے رُوکا ہزار آنکھوں میں
جب سے اپنا لقب ہوا ہے سرور — روز و شب ہے خمار آنکھوں میں

مرزا رجب علی بیگ سرور

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سوجا — کہ گذر گئی شب آدھی دلِ بیقرار سوجا
یہ تیری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے — مرے پردہ دار سوجا مرے رازدار سوجا
ابھی داستان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل — یہ تپش کا آہ شیوا نہ کر اختیار سوجا
تجھے جن کا ہے تصور ارے مستِ جامِ الفت — انہیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سوجا
تجھے پہلا سابقہ ہے شبِ غم بُری بلا ہے — کہیں مر مٹے نہ ظالم دلِ بیقرار سوجا

منشی دُرگا سہائے سرور

افسردہ سہارے تری مٹھی میں ہیں اے دل — یہ تیر تو وہ ہیں جو نشانے سے اُچٹ جائیں
اے عشق تری شوخیاں اب حد سے سوا ہیں — خطرہ ہے کہیں حسن کے تیور نہ پلٹ جائیں
تیری نظرِ لطف پہ بنیادِ جہاں ہے — برپا ہو قیامت تو یہ تیور جو پلٹ جائیں
کس کام کی اے دل وہ ترقی کی اُمنگیں — ہر دم صفِ انجم سے جو ٹکرا کے پلٹ جائیں
بلبل جو اُڑاتی ہے دھواں سوزِ جگر سے — اندیشہ ہے پھولوں کے کہیں رنگ نہ کٹ جائیں
تم اور قیامت کا نہ دکھلاؤ تماشہ — فتنے نہ کہیں آن کے دامن سے لپٹ جائیں
رکھ نفس کے جادوں سے سلیم آپکو محفوظ — یہ سانپ ہیں وہ کاٹ کے جو دم میں اُلٹ جائیں

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے — سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں
غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب — تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھائے — جو کچھ دوست سے اپنے ہم دیکھتے ہیں
مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا — اُسے تیرے کوچہ میں کم دیکھتے ہیں

مرزا محمد رفیع سودا

تیس دن کے لئے ترک مے و ساقی کر لوں — واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال — ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش — میں ذرا عمرِ گذشتہ کی تلافی کر لوں
کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے — تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں
اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل — غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر لوں
دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلی — خوب گنتے فلکِ دوں سے جو یاری کر لوں

مولانا شبلی

عدم سے بشر آئے گا ایک دن تو — زمانہ کہے گا آ ہے نیک دن
لڑکپن کے دن ہونگے شاہی کے دن — محبت کے دن بے گناہی کے دن

خوشی ان دنوں نور برسائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائے گی

پھر آئے گا مدہوش کرنے شباب — رہے گا خیال شراب و کباب
کبھی جوشِ مستی کبھی نوش خواب — نہ فکرِ ثواب و نہ خوفِ عذاب

گھٹا دل پہ پندار کی چھائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

سپاہی جوانمرد کہلائے گا — لڑائی میں زخمِ گراں پائے گا
غش آئے گا سیر ہوں لہو جائے گا — کراہے گا۔ تڑپے گا۔ چلائے گا

قضا بوند پانی کو ترسائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

بشر ہو گا عالم میں ذی احتشام — بڑھے گی لیاقت سے شہرت تمام
رہے گو نہ شہرت بھی اس کی مدام — کہ شہرت کو بھی یاں نہیں ہے قیام

یہ شہرت نیا رنگ چمکائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

طالب بنارسی

یہ چپکے خزاں میں کوئی کیوں سُنا کرے — گُل ہی نہ ہو تو بلبلِ شیدا کو کیا کرے
بجلی نے جبکہ اپنا نشیمن جلا دیا — رنگِ چمن پہ کون دل و جاں فدا کرے
چمپا نہیں گلاب نہیں موتیا نہیں — گلچین سوکھی شاخ سے پتّے چنا کرے

پروانہ وار کیوں ہو نثارِ چراغِ حُسن
مو ہم غم کی آگ میں دل کیوں جلا کرے

آنریبل میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں

جلد ۱۱ — نمبر ۸۹

(جملہ حقوق محفوظ)

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے اس لئے ہمیشہ اسمیں اشتہار دو

قیمت سالانہ بذریعہ دی پی مع محصول ۳ ۔ ممالک غیر سے ۸ شلنگ ۔ فی پرچہ ۵ روپیہ کمپنی کبٹال پر ۸

"ایجاد ہمارا حصہ ہے — اور تقلید دوسروں کا"

ایڈیٹر: حکیم محمد یوسف حسن

فہرست مضامین

تعداد اشاعت ۵۲۵۰

نومبر ۱۹۳۱ء

کریمی پریس لاہور بیرون شیرانوالہ گیٹ۔ باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر و پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور سے شایع کیا

(۴۹۶)

شذرات

نیازمندانِ لاہور کے نام دکھنی بھائیوں کا پیغام

نیرنگ خیال میں نیازمندانِ لاہور کی طرف سے ایک تنقید دیباچہ نگاران غنچۂ تبسم پر شائع ہوئی تھی۔ اس تنقید کا ابھی تک کسی طرف سے جواب موصول نہیں ہوا۔ اس کے بعد دیباچہ نگاروں کی حمایت میں ایک مضمون "نقادانِ ادب لاہور" کی طرف سے شائع ہوا جس میں کسی حد تک دیباچہ نویسوں کی حمایت کی گئی تھی۔ اگر غنچۂ تبسم کی وہ مٹی پلید ہوئی کہ جس شخص نے اصل کتاب نہ پڑھی ہو وہ اس مضمون کو دروغ بے فروغ ہی سمجھے کیونکہ کسی ایک کتاب میں اس قسم کی اتنی غلطیاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ہونگی ؛

حیدرآباد میں ایک روزنامہ "منشور" کے نام سے شایع ہوتا ہے۔ اُس کے "لیل و نہار" کے کالم کی تحت میں نیازمندانِ لاہور کے نام ایک پیغام دکھنی بھائیوں کی طرف سے درج ہے جس کی نقل "نیازمندانِ لاہور"۔ "نقادانِ ادب لاہور" او ناظرین نیرنگِ خیال کی اطلاع کے لئے درج ذیل کی جاتی ہے :-

"نیازمندانِ لاہور سے"

"ہم نے "نیرنگِ خیال" لاہور میں ایک چندے کا مضمون دیکھا ہے۔ جو ایک کتاب کے پانچ دیباچوں پر تنقید ہے۔ تنقید کیا ہے یہ کہئے کہ دیباچہ نویسو اور مصنف کی نبض دیکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اتفاق سے ایک ایسے حیدرآبادی مضمون نگار کے مذاقیہ مضامین کا گنجینہ ہے جو ہندوستان کے تمام "نگار" اور نیرنگِ خیال کے قبل رسائل کی مدت سے آبیاری کر رہے ہیں۔ ہم "نیازمندانِ لاہور" کے اس مضمون کی اکثر باتوں سے اتفاق رائے رکھتے ہیں۔ اور تسلیم کرتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی کتاب پر پانچ گرانبار دیباچوں کا لگانا "کتاب کا جلوس نکالنے" کے برابر ہے۔ اور پھر چند عدد نیازمندوں کی تنقید سونے پر سہاگہ کا اثر رکھتی ہے۔ جس نے ہم کو بھی اس غنچہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کردیا ؛

ہم اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ ہمارے یہاں مذاقیہ نگار ظرافت کو متعفن تحریر سمجھتے ہیں۔ اور ایسی تحریروں پر کسی سمجھدار آدمی کو اپنے بزرگوں کی تصویر لگانا جائز نہیں ہے ہم یہ مرض بھی دیکھ رہے ہیں کہ لوگ ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے چندہ دہندہ بن کر اپنے نام کے ساتھ یم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) اسی طرح شان سے لگاتے ہیں گویا "خاص جارج پنجم کے دست مبارک سے انہیں سند ملی ہے۔ بیشک یم۔ آر۔ اے۔ یس کی وقعت آر۔ یس۔ ڈی۔ پی سے کچھ بڑھ کر نہیں ہے۔ اور ہم اس بات کے بھی روادار نہیں اپنے معمولی سے معمولی کام کو اپنے دوستوں سے تعریف کروا کے بازار میں وقعت حاصل کریں لیکن ہم "نیازمندانِ لاہور" سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اُنہوں نے حیدرآباد کے ایک رسائلی مضمون نگار کے ساتھ تمام دکن لپیٹ لیا۔ اور دکن اور اہلِ دکن پر بیدریغ حملہ کردیا۔ اگر کسی حیدرآبادی مضمون نگار میں ایسی شانِ انانیت پیدا ہوگئی ہے تو اس کے اہل حیدرآباد ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہ تو لاہوری رسائل کی خصوصیت ہو تو ہو کہ محض چند خریدار اور چند مضامین کی فراہمی کرنے والے مضمون نگاروں کو مسٹر سے مولوی، مولوی سے مولانا، اور مولانا سے علامہ بنادیں۔ اس کے مضامین پر لمبے چوڑے نوٹ لکھیں۔ اس کو آسمان پر بٹھادیں۔ اور پھر اگر اس طرح بد ذوقی کی تربیت دینے کے بعد اس کے نتائج خراب ہوں تو اس مضمون نگار کو چھوڑ کر اُس کے ملک کو بُرا بھلا کہنا شروع کردیں۔ یہ "نیازمندانِ لاہور" سے ہم کہدینا چاہتے ہیں کہ "خاکِ پاءِ دکن" کو اس طرح سمجھنے میں آن سے بھاری غلطی ہوئی ہے۔ رہی زبان اور اس پر اعتراض اس کا تو یہ عالم ہے کہ نہ لاہور، دہلی اور لکھنؤ۔ بے کا دعوی کرسکتا ہے اور نہ حیدرآباد۔ البتہ دکن قدیم زبان اردو کا گہوارہ ہے۔ جس کو محمود شیرانی نے پنجابی بنانے کی ناکام کوشش کی۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ اردو کو ٹکسالی انداز میں نہ لاہور استعمال کرنے کا دعوی کرسکتا ہے نہ ہم۔ ہمیں یاد ہے کہ میٹرک میں ہمیں ایک پنجابی اُستاد تاریخ و جغرافیہ پڑھاتے تھے ایک مرتبہ انہوں نے کہا "تم لوگ "نے" استعمال غلط کرتے ہیں۔ آخر تمہیں کیا ہوا ہے۔ تمام حیدرآبادیوں میں یہ مرض عام ہے"۔ ایک طالب علم نے جواب دیا "صاحب

ہم نے " کا استعمال سرے سے کرتے ہی نہیں ۔ مگر آپ جہاں کرتے ہیں غلط" اس پر استاد صاحب جھنجلا کر کہنے لگے " ہم نے ایسا کب کیا ہوا ہے" اس طرح چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نکال کر کسی ملک کے تمام رہنے والوں پر فقرے کسنا کم از کم نیاز مندی کے آئین سے بہت دور ہے ۔ ہم تو برگشتہ ٹھیرے ۔ کہہ دینا ہمارا کام ہے ۔ ورنہ ہمارا نیاز مندوں سے کوئی تعلق اور نہ " جلوسیوں " سے +

خاکسارانِ دکن

خاکساران دکن نے " منشور " میں جو اپیل ونمارِ تحریر شایع کی ہے یہ اُن کے حُسن مذاق کی دلیل ہے ۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے نیاز مندانِ لاہور نے تمام دکن کو حضرت مولانا تمکین کاظمی کے جرائم کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا ۔ رہا یہ کہ لاہور کے رسایل بعض مضمون نگاروں کو مولوی سے مولانا اور مولانا سے علامہ بنا دیتے ہیں ۔ یہ اہل لاہور کا اخلاق ہے ۔ البتہ کسی " مولوی " کو " علامہ " بنا دینے کی ذمہ داری نیرنگِ خیال پر عاید نہیں ہو سکتی ۔ جہاں تک ہمارا حافظہ کام کرتا ہے ہم نے " علامہ " کا لفظ آج تک کسی ایسے مضمون نگار کے نام کے ساتھ نہیں لکھا جس کی قابلیت ہمارے خیال میں صرف مضمون نویسی تک ہی محدود تھی ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ بعض ایسے مضمون نگار بھی ہیں جن کے مضامین پیشتر نیرنگ خیال میں شایع ہوتے رہے ہیں ۔ اور اب شایع نہیں ہوتے ۔ اس میں ہمارا قصور نہیں ۔ یہ ایسے مضمون نگاروں کے فن سرقہ میں انحطاط کے مترادف ہے ۔ ہمیں حال ہی میں دکن کے ایک اہل قلم نے توجہ دلائی ہے کہ وہ فلاں مضمون نگار کے تمام مضامین کو دوسروں کے مضامین کا چربہ یا نقل ثابت کرنے پر تیار ہیں ۔ ہم نے ایسے " چور مضمون نگاروں " کو مزید رسوائی سے بچانے کے لئے اپنے دکنی جاسوس کی خدمات مستعار لینے سے انکار کر دیا +

سالنامہ نیرنگِ خیال

سالنامہ نیرنگِ خیال کے متعلق وقتاً فوقتاً ضروری اطلاعات نیرنگ خیال میں شایع ہوتی رہتی ہیں ۔ سالنامہ نیرنگِ خیال میں تین تین رنگ کے آٹھ دس بلاک شایع ہو رہے ہیں ۔ ہر تصویر کا سائز بڑا اور آرٹ پیپر اعلیٰ قسم کا ہوگا ۔ اگر ان تصاویر کی قیمت ہی شمار کی جائے تو ڈیڑھ روپیہ سے زاید ہوگی ۔ مضامین کے متعلق ایک مطبوعہ پمفلٹ ان اصحاب کی خدمت میں پیشتر بھیجدیا جائے گا ۔ جنہوں نے گذشتہ سال سالنامہ کا وی پی وصول کیا تھا ۔ تاکہ وہ دیکھ لیں کہ اس سالنامہ کی تکمیل میں کن کن ادیبوں نے حصہ لیا ہے ۔ یہ پمفلٹ یکم دسمبر تک سالنامہ کے تمام خریداروں کو پہنچ جائے گا ۔ جن خریداروں تک یہ پمفلٹ نہ پہنچے وہ سمجھ لیں کہ اُن کا نام کسیطرح درج رجسٹر ہونے سے رہ گیا ہے ۔ اس لئے وہ دوبارہ درخواست بھیج دیں +

دفتر نیرنگِ خیال میں ہر ڈاک جو موصول ہوتی ہے وہ سالنامہ کے لئے نام درج کرانے والوں کی ایک نئی جماعت ساتھ لاتی ہے ۔ اگر آپ نے ابھی تک نام درج نہیں کرایا تو دیر نہ کیجئے ۔ آج ہی ایک کارڈ لکھ کر نام درج کرا دیجئے +

سالنامہ نیرنگ خیال یقیناً بہترین سالنامہ ہوگا

دسمبر میں ہندوستان بھر کے ادبی رسایل اپنے اپنے سالنامے شایع کریں گے ۔ یہ جذبہ اردو زبان اور رسایل کی ترقی کے لئے بیحد قیمتی ہے ۔ جب ہم دسمبر میں سالناموں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں بے حد مسرت ہوتی ہے ۔ کیونکہ نیرنگ خیال ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے اوّل اس نے سالنامہ شایع کر کے رسایل کی راہنمائی کی ۔ اور زبان اور جرائد کی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں کھول دیں ۔ جہاں ہم دوسرے رسایل کے سالناموں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ۔ وہاں نیرنگ خیال کے سالنامہ کو سب سے بہتر حالت میں پیش کر کے اس حقیقت کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ " ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا "

ایڈیٹر

مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم ومغفور

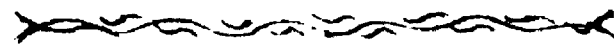
ادبائے قدیم کے طرزِ نگارش میں مسٹر خلیل احمد صاحب بی ۔ اے نے تعارف کی تحت میں مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم کے حالات میں جو کچھ لکھا ہے وہ تصحیح کا محتاج ہے ۔ خلیل صاحب نے مرزا سلطان احمد مرحوم کو مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا برادر خورد لکھ دیا ہے ۔ حالانکہ آپ مرزا غلام احمد صاحب کے فرزند ارجمند تھے ۔ امید ہے کہ ناظرین تصحیح کر لیں گے +

دلچسپ اور سبق آموز افسانے درج ہوں گے۔ اس کے بعد سالنامہ ۸ تاریخ کو ڈاک میں ڈالا جائے گا۔ اور صرف اُن اشخاص کو بھیجا جائے گا جنہوں نے وی۔ پی کی اجازت دی ہے۔ امسال وی پی کی شرح دو آنہ کی جگہ تین آنہ ہو گئی ہے۔ اس لئے وی پی ۱۲ کی جگہ ۱۳ کا ہوگا۔ ناظرین نوٹ کرلیں +

پہلے نیرنگ خیال کی تاریخ اشاعت ۴ تھی لیکن اب ۸ کر دی گئی ہے۔ کیونکہ کثرت اشاعت کی وجہ سے ۴ تاریخ تک پرچہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ پہلے سائز چھوٹا تھا اور ایک کاپی میں آٹھ صفحے ہوتے تھے۔ اب چار صفحے ہیں۔ گویا چھپائی پر دوگنا وقت صرف ہوتا ہے۔ اس لئے نیرنگ خیال کی تاریخ اشاعت ۸ سمجھنی چاہئے +

جنوری ۱۹۳۲ء سے نیا اہتمام

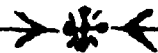
جنوری ۱۹۳۲ء سے نیرنگ خیال کی خوبیوں میں مزید اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ہر پرچہ میں ایک رنگین اور آٹھ یک رنگ تصاویر شایع ہوا کرینگی۔ بہت سے مضامین باتصویر شایع ہوں گے۔ نیز مضامین میں بھی خاص جدتیں پیدا کی جائینگی۔ ان تمام کوششوں کا صلہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ نیرنگِ خیال سے اپنا تعلق دائمی رکھیں اور دوست و احباب کو اس کی توسیع اشاعت کے لئے توجہ دلاتے رہیں +



نیرنگِ خیال کے ایجنٹ

یورپ میں جسقدر رسائل اور اخبارات ایجنسیوں پر فروخت ہوتے ہیں اُس کا سولھواں حصّہ بھی براہِ راست نہیں خریدے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شہر اور ہر قصبہ میں اخبار اور رسائل بیچنے والی ایجنسیاں قایم ہیں جہاں سے لوگ بغیر کسی تحریک و تحریص کے اپنے لئے پرچے خرید لیتے ہیں۔ یا ایجنسیاں خریداروں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے گھروں پر رسایل پہنچا دیتی ہیں۔ وہاں تمام ایجنٹ مال نقد قیمت پر خریدتے ہیں۔ یا کم از کم اتنی رقم بطور ضمانت جمع کرا دیتے ہیں جو آن کے ایک مہینہ یا ایک سال کے بل کے برابر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بھی انگریزی اخبارات مثلاً پاؤنیر سٹیٹسمین، ٹائمز آف انڈیا اور سول ملٹری گزٹ کا یہی قاعدہ ہے۔ بغیر نقد ضمانت یا پیشگی رقم کے وہ اخبار ایجنٹوں کے نام نہیں بھیجتے۔ مگر اردو رسایل اور اخبارات کا خدا حافظ ہے۔ اردو جرنلزم کی حالت ابھی تک شیرخوار بچّہ کی مثل ہے۔ اسیطرح سے ان رسایل کی ایجنسیاں بھی شیرخوارگی کی حالت میں ہیں۔ رسالہ نیرنگ خیال اور تازیانہ ریویو کو جسقدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ سمجھ لیجئے کہ کم از کم دو ہزار کی رقم ان ظالموں نے ہضم کر رکھی ہے۔ اس پر ہم نے بددیانت ایجنٹوں سے قطع تعلق کر لیا۔ لیکن موجودہ حالت بھی یہ ہے کہ جن ایجنٹوں سے ہمارا تعلق ہے۔ اُن میں سے نصف کے قریب تو خود بخود رقوم ہر ماہ بھیج دیتے ہیں۔ باقی نصف وہ ہیں جو دو تین ماہ کے بعد کچھ بھیج دیتے ہیں۔ اور ایک معقول رقم ہمیشہ دبائے رکھتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑی شکایت ایک اور پیدا ہوئی ہے وہ بددیانت ایجنٹوں کی "سیہ کاریاں" ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ "سیہ کار ایجنٹ" چند رسالے خرید کر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور اپنے اخبار خریدنے والوں کو پڑھنے کے لئے دیدیتے ہیں۔ جب وہ رسالہ پڑھ لیتے ہیں تو اُن سے ایک آنہ کرایہ وصول کر کے وہی رسالہ دوسرے آدمی کو دے دیتے ہیں۔ اس قسم کی ذلیل حرکت ایک اخلاقی گناہ ہے جسمیں ایجنٹ اور رسالہ پڑھنے والے دونوں حصّہ لیتے ہیں۔ یہ "پریکٹس" دہلی میں دیر سے جاری ہے۔ اس لئے ہم دہلی میں اب کسی بھی ایجنٹ کو مال بھیجنے کو تیار نہیں۔ اہلِ دہلی براہِ راست دفتر سے وی پی منگوالیں۔ ایک دو اور شہروں کے متعلق بھی شکایت آئی ہے۔ اُس کے متعلق بھی تحقیقات کی جا رہی ہے۔ اگر درست ثابت ہوئی تو رسالہ وہاں بھی کسی ایجنٹ کو نہ بھیجا جائے گا۔ یہ طریقہ اردو جرنلزم کو بے حد نقصان پہنچائے گا۔ اس لئے اخبار میں حضرات کو اس سے بچنا لازم ہے +

اسسٹنٹ ایڈیٹر



اُصولِ ادب

رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک مضمون کا ترجمہ

(براہِ راست بنگالی زبان سے)

از جناب ڈاکٹر ایم ضیاء الدین امرتسری

پہیلیوں کی کہانی میں جاسوس کا لڑکا۔ سوداگر کا لڑکا اور بادشاہ زادہ تینوں شہزادی کی تلاش میں خطرناک سفر اختیار کرتے ہیں۔ تین مختلف پہلوؤں سے تین قسم کی ذہنیتیں اُس حقیقت کو جسے شاہزادی اپنی شخصیت میں پیش کرتی ہے۔ دریافت کرنا چاہتے ہیں +

ان میں سے ایک تو تجزیہ اور تقسیم کے ذریعہ حقیقت کی چھان بین کرتا ہے شہزادی کے قلب اور تن بدن کے پوشیدہ راز ڈھونڈھتا ہے۔ شہزادی اس اصولِ تحقیق کے مطابق کسی دوسری لڑکی سے مختلف نہیں۔ دایا اور شہزادی میں امتیاز نہیں۔ جاسوس کو جذبات سے تعلق نہیں۔ وہ بذاتِ خود فلسفی ہو یا سائنسدان اس کے نزدیک ضرورت اور مشقت کی بھی قیمت نہیں وہ صرف نفسِ سوال کو دیکھتا ہے +

شہزادی کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ اس رخ سے مشاہدہ کرنے والا اُسے کسی ضرورت اور دفع الوقتی کے خیال سے دیکھتا ہے۔ مثلاً شہزادی کاتتی ہے۔ کاڑھتی ہے۔ اور بُنتی ہے۔ سوداگر شہزادی کا چرخہ پھرا دیکھتا ہے۔ کرگہ پر بیٹھے اس کا بُننا دیکھتا ہے۔ اور سیتے وقت اس کی سوئی کی حرکت کو دیکھتا ہے۔ سوداگر کی نظر میں بھی جذبات کی اہمیت نہیں اور نہ ہی اس کا مقصد کسی سوال کا حل دریافت کرنا ہے۔ سوداگر حساب کرتا ہے۔

بادشاہ کا بیٹا ماہرِ طبیعیات نہیں۔ فلسفہ سے بہرہ ور نہیں۔ اور نہ اُس نے علم اقتصادیات کا کوئی امتحان پاس کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اُس نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے وہ اس کا بیسواں برس ہے اور صرف قصوں ہی میں پائی جانے والی جسمانی ہمت۔ شہزادے نے بہت سے دشوار گزار راستے طے کئے ہیں۔ علم کی تحصیل کے لئے نہیں۔ اور نہ ہی خزانوں کو لوٹ لانے کے لئے۔ بلکہ شہزادی کے لئے۔ اس شہزادی کا محل بھی کسی سائنس کی تجربہ گاہ میں نہیں۔ اور نہ کسی مارکیٹ کی سڑک پر ہے۔ شہزادی کا محل شاہزادے کے دل کی جنت میں ہے۔ جہاں موسم بہار کو زوال نہیں۔ جہاں شاعر کے تخیل کے سایہ تلے سدا پھول کھلے رہتے ہیں +

جسے منطق نہیں پہچانتی۔ جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ جس کی قیمت اس کی ضرورت کے مطابق نہیں۔ جسے صرف دل ہی دل میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ ادب میں رونما ہوتا ہے۔ اور وہ جمالیات کا نفسِ مضمون ہے۔ کوئی شخص بھی جسے سرور کی حس کا ملکہ حاصل ہے۔ وہ فنِ ادب پر کبھی یہ سوال نہیں کر سکتا۔ "فنِ ادب تو کیا ہے! کیوں ہے؟" بلکہ وہ کہتا ہے "ادب تو ہی اور جو کچھ بھی تو ہے میرے لئے بس ہے"۔ یہ وہی بات ہے جو شہزادہ نے شہزادی کے کان میں کہی تھی۔ اور یہ انہی الفاظ کو صحیح جامہ پہنانے کے لئے تھا کہ شاہجہان نے تاج محل تعمیر کیا!

ہم صرف اُس شے کی تعریف کر سکتے ہیں جسے ماپا جا سکتا ہے۔ اور جو کچھ پیمانہ کی گرفت سے باہر ہے اُسے تعقلاً دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے مشاہدہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ [illegible] ہم لامحدود ہستی کا قرب لفظ بول کر حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی فہم و ادراک سے اُسے جان سکتے ہیں اُسے ہم صرف باطنی آگہی سے پہچان سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ سرور ہے۔ اور جس کے ہوتے ہوئے خوف نہیں رہتا۔ ہماری روح میں اس مشاہدہ کو جلد از جلد حاصل کرنے کی تشنگی موجود ہے۔ اور یہ اُسی ذات کے مشاہدہ سے ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچاننے کے قابل ہوتے ہیں۔ عشق، مراقبہ اور وہ انکشاف جو اس ہستی کو دکھا سکتا ہے۔ ادب میں ظاہر ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں اس کا کشف حاصل ہوتا ہے +

وہ جگہ جو دیواروں سے محصور ہے میرا تجارتی دفتر ہے۔ وہاں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہاں زمین کا کرایہ گزوں کے حساب سے لیا جاتا ہے۔ اور دیا جاتا ہے۔ باہر ——— جہاں آسمان میں تارے ہی ستارے جگمگا رہے ہیں۔ اُس نامحدود فضا کا مشاہدہ ہم اس ذوقِ حسن کی بدولت کرتے ہیں جس کا خاصہ اور محویت و مستی میں لطف پاتا ہے۔ یہ فضا لامتناہی یا بیکراں وسعت ہماری جسمانی ضروریات کے لئے محض بے کار ہے۔ وہ کیڑے جو زمین کے اندر رہتے ہیں۔ اس ضرورت کی نفی کو ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح آدم کی اولاد ایسی بھی ہے جس کے لئے آسمان کا سر پر نہ ہونا چنداں تکلیف کا باعث نہیں۔ اُن کے دلوں کی وہ حس وہ جذبہ جو ضرورت کے قفس کی سلاخوں سے باہر پر پھیلا کر اُڑ سکنے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا مر چکا ہے۔ اسی قسم کے مردہ دلوں سے تنگ آکر شاعر یہ دعا مانگنے پر مجبور ہوا تھا۔ "آہی مجھے بے حس اور بے حجم روحوں کے سامنے لطیف اور مسرت افزا سامان پیش کرنے کی مصیبت میں مبتلا نہ کر"۔

لیکن شاہزادہ کا دل حساس ہے۔ وہ شہزادی میں اُسی لامحدود کو پاتا ہے۔ جو اُس صدا جگمگانے والے آسمان میں ہے۔ شہزادہ کا دل اس مشاہدہ کا جواب بھی اسی انداز میں دیتا ہے۔ جو اس قسم کے احساسات کا حق ہے۔ لیکن دوسروں کا مسلک اور ہے۔ اگر شہزادی کی نبض کی ٹھوک اور اُس کی تال کو ناپا ہو تو اُس کے لئے مضائقہ نہیں کہ وہ ایک مشین کی ٹیوب لے کر پہنچے۔ اور تاجر سمجھتا ہے کہ وہ خود شہزادی کو اپنے ہاتھوں سے نکالا ہوا کھوٹی مشین کے پیسوں میں محفوظ کر لیتا ہے۔ لیکن شہزادہ کبھی خواب میں بھی یہ سوچ نہیں سکتا۔ کہ مشین کے کڑے شاہزادی کے ہاتھوں میں پہنائے جا سکیں۔ اگر بالفرض محال وہ ایسا خواب دیکھے تو دہشت سے چونک اُٹھے اور جب وہ بیدار ہو جائے تو صرف اس صورت میں کہ مشین اگر روئے زمین سے ناپید ہو چکا ہو۔ وہ تہذیب کی گلیوں کو تلاش کر کے لائیگا۔

آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ شکایت میں فصاحت کو دخل کیوں ہو۔ کی صرف نجو کیوں کہتے ہیں۔ مزید مشتی کی علامت ہے۔ ہاں جو اپنی اولاد میں اپنی محبت کی انتہا کو پاتی ہے۔ وہ اپنے لختِ جگر کے جسم میں اپنے سرور کی انتہا کو پاتی ہے۔ اسے سنوارتی ہے۔ اس کا سنگھار کرتی ہے۔ اپنے خدمتگار کو ہم ایک محدود نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی خدمات کا معاوضہ ہمارے ایک معین رقم کی ہے۔ لیکن دوست کو ہم نظر سے غیر محدود حد تک دیکھتے ہیں۔

کرتے ہیں۔ اور یہی وہ نقطۂ نگاہ ہے جو گلستانِ فصاحت میں ہماری زبان میں ہمارے آداب و اخلاق میں اپنی بہار دکھاتا ہے۔ ہمارے اندازِ تکلم میں۔ ہمارے لہجہ میں تبسم میں۔ ہماری خوش آمدید میں۔ ہماری ادبی تحریر میں ہم اپنے دوست کو رنگین اور مرصع الفاظ میں یاد کرتے ہیں جن کا مقصد ان الفاظ کے معانی میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ان الفاظ سے پیدا ہونے والے پیغام کے اُس احساس میں ہوتا ہے جو الفاظ کے وزن اور ترنم کی گونج سے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ شکل اور کیفیت وہ صورت اور تخیلات جو استدلال سے ثابت نہیں کئے جا سکتے ادب میں رونما ہوتے ہیں۔

انگریزی زبان میں جسے (Reality) حقیقی کہتے ہیں۔ وہ ہماری زبان میں (سا زتحمک) خصوصیتِ ممیزہ کہلاتی ہے۔ عام حقیقت یا واقعیت ایک بات ہے اور مخصوص حقیقت ایک دوسری چیز۔ عام قسم کے حقائق میں تخصیص نہیں ہوتی۔ یہ صرف ممتاز حقیقت ہے جو مخصوص اور منتخبہ ہے۔ ہر قسم کے انسان ایک عام حقیقت کے زمرہ میں شامل ہیں۔ لیکن کسی خصوصیت کی بنا پر انتخاب ہونیوالا انسان کروڑوں میں ایک ہوتا ہے۔ جب والمیکی نے اپنے جذبۂ رحم کی شدید ترغیب سے نظم کا سننے پر مجبور ہوئے تو یہ صرف رشی نارد کی مدد سے تھا کہ وہ ایک خاص شخصیت کے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ جن کی شخصی خصوصیت والمیکی کے اشعار کے وزن اور ترنم کی مستحق قرار دی جا سکتی تھی۔

میرا یہ مقصد نہیں کہ امتیازی خصوصیت کا لحاظ ہوا کرتا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جو شے میرے لئے کسی خصوصیت کے ساتھ حقیقی نہیں۔ کسی شاعر یا فنِ لطیفہ کے ماہر کی دنیا کے حقائق اپنی حدود میں بہت وسیع ہوتی ہے۔ وہ چیزوں کی مختلف اقسام کے حقائق سے ان کی خصوصیت کو پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر وہ شے جسمیں کسی حد تک اپنے اندازۂ کمال کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ ہمارے لئے خصوصیت کے ساتھ حقیقی ہے۔ ریگ کا ایک ذرہ میرے لئے کچھ بھی نہیں۔ لیکن کنول کا پھول ایک یقینی قوت رکھتا ہے۔ گو بیابان کی ریگ ہر قدم پر میری توجہ میں مخل ہو۔ میرے پاؤں میں آبلے پیدا کرے۔ آنکھوں میں گرے حتیٰ کہ میں غصہ سے دانت پیسنے لگوں پھر بھی ریگ کا ایک ذرہ کوئی یقینی خصوصیت نہیں رکھتا۔ کنول کو میری توجہ حاصل کرنے کے لئے اُڑ کر میری آنکھوں میں گرنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی۔ میرا دل ہی کنول تک پہنچکر خوش آمدید عرض کرتا ہے۔

میں ایک مثال سے ظاہر کرتا ہوں کہ انسان کا دل جب کسی دلفریب شے کو پسند کرتا ہے تو اُس کے لئے رنگین الفاظ کا انتخاب کس احتیاط کے ساتھ

کرتا ہے۔ سورج مکھی کا پھول خوبصورتی میں کچھ کم نہیں۔ لیکن شاعر جیکہ وہ موسموں کے بادشاہ کی تخت نشینی کا جشن مناتا ہے تو اس دربار میں اس پھول کے نام کا ذکر بھی مجلس کی توہین سمجھتا ہے۔ شاعروں میں اب اس کی وقعت نہیں رہی کیونکہ وہ اشیاء خوردنی میں شامل ہو چکا ہے۔ اسیطرح کدو اور بینگن کے پھول بھی شاعری کی درگاہ کے دروازہ کے باہر سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ طبیع نے ان کی ذات اور فعل کو بگاڑ دیا ہے۔ شاعر ہی نہیں بلکہ شعرا کے ممدوح بھی اپنی زیب وزینت کے لئے ان کا استعمال عار سمجھتے ہیں۔ اگرچہ انجنا کے پھولوں کا کرن پھول اُن کی زلفوں میں اٹکا ہوا یقیناً بُرا دکھائی نہ دیگا آکند را اور ناگر کے پھول اگرچہ کچھ ایسے خوشبودار اور شوخ رنگ نہیں ہوتے۔ لیکن محفل کی زیب و زینت میں اُن کے لئے راستہ کھلا ہے۔ ہمارے جسم کی بھوک نے انہیں چھو کر پلید نہیں کر دیا +

ان حالات میں مصوری کو ایک گونہ سہولت حاصل ہے۔ مصور کا قلم آلو کے بوٹے کی گھنی سبز پوشاک بناتے وقت جھجکتا نہیں۔ جبکہ اُس کے نام کا ذکر ایک شاعر کے قلم پر بار ہوتا ہے۔ جن الفاظ کی آواز سے لفظی تصویر میں نقش پیدا ہو لیسا اوقات وہی الفاظ کی صدا نے اُن کی قدر و قیمت کو گرا دیا ہے۔ کیونکہ یہ شکل یا رنگ نہیں بلکہ آواز ہے جو شاعری کی روح رواں ہے۔ مجھے شاعری کی رسم و رواج کے پابند ہونے کا تمغہ حاصل نہیں۔ جب بھی غیر ادبی الفاظ کو اکثر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ پھر پھیر اکر مقصد کو ادا کرتا ہوں تاکہ کوئی لفظ ایسا استعمال نہ ہو جس پر روزمرہ کی ضرورت کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس جگہ یہ کہہ دینا بیجا نہ ہوگا کہ مغربی شاعری اس احتیاط کی پابند نہیں۔ اُن کے یہاں اشعار میں لفظ اور نام کا نہیں بلکہ معنی کا غلبہ رہتا ہے +

جو کچھ بھی ہو یہ ایک تجربہ کی بات ہے کہ ہم اُس شے کا کما حقہ مشاہدہ نہیں کر سکتے جو ہمارے روزمرہ کے استعمال میں آتی ہے۔ اس پر ہماری ضرورت کا سایہ پڑ چکا ہوتا ہے۔ ایک خانہ دار کے لئے اس کا باورچی خانہ ایک ہر روز کی ضرورت کا کمرہ ہے۔ لیکن یہ وہ کمرہ ہے۔ جسے وہ عام نظروں سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اور اُس کی ملاقات کا کمرہ ——— جس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا ایک ایسا کمرہ ہے جس پر وہ تمام سامان زیب وزینت ختم کرتا ہے۔ وہ اس میں قالین بچھاتا ہے۔ تصویریں آویزاں کرتا ہے۔ خوبصورت اشیاء کو جمع کرتا ہے تاکہ اس کمرہ کو نالگیر وسعت نصیب ہو سکے۔ وہ اپنے ملاقات کے کمرہ ہی کی وساطت سے باہر کی دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ اور اسی میں اس کی شخصیت کی قدر و منزلت

اور یہ حقیقت کہ وہ کھاتا پیتا ہے اور اشیاء خوردنی کا ایک ذخیرہ رکھتا ہے۔ اُس کی شخصیت کو کسی امتیازی خصوصیت سے مزین نہیں کرتی۔ یہ بات کہ اس شخص میں کوئی خصوصیت ہے وہ اس ملاقات کے کمرے سے نشر کرنا چاہتا ہے اور اسی لئے اس کمرے کی آرائش کی جاتی ہے +

علم الحیات کی رو سے انسان اور حیوان میں فرق نہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بقائے نسل کی ضرورت دونوں کی زندگیوں میں موجود ہے۔ لیکن انسان ان حقائق میں اپنی امتیازی خصوصیت کو نہیں پاتا۔ بھوک اور پیٹ بھرنے کی عادت انسان میں کسیقدر گہری اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو۔ علم ادب کو اس سے سروکار نہیں۔ کھانے پینے کی عادت کسیقدر لازمی کیوں نہ ہو اور کسیقدر تکرار اور تواتر کے ساتھ پیدا کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ وہ حقیقت نہیں جس سے انسان کی خصوصیت ظاہر ہو سکے۔ کھانا پینا اور بھوک کو رفع کرنا اُس تعلق طبیعہ کے سامان میں سے نہیں جسے فن لطیف کے فردوس میں جگہ مل سکے +

تعلقات مرد و زن کا درجہ تناول غذا کی ضرورت سے بلند تر ہے۔ ان تعلقات میں ایک باطنی رشتہ موجود ہے۔ جس کے باعث دلوں میں قرب اور وحدت حاصل ہوتی ہے۔ شہوانی ہیجان زندگی کی بنیادی ضرورت کے لحاظ سے ایک دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ یہ ہیجان اپنی بنیادی ضرورت یعنی بقائے نسل کی اہمیت سے گذر کر انسان کی وسیع تر زندگی میں بلند تر درجہ کی اہمیت کو حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ عشق انسان کی زندگی کو روشن کرتا ہے اُس کے ظاہر و باطن کو منور کرتا ہے۔ آگہی کی لطیف ترین باریکیوں تک اسے پہنچاتا ہے۔ یہ روشنی حیوانی زندگی کی ضرورت بقائے نسل میں موجود نہیں۔ لہذا اس کی اہمیت سائنس کی حدود میں محصور ہے۔ دلوں کے میل اور قرب میں جو حقیقت ہے وہ فطرت کی اس بنیادی ضرورت سے الگ ہو کر اپنی اہمیت علیحدہ قائم کرتی ہے۔ اسی لئے ادب اور فنون لطیفہ میں اس جذبہ کو اسقدر وسعت حاصل ہے۔ انسان کے لئے اُس کے نوعی تعلقات کا مقصد توسیع نسل نہیں جیسا کہ ہمارے مقنن کا خیال ہے (یہ ان کا رجحان) اس لحاظ سے تو انسان محض حیوان ہے۔ مرد و زن کے تعلقات کا مقصد عشق ہے۔ اور اسی عشق کے لحاظ سے انسان حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ میں لفظ حیوان کو کسی اخلاقی نقطۂ نظر سے استعمال نہیں کر رہا۔ بلکہ انسان کی تدریجی خودشناسی کے مراتب کے لحاظ سے حیوانی کیفیات اور انسان کے شہوانی تعلقات کی حد بندی جبلیات میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے جدوجہد موجود ہے۔ اور یہ دونو کیفیتیں ادب

اور فنونِ لطیفہ سے اپنی فتح کے سہرے کی طلبگار ہیں۔ جدید علم نفسیات کے ماہروں نے ایک اور پیچیدگی پیدا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حیوانی رجحان بھی انسان میں نہایت گہرا ہے اور انسان کی ذہنی زندگی کا مدار اسی پر ہے۔ سائنس کے اس مقولہ کی اہمیت کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن فن لطیف اور ادب میں اس جذبہ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ادب اور فن لطیف کا مقصد انسان کے ذاتی معیار کے مطابق حقیقت ازلی سے تعلق رکھنے والے جذبات مسرت زا کے مختلف مدارج کا حصول ہے۔ یہی کیفیت اخلاق کی ہے۔ نوعی تعلقات کی بناء پر جو سوال ادب میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کا حل سائنس یا اخلاق کی رو سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ جمالیات کی رو سے۔ اور اسی علم کو حق ہے کہ وہ فیصلہ کرے اس حقیقت کے کس رُخ کی انسان پرستش کرے گا۔ اور اُسے لازوال اہمیت حاصل ہوئی +

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانہ میں چند واقعات ادب پر ایسے گزرتے ہیں کہ وہ ادب کی امتیازی خصوصیت کو عارضی طور پر چھپا لیتے ہیں۔ اس عارضی قسم کی ٹھوکر کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے ادب میں اپنی جگہ قایم رکھ سکے۔ اس قسم کے حادثات کی طبیعت ہی پرواز کن ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے یورپ کی جنگ عظیم نے وہاں کی شاعری کے پانی کو گدلا کر ہی دیا تھا۔ جب انگلستان میں عہد اتفاق کے بعد مطلق العنانی کا دور آیا تو اس دور کے بخارات نے اس زمانہ کے ادب کی فضا کو بھی مکدّر کر دیا تھا۔ لیکن یہ دھندلکا اپنی خصوصیت کو بیان نہ رکھ سکا۔ یہ اُسی روشنی کے وجود کو ثابت کرتا رہا جسے وہ پوری طرح چھپا نہ سکتا تھا۔ از منۂ وسطیٰ میں کلیسائی طاقت نے اسقدر غلبہ حاصل کیا تھا کہ سائنس کو گلا گھونٹ کر مار ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ سائنس اپنی جگہ خاص اہمیت اور بلند رُتبہ رکھتی ہے اور مذہب سے بھی کسی رشتہ کی محتاج نہیں۔ آج کے واقعات اس کے خلاف ہیں اور اب یہ سائنس نہیں ہے۔ جو ہماری زندگی کے ہر پہلو پر تسلط جمانا چاہتی ہے۔ اس نئی حاصل کی ہوئی طاقت اور وسعت کی بنا پر وہ اپنی حدود سے باہر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتی۔ سائنس کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس کی اہمیت غیر جانبدارانہ تحقیق ہے جب ہی اس کا نظرتی اور عالمگیر تجسس بتدریج ادب کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ ادب کی بنا جانب دارانہ تعلق پر ہے۔ اس کا بلند پیغام شخصی ذوق کے مطابق انتخاب کی آزادی ہے۔ اور سائنس اور اسی پر حملہ کر رہی ہے مغربی ادب چونکہ شہوانی تخیلات سے مملو ہے اس کا مانند بھی سائنس ہی کی جبلی جستجو ہے۔ جس طرح رسٹوریشن کے عہد کا رجحان شہوانی تھا۔ اور وہ ادب میں کسی بلند مرتبہ کو حاصل نہ کر سکا۔ موجودہ زمانہ کی سائنس کے تجسس کی یہ شدت بھی قایم نہیں رہ سکتی +

ایک وقت تھا ہمارے ملک کی سوسائٹی میں آوارگی کا دور دورہ تھا۔ اور ہمارے ادب پر عریانی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ لیکن یہ صرف ایک عارضی ٹھوکر تھی۔ موجودہ قارئین ادب اس عہد کے ادبیات کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ اس لئے نہیں کہ اخلاق مانع ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اُسے دائمی اہمیت نہیں دیتے۔ موجودہ نقّادانِ ادب کچھ دنوں سے پھر وہی پرانی روش اختیار کر رہے ہیں۔ پرستشِ جسم کی بے اعتدالیاں جو مغربی ادب سے ہمارے یہاں منتقل ہو کر آ رہی ہیں اس قسم کے ادب کو وہ اقسام ادب کے لحاظ سے ماسبق ادب میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ جو کچھ دائمی ہے وہ کبھی ماضی کی قطعی تردید نہیں کر سکتا۔ انسان کی طبعی نزاکت جس پر انسان کی حُسن پرستی کا مدار ہے۔ ادب کی یہی امیرانہ شکوہ ہی دائمی شے ہے اور یہ صرف سائنس کے سحر کی پابند جمہوریت ہے۔ جو نزاکت ادبی کو کمزوری خیال کرتی ہے۔ اور شہوات جسمانی کی گرسنگی کو ادب کی جان سمجھتی ہے +

موجودہ تہذیب کی بہیمیت کی مثال ہولی کے اُس تہوار سے دی جا سکتی ہے جو جیت پور (کلکتہ) کے آوارہ گردوں میں رائج ہے۔ ہولی کے اس کھیل میں یہ لوگ سُرخ رنگ نہیں چھڑکتے۔ گاتے نہیں۔ ہنستے کھیلتے نہیں۔ بازار کے کیچڑ سے کپڑے تر کر کے ایک دوسرے پر کیچڑ پھینکتے ہیں۔ راہگذاروں کو کیچڑ سے آلودہ کرتے ہیں۔ اُن کا مقصد رنگنا نہیں بلکہ آلودہ کرنا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ ذہنیت انسان میں موجود نہیں۔ علم نفسیات جدید کے ماہروں کو دعوت ہے کہ وہ اس ذہنیت میں غوطہ زن ہو کر اُس کی تحقیق کریں۔ میرا اعتراض تو عوام کی اس خواہش پر ہے جسے وہ بہار کے تہوار میں ایک دوسرے کو آلودہ کرنے میں ظاہر کرتے ہیں (جبکہ یہ تہوار انسان کی حسن پرست طبیعت کا نتیجہ ہے) یہ نہیں کہ جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں صحیح نہیں بلکہ یہ کہ مناسب نہیں +

وہ لوگ جو کہ ادب میں خرافات کی موجودگی کو بجا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں "کیا یہ حقیقت نہیں ؟" حالانکہ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے جوتپوری کے تہوار میں جب مَیخوار بدمستی کے عالم میں طبلوں کو پیٹ کر ایک لامتناہی طوفان برپا کرتے ہیں۔ اور اُن کے حیوانی نعرے جو کسی ایک شعر کی بغیر سُر تال کے ایک لامتناہی تکرار ہوتی ہے۔ کیا یہ بالکل غیر ضروری نہیں کہ ہم پڑوسیوں سے جا کر

پوچھیں "کیا یہ حقیقت نہیں؟" سوال تو یہ ہو سکتا ہے "کیا یہی موسیقی ہے؟" اس بدمستی میں ایک وارفتگی ضرور ہوتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ پھیپھڑوں کی ورزش کی اس نمائش میں قوت کا بھی اظہار کافی ہوتا ہے۔ اگر بدتہذیبی کے اس کریہ منظر کو ہم زندہ دلی کہیں تو ایک بدمست شرابی کی جسمانی ورزش کے کرتب کی بھی داد دینی پڑیگی۔ لیکن پھر؟ اس تنومندی کی نمائش صرف جیت پور ہی میں رہتی ہے۔ اور اُسے فنِ لطیف کی بارگاہ میں دخل حاصل نہیں ہوتا۔

مضمون کے اختتام پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُن ملکوں میں جن کے سر پر سائنس مسلط ہے اُن کا بجا اور بے جا تجسّس دہن آہن کی طرح اگر ادب کی دیوی کا زرنگار لباس اُتار پھینکے تو اُن کے اس سلوک کے لئے سائنس کا جواز موجود ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جہاں نہ ظاہر و باطن میں اور نہ قول و فعل میں سائنس کو دخل ہے۔ اس بدتہذیبی کے لئے جو کہ مستعار لی گئی ہے اور وہ ادب میں داخل ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس کونسی دلیل ہے؟ اگر اس سوال کو سمندر پار بھیجا جائے۔ اور پوچھا جائے "ہمارے ادب میں ہاٹ بازار کا شور و غل کیا ہے؟" تو جواب ملیگا "یہ ہمارے ادب کا قصور نہیں اس کی وجہ وہ بازار ہیں جو ہمیں احاطہ کئے ہوئے ہیں۔" اسی سوال کو اگر یہاں پیش کیا جائے تو جواب ہوگا "ہمارے یہاں مارکیٹ وغیرہ تو نہیں لیکن مارکیٹ کا تمام شور و غل موجود ہے۔ اور ہماری موجودہ تہذیب کی شان و شوکت یہی ہے۔"

(ٹیگور) ڈاکٹر ایم ضیاء الدین امرت سری

مُحبّت اور شکستہ دِلی

از جناب "عطارد"

(۱)

شکستہ دلی ایک ایسا "جذبی تجربہ" ہے جس سے ہر انسان کو اپنی زندگی میں کسی نہ کسی وقت سابقہ پڑتا ہے۔ اور ہمیں ایک نہ ایک دن یہ معلوم ہوگا کہ "دل کے ٹوٹنے" سے کیا مراد ہے۔ اور نظامِ کائنات اس امر کا شاہد ہے کہ انسان (خواہ عورت ہو یا مرد) اس ناگوار احساس سے ضرور دوچار ہوتا ہے ——— جو کبھی کبھی اُس کے آئینۂ دل کو بالکل پاش پاش کر دیتا ہے۔ شکستہ دلی وہ تلخ تجربہ ہے جس کے لئے کشمکشِ حیات ہر وقت "سامانِ صد ہزار نمکداں" لئے رہتی ہے۔ یہ جذبہ انسان کی حیاتِ عملی کا ایسا اہم جزو ہے جس کے دستِ گستاخ سے نہ کوئی نجات ہی پا سکتا ہے نہ مستثنیٰ ہو سکتا ہے+

لیکن ملال انگیز واقعہ تو یہ ہے کہ شکستہ دلی ناخواندہ مہمان کی طرح فروکش ہوتی ہے جس کے میزبانی کے لئے پہلے سے کوئی تیار نہیں رہتا۔ بلکہ بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں اپنے ماحول سے یہ جذبہ جبراً پیدا ہوتا ہے۔ اور ہم مجبوراً اُسے قبول کر لیتے ہیں ——— کیونکہ اس کی نوعیت منجملہ اُن تجاربِ حیات کے ہے جو بغیر اطلاع نظامِ جذبات کو بری طرح اپیل کرتے ہیں ——— ایسی حالت میں انسان قطعاً قابلِ رحم اور بے بس ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو مایوس ہی نہیں ہوتے بلکہ اس جذبہ کی غلط فہمی سے خائف ہو کر دیگر ناگوار جذبات کی گوناگوں کیفیات میں اور بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی افراد اپنی پریشانیوں کو چھپا کر حیات کے بارے میں ایک نظر فریب تصویر پیش کرتے ہیں۔ لیکن حیات ان کے ساتھ ستم ظریفی کرتی ہے۔ ان کے سربستہ احساسات پوشیدہ تاثرات کی تہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اُن جذباتِ پنہاں کے ساتھ ریشہ دوانیاں کرتی ہے۔ جو دبے ہوئے اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں (بالغرض حیات اس قسم کی ستم رسانی سے عاجز بھی ہے تو وہ ایسے ناگوار تاثرات اپنے ہمراہ لا کر کل عالم میں وہ مزید اضافہ کرتی ہے۔ جس سے بے بہرہ رہنا زندگی سے کنارہ کش ہونے کے مترادف ہے+)

شکستہ دلی کے کئی اسباب و علل ہیں ——— تجارت یا کاروبار میں ناکامی۔ دوست احباب یا رشتہ داروں سے ناامیدی۔ اپنے سفینۂ جذبات کی مایوسی کے بحرِ متلاطم میں غرقابی وغیرہ ——— لیکن یہاں شکستہ دلی کے اس نتیجہ سے بحث کی جاتی ہے جو معاشقہ میں ناکامیابی سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو تمام نقصانات سے شدید ترین نقصان کی حامل ہے۔ جس کی تلافی نہ کسی طرح ممکن ہی ہے اور نہ اُس کا احساس زندگی کی آخری سانس تک محو ہو سکتا ہے۔ جب یہ مسلّم ہے کہ ہمیں اس سے پالا پڑتا ہے۔ اس کی تکلیف اور کرب محسوس کرتے ہیں۔ اس کی ناگوار خلش سے جبراً واقف ہوتے ہیں۔ تو اُس وقت اس کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہمیں اُس موقع پر کس قدر تسکین، کتنی اعانت اور کیسی رفاقت درکار ہے+

بطورِ مثال ایک مستِ شباب کا مقدمہ لیجئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جو عمر کے ایک حصہ میں نہایت دلچسپ اور مرغوب ہوتا ہے کیونکہ بلوغ کے پیشتر اس کی ذہنی اور جسمانی زندگی میں اُن نمایاں تغیرات اور واقعات کا ہجوم ستم برپا رہتا ہے جہاں اُس کی فطرت کے روحانی اور جذبی اسرار آہستہ آہستہ رونما ہوتے ہیں اور بعد بلوغ یہ انکشافات عملی دنیا میں کامل ظہور کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں اُس کا کسی کی محبّت میں مبتلا ہونا اور ٹھیک اسی موسم میں شکستہ دلی سے دست و گریبان ہونا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ ان مہمات کے بعد "بغض اور رشک" کا معرکۃ الآرا حملہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں (اگر وہ ہیجانی الحرکۃ یا حساس فطرت ہے) اس کا اپنی جان پر کھیل جانے کی حسرتناک داستان کا آغاز یا شکستہ دلی کے محرکہ کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا افسانہ شروع ہوتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں کُڑھنے لگتا ہے۔ اس کے تر و تازہ و شاداب چہرہ پر خمسان و پژمردگی شبخون مارتی ہے۔ اس کا دل کمزور اور خاطر کبیدہ ہو جاتی ہے۔ جس کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی سوز و گداز کا دائمی مرقع اور ڈھنگ

سوگواروں کے آثار پیدا کئے۔ تنہائی اور عزلت نشینی کو مونس بنالیتی ہے۔ وہ صرف لذت و عیش سے ہی مُنہ نہیں موڑتا۔ بلکہ حیات کو جلد از جلد ختم کرنے والا زہریلا گھن اپنے دل میں پرورش کرتا رہتا ہے۔ اس مایوس زندگی میں گھل گھل کر بتقریبِ موت کے لئے خطرناک سامان مہیا کرتا ہے۔ ایسی حالت میں خودکشی "کائنات کے دلچسپ کھیلوں میں معمولی اور سادہ کھیل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ کسیوقت یونان میں خودکشی ایک کھلونا تھی۔ اور ہر شخص جب چاہتا عروسِ مرگ سے ہمکنار ہوجاتا۔ وہ ایک استعارہ سے خودکشی کی لذت کو یوں بیان کرتے تھے:۔

"جب بچہ اپنی ماں کے ایک پستان سے اچھی طرح سیر نہیں
ہوتا۔ اُسی وقت اُس کو دوسری جانب راحت نصیب ہوجاتی
ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس طرح حیات بعد الموت میں تکالیف مصائب ـــــ راحت و نشاط بن جاتی ہیں [اس مسلک کے راہرو کے نشانِ قدم تو ملتے ہیں کہ انکی غایت اُنہیں کس طرف لے جارہی ہے۔ مگر اُس سے پلٹنے والوں کے نشانِ قدم کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ دستور اُس بیمارِ شہر کی عیادت ہے جسکی مزاج پُرسی کے لئے جتنے بھی گئے گرگِ کہن کے لئے نتیجہ خیز اشارہ چھوڑ گئے]

دورِ حاضر میں لوگ موت کو قبل از وقت دعوت دینے سے حذر کرنے لگے۔ عہد جدید میں نوجوان افراد کا یہ دستور ہوگیا ہے کہ جب ایک شخص اپنے "دل کے ٹوٹنے" کے باوجود سیماب کی طرح نہ مضطرب و بیتاب رہتا ہے اور نہ اپنے چہرہ سے پژمردگی اور افسردگی کے آثار ہی ظاہر ہونے دیتا ہے۔ تو یہ ادائے خاص اس کے ابنائے جنس کے حق میں دلیل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ وہ انفعالی جذبہ کے شکار ہونے سے فاعلی جذبات میں گھرے رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ "خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرنا ہی مسرت کا وسیلہ ہے"

آپ اٹلی یا فرانس کا کوئی روزنامچہ دیکھئے کہ حیات و ممات کے کالم میں ہر روز کیوپڈ (عشق کے دیوتا) کی بارگاہ پر کتنی جانیں قربان ہوتی ہیں اور شکستہ دلی سے عاجز ہوکر کتنے نامراد خودکشی کی تیغ بےپدریغ اپنا گلا رکھتے ہیں۔ (وہاں یونانیوں کے دستور کی پیروی اب بھی جاری ہے) مگر انگلینڈ اور امریکہ اس رواج کی پابندی خلاف فطرت سمجھتے ہیں۔ ان کے نظامِ حیات میں اس شعبہ کا دخل ہی نہیں اور نہ یہاں "کشتگانِ حسرت" کی کوئی فہرست ہی مرتب ہوتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ یہ لوگ اس احساس کو محسوس نہیں کرتے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان تاثرات سے کم متاثر ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے "عشق و حیات" کا تصور ہی جداگانہ ہے۔ انکی زندگی کا نصب العین "طربیہ یا تماشہ پسندی" کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان کی حیاتِ معاشقہ کی کامیابی میں اچھے مغنی یا مطرب اور عمدہ کھلاڑی یا تماشہ پسند کی ضرورت ہے۔ ان کی صلائے عام بھی یہی ہے:۔ کھیلو! اور اچھے کھلاڑی بنو! کھیل تماشے میں دلچسپی لو! لطف اُٹھاؤ! "اور آئے دن اُن کا وتیرہ بھی یہی ہے۔ جس طرح یہ لوگ کھیل کے میدان پر ان فقرات کو منطبق کرتے ہیں۔ اسیطرح میدانِ حیات پر بھی اُن کو مطابق کرتے ہیں۔ اس طرح یہ زندگی کے ہر صیغہ کا خندہ روئی سے مقابلہ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شکستہ دلی جبکہ جزوِ حیات ہے۔ اُس کا واقع ہونا لابد ہے۔ اُس کا ناگزیر عنصر کارگاہِ ہستی میں شامل ہے۔ پھر کیوں نہ زندگی کے بقیہ دن اور ناکامیوں کے گذار دیئے جائیں +

گو حیات کو ایسے لہو و لعب کے اصول پر کاربند کرنا آسان نہیں اور نہ ہمیشہ فراخدلی سے اس بحث کو مرکزِ حیات قرار دینا سہل ہے۔ تاہم اس کا تعلق اس کھلاڑی کے مشابہ ہے جس نے کھیل کے دوستانہ مسابقہ (ـــــــــــــ ـــــــــــــ) میں شکست اُٹھائی ہو۔ انگلینڈ اور امریکہ کی ہر دوشیزہ جو "ناکام آرزو" ہے۔ نہایت دلچسپی سے ان قوانین کا تتبع کرتی ہے۔ وہ ہر وقت شوخی کساں۔ خوش طبع نظر آتی ہے کہ دیکھنے والا اس کی اداؤں کا گرویدہ ہوجائے۔ لیکن اس عریاں شوخی اور خوش طبعی کے پس پردہ اس کے ناکام احساسات اور مجروح جذبات تڑپتے رہتے ہیں۔ جس کی بےچینی اور بیقراری کا پتہ تک نہیں چلتا۔ تاہم وہ مستِ شباب اپنی رعنائیوں کی دنیا کو لئے دلیری سے ناامیدیوں کا بارِ گراں برداشت کرتی ہے +

کلارا (ـــــــــــــ) ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ وہ کیرل نامی ایک حسین دوشیزہ سے واقف تھیں۔ ایک دفعہ جب اُس نے اُس کو دیکھا تو اس بات کا اندازہ لگا یا کہ کیرل کے حسن کی شعاعیں آغوشِ عشق میں سمٹی ہوئی تھیں۔ اس کی معصوم مسرتیں تبسم بنا کر اس کے ہونٹوں پر ایک امید افزا عشرت کا نیا عنوان پیدا کر رہی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ میں تمناؤں کی نشاط انگیز بجلیاں پناہ گزین تھیں۔ اس کی

ـــــــــــــــــــــــــــــ

لہ بتی کا لیسن ایک سینما اداکار نے اپنے کو منا کحت کی سنہری زنجیروں سے اسی سے آزاد کیا کہ اُس کا شوہر تماشہ پسند نہیں تھا +

آنکھیں کامیاب خوابوں کی نمایاں تعبیر سے لبریز نظر آتی تھیں۔ اس وقت وہ ایک شیریں کام اعتبار اور رنگین لذتوں کے مخلوط احساسات سے "تازہ بہ تازہ" دکھائی دیتی تھی۔ ہنگام خرام وہ ایسی معلوم ہوتی تھی کہ موسیقی کے مجسمہ میں روح سا لطیف نغمہ رقص کر رہا ہو۔ اس کا ہر قدم محرکِ انبساط ہر حرکت کیف نواز ——— اس کا پورا جسم خوشی کے گہوارہ میں جھول رہا تھا +

کلارا نے چھیڑ چھاڑ شروع کی جس پر وہ کہنے لگی "کیا خوب! اشاید تمہیں نہیں معلوم کہ میں کسی کی شیدائی ہوں" اس کے ان الفاظ میں ایک آبشار کا ترنم تھا +

لیکن ایک دن جب کلارا نے اُسی کیرل کو دیکھا تو اس میں غضب کا حیرت انگیز انقلاب پایا ——— گویا اس کی داستانِ عشق کا ہر ورق پُر الم سرخیوں سے مملو تھا۔ اُس کا حسن قوس قزح کی اُن بوقلمونیوں کے مانند تھا جس کی جھلک بادلوں کے نقاب میں چھپ گئی ہو۔ اُس کا چہرہ دل میں چٹکیاں لینے والے درد ناک تصویر کا تصور تھا۔ اُس کی رفتار میں ایسی نقاہت آگئی تھی۔ جیسے ایک "تازہ نوشاہ" جس نے ہنوز حجلۂ عروسی میں قدم بھی نہ رکھا ہو۔ اچانک جنگ کی اطلاع پاکر میدان کارزار کی طرف نہایت بے دلی سے جا رہا ہو۔ اُس کی ہر حرکت سے دلی کرب و مصیبت ٹپک رہی تھی۔ اور وہ مخصوص غم میں کھوئی ہوئی خاموش التجا کا سراپا بنی ہوئی تھی +

کلارا نے محسوس کیا کہ اس کو مکتبِ عشق سے نہایت تلخ اور پُر ملال درس ابتدائی ملا تھا۔ اُس نے کیرل کو جبراً اپنے ہاں مہمان رکھا لیکن کیرل نے آبدیدہ ہو کر ایک غمناک لہجہ میں کہا:۔

"عزیز من! یہ تکلف کس مصرف کے لئے؟ میں اس قسم کی زندگی سے قطعاً بیزار ہوں۔ میرا ضبط ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔ میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ اور عنقریب اس تنہائی کا بھی خاتمہ ہوا جاتا ہے"+

کلارا نے اس کے ارادوں کی تنقید کرتے ہوئے کہا +

"کیا تم محبت کے پہلے ذائقہ کو اسقدر جلد بے لطفی میں تبدیل کرنا چاہتی ہو؟ کیا تم ایک ہی لڑکی ہو جو اس قسم کے غم میں مبتلا ہو؟ کیا تم اتنی خود غرض ہوگئیں کہ اپنی زندگی سے سبکدوش ہو کر اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو اپنے غم میں مبتلا کرنا چاہتی ہو؟ جیسا کہ تمہارا خیال ہے ——— کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہے؟ اور تمہاری موت اس کا بھی خاتمہ کرنے والی نہیں؟[۵] نادان کیرل!" اس نے دلاسا دیتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہا "مر جانا تو بہت سہل ہے لیکن ناکام آرزوؤں کے ساتھ زندگی بسر کرنا مشکل ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارے سینہ میں ایک پُرسوز و گداز دل ہے" +

[در اصل کسی وجود کی کچھ وقعت و قدر رہی نہیں۔ جبتک وہ کسی سے کشمکش نہ کرتا ہو۔ اور اس آزمائشی مبارزت میں غالب آنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ حدودِ عشق بے انتہا۔ اس کی وسعت کو محدود کرنا اور صرف ایک ہی مقصد پیش نظر رکھنا ایک ابلہ فریبی اور مایوس نخوت ہے۔ انسان کی حیاتِ معاشقہ کا پہلا دور (خواہ عیش و نشاط کا ہو یا رنج و غم کا) بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ اس کی کشتیٔ حیات طوفان خیز سمندر میں مبتلائے گرداب و آلام رہیگی اور نہ کسی کی زندگی اس امر کی ذمہ دار ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ راحت و مسرت کی گودیوں میں کھیلتی رہے گی]

کلارا لکھتی ہے کہ کیرل اُس کی گفتگو سے متاثر ہو کر خوابگاہ میں آرام کی خاطر چلی گئی جب صبح ہوئی تو اُس نے دریچۂ خوابگاہ سے طلوع آفتاب کی چمکیلی شعاعوں کو دیکھ کر کہا:۔

"آہ! آج دوسرا دن ہے .... میں خوش ہوں کہ میں زندہ ہوں"

اس واقعہ سے ہم کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ کیرل درد و غم کا مقابلہ کرتی ہوئی جذبات کی کشمکش پر غالب آگئی۔ خیالات کو مطیع کیا شکستہ دلی کو حریفِ زندگی کے بجائے حلیفِ حیات قرار دیا ——— شکستہ دلی کی لذت کو محسوس کیا اور اپنے کو اس امتحان میں کامیاب ثابت کیا ——— اگر وہ ضعیف قلب اور کمزور خیالات کا شکار ہوتی تو یقیناً اس کا بھی نام "فہرست کشتگانِ حسرت" میں نظر آتا ———

پس اگر ہماری رائے خطا نہیں کرتی تو ہم یہ سفارش کرتے ہیں:۔

احساساتِ تلخ کا ذائقہ فراموش رکھیں۔ مگر ان کے ناگوار تاثرات کو ظاہر نہ کریں۔ بلکہ خندہ روئی سے اُن کیفیات کو بدلنے کی کوشش کریں اپنی افسردگی کو شگفتہ مزاجی میں تحویل کریں[۶] +

(۲)

انسان ابتدائے عشق میں ناکامیابی کی شدید ضرب کس طرح برداشت

[۵] "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" (ذوق)

[۶] "جب ہم اٹھ نہ لیں تو غم و غصہ کیا کرے
انسان بار بار دکھ کو ہنس ہنس دیا کرے" منشی اورنگ آبادی

کرتا ہے؟ اس زخم کا اندمال کیونکر کیا جاتا ہے ؟

اس کا انحصار عورت یا مرد کی نوعیت پر مبنی ہے ــــ بعض اس بات کے حامل ہیں کہ تلخ اور شدید جذبات میں مبتلا رہنا روح کی بہبودی کا نسخہ ہے کیونکہ زندگی جبتک معرض خطر میں نہ ہو۔ زندگی مکمل نہیں ہوسکتی۔ حیات کے سقم و قبح کا ازالہ یہیں مخفی ہے۔ لیکن اس کا مدار ان جذبات کے تحمل پر موقوف ہے ؞

کیا انقباض والم میں بہبودی کا عنصر شامل ہے ؟

اس کا جواب' اس جذبہ کے تحمل وضبط کے علاوہ ان احساسات کی ترجمانی پر منحصر ہے ـــ یعنی جب آپ ان احساسات کی اصلیت سے واقف ہوجائینگے اسیوقت سے آپ کو اپنے مقدار غم میں انحطاط محسوس ہوگا۔ لیکن شعور کی جاذبی وحسی کوائف کے متعلق جب آپ توڑ اوراک سے کام نہیں لیں گے' اور نہ ان کے سمجھنے پر مستعد ہی رہیں گے تو یہ صورت آپ کے زخم دل کو مندمل کرنے کے بجائے ان کو ہمیشہ ہرا رکھے گی ؞

اب سوال یہ ہے کہ "کس طرح شکستہ دلی سے مقابلہ کیا جائے ؟ اور کس طرح اپنی آپ اعانت کی جائے ؟ (کیونکہ مقابلہ کے لئے بغیر خود اعانتی اور کوئی چارہ نہیں)

ہمارے رنج وغم ہمیں سب سے پہلے یہی تعلیم دیتے ہیں کہ "ان کو قبول کریں پھر ان سے مقابلہ کریں"۔ آپ کو اس کے متعلق پس وپیش کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان جذبات کے اخفا کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے کو غلط فہمی میں سرگرداں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ــــ ورنہ ان ہیجانوں میں ایک دن ایسا سخت طوفان برپا ہوگا کہ نہ تو زبردست قوت ہی نجات دلانے والی ہوگی اور نہ سہارے کے لئے کوئی تنکا ہی دستیاب ہوگا۔ نیز اس کے مقابل آپ کی تمام کوشش وکشمکش ایسی ہی بے سود ہوگی جس طرح تیز رو پانی کا سیلاب' ذرات ریگ کے پشتہ سے روکا جارہا ہے۔ اس قسم کی حماقتوں سے صحت فکری کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے اور احتمال ہے کہ ضمیر مسخ ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قدم آستانۂ جنون پر اور دوسرا دامن اجل میں۔ آپ کو چاہئے کہ موت کے پہلے غم سے نجات پائیں ؞

ایک مرد کسی کی محبت میں وارفتہ ہونے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جنس مقابل یا محبت کا معروض معاوضۂ عشق کے لئے بالکل انجان ہے۔ یا ایک عورت' جس نے کسی پر اپنا عشق جتایا ہو اور اس کے معاوضہ میں فریق نے کوئی جواب نہیں دیا ــــ

ان دو واقعات سے ایک مشترک چیز اخذ کیجئے یعنی "فقدان عشق"

آپ اس فقرہ کا اعادہ کیجئے :۔

"میں تو اس کے لئے جاں بلب ہوں۔ لیکن اس ستمگر کو احساس تک نہیں"؞

یہ اعادہ آپ کے جذبات کی ہر جوش زن لہر کو خاموش کردے گا۔ آپ کے حافظہ میں یاد دلفستیوں کا ہنگامہ' یہ اطلاع اور آپ کا ہر تصور چٹکیاں لے کر یہ یقین دلائے گا کہ :۔

"محبت دل سے نکل چکی ہے"؞

آپ کی آہ سرد کے ساتھ یہ کلمہ بھی بے ساختہ نکلیگا کہ :۔

"تاہم اس کو مجھ سے محبت کرنی چاہئے تھی۔ کیونکہ ......"

اس مقام پر ایک دفعہ آپ اپنا افسانہ محبت دل ہی دل میں دہراوینگے آپ کے ذہن میں ہر سلوک اور برتاؤ کے وفا شعارانہ تصور کا احیا نہ ہوگا۔ اس سلسلۂ تخیل وافکار سے آپ کے مطلوب کی جفاؤں کا احساس آپ کے دل میں محو ہوتا رہے گا۔ اور آپ کا غم بھی دوش بدوش انحطاط کی طرف مائل رہے گا۔ کیونکہ ـــ آپ کی وفاداری' آپ کے مطلوب کی ستم آرائیوں کی بہ نسبت قیمتی ہوگی ؞

فرض کیجئے آپ کو اپنی محبت کا کامیاب جواب مل گیا۔ اور یہ بھی فرض کیجئے کہ کوئی جواب ہی نہیں ملا۔ اور آپ کے تمام نیازمندانہ احسانات پر پانی پھیر دیا گیا لیکن آپ کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آئے گا۔ کہ آپ جو اس وقت مبتلائے محبت ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر اس جذبہ سے ناواقف تھے۔ گو آپ کی مملکت حیات میں ایک ایسے حاکم کی عملداری ہوگئی ہے۔ جس کے قوانین آپکو اسقدر مجبور و پابند کردیتے ہیں کہ ان کے خلاف ذرا سی بغاوت یا شورش سے عجیب عجیب مصیبتوں میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ بایںہمہ آپ یہ بول اٹھینگے کہ "محبت اس نوعیت کی نہیں ہوا کرتی"۔ مگر باخبر رہئے! حیات کے معمورہ میں بیسیوں قسم کے تجربات محفوظ ہیں۔ شاید آپ کو ایسی محبت سے پالا پڑے جو جنون کی حد تک پہنچا کر آپ کو گم کردے۔ اور ایسا بھی اتفاق ہوجائے کہ جس طرح عشق کے نشہ نے آپ کو متوالا اور مدہوش کردیا تھا اسیطرح اس کا خمار بھی زائل ہوجائے اور آپ کے دل میں کوئی یاد تک باقی نہ رہے۔ اور ممکن ہے کہ آپ کا یہ جذبہ دوسروں کو بعینہٖ متاثر کردے۔ جسطرح خود آپ متاثر ہوئے تھے۔

اس موقع پر شاید کسی کے دہن سے بے محابا یہ الفاظ نکل پڑیں کہ :-
"عشق جنوں خیز" عشق نہیں بلکہ وہ اختلال جذبۂ عشق یعنی شہوت ہے"
کیا آپ "محبت اور شہوت" کی تحدید فرمائیں گے؟ کیا اُن کے مابین مابہ الامتیاز حد فاصل قائم کریں گے؟ لغویات آپ کو بتائے گی کہ "محبت اور شہوت" روحانی و جسمانی پہلوئے عشق کے مرادف نام ہیں۔ جو بایکدگر اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ ایک حقیقت کے دو مساوی اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ پھر عشق کیا ہے؟ کیا کوئی کائنات میں اس کے "وجود مطلق" کو ثابت کر سکتا ہے؟

(۳)

جب آپ شکستہ دلی کے مقابلہ پر مستعد ہو جائیں' اُس وقت اپنے غم و اندوہ کا غائر بینی سے مطالعہ کیجئے ——— مگر غیر جانبدارانہ حیثیت سے ——— آپ کا مطمح نظر صرف یہی نہیں ہونا چاہئے کہ "آپ" ایسے کام کیوں کر بیٹھے؟ اور کیوں اُن پر اعتماد کیا گیا؟" بلکہ جس سے آپ کو اُلفت تھی اُس کے متعلق بھی غور کیجئے کہ "کیوں اُس نے آپ کی اُمیدوں کا خون کیا؟" اس طرح کی غور و فکر میں آپ کو تسکین ہوگی +

لیکن جب آپ اپنے رنج و الم کی وجوہ پر کبھی غور نہیں کریں گے تو سمجھ جائیے کہ آپ کو اپنے سے نفرت پیدا ہوگئی ہے اور آپ اپنے عشق کو عداوت اور بدگمانی میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے مصائب میں مزید مصیبتوں کا اضافہ کر رہے ہیں۔ جتبک آپ میں احساسات کی تلخی اور ناگواری ہے آپ کو ہرگز تسلی میسر نہ ہوگی۔ اور جب ان جذبات پر قابو حاصل کر لیں گے۔ رنج و غم کو سمجھنے لگیں گے۔ اس وقت آپ پر روشن ہوگا کہ ایک "معجزہ" عمل کر رہا ہے ایک غیبی امداد آپ کی اعانت کر رہی ہے۔ آپ کا "درد دل" اس معجز نمائی میں بھیس بدل کر ہمدردی اور موانست میں ظاہر ہوگا۔ اور ساتھ ہی "عقل سلیم" اپنے اور غیروں کے سمجھنے کے لئے حاصل ہوگی۔ جو آپ کو وفاشعار اور شریف ترین کامیاب انسان بنا دیگی +

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اُن جفاؤں کا بالکل بھول جائیں اور اُن کی خطاؤں کو معاف کر دیں؟"

نہیں ہرگز نہیں۔ آپ اُن تجربوں کو ہرگز نہ بھولئے اور اُن کی یاد ہی مٹائیے۔ ہم کو خواہ کسی قسم کا تجربہ ہو (جو دوسروں سے حاصل ہوتا ہے) ہرگز بھلانا نہیں چاہئے۔ بلکہ اُن کے سمجھنے اور قبول کرنے کی حتی الوسع کوشش کرنی چاہئے۔ ہاں! ایسے تجربات کو "بجائے فراموش کرنے کے معاف کرنا چاہئے۔" لیکن اس "معافی" کے لفظ میں ایک رعونت مضمر ہے۔ خصوصاً جس کے لئے معافی کا انطباق ہوتا ہے۔ آپ اس سے احتراز کیجئے۔ اور ہر وقت خیال رکھئے کہ معافی صرف اس قسم کی جو مرہم زخم بن سکے۔ اس مرہم کی تلاش صرف غور کرنے اور سمجھنے پر موقوف ہے یعنی :-

"مجھ کو معلوم ہے کہ اُس سے کیوں ایسی حرکت سرزد ہوئی۔ جس سے مجھ کو تکلیف پہنچی۔ خیر! میں نے غور کیا اور معاف کیا!"

کسی شکستہ دل سے یہ کہنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کے رنج و غم کے خاص اسباب میں سے اس کی "فخر رنجیدگی" بھی ایک سبب ہے یعنی اس کا یہ بیان کہ "جسقدر میری زندگی مشق جور و ستم رہی ہے اور جتنی جفائیں میں نے سہی ہیں شاید ہی کسی کا تجربہ ہو" گویا اپنے رنج و محن کو بلحاظ کیفیت و کمیت دوسروں کے درد دکھ سے برتر سمجھنا۔ یقیناً یہ خیال رنج کی مقدار سے زیادہ رنجیدہ کرنے والا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا (غور تو کیجئے) کسقدر صداقت پر محمول ہے۔ یعنی "یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس کو جب مجھ سے محبت نہیں تو کیوں اتنی بیدادگری کی گئی؟" دراصل دنیا میں سب سے زیادہ شدید زخم اور کاری ضرب بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ کسی کو اُس کی محبت کے عوض ایسا جواب دیا جائے۔ ایسے واقعات آپ کے اعتقاد و اعتماد، سکون و نشاط کی نہایت بے دردی سے بیخ کنی کرتے ہیں۔ غور طلب یہ ہے کہ ہر چیز سے اپنے مطلوب کی خاطر و تواضع کی جائے۔ ہر فرمایش سے خاطر خواہ تکمیل کی جائے۔ پھر اس کے معاوضہ میں یہ حوصلہ شکن جواب ملے کہ "آپ نے کیا کیا ہے؟"

لیکن اس درد کی دوا شاید یہاں ہمدست ہو جائے کہ ——— اس برتاؤ سے آپ کی وقعت اُس کی نظروں میں زائل نہیں ہوئی۔ اگر آپ کو خود اپنی عزت و وقعت کے زائل ہونے کا احتمال بھی ہوگیا ہے تو آپ سے کوئی پیار اور محبت ہی نہیں کرے گا۔ انسان بحیثیت انسان ایک قابل افتخار اور مقدس وجود ہے۔ پھر کیوں نہ اپنے تقدس کا احترام کریں۔" اکثر جوشیلے احباب خودداری کے اصول کو نظرانداز کر دینے کے باعث تباہ ہوگئے ہیں۔ آپ خادم و مخدوم کے تعلقات تو قائم رکھ سکتے ہیں۔ مگر "عشقیہ معاملات" (ازدواجی تعلقات) بغیر خودداری کے قائم نہیں رکھ سکتے۔ "تحفہ و سوغات کے بہم پہنچانے میں آپ کی شان نہ تو بڑھ سکتی ہے اور نہ گھٹ سکتی ہے۔ کہ "محبت ایسی کسوٹی نہیں جس پر ہمیشہ ہر چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا

جانے" اگر کسی نے آپ کی محبت رد بھی کی تو آپ کی مایوسی یا شکستہ دلی کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ :-

آپ امتحانِ محبت میں ناکام ہو گئے ہیں یا ———

آپ میں صلاحیتِ معاشقہ ہی نہیں یا ———

آپ قابلِ محبت بھی نہیں ——— اس سے یہ بھی تو مراد نہیں کہ

آپ جنسِ مقابل کی نظروں میں جاذبِ نظر نہیں (جیسا کہ اس کے برعکس خیالات عالمِ یاس میں پیدا ہوتے ہیں) اس سے صرف یہ غایت ہے کہ

آپ اُس خاص فرد کے لئے موزوں نہیں +

خوش قسمت ہیں وہ جن کی عقلِ سلیم اس رمز سے واقف ہو جاتی ہے۔ مگر جو لوگ (کسی ایسے فرد سے جس پر خود تو مٹے رہتے ہیں لیکن اُن کے مطلق کو ان کی موت و حیات سے کوئی واسطہ نہیں) "کسی اثر" کے تحت رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھ جائیے کہ فطرت سے برسرِ پیکار ہیں۔ کشیدگی کو دعوت دی جا رہی ہے۔ محبت، عداوت میں منتقل ہونے کے لئے سرعت سے گامزن ہے۔ سمندِ خلوص پر ہر روز جدائی کا تازیانہ لگایا جا رہا ہے...

...... ہر شخص نپولین نہیں کہ پولینڈ کی حسین بیگم فالسکا کے دماغ پر چنگیز خانی اثرات بٹھائے۔ یہ مستثنیٰ ہے۔ نپولین کی حیاتِ معاشقہ جس کو شہوت رانی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے ویسے ہر شخص کی حیاتِ عشقیہ نہیں +

(۴)

شکستہ دلوں کو یہ بھی مشورہ دیا جاتا ہے کہ "اپنا ماحول بدل دیں"۔ کچھ دنوں کے لئے ایسے مقام پر بود و باش اختیار کریں جہاں آپ کا کوئی شناسا نہ نکلے کیونکہ جہاں آپ فی الحال مقیم ہیں ہر شے آپ کے مطلوب کے ساتھ ایسے گہرے نقوش مرتسم کر لیتی ہے اور ایسے تلازمات و تصورات کے پیچ و خم میں محصور کر لیتی ہے جس میں آپ کے مطلوب کی "چلتی دنیا" نظر آتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر آپ کا موجودہ ماحول، آپ کی مایوسیوں میں الم انگیز مناظر کا اضافہ کرتا رہے گا۔ آپ کا حافظہ برباد اور ہر تصور سے بے طور گھائل ہوتا رہیگا۔ لیکن جب آپ کچھ عرصہ کے لئے ان تمام علائق اور رشتوں کو الوداع کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اُس وقت آپ ہر جدید منظر سے تسلی بخش سفارشیں محسوس کریں گے۔ اس طرح کا "نقل مقام" بزدلی نہیں بلکہ عقلمندی

اور علو ہمتی ہے۔ آپ کو اس طرح رخصت ہوتے ہوئے ایک بارِ گراں معلوم ہوگا۔ لیکن آمادہ ہو جائیے اور بلند حوصلگی سے کہئے "گزشت آنچہ گزشت" "میں ایک نئی زندگی از سرِ نو شروع کرنے والا ہوں"۔ یا اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے اور آپ کی تمدنی و معاشرتی مجبوریاں آپ کو رہا کرنے سے عاجز ہیں تو آپ اپنا ماحول یوں بھی تبدیل کر سکتے ہیں :-

نئی نئی دلچسپیاں پیدا کریں ——— نئے دوست احباب سے مقاربت حاصل کریں۔ نئے جوش و ولولہ سے حیات کی رفتار میں قدم رکھیں +

پہلے پہل یہ مشورہ آپ کو بدمزہ معلوم ہوگا۔ مگر کیا کیا جائے! آپ کا "ٹوٹا ہوا دل" از سرِ نو تعمیر کا محتاج ہو گیا ہے +

اگر آپ "یاس" یہی واقع ہوئے ہیں اور اُن جگر خراش و دلسوز حادثات کو برداشت کرنا چاہتے ہیں تو ——— قصور معاف! یہ ارادے نیک نیتی اور سلیم الطبعی کے تحت شامل نہیں ہو سکتے۔ چونکہ اپنے درد کا علاج آپ کی سمجھ ہی میں نہ آسکا اس لئے بغیر سوچے سمجھے یہ بول اُٹھے :-

"حسرت بھری زندگی بھی لطف سے خالی نہیں" ——— اسی لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ مسلکِ عشق میں یاس کے پہلو سے اجتناب کیجئے۔ اس قسم کے ہر واقعہ کو زندہ دلی میں تبدیل کیجئے۔ کیونکہ زندہ دلی انسان کی فطرت میں داخل ہے اور ناامیدی و مایوسی دنیا کے انقلابی تاثرات ہیں۔ انکشافات و مقاومت حبابِ آب سے زیادہ نہیں +

پس اگر آپ کا دل کسی کی سنگِ بے التفاتی سے چور چور ہو گیا ہے تو آپ کسی دوسرے سے دل بہلائیے۔ (انسان کو بعض ایسی چیزیں انتخاب کرنی پڑتی ہیں جس کے متعلق پہلے سے کوئی خیال اس کی زندگی میں موجود نہیں رہتا)، گویا آپ کی سیاحتِ حیات میں اس ساحل کی فضا خوشگوار نہ تھی۔ دوسرے ساحل پر اپنے سفینۂ حیات کو لنگر انداز کیجئے۔ ہم نے مانا کہ آپ کی حیاتِ نظم کا مطلع حسرت و حرمان، سوز و گداز کا لبِ لباب تھا۔ لیکن آگے چل کر عیش و نشاط کا تجربہ بھی پرکیف ہوگا۔ آپ سرے سے انہی سرگزشتِ عشق کے جدول و عنوان بدل دیجئے۔ جب اپنے کو کسی دوسرے کی نکہت فروش خوشبوئے محبت اور کیف پرور حسن پاش فضا میں متوافق کر لیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ اپنی الف لیلہ کی مسلسل راتیں بہت جلد ختم کرنے والے ہیں۔ آپ کی حالت اُس دوست کے مانند ہوگی جس کی ملاقات کا سخت انتظار ہے۔ وقت گزر گیا لیکن انتظار جاری ہے۔

گدگدانے والی مسرتیں، بیتاب تمنائیں ہر وقت یہ پیغام دیں گی کہ محبت کا معمہ حل ہو رہا ہے۔ جوابِ عشق کی تعبیر کی جا رہی ہے۔ اس وقت آپ یہ محسوس کریں گے کہ ایک ایسا لطیف نغمہ مسحور کر رہا ہے جس کے الفاظ ہی نرالے ہیں ●

شاید اس بحث پر آپ یہ پرانا راگ الاپیں کہ "محبت" تمام عمر صرف ایک مرتبہ واقع ہوتی ہے۔ یہ بالکل بجا۔ مگر اس کی تاویل غلط کی گئی ہے۔ اور اب تک کثرت سے لوگ اسی مغالطہ میں مبتلا ہیں۔ آپ میں محبت کرنے اور محبت کو قایم رکھنے کی تمام خوبیاں فطرت نے ودیعت کی ہیں۔ کیوں نہ ان قابلیتوں سے استفادہ حاصل کیا جائے ؟

ڈاکٹر مری اسٹوپس لکھتی ہیں کہ "جو شخص ہر کس و ناکس سے محبت کرنے کا مدعی ہے۔ کسی سے محبت نہیں کرسکتا"۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لئے کہ (فرض کیجئے کہ) آپ کی حیاتِ معاشقہ صرف ایک فردِ واحد سے وابستہ ہے (مثلاً الف) مگر جب آپ نے کسی دوسرے (یعنی ب پر) اپنا عشق جتایا تو یقیناً آپ کو شکستہ دلی کا تجربہ حاصل ہوگا۔ پھر ہم یہ کیوں نہ یقین کرلیں کہ "آپ کی محبت یا تو ایک غلط معروف سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی ــــ یا ــــ "کس طرح محبت کرنی چاہئے" کی مشق میں مصروف تھی ●

اکثر لوگ اپنے کو "تجدیدِ عشق" کے مسئلہ سے باز رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے خیالات صرف اسی مغالطہ میں محبوس ہیں کہ وہ اپنی حیات میں صرف ایک فرد کے لئے وقف ہیں۔ خواہ اُن کا مطلوب کسی اور کے ساتھ مصروفِ عیش ہو یا کسی نے اس کو اپنی عروسِ زندگی بنالیا ہو۔ لیکن انہیں جب بھی اسی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ اسی طرز کی عاشقی کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ کامیاب ہو اور اگر وہ یکطرفہ ہے یا آہ و بکا بیت الحزن ہے یا جذباتِ بہیمی کا جنازہ لئے ہوئے ہے۔ تو ــــ تکلف برطرف ! ایسا عشق نہ صرف آپ کو نکما ہی بنادیگا بلکہ بتدریج دارلمجانین کا لاعلاج مریض بنا کر چھوڑ دیگا ایسی محبت مستحقِ لعنت ●

اگر آپ کو "مرہمِ شکستہ دلی" بہبودیِ حیات اور لطفِ زندگی کی تلاش ہے تو کبھی نہ کبھی ایک مخصوص "رفیق" مل ہی جائے گا جو پہلے سے زیادہ پختہ۔ گہرے اور سچے جذبات کی خوشگوار مسرتوں سے محظوظ کرے گا۔ آپ کی صبحِ زندگی کی لطافتیں، نکہت تصورات سے سرگوشیاں کرتی نظر آئیں گی۔ ایک نئی زندگی، کیف انگیز تبسم کے ساتھ انگڑائی لے کر بیدار ہوگی۔ آپ کے ریاضِ جذبات میں ایک تازہ ہوا خواہ محوِ گلگشت ہوگا۔ جو خوشگوار فضا میں ہر وقت پرورش پاتا رہیگا ●

پس شکستہ دلی امیدوں کو قطع کرنے والی یا مرادوں کو خاک میں ملانے والی نہیں ہے بلکہ گمراہی اور غلط فہمی کا ازالہ کرنے والی ہدایت، پامال تمناؤں کو اُبھارنے والی محرک فطری منزل تک پہنچانے والی مشعلِ راہ ہے ●

"عُطارد"

کیا آپکا نام سالنامہ کے لئے درج ہوچکا ہے؟

اگر یہ صحیح ہے تو سالنامہ شایع ہوتے ہی آپکو بذریعہ وی پی

بھیجدیا جائے گا۔ اگر آپ نے گذشتہ سالنامہ وی پی طلب فرمایا تھا تو اب نام درج کرانے کی ضرورت نہیں رہی لیکن اگر آپنے نہ تو نام درج کرایا ہے۔ نہ پچھلے سال وی پی وصول کیا تھا۔ تو اس صورت میں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر نام درج کرا دیجئے تاکہ سالنامہ شایع ہوتے ہی وی۔پی کردیا جائے۔ قیمت عہ۔ محصول و پیکنگ و خرچہ وی پی ۵ سر ۱۳۔ خریدارانِ نیرنگِ خیال کو ۹ کا وی پی ہوگا۔ ایک آنہ فیس وی پی بڑھ گئی ہے ● منیجر رسالہ نیرنگِ خیال لاہور ●

پیروڈی :-

تنقیدِ شعری

دندانِ تو جملہ در دہان اند
چشمانِ تو زیرِ ابروان اند

آج ہم ایک ایسا شعر پیش کرتے ہیں جو اپنی غیر معمولی خوبی کی وجہ سے شہرتِ دوام حاصل کر چکا ہے۔ فنِ شاعری کی کوئی عمدہ کتاب دیکھ لیجئے۔ جہاں بھی حقیقتِ شعر کی بحث ہوگی وہیں یہ شعر بطورِ مثال موجود ہوگا۔ اردو اور فارسی شاعری میں دلچسپی لینے والا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس کو یہ شعر یاد نہ ہو لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ یہ الہام کس پر اُترا۔ گویا شعر کی شہرت نے شاعر کے نام پر بھی پردہ ڈال دیا ہے +

اس شعر کے پڑھتے ہی سب سے پہلی چیز جو دل پر اثر کرتی ہے وہ اس کی سادگی۔ سلاست اور روانی ہے۔ نہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے قاموس وصراح کی ضرورت پیش آئے۔ اور نہ کوئی ایسی ترکیب جس کے سمجھنے کے لئے غالب کی رُوح سے استمداد لازمی ہو جائے +

دوسری قابلِ داد بات یہ ہے کہ شعر حشو و زوائد سے بالکل پاک ہے۔ عام شعرا کی طرح شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے کوئی بھرتی کا لفظ نہیں ٹھونسا گیا۔ شاعر نے صرف وہی الفاظ رکھے ہیں جو نہایت ضروری تھے۔ اور اُن کو بھی اس طرح کرسی پر بٹھایا ہے کہ کیا مجال جو اپنی جگہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہل سکیں +

تیسری بات جو پڑھنے والے کو واہ واہ کہہ اٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے وہ شعر کے الفاظ کی "موسیقی" ہے ذرا شعر کو ترنم کے ساتھ دُہرائیے اور دندان۔ دہان۔ ابروان کی آوازوں پر کان رکھئے۔ کیا ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ آپ گا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ کوئی پیانو بجا رہا ہے؟

یہ سب تو ہوئیں لفظی خوبیاں۔ اب ذرا محاسنِ معنوی کی طرف توجہ کیجئے دندانِ تو جملہ در دہان اند۔ یعنی تیرے تمام دانت منہ میں ہیں۔ بظاہر اک معمولی سی بات ہے۔ لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایک گنجینۂ اسرار نظر آتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ ایک حسین ہے جس کا چہرہ چاند کو شرماتا ہے۔ رخسار گلاب کے پھول ہیں۔ ناک تلوار کی نوک۔ ہونٹ عاشق کے زخمِ دل کی مانند۔ ٹھوڑی ناشپاتی کا ٹکڑا ہے۔ اور دانت انار کے دانے۔ غرضیکہ حسن وجمال ہر طرح سے مکمل ہے۔ لیکن افسوس کہ جب وہ ہنستا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انار کے دانوں میں سے ایک دو دانے گم ہیں۔ اب بتائیے کہ تمام خوبصورتی خاک میں مل گئی یا نہیں؟ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمارے شاعر نے سب سے پہلے یہی کہہ دیا کہ دندانِ تو جملہ در دہان اند۔ تیرے تمام دانت منہ میں ہیں کوئی دانت گرا ہوا نہیں +

اس میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ تمام دانتوں کا منہ میں ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ممدوح بوڑھا نہیں۔ لہٰذا جوان یا کم سن ہوگا۔ کم سنی اور شباب کے خیال کے آتے ہی سُننے والے کی آنکھوں کے آگے ایک ایسی تصویر پھر جاتی ہے۔ جس میں حسن وجمال کے تمام لوازم بدرجۂ اتم موجود ہوں گویا یہ مصرع گنجینۂ حسن کا ایک طلسم ہے۔ اس کے بعد محبوب کے کسی اور وصف کی تعریف کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی +

"در دہان اند" پر ذرا مزید غور فرمایئے۔ اس کے معنی ہم نے "منہ میں ہیں" کئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی "منہ کے اندر ہیں" بھی ہو سکتے ہیں یعنی تیرے تمام دانت منہ کے اندر ہیں۔ کوئی دانت باہر نکلا ہوا نہیں۔ کوئی کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو اگر اُس کا کوئی دانت منہ سے باہر نکل کر نچلے ہونٹ کے اوپر جلوہ فرما ہو تو اُس حسین کی شانِ محبوبیت کو داغ لگ جائے گا۔ ہمارے شاعر کا محبوب اس عیب سے بالکل پاک ہے +

اب دوسرے مصرع کو لیجئے چشمانِ تو زیرِ ابروان اند یعنی تیری آنکھیں ابروؤں کے نیچے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آنکھیں ابروؤں کے اوپر

تھوڑی سی ہوتی ہیں۔ جو یہ نیچے کی تخصیص کردی گئی ہے۔ آپ غلط سمجھے۔ نیچے سے یہاں سمت کی تخصیص نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ آنکھوں کے اوپر ابرو موجود ہیں۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے جمالیاتِ فرنگ کی طرف توجہ کیجئے۔ یورپ میں بالعموم اور فرانس و انگلستان میں بالخصوص باریک ابرو ایک لوازمۂ حسن سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے حسینانِ فرنگ مصنوعی طریقوں سے ابروؤں کے بال اُڑا اُڑا کر انہیں ایک لکیر سی بنا دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات اسقدر باریک کر دیتے ہیں کہ وہ "ہرچند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں" کے مصداق بن جاتے ہیں۔ مغربی نقطۂ نظر سے یہ کتنے ہی پسندیدہ ہوں مگر مشرقی زاویۂ نگاہ سے ہمیشہ ایسے ابرو قابلِ تعریف ہیں جو پیوستہ ہوں تو کمان کی مانند ہوں اور غیر پیوستہ ہوں تو ہلال کی مثال۔ شاعر جو مشرقی روایات کا علمبردار ہے اپنے محبوب کو مغربی تصنع سے محفوظ دیکھ کر داد دیتا ہے کہ اے محبوب آفرین ہے کہ تو نے بتانِ مغرب کی تقلید میں ابروؤں کو غائب نہیں کر دیا۔ بلکہ تیری آنکھیں ابروؤں کے نیچے ہیں۔

(چشمان اور ابروان کے الفاظ بھی غور طلب ہیں۔ فارسی میں بیجان کی جمع "ہائے" سے ہوتی ہے اور جاندار کی "ان" سے۔ یہاں چشمہا ئے اور ابروہائے کی بجائے چشمان اور ابروان کیوں کہا گیا؟ اہلِ صرف خواہ کچھ کہیں لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس میں ایک عجیب و غریب نکتہ پنہاں ہے۔ "ان" سے چشم و ابرو کی جمع بنا کر شاعر نے ان میں زندگی بھر دی ہے اور وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو "گردشِ چشم" اور "جنبشِ ابرو" وغیرہ جیسی ترکیبوں سے پیدا نہیں ہوسکتی)

اب دونوں مصرعوں کو ملا کر پڑھئے۔ اور معانی پر غور کیجئے۔ پہلا مصرع عالمِ شباب اور حسن بے عیب کی تعریف کرتا ہے۔ جو ایک عطیہ قدرت ہے۔ اور انسان کے اختیار سے باہر۔ مصرع ثانی حسن کا تصنع سے پاک اور مغربی اثرات سے محفوظ ہونا ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ ذاتی احتیاط کا نتیجہ ہے۔ گویا دونو مصرعے ملکر نہ صرف حسن و جمال کی ایک مکمل تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ بلکہ فلسفۂ حسن کی بھی بوجہ احسن تشریح کر دیتے ہیں۔ واقعی حسن ایک خداداد چیز ہے۔ مگر اس کا برقرار رکھنا صاحبِ حسن کی ذاتی کوشش و احتیاط پر بہت کچھ منحصر ہے۔ نیز مشرقی حسن کی شان اسی میں ہے کہ مغربی معیارِ حسن کو مطمحِ نظر نہ بنائے +

حق تو یہ ہے کہ شاعر نے ایک مختصر سے شعر میں حسن کی دنیا بند کر دی ہے یہ شاعر کی قادرالبیانی۔ نادرالبیانی اور نقاشی قابلِ ہزار تحسین و آفرین ہے

الف میم

ترجمہ نظم
Solitary Reaper"

انشائے لطیف:۔ دہقانی لڑکی

دیکھو! دیکھو! اُس پہاڑی لڑکی کو دیکھو جو سامنے والے کھیت میں فصل کاٹ رہی ہے۔ اور کچھ گاتی بھی جاتی ہے۔ کبھی خاموش ہوجاتی ہے۔ اور کبھی دبے پاؤں آگے نکل جاتی ہے۔ وہ اکیلی فصل کاٹ رہی ہے۔ اور اُس کی زبان پر ایک درد بھرا نغمہ ہے +

سنو! سنو! وادی کی گہرائیاں نغمہ سے پُر ہیں۔ عرب کے۔ تپتے ملک میں نخلستانوں کے درختوں پر تھکے مسافروں کے خیر مقدم کے لئے کسی بلبل نے ایسا نغمہ نہ گایا ہوگا +

جزائر ہیبرڈیز کے اندر موسم بہار میں کوئل کی وہ آواز جو سمندر کی خاموش فضاؤں میں گونج اُٹھتی ہے۔ اس سے زیادہ وحشت انگیز نہیں ہوسکتی۔ خدا کے لئے مجھ کو کوئی یہ بتادے کہ وہ کیا گا رہی ہے۔ کیا وہ گذری ہوئی باتوں پر زمانہ کی جنگجو بھری داستان الاپ رہی ہے۔ یا آجکل کے زمانے کا کوئی پُر درد واقعہ اُس کی زبان پر ہے۔ یا کوئی قدرتی غم و رنج جو آج بھی موجود ہے اور پھر بھی ہوسکتا ہے +

اُس راگ کا مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو لڑکی برابر گاتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا نغمہ ختم ہونے والا ہی نہ تھا + میں نے دیکھا وہ کام کر رہی تھی اور گاتی بھی جاتی تھی۔ سُریلی آواز اُس کی زبان پر تھی۔ میں سناٹے میں آگیا۔ اور خاموش کھڑا اس سُریلی آواز کے مزے لوٹتا رہا۔ جب میں پہاڑ پر چڑھ گیا تو وہ پیاری دلکش آواز میرے دل کے ساتھ چلی گئی۔ اسیطرح شام ہوگئی۔ اور پیاری سُریلی آواز کا خاتمہ ہوگیا +

(ورڈسورتھ)

عتیق الرحمٰن نعمانی ردولوی

زندگی کی گاڑی

تمہاری زندگی کی گاڑی بہت تیز جا رہی ہے +

اس گاڑی میں دو گھوڑے لگے ہوئے ہیں۔ ایک نیکی کا گھوڑا ہے اور دوسرا بدی کا۔ تمہارا نیکی کا گھوڑا سست رو مریل ہے۔ اور بدی کا گھوڑا نہایت شریر اور تیز رو ہے +

تم نے بدی کے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی ہے۔ اور وہ تمہاری گاڑی کو اِدھر اُدھر کھینچے لئے جا رہا ہے۔ وہ نیکی کے گھوڑے کو اپنے راستے پر گھسیٹ رہا ہے +

تم نیکی کے گھوڑے کو مار رہے ہو۔ لیکن وہ نہیں بھاگتا ہے۔ تم اُس کی عنان کو جھٹکے دے رہے ہو اور وہ رُک رُک کر جاتا ہے +

جس طرف نیکی کا گھوڑا اچل رہا ہے۔ اُدھر نہ تو کوئی درخت ہے اور نہ ہموار زمین۔ وہاں لق و دق گھاٹیاں ہیں۔ اور بلند و مہیب پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ جس پر تم نہیں چڑھ سکتے۔ اُس کی سر بفلک چوٹی تک نہیں پہنچ سکتے +

بہت دور ایک روشنی نظر آرہی ہے جس کو تمہاری دنیاوی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ تم ایسے کٹھن راستے پر جانے سے ڈرتے ہو۔ بلکہ تم اُدھر دیکھتے تک نہیں

اور جس جانب بدی کا گھوڑا چل رہا ہے اُس سمت میں مرغزار اور پھولدار درخت لہلہا رہے ہیں۔ ایک چشمہ پر چند حسین دوشیزہ لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ چند گا رہی ہیں اور کچھ نہا رہی ہیں۔ اور بعض تمہیں پکار رہی ہیں۔ تم انہیں دیکھ کر بے تاب ہو جاتے ہو اور بدی کا گھوڑا تمہاری گاڑی کو اُس طرف کھینچتا ہے۔ نیکی کا گھوڑا بے بس ہو کر ہانپتا کانپتا چلا جا رہا ہے۔ تم اسے اور کوڑے رسید کر رہے ہو۔ تاکہ جلد از جلد چشمہ پہ پہنچ جاؤ۔ اور لڑکیوں سے لطف اندوز ہو۔ دُور ایک کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ اور اُس میں ایک مہیب شکل تمہیں غصّے سے دانت نکالے دیکھ رہی ہے۔ لیکن تمہیں اس کی مطلق خبر نہیں +

تم اندھے کی طرح برابر گاڑی ہانکے جا رہے ہو۔ تمہاری گاڑی مرغزاروں کو سُرعت سے طے کر رہی ہے۔ وہاں پوشیدہ گڑھے بھی ہیں جن سے تمہاری گاڑی ہچکولے کھاتی جا رہی ہے +

بدی کا گھوڑا بدک رہا ہے۔ تم دھکے کھا رہے ہو۔ لیکن تمہاری پُر شوق نگاہیں انہیں پری وش لڑکیوں کے ہجوم پر ہیں۔ تم ان سے ملنے کے لئے بیقرار ہو اور تم خوشی سے چلّانے لگتے ہو +

لو! گاڑی چشمہ کے قریب پہنچ گئی۔ تم جلدی میں کود پڑے ہو اور خود کو ایک گڑھے میں پاتے ہو۔ لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہیں۔ تم کیچڑ میں لت پت ہو کر باہر نکلتے ہو۔ تمہارا منہ کیچڑ سے بدنما ہو گیا ہے۔ اس لئے تم شرم مٹانے کے لئے فوراً چشمہ میں نہانے لگتے ہو +

اُس وقت ایک آواز آتی ہے "او اندھے انسان ہوشیار دیکھ تیری موت قریب ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ نیکی کی راہ اختیار کر گو تجھے کئی مشکلات اُٹھانی پڑیں گی۔ سنبھل جا ورنہ تیرا انجام بہت بُرا ہوگا" +

لیکن تم بہرے ہو چکے تھے۔ تم نے چند الفاظ سنے اور دوسرے کان سے اُڑا دیئے +

اب تم لڑکیوں کے ہجوم میں پہنچ گئے ہو۔ تم نے یکے بعد دیگرے سب کو آغوش میں لیا اُنہوں نے بھی تمہیں پیار کیا۔ اُنہوں نے تمہیں شراب پلا کر مست کر دیا۔ اُنہوں نے گا گا کر تمہیں مسحور کر دیا۔ اُنہوں نے تمہارے دل کو اپنے ناز و انداز سے مسخر کر لیا +

تم بدی کے خوبصورت پنجے میں گرفتار ہو۔ وہ غیبی آواز تمہیں دوبارہ سنائی دیتی ہے۔ لیکن تم عیش سے نہیں چونکتے۔ تم غافل ہو گئے ہو +

دیکھو وہ دور سے گھٹا اُٹھی۔ لو وہ تند ہوائیں چلنے لگیں +

دیکھو چشمے کا پانی اُبلنے لگا۔ سُنو وہ بجلی کڑکی +

ہاں تم اب ہوشیار ہو گئے۔ ہاں تم نے آنکھیں کھول دیں۔ اُف تم اس خوفناک سماں سے لرزنے لگے۔ تم اپنے بچاؤ کے لئے چشمے کو بدقت پار کر کے گاڑی کی طرف دوڑتے ہو +

معاً بدی کا گھوڑا بدک کر چشمے کے کنارے دوڑنے لگتا ہے۔ تم پاگل کی طرح بھاگتے ہوئے گاڑی کو جا لیتے ہو۔ لیکن تم ابھی اس میں بیٹھنے بھی نہیں پاتے کہ گاڑی ایک چٹان پر پھسل جاتی ہے۔ تم چشمے میں اوندھے مُنہ گر پڑتے ہو۔ اور ایک بھنور میں پھنس جاتے ہو +

تم نے بھنور میں سے نکلنے کی بہت کوشش کی۔ مدد کے لئے لڑکیوں کو پکارا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں غائب ہو چکی ہیں۔ البتہ ایک موت کا راگ تمہیں سُنائی دے رہا ہے +

یکبارگی تمہاری نظر میدان کی طرف پڑتی ہے۔ جہاں نیکی کا گھوڑا اطمینان سے چر رہا ہے۔ اسے نہ تو طوفان کا خوف ہے اور نہ بجلی کا ڈر +

دوسری طرف بدی کا گھوڑا چٹان پر تڑپتے ہوئے دم توڑ رہا ہے۔ اور وہیں تمہاری زندگی کی گاڑی ٹوٹی پڑی ہے +

لو اب تمہارے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ دیکھو تمہاری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ آہ تم موت کے ہیبتناک فرشتے کو دیکھ کر چلّانے لگے +

تم موت کے بھنور سے بچنے کے لئے آخری مرتبہ ہاتھ پیر مارتے ہو۔ مگر بھنور تمہیں زہریلے سانپوں کی طرح لپٹا ہوا ہے۔ افسوس کہ تم اب بے بس ہو گئے +

تمہاری آنکھیں بند ہوگئیں اور موت کا فرشتہ تمہیں بے جان چھوڑ کر چلا گیا +
آہ! یہ تھی تمہاری مختصر زندگی +

قیس حیدرآبادی

مصوّر

مصوّر حقیقت کا رازداں ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ صنّاعِ عالم نے آسمان پر تاروں کو کس لئے بے ترتیبی سے بکھیر رکھا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ ہر انسان کے خط و خال۔ اوضاع و اطوار ایک ہی جیسے ہوتے تو زندگی کسقدر دشوار ہوجاتی۔ اس لئے وہ تتبع سے آزاد ہوکر تخلیق کرتا ہے۔ اور یکسانیت میں اضافہ کرنے کی بجائے تازہ اختراعات کرتا ہے +

ہر باکمال حقیقی مصوّر کسی ظاہری خط و خال کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ نئے شاہکاروں میں نئی زندگی لاتا ہے۔ تصویر کے اعضا و اطوار مصوّر کی انفرادی شخصیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہی اس کا پیغام ہوتا ہے!

مصوّر کا کام کائنات کے اسرار کو بے پردہ کرنا ہے۔ پریشانی کو ترتیب دینا ہے۔ اپنے تفکرات کو صورت پذیر بناتا ہے +

مصوّر کا پیغام عالمگیر جبھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب میں ایسا رچا ہوا ہو کہ وہ قدیم روایات کو اپنے مخصوص انفرادی رنگ میں ڈھال سکے +

مصوّر ایسے راہِ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔ جہاں ہر قدم پر کہکشاں کے تارے بکھرے پڑے ہیں۔ جہاں کے ذرّے ذرّے میں قوموں کا مستقبل اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ پوشیدہ ہے!

یہ قدرت کا پیغامبر صنفِ نازک سے ایک گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ اور زندگی کے سارے سرمایہ کو بے دریغ قدرت کی اس پُراسرار نعمت پر قربان کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اور اُس کے وسیلے سے عالمگیر اوصاف' آزاد حسن' اور نازک نازک تمثیلیں اختراع کرتا رہتا ہے۔ جو ملکی اور قومی کاموں میں ہمیشہ انقلاب کا باعث ہوتی ہے +

عبدالاحد شرف الدین پوری

ساحر کے نغمہ ہائے شب!

(۱)

اے کہ تیری سحر آفریں آواز آسمانی طلسم گاہ سے تمام دکھ اور غم دھرتی کی جانب کھینچ لاتی ہے۔ اور اُداس اور مظلوم دلوں کو رنج و الم کے نئے اور تازہ تحفے بخشتی ہے!!

آہ' مجھ سے اب صبر نہیں ہو سکتا!

یہ بیقراری اور ویراگ کس لئے ہے؟!

شاید سکون آسمان سے اُتر رہا ہے!

آہ اے سکون' جلد آ اور میری غمگین روح کو اطمینان بخش!!!

(۲)

تمام کہساروں پر'
خاموشی طاری ہے!
درختوں کی شاخوں میں
سکون ہو رہا ہے!!
طیور آشیانوں میں خواب سے ہمکنار ہیں!
ٹھہر' اے غمگین ساحر صبر کر' تو بھی جلد انہی کی طرح سکھ کی نیند سوئیگا!!!

(گوئٹے)

مترجمہ عظیم قریشی

تمنّا

...... جس طرح چودھویں کا چاند دریا کی گود میں چمکتا ہے' اسی طرح تو میرے دل کی گہرائیوں میں بستا ہے ـــــ نسیم پھول کی خوشبو کو دامن میں لے کر اترائی پھرتی ہے ...... اسی طرح میرا تخیل تیرے خیال سے ہم آغوش ہو کر پھولا نہیں سماتا ـــــ اے میرے محبوب میرا ہر سانس تیری محبت سے معمور ہے جب میں سوتی ہوں تو تیری یاد محافظ فرشتہ کی طرح مجھ سے الگ نہیں ہوتی.... تو میرے تنہا لمحات کو آباد کرتا ہے ـــــ اور مشغول وقتوں میں بھی میری رگ و پے میں ساری ہوتا ہے .... کاش اے محبوب' میرے مرنے کے بعد بھی تیری محبت .... میری تربت کا پھول اور شمع مزار ہو!!!

شکیلہ خاتون ارول

نسیان

میں واقعات کو جلدی بھول جاتا ہوں ـــ ہاں ایک خفیف سا' غیر معلوم سا' باریک اور غیر مبہم..... دھندلا سا اثر میرے دماغ پر مرتسم رہتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ مجھے بہت لطف دیتا ہے +

آج میں بیٹھا ہوں۔ اپنے گذشتہ ایام۔ اپنی ماضی رفتہ کو یاد کرتا ہوں۔ تو میں کیا دیکھتا ہوں چند دھندلی سی تصویریں۔ چند مٹے مٹے اور آپس میں اُلجھے ہوئے نقوش ہیں۔ اور بس! ہر چند میں اُن میں کچھ ربط' کچھ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر ان اوراقِ پریشاں کو ایک سلسلہ میں منضبط کرنے میں ناکام رہتا ہوں ـــــ سوچتا ہوں اور بہت سوچتا ہوں۔ لیکن چند بے ربط نتائج پر میری کوششیں منتج ہوتی ہیں۔ یہ ربط سے خالی۔ تعلقات سے بری نتائج مجھے بہت لطف دیتے ہیں۔ اُن سے میری زندگی خوشگوار بن رہی ہے۔ اور میں اپنے ارد گرد ایک عجیب دنیا پاتا ہوں ـــــ

وہ شخص جو واقعات کو کبھی نہیں بھولتے۔ افکار و حوادث ان کے دماغ پر گہرے۔ نہ مٹنے والے نقوش بنکر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ ہاں وہ شخص میں خیال کرتا ہوں۔ قطعی طور پر زندگی کی مسرتوں سے متمتع اندوز نہیں ہو سکتے ـــ ایک خفیف سا اشارہ گذشتہ واردات کو چلتی پھرتی تصویروں کی مانند اُن کی آنکھوں کے سامنے متحرک کر دیتا ہے۔ ذرا سی سوچ پر اُن کے ایام رفتہ کے حوادثات اور واقعات حقیقی رنگ میں اُن کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اور پھر آہ خود ہی سوچ لو۔ ان دنوں کی یاد ان کے دل پر کیا اثر کرتی ہوگی۔ وہ جذبات جو آج سے مدت پہلے اُن کے دل و دماغ پر کاری وساری رہتے تھے۔ پھر رگ رگ میں چٹکیاں لینے لگتے ہیں۔ پھر انہیں غمگین' مسرور' حزیں یا شاداں بنا دیتے ہیں +

حوادثات اور واقعات دائمی چیزیں ہیں۔ اُن کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ معینہ کے لئے آتے ہیں۔ اُنہیں یاد کر کے پھر انہیں تکلیف دہ یا حسرت افزا واقعات کی یاد کا لطف اُٹھانا چبے ہوئے نوالے کو چبانا ہے +

ـــــ ہاں میں واقعات کو جلدی بھول جاتا ہوں۔ باوجود نوے سال عمر ہونے کے میں یہی خیال کرتا ہوں کہ اب کتم عدم سے عرصۂ شہود پر آیا ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ مجھے یاد تک نہیں کہ میری ماضی رفتہ میں کون کون سی چیزیں وقوع پذیر ہوئیں۔ کون کون سی مصیبتیں مجھ پر ٹوٹیں۔ کون کون سی مسرتوں سے میں تمتع اندوز ہوں +

ہاں اگر کچھ سوچ بچار کے بعد کچھ قرائن اور قیاسات سے معلوم بھی کر لوں۔ تو وہ چند نقوش ہیں: نامعلوم اور دھندلے دھندلے سے۔ وہ تمام مصائب جو میرے لئے باراں گئے ثابت ہوئے ہونگے۔ وہ تمام مسرتیں جو میں نے زندگی میں دیکھی ہونگی۔ وہ تمام واردات قلبیہ وہ تمام داحساسات۔ وہ تمام مم

اندوہ رُبا خیالات ۔ جو کبھی میرے دماغ میں چٹکیاں لیتے رہے ہونگے ۔ آج سب ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں ۔ تمیز تک نہیں ہو سکتی ۔ آج میں اندوہ رُبا مسرتوں ۔ الم افزا غموں سے ایک جیسا لطف اُٹھاتا ہوں ۔ غم و سرور ۔ اندوہ و مسرت ۔ حزن و شادمانی میرے لئے ایک ہی چیز ہے ———— اور پھر آہا یہی ہے زندگی اور یہی زندگی کا ماحصل !!

عبدالمجید امجد

"اعمال نامہ"

خود سر انسان نے مارے شرم کے اپنی گردن جھکا لی اور نیچی نظریں کئے دھیمی آواز سے کہا " ہاں میں نے ایسا ہی کیا !! "

شانِ کریمی نے یہ الفاظ سُنکر انسان کا اعمال نامہ کھولا اور کہا ۔ " اے ابن آدم ! تو نے اپنی زندگی بدکرداریوں کی نذر کی ۔ تو نے مقصد حیات کو ایک خوابِ پریشان کی طرح بُھلا دیا ۔ تو اپنی بے ثباتی سے لاپرواہ اور یوم جزا کے خوف سے بالکل بے خطر صراطِ مستقیم سے کوسوں دور بھٹکتا پھرا ۔ تیری خوابگاہ انتہائی آرائشوں کا مجموعہ اور صفحۂ ہستی پر جنّت الفردوس کا نمونہ تھی ۔ تیرے عشرت کدہ میں ہر دم محفلِ رقص و سرور قائم رہتی ۔ شب و روز شراب گلگوں کے دَور چلتے ۔ اور آٹھوں پہر حور طلعت نازنینوں کا تانتا بندھا رہتا ۔ نیکی سے بے بہرہ اور سزائے گناہ سے بے خوف تو نے بیکس انسانوں اور بے زبان حیوانوں پر دل کھول کر وہ وہ ستم توڑے کہ زمین تھرا اُٹھی ۔ درخت سہم گئے ۔ ستاروں کی پُرغم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلیں ۔ اور فلکِ پیر بے بس ہو کر کانپنے لگا ۔ میں نے تجھے گناہوں سے بچنے کی تلقین کی اور دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ۔ مگر گناہ تجھے ایسے مرغوب ہوئے کہ ایک لمحہ بھی تجھے ان سے فراغت نہ ملی ۔ میں نے تجھے دانۂ گندم کھانے سے منع کیا ۔ مگر جب تک اُسے کھا نہ لیا ۔ تجھے چین نصیب نہ ہوا ۔ تو نے مٹی اور پتھر کی بیجان مورتوں اپنے ہی جیسے فانی انسانوں اور بے بس حیوانوں کے آگے سرِ نیاز خم کیا ۔ تو نے آگ ' پانی ' دریا ' سمندر ' چاند ' سورج ' سانپ اور ستاروں کی پرستش کی ۔ قربانیاں چڑھائیں اور مرادیں مانگیں ۔ او سفاک انسان ! وہ کونسا گناہ ہے جو تجھ سے سرزد نہ ہوا ۔ اور وہ کونسی لغزش ہے جس سے باز رہ کر تو نے سعادتِ دارین حاصل کرنے کی کوشش کی ؟ "

عدالتِ ایزدی میں ہر طرف سکوت کامل تھا اور فرعون نفس انسان خدائے عادل کے حضور میں گردن جھکائے بے حس و حرکت کھڑا تھا ۔

پھر صانعِ قدرت نے انسان کا اعمالنامہ کھولا اور کہا " اے سنگدل انسان ! تو نے نیکی کو گناہ اور خطا کو کارِ ثواب سمجھ کر رحم کو ترستے ہوئے بیکس ' مظلوم اور ستم رسیدہ بندوں پر ظلم و ستم کے بادل برسائے ۔ تو نے غریبوں اور محتاجوں کی چیخ و پکار پر کان نہ دھرے ۔ تو نے یتیموں اور بیواؤں کی آہ و بکا کی پرواہ نہ کی ۔ تو نے میرے نیک بندوں کو جو عبادت کدوں میں دن رات میری حمد و ثنا میں محو رہتے تھے ۔ طرح طرح کی تکلیفیں دے کر جان سے بیزار کر دیا ۔ او مٹی کے ناچیز پُتلے ! تو نے میری زمین پر معصوموں کے خون کی ندیاں بہائیں ۔ اور ہر طرف فتنہ و فساد برپا کر کے اپنا اُلّو سیدھا رکھا ۔ اگر میرے کسی پاکباز بندے نے تجھے رات کی خوفناک تاریکی سے اپنے مختصر سے جھونپڑے میں پناہ دی اور خود تمام رات باد و باراں کا نشانہ بنا رہا تو تو نے طلوعِ آفتاب سے پیشتر ہی اس نیکی کے عوض اُسے مارِ آستین کی طرح ڈس کھایا ۔ تیرے جس محسن نے تجھ پر رحم کیا ۔ تو نے اُسی کا سر کاٹا ۔ اور جس ہمدرد دوست نے تیرا ساتھ دیا تو نے اُسی کو موت کے گھاٹ اُتارا ۔ او عیش و عشرت کے بندے ! کیا میں نے تجھے انہی کاموں کے لئے پیدا کیا تھا ؟ "

یہ سُنکر سرکش انسان نے آہستہ آہستہ اپنی گردن اوپر اُٹھائی اور دبی ہوئی آواز سے کہا " بیشک میں نے ایسا ہی کیا ! "

جب یہ بے باک الفاظ انسانِ بدلگام کی زبان سے نکلے ۔ تو خدائے قہّار نے اعمالنامہ بند کر دیا اور کہا " او گستاخ انسان ! تو اسی قابل ہے کہ تجھے دوزخ میں جھونک کر کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے ۔ بس اب نارِ جہنم میں اپنی بد اعمالیوں کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جا ! "

خالقِ ارض و سما کا یہ فیصلہ سن کر سرکش انسان چلا اُٹھا "نہیں! ہرگز نہیں!! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!!!"

"کیوں؟ میرے فیصلے میں کہاں کی بے انصافی ہے؟؟ آخر میں تجھے یہ سزا دینے میں کیونکر حق بجانب نہیں ہوں؟؟؟"

"وجہ؟ یہی کہ میں تمام عمر دوزخ ہی میں تو رہا ہوں!"

یہ سُنکر عدالتِ خداوندی میں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اور سب حیران ہو کر مجرم انسان کا منہ دیکھنے لگے +

(آسکر وائلڈ)

مفتی محمد افضل انور۔ بی۔ اے

"غلط فہمی"

"ایک لڑکی باہر آپ کو پوچھتی ہے"+

میرے نوکر نے دروازے سے اپنا "مبارک چہرہ" نکالتے ہوئے حسبِ معمول سنجیدگی اور متانت کے لہجے میں کہا +

میں چلا اُٹھا "ایک لڑکی"+

وہ حیران تو ہوا۔ مگر صرف اتنا کہا: "یہ باہر تشریف رکھتی ہیں"+

میں غسل خانے کی طرف دوڑا۔ منہ پر ایک چھینٹا دیا۔ جلد جلد کپڑے پہنے۔ کانپتے ہاتھوں سے ٹائی باندھی۔ طبیعت کی بے چینی اور جذبات کے ہیجان کی کوئی انتہا نہ تھی +

سوچا ثریا ہوگی۔ پھر خیال آیا۔ اتنی میری کہاں قسمت کہ وہ میرے گھر پر ملنے آجائے۔ پھر سوچا وہ لڑکی ہوگی جس نے سینما میں بار بار میری جانب پُر التفات نگاہوں سے دیکھا تھا۔ نہیں میری ہمجماعت رشیدہ ہوگی۔ لیکن وہ تو مجھ سے گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ تو پھر کون ہو سکتی ہے؟ کوئی محبت زدہ ہوگی اور مجھے اپنی حالت سے آگاہ کرنے آئی ہے۔ ہاں کچھ عجب تو نہیں۔ آخر میں ایسا بھی بُرا کیوں ہوں۔ میں......

آئینہ دیکھا تو چہرہ سرخ تھا۔ خوبصورتی کے آثار تو چنداں نظر نہ آئے۔ مگر دل نے کہا محبت کے لئے خوبصورت ہونا لازمی نہیں۔ خیر دیکھا جائیگا۔ اوہو۔ خوب یاد آیا۔ وہ لڑکی نہ ہو جس کو ایک دن میں نے اُس کی گری ہوئی کتاب اُٹھا کر دی تھی۔ اُس نے ایک انداز دلنواز کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ شاید میری کوئی ادا پسند آگئی ہو اور کسی سے میرا پتہ ڈھونڈ نکالا ہو +

ٹائی درست کی۔ لباس پر سینٹ چھڑکا۔ میلے پاجامے سے بوٹ دوبارہ صاف کیا اور سوٹ کے شکنوں کو درست کرتا ہوا باہر نکلا۔ گھبراہٹ بڑھ گئی تھی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جسم کے ہر حصے میں برقی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ کیوں نہ ہوتا ایک لڑکی....... سے پہلی ملاقات.....

چِق کا اُٹھانا تھا کہ ایک میلی کچیلی مریض اور دردناک آواز سُنائی دی +

"حضور بھوکی مرتی ہوں۔ کھانے کے لئے......."

میں مایوس اور پژمردہ نگاہوں سے اپنے لباس کو تک رہا تھا +

(ترجمہ)

محمد عظیم حسین

شنیدہ کے بود مانند دیدہ!

[مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی سے درخواست ہے کہ اس مضمون کا بقیہ لکھیں ۔ ایڈیٹر]

از جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی ۔ بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی ۔ (علیگ)

ایک روز کا ذکر ہے کہ اتوار کا مبارک دن تھا ۔ میں اتوار کو مبارک کہتی ہوں کیونکہ اتوار کو ولایتی ڈاک آتی ہے ۔ میرے پاس دنیا کے عزیز ترین شخص کا نامۂ محبت لاتی ہے ۔ اتوار کے دن میں صبح تڑکے ملازم کو ڈاکخانہ بھیج دیتی ہوں ۔ اور خود بار بار پھاٹک کی طرف دیکھتی ہوں کہ ملازم لاپرواہی سے خط لئے آہستہ آہستہ چلا آرہا ہے ۔ کمبخت دوڑتا تک نہیں بلکہ اکثر کسی دوسرے ملازم سے بات چیت کرنے لگ جاتا ہے ۔

قصہ مختصر اتوار کا دن تھا ۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور خط میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لیا ۔ حسب ذیل عبارت تھی :-

" جمو ۔

. . . . . تمہارا جم اب ہندوستان آنے والا ہے ۔ کیا جمو بھی اس کا بے چینی سے انتظار کرتی ہوگی ۔ کیا یہ ممکن ہے ؟ جم کی ایسی قسمت ہے ؟

میں اگلے ماہ کی ساتویں کو یہاں سے روانہ ہونگا ۔ ۲۹ ر کی شام کو بمبئی پہنچونگا ۔ اور پہلی مرتبہ جو جموں کو دیکھونگا تو . . . . . ہاں . . . . . میں نے جموں کو پرسوں خواب میں دیکھا تھا ۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں بغیر کسی تعارف کے دیکھتے ہی کہدونگا کہ وہ کون ہے ۔ تصویر کا کیا کرو گی ۔ مجھے تو تمہاری تصویر کی ضرورت نہیں ۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو بھیج دو ۔ جلدی ۔ باقی بوقت ملاقات ۔

تمہارا جم "

آپ کہیں گے کہ تمہارا نام جمو کیسے ہو گیا ۔ تو سنئے کہ جمشید سے ہوا جم اور جم نے خود میرا نام جمو رکھ دیا ۔

خط کیا تھا میرے لئے تماشا تھا ۔ بے تحاشا باغ کی طرف دوڑی ۔ پھر لوٹی ۔ برقعہ بغل میں دابا کہ کہیں کوئی بھلا مانس نہ مل جائے اور باغ کی دیوار سے نکل کر سامنے کے کھیتوں میں داخل ہوئی ۔ سامنے شاہ جی کے بنگلہ کا باغ نظر آرہا تھا ۔ کھیتوں کی خوشگوار ہوا کسقدر پر فضا تھی اور میں فراٹے بھرتی جا رہی تھی ۔ چشم زدن میں شاہ جی کے بنگلہ کے گھنے باغ میں پشت کی طرف سے گھس گئی ۔ کیلوں کی قطار کے برابر برابر دوڑتی ہوئی سیدھی پشت کے برآمدہ میں پہنچی ۔ ایک مالی کھرپا لئے کھڑا تھا ۔ اس نے سلام کیا ۔ جلدی سے میں نے پوچھا " شاہ جی ہیں " واللہ اعلم اس نے کیا جواب دیا ۔ مگر کھرپا کمرے کی طرف اٹھا دیا ۔ میں جانتی ہی تھی کہ شاہ جی کا کمرہ اوپر ہے اور وہ بیٹھی ہوگی ۔

تیر کی طرح دو دو سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی ۔ اوپر کے برآمدہ میں پہنچی تو سامنے آئینہ دیکھ کر خیال آیا کہ کسقدر بدحواس ہو رہی ہوں ۔ کھیتوں کی دوڑ دھوپ سے چہرہ تمتما گیا تھا اور پھر سانس پھول گیا تھا ۔ شاہ جی ہنسے گی ۔ یہ خیال کر کے دروازہ پر ٹھہری کہ ذرا سانس قابو میں آجائے ۔ برقعہ برابر والی کرسی پر رکھ دیا ۔ اور پھر چپکے سے کمرہ کا پردہ سرکا کر جھانکا ۔ کیا دیکھتی ہوں کہ شاہ جی دو شالہ اوڑھے مسہری پر سو رہی ہے ۔ سامنے کی چھوٹی میز پر قلم اور کھلا ہوا خط لکھنے کا پیڈ رکھا ہوا ہے ۔ میں نے مسکرا کر دل میں کہا ٹھہر جا آج تیری خبر لونگی ۔ شاہ جی کی عادت تھی کہ جیسے ہی وہ میرے آنے کی آہٹ پاتی ۔ فوراً سو کام چھوڑ سوتی بن جاتی ۔ خراٹے لینے لگتی ۔ اور جب میں جا کر اس کو اٹھاتی تو ایسی بنتی کہ جیسے عرصے سے سو رہی ہے ۔ مصنوعی سونے کے لئے وہ یا تو تکیہ میں منہ چھپا لیتی ورنہ موقع ہوتا تو دوشالہ یا چادر اوڑھ لیتی کہ ہنسی آئے تو ہنسی دکھائی نہ دے ۔ شرارت یہ کرتی کہ بڑی مشکل سے اٹھائے اٹھتی ۔ ایسے ایسے مکر کرتی کہ بعض اوقات غصہ آجاتا اور میں جب چادر گھسیٹتے گھسیٹتے تنگ آجاتی

اور وہ منہ نہ کھولتی تو میں بلکہ یہ کہتی مکّارہ میں خوب جانتی ہوں تو جاگ رہی ہے۔ لے اب میں جاتی ہوں" یہ کہہ کر جیسے ہی میں کمرہ سے باہر جاتی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ میری اُس نے یہ عادت بنائی تھی۔ کمرہ میں میں نے پھر جھانکا بازو کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ کمرہ میں خوشگوار ہوا آرہی تھی اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسے خوشگوار موسم میں کوئی دوشالہ اوڑھ کر سوئے۔ میں نے دل میں کہا "وہ تو جا میں تجھے ابھی ٹھیک کرتی ہوں" یہ کہہ کر اب میں کمرہ میں داخل ہوئی۔ میز کے پاس پہنچی تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے خط لکھنے والی ہی تھی۔ میں نے ہنسکر کہا میں خوب جانتی ہوں شریر اُٹھنا ہو تو اُٹھ ورنہ آج تیری بُری طرح خبر لونگی" مگر جناب وہ پرلے درجہ کی شریر۔ جانتی تھی کہ اتوار کا دن ہے جم کا خط آیا ہوگا۔ تنانے آوُنگی اور کر کے پڑی ہے۔ میں پاس پہنچی۔ وہ گُڑی مُڑی بنی پڑی تھی۔ میں نے اندازہ لگا کر ٹٹول کر معلوم کر لیا کہ اس شریر کی ناک کدھر ہے۔ پھر نہایت ہی ہوشیاری مگر چالاکی سے میں نے زور سے اُس شریر کی ناک پکڑ لی۔ تھوڑی دیر تک تو اُس نے ضبط کیا پھر کلبلائی اور کلبلا کر کچھ ایک دم سے تڑپی کہ میں نے اُس کو دابا کہ ایکدم.... خدا کی پناہ۔ زور کے ساتھ میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ ایک مردانہ آواز کے ساتھ چادر وہ گری "یہ کون" کہہ کر ایک نوجوان شخص نے تڑپ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا میرے ہوش اُڑ گئے۔ یا اللہ شاہجی کے بجائے یہ کون !!

ایکدم سے ایک ہاتھ سے میں نے منہ چھپا کر دوسرے ہاتھ کو جھٹکے سے چھڑانا چاہا۔ مگر وہ تو آہنی گرفت میں تھا۔ اُس نوجوان نے ایک قہقہہ لگایا کہ شاہجی ایکدم کمرہ میں داخل ہوئی +

"جمّو پیاری" کہہ کر اُس نے ایک ہنسی کی چیخ ماری اور مجھ سے آکر لپٹ گئی

"بھئی چھوڑ دو۔ ہماری جمّو کو چھوڑ دو۔ یہ کیا۔ . . . . "

"واہ! خوب آپکی پیاری جمّوں ہیں۔ رات بھر کا میں جاگا ہوا اور میری ناک آکر مروڑ دی۔ سوتے میں +

مارے ہنسی کے شاہجی کا بُرا حال ہوگیا اور وہ سمجھ گئی کہ مجھے اس کا دھوکا ہوا ہوگا۔ یہ کہکر وہ میرا ہاتھ چھڑانے لگی تو انہوں نے کہا "جی نہیں میں نہیں چھوڑوں گا تاوقتیکہ تم یہ نہ بتاؤ کہ یہ ہیں کون بلا جو میرے اوپر اس طرح صبح صبح نازل ہوئیں +

میرا اُس وقت کیا حال تھا؟ میں بیان نہیں کرسکتی۔ حالانکہ میں کانا پردہ گی پابند تھی لیکن ملازموں خدمتگاروں اپنی سہیلیوں کے بھائیوں یا شوہروں کے میں دنیا سے پردہ کرتی تھی اور خصوصاً جان پہچان والوں سے بمشکل شاہجی نے میرا ہاتھ چھڑایا اور پھر میرا تعارف کرایا +

"نجمی بھائی۔ ولایت سے ہفتہ بھر ہوا آئے ہیں۔ جم کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرے قریبی عزیز ہیں۔ بھائی ہیں۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے"

اچھا! یہ ہمارے جم والی جمّوں ہیں۔ نجمی نے مسکراتے ہوئے مجھ سے معافی کرتے ہوئے کہا۔ مجھ سے تو یہ ویسے بھی پردہ نہیں کرسکتیں۔ ہاتھ ہٹاؤ صورت دیکھنے دو جی" یہ کہہ کر میرا ہاتھ میرے منہ پر سے ہٹایا اور کہا "شاہجی تمہاری سہیلی ہیں اور پھر جم کی . . . . جم کی جمّوں (قہقہہ لگا کر) اور پھر میری انہوں نے آکر صبح صبح ناک مروڑ دی" پردہ وردہ کیسا . . . بس ایسے بیٹھو۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔ مگر میں جھینپ رہی تھی۔ شاہجی بولی "اچھا ہوا۔ روز آکر مجھے سوتے میں دق کرتی تھیں آج پھنس گئیں" +

نجمی شرارتاً بولے "تو کیا انہوں نے میری ناک تمہارے دھوکہ میں مروڑی تھی؟"

شاہجی نے کہا "ہاں اور کیا"

"توبہ کرو" نجمی نے شرارتاً کہا "یہ تو خود ہنسی کا گول گپا ہو رہی ہیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر میری ناک مروڑی ہے . . . اور پھر . . . پھر میں چھڑاؤں تو چھوڑیں نہیں بلکہ مجھے دبا بیٹھیں" +

"خدا کے لئے اب اس ذکر کو چھوڑیئے۔ مجھے زیادہ حیران نہ کیجئے" میں نے شرمندگی کی انتہائی تکلیف سے کہا "خدا را اس ذکر کو چھوڑیئے"

"میں کیوں چھوڑوں" نجمی نے کہا "میں کیوں اس ذکر کو جانے دوں۔ میں تو ایک ایک سے کہونگا کہ ایک چمکتی دمکتی لڑکی آئی اور اُس نے میری ناک مروڑ دی" +

"نجمی بھائی" شاہجی نے بات کاٹ کر کہا "نجمی بھائی اب اس ذکر کو چولھے میں ڈالئے اور کچھ جم کا ذکر کیجئے۔ وہ . . . . . . وہ کل رات کو آپنے کہا تھا جم کی تصویر دکھائیں۔ آپ کے پاس ہے نا؟"

شوخی سے شاہجی نے میری طرف آنکھیں جھکا کر دیکھا۔ نجمی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں شرمندہ تھی۔ میں نے کنکھیوں سے نجمی کے خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھا۔ میرے دل میں خیال گذرا نجمی مردانہ حسن کی بہترین تصویر ہیں اور جم؟ جم تو بیحد خوبصورت نوجوان ہیں۔ نجمی سے کہیں زیادہ خوبصورت میں نے دیکھا نہیں۔ مگر سنا ہے۔ اب میں اصل تصویر کو دیکھنا چاہتی تھی۔

جم کی تصویر کو۔ کسقدر میں اس تصویر کو دیکھنے کے لئے بیقرار تھی +

نجمی نے آہستہ سے کہا "پیارے جم والی جنوں۔ میری ناک مروڑنے والی تمہارے جم کی تصویر دکھاؤں نا۔ ۔ ۔ ۔ دکھاؤں تو کیا دوگی بولو۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں نجمی بھائی آپ۔ ۔ ۔ ۔"

"خبردار جو تم نے اب کی نجمی بھائی کہا۔ بھائی بنا کر خواہ مخواہ اپنی جان چھڑاتی ہو۔ ہاں تو بتاؤ کہ جم کی تصویر دکھاؤں تو کیا دوگی۔ ۔ ۔ ۔"

میری طرف نجمی نے مسکرا کر عجیب انداز سے دیکھا۔ ان کے بھورے بال بائیں آنکھ کی طرف حلقہ کئے ہوئے تھے۔ جم کے بھی ایسے ہی بال ہیں بلکہ اس سے کہیں اچھے۔ میں نے تحقیق سُنا تھا۔ عرصہ ہوا جم کے بالوں کا ذکر سُنا تھا۔ مگر مجھے بات یاد آگئی۔ میں نے نجمی کے خوبصورت اور روشن چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "آپ کے پاس جم کی تصویر کہاں سے آئی۔ آپ مذاق کر رہے ہیں"

"دو بجو! جم کی تصویر تمہیں ابھی دکھاؤنگا" سر ہلاتے ہوئے نجمی نے کہا۔ "تمہیں ابتک نہیں معلوم کہ جم سے میرے کیسے تعلقات ہیں۔ کیا تمہیں یقین نہیں"+

میرے چہرے کو نجمی نے بغور دیکھا۔ میرا چہرہ کہہ رہا تھا کہ ممکن نہیں کہ تعلقات ہوں۔ مگر نہ ایسے۔ یعنی بے حد تعلقات۔ نہیں تو وہ مجھے نہ لکھتے +

ایک دم سے نجمی کھڑے ہو گئے۔ میں نے اس خوبصورت شخص کو سرو قد دیکھا۔ مرقع حسن کی تصویر تھا۔ معاً جم کی خیالی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ نجمی نے جھٹ سے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے کونہ تھام کر میرے سامنے کر دیا۔ "اس خط کو پہچانتی ہو؟"۔ میں گھبرا گئی۔ چہرہ پر ایک رنگ آیا اور گیا۔ ہاتھ خود بخود اس طرف بڑھ گیا۔ نجمی نے مسکرا کر ہاتھ کھینچ لیا "واہ جناب" یہ کہہ کر وہ لفافہ میں سے خط نکالنے لگے +

میری حالت ناقابل بیان تھی۔ یہ میرا خط تھا جو میں نے جم کو لکھا تھا۔ اور مجھے یاد تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیسے اُنہوں نے یہ نجمی کو دیدیا +

"رہنے دیجئے" یہ کہہ کر میں کھڑی ہو کر خط لینے بڑھی۔ میں پریشان تھی +

"سبحان اللہ" نجمی نے ہنستے ہوئے شاہجی کو مخاطب کر کے میری طرف اشارہ کر کے کہا "ذرا انہیں دیکھیئگا۔ آپ مجھ سے خط لئے لیتی ہیں۔ ہیں آپ کون؟"

خط اُس نے نکال لیا تھا اور میری پریشانی ناقابل بیان تھی۔ میری زبان میں لکنت آگئی اور بولا نہ گیا کہ نجمی نے ہنسکر پڑھا "بھئی پیارے جم"۔ میں روہانسی ہو کر چیخ پڑی۔ اور میں نے اپنا منہ دامن میں چھپا لیا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ لو۔ یہ لو" یہ کہہ کر نجمی نے خط چاک چاک کر دیا۔ "تم تو روتی ہو۔ رونے لگیں۔ مجھ سے کیا شکایت۔ اپنے جم سے شکایت کرو +

"ہرگز اُنہوں نے یہ خط آپ کو نہیں دیا ہوگا" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا +

"ہرگز آپ نے میری ناک دھوکہ میں نہیں توڑی ہوگی"+

کس برجستگی اور موقعے سے نجمی نے یہ کہا کہ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی "دیکھئے جم والی جنوں راضی ہو گئیں۔ راضی ہو گئیں" نجمی نے مسکراتے ہوئے کہا "اب یقین آگیا کہ جم سے میرے کیا تعلقات ہیں اور میرے پاس اُن کی تصویر ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر یقین نہ آیا ہو تو اور ایک آدھ ثبوت دوں۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ تم رونے لگو گی +

"مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس تصویر ہے" میں نے مسکراتے ہوئے اُس شریر مگر خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا +

"کس کی؟ کس کی تصویر"

"جم کی"۔ میں نے جھینپتے ہوئے کہا "اور کس کی"

"مگر کیا دوگی؟"

"جو تم کہو دونگی"

"شاہجی۔ سنتی ہو شاہجی۔ تم ضمانت کرتی ہو کہ میں جو مانگوں وہ یہ دیں گی"+

شاہجی نے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں بھی مسکرا رہی تھی ("بخدا!" اُس نے کہا۔ میں نے کہا "دونگی")

ایک بڑی سی تصویر نجمی نے نکالی اور خود ہی اس کو دیکھ کر ایک بو

دیا۔ میں کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔

"شاہجی تم ادھر آؤ۔ ادھر آؤ" یہ کہہ کر شاہجی کا ہاتھ پکڑ کر نجمی نے گھسیٹا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر تصویر کو پاس سے دکھاتے ہوئے پوچھا "بولو کیسا حسین و رعنا جوان ہے" مسکرا کر نجمی نے شاہجی سے کہا شاہجی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو کر مسہری پر جا پڑی۔ میں کھسیانی ہو رہی تھی۔

"آخر یہ کونسا مذاق ہے" میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"مذاق تو بس دنیا میں ایک ہے" نجمی نے برجستہ کہا "بس مذاق تو ایک ہے اور وہ ہمارے جم کی جموں جانتی ہیں۔ کہ دیکھا جو کوئی اچھی صورت شکل کا آدمی اور اُس کی ناک دھر مروڑی۔۔۔۔۔۔ دھوکہ۔۔۔ دھوکہ ہیں۔۔۔۔"

شاہجی ویسے ہی ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اور بھی اُس کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہوگیا۔ اور مجھے بھی خواہ مخواہ ہنسی آئی۔

"دیکھو جی۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔" یہ کہہ کر نجمی نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ ادھر آؤ۔۔ تو کیا تصویر دیکھنا نہیں۔۔ آؤ۔۔۔ یہ کہہ کر اُس نے میز کے پاس لا کھڑا کیا۔ تصویر اُلٹی رکھدی۔ جگ ہاتھ میں لے کر کہا "منہ دھو ڈالو"۔

میں سمجھی کہ شاید یونہی میرے چہرہ کی حیرانی دیکھ کر کہا ہے۔ میں مسکرانے لگی۔ پھر نجمی نے اپنی خوبصورت اور مخمور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "دھو ڈالو" میں مسکرا رہی تھی اور میں نے دو چلو پانی سے اپنا چہرہ ٹھنڈا کر لیا۔ واقعی بڑی فرحت حاصل ہوئی۔

"لاؤ میں پونچھ دوں" یہ کہہ کر نجمی نے تولیہ لے کر ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مسکراتے ہوئے تولیہ لے لیا اور ہاتھ پونچھتی ہوئی کرسی پر آ بیٹھی۔

"اب آپ نے منہ دھو لیا لہٰذا اب آپ جم کی تصویر دیکھ سکتی ہیں" شاہجی میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میرا کلیجہ جم کی تصویر دیکھنے کے شوق میں دھک دھک ہو رہا تھا۔ نجمی نے ہاتھ کی تصویر چھپا کر پہلے صرف تصویر کے پیر دکھائے اور کہا "پہلے قدمبوسی تو کر لو"۔ میں نے تصویر ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے نجمی کا ہاتھ ہنستے ہوئے ہٹانے کی کوشش کی۔ اور تھوڑی بہت دقت کے بعد نہ معلوم کس شوق سے ہاتھ ہٹا کر تصویر کو دیکھا۔ میری جان ہی تو جل گئی۔ یہ تصویر خود نجمی کی تھی۔ میں نے جل کر تصویر بھنّا کر کونے میں پھینکی۔ جل کر میں نے کہا "آپ کو سوائے اُلٹے سیدھے مذاق کے اور کچھ بھی آتا ہے"۔

اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر نجمی نے دو قدم آگے بڑھ کر مجھ سے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا "اور آپ کو۔۔۔" بڑی جم کی چہیتی آئیں۔ لے کے تصویر پھینک دی"۔

یہ کہہ کر تصویر اُٹھائی اور میرے سامنے تصویر جھٹک کر کہا "دیکھا ہے؟ کبھی دیکھا ہے۔ اتنا خوبصورت شخص کبھی خواب میں بھی دیکھا ہے۔ ہونہہ۔ تصویر اُٹھائی اور پھینک دی۔ جم۔ جم۔ بڑی جم والی آئیں۔ جم کی صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل"۔

"مسٹر نجمی بس" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا "مسٹر نجمی بس۔ میں آپ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ اور نہ میں اس قسم کی باتیں سننا چاہتی ہوں میں اس قسم کے برتاؤ کی عادی نہیں"۔

"محترمہ" نجمی نے سنجیدگی سے کہا "آپ اس قسم کے برتاؤ کی عادی نہیں تو بندہ بھی "اُس قسم" کے برتاؤ کا عادی نہیں" لفظ "اُس" پر نجمی نے اپنی ناک مروڑ کر بتایا۔

پھر مجھے ہنسی آگئی۔ تو نجمی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا بات سنو اور ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سوٹ کیس کے پاس لا کھڑا کیا۔ اور کہا اب مذاق کو تو میں الگ رکھتا ہوں۔ جم نے تمہیں ایک خط دیا ہے وہ لے لو۔

یہ کہہ کر مجھے ایک خط دیا۔ جم کا خط میں پہچانتی ہوں۔ میں نے پتہ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میں نے خط کھول کر پڑھا جو حسب ذیل تھا:۔

"میرے دل کی جموں۔ یہ میرے دوست نجمی ہیں۔ اگر مجھ سے محبت ہے تو ان سے پہلے کرنا جم کے لئے۔ اور جم کی محبت کے لئے نجمی لازمی ہے۔ نجمی اور جم بس ایک ہیں۔ یک جان دو قالب نہیں بلکہ یک جان و یک قالب۔

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

تو جم کی جموں ذرا اس آبگینہ کا خیال رکھنا۔ میرا پہلا خط بھی تمہیں ساتھ سا تھ ملیگا۔ اُس میں میں نے متعلق اسکا ذکر نہیں کیا جب ملیں گے تب۔۔۔"

تمہارا جم

میں نے پڑھ کر نجمی کی طرف دیکھا۔ وہ بولے "دیکھتی کیا ہو" میری اور جم کی ناک میں کوئی فرق نہیں"۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور نجمی نے سفید رومال جیب سے نکال کر میرے منہ کے سامنے کیا "چومو اس کو۔ لگاؤ اسے آنکھ سے۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ لگاؤ آنکھ سے"۔ "نہیں کیسے لگاؤں گی" یہ کہہ کر زبردستی میری آنکھ سے لگانے بڑھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُسے آنکھ سے لگایا اور کہا "یہ لیجئے۔ اس سے کیا مطلب"۔

"اس سے کیا مطلب؟ ارے یہ جم کا ہے۔ لیلو نا تم اسے"۔ یہ کہہ کر میرے منہ پر ماردیا اور کہا "بخدا یہ جم کا ہے۔ تم سونگھو اسے"۔

میرا دل یہ سُن کر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے رومال کو اپنے چہرہ پر سے ہٹا کر مٹھی میں لیا اور کہا "اگر یہ جم کا ہے تو مجھے اپنی جان سے زیادہ پیارا ہے"۔

"واللہ یہ جم کا ہے اُنھوں نے کہا تھا کہ تم محض سونگھ کر بتادوگی اس لئے کہ اس میں سے بوئے محبت تمہیں ضرور آئے گی"۔ اب میں غسل کرلوں"۔

یہ کہہ کر نجمی چلے گئے غسل خانہ میں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہ کوئی نہیں رومال کو سونگھا۔ اس کو بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔ رہ رہ کے میں نے اس رومال کو چوما۔ واقعی یہ جم کا تھا۔ اس میں سے جم کی حسین حسین محبت آمیز خوشبو آرہی تھی۔ اتنے میں شاہجی آگئی اور نجمی کی باتیں ہوتی رہیں۔ شاہجی نے کہا "بہن خدا کے واسطے ان کی کسی بات کا بُرا نہ ماننا۔ یہ ایسے ہی شخص ہیں۔ ذرا لڑکیوں کو بہت چھیڑتے ہیں۔ اور تم کو بھی بہت چھیڑیں گے۔ جم کے بڑے گہرے دوست ہیں"۔

اس کے بعد میں نے جم کا خط دکھایا اور تھوڑی دیر بعد جم کا خط اور رومال چومتی ہوئی گھر واپس آئی۔ جم کی تصویر غالباً اُن کے پاس نہ تھی۔

(۲)

تیسرے پہر کو میں ویسے بھی شاہ جی کے یہاں روزانہ جاتی تھی۔ ورنہ وہ میرے یہاں آتی تھی۔ آج اُس نے فرض کرکے مجھے بلا بھیجا۔ نجمی کے مسخرے پن سے دراصل میرا بھی جی بہت خوش ہوا تھا۔ اور پھر مزید برآں وہ جم کے دوست تھے۔

میں جب پہنچی تو نجمی اور شاہجی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس شخص نے چائے کی پیالی معہ چائے کے گھسیٹ کر زور سے میری طرف پھینکی۔ میں چیخ پڑی۔ بال بال بچی۔ چائے فرش پر گری چائے کی پیالی دیوار سے لگ کر کھیل کھیل ہوگئی۔

"آخر یہ کونسا مذاق ہے؟" میں نے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا۔ "اور جو میرے لگ جاتی"۔

ادھر شاہجی کا بُرا حال تھا۔ مارے ہنسی کے اُسکو اُچھو لگ گیا۔ اور وہ لال بھبوکا ہوگئی۔ برابر والے کمرہ سے بہن زاہدہ جھانک رہی تھیں۔ پردہ سے جھانک رہی تھیں۔ اُن کی دو آنکھیں اور سر کا اوپر کا حصہ شیشہ میں سے دکھائی دے رہا تھا۔

میری بات کا تو نجمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اُس طرف انگلی اُٹھا کر پوچھا "یہ کون ہیں؟" جھٹ سے زاہدہ غائب ہوگئی۔ میں پہنچی اور زاہدہ سے سلام علیک کی۔ وہ ابھی ابھی آئی تھی اور اُس نے مجھ سے پوچھا "یہ کون مسخرا ہے؟" اتنے میں شاہجی بھی آگئی۔ اور اُس نے کہا "چلو بہن تمہیں ان سے ملائیں"۔

زاہدہ نے ہاتھ ملا کر کہا "نہ بہن میں ان سے نہیں ملتی۔ میں ہر کس و ناکس کے سامنے نہیں آتی"۔

"تمہیں ہماری قسم۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ دنیا بھر کے سامنے تو آؤ اور۔۔۔۔"

"نہ۔ نہ۔ میں نہیں آؤں گی کوئی بات بھی ہے"۔

اتنے میں نجمی نے پکارا۔ "جم کی جتوں جم کی جتوں" بڑے زور زور سے۔

میں دوڑی گئی اور دوڑی آئی اور کہا "خدا کے واسطے زور سے مت پکاریئے۔ کوئی کیا کہیگا"۔

"تو ہنڈ منٹس نہیں کھیلوگی۔۔۔۔ کہاں گئی شاہجی۔۔۔ لاؤ اُسے۔۔۔۔ چپکے سے۔ بلا کر مجھ سے زاہدہ کے بارہ میں کہا "یہ کون ہیں۔ لاؤ انہیں پھسلا کے جو اچھی صورت شکل کی ہوں۔ تو پھسلا لاؤ"۔

مجھے بڑی ہنسی آئی اور میں نے کہا "میں کیوں کسی کو پھسلا لاؤں۔۔۔۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"۔

"بالکل تمہارے جم کی سی کرتا ہوں۔۔۔ جم کی سی"۔

"خدا نہ کرے۔ میرا جم ایسی باتیں کرے"۔

بس دعا مانگو۔ دعا مانگو۔ اللہ کرے جھوٹ ہو۔ ... چلو اب چلو"

جھٹ سے میں جھک گئی۔ ورنہ میری گردن پکڑی ہوتی۔ میں نے کہا یہ آپ کیا کرتے ہیں" +

جلدی سے میں نجمی کے ساتھ بیڈمنٹن کورٹ پر آئی۔ ہم دونوں نے کھیلنا شروع کیا۔ ہر گیند پر نجمی کہتے تھے تمہیں جم کی قسم جو واپس کی نہ میرے بُرا ماننے سے بُرا مانتے تھے۔ اور نہ خفا ہونے سے اور نہ ہنسنے سے۔ میں نہیں کھیلتی یہ کہکر میں بلا پھینک کر کرسی پر جا بیٹھی۔

"میں بھی نہیں کھیلتا" نجمی نے لاپرواہی سے کہا "تاوقتیکہ چار کھیلنے والے نہ ہوں" +

اتنے میں شاہجی آگئی۔ نجمی نے اول تو الٹی سیدھی میری شکایت کی۔ اور کہا بغیر چار آدمی کے کھیل بیکار ہے +

شاہجی نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا "چوتھا شخص ہے تو مگر تم سے پردہ ہے" +

مجھے بھی خیال آیا کہ زاہدہ بہت اچھا کھیلتی ہے۔ میں نے بھی کہا "ہاں زاہدہ اچھا کھیلتی ہے مگر ..."

"کھاؤ قسم" نجمی نے مجھ سے کہا "کھاؤ قسم اچھا کھیلتی ہے۔ کھاؤ جم کی قسم ... ہاں اور یہ بتاؤ کہ اس کی صورت شکل کیسی ہے"

زاہدہ سے مخاطب ہوکر کہا +

شاہجی ہنسکر بولی "بڑی اچھی صورت شکل ہے" +

"کہاں ہے" نجمی نے پوچھا +

"برابر والے کمرے میں" یہ کہکر شاہجی نے چپکے سے انگلی سے بتایا "اس کمرہ میں بیٹھی کھیل دیکھ رہی ہے" +

نجمی نے فوراً باغ کی دوسری طرف رُخ کیا تاکہ زاہدہ کو شبہ بھی نہ ہو۔ ہم دونوں تماشا دیکھنے لگیں +

"کیا واقعی وہ کمرے میں گھس جائیں گے" میں نے شاہجی سے پوچھا +

شاہجی نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھ ہی جو رہی ہو نا" +

پیچھے سے نجمی اور سامنے والے دروازہ سے ہم دونوں پہنچیں۔ زاہدہ نے ہم دونوں کو تنہا دیکھ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا "اور وہ مسخرا کہاں گیا؟"

بس کچھ نہ پوچھو کیا لطف آیا ہے جب نجمی نے پیچھے کے دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے کہا "بندہ یہ حاضر ہے۔ ارشاد" +

زاہدہ ایک دم سے + (باقی)

مرزا عظیم بیگ

عشق کی گولیاں

از جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) وکیل چیف کورٹ ماروارڈ

حکماء کا قول ہے کہ عشق بھی ایک مرض ہے۔ جہاں حکمائے دوائیں امراض کو کھونے کی پیدا کی ہیں۔ وہاں اس کو پیدا کرنے کی بھی ادویات ہیں۔ اور یہ نظریہ موجودہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے۔۔۔۔۔" اتنا سنکر بھائی ناصر کچھ ابرو سمیٹ کر بولے کہ "بھئی یہ اصول تو موجودہ طب بھی مانتی ہے۔ انجکشن کے ذریعہ سے امراض پیدا کئے جا سکتے ہیں"۔

میں نے کہا تو "پہلے پوری بات تو سن لو۔۔۔ ہاں۔۔۔ تو یہ نظریہ موجودہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی اصول پر یہ گولیاں بنائی گئی ہیں۔ ان میں صفت یہ ہے کہ جو کوئی شخص ان گولیوں کو باضابطہ کھائے اُس کو مرض عشق لازمی طور پر لاحق ہو جائے گا۔ کسی نہ کسی کے ساتھ۔ کس کے ساتھ؟ لازمی طور پر اُس کے ساتھ جو اُس کے ملنے جلنے والوں میں سے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ لہٰذا قطعی ممکن ہے کہ آپ کسی کو یہ گولیاں خفیہ طور پر کھلواتے رہیں اور خود اُس کی طرف ذرا اپنی توجہ کریں۔ لامحالہ کھانے والا آپ کے عشق میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہفتہ بھر کی خوراک کافی ہے۔ قیمت مبلغ پانچسو روپے۔ اور وہ بھی حسب دلخواہ نتیجہ نکلنے کے بعد ورنہ کوڑی نہیں"۔

ناصر کچھ ٹیڑھے ہو کر بولے "لاحول ولا قوۃ۔ کہاں کی غپیں سناتے ہو۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ اس سے زیادہ عمدہ شرائط اور قیمت ملنا ناممکن۔ اب کیا کوئی۔ آپ کے آگے سر کاٹ کر رکھدے؟"

"میں ایک ہزار دونگا بجائے پانچسو روپیہ کے اگر یہ دعویٰ صحیح نکلے"۔

ابھی ناصر کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کسی مریض کی قسمت نے جو دھکا کھایا تو ایک آدمی اس طرح آ کر مخل در معقولات ہوا کہ "ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب جلدی۔۔ جلدی چلئے اس زور سے میرے بھائی کے درد گردہ اٹھا ہے کہ بس مرا جا رہا ہے"۔

اس کے بعد ہم لوگ ناصر کو اُن کے گاہک کے ساتھ باتیں کرتا چھوڑ کر چلے آنے پر مجبور ہوئے۔

لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ یہ مثل آپ نے سنی ہوگی۔ سچ کی دوا سچ اور جھوٹ کی جھوٹ اور غپ کا علاج غپ! کیا وجہ جو بھائی ناصر کو ایک اچھا سبق نہ دیا جائے۔

سسٹر سیسل ایک نوعمر اور حسین نرس تھی۔ آفت کا پرکالہ۔ بڑی چالاک ہوشیار اور نہایت خوبصورت اور خوب سیرت۔ غرض بڑی شاندار لڑکی چمکیلی اور دلچسپ کہ جنوں ڈاکٹروں کو اُلو بنا چکی۔ اس کو ناصر تختۂ مشق بنانا چاہتے تھے۔ ویسے وہ پچھے پرکالہ ہے کہ ہاتھ رکھنے دیتی۔ اب یہ ترکیب ناصر کو سوجھی کہ آخر کیوں نہ اس طرّار کو اپنا مفتوں بنا لیا جائے۔ ٹھیک ہے۔ یورلپس کئی مرتبہ ناصر سے مانگ چکی تھی۔ لہٰذا ناصر نے یہی عشق کی گولیاں میری معرفت فریکر سیسل کو یورلپس (اصلاح جگر کی گولیاں) کہہ کر دیں۔ "ایک صبح کھانا اور ایک شام" ناصر نے کہا "اور روزانہ حال کہنا"۔

نرس نے گولیاں شکریہ کے ساتھ لے لیں اور ادھر ناصر نے سیسل پر یہ مہربانی شروع کی تاکہ راہ و رسم اُس سے زیادہ بڑھے اور زیادہ دیر تک ساتھ رہے۔ یہ انتظام کیا کہ جس مریضہ کو بھی دیکھنے جاتے سیسل کی خدمات کی وہاں ضرورت ظاہر کر کے اُس کو بلواتے اور حتی الامکان اپنی فیس کے ساتھ اُس کو بھی فیس دلواتے۔ اب آپ خود ہی غور فرمائیے کہ عشق کی گولیاں کیونکر سیسل پر اثر کرتیں ناصر کو نہ معلوم ہوتیں۔ وہ ناصر سے

اپنے کرشموں اور اداؤں کے ساتھ مجسم شکریہ ہوکر ملتی۔ ناصر اُس کیس کو کم فیس پر بھی لے لیتے جس میں سیسل کی خدمات کی بھی ضرورت ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ ہفتہ بھر کے اندر ہی اندر ایک ہفتہ کا اَوَرکورس عشق کی گولیوں کا ناصر نے لیا اور قائل تھے کہ بے حد اثر کر رہی ہیں +

میں روزانہ سیسل کے عشق کی رپورٹ سنتا۔ کس طرح آنکھیں چمکا کر اور مسکرا کر آج اُس نے ناصر سے ہاتھ ملایا۔ کس طرح اُس کے تحسن اور نازک لبوں پر تبسم رقص کر رہا تھا۔ کس طرح وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ناصر کو دل میں لئے لیتی تھی۔ کس طرح وہ زبردستی ناصر کے پاس گھسی آتی تھی۔ دسویں روز میں نے مجبوراً ناصر کو صلاح دی کہ "ارے میاں اب کیا رہ گیا ہے اب وہ تمہاری ہے۔ تم آج ہی تنہائی میں اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دو" +

ناصر نے مجھ سے کمرہ کو بند کرتے ہوئے تیزی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "یار وہ تو۔۔۔۔ وہ تو ایکدم سے ششدر رہ کر رہ گئی۔ اُسکا چہرہ سفید ہوگیا۔ زبان بند ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور ایکدم سے بغیر بات چیت کئے ہوئے وہ ایسی رفو چکّر ہوئی کہ نہ تو کل آئی اور نہ آج۔ گویا اُس نے اپنا سب کام بھی چھوڑ دیا۔ اور اب یہ خط آیا ہے"

میں نے خط کھول کر پڑھا۔ بہت مختصر تھا لکھا تھا:-

"مسٹر ناصر شاید آپ سے نہایت ہی عجلت میں اور نہ معلوم کن خیالات کے ماتحت یہ غلطی ہوئی ہے۔ میری اور آپ کی مشترکہ پریکٹس آج سے ختم ہے۔ فقط"

میں نے خط کی ظاہری خوبیوں کو چھوڑ کر اب اس کا اصلی مطلب پیش کیا "کہیں خدا کے واسطے یہ نہ لکھ دینا کہ غلطی ہوئی ہے۔ ورنہ اُس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ہرگز غلطی نہیں ہوئی بلکہ دیدہ و دانستہ تم نے ایسا کیا ہے۔ سوچ سمجھکر اور نیک نیتی سے اور مشترکہ پریکٹس ہمیشہ ہمیشہ تا زندگی رہے گی +

ناصر کو کچھ کمزور پایا تو میں نے کہا "یار لکھو تو۔ تم لکھو تو۔ نہیں تو میں لکھے دیتا ہوں۔ بھائی یہ گولیاں ہی ایسی ہیں۔ تم لکھو اور اگر جواب با تشفی نہ آئے تو میں سو روپے جرمانہ دونگا" +

غرض ناصر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھ دیا

رات کے آٹھ بجے احسان اپنا موٹر لے کر میرے گھر پر آ گئے۔ چار پانچ یار دوست بھی تھے۔ جو اُس روز والی دعوت میں شریک تھے۔ جلدی جلدی میں نے کپڑے پہنے اور ہم سب روانہ ہو گئے۔ بہت جلد شہر سے باہر نکلے۔ کوئی بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ کے بعد موٹر ایک طرف کچی سڑک پر موڑ دیا گیا۔ اور بہت جلد شاہی مسجد کے کھنڈر پر پہنچکر ہم اُتر پڑے۔ قریب ہی کیا دیکھتے ہیں کہ ناصر کا موٹر کھڑا ہے۔ مسجد کے صحن میں داخل ہوئے اور سرچ لائٹ گھمائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں ناصر! ہیں! یہ کیا آپ یقین مانئے کہ میاں ناصر ایک لنگوٹ باندھے مسجد کے صحن میں چاروں شانے چت چونٹیاں گسے ہوئے پڑے ہیں۔ سارا منہ لال اور سیاہ ٹیپوں سے رنگا ہوا ہے۔ اور ان کے سینہ پر لکھا ہوا ہے "عشق کی گولیاں"

"ارے میاں یہ کیا مصیبت ہے؟" ہم سب نے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جوں توں کر کے ناصر کو کھولا۔ پاس ہی ایک دفتی پڑی تھی۔ قبل اس کے کہ ناصر کچھ اپنا حال بیان کریں جنہیں انہیں سخت تامل تھا۔ وہ دفتی پڑھی۔ اس پر لکھا تھا:-

"میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہایت ہی نیچ آدمی ہوں۔ ڈاکٹر اسٹرکینی نے ہرگز ہرگز کوئی ایسا عرق ایجاد نہیں کیا ہے کہ جس کی ایک بوند پلا دینے سے آدمی کی صورت بدل جائے میں نے محض جھوٹ بولا اور جھک مارا تھا۔ اور نہ ڈاکٹر مار گونیتہ نے گولیاں ایجاد کی ہیں۔ میں نے ان دونوں ڈاکٹروں کے نام بھی نہیں سنے میں اب توبہ کرتا ہوں کہ آیندہ خواہ مخواہ اپنے دوستوں میں بیٹھکر بے سر و پا ایسی گپیں نہیں تراشوں گا۔ جس سے دوستوں کی توہین ہو گویا کہ وہ بالکل گدھے ہیں فقط ناصر بقلم خود" +

بڑی مشکل سے ناصر نے مجبور ہو کر حال سنایا۔ واقعہ یوں ہوا کہ سیسل کو خط جو میں نے لکھوایا تھا اُس کا جواب آیا۔ بیحد محبت آمیز۔ اور اُس میں لکھا تھا کہ بعد مغرب مجھے اس جگہ ملو۔ میں یہاں پہنچا تو چار ڈھاٹے بند میرے اوپر ٹوٹ پڑے اور میری یہ گت بنا ڈالی۔ اور مجھ سے یہ تحریر زبردستی لکھوائی۔

ناصر صاحب واپس گھر آ گئے۔ ہم لوگوں سے وہ ابتک کھچے کھچے رہتے ہیں۔ اُن کا شبہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے خصوصاً میں نے جھوٹ موٹ نرس سیسل کی طرف سے یہ خط ٹائپ شدہ اور بغیر دستخطوں کے لکھدیا کہ فلاں

دیوانہ بنا رہی ہے ✦

"اچھا تو صبح تک انتظار کرو۔ میں صبح تک اپنا کام ختم کرونگی" ✦

"اگر تم انتظار کرو! تو؟"

"میں تو بتا چکی ہوں کہ میں انتظار نہیں کر سکتی" ✦

"لیکن میں بھی تو انتظار نہیں کر سکتا"

"تو پھر کسی دوسرے کمرے میں کام کرنے کی تکلیف گوارا کر لو"

"میرے پاس بھی صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اس کا دروازہ بالکل تمہارے کمرے کی طرح برآمدے کی طرف کھلتا ہے۔ اگر میں کھلی ہوا میں بیٹھوں۔ تو میرا زندہ رہنا محال ہے۔ میری طبیعت —— میں بہت علیل ہوں"

"بدنصیب! مجھے سخت افسوس ہے"

"آہ! تمہیں افسوس تو ہے لیکن محض افسوس —— اور جو کام کی بات ہے وہ غائب —— آخر مشین روک دو گھنٹے بھر کے لئے ہی سہی تو ——"

"میں معافی کی خواستگار ہوں۔ اگر تم صرف جانتے کہ ——"

"کیا جانتا"

"کہ اسی ایک گھنٹہ میں جو کچھ میں سی رہی ہوں ختم ہو جانا چاہئے —— ورنہ ——"

"ہاں! ورنہ کیا ہوگا؟"

"بس رہنے دو۔ کچھ نہ پوچھو۔ مجھ پر رحم کھاؤ"

"تو تم پھر مشین چلانے چلی ہو؟"

"ہاں! چلانے چلی ہوں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھے معذور سمجھو"

"اوہوں! اگر تم نے پھر مشین چلائی۔ تو میرے لئے کام کرنا ناممکن ہو جائیگا اور ایک گھنٹے میں تمہاری طرح —— بالکل تمہاری طرح —— کیا تم مجھے اپنا راز نہیں بتاؤگی؟"

"برائے خدا مجھ پر رحم کرو"

"اور کیا تمہیں رحم نہ کرنا چاہئے"

"میں عورت ہوں"

"اور میں —— میں مریض ہوں"

"آہ! بدقسمت میں تمہارے مجبور کرنے پر مشین نہیں چلاتی۔ لیکن یاد رکھو بعد میں پشیمانی اٹھانی پڑیگی"

"پشیمانی؟"

"ہاں! پشیمانی اور —— ضمیر کی سرزنش ——"

"شاید تمہیں اپنا کام بیچ کر دوائی خریدنی ہے"

"بس مجھ سے کچھ نہ پوچھو"

"تمہارا کوئی بزرگ بیمار ہے یا بچہ؟"

"اس ذکر کو نہ چھیڑو"

"تمہارا بیٹا ہے یا شوہر"

"برائے خدا مجھ سے نہ پوچھو"

وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز دھک دھک کر رہا تھا۔ ایک قلیل عرصہ کے بعد اُس نے مشین کی آواز سنی۔ اُسکا سر چکرا رہا تھا لیکن آواز —— باقاعدہ متواتر —— کرخت۔ جگر دوز —— دماغ پاش۔ دلخراش —— گھر گھر۔ گھر —— جاری تھی ✦

"اُف میرے خدایا! اُف میرے اللہ" وہ بڑبڑایا۔ ایک بجلی سی اُسکے بدن میں دوڑ گئی۔ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور پھر میز کے سامنے جا بیٹھا۔ میز اخباروں —— رسالوں اور کاغذوں سے لدی ہوئی تھی۔ جن کے درمیان ایک مایوس مریض کا چراغِ سحری ٹمٹما رہا تھا۔ سامنے کچھ سادہ اور کچھ لکھے ہوئے کاغذ پڑے تھے۔ اُس نے ان پر نگاہ ڈالی۔ اور ہمت کر کے قلم اُٹھایا —— قلم کاغذ پر لرزا —— ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ لرزش مشین کی آواز سے پیدا ہو رہی ہے۔ لکھے ہوئے مسودے کے الفاظ مشین کی آواز کے مطابق اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے معلوم ہوتے تھے ✦

قلم کی لرزش اُس کے ہاتھ تک پہنچی۔ ہاتھ سے بازو میں سرایت کر گئی۔ اور بازو سے دماغ میں —— مشین کی گھر گھر —— کمرے کی خاموش فضا میں ناچتے ہوئے الفاظ میں —— اس شکستہ دل کی رگ وجاں میں —— اُس کے دماغ میں —— ایک سحر انگیز اثر پیدا کر رہی تھی۔ وہ کیا لکھ رہا تھا؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اُسے کچھ یاد نہ تھا! سادے کاغذ پر —— کانپتا ہوا قلم —— عجیب مبہم سی شکلیں بنا رہا تھا۔ یا گاہے گاہے سیاہ آنسو بہا رہا تھا —— اور وقت گزر رہا تھا ✦

وہ دروازے کی گھنٹی سے چونک پڑا۔ سورج کی پہلی کرن دریچے کی درز سے اندر آ رہی تھی۔ اور دئے کا شعلہ مدھم ہو چکا تھا۔ "وہی ہوگا" اُس نے خیال کیا۔ اور جھجکتے جھجکتے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلا اور ہوا کے ایک ٹھنڈے جھونکے نے کمرے کو سرد کر دیا۔ ایک شخص اپنی ہیٹ کانوں تک کھینچے اپنی سُرخ ناک

کو چھپائے داخل ہوا +

"کام ختم ہوگیا؟" اُس نے ناخوشگوار آواز میں پوچھا +

"نہیں! کام تو نہیں ہوسکا" نوجوان نے مایوسی سے اپنے بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے جواب دیا +

"مذاق کررہے ہو کیا؟"

"سچ کہتا ہوں ـــ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکا"

"کیا کہا؟ نہیں ہوسکا! تم مجھے بنا رہے ہو" یہ کہہ کر وہ ایک کرسی پر لاپرواہی سے بیٹھ گیا۔ اور اپنے لمبے میلے کچیلے ہاتھ کوٹ کے اندر سے باہر نکالے۔ سبزی مائل آنکھوں کی پتلیاں اُس کی سُرخ بھوؤں کے نیچے غصّے سے پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں +

"ممکن نہیں کہ نہ ہوسکا ہو" اُس نے زور سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ابتک تو اخبار بھی شایع ہوجانا چاہئے تھا۔ اور اگر آج "رقیق" کے خلاف مضمون نہ نکلا ـــ تو بس ـــ میری شامت ـــ کاش! کہ میں خود لکھ سکتا ـــ میری بدقسمتی! میری کے انتخاب کا آج فیصلہ کن دن تھا۔ میں خوب روپیہ کما سکتا ہوں اور اس کی بجائے اب؟ اسکی بجائے اب وہ میری خوب گت بنائیں گے۔ ـــ وہ مجھے بدعہد ـــ دغاباز کہیں گے۔ لیکن دراصل ـــ درحقیقت ـــ تم دغاباز ہو ـــ تم ہو تم ـــ بدعہد ـــ دغاباز ـــ"

"نہیں جانی! ذرا عقل سے کام لو۔ میں دغاباز کیونکر ہوا۔ میں اس مضمون کے لکھنے سے قاصر تھا۔ میرے ضمیر کی آواز مجھے چین نہ لینے دیتی تھی۔ "رقیق" کی بابت میری رائے ہمیشہ اچھی رہی ہے۔ اور میں اُسے اچھا آدمی خیال کرتا ہوں۔ تاہم مجھے اپنے اس فرض منصبی کے ادا کرنے کا احساس ضرور تھا۔ کہ میں اسے مفت میں بدنام کروں۔ اُس کی نیک نامی و شہرت کو بغیر جرم کے خاک میں ملاؤں۔ لیکن جب میں ان جعلی بہتانوں ـــ بیجا و سراسر بے بنیاد الزامات کی ریشہ دوانیوں میں محو تھا۔ میرے دماغ نے ساتھ کرنے سے جواب دیدیا۔ میرے حواس قایم نہ رہے۔ میرا قلم لرزنے لگا ـــ میں ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا۔ میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ اس میں میرا کیا قصور؟ ـــ"

"جاؤ ـــ جاؤ ـــ یہ چکمے کسی اور کو دو۔ تم تو ہو ہی سارے جہان کے جھوٹے ـــ بدعہد ـــ نمک حرام ـــ احسان فراموش ـــ اور ہم سب تمہیں خوب سمجھتے ہیں" +

"میں جھوٹا اور نمک حرام ہوں؟ ہاں درست! ہاں میں اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو درست کہتے ہو" یہ کہہ کر نوجوان ایک یاس انگیز انداز میں کھانسا۔ اور دوسرے نے پھر بلبلانا شروع کیا +

"اُف ـــ میرا اخبار تباہ ہوگیا۔ مجھے تم نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ ولئے بدنصیبی! اُف کسقدر شرم کی بات ہے کتنی بے عزتی ہوگی۔ جو شخص تم لوگوں کو کام دے۔ تم پر احسان کرے۔ اُس کی نوازشوں کا صلہ یوں دیا کرتے ہو۔ ـــ خوب ـــ یہ اجر؟ ـــ واقعی محسن کش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ـــ خدا کی قسم مجھے انسان نہ کہنا۔ اگر میں تمہیں کبھی ایک حبّہ کا کام بھی دوں۔ تو! کیا تم مجھ سے کسی قسم کی مروّت کی اُمید رکھ سکتے ہو؟ ہاں! آج ہی سے فاقہ مستی کا خواب دیکھو +

آہ ـــ وہ مجھے چالباز ـــ دغاباز کہیں گے۔ خدا جانے وہ اور مجھ سے کیا سلوک کریں۔ میں اپنا عہد دے چکا تھا۔ میں کیسے منہ دکھاؤں گا۔ کیا ذلت ہے کیسی مصیبت ہے ـــ خیرات ـــ ہاں بھیک ہی مانگتے پھروگے ـــ شاید ـــ تمہیں مل ہی جائے"

وہ اپنے بڑے کوٹ میں پتلی ٹانگوں سے ڈگ بھرتا ہوا ـــ ہزاروں صلواتیں سناتا ہوا۔ دروازہ کو زور سے بند کرکے چلا گیا +

"جاؤ۔ اب بھیک مانگو! بھیک! ہاں خیرات کھاؤ! خیرات!" نوجوان میز کے سامنے کھڑا ہوکر یہ الفاظ دل میں دُہراتا رہا۔ "آج سے فاقہ مستی کے لطف اُڑاؤ" اُس کے چہرے پر بشاشت و پریشانی کے آثار نمایاں تھے لیکن تمکنت و خودداری کا جذبہ ان دونوں جذبوں پر غالب معلوم ہوتا تھا +

لیکن وہ مضمون ـــ وہ خرافات کا پلندہ ـــ نہ لکھا گیا۔ اُس نے وہ کیوں نہ لکھا۔ کس وجہ سے؟ وہ معلوم نہ کرسکا۔ اُس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ روشندان ابتک بند تھے۔ اُس کے کمرے میں ابتک رات تھی۔ چراغ سحری اسیطرح اپنی مدھم سُرخ روشنی سے جھلملا رہا تھا اور کوچے میں ـــ ساتھ کے مکانوں سے نرمی سے ـــ سحر کی دھیمی آوازوں میں ـــ کائنات خواب سے بیدار ہورہی تھی مشینیں کی آواز اب خاموش تھی۔ پتھر کی دیوار اسیطرح گرد آلود و مایوس کن معلوم ہوتی تھی۔ اس میں سے شرابی کے وہ الفاظ جو کہ اُس نے چابی سے دروازہ کھول کر منتظر عورت کو کہے تھے۔ نوجوان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے تھے۔ اُس نے داخل ہوتے ہی تحکمانہ لہجہ میں کہا تھا +

"دوپہر سے پہلے کھانا ـــ نہ دیا ـــ تو ـــ"

اب وہ بدقمار، ناخوشگوار گہری نیند میں مست تھا۔ عورت کپڑے بغل میں دبا کر باہر جانے کو تیار ہوئی۔ وہ خوش تھی کہ وہ اپنے بدکردار، بدمعاش، کم عقل و سینہ زور شوہر کی بے خواہش کو پورا کر سکیگی۔ باہر جانے سے پہلے اُسے اپنے ہمسائے کا خیال آیا جس کو رات بے آرام کر کے اُسے تسکین ——— اور شاید اپنی عزیز جان ——— حاصل ہوئی تھی۔ اُس نے دیوار کھٹکھٹائی۔

شکستہ دل نوجوان اپنے خیالات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کاغذوں سے باتیں کر رہا ہے: "خیرات! لیکن مشین نے مجھے ایک شریف انسان کو بدنام کرنے سے روکا۔ اس پر بے سروپا پھبتیاں باندھنے سے باز رکھا"۔

ساتھ کے کمرے سے عورت کی انگلیوں کی آواز آرہی تھی۔ اُس نے جان لیا کہ وہ اُس سے بولنا چاہتی ہے۔ اُس نے جواب میں دیوار کو کھٹکھٹایا۔

پھر دونوں نے دیوار سے اپنا منہ لگا کر ایک ہی وقت میں کہا:-

"آپ کا شکریہ"

افسوس! یہ خوش کن الفاظ ——— دونوں میں سے ایک بھی نہ سن سکا۔ کیونکہ دونوں کے منہ دیوار کو ایک ہی وقت پر چھوئے۔ دونوں دیوار سے گنگناتے ہوئے پیچھے ہٹے۔

"نہیں! یہ وہ نہ تھی"

"نہیں! یہ وہ نہ تھا"

(ماخوذ از اطالوی بوساطت انگریزی)

محمد عمرؓ فاروقؓ

غزل

(از جناب حکیم حافظ رحمت اللہ صاحب بنارسی)

کس نے بے پردہ ترے حُسن کا جلوا دیکھا
ہم نے کوئی نہ ترا دیکھنے والا دیکھا

تجھ میں اعجاز عجب اے دلِ شیدا دیکھا
جس کو ڈھونڈھا اُسے پایا جسے چاہا دیکھا

ہاتھ میں لے کے کبھی رکھ کے ہتھیلی پہ کبھی
اُس نے پہروں دلِ بیتاب ہمارا دیکھا

پائے بوسی کا شرف ہم کو تو حاصل نہ ہوا
اور پتھر پہ ترا نقشِ کفِ پا دیکھا

کیا چھپائے گی بھلا حُسن کے جلوے کو نقاب
آپ کو دیکھ لیا آپ کا پردا دیکھا

حال کہتا ہوں تو آنکھیں وہ دکھاتے ہیں مجھے
دل دکھاتا ہوں تو کہہ دیتے ہیں دیکھا دیکھا

وہ تجھے جان گیا وہ تجھے پہچان گیا
غور سے آکے مرا جس نے سراپا دیکھا

حافظ رحمت اللہ

عروسی ہار

ایک اطالوی افسانہ

(نوٹ :- قارئین کی سہولت کی وجہ سے اطالوی زبان کے نام تبدیل کر دیئے گئے ہیں)

از جناب خلیل احمد صاحب بی ۔ اے ۔ منٹگمری

"یہ ہار میں نے شام ہونے سے پہلے ختم کرنا ہے ۔ اور تم مجھے خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہو۔ تو بہ تم کسقدر شیطان ہو کہ میرے پھولوں اور پتوں کو اُلٹ پلٹ کر رہے ہو۔ سرخ رنگ کے عوض اودے رنگ کے پھول میرے ہاتھ میں دیدیتے ہو اور یہ خیال رہے کہ جبتک میں ہار ختم نہ کر یوں گی یہاں سے ہلنے نہ دوں گی" +

یہ الفاظ نہایت تنگ مزاجی سے لیکن ہونٹوں پر نہایت دلاویز تبسم کے ساتھ ایک سولہ برس کی حسین لڑکی نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے خوبصورت نوجوان کو کہے جو کہ اُس حسینہ کو تنگ کرنے میں لطف اُٹھا رہا تھا ۔ ہار پروتے کبھی اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ۔ کبھی چیزیں چھپا لیتا ۔ کبھی جو چیز وہ چاہتی اتنی دور لیجاتا جہاں اُس کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا ۔ کبھی اُس کے لمبے لمبے خوبصورت بالوں سے کھیلتا۔

"بس ناراض ہوگئیں ۔ اچھا مجھ سے خطا ہوئی ۔ معاف کیجئے گا ۔ لیکن یہ یہ تو بتائیے ابھی سے ہار پرونے میں کونسی جلدی ہے ۔ یہ بات صرف الّٰلہ جانتا ہے کہ یہ ہار کب پہنا جائے گا ۔ البتہ اگر آپ نے اسے کل پہننا ہو تو میں بھی دل و جان سے ہار پرونے میں مدد دیتا ہوں" +

"کچھ پرواہ نہیں ۔ یہ پھول اُس دن کا انتظار کریں گے ۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جب بھی وہ وقت آئے گا یہ پھول ایسے ہی تازہ نظر آئینگے مجھے پھولوں کو احتیاط سے رکھنے کا طریقہ یاد ہے ۔ اُس دن لوگوں کی نظر میں یہ ہار ایک معمولی ہار ہوگا ۔ لیکن میری اور تمہاری نظروں میں یہ ایک آسمانی تحفہ ہوگا ۔ اس گہوارہ کی جہاں ہماری غیر فانی محبت پل کر جوان ہوئی ہے ۔ یہ ہار یاد تازہ کریگا ۔ علاوہ ازیں جب تم اپنے گھر جاؤ گے یہ ہار میری زندگی کا سہارا ہوگا ۔ خلوت میں اس سے باتیں کرونگی ۔ تمہاری یادیں آسے جو ہونگی ۔ آنکھوں سے لگاؤں گی ۔ سامنے پر رکھوں گی ۔ اس دن تک جب لوگوں کو بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم ایک لڑی میں پروئے جا چکے ہیں ۔ اس ہار کو ایک لمحہ بھی اپنے پاس سے جدا نہیں کرونگی ۔ پیارے راجندر کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ میں تمہاری ہوں اور تم میرے ہو اور صرف موت ہم دونوں کو جدا کر سکتی ہے" +

"وہ کیا اچھا دن ہوگا جب تم اپنے ہاتھوں سے یہ ہار مجھے پہناؤ گی اور اُس وقت تمہیں مسرور دیکھ کر میں کسقدر شادمان ہونگا ۔ تمہاری خوشی کو بالائے بام تک پہنچانے کے لئے میں اپنی انتہائی قوتوں کو صرف کر دونگا ۔ پیاری رکمنی تمہیں اس وقت معلوم نہیں کہ حقیقی مسرت کیا شے ہے ۔ ایشور کرے وہ دن جلد آئے جب تم حقیقی کامرانی اور خوشی سے آگاہ ہو ۔ جس زندگی میں پریم رس نہ ہو وہ کسقدر ہولناک زندگی ہے"۔

"لیکن محبت کے ساتھ استقلال اور قیام بھی ہو ۔ دیکھو راجندر پھر وہی شرارت کر رہے ہو ؟ یہ گلاب کا پھول مجھے کیوں دے رہے ہو ؟ بارہ برس دہلی میں رہے اور بھاڑ جھونکتے رہے ۔ تمہیں ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ عروسی ہار میں گلاب نہیں پرویا جاتا ۔ صرف نارنگی کے پھول ہوتے ہیں" +

ایک خادم داخل ہوا +

"آج اور کل ڈاک گاڑی نہیں جائے گی ۔ اس لئے شکروار سے پہلے آپ تشریف نہیں لے جا سکتے" +

رکمنی ۔ "ستّگر ! کہتے ہیں شکروار کو سفر نہیں کرنا چاہئے" اور پھر نہایت دلچسپی سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی ۔ لیکن اُس کے بشرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ راجندر کی روانگی کی تاخیر میں مسرور ہے +

"رکمنی ! میرا خیال ہے کہ یہ تمہاری چال ہے کہ میں کسی طرح دو دن اور رُک جاؤں" +

"آپ غلطی پر ہیں ۔ کیونکہ میری یہ دلی خواہش ہے کہ تم جسقدر جلد ہوسکے یہاں

سے روانہ ہو جاؤ"+

"اچھا! اس سے تمہارا مطلب؟"

"اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ مجھے تم سے کمال درجہ کی محبت ہے۔ جہاں اس دنیا میں مسرت ناک بہار انسان کی روح کو تر و تازگی بخشتی ہے۔ وہاں تباہ کن خزاں بھی ایک پلیٹ میں دردناک منظر پیش کردیتی ہے۔ انسان کو دنیا میں رہ کر فرض شناسی لازم ہے۔ اور فرض شناسی کا دوسرا نام درد، الم رنج و غم ہے۔ اور ان کو بجا لانا اعظیم ترین گناہ ہے۔ سنئے میری ایک ہی بہن تھی۔ دو سال ہوئے ایک شخص نے اُسے محبت میں دھوکا دیا۔ اس صدمے کو وہ برداشت نہ کرسکی اور گھل گھل کر عالم فانی کو سدھاری۔ ایک لمحہ بھی اُس کا خیال میرے دل سے نہیں نکل سکتا لیکن پھر بھی جب تمہیں دیکھتی ہوں تو سوائے تمہارے سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ تم سے بولتی ہوں تو سمجھتی ہوں کہ دونوں جہان کی دولت میرے پاس ہے۔ میری ماتا جو کہ بہ تقاضائے عمر و وقت قابل مدد ہیں۔ میں ان کی طرف عدم توجہی سے کام لیتی ہوں۔ ایک دن اُنہوں نے کہا "تم نالائق بیٹی ہو" آہ اُس دن سے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ میں اپنے فرائض منصبی کو بجالانے میں کوتاہی کرتی ہوں۔ سست ہوں۔ تُف ہے مجھ پر۔ راجندر جو شخص اپنے ادائیگی فرض پر دھیان نہیں دیتا اُس کو ہم انسان نہیں کہہ سکتے۔ تو میں کس لئے اسقدر کوتاہ اندیش ہوں۔ صرف تمہارے لئے جب تم آنکھوں کے سامنے آجاتے ہو تو مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ اور اُس وقت میں یہی سمجھتی ہوں کہ تمہاری محبت ہی میرا سب سے بڑا فرض ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تم جلدی چلے جاؤ۔ تاکہ میں اپنی بوڑھی ماتا کے دُکھ سکھ میں شریک ہو سکوں اور فرض شناسی کی کسوٹی پر جبتک میں پرکھی نہیں جاؤنگی میں کس طرح تمہاری "اچھی بیوی" کہلا سکونگی۔ جب تم دور چلے جاؤ گے میرا کامل اعتماد تمہارے ساتھ ہوگا۔ میری محبت تمہارے ہمراہ ہوگی۔ لیکن اگر تمہارے والد اس بات پر رضامند نہ ہوئے تو کیا ہوگا؟"

"آپ ایسے اندوہناک خیالات دل میں مت لائیے۔ مجھے کامل اُمید ہے کہ جس بات میں میری خوشی ہوگی میرے والد ہرگز اُس کو ٹھکرا نہیں سکیں گے۔ اور اگر بفرض محال وہ ٹھکرا بھی دیں تو دو سال تک میں قانونی طور پر اپنی مرضی کو استعمال کرنے کے قابل ہو جاؤنگا"+

"خدا کرے میرا یہ وہم دور ہو جائے لیکن میرے دل میں کسیوقت یہ خیال ایک گھبراہٹ سی پیدا کردیتا ہے۔ راجندر! جب تم اپنے والد سے اس امر کی اجازت لے کر آؤ گے تو اُس وقت ہم دونوں دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہوں گے"+

اس کے بعد گھنٹی کی آواز سنائی دی جو کہ رکمنی کی ماں کے کمرہ کی طرف سے آئی تھی۔ رکمنی جلدی سے اُٹھی اور "پیارے راجندر میں ابھی آتی ہوں" کہہ کر اپنی والدہ کے کمرہ کی طرف بھاگ گئی +

راجندر ایک نہایت متموّل تاجر کا بیٹا تھا۔ وہ آجکل اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لیکن وہ تعلیم جس سے فہم و فراست اور گیان قوی ہو۔ لیکن جس سے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے کی کبھی کبھی کوشش نہ کی گئی ہو۔ وہ آجکل ایک دقیانوسی کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ جس کی تعلیمی فضا اتنی بوسیدہ تھی جتنی کہ اُس کی دیواریں۔ اس کو اتنا بتایا گیا تھا کہ اُس کے سینہ میں دل ہے۔ لیکن وہ جذبات اور احساسات جو سیل بے پناہ کی مانند اُٹھتے اور گرتے رہتے ہیں کبھی کسی کتاب یا کسی اُستاد نے نہیں بتایا تھا کہ ان کا صحیح راہ عمل کیا ہے کالج میں صرف اتنا بتایا گیا کہ اپنے شدید جذبات اور خواہشات کا مردانہ وار مقابلہ کرے لیکن اِس بات پر کبھی بھی روشنی نہ ڈالی گئی کہ وہ ان کے مقابلہ کے لئے کونسے ہتھیار استعمال کرے۔ اس کو یہ تعلیم دی گئی کہ نیکی سے محبت کرو اور بدی سے نفرت۔ لیکن کبھی بھی اس پر یہ روشن نہ ہوا کہ صحیح نیکی اور بدی کیا چیزیں ہیں۔ گو راجندر کی طبیعت میں آتش مزاجی اور تندی تھی لیکن وہیں وہ سلیم الطبع اور جلدی زیر ہو جانے والا تھا۔ قدرت نے اُسے خوبیاں عطا کیں۔ لیکن سماجی زندگی نے وہ تمام خوبیاں چھین لیں۔ وہ ایک جہاز کی مانند تھا جو بغیر جہاز راں کے پانی کی سطح پر کبھی اِدھر کبھی اُدھر تیرتا پھرتا تھا +

رکمنی کے والد کے راجندر کے خاندان سے نہایت اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ جب وہ بنارس میں تعلیم حاصل کرنے کو گیا تو انہی کے گھر میں رہائش اختیار کی۔ راجندر ایک ہی نگاہ میں رُکمنی کو دل دے بیٹھا۔ رکمنی نے بھی اس کی محبت کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ راجندر نے اپنی طبیعت کے ماتحت نہایت تیزی سے محبت کے عہد و پیمان کا اظہار کردیا۔ رکمنی کو اپنے ناتجربکاری کی وجہ سے یقین ہوگیا کہ جس جوش و خروش کے ساتھ اُس نے محبت کا اظہار کیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کو استقلال ہوگا۔ اس لئے دل و جان سے اپنے آپ کو راجندر کے حوالہ کردیا +

راجندر کی تعلیم کا ایک سال ختم ہوچکا تھا۔ اور وہ اب رخصت پر گھر جا رہا تھا۔ رکمنی کا والد دینا ناتھ بھی ایک بڑا تاجر تھا۔ اُس نے نہایت چھوٹے پیمانے پر

تجارت کا کام شروع کیا۔ بالآخر اپنی جانفشانی۔ دیانتداری اور فہم و فراست کی وجہ سے آہستہ آہستہ ایک کامیاب سوداگر بن گیا تھا اور اس وقت وہ کافی سرمایہ جمع کرکے بہ تقاضائے عمر تجارت سے مستعفی ہو چکا تھا۔ دینا ناتھ طبیعت کا دھیما، سخت اور تجارت کا کھرا تھا۔ وہ محبت نہیں چاہتا تھا۔ دوسروں میں ڈر پیدا کرنا اُس کا مقصد وحید تھا۔ وہ اپنے خاندان کا ایک ظالم حکمراں تھا۔ اُس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان ہمیشہ کشیدگی سی رہتی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے کہ وہ بچوں کو شفقت اور محبت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ کچھ اس غم سے اور کچھ بڑی لڑکی راجکماری کی موت کے غم نے رکمنی کی والدہ کو جاں بلب کردیا۔ اور فالج کی مرض لاحق ہوگئی۔ اور وہ بغیر سہارے کے حرکت نہیں کرسکتی تھی +

ایک اور ضعیف عورت محبت کی وجہ سے اس خاندان میں رہنے سہنے لگی۔ وہ ایک دیانتدار اور خیرخواہ عورت تھی لیکن خاموش اور اردگرد کے روزانہ جھگڑوں سے بے نیاز تھی۔ جب دینا ناتھ نہایت درشت لہجہ میں گھر کو سر پر اُٹھا لیتا۔ تو اُسے نہایت ناگوار گذرتا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اُسکا یہ رویہ اُس کی بیوی کے لئے زہر قاتل ہے۔ اور اگر وہ مرگئی تو اُس کی موت کا باعث وہی ہوگا +

رکمنی نہایت اندوہناک مراحل میں سے گزر رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو طرح طرح کے کاموں میں مشغول رکھتی تھی۔ پھولوں کے ہار بنانے میں اس کا کوئی مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ بڑے بڑے رؤسا کو جب نادر پھولوں کے ہار مطلوب ہوتے تو وہ رکمنی سے درخواست کرتے اور وہ بخوشی منظور کرلیتی۔

راجندر کو آج رخصت ہونا تھا۔ وہ مریضہ کی چارپائی کے پاس آیا۔ رکمنی بھی وہاں بیٹھی تھی۔ مریضہ کی وجہ سے گھر پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ رکمنی نے راجندر کی طرف دیکھا تو آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہوں نے الوداع کہا۔ اُس کو بہت کچھ کہنا تھا لیکن وہ خاموش رہی۔ وہ جارہا تھا۔ ممکن ہے وہ پھر نہ آسکے۔ یونہی سا ایک گمان اُس کے دل میں پیدا ہوا۔ دراصل انسان کا اپنا دل سب سے بڑا پیشینگو ہے۔ رکمنی کا صرف یہ وسواس نہ تھا۔ بعد میں یہ بات صداقت کا جامہ پہنکر رونما ہوئی۔ اُس کی والدہ زندگی کی آخری منزل میں تھی۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کے سرہانے سے نہ اُٹھتی تھی کبھی کبھی اُسکے غم انگیز خیال والدہ کے قدموں سے اُڑ کر دور راجندر کی یاد میں محو ہوجاتے پھر اُس کی والدہ آنکھیں کھولتی اور اپنی پیاری بیٹی کو غم میں گھلتے دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھر کر ایشور سے دعا مانگتی۔ رکمنی جلدی ہی سنبھل کر پھر ماں کی خدمت میں مشغول ہوجاتی۔ رکمنی نے والدہ کی خدمت کرنے میں رات دن میں کوئی تمیز نہ کی۔ لیکن بدقسمت عورت کی روح بہت دنوں تک غم گیتی کی متحمل نہ ہوسکی +

رکمنی کی والدہ کی زندگی کے آخری لمحات آپہنچے۔ آخری سانس لینے سے پہلے اُس نے اپنی پیاری بیٹی کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا +

"پیاری بچی میں جانتی ہوں کہ تمہیں راجندر سے کمال محبت ہے۔ ایشور انجام بخیر کرے۔ میرے پاس یہ ایک سونے کا جڑاؤ تعویذ ہے جس کی قیمت دس پندرہ ہزار ہوگی۔ اس کو تادم آخر سینے سے لگائے رکھنا۔ غریب اور بیکس ماں کی یاد اس سے تازہ رہیگی۔ میرے بکس میں کچھ روپے اور کچھ امپیریل بنک کے چک موجود ہیں۔ گو وہ بہت بڑا سرمایہ نہیں تاہم آڑے وقت تمہارے کام آسکیگا۔ اور اسی غرض سے میں نے آج تک تمہارے باپ سے چھپائے رکھا ہے" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن آخری سانس کی میعاد ختم ہوگئی اور اُس کا سر رکمنی کے زانو پر پھر کبھی نہ اُٹھنے کے لئے دھرا تھا +

اس واقعہ کے چار ماہ بعد راجندر آگیا۔ اُس کا والد ابھی تک رضامند نہ ہوسکا لیکن وہ دھندلی اُمیدوں سے رکمنی کو ڈھارس دیتا رہا۔ دینا ناتھ کو بھی اس عشق بازی کا راز کھل چکا تھا۔ اس لئے اُس نے راجندر کو گھر پر آنے سے روک دیا۔ لیکن رکمنی اور راجندر خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے +

راجندر کی محبت میں کافی تبدیلی ہوچکی تھی۔ اس میں پہلا سا وہ جوش و خروش نہیں تھا۔ اُس کی باتوں میں اب وہ سرگرمی نہیں رہی تھی۔ علاوہ ازیں شہر کے بدمعاشوں سے اُس کا رابطہ پیدا ہوگیا۔ قماربازی سے اُس کو ایک قسم کا عشق ہوگیا۔ باپ سے جو روپیہ منگواتا جُوا میں ہار جاتا۔ جب کسی بہانے سے بھی باپ سے روپیہ نہ منگوا سکتا تو رکمنی کے پاس جاتا وہ بیچاری وفا کی پُتلی سو کی بجگہ دو سو اُس کے حوالہ کرتی۔ اور جب وہ روپیہ کے اخراجات کا جھوٹا بہانہ کرتا تو وہ کہتی:۔

"میں کچھ نہیں سُننا چاہتی۔ میں تمہاری ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ بھی تمہارا ہے۔ آپ کیوں تفصیل سے کام لے رہے ہیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ تمہیں روپیہ چاہئے" +

کاش وہ ان الفاظ کو سمجھ سکتا۔ اور اس معصوم لڑکی کے دل کی تہہ کو پہنچ سکتا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوسکا۔ روپے کی طلب نے اُس کے تمام حسیات کو بے حس کردیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی پاک محبت کی تخریب کے درپے تھا۔ جوں جوں وہ

روپیہ ہارتا رہا قماربازی کی محبت اُس کے دل میں بڑھتی جاتی تھی اور رکمنی کے سوا اُسے اور کہیں سے روپے کی اُمید نہ ہو سکتی تھی۔ جو روپیہ اُس کی ماں مرتے وقت اُس کے لئے چھوڑ گئی تھی وہ تمام راجندر کی نذر ہوا۔ آدھے سے زیادہ زیور بک گئے۔ لیکن رکمنی نے اپنے باپ کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ راجندر ضرورت سے زیادہ روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ منصب نہیں تھا کہ وہ راجندر کو سمجھاتی۔ وہ محبت میں اندھی ہو رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ سمجھ چکی تھی کہ راجندر اُس کے تن و من کا مالک ہے۔ دیوتا ہے خدا ہے۔ وہ چھپ چھپ کر راتوں کو بیدار رہتی اور جانفشانی سے پھولوں کے ہار تیار کرتی۔ پہلے وہ قیمت نہ لیا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ قیمت کے بغیر کسی کو ایک ہار بھی نہ دیتی۔ اس کی سہیلیاں اس حرکت پر شدید نکتہ چینی کرنے لگیں۔ کوئی کہتی "خدا جانے اس کو کیا ہو گیا ہے۔ اب اس کے ہاتھ میں چھلا بھی دکھائی نہیں دیتا۔" دوسری کہتی "دیکھئے کس قدر کنجوس ہو گئی ہار تک تو بیچنے لگی ہے۔" لیکن رکمنی ان باتوں کی ذرا پروا نہ کرتی۔ وہ دل میں خیال کرتی ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ میرا سب سے پیارا زیور راجندر ہے۔ زیور کی محبت اُس کی محبت کے سامنے خاک ہے۔ میری محبت کا وہ دیوتا ہے۔ مجھے اُس پر زیور نچھاور کرنے ہوں گے۔ پھولوں کے ہار تو کیا اپنی جان بیچ کر اُس کے سپرد کرنا ہو گی۔ اگر میری صحت خراب ہوتی جا رہی ہے تو بلا سے۔ جب اُس کو روپے کی ضرورت ہے تو مجھے بھیک مانگ کر بھی اُس کی ضروریات کو پورا کرنا ہو گا۔ اور یہ سب باتیں خواب ہو جائیں گی۔ جب وہ دن آئے گا۔ صرف اُس کا گلے میں باہیں ڈال لینا ان تمام تکالیف کو ایک موہوم خواب کی طرح محو کر دے گا +

راجندر دن بدن مقروض ہوتا گیا۔ اور رکمنی کی کوششیں اُسکی ضروریات کو پورا نہ کر سکیں۔ قرضخواہوں نے اُس کو عدالت کی دھمکی دی۔ وہ چار و ناچار پھر رکمنی کے پاس گیا۔ چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ قماربازی کی لعنت نے اُس کے چہرے کو نہایت گھناؤنا بنا دیا تھا۔ اس میں وہ پہلا سا موہ کا غیر رہ چکا تھا۔ رکمنی جان گئی تھی کہ وہ زندگی کی قبیح عادتوں میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن وہ اس بات کو اہمیت نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وقت کا چکر اس کو راہ راست پر لے آئے گا۔ وہ کمرے کے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ لیکن شرم سے رکمنی کے چہرے کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ نامکمل الفاظ اُس نے کہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کو اس وقت دس ہزار کی سخت ضرورت ہے۔ رکمنی ہکا بکا رہ گئی لیکن اُس نے بغیر تامل کے اُس کے ساتھ کل کا وعدہ کیا اور اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے لے گی +

اُس کے جانے کے بعد ہی وہ اپنے پتا کے چرنوں میں گر پڑی اور روپے کے لئے درخواست کی۔ لیکن اُس کے باپ نے صاف انکار کر دیا۔ رکمنی پر ایک پہاڑ من بوجھ پڑ گیا۔ وہ بے یار و مددگار کیا کر سکتی تھی۔ اُس کے دل میں مایوسی کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ گناہ نے جھلک دکھائی۔ معصیت پرور جذبات اُس کے دماغ میں پھرنے لگے۔ رات کے وقت تن تنہا اسی خیال میں غلطاں اُسکی نگاہیں ہیبتناک اندھیروں کو چیر کر نکل رہی تھیں۔ آخرکار گناہ نے فتح پائی۔ وہ باپ کی چوری کرنے کو تیار ہو گئی۔ لیکن جن آہنی صندوقوں میں سونے کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ اُس کی کنجیاں ہر وقت اُس کے باپ کے پاس رہتی تھیں اور اُن کا توڑنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کو معاً جڑاؤ تعویذ کا خیال آیا۔ آہ! کیا وہ اپنی پیاری ماتا کی نشانی کی جدائی برداشت کر سکیگی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ اُس نے کلیجہ پر پتھر رکھ لیا۔ اُس کے لئے وہ سب کچھ قربان کر سکتی ہے۔ لیکن وہ تعویذ بھی حفاظت کے لئے اُس ضعیفہ کے کمرہ میں ایک میز کے دراز میں بند تھا۔ وہ برقی لیمپ لے کر پنجوں کے بل چلتی ہوئی اُس ضعیفہ کے کمرے کے پاس پہنچی۔ اس کا دل اُس مرغی کی طرح دھڑک رہا تھا جو بلی کے پنجوں سے چھڑا لی گئی ہو۔ در و دیوار پر اُسے دہشتناک صورتیں نظر آ رہی تھیں۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے دروازہ کھولا۔ ذرا سا شور ہونے سے اُسے ایسا معلوم ہوا گویا کہ تمام عمارت میں زلزلہ آ گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہزاروں ہاتھ اُس کو پکڑنے کے لئے اندھیرے سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ لاتعداد خوفناک آنکھیں دیوار و در پر گڑی ہوئی ہیں۔ اُس نے میز کا دراز کھولا اور وہ جڑاؤ تعویذ باہر نکالا۔ اسی دراز میں اسے بہت سے امپیریل بنک کے چک نظر پڑے۔ اُس نے ان پر ہاتھ ڈالا۔ لیکن گناہ کا خوف اس پر اسقدر طاری ہو گیا کہ وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی +

تھوڑی دیر بعد وہ ضعیفہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رکمنی کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ تعویذ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میز کا دراز کھلا ہوا تھا۔ ضعیفہ اُسے جلدی ہوش میں لائی۔ رکمنی جب

ہوش میں آئی تو اُس نے اپنے آپ کو ضعیفہ کے چرنوں میں پھینک دیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی :۔

"مجھے معاف کرو! مجھے معاف کرو!"

ضعیفہ نے اُسے نہایت محبّت اور شفقت کے لہجہ میں اُس کو تسلّی دی گلے لگایا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور صرف اتنا کہا :۔

"پیاری بچّی! اسوقت تم اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو"

"ماتا جی! مجھ سے کسقدر شرمناک فعل ہوا ہے۔ اے ایشور! مجھ بدبخت کی حالت پر رحم کرو"

"رُکمنی! اس معاملہ کی بابت کل دیکھا جائے گا۔ اس وقت جاؤ اپنے بستر پر لیٹ جاؤ۔ میری بچّی! کسی قسم کا فکر مت کرو۔ ورنہ تمہاری صحت پر بُرا اثر پڑیگا"

رحمدل ضعیفہ نہایت شفقت سے اُسے کمرے میں پہنچا آئی۔ صبح رُکمنی فرطِ غم کی وجہ سے بستر پر سے نہ اُٹھ سکی اور شدید بخار سے اُس کا بدن آگ کی طرح پھُنک رہا تھا۔ وہی ضعیفہ اُس کی تیمارداری کرنے لگی۔

راجندر کی بداعتدالیاں اُس کے باپ کے کان تک پہنچ چکی تھیں۔ اُس نے اُس کو واپس بلوالیا۔ وہ تمام لوگوں میں بدنام ہوچکا تھا۔ وہ مجبور ہوگیا تھا کہ وہ اپنی گذشتہ سیاہ اعمالیوں پر غور کرکے اپنے آپ کو نفریں بھیجے اور صحیح راستہ پر گامزن ہو۔ اُس نے کالج کو خیرباد کہا اور اپنے آبائی پیشہ تجارت میں مشغول ہوگیا۔

کچھ عرصہ بعد رُکمنی کو راجندر کا پہلا خط موصول ہوا جس میں اُس نے لکھا کہ میرا والد میری اور تمہاری شادی پر رضامند نہیں ہوا اور وہ اُس لڑکی کو منتخب کرے گا جو بہت سی دولت ساتھ لائے۔ لیکن میں ہرگز کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کرونگا۔ اور تمہیں وقت اور قسمت کا انتظار کرنا چاہئے۔ اس کے بعد بھی اُس نے کئی خط بھیجے۔ جن کا مضمون قریباً یہی تھا۔ رُکمنی اسقدر دولتمند نہ تھی جتنا کہ راجندر کے والد کی خواہش تھی۔ اس غم سے وہ اور بیمار ہوتی چلی گئی۔ کاش وہ اس وقت دولتمند ہوتی۔ اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا۔ اُس کی بیماری خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ اس رنج و الم کے مرحلہ میں اُس نے رحمدل ضعیفہ کو اپنا ہمراز بنالیا۔

چار سال کا عرصہ گذر گیا اور رُکمنی اور وہ ضعیفہ ایک پل کے لئے بھی جُدا نہ ہوتی تھیں۔ رکمنی اس سے اپنے غم کی داستان سُناتی اور اس طرح دل کا غبار نکال لیتی۔ اور دنیا میں اس کے لئے صرف یہی ایک بڑھیا تھی۔ جس سے باتیں کرکے اُس کو تسلّی ہوتی۔ لیکن رُکمنی کی بدقسمتی سے بڑھیا کا آخری وقت آپہنچا۔ رُکمنی سر پیٹ کر بیٹھ گئی۔ "اے ایشور! کیا میری قسمت میں یہی ہے کہ میں جس سے محبّت کروں وہ ہاتھوں سے چھن جائے۔ بڑی ہمشیرہ سے کمال محبّت تھی وہ چل بسی۔ ماتا جی بھی مجھے کراہتا چھوڑکر سُرگباش ہوگئیں۔ راجندر ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب یہ بڑھیا میرا آخری سہارا تھا وہ بھی ملکِ عدم کو تیار ہے۔" لیکن رُکمنی کی گریہ وزاری کارگر نہ ہوئی۔ بڑھیا راہئی ملکِ عدم ہوگئی۔

جب بڑھیا کے کاغذات کی دیکھ بھال ہوئی تو اُن میں سے ایک وصیّت نامہ برآمد ہوا جس کی رو سے اس بڑھیا نے اپنی تمام جائداد رُکمنی کے نام وقف کردی تھی۔ رُکمنی کو ایسا معلوم ہوا گویا آکاش سے کوئی دیوتا اُس کی قسمت پلٹنے کو اُتر آیا۔ چھ سال کا عرصہ گذر گیا تھا راجندر کے وعدے ختم ہونے کو نہ آتے تھے اس کے والد کی وہی ہٹ اور بیچاری رُکمنی کا وہی انتظار۔ اب اس کو وہ تمام باتیں ایک خواب کی طرح نظر آنے لگیں۔ وہ اب امیر تھی۔ راجندر کا والد ضرور رضامند ہوجائے گا۔ یہ کسقدر مسرّت انگیز خیال تھا۔ کچھ دنوں تک وہ محبت کی ملکہ بن جائے گی۔

اُس نے ایک طویل خط جس کے لفظ لفظ سے خوشی ٹپکتی تھی راجندر کو لکھا اور اپنی اس خداداد دولت کا ذکر نہایت مسرّت سے کیا۔ اُس نے اب شادی کی تیاری شروع کردی۔ اُس نے اُن رنگوں کے کپڑے بنوانے شروع کردیئے جو راجندر کو پسند تھے۔ وہی ہار جو اُس نے راجندر کی موجودگی میں تیار کیا تھا۔ باہر نکالا اور پہن کر آئینہ میں دیکھا تو اُس کی مسرّت ناک نگاہیں عرشِ اعلیٰ تک پہنچ گئیں۔ راجندر کا جواب آگیا۔ اگر کوئی شخص اُس کو دیکھتا تو یقیناً اُس کے روکھے الفاظ سے کچھ اور نتیجہ نکالتا۔ اُس نے لکھا کہ وہ ابھی بیمار ہے۔ اور شادی کے متعلق ابھی کوئی تاریخ وغیرہ مقرر نہیں کرسکتا۔ لیکن رکمنی کو ان الفاظ سے مایوسی نہ ہوئی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ اُس کی اُمید مضبوط ہوگئی۔

کاش اُس کو یہ معلوم ہوتا کہ راجندر نے علالت کا صرف بہانہ کیا تھا۔ وہ فوراً کانپور کو روانہ ہوگئی تاکہ راجندر کی تیمارداری کرے۔ اور اُسے یہ بھی خیال پیدا ہوا۔ کہ جبتک راجندر صحت یاب نہ ہو وہ وہیں قیام کرے گی۔ بعدازیں وہیں شادی کی تاریخ مقرر ہوجائے گی۔

وہ راجندر کے مکان پر پہنچ گئی۔ نوکروں نے گول کمرہ میں بٹھایا۔ جب راجندر کمرہ میں داخل ہوا تو رکمنی کو دیکھ کر اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اُس کے منہ پر

کسی نے گھونس مار دیا۔ وہ ششدر رہ گیا۔ وہ بالکل تندرست تھا۔ بیماری کی کوئی علامت بھی اُس کے چہرہ پر عیاں نہ تھی +

"کیا اب بالکل صحتیاب ہوگئے ہو؟" رُکمنی نے حیرت سے پوچھا جو راجندر کی گھبراہٹ کو بھی محسوس کر چکی تھی +

"ہاں! یونہی طبیعت ناساز ہوگئی تھی۔ اور آپ کے اس طرح چلے آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی"+

"ضرورت نہ تھی! راجندر! ذرا میری طرف دیکھو۔ کیوں اسقدر بیچین سے نظر آتے ہو؟ کیا اب مجھ سے محبت نہیں رہی؟ جلدی کہو صاف صاف بتاؤ؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں۔ لیکن والد صاحب اگر ہم کو اس طرح دیکھ لیں تو وہ کیا کہیں گے۔ یہ ایک ناکتخدا لڑکی کے شایاں نہیں۔ کہ وہ اس طرح بیدھڑک چلی آئے جہاں وہ پہلے کبھی بھی نہ آئی ہو"+

"تمہاری باتیں مجھے ہلاک کئے دیتی ہیں۔ کیا میں اس گھر میں داخل نہیں ہوسکتی۔ کیا ہم دونوں نے اس گھر میں عمر نہیں گزارنی؟ کیا اس گھر کا انتظام میرے ہاتھوں میں نہیں ہوگا؟"

"ہاں یہ صحیح ہے۔ لیکن آپ نے اپنی آمد کی خبر پیشتر دینی تھی۔ تاکہ والد صاحب کو بھی خبر ہوجاتی۔ اس طریقہ سے اُن کو تمہاری آمد کی خبر دینا حماقت ہے آپ کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک دن کے لئے آپ شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھیریں"

اس وقت خادم داخل ہوا اور راجندر کو خطاب کیا +

"آپ کی دُلہن آپ کو یاد فرماتی ہیں"+

رُکمنی کبھی راجندر کے مُنہ کی طرف کبھی خادم کی طرف دیکھتی۔ جب خادم رخصت ہوا تو اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور زار و قطار رونے لگی +

"راجندر! تمہاری دلہن! یہ بالکل غلط ہے۔ مجھے تسلی دو کہ جو کچھ خادم نے کہا وہ غلط تھا۔ ہاں کہو کہ یہ بات کبھی صحیح نہیں ہوسکتی"+

"لیکن وہ بات بالکل صحیح ہے۔ میرے والد کی مرضی اسیطرح تھی۔ ایک گھنٹہ کے بعد میں کسی دوسری عورت کو بیوی کہنے والا ہوں"+

"اے میرے ایشور! کیا جو کچھ میں سن رہی ہوں یہ صحیح ہے۔ نہیں! نہیں!! تم غلط کہہ رہے ہو۔ راجندر! ابھی تک تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ جاؤ اپنے والد کو مجبور کرو کہ جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ آگئی ہے ــــــ آہ چھ برس کا انتظار۔ جلدی اپنے والد کو یہ خوشخبری سناؤ۔ میرا دل ٹوٹا جا رہا ہے"+

"یہ ناممکن ہے۔ حالات بالکل مستحکم صورت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ لڑکی کانپور کے نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت ناؤ کا رُخ پلٹنے کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی"+

"اگر تم کو اس سے محبت نہیں تو پھر کیوں تمہیں اُس کے یا اُس کے خاندان کے بدنام ہونے کا اندیشہ ہے"+

"ممکن ہے مجھ کو اُس سے محبت ہو" اُس نے دیوار پر نگاہیں جمائے ہوئے کہے +

"اگر تم کو اُس سے محبت ہے تو تم انسانیت کے حرف پر داغ ہو۔ کھوٹے ہو۔ انسان کی شکل میں بھیڑیا ہو۔ لیکن راجندر! کیا تم وہ تمام وعدے اور قسمیں بھول چکے ہو؟ کیا چھ سال کے بعد میں نے یہی الفاظ تمہارے منہ سے سننے تھے؟"

وہ فرطِ محبت سے بیتاب ہوگئی۔ اور راجندر کے قدموں پر گر پڑی +

"ہاں! ہاں!! راجندر! مجھے یہ الفاظ کہو کہ میں نے تمہاری محبت کو پرکھنے کے لئے یہ الفاظ کہے تھے۔ مجھے جلدی تسلی دو کہ میرے سوا تمہیں کسی اور سے محبت نہیں اور یہ دوسری محبت والا ایک من گھڑت افسانہ تھا۔ تم اس گھر سے مجھے نہیں نکال سکتے۔ ایشور کے لئے وہ لفظ واپس لو کہ تم کسی اور سے محبت کرتے ہو"+

"رُکمنی! میرے بس کی بات نہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ مجھے تمہیں یونہی رُلانے میں کوئی لطف نہیں حاصل ہوتا"+

"تم بے بس نہیں ہو۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ وہ کونسی بات ہے۔ جو تمہارے درمیان حائل ہے؟"

"میری عزّت"

"عزت! کہاں تھی تمہاری عزت جب تم نے میرے ساتھ قسمیں دے دے کر وعدے کئے اور اُس وقت تمہیں اپنی محبت اور عزت مدنظر نہ تھی۔ جب تم نے ان پاک وعدوں کو توڑ دیا"+

"رُکمنی! ایشور کے لئے ایسی بات نہ کرو۔ جس سے میں شہر کے لوگوں میں

نشانہ ہوں۔ میں واقعی ننگِ انسانیت ہوں۔ دھوکہ باز اور دل کا کھوٹا ہوں میں اس وقت تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ میں تمہیں صحیح بات بتانا چاہتا ہوں گو میں نہیں سمجھتا کہ میں کس طرح کہوں۔ وہ لڑکی ایک عرصہ سے میری بیوی ہوچکی ہے۔ رسم نکاح وغیرہ کئی ماہ سے ادا ہوچکی ہے۔ اب یہ رسمی طور پر شادی کی رسم ادا کی جارہی ہے۔ رکمنی مجھے معاف کردینا۔ اور اس وقت تمہارا یہاں سے رخصت ہوجانا مجھ پر آخری احسان ہوگا"۔

"میں ہرگز نہیں جاؤنگی۔ یہاں سے مرکر اُٹھوں گی"۔

اتنے میں کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ راجندر کو معلوم ہوگیا کہ سوائے شانتا (اُس کی نئی بیاہتا) کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ جلدی سے ایک میز کے سامنے کھڑا ہوکر کاغذات اُلٹنے پلٹنے میں مشغول ہوگیا۔ اور اُس نے نہایت آہستہ سے کہا "میں کہیں کا نہ رہا۔ ابھی میری عزت خاک میں مل جائے گی"۔ رکمنی اپنے صندوق کو کھول کر اُس میں سے کوئی چیز نکالنے کے بہانے مصروف ہوگئی۔

دلہن داخل ہوئی اور ایک عورت کو دیکھ کر ذرا جھجک گئی۔ اُس کے ہاتھ میں دو ہار تھے۔

"راجندر! میں نے آپ کو بلوا بھیجا تھا۔ ان میں سے کونسا ہار آپ پسند کریں گے"۔

رکمنی فوراً بول اُٹھی۔ "یہ دونوں کچھ ایسے اچھے بنے ہوئے نہیں۔ یہ لیجئے میں آپ کے لئے ہار لائی ہوں۔ آپ کے شوہر نے مجھے ایک عرصہ پیشتر ہار بنانے کا حکم دیا تھا۔ اور ایشور کا شکر ہے کہ میں ہار لے کر ٹھیک وقت پر پہنچ گئی ہوں اور غالباً اُس کو قبول کرلیا جاوے گا۔ میں نے یہ ہار بہت محنت سے تیار کیا ہے"۔

دلہن نے کہا "بیشک! یہ ان دونوں ہاروں سے خوبصورت اور اعلیٰ ہے لیکن راجندر آپ نے تو اس ہار کی نسبت مجھے پہلے نہیں بتلایا"۔

رکمنی نے جواب دیا "ان کو خیال نہیں رہا ہوگا"۔

"میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔ آپ ہمارے لئے ایسا خوبصورت اور بیش بہا عروسی ہار لائی ہیں"۔ یہ کہکر وہ رکمنی والا ہار لیکر باہر نکل گئی۔ رکمنی کی نظریں اس دلہن کے تعاقب میں گئیں۔ جب دلہن آنکھوں سے غائب ہوگئی تو رکمنی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو چشمے بہ نکلے۔

"آہ! میرا ہار"۔

"رکمنی! تم دیوی ہو۔ پرستش کے لائق ہو۔ ایک دفعہ پھر میں تمہارے قدموں پر پھول پھینکتا ہوں۔ میں تمہیں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا"۔

رکمنی نے نہایت طمانیت کے لہجہ میں کہا "راجندر اب وقت گزر چکا ہے وہ تمہاری بیوی ہوچکی ہے۔ میرا دل تو ٹوٹ چکا ہے لیکن میں اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی۔ یہ میرے دل سے پوچھئے کہ شکستہ دل لوگ کس طرح زندہ رہتے ہیں۔ ایشور میری جیسی زندگی دشمن کو بھی نہ دے۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ جاؤ رسم شادی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو۔ وہ تمہارا انتظار کررہی ہوگی۔ اب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور نہ مجھے اب کوئی شکایت کرنے کا حق رہا ہے اس ہار میں سب کچھ تھا۔ وہ میرے ہاتھوں سے گیا تو سب کچھ گیا۔ آہ وہی ہار ہماری محبت کا ضامن تھا۔ اب جلدی چلے جاؤ۔ تمہیں اب میں دیکھنا نہیں چاہتی۔ اور میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جب تمہاری رسم شادی ختم ہوجائے گی تو تم مجھے یہاں نہ پاؤ گے۔ ہم کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں ملیں گے"۔

راجندر کا رنگ زرد ہوچکا تھا۔ گھبرایا اور پچھتایا ہوا نہایت مایوس نگاہیں ڈالتا ہوا کمرہ سے باہر نکل گیا۔

ایک گھنٹہ بعد رسم شادی ادا ہوئی۔ جب برات شہر میں گھومتی ہوئی ایک بڑی نہر کے پل پر پہنچی تو ماہی گیر مچھلیوں کے ٹوکرے لئے کھڑے تھے۔ اور ان میں ایک لڑکی کی لاش بھی تھی۔ وہ ماہی گیر سڑک پر کھڑے ہوگئے تھے۔ تاکہ برات گزر جائے۔

"راجندر نے اپنا سہرا آنکھ سے اُٹھا کر لاش کو دیکھا تو اُس کے بدن میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور اُس میں سما جائے۔ لیکن برات آہستہ آہستہ گزر گئی۔ اور ایک بوڑھی بولی:۔

"سامنے لاش ملی ہے۔ یہ دولہا کے لئے اچھا شگون نہیں ہے"۔

خلیل احمد بی اے

دہقان کی لڑکی

(ترجمہ ورڈز ورتھ)

از جناب لالہ نرائن داس صاحب پوری - فرید کوٹ

وہ دیکھو ایک لڑکی کچھ گنگنا رہی ہے
اُس کھیت میں اکیلی اک گیت گا رہی ہے

غلہ کو کاٹ کر وہ پولے بنا رہی ہے
اور دردناک لَے میں تانیں لگا رہی ہے

پُرکیف وادیوں میں ہیں بے شمار نغمے
ہر گوشۂ فضا میں ہیں بیقرار نغمے

بلبل نے راگ ایسا میٹھا کبھی نہ گایا
عربی مسافروں کو جب سُر کوئی سنایا

ٹاپو کی کوئلوں نے گا گا کے راگنی بھی
خاموشیاں نہ توڑی ہوں گی سمندروں کی

کیا گا رہی ہے لڑکی کوئی مجھے بتا دے
مضمون اس کے سُر کا کوئی مجھے سنا دے

مضمر ہیں اس نوا میں جنگ وجدل کے قصے
شائد نہاں ہیں اس میں جورِ فلک کے شکوے

ہے دردخیز لہجہ غمناک ہیں صدائیں
ان میں چھپی ہوئی ہیں عہدِ کہن کی باتیں

شائد سنا رہی ہے اس دل کو یادِ ماضی
یا ہے کوئی مصیبت اس دل پہ آنے والی

گا گا کے اپنے غم کو شائد مٹا رہی ہے
یا وہ خدا کو اپنا دُکھڑا سنا رہی ہے

مضمون اس کا کچھ ہو تھی گیت میں روانی
نغمے بھی تھے زباں پر چلتی بھی تھی درانتی

جی بھر کے سُن چکا میں جس وقت وہ ترانہ
سیدھا پہاڑیوں کی جانب ہُوا روانہ

کانوں میں وہ ترنم گو اب نہ آ رہا تھا
وہ راگ میرے دل میں پھر بھی سما رہا تھا

نرائن داس پوری

برسات کا گیت

از جناب روشن دین صاحب وکیل

ایک باغ دلکشا ہے   خطۂ بہشت کا ہے
برسات کا ہے موسم   مینہ پڑ رہا ہے چھم چھم
بادل ہیں کالے کالے   جادو چمن پہ ڈالے
ڈوبے ہوئے نشے میں   جوں رند میکدے میں
اُٹھے ہیں لڑکھڑا کر   جن ہے سوار سر پر
چلتے ہیں بے ارادہ   پی کر ذرا زیادہ
اور خود ہی مُسکرانا   پھر قہقہہ لگانا
اور لہر میں پھر آ کر   تالی بجا بجا کر
رہ رہ کے تان بھرنا   بے تال رقص کرنا
یکلخت رُخ بدلنا   سینہ میں دل مسلنا
بے اختیار ہوکر   اور بے قرار ہوکر
آنسو ہوئے روانہ   تاریک ہے زمانہ
یہ وقت دوپہر کا   اور جھٹ پٹا سحر کا
ہے کائنات ہستی   غرقِ سیاہ مستی

آموں کا جھنڈ گویا   ہے خوشنما اندھیرا
یا دیو کالے کالے   بھر بھر کے مے سے پیالے
نشہ لٹا رہے ہیں   اور لہلہا رہے ہیں

یہ بڑ جو ہے بڑا سا   اک شہر طائروں کا
ٹھیرا ہوا ہوا پر   ہے رقص کا سمندر

یہ ننھی ننھی لہریں   جوشِ طرب کی لہریں
ہر طرف جو رواں ہیں   موسم کی نغمہ خواں ہیں
گر گر کے ان میں قطرے   اُٹھتے ہیں ببلے سے

گویا چمن کی فطرت   بن کر چراغ اُلفت
ہوتی ہے آپ روشن   کالے کا جس طرح من

یہ سبزہ تازہ تازہ   رُوئے زمیں کا غازہ
یا بے شمار حوریں   پوشاک سبز تن میں
اُتری ہیں آسماں سے   گلزار جاوداں سے
جن کو بُلا لیا ہے   جن کو لبھا لیا ہے
باراں کے خوشنوا نے   آئی ہیں سب نہانے
پانی میں ہیں کمر تک   اور قلب میں ہے ٹھنڈک

اس گلستاں کے اندر   اک پھوس کا ہے چھپّر
ہے اس پہ عشق پیچاں   پھیلائے اپنا داماں
بے جام پی رہا ہے   بے جان جی رہا ہے

اور سامنے ہے پیاری   اک موتیا کی کیاری
بادل کے دھندلکے میں   دکھلا رہی ہیں کلیں
پھولوں کے کیا نظارے   جوں صبح کے ستارے

ہے پاس ایک کوٹھا   قصرِ بہشت گویا
چاروں طرف کھلا ہے   آتی خنک ہوا ہے
اس میں خدا کا بندہ   مُنہ سے لگائے حقّہ
شاعر ہیں جس کو کہتے   اور جس کے لب سے بہتے
چشمے ہیں زمزموں کے   خوشیوں کے اور غموں کے
بیٹھا ترنگ میں ہے   مستی کے رنگ میں ہے
یہ گیت گا رہا ہے   دل کو سنا رہا ہے

منظومات:-

دُرِ یگانہ

از میرزا یگانہ علیہ السّلام

بہتیرے جوانانِ خوش اسلوب مرے
بے موت بھسم ہو گئے یا ڈوب مرے
مرنا اُس کا، جو مر کے زندہ ہو جائے
مرنے کو مرے ہم بھی، مگر خوب مرے

(ولہ)

وہ دل جسے لاگ ہو کسی سے نہ لگاؤ
اک خاک کا ڈھیر ہے جہاں تھپ نہ جاؤ
ٹھنڈی ہی مٹی کا اک انوکھا پتلا
پہلو میں ہمیں کو دیکھ لو دور نہ جاؤ

(ولہ)

یاد آ گئی آوازۂ دلِ گم گشتہ
بجنے لگا پھر سازِ دلِ گم گشتہ
پہنچا ہے کہاں خاک کا پتلا اُڑ کر
اللہ ری پروازِ دلِ گم گشتہ!

(ولہ)

دل کی زبان گفتگو کیا جانے
میر و مرزا کی گفتگو کیا جانے
دل درد سے خالی ہے تو بکواس فضول
خاموش! زبانِ عشق تو کیا جانے

مرزا یگانہ لکھنوی ۔ سب رجسٹرار عثمان آباد، دکن۔

رُباعیات ہادیؔ مچھلی شہری

ہنگامِ شباب کیفِ مستی دارد — باشاہدِ مے دراز دستی دارد
پیری کہ حریفِ فکرِ ہر نشو و نماست — بر رغمِ خودی خدا پرستی دارد

اے پیر ترا کہ بود ہم حال خراب — ایراد مکن بفکرِ اربابِ شباب
خود کردۂ را بیاد انداز و دگر — در عکسِ زمانہ رنگِ خود را دریاب

پیرے کہ ز آبِ سرد غم نوش کند — از گرمئ دل ہمہ فراموش کند
بر زعمِ خیالِ ہر جوانِ دل خوش — چوں رعد بشور آید و جوش کند

اے پیر ترا کہ ہم جوانی بودہ — اسبابِ نشاطِ زندگانی بودہ
ایراد چرا کنی بہ افکارِ شباب — فکرِ تو ہمیں اگر ندانی بودہ

از ساحل و موج ہیچ داری نہ خبر — ہموارہ بود نوی برائے تو نظر
سازد نہ بفکرِ نوجوانی پیری — شام است یکے و دیگرے نورِ سحر

با دہر ہمیشہ رسم و راہے دگر است — ہموارہ بچشمِ تو نگاہے دگر است
با گرمئ سرد ریش کے سازد — در شیب و شباب رنگِ آہے دگر است

اے پیر مشو حریص بہ فکرِ شباب — آں مستقل است و ایں ز سرخاب و خضاب
یک وقعہ دگر تمام بے پا و سر است — یک منظرِ تست و دیگرے از تو حجاب

ہادی

(مرسلہ خبیر بھوروی)

رُباعیات

منبر پہ جو چڑھ کے وعظ فرماتے ہیں — کیا عیب جو قومی چندے کھا جاتے ہیں
شیطان کے نام کا تو ملتا نہیں کچھ — اللہ کے نام پر کما کھاتے ہیں

ہے عالمِ بے عمل گدھے کی مانند — جس پر کہ لدی ہوئی کتابیں ہوں چند
سچ پوچھو گدھا اس سے کہیں بہتر ہے — اُسکو تو نہیں کتاب اُٹھانا بھی پسند

پوچھا جو گدھے سے کیوں ہے اے باہمّت — انسان کے لات مارنے کی تجھے لت
بولا مرا خون جوش میں آجاتا ہے — دیتے ہیں جو اس گدھے کو مجھ سے نسبت

خانصاحب شیخ محمد رفیق "شوکت" انصاری (بنداپ)

شاعر کا مقام

مدتیں گزریں علیگڑھ میں تھا جب میرا قیام
ایک دن مجھ سے ملا اک شاعرِ رنگیں کلام

گفتگو بہکی ہوئی نظریں پریشاں خستہ حال
دُبلے پتلے زرد چہرے سے عیاں حزن و ملال

اس کے ہر انداز سے تسکینِ دل مفقود تھی
سر کی ایرانی سیہ ٹوپی بھی خاک آلود تھی

اس نے جھیلی تھیں بہت سی زندگی کی سختیاں
سہہ چکا تھا حاسدوں کے دشمنی کی سختیاں

گھٹ رہا تھا دل میں ناآسودہ جوشِ انتقام
تلخیوں کے زہر سے لبریز تھا اُس کا کلام

لافِ خودبینی سے اُس کی شاعری معمور تھی
آشتی کے طرزِ خودداری سے کوسوں دور تھی

ہو رہا تھا گو مرا ذوقِ سماعت تلخ کام
دیر تک سنتا رہا میں غور سے اُس کا کلام

اُس کے ہر مصرعہ سے تھی بے جا تعلّی آشکار
زجر کے کانٹوں سے پُر تھی شعرِ رنگیں کی بہار

شاعری کے رس میں تھی کچھ تلخیٔ پندار بھی
خوشنما پھولوں میں شامل ہو گئے تھے خار بھی

سُن کے اُس شاعر کا یہ پُرخود غلط طرزِ سخن
دیکھ کر اس درجہ اس کو بے تکلف لاف زن

میں نے سوچا اب مرا خاموش رہنا کفر ہے
دل پہ ایسی شاعری کے جور سہنا کفر ہے

میں نے پھر بے باک ہو کر یوں کیا اُس سے خطاب
کیوں خفا ہے؟ کس لئے کھاتا ہے دل میں پیچ و تاب!

چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے کس لئے دل تنگ ہے؟
نغمۂ بیکار سے پائے سخن کیوں لنگ ہے؟

کیوں پھپھولے پھوڑتا ہے دل جلے اشعار میں؟
کیوں پھنسا ہے حاسدوں سے دائمی پیکار میں؟

عقل کا اس درجہ کچھ حالِ توازن غیر ہے
تو سمجھتا ہے کہ دنیا بھر کو تجھ سے بیر ہے

ہر وہ شاعر جو ہے ذرہ بھر بھی طینت کا دنی
تو نے اُس سے ٹھان رکھی ہے خیالی دشمنی،

کچھ تو یوں ہی ہو چلی تھی شعر کی تاثیر کم
اس پہ ڈھایا ہے تعلّی نے تری تازہ ستم

یہ تو سر تا سر ہے تیری کم نگاہی کی دلیل
اس سے روکھا پڑ چلا ہے شعر کا روئے جمیل

مُردنی چھانے لگی ہے چہرۂ تخئیل پر
بدنما پردے چڑھے ہیں فکر کی قندیل پر

شاعری تو نفس کی کیفیتوں کا عکس ہے
دل کی پُراسرار گہرائی کا سچا عکس ہے

روحِ شاعر اصلیت سے اسقدر نزدیک ہے
دل اگر تاریک ہے تو شاعری تاریک ہے

دل میں جب ہوتا ہے مہمل رنجشوں کا اژدحام
خود پرستی میں بدل جاتا ہے جوشِ انتقام

تو خدارا ذہن سے اس وہمِ باطل کو نکال
کام لے روشن دلی سے چھوڑ یہ مہمل خیال

چھوڑ دے سب و شتم کی پست منزل کا قیام
اس سے سو درجے بلندی پر ہے شاعر کا مقام

ذوقی

جلد ۱۱ (جملہ حقوق محفوظ) نمبر ۹۰

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ اس میں اشتہار دو

قیمت سالانہ بذریعہ وی پی مع محصول ہے۔ ممالک غیر سے ۸ شلنگ۔ فی پرچہ ۸ ر ویلر کمپنی بکسٹال پر ۶ ر

"ایجاد ہمارا حصہ ہے" ایڈیٹر: حکیم محمد یوسف حسن "اور تقلید دوسروں کا"

تعداد اشاعت ۵۲۵۰ تعداد اشاعت ۵۲۵۰

فہرست مضامین

دسمبر ۱۹۳۱ء

افسانہ نمبر کے دلچسپ افسانے

کریمی پریس لاہور بیرون شیرانوالہ گیٹ۔ باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر و پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور سے شائع کیا

شذرات

۱۹۳۱ء کا اختتام اور ۱۹۳۲ء کی ابتدا

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم دسمبر ۱۹۳۱ء کا نیرنگ خیال شائع کر رہے ہیں۔ جو اس کی اکیسویں جلد کو مکمل کرتا ہے۔ سال گذشتہ میں جو ہندوستان کی کاروباری دنیا میں کساد بازاری کا سال تھا۔ ہم نے حتی المقدور نیرنگ خیال کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ گذشتہ سال آمدنی کے دیگر صیغے جو نیرنگ خیال کی ترقی اور قیام میں مدد دیتے تھے سست رفتاری کا نمونہ بنے رہے۔ کیونکہ بک ڈپو اور دواخانہ کی بیشتر آمدنی بھی رسالہ پر ہی خرچ ہو جاتی ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے۔ کہ ہم نے جو وعدے اپنے ناظرین سے کئے تھے۔ انہیں پورا کرنے میں ہماری کوششیں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔ فلم نمبر۔ ادبائے قدیم کے طرز نگارش اور افسانہ نمبر ہم شائع کر چکے ہیں۔ اور پبلک نے انہیں بے حد پسند کیا ہے۔

۱۹۳۲ء کے خاص نمبر

اپنے اعلانات کے مطابق ابھی دو نمبر آئندہ سال میں شائع ہونے باقی ہیں۔ ایک عید نمبر جو حقیقی معنوں میں نیرنگ خیال کا خاص نمبر ہوتا ہے۔ یہ نمبر بہت ضخیم ہوگا۔ اس کی جداگانہ قیمت ایک روپیہ ہوتی ہے۔ مگر نیرنگ خیال کے خریداروں کو مفت ملتا ہے۔ اس کے بعد جون میں نگارش لطیف شائع ہوگا جس کے تمام تر مضامین عورتوں کے لکھے ہوئے ہوں گے۔ اس نمبر کے لئے بڑا اہتمام کیا جا رہا ہے اور ہم کوشش کر رہے ہیں۔ کہ یہ نمبر گذشتہ نمبروں پر سبقت لے جائے۔

ان دو خاص نمبروں کے علاوہ ہم سال آئندہ میں ایک تیسرا نمبر اور بھی شائع کریں گے۔ یہ وہی نمبر ہے جس کا گذشتہ سال سے ہم اعلان کر رہے تھے مگر حسب منشا مواد فراہم نہ ہو سکنے کے سبب ہم نے اسے شائع کرنے سے احتراز کیا۔ یہ اقبال نمبر ہوگا۔ ناظرین نیرنگ خیال کے سینکڑوں خطوط دفتر میں موصول ہو چکے ہیں۔ جس میں اس نمبر کا بار بار مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ الحمد للہ کہ اب ہم اپنے کو اس پوزیشن میں پاتے ہیں۔ کہ آئندہ سال اقبال نمبر نہایت تزک و احتشام سے شائع کر سکیں۔

اقبال نمبر کی خصوصیات نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے اقبال نمبر کے لئے جن مضمون نگاروں کو دعوت دی تھی۔ ان سے مضامین حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ انشاء اللہ اقبال نمبر میں آپ اہل قلم کی ایک نئی جماعت دیکھیں گے۔ جن کے مضامین ابھی تک نیرنگ خیال میں شائع نہیں ہوئے۔

اس طرح سے نیرنگ خیال کے تین خاص نمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوں گے۔ عید نمبر۔ نگارش لطیف اور اقبال نمبر۔ امید ہے کہ ناظرین نیرنگ خیال ان نمبروں کو پسند کریں گے۔ وہ خود بھی رسالہ کی خریداری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رکھیں گے۔ اور دیگر احباب کو توجہ دلا کر اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں گے تاکہ اردو علم ادب کی جو خدمت ہم نے شروع کر رکھی ہے۔ اس میں آپ کی امداد بھی شامل ہے۔

جنوری ۳۲ء سے نیرنگ خیال کی خوبیوں میں اضافہ

جنوری ۳۲ء سے نیرنگ خیال کی خوبیوں میں مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ سال گذشتہ میں تصاویر کے کبھی دو ورق ہوا کرتے تھے اور کبھی ایک جن پر ایک سے لے کر چار تصویریں شائع ہوتی تھیں (گو فلم نمبر میں ہم نے ۲۵ تصویریں شائع کی تھیں) لیکن اب انتظام کیا گیا ہے۔ کہ جنوری ۳۲ء سے نیرنگ خیال میں تصاویر کے تین ورق ہوں۔ ان اوراق کی تقسیم یوں کی جائے گی:۔

(۱) پہلی تصویر۔ رنگین۔ دو رنگ یا سہ رنگ یا چار رنگ۔ یہ تصویر عام طور پر آرٹ کی ہوگی۔

(۲) دوسرا ورق۔ پہلا حصہ شخصیات مشہور و معروف اہل قلم وغیرہ۔

(۳) " " دوسرا حصہ۔ آثار قدیمہ۔

(۳) تیسرا ورق - آرٹ کی تصاویر کا ایک صفحہ۔

(۴) " دوسرا حصہ - کارٹون، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ۔

بعض صفحوں پر دو تصویریں اور بعض پر چار بھی ہوں گی۔

اس طرح سے نیرنگ خیال کے ہر نمبر میں آرٹ کی تصویریں - قدیم مشہور عمارات کی تصویریں قدرتی مناظر کارٹون - مشہور عالم شخصیتیں - اور کبھی کبھی فلم کے متعلق بھی ایک صفحہ وقف کیا جائے گا - گویا ہر مذاق کے لئے نیرنگ خیال میں تصاویر کا اجتماع ہوگا - ہم نے تصاویر کا اس قدر مواد جمع کر لیا ہے - کہ ۱۹۳۲ء کے لئے پوری .. تصویریں ہمارے پاس مکمل موجود ہیں - اس کے علاوہ تصاویر کے متعلق مضامین کا بھی انتظام ہوگا تاکہ انکی اشاعت سے پبلک کو پورا پورا فائدہ پہنچے ۔

نیرنگ خیال کی صحیح اشاعت

نیرنگ خیال کی صحیح اشاعت جس کے ہم قانونی طور پر ذمہ وار ہیں نہ ہر رسالہ کے اوپر لکھی جاتی ہے - سال گذشتہ میں اشاعت پانچ ہزار سے بڑھ کر سوا پانچ ہزار ہوگئی ہے - اگر ہمارے بعض حساس معاونین جنہیں ڈاک خانہ کی دست برد کی وجہ سے رسالہ نہیں ملا ہم سے قطع تعلق نہ کر لیتے تو یہ اشاعت چھ ہزار سے تجاوز کر جاتی - لیکن پھر بھی خدا کا شکر ہے - کہ اس کساد بازاری کے زمانہ میں نیرنگ خیال نے نہ صرف اپنی اشاعت کو قائم رکھا ہے - بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوا ہے - اگر نیرنگ خیال کے معاونین چھوٹی چھوٹی شکایات سے قطع نظر کر لیا کریں اور ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ہماری دفتری غلطیوں سے ہمیں آگاہ کرتے رہیں تو شکایات بہت حد تک دور ہو سکتی ہیں - ہمارے دفتر کا قاعدہ ہے کہ رسالہ نہ پہنچنے کی شکایت موصول ہوتے ہی دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے - اس سے زیادہ ہم قربانی نہیں کر سکتے - اگر آپ نے دو پیسہ کا کارڈ لکھ کر دوبارہ رسالہ طلب کیا - تو آپ کو اس کا قلق ہوتا ہے لیکن کبھی اس کا بھی اندازہ کیا ہے کہ ہمیں آپ کے دو پیسہ کے جواب میں ۵؍ کا رسالہ دوبارہ بھیجنا پڑتا ہے ۔

ڈاک خانہ کی چوریوں اور ہماری فروگذاشتوں سے قطع نظر کیجئے - آپ کا تعاون ایک عظیم الشان کام میں امداد بہم پہنچاتا ہے - اس لئے جن احباب کو کسی قسم کی شکایت ہو - وہ اس کے رفع کرانے کے لئے ہمیں لکھیں لیکن رسالہ کی اشاعت اور ترقی میں کسی قسم کا روڑا نہ اٹکائیں - کیونکہ یہ قوم کی میراث ہے - ہندی کے رسائل پندرہ پندرہ ہزار تک چھپتے ہیں اور انکا چندہ تو دس روپیہ سالانہ ہے - مگر اردو کے شائقین تین چار روپے بھی سال بھر میں بہترین رسائل پر خرچ کرنے سے گھبراتے ہیں - اس پر بھی اگر اردو رسائل زندہ ہیں تو یہ معجزہ سے کم نہیں ۔

نیرنگ خیال کی اشاعت واقعی سوا پانچ ہزار ہے - بعض معاصرین غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں - کہ ہم غلط اندراج کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہ کامل صفائی کے ساتھ اپنی اشاعت بھی پانچ ہزار بنا دیتے ہیں - ہم ایسے معاصرین اور دروغ گو احباب کو چیلنج دیتے ہیں - کہ وہ نیرنگ خیال کی اشاعت سوا پانچ ہزار سے یا اس تعداد سے جو رسالہ کے اوپر درج ہو کم ثابت کر کے ایک ہزار روپیہ نقد انعام حاصل کر سکتے ہیں - ہم یہ جرمانہ "غلط نویسی" کے لئے ہر وقت برداشت کرنے کو تیار ہیں ۔

وی پی کا خرچ بڑھ گیا ہے

ڈاک خانہ کے نئے قواعد کی رو سے اب وی پی کا خرچ ۳؍ ہو گیا ہے - نیرنگ خیال کا وی پی سال بھر کے لئے معہ محصول ڈاک ہم تین روپیہ چھ آنہ میں بھیجا کرتے تھے - وہ آپ کو فیس منی آرڈر ملا کر ۴؍ میں ملا کرتا تھا - اب ہم وی پی ۴؍ کا بھیجتے ہیں جو ۹؍ میں آپ کو ملتا ہے بعض احباب کسی وجہ سے وی پی واپس کر دیتے ہیں - اور نہیں جانتے کہ وہ اس طرح سے دفتر کو قریباً ۸؍ کا نقصان پہنچا رہے ہیں - ہندوستانی انہیں بد اخلاقیوں کی وجہ سے دنیا میں ذلیل و رسوا ہیں - یورپ میں طلب کیا ہوا وی پی کبھی واپس نہیں کیا جاتا - اور رسائل و اخبارات کے چندے لوگ خود بخود وقت مقررہ پر منی آرڈر کر دیتے ہیں - اور اگر انہوں نے وی پی بھیجنے کی ممانعت نہ کر دی ہو تو وی پی آ جانے پر اسے وصول کرنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں - لیکن ہندوستان میں وی پی واپس کر دینا تو ایک معمولی کھیل ہے - لہٰذا کم از کم نیرنگ خیال کے معاونین کا اخلاق تو کسی تعلیم یافتہ مغربی سے کم نہ ہونا چاہئے ۔

سالنامہ نیرنگ خیال

نومبر اور دسمبر میں ہماری مصروفیت کی کوئی حد نہیں رہی - نیرنگ خیال کا سالنامہ - نیرنگ خیال کا افسانہ نمبر اور تاریخ

ریویو کا سالنامہ تین پرچے تیار ہو رہے ہیں۔ سالنامہ چند دن کے بعد آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کا دی پی عہ میں روانہ ہوگا۔ جو اٰ۔عہ میں آپ کو ملیگا۔ غیر خریداروں کو عہ میں بھیجا جائے گا۔ جو انہیں عہ میں ملے گا۔ تازیانہ ریویو کا سالنامہ نیرنگ خیال کے سالنامہ کے ایک ہفتہ بعد شائع ہوگا۔ الغرض مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ہم ہی جانتے ہیں۔

سالنامہ نیرنگ خیال ان احباب کی خدمت میں جنہوں نے گذشتہ سال سالنامہ وی پی طلب کیا تھا۔ یا جن احباب نے بعد میں اپنا نام رجسٹر کرایا ہے۔ وی پی بھیجا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ وہ وصول فرمائیں گے۔ جن احباب نے ابھی تک آرڈر نہیں دیا انہیں فی الفور توجہ کرنی چاہئے۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

نیرنگ خیال کے سائز کے متعلق ناظرین نیرنگ خیال سے استصواب

کیا پرانا سائز بہتر تھا یا موجودہ سائز مناسب ہے؟

نیرنگ خیال پہلے ۲۲×۲۹/۸ سائز پر شائع ہوتا تھا۔ جو ایک پسندیدہ سائز تھا۔ لیکن مغربی رسائل کی تقلید میں ہم نے اس کا سائز بڑھا کر ۱۸×۲۲/۴ کر دیا (یہ موجودہ سائز ہے) لیکن ۱۸×۲۲/۴ سائز پر رسالہ شائع کرنے کے بعد یہ سائز عام طور پر نا پسند کیا گیا ہے۔ اس وقت ملک کے مشہور و قیع رسائل اردو۔ ہندوستانی۔ ہمایوں۔ نگار۔ معارف۔ جامعہ سب کے سب یا تو ۲۲×۲۹/۸ پر شائع ہوتے ہیں یا اس سے بھی ذرا چھوٹے سائز ۲۰×۲۶/۸ پر۔ ذیل میں ہم ہر دو سائز کے متعلق صحیح صحیح حقائق پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین فیصلہ کر سکیں کہ کونسا سائز ہمارے لئے موزوں رہیگا۔

۱۸×۲۲/۴ موجودہ سائز

لمبائی پونے گیارہ انچ۔ چوڑائی آٹھ انچ

حجم۔ مضامین کے صفحات ۵۲

تصاویر:۔ دو ورق

رسالہ ڈاک میں بھیجتے وقت شکن ڈال کر بھیجا جاتا ہے۔ جس سے تمام تصاویر تباہ ہو جاتی ہیں۔

۵۲ صفحہ حجم ہونے کی وجہ سے رسالہ بڑا ہلکا پھلکا سا ہوتا ہے

۲۲×۲۹/۸ پہلا سائز

لمبائی پونے گیارہ انچ چوڑائی سات انچ

(صرف ایک انچ کم)

مضامین کے صفحات ۷۲۔

(پہلے ۶۰ صفحے شائع ہوا کرتے تھے۔ ہم انہیں یہ اضافہ کردینگے)

تصاویر کے تین اور کبھی چار ورق

رسالہ ڈاک میں بغیر شکن ڈالے لفافہ میں بند کر کے بھیجا جاتا ہے۔ جس سے تصویروں کی دلکشی میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔

۷۲ صفحہ حجم ہونے کی وجہ سے اور ٹائیٹل دبیز لگانے سے رسالہ وزنی اور خوبصورت ہوتا ہے۔ نیز ۷۲ صفحہ میں مضامین زیادہ آتے ہیں۔

ناظرین نیرنگ خیال مطلع فرمائیں کہ وہ کس سائز کو پسند کرتے ہیں

(جس سائز کے متعلق زیادہ رائیں دفتر میں موصول ہوئیں اس سائز پر جنوری کا پرچہ شائع کیا جائے گا)

مینیجر

افسانہ نمبر

مقدمہ

(از جناب پروفیسر محمد الدین صاحب تاثیر۔ ایم اے۔ اسلامیہ کالج لاہور)

نیرنگِ خیال کی جدت پسندی اب ایک افسانہ کہن ہو چکی ہے جس کی حکیم محمد یوسف حسن ہر سال تجدید کرتے رہتے ہیں۔ اردو رسائل پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں یگانگتِ خیال نہیں پائی جاتی۔ محض ایک معجون مرکب ہوتے ہیں جن میں ہر قسم کے اجزا ملے جلے ہوتے ہیں۔ لیکن ان خاص نمبروں کے ہوتے ہوئے یہ اعتراض زیادہ وقیع نہیں رہتا۔ انکے مضامین کی اپنی قدر و قیمت پر بحث ہوسکتی ہے۔ مگر یہ بات ناقابلِ انکار ہے۔ کہ اس قسم کے خاص نمبروں سے پبلک میں بہتر ذوقِ انتقاد پیدا ہونے کا امکان ہے۔

زیرِ نظر افسانہ نمبر بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ قصے کہانی کا رواج ہبوطِ آدم سے چلا آتا ہے۔ ادبی صورت میں انجیل کے افسانے۔ ہومر کے قصے غالباً قدیم ترین نمونے ہیں۔ برٹش میوزیم میں مصر کی دفن شدہ یادگاروں میں افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے سولہ سو برس پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان بھی کسی سے کم نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے ہر چیز کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ بدھ کی پیدائش کے متعلق "جاتکا" کہانیاں اس قدر مقبول ہوئیں کہ چھٹی صدی میں یونانیوں نے انکے تتبع میں لقمان کی کہانیاں طیار کیں۔ یونان سے یہ فن روم کے رہنے والوں میں آیا۔ اور انہوں نے تاریخ میں داخل کر دیا۔ یہاں تک کہ تاریخ محض افسانہ نویسی بنکر رہ گئی۔ اور آج صحیح تاریخ کے بانی بجا طور پر مسلمان تصور کئے جاتے ہیں۔ پہلے تاریخ اور قصے میں کم فرق تھا۔ یونانی ہیرو ڈوٹس اور رومن لوی کی کتب تواریخ اس پر شاہد ہیں۔

یورپ میں بحیثیتِ فن ابتدا اٹلی کے نامور مصنف بوکاچیو سے ہوئی ۱۳۴۸ء کی پلیگ کے موقع پر اس نے سو کہانیوں کا مجموعہ تیار کیا۔ جو بڑی حد تک عربی افسانوں کی مشہور کتاب "الف لیلہ" کا شرمندہ اثر ہے۔ عربوں میں افسانہ کا شوق دیر سے ہے۔ نویں صدی کی اصمعی کی کتاب عنترہ" آجتک شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کے ایک افسانہ کا ترجمہ بعنوان "صحرا کا لڑکا" نیرنگِ خیال میں شائع ہو چکا ہے۔ حریری کے افسانے زبانِ زدِ عوام ہیں۔ انکا مشہور ہیرو ابوالفتح اسکندری بھی نیرنگِ خیال ہی کے ذریعہ اردو میں متعارف ہو چکا ہے سعودی کی کتاب حقیقت نگاری کا نقش اولیں ہے۔ عربی اثر کی بدولت ایران میں فردوسی کا شاہنامہ لکھا گیا۔ اور اس میں ہر قسم کے قصے موجود ہیں۔ مگر ایشیا کی سب کتابوں سے زیادہ مقبول الف لیلہ ہوئی۔ غالباً یورپ اسے ایشیا سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دیکھتا کیوں نہ۔ یورپ نے افسانے کو کہ مشرق کا زائیدہ ہے۔ اس طرح اپنا بنا لیا۔ کہ اب سب اس لے پبلک کو مغرب نژاد سمجھتے ہیں۔ بوکاچیو کی کتاب کا اثر ہر ملک میں نظر آتا ہے۔ انگلستان میں شکسپیر اور اس سے پہلے چوسر نے اس کے افسانے "اپنائے"۔ افسانوں کے ملک فرانس میں ناوآر کی ملکہ نے ڈی کیمیرون کے انداز میں ہیپٹیمرن ... تصنیف کی مشرقی اثر افسانوں کے پلاٹ تک میں موجود ہے۔ بوکاچیو کی کتاب میں صلاح الدین ایوبی کے متعلق قصص ہیں۔ یہ ایشیا کا سایہ مغربی ادب میں اب تک نظر آتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں بیشتر مختصر افسانوں کے پلاٹ اور ماحول مشرقی ہوتا تھا۔ اخلاقی کہانیاں سب اس انداز میں تھیں۔ چنانچہ فرانس کے مشہور ادیب ارہوشل (۱۶۱۱-۱۷۱۳) کی کہانی سلیمانی ثمنی اس پر شاہد ہے اس کے تتبع میں والٹیئر۔ اڈیسن۔ اور جونسن نے بھی اسی انداز میں لکھا ہے۔

مگر یہ مختصر افسانے کسی خاص اصول کے ماتحت نہ لکھے گئے تھے۔ چلا چل چلا چل کی بات تھی۔ اختصار یگانگت۔ ایک اثری عموماً مفقود ہوتی تھی۔ زمانہ حاضرہ کا پہلا مختصر افسانہ فرانس کے ناول نویس بالزک نے لکھا ہے۔ انگریزی زبان میں اولیت کا سہرا امریکہ کے سر ہے۔ اولین نقش ارونگ اور پو کے ہیں۔ پو نے تو اس فن میں اقلیدسی تعین کو برتا ہے۔ ایک مقررہ اثر ایک متعین ماحول کو اس طرح تخلیق کرتا ہے۔ کہ آدمی اردگرد کی دنیا کو فراموش کر دیتا ہے۔ فرانس کا رومان نویس گوٹیا (۱۸۱۱-۱۸۷۲) بڑی حد تک پو سے متاثر ہے۔ دونوں ان ہونی باتوں کو روزمرہ کی ہونے والی باتوں سے زیادہ ٹھوس اور واقعی بنا دیتے ہیں۔

فرانس میں آکر مختصر افسانہ نویسی اپنی اعلیٰ معراج کو پہنچتی ہے۔ زولا (۱۹۰۳ء - ۱۸۴۰ء) حقیقت نگاری کو آخری حد تک لے جاتا ہے بہت سارولی سے باتیں کرنے والوں کی نگاہیں زمین کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ ثریا سے ثریٰ تک پہنچاتا ہے لیکن اس کشمکش میں وہ کیچڑ اچھالتا ہے۔ کہ لوگ حقیقت نگاری کے نام سے اکتا جاتے ہیں موپاساں (۱۸۹۳ء - ۱۸۵۰ء) عشق کو شہوت سے ملا دیتا ہے۔ غرض فرانسیسی ادیب انسان کی نفسیات کی تہوں تک جا پہنچتے ہیں اور تہ نشیں فواسد کو سطح پر لے آتے ہیں۔

فرانس سے یہ فن روس جا پہنچتا ہے اور ٹرجنیف (۱۸۸۳ - ۱۸۱۸) ٹالسٹائی (۱۹۱۰ - ۱۸۱۸) اور چیخوف (۱۹۰۴ - ۱۸۶۰) کے ہاتھوں دوبارہ زندگی پاتا ہے۔ اور بنی نوع انسان کی تضحیک کی بجائے ہمدردی کا آلہ بنتا ہے۔ روسی افسانوں میں ہمیشہ ایک مقصد ہوتا ہے۔ اصلاح حالات مد نظر ہوتی ہے۔ زندگی کی سر توڑ دوڑ میں کچلے جانے والوں کے لئے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ آج کل روسی اثر یورپ کے ادبیات میں جا بجا نظر آتا ہے۔ جرمنی کے مشہور افسانہ نویس مان اور زوایگ اور انگلستان کے دو صاحب طرز گولزورردی اور مینسفیلڈ روسی انداز کے متبع ہیں کپلنگ کی بے رحم حقیقت نگاری کا اثر محض امریکہ ہی میں رہ گیا ہے۔ وہ بھی عامیانہ میگزینوں میں۔

اب زمانہ حاضر میں مختصر افسانہ نویسی کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ حال ہے۔ کہ کئی نقاد ناول کی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ زمانہ بھاگ دوڑ کا ہے۔ عدیم الفرصتی کا ہے۔ ہر چہ گیرید مختصر گیرید کا ہے۔ لہٰذا مختصر افسانہ مقبول عام ہے لیکن ناول اپنی جگہ پر قائم ہے اور رہے گا۔ مختصر افسانہ ایک واقعہ ایک کردار ایک فضا کا ترجمان ہے۔ زندگی کے کسی ایک پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ناول زندگی کے مختلف پہلوؤں کا حامل ہے الجھی ہوئی بُنت رکھتا ہے۔ اور کردار و واقعات کی تدریج کا ترجمان ہے غرض جب تک زندگی قائم ہے۔ ناول اور مختصر افسانہ پہلو بہ پہلو قائم رہیں گے۔

(تاثیر)

ردھیا

مترجمہ منشی کنہیا لال ایم اے - ایل ایل بی ایڈووکیٹ ایڈیٹر "چاند" الہ آباد

(۱)

پوس کا جاڑا تھا - چاروں طرف اندھیرا تھا - کہرے کے دھندلے پردے میں آسمان چھپا ہوا تھا - گنگا کے اس پار بادلوں کی ایک بستی دکھلائی پڑتی تھی - چاند رجنی کے محبت کے آنچل میں دبک کر سو رہا تھا۔

گنگا کے کنارے درختوں کے نیچے سینکڑوں بھکاری ٹھٹھر کر گٹھری بنے پڑے تھے - ان میں کوئی لنگڑا تھا - کوئی لولا یا کوئی اندھا تھا - اور کوئی ایسا کہ جس کے پاؤں دونوں بیکار رہا کوئی سردی سے کانپ رہا تھا - اور کوئی دمہ سے پریشان یا کسی کو بخار تھا - تو کسی کے پیٹ میں درد کہیں سے "آہ - آہ" سنائی پڑتی تھی - اور کہیں سے ہاہاکار - یہاں پر دکھی آدمیوں کا پورا دل موجود تھا۔

گنگا کنارے محل ایسے بنے تھے جو آسمان سے باتیں کریں - جن میں امیر اور خوشحال آرام کر رہے تھے - کہیں سے ستار کی میٹھی جھنکار آ رہی تھی اور کہیں پیانو اور ہارمونیم کی سریلی تان - کہیں کہیں سے بانسری کی جادو بھری پھونک سننے والوں میں گدگدی پیدا کر دیتی تھی - - -

وہیں ایک بوڑھی عورت ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی لڑکی کے ساتھ پڑی ہوئی تھی - چیتھڑے ہی اس کے اوڑھنے اور بچھونے تھے - بوڑھی اندھی تھی - لڑکی یہی اس کی تمام زندگی کا سہارا تھا - اور وہی اس کی زندگی کی "ہیرا" "موتی" تھی۔

بوڑھی نے کہا "ردھیا تجھے نیند نہیں آتی کیا؟ جاڑا لگتا ہے؟ آ، میرے کلیجے سے لگ کر سو جا"

ردھیا نے کہا "نہیں نانی! جاڑا تو نہیں معلوم ہوتا - ایک بات ہے آج مجھے چار پیسے ایک ساتھ ہی مل گئے تھے!"

"کیسے بچی؟"

"آج ایک راجا گنگا نہانے آئے تھے - ان کے ساتھ رانی بھی تھیں - وہ بہت سے سونے کے گہنے پہنے تھیں - انہیں کے نوکر نے مجھے چار پیسے دیئے - اچھا نانی! ایک بات بتاؤ گی؟"

"کیا بات ہے بچی؟"

"رانی کو اتنا گہنا کہاں سے ملا نانی؟"

"انہیں ایشور نے دیا ہے بیٹی!"

"تو ایشور ہم لوگوں کو کیوں نہیں دیتا نانی؟"

"ایشور غریبوں کو نہیں دیتا"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ پھر تو سنسار بھر دھنی (امیر) ہو جائے گا - تب نہ غریب رہیں گے اور نہ کوئی امیر"

ردھیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا - وہ بار بار یہی سوچتی تھی - کہ رانی کے گہنے اچھے اور چمکتے ہوئے کیوں تھے؟

بوڑھی نے کہا "بیٹی اب سو جا - رات بہت گئی!"

(۲)

ردھیا جب چھ برس کی تھی - تبھی اس کی ماں اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی تھی - بوڑھی نے بہت تکلیفیں جھیل کر اسے پالا اور اتنا بڑا کیا - جب وہ بھیک مانگنے جاتی تو ساتھ ردھیا کو بھی لے جاتی تھی ---- ردھیا اندھی کے ہاتھ کی لکڑی تھی - اسے پاکر بوڑھی اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھتی تھی - ردھیا دن دن بڑھتی ہی جاتی تھی

* * * *

بوڑھی اب بالکل لاغر ہو گئی تھی - اب وہ بھیک مانگنے بھی نہیں جاتی تھی اس کے لئے چلنا پھرنا محال تھا - ردھیا جو کچھ مانگ کر لاتی - اسی میں دونوں کا گذر ہوتا تھا - وہ دن بھر کی کہانی بڑے پریم سے نانی کو سناتی تھی - ایک بچے کو اپنے کھلونے سے جتنا پیار ہوتا ہے - اس سے کہیں زیادہ ردھیا کو اپنی بوڑھی نانی سے محبت تھی

(۳)

بہت دن گزر گئے

ردھیا اب سیانی ہو گئی تھی -

ایک دن اس نے دیکھا - کہ بوڑھی کے لاغر جسم سے چنگاری سی نکل رہی تھی - اسے سخت تیز بخار تھا - اور وہ رہ رہ کر کراہ رہی تھی

بڑھیا نے کہا: "نانی یہ بخار تو توے کی آنچ سے بھی زیادہ ہوتا جا رہا ہے اچھا جاتی ہوں — دیکھوں کہیں دودھ کے لئے چار پیسے مل جائیں ——"

* * * * * * *

بڑھیا دن بھر رستوں میں بھٹکتی رہی۔ اسے کہیں کچھ نہ ملا۔ اسے جو ملتا کہتا: "ہُش! اتنی بڑی لڑکی ہو کر بھیک مانگتی ہے! ایشور نے ہاتھ پیر دئے ہیں۔ جا کہیں نوکری کرے۔"

کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو اس پر پھبتی کہنے لگتے۔

آخر میں بیچاری نا امید ہو کر واپس چلی آئی۔ اب اسے بھیک مانگنے میں شرم آتی تھی۔

بڑھی نے ٹوٹے پھوٹے الفاظوں میں کہا: "بیٹی آج کیا ملا؟"

"کچھ بھی نہیں ملا۔ نانی! لوگ کہتے ہیں۔ کہ اتنی بڑی لڑکی ہو کر بھیک مانگتی ہے! جا نوکری کر لے۔"

"بوڑھی نے آنکھ بند کرتے ہوئے کہا: "ہاں بیٹی۔ تو نوکری کر لے میں بھی جاتی ہوں۔ میری نوکری پوری ہو گئی!"

"کہاں نانی؟"

"یہاں کی نوکری سے طبیعت بھر گئی۔ وہاں کی نوکری کرنے جاتی ہوں!"

روھیلا کے سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

اس نے کئی مرتبہ پوچھا: "کہاں نانی؟" مگر اسے کچھ جواب نہ ملا۔

تولیکا

نقد و نظر

جدید طبی کتب

مطبوعات دار الکتب سلیمانی } حکیم مولوی محمد عبداللہ صاحب مصنف کتب طبیہ نے چند نہایت مفید رسائل لکھے ہیں۔ جن میں ہندوستان کی بعض مشہور پیداوار کے طبی خواص اور استعمال درج کئے ہیں۔ ذیل میں ان کتابوں کے نام اور قیمتیں درج ہیں۔ ناظرین نیرنگ خیال طلب فرما کر فائدہ اٹھائیں۔

خواص کیکر حجم ۳۲ صفحہ ۴ر خواص آک حجم ۱۳۴ صفحہ ۱۲ر خواص انار حجم ۴۲ صفحہ ۲ر خواص پیاز حجم ۴۰ صفحہ ۵ر
خواص گھی کوار " ۷۲ " ۹ر خواص نیم " ۵۶ " ۶ر خواص پیپل " ۳۲ " ۴ر خواص " ۴۸ " ۶ر
خواص ستیاناسی " ۴۲ " ۵ر خواص نمک " ۱۲ " ۲ر خواص برگد " ۳۲ " ۴ر خواص پھٹکڑی " ۱۲۶ " ۱۲ر
خواص سونف " ۶۴ " ۸ر۔ کنز المجربات۔ اس میں ہر مرض کے متعلق نہایت مفید اور مجرب نسخہ جات درج ہیں حجم ۳۵۰ صفحہ قیمت ۱۲ر

دار الکتب سلیمانی روڑی۔ ضلع حصار پنجاب سے طلب فرمائیں۔

لیڈی ڈاکٹر پنڈتہ ستیہ وتی شاستری۔ ایم۔ ایس سی او۔ ایم ڈی ایچ امریکہ کی تصنیفات

رحم کی بیماریاں اور ان کا علاج حجم ۱۶۲ صفحہ قیمت ۱۲ر حیض کی بیماریاں اور ان کا علاج حجم ۱۰۶ صفحہ قیمت ۱۲ر
لیکوریا یعنی سیلان " ۶۴ " ۸ر گربھ دگیان یعنی فلسفہ حمل " ۲۴۶ " ۱۲ر

مینیجر رسالہ لیڈی ڈاکٹر امرتسر سے طلب فرمائیے

نقش برآب

حضرت حنیف ہاشمی مرحوم کا آخری افسانہ

بادل گرجا۔ بجلی کڑک کڑک کر چمک رہی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ گویا اس نے درختوں کو اکھاڑ دینے کا عزم کر لیا تھا اور اکھاڑ دینا ہی چاہتا تھا۔ ایک موٹی سی بوند بادلوں سے قرطاس پر پڑی۔

بوڑھے پروفیسر صاحب نے سر اٹھایا۔ اس نے بادلوں کو دیکھا۔ باریک بادلوں کو جو مختصر سے عرصے میں آسمان کی وسعتوں پر چھا گئے تھے۔ اس نے ان پر تھکی ہوئی نگاہ ڈالی جو بہت دور سے اور بہت گہرائیوں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سر کی ایک خفیف سی حرکت کے ساتھ اس نے درختوں کو دیکھا۔ ہوٹل کے باغیچہ کی روش کے کنارے کے درخت جھوم رہے تھے۔ ہوا سے دست و گریباں تھے۔ ان کی شاخیں سنسناٹے سے لہلہاتی تھیں۔ بدمست میخواروں کی طرح مخمور اور نشہ میں چور اور ان کے زرد اور پژمردہ پتے بلندی سے فضا میں ایک آہوانہ رقص کرتے آتے اور سبزہ اور سرخ بجری کی روش پر گرتے۔

ہوا کا ایک اور جھونکا اور اس کے ساتھ بارش کا ایک چھینٹا۔ پروفیسر نے حسرت آمیز نگاہوں سے قرطاس تصویر کو دیکھا۔ بوندوں نے گر کر مختلف رنگوں کو مخلوط کر دیا تھا اور وہ تصویر ایک نوخیز لڑکی کا بڑی آنکھوں والا حسرتناک چہرہ خراب ہو گیا۔ پروفیسر نے تصویر پر نگاہ جمائی پانی اس کے اوپر برس رہا تھا۔ وہ بھیگ رہا تھا۔ وہ بھیگ چکا تھا۔ اس نے ایک آرزو داغ شدہ تمنا لئے ہوئے تصویر کو دیکھا اور ایک سرد اور حرماں انگیز آہ کے ساتھ قلم ہاتھ سے روک دیا۔ وہ اپنے سفید سر کو اپنے چوڑے چوڑے ہاتھوں میں لئے کہنیاں گھٹنوں پر رکھے بیٹھا رہا۔ وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کب تک بیٹھا رہیگا۔ اور حسرت و اندوہ کے ساتھ اس پیکر حسرت اور اس راز سربستہ کے موہوم خط و خال کو دیکھتا رہے گا۔ جو اس کی متخیلہ کی تخلیق تھا۔

ہمیشہ یہی ہوا تھا۔ وہ تصویر بنانا چاہتا تھا حسین چہرے کی ایک نوخیز لڑکی کی تصویر جس کے سر کے بال پریشان تھے۔ جس کی آنکھوں میں غیر ارضی سوز و گداز تھا۔ وہ رحم انگیز المناکیاں اس کی نگاہیں بوڑھا پروفیسر فراموش نہ کر سکتا تھا۔ ان میں اسے حرماں نصیبی کی ابدیتیں نظر آتی تھیں۔ اس کی نگاہیں حزن مجسم تھیں۔ اس کے آرزو انگیز ہونٹ لب خشک تھے خشک اور زرد۔ اس کا چہرہ حسین تو تھا لاثانی طور پر حسین لیکن اس پر حسرت و یاس کی ملمع تھی۔ اس کی نگاہوں میں جوانی کی امنگیں تھیں لیکن درماندہ۔ وہ ایک شگفتہ پھول تھی لیکن گرم ہوا نے اسے کمھلا دیا تھا۔ یہ چہرہ تھا جس کی تصویر پروفیسر بنانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اسے یاد نہ تھا۔ اس نے یہ المناک چہرہ کہاں دیکھا ہے۔ یہ نشتر شکستہ اس کے دل میں کہاں سے پیوست ہوا ہے لیکن یہ اس کے خوابوں کی مملکت میں آباد رہا تھا اور پروفیسر اپنی خیال کی دنیا نذر قرطاس کرنا چاہتا تھا کتنی بار اس نے اس امر کی کوشش کی تھی۔ کتنی بار اس نے چاہا تھا کہ اس حسرت نصیب حسینہ کی پریشانی کو خطوط رنگین کا جامہ پہنا دے لیکن وہ ناکام رہا تھا۔ تصویر مکمل نہ ہوئی۔ وہ کہتا "بس اب چند خطوط باقی ہیں اور میرا خیال مجسم ہو جائے گا"۔

لیکن اس وقت کوئی اتفاقی واقعہ ہوتا۔ اور تصویر پھر محو ہو جاتی۔ آرٹسٹ کا کام تخلیق ہے۔ وہ خالق ہوتا ہے ان جذبات کا جو اس کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کے لئے عظیم نعمت سماوی یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ پتھر کے کسی تراشیدہ ٹکڑے میں برش کے ایک حیات آفریں لمس اور الفاظ کی سحر کار ترکیب سے۔

اور پروفیسر کی روح بھی ایک آرٹسٹ کی روح تھی۔ وہ بھی اسی اظہار کے لئے بیتاب تھی۔ وہ اس تابناک خیال کو نذر قرطاس کرنا چاہتی تھی۔ غم و الم کی اس ابدیت اور اس لامحدود حسرت کو جو اس کے دل میں جاگزیں تھی جو اب اس کے دل میں بسی تھی ——— لیکن وہ ناکام رہتا تھا۔ وہ ایک حسرتناک چہرہ سراپا درماندگی اور حزن مجسم دیکھتا تھا۔ ہر جگہ دیکھتا تھا۔ ہوٹل کے بڑے کمرہ میں جہاں ہر قومیت کے مہمان شرکت طعام کے لئے جمع ہوتے وہ اس چہرہ کو دیکھتا۔ یہ سراپا الم چہرہ۔ آہ پژمردہ جواں چہرہ! حسرت نصیبوں کا پیکر! سے حسین و جمیل

عورتوں کے درمیان نظر آتا۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر رحم انگیز نگاہوں کے ساتھ دیکھتا۔ یہ چہرہ اسے ہوٹل کے باغیچہ کی روش پر ٹہلتا نظر آتا تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں حنائی روش کے کنارے خراماں ہوتا۔ یوکلپٹس کے کسی بلند قامت درخت کے سایہ میں شام کی کہر میں غائب ہو جاتا۔ تاریکی میں اس کے پریشاں بال فضائے بعید میں لہراتے اور وہ آہستہ آہستہ تحلیل ہو جاتا۔

پروفیسر نہ جانتا تھا وہ کب سے وہاں بیٹھا ہے۔ وہ بھیگ چکا تھا۔ اس کے سر کے سفید بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اس کے روبرو حسرتناک آنکھیں تھیں اور گہری دھند بارش زور کی ہو رہی تھی۔ درخت سائیں سائیں کرتے تھے اور حنائی روش کی سرخ بجری بہتی جا رہی تھی۔ درخت دھندلے نظر آتے تھے اور سڑک کا راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہرچا طرف ایک دھواں چھا رہا تھا۔

پروفیسر قرطاس بارش میں چھوڑ کر آہستہ سے اٹھا اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ سر جھکائے ہوئے ہوٹل کے بلاک کی طرف چلا۔ وہ جا رہا تھا۔ سرنگوں اور حسرت و یاس کا پیکر بنا۔ بیچارگی اور ناکامرانی کا مجسمہ ہر ایک قدم ایک خاص وقفہ کے بعد اٹھتا۔ نہایت مشکل کے ساتھ بہ ہزار دشواری اور پھر بجری کی سرخ سڑک پر پڑتا۔ گراں باری کے ساتھ اور اس مختصر وقفہ میں اس پر المناکیوں کی بے شمار ابدیتیں بیت جاتیں۔ جن کو وہ صرف جانتا تھا۔ لیکن وہ اس غم ——— اس عظیم الشان غم کے اظہار سے قاصر تھا۔ جو خدا جانے کہاں سے اس کے دل میں اٹھا تھا اور کیوں اس نے ایک حزیں و مایوس نوخیز لڑکی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک نوخیز لڑکی کے سراپا کو غم سے کیا مناسبت ہو سکتی۔ سنگ تراشوں نے بھی غم کے مجسمے بنائے تھے۔ پیکر نگاروں نے غم کا تصور نذر قرطاس کیا تھا۔ لیکن وہ ایک نوخیز اور حسین کا سنگیں مجسمہ یا پیکر لطافت نہیں تھا۔ وہ شباب کا حامل نہیں تھا۔ اس کا چہرہ حسین نہیں تھا۔ حسین ہو بھی کیسے سکتا تھا غم کا چہرہ بھیانک ہے۔ دہشتناک طور پر بھیانک اور کریہہ۔ پروفیسر حیران تھا۔ کہ اس غم کا تصور اس قدر حسین کیوں ہے اور کیا یہی حسن اس کے اظہار میں مانع نہیں لیکن اگر اس کی روح میں حسن ہے اگر اس کی زندگی کے ارباب کے تاروں میں غم کا ارتعاش ہے تو وہ ایک ترانہ مسرت نہ سہی۔ درد و کرب کی ایک چیخ تو پیدا کر سکتا ہے۔

وہ حنائی روش پہ سے ہوتا ہوا پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا چلا گیا۔ نرگس اور ولایتی بنفشہ کے پھولوں کے کئی پھول پامال ہو گئے اور اسے احساس بھی نہ ہوا۔ وہ انہیں پامال کرتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ بلاک کی سنگین زمینوں سے غلام گردش میں اور پیچدار آہنی سیڑھیوں سے دوسری منزل پر گیا۔ اس کے کپڑوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور ہوٹل کے سنگین فرش پر ان کا نشان پڑ رہا تھا۔ وہ آہنی زینوں سے چڑھ کر دروازے کے سامنے گزرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ خاموش اور سرنگوں اور اسی طرح پیکر یاس بنا ہوا۔ خیالات میں مستغرق چلا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گویا وہ موت کی سزا کے لئے جا رہا ہے اور مرتے دم سکون قلب کو برباد کرنا نہیں چاہتا آخرکار وہ ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس نے مڑ کر باہر کی جانب دیکھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی اور ہوا کا سناٹا۔ خدا کی پناہ وہ درختوں میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بجلی کڑکتی تھی۔ ایسی تیزی اور ایسی تندی اور خیرہ کن چمک کے ساتھ۔ اور ہوٹل کے باغیچہ کے درخت بیچارگی سے جھوم رہے تھے۔ ہری ہری گھاس پانی میں چھپ گئی تھی اور سڑک کی بجری بہی جا رہی تھی۔

پروفیسر نے غیر شعوری طور پر دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ایک حسین لڑکی کا شاداب چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے پروفیسر کو رحم آمیز متبسم نگاہوں سے دیکھا اور اندر آنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ پروفیسر نے کہا۔

"میری بچی ——— ناہنجار بارش نے تصویر خراب کر دی!"

(وہ خواب میں گفتگو کرتا معلوم ہوتا تھا)

"آہ! ——— صرف خطوط باقی ہوں گے!"

"ہاں ——— میری بچی ورنہ تم دیکھتیں یہ مجسم حسرت نصیب کی شاہکار ہوتی لاثانی اور ابدی"۔ پھر اس نے کہا گویا کسی غیر مرئی مخلوق سے گفتگو کر رہا ہے۔

"یہ حزن مجسم نوخیز لڑکی کون ہے۔ میں نہیں جانتا۔ مجھے یاد نہیں میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ لیکن اس کی نگاہیں۔ وہ نگاہیں جو میں تصویر میں دیکھتا ہوں اور اس وقت بھی جب وہ قرطاس پر مٹی ہوئی ہیں مجھ سے کوئی رازبیان کرنا چاہتی ہیں۔ شاید زندگی کا راز جس سے میں اپنی ہمہ دانی اور تبحر علمی کے باوجود محروم رہا۔ یا کوئی داستاں ہے ماضی کی۔ کیونکہ وہ میرے پاس بچپن کی بھولی ہوئی پکار کی مانند آتی ہیں اور مجھے فوراً احساس ہوتا ہے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ صرف دیکھا ہی نہیں اس کے خیالات کی گہرائیوں میں بھی اتر گیا اور کھویا رہا ہوں لیکن کب؟ یہ مجھے یاد نہیں"۔

یہاں لڑکی نے اس کے خیالات کے سلسلہ کو منقطع کیا۔

"ہر حسین و جمیل شے کے متعلق ہمیں گمان ہوتا ہے کہ ہم اسے پیشتر کہیں دیکھ چکے ہیں کسی گذشتہ زندگی میں"۔

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے پروفیسر کا گیلا کوٹ اتارتے ہوئے کہا:۔

"محسوس ہوتا ہے ہم نے اسے کسی گذشتہ زندگی میں دیکھا ہے۔ کیا یہ حرماں نصیب نوخیز لڑکی کسی گذشتہ زندگی کا سایہ نہیں؟"

لیکن پروفیسر اپنے خیالات میں کھویا رہا۔ اسے احساس ہی نہ تھا لڑکی نے کیا کہا ہے۔

"مجھے یاد نہیں میں نے اسے کب دیکھا ہے لیکن میں اس راز سے آشنا ہوں جو وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہے وہ راز کیا ہے۔ کیا ہے وہ حدیث الم اور روداد آرزو میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ نہیں میں قدرت نہیں رکھتا۔ میں الفاظ تلاش کرتا ہوں اور ناکام رہتا ہوں لیکن وہ راز وہاں ہے۔ اس کی نگاہوں میں موجود ہے۔ وہ افسردگی و یاس کے لباس میں ملبوس ہے۔ اس کی کشادہ پیشانی کی ویرانی اور زندگی بخش ہونٹوں کی پژمردگی میں۔ ستے ہوئے حسین چہرہ اور پریشاں بالوں کی برہمی میں اور میں اسی پژمردگی اور ویرانی کا شاکی ہوں۔ اسی سے مجھے شکوہ ہے۔ مجھے گلہ ہے تو اسی بے سروسامانی کا کہ یہی میری قوت متخیلہ کو بے بس کر دیتی ہیں۔ میری قوت تخلیق ناکارہ ہو جاتی ہے۔ مجھ پر تمام تر وہی جذبات طاری ہو جاتے ہیں اور میں اپنے گرد قوس قزح کے رنگوں کی ایک دھند محسوس کرتا ہوں جو بیکار کر دیتی ہے میرے حواس کو میرے قلب و جگر کو خرد و ہوش کو۔

ایک نادر کار آرٹسٹ ایک خانی نغمہ موسیقار مغنی۔ ایک سحر کار شاعر اور ایک نوآموز میں غالباً یہی امتیاز ہے۔ آرٹسٹ ایک ایسے عریاں پیکر حسن کو نذر قرطاس کرتا ہے جو دیکھنے والے کے جذبات میں ایک ہنگامہ برپا کر دے طوفان اور آندھیاں لے آئے۔ لیکن آرٹسٹ کا دل سکون کا گہوارہ ہی رہے۔ مغنی اپنے رقت انگیز اور جگر گداز نغموں سے بے پناہ انسان سے زندگی اور موت کے حدود کو ایک کر دیتا ہے اور تمام کائنات اس لمحہ ایک "نغمہ" بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن مغنی خود ——— وہ اپنے تئیں فراموش نہیں کرتا اور شاعر باد صبا کے مانند گلستاں میں پھر تا گلوں کو رنگ و بو بخشتا ہے۔ جذبات کا طوفان

اٹھاتا ہے یاس و حرماں کی تصویر کھینچتا ہے کہ پڑھنے والا زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے لیکن وہ زندہ رہتا ہے۔ دنیا کو ترک کرنے کا کبھی اسے خیال نہیں آتا۔ لیکن میں ہوں کہ جذبات کے وفور سے مجبور ہوں تخلیق سے قاصر ہوں۔ میں جسے زندگی سے کوئی شے وابستہ نہیں کر سکتی۔ کوئی رشتہ نہیں کہ مجھے دنیا سے منسلک کرے"

نوجواں لڑکی نے گھنٹی بجائی۔ ایک یورپین لڑکی آئی اور چاء کا آرڈر لے کر چلی گئی۔ لڑکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ضخیم کتاب اٹھائی اور اس کے اوراق الٹنے پلٹنے لگی۔

"کیا ہے میری بچی؟"

"یہ کتاب ابا نے بھیجی ہے۔ پروفیسر آپ اپنی تصنیف مکمل کیوں نہیں کرتے"۔ لڑکی نے سادگی سے کہا۔

لڑکی حسین تھی۔ سفید ساری میں ملبوس۔ بوڑھیوں کا سا لباس اور بال ہندوستانی وضع پر آراستہ۔ مشرق و مغرب کے مخلوط تمدن کا ایک پیکر۔ انداز میں مغربی بے تکلفی۔ نگاہوں میں مشرقی حیا۔ الفاظ میں مغربی سادگی۔ انداز گفتگو میں ایشیائی متانت و تفکر سادگی اور معصومیت

یورپین لڑکی چاء لے کر آئی۔

"حمرا ——— مجھے سردی محسوس ہوتی ہے میری بچی"۔

"غریب پروفیسر"۔ لڑکی نے کتاب رکھ دی اور ترے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

پروفیسر نے چاء کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"حمرا ——— تمہیں آئندہ ماہ جہاز پر سوار ہو جانا چاہئے"۔

"آئندہ مہینے ——— ہاں پاسپورٹ آ چکا ہے"۔

"جرمنی؟"

"ہائڈل برگ"

"تم تنہا ہو گی حمرا؟"

"ابا نے کہا ہے پروفیسر تمہارے ساتھ ہوں گے"۔

"ہاں کیا رکھا ہے میرا ہندوستان میں"!

"پروفیسر تمہارا کوئی نہیں؟"

"نہیں"!

"کوئی دوست؟"

"نہیں"

"بیوی ؟"

"نہیں ——— میری بچی !"

"پروفیسر تم نے کبھی محبت نہیں کی" حمرا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"مجھے یاد نہیں ——— میری بچی"

"تو ——— پروفیسر تم میرے پاس رہو گے ہمیشہ ؟"

"حمرا ——— میں چند روز کا مہمان ہوں"۔

"نہیں تم وعدہ کرو!"

"کیا"

"تم میرے پاس رہو گے"۔

"تم بھول جاؤ گی مجھے میری بچی!"

"غلط"

"حمرا وقت آئے گا کہ تم بے پروا ہو جاؤ گی مجھ سے"۔

"نہیں، میں کبھی بے پروا نہیں ہوں گی"۔

"ایک شخص آکر تمہارے خیالات کا مالک ہو جائے گا۔ اور تم مجھے فراموش کر دو گی حمرا"۔

حمرا شرما گئی۔

"یہ تم کس کی تصویر بنانا چاہتے ہو؟"

"ماضی کی تصویر میری ننھی بلبل"۔

"ماضی کی تصویر ——— شباب رفتہ کا تصور؟"

"نہیں - ویران و برباد گشتہ زندگی - وہ افسانہ جس کا مجھے کوئی ٹکڑا یاد نہیں"۔

"یہ کوئی عورت تھی"؟

"میرا خیال ہے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے"۔

"کہاں دیکھا ہے"۔

"یہ مجھے یاد نہیں"۔

"ابا کہتے ہیں تم دس سال سے یہ تصویر بنانا چاہتے ہو"۔

"ہاں ——— لیکن نہیں بنا سکا"

"کیا یہ تمہارے واہمہ کی تخلیق ہے"۔

"نہیں - میں نے اسے کہیں دیکھا ہے ضرور"۔

پروفیسر چائے ختم کر چکا تھا۔ گھنٹی بجی، یورپین لڑکی اندر داخل ہوئی ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ تھکا ماندہ اور پروفیسر کو آسمان دکھائی دیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر برآمدہ میں آگیا اور ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ جنوب کی جانب بادل پھٹ چکے تھے اور سیاہی مائل نیلگوں آسمان کی سطح لارنس گارڈن کے گھنے اشجار پر نظر آ رہی تھی۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور درختوں پر تاریکی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ یوکلپٹس کے درخت کے پاس جہاں پروفیسر کا قرطاس تصویر پڑا تھا کوئی کھڑا تھا۔ وہ ایک عورت کا سراپا تھا۔ ارغوانی سمور کا ایک کوٹ پہنے سر پر نیلگوں ساری کا آنچل۔ حنا کے پودہ کا ساقد لیکن چہرہ تصویر کی جانب۔ تصویر کے موہوم خد و خال میں کھویا ہوا۔

اس نے ہوٹل کی طرف نگاہ کی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہے اور پروفیسر نے اس کے چہرہ کو دیکھ لیا ایک موہوم سی جھلک۔

"یہ وہی ہے!" اس کے منہ سے نکلا اور وہ دیوانہ وار سبزہ زار کی جانب جھپٹا بیتابانہ پختہ سنگیں زینوں کو جلدی سے عبور کرتا۔ پھولوں کی کیاریوں کو روندتا۔ بجری کی سڑک پر بے تحاشا بھاگتا سیدھا یوکلپٹس کے درخت کی طرف اس کی سانس پھول گئی تھی۔

ہوا کا جھونکا آیا۔ درختوں کی شاخوں سے سائیں سائیں کی آواز پیدا ہوئی۔ عورت نے مڑ کر دیکھا۔

"ہاں یہ وہی ہے وہی آنکھیں وہی حسرت و مایوسی - وہی حسن بے پناہ اور نگاہوں میں وہی غم یہ وہی ہے وہی نا ہنجار۔ جس نے مجھے پریشاں کر رکھا ہے۔ جس نے نذر قرطاس ہونے سے بغاوت کی مسلسل بغاوت اور میرے سکون کو تباہ کر دیا ——— لیکن یہ کون ہے یہ حسین جہنمی مخلوق - وہ مجھ سے کیا راز کہنا چاہتی ہے - کیا غم ہے جس کا وہ مجھے امانت دار بنانا چاہتی ہے - کیا وہ مجھ سے بیان کر دے گی - اب جبکہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے - جبکہ میں جان گیا ہوں - وہ ایک واہمہ یا فریب نہیں - ایک حقیقت ہے - ایک مجسم حقیقت ایک انسانی مخلوق - اسی یاس و حرماں کی حامل - اسی حسرت پرستی کی پیکر۔

عورت نے پروفیسر کو ڈری سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ قرطاس پر آنکھوں کو دیکھ رہی تھی - جو بارش سے محفوظ تھیں - اور ان میں اپنی روح کو عکس نما پاتی تھی - لیکن اب وہ حیران تھی یہ معمر شخص کون ہے وہ اس کی طرف دانت پیستا چلا آ رہا ہے - ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے ہوئے ہے - اس کے سر کے سیاہ و سفید بال پریشاں ہیں - داڑھی کے بال بھی برہم ہیں - آنکھوں میں ایک دہشت ہے - خونخواری شیطان کا سا ایک عزم۔

پروفیسر قریب آتا جا رہا تھا اور وہ سہمی جا رہی تھی۔ کانپ رہی تھی۔ وہ کسی اور جانب نہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ پروفیسر کی آتش ریز نگاہوں کو دیکھ رہی تھی اور کانپ رہی تھی اور پروفیسر اب آہستہ آہستہ بڑھا چلا آ رہا تھا وہ اس کے قریب آگیا۔ اس قدر قریب کہ وہ اس کے تیز تیز تنفس کی آواز سن سکتی تھی۔ اسے اپنے چہرہ پر محسوس کرتی تھی وہ بے بس تھی اور پروفیسر کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کا حلق خشک تھا وہ کانپ رہی تھی اور پروفیسر قریب آتا رہا۔ اب وہ اس کے دل کی حرکات سن سکتی تھی وہ مسحور ہو گئی تھی۔ پروفیسر کے چنگل اسکی لمبی لمبی انگلیوں والے وحشیانہ ہاتھ اس کے شانوں پر تھے۔ وہ انہیں پکڑ کر جھنجوڑ رہے تھے۔ انہیں زور زور سے ہلا رہے تھے۔ اور وہ خاموش تھی۔ آواز اس کے منہ میں منجمد ہو گئی تھی اور پروفیسر بھی ایک لفظ نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ تمام جذبات جو گذشتہ دس سال سے اس کے دل میں مسکن گزیں رہے تھے۔ وہ تمام حسیات جن کو اس نے محسوس کیا تھا۔ وہ تمام پریشان خیالات جو اس کی تنہائیوں کے رفیق رہے تھے۔ اس وقت ہجوم کر آئے تھے۔ وہ ان سب کو دیکھتا تھا۔ چاروں طرف اور اب حسین منحوس عورت کا چہرہ ان میں چھپ گیا تھا۔ بہ حسرت آلود حسین چہرہ جہنمی سایہ نفرت انگیز پیکر۔ پروفیسر نے اسے جھنجوڑا اور بہ ہزار دقت کہا "تم کون ہو" اور اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ وہ بھاگ گئی۔ اس نے پھر دیکھا وہ بھاگ گئی۔

ہوٹل کے دروازہ میں اسے ایک نوجوان ملا۔ جس نے اس کا بازو تھام لیا اور وہ دونوں چلے گئے۔ پروفیسر نے انہیں ہال کے طریق پر جاتے دیکھا۔ دوزنگ۔ وہ ہوٹل کے دروازے میں آ کھڑا ہوا اور وہ ڈریننگ کے پاس جا کر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ وہ ارغوانی سمور کے کوٹ والی عورت۔ وہ حسین اور حیرت زدہ چہرہ اور اس کا جوان رفیق ——
خدا جانے وہ کون تھا۔ اور وہ کہاں چلے گئے ٭

ہوٹل کی رقص گاہ سے مخمور سروں کی آواز آ رہی تھی۔ ارغنوں کی مدہوشانہ تانوں پر رقص ہو رہا تھا۔ پروفیسر سر جھکائے یوکلپٹس کے درخت کے نیچے کھڑا تھا وہ سوچ رہا تھا۔ آخر وہ واہمہ نہیں۔ وہ میرے خیال کا فریب نہیں حقیقت ہے۔ ایک عورت جسے اگرچہ روح عظیم نے ایک پیکر الفت ایک ہیکل الوہیت تخلیق کیا تھا لیکن کسی افتاد نے الفت کے آخری قطرے تک کو خشک کر دیا۔ ہیکل ویران ہو گئی اور اب وہ اس آبادی اور معمورگی کی ماتم گسار ہے۔ وہ مجھے اس ویرانی اور بربادگشتگی کی داستان سنانا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی آواز کو نہیں سنا سکتی۔ کوئی نہیں ہے کہ اس کے اشک ہائے حسرت کو پونچھے اور اس کے درد کو شرمندہ التفات کرے۔ میں اس افسانہ حسرت کو سنونگا۔ میں اس غم کو جو میرے سپرد کرنا چاہتی ہے اپنے پاس امانت رکھوں گا اور اسے قبر میں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ حرماں نصیب چہرہ۔ یہ ارغوانی سمور والی حسینہ کون ہے؟ میں نے اسے دیکھا ہے؟ میں اس سے کیوں محبت کرتا ہوں؟ محبت؟ ہاں نفرت نہیں۔ مجھے محبت ہے۔ میں نے کبھی محبت نہیں کی مجھے یاد نہیں میں نے کبھی محبت کی ہو۔ میں نے ہمیشہ حسینوں کی آہوانہ نظروں کو فریب مال بتایا ہے۔ ان کا حسن سرکار میرے لئے ہمیشہ ایک فریب اور مایا رہا ہے۔ ان کے التفات کو میں نے ہمیشہ بناوٹ اور تکلف سے تعبیر کیا ہے۔ جمال کی لطافتیں اور رعنائی کی شادابیاں ہمیشہ میرے لئے رشتہ ہائے دام رہی ہیں۔ مجھے حسینوں سے ہرجائی ہونے کا تلخ ترین گلہ رہا ہے۔ ان کی خاموشی کو فریب متانت اور حسن التفات کو طلسم گناہ کہا ہے لیکن یہ کیا؟ ایک ارغوانی سمور والی حسینہ آئی اور مجھے اپنی محبت نہیں نہیں پرشوق عشق اور والہانہ الفت کا پرستار کر گئی۔ آخر وہ کون ہے؟ وہ کہاں گئی؟ میں کس کے پاؤں کی آہٹ سنتا ہوں؟ درخت کیوں سائیں سائیں کرتے ہیں؟ مجھے کوئی کیوں پکارتا ہے۔ یہ کون ہے۔ یہ ارغوانی سمور والی حسینہ ہے۔ جو اپنے پریشان بالوں کو اپنے جذبات پر درینہ کو دبائے آ رہی ہے۔ وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہے۔ مجھ سے محض مجھ سے ——
نہیں یہ حمرا ہے۔ حمرا غریب لڑکی۔ ابدیت کی ایک آواز ابدیت اور عالم معصومیت۔ اس کو کیا معلوم ہے وہ پیکر جسے وہ میرے واہمہ کی تخلیق خیال کرتی ہے ایک زندہ مخلوق ہے۔ ہماری طرح گوشت اور پوست کی جذبات و حسیات کی۔ خوف اور غم وہ بھی محسوس کرتی ہے اور اسکی زندگی ویران ہے۔ برباد۔ حسرت و الم کا گہوارہ۔ میں معلوم کرونگا وہ کیا راز ہے جو وہ مجھے سونپنا چاہتی ہے" ٭

پروفیسر یوکلپٹس کے بلند اور مستقیم درخت کے نیچے کھڑا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ ایک تاریک سایہ معلوم ہوتا تھا۔ اور ہوٹل کے دریچوں سے روشنی آ رہی تھی۔ بڑے کمرے میں رقص ہو رہا تھا لیکن پروفیسر بے خبر تھا ٭

ایک نرم ہاتھ نے اس کا بازو چھوا۔

"حمرا" "پروفیسر یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں اپنا دن کا کام کر چکی ہوں"

"حمرا ــــــ میری تصویر مکمل ہو چکی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہ مکمل ہو چکی ہے۔ میں تمہیں کل دکھاؤں گا۔ میری تصویر مکمل ہو گئی ہے۔ اور میں کہہ سکوں گا میں نے اس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ وہ میرے خیالات کی تخلیق نہیں ہے محض میرے خیالات کی تخلیق۔ سنتی ہو حمرا۔ میری بچی"۔

ایسے مواقع پر حمرا ہمیشہ کہتی تھی۔

"ہاں۔ کل تصویر مکمل ہو جائے گی۔ اور میں اسے "اگزبشن" میں بھیج دوں گی"۔

پروفیسر گوشہ ہائے چشم سے اسے پیار کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے لئے یہ چند الفاظ عنایات فراداں اور پرسش و التفات کی ایک دنیا لئے ہوئے تھے لیکن اس نے آج ان الفاظ کا یہ جواب نہیں دیا اس کے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا کانپتے اور لرزتے ہوئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے حمرا کا بازو تھام لیا۔ اور اسے کھینچتا ہوا لے چلا۔

"آ! میری بچی۔ میری معصوم حمرا! چلی آ! آسیب زدہ ہے یہ درخت یہ خود بھی آسیب زدہ ہے۔ دنیا تمام آسیب ہے۔ آ جا میری بچی۔ آ جا۔ باغیچہ کے اس ویران گوشہ سے آ جا۔ میں دور سے آسیبی آوازیں سنتا ہوں بھیانک اور ہولناک۔ یہ آوازیں دنیا کے اس پار سے مجھے آ رہی ہیں میری بچی۔ آ جا۔ بھاگ نہ ٹھہر"۔

حمرا اسے رقص گاہ کی گیلری میں لے آئی۔ ارغنوں کی تانوں پر ایک تیز اندلسی رقص ہو رہا تھا۔ حسین و جذبات انگیز مجسمے سینہ سے سینہ پیوست کئے گوری گوری باہیں مردانہ گردنوں میں حمائل اور مردانہ بازو آغوش میں شباب ملتہب لئے تیزی سے گھوم رہے تھے۔ حسین چہرے روبرو آتے تھے اور پھر گذر جاتے تھے۔ حمرا ان میں کوئی دلچسپی نہ لیتی تھی۔ وہ ایک مشرقی ناول کی ہیروئن کی طرح ہر وقت خیالات میں مستغرق رہتی تھی۔ اور کثرت مطالعہ اور فلسفہ میں استغراق نے اسے ضرورت سے زیادہ متفکر آگیں بنا دیا تھا۔ لیکن پروفیسر آج خلاف معمول ان چیزوں کو غور سے دیکھتا تھا اور محسوس کرتا تھا وہ بھی مرمریں فرش پر ایک بدمست میخوار کی مانند جھوم رہا ہے۔ رقص کر رہا ہے اور کئے جاتا ہے۔

آخر کار جب رقص کا ایک دور ختم ہوا۔ حمرا اسے اس کی خواب گاہ میں چھوڑ آئی۔ حمرا کو اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک تشویش تھی۔ وہ طبی امداد طلب کرنا چاہتی تھی لیکن پروفیسر مصر تھا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اسے سردی لگ گئی ہے اور صبح تک وہ اچھا ہو جائے گا۔

وہ پھر آئی۔ وہ ارغوانی سمور کے کوٹ والی حسینہ۔ جس کے سر پر نیلگوں ریشم کی ساری کا آنچل تھا۔ وہ یاس و حرماں کا مجسمہ۔ حسرت و ناکامی کا پیکر۔ وہ پھر آئی۔ پروفیسر نے اسے پھر دیکھا۔ وہ اسی یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھا تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ اسی حسرت نصیب حسینہ کی تصویر۔ وہی محروم پرسش و التفات عورت ہاں وہ حرماں نصیب تھی۔ پروفیسر اس کے متعلق نہ جانتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں تو کہتی تھیں وہ حسرت نصیب ہے۔ اس کا دل دکھا ہوا ہے۔ کسی نے اسے ستایا ہے۔ گردش زمانہ نے یا انقلاب چرخ نیلی نے۔ پروفیسر یہ جانتا تھا لیکن اسے یاد نہ تھا۔ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ وہ پھر آئی۔ پروفیسر موقلم سے قرطاس پر ان حسرت زدہ آنکھوں کی پلکیں بنا رہا تھا۔ کہ وہ آئی۔ وہ ان آنکھوں کی گہرائی میں کھویا ہوا تھا۔ ڈوبا ہوا تھا۔ ان کے عمق میں اس وقت اس کے دل میں جذبات کا طوفان تھا۔ اسے توقع تھی آج شام تک تصویر مکمل ہو جائے گی۔ وہ اس معصوم بچی اپنی شاگرد حمرا کو دکھاتے گا اور کہے گا۔ "و دیکھ لو یہ مکمل ہو گئی ہے۔ اب اسے تم "ایگزبشن" میں بھیج دو میری زندگی مکمل ہو چکی ہے۔ آج میں نے روئداد حیات کی تکمیل کر لی ہے اور اس کے بعد اب میں آرام سے مر سکوں گا۔ سکون و اطمینان کی موت"۔

اور پروفیسر واقعی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تصویر کی تکمیل سے پیشتر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے حسرت زدہ آنکھوں کی سیاہ اور گھنی پلکیں بناتے ہوئے محسوس کیا۔ سرد یخ بستہ ہوا کی ایک رو آئی ہے۔ ایک ہلکا سا جھونکا جس نے اسے کپکپا دیا ہے۔ ہوا درختوں کی شاخوں میں سرسرائی اور اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ اسے خوف تھا کہیں کوئی ٹکڑا ابر نہ ہو اور کارکنان قضا و قدر پھر اس کے ارادوں کو پامال نہ کر دیں۔ اس نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ وہ پھر نگاہ کو گھنی پلکوں کی تکمیل میں مصروف کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس کی نظر یاسمین کی گھنی روش سے ہوتی ہوئی ہوٹل سے باہر پڑی۔

وہ جا رہی تھی۔ وہی حسرت آلود اور حرماں آگیں آنکھوں والی حسین عورت اور کشادہ چہرے اور سیاہ پلکوں والی حسینہ۔ وہ جا رہی تھی۔ اس ارغوانی سمور کے کوٹ میں وہ سطح آب پر چلتی معلوم ہوتی تھی۔ ایک شاہی راج ہنس کی مانند اور لارنس گارڈن کے گھنے گہرے سبز رنگ کے اشجار کی فضائے بعید نے اسے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ وہ اسی مایوسی اور حرماں نصیبی کے سایہ میں ملبوس تھی۔ اس کی نگاہوں اور انداز سے وہی بیچارگی برستی تھی۔ وہ بے بسی اور درماندگی کا پیکر تھی۔ وہ جا رہی تھی۔ سبک رفتاری کے ساتھ اور اس کے ساتھ وہی نوجوان تھا وہی نوجوان۔ جسے اس نے کل شام کو دیکھا تھا۔ وہ جو انگریزی لباس میں ملبوس تھا اور اس کے ساتھ جا رہا تھا۔

عورت نے ڈرتے ہوئے جھجکتے ہوئے اور کپکپاتے ہوئے یوکلپٹس کے اس درخت کی طرف دیکھا۔ پروفیسر وہیں تھا۔ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سینہ تنفس کے زیر و بم سے گرتا اور ابھرتا تھا۔ سانس کی رفتار تیز تھی اور سراپا سکوت بنا اس حرماں نصیب سکینہ کو دیکھ رہا تھا۔ عورت جا چکی تھی وہ ارغوانی سمور کے کوٹ والی عورت ایک موج نسیم کی طرح جا چکی تھی۔ پروفیسر کی نگاہیں لارنس گارڈن کی روش پر تھیں وہ اس طرح دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹکی جمائے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کسی بھولے ہوئے افسانہ کو ماضی کے کسی لمحہ کو اپنے افسانۂ حیات کے کسی قیامت بداماں ٹکڑے کو۔ لیکن اسے یاد نہ آتا تھا۔

اس محویت میں کس قدر وقت گزر گیا۔ گم شدگی کی یہ کیفیت کتنے طویل لمحے طاری رہی۔ پروفیسر نہ جانتا تھا۔ اسے کبھی معلوم نہ ہوا لیکن جب اس نے پھر تصویر کو دیکھا تو رنگ آلود موقلم حسینہ کے حسرت آگیں چہرے پر ایک سیاہ نشان بنا چکا تھا۔ قسمت نے اس بار بھی دھوکا دیا تھا اور "حمرا" وہ نوخیز معصوم لڑکی "حمرا" یونانی علم الاصنام کی علم کی دیوی کی طرح اسے شفقت آمیز جملوں اور محبت آگیں الفاظ سے تسلی دیتی اس درخت کے نیچے سے اٹھا کر لے گئی۔ لیکن اسے ارغوانی سمور کے کوٹ والی حسینہ کا کوئی علم نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پروفیسر کسی ذہنی عارضہ میں مبتلا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا وہ ضرور طبی امداد طلب کرے گی لیکن پروفیسر دلائل سے اس کے خیالات کی تردید کرتا تھا۔ وہ مباحثہ میں "حمرا" سے زیادہ ذی ہوش تھا۔ حمرا اس سے درس فلسفہ لیتی تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ پروفیسر کی ہوشمندی پر یقین نہ کرتی۔

تیسرے روز پروفیسر سر جھکائے پھر تصویر کی تکمیل میں مصروف تھا۔ تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ کشادہ پیشانی قوسی ابرو اور بھرے بھرے گال۔ تراشیدہ گول ٹھوڈی۔ اور وہی حسرت آگیں آنکھیں، وہ جن میں ایک غیر ارضی سوز و گداز تھا۔ ایک فریاد مستقل یا نالہ پیہم۔ ایک رقت انگیز آرزو اور ایک خون شدہ تمنا۔ آہ ——— وہ مرقد آرزو آنکھیں کھلی ہوئی اور حسرت زدہ حرماں نصیبی کا مزار۔ آج وہ پھر سیاہ اور گھنی پلکوں میں مصروف تھا۔ موقلم غیر شعوری طور پر حرکت کر رہا تھا۔ پروفیسر کی آنکھوں میں فتحمندی کی چمک تھی۔ اور اس نے ارادہ کر لیا تھا۔ وہ سر نہ اٹھائے گا۔ اس وقت تک سر نہیں اٹھائے گا۔ جب تک وہ اس ناشاد و نامراد حسینہ کے حسرت آگیں چہرہ کو نذر قرطاس نہ کر دے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا اور وہ اس کا پابند تھا۔ تصویر ابھی ایک یا دو یا شاید تین لمس کی محتاج تھی اور وقت کا وہ نقطہ جب ایک غیر مرئی ہاتھ پروفیسر کی تخلیق کو خراب کر دیتا تھا۔ قریب پہنچ چکا تھا۔

پروفیسر کو اپنی پشت پر ایک سایہ نظر آیا۔ ایک سایہ۔ ایک مرد کا سراپا۔ نوجوان مرد کا۔ اور پھر ایک عورت کا سراپا۔ وہی حنا کے پودے کا سا قد اور ارغوانی سمور کے کوٹ کی جھلک اور ایک مانوس کی معطر روح اس نے پہچان لیا۔ یہ وہی روح تھی وہی عطر۔ چند روز پیشتر کی برشگالی۔ شام کی حرماں نصیب حسینہ کی خوشبو اور وہی خوبصورتی۔ اس نے غیر شعوری طور پر سر اٹھایا۔ وہی عورت کھڑی تھی۔ خاموش اور اپنی تصویر کو اپنی کھلی ہوئی حسرت آلود آنکھوں۔ اپنے پریشاں بالوں اپنے سیاہ آہوانہ ابروؤں اور اپنی ایک جانب کی سیاہ گھنی پلکوں کو دیکھ رہی تھی۔ تصویر میں بھی باریک ہونٹوں پر وہی استہزا آمیز مسکراہٹ تھی۔ وہی مسکراہٹ جو کہ کے دل کے عظیم تنفر و حقارت کا پتہ دیتی تھی۔ اس میں انسانی سوسائٹی اور انسانی رسوم و قیود اور کارکنان قضا و قدر کے خلاف ایک عمیق جذبہ تحقیر و تمسخر کا ایک پوشیدہ طوفان۔ اور اس عورت کے ساتھ وہی نوجوان تھا۔ شباب مجسم سراپا مسرت و شگفتگی اس کے ہونٹوں پر ایک زندگی بخش مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک فیاضانہ خندہ۔ اسنے شفقت آمیز الفاظ میں پروفیسر کو مخاطب کیا۔ عورت خاموش رہی۔ پروفیسر نے محسوس کیا۔ نوجوان نے گفتگو کر کے اسے ایک حیات نو بخش دی ہے اس کی زندگی کی تاریکیوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔ وقت کا دریا پلٹ گیا ہے۔ اور وہ پھر شباب کی وادیوں میں گل بداماں پھر رہا ہے۔ اس

کے ساتھ کوئی رفیق بھی ہے لیکن اس کے چہرے کے نقش ونگار بہت دھندلے ہیں۔ وہ اب انہیں پہچاننے سے قاصر ہے وہ انکی یاد تازہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن نہیں کرسکتا۔ اس نے بتایا کس طرح اس نے ایک نوخیز لڑکی سے عشق کیا۔ وہ شباب کے طوفانی ایام سے گزر چکا تھا۔ یہ وہ ایام تھے جب وہ جامعہ میں فلسفہ اسلامیہ کی کرسی پر متمکن تھا۔ کس طرح اس نے وفور جذبات کے ساتھ ایک نوخیز حسینہ کو چاہا۔ کس طرح دونوں نے پیمان وفا باندھا۔ دونوں کی شادی ہوئی اور کس طرح ایک صبح اسے بیدار ہوکر معلوم ہوا کہ وہ جاچکی ہے۔ وہ نوخیز حسینہ جو اس کی امیدوں کا مرکز تھی وہ سراپا جمال ــــ وہ کسی ایکٹر کے ساتھ جاچکی تھی اور یہ جواب تھا اس کی محبت کا ــــ اس قدر فریب کار واقع ہوئی ہے عورت!

اس نے یہ بھی بتایا کس طرح وہ ایک عرصہ تک دیوانوں کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ کس مجنونانہ تلاش میں کھویا رہا۔ اور آخر ناامیدی نے سعی بے حاصل کی لذت کو خاک میں ملاکر اسے پھر وہی سکون بخش دیا۔ جس کا وہ محبت کے ایام سے پہلے مالک تھا۔

وہ آرٹسٹ ہے۔ وہ پھر استاد فلسفہ ہے۔ اور خدا نے اسے الفت کی تباہی کا مقابلہ کرنے کی قوت عطا کردی ہے۔ طوفان اتر چکا ہے اور پھر "باریک نگاہ" کا اہل ہے۔ وہ نہیں جانتا۔ وہ یہ تصویر کیوں بناتا۔ لیکن وہ گذشتہ دس سال سے اسے مکمل کرنے کی کوشش میں ہے اور یہ کوشش ابھی تک مشکور نہیں ہوئی۔

نوجوان نے تمام واقعہ کو غور سے سنا۔ سراپا جوش اور ہمہ تن التفات و توجہ بن کر سنا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ کچھ عرصہ تک جیب میں رہا۔ وہ عورت تصویر پر نگاہ جمائے دیکھتی رہی۔ وہ پروفیسر کو مخاطب کرنے سے خائف تھی۔ اس کے لب متحرک تھے لیکن الفاظ زبان تک آکر رہ جاتے۔ وہ جانتی تھی یہ اس کی تصویر ہے۔ اس کے شباب کی بہار کے اولیں ایام کی جب وہ ایک پرکیف مسکراہٹ تھی۔ یا ایک تندو مسرت۔ اور یہ تصویر ایک پکار ہے ایام گذشتہ کی۔

نوجوان نے جیب سے "دہلیس تھیٹر" کے دو ٹکٹ نکالے۔ اور پروفیسر کی طرف بڑھا کے اس نے کہا "آج "شکسپیر" کا "اتھالو" دکھا رہے ہیں۔ آپ اور آپ کے قابل رفیق کی موجودگی ہمارے لئے باعث افتخار ہوگی"۔

بیچارہ نوجوان نہ سمجھ سکا جیسے انداز میں کہا۔ پروفیسر نے تو ٹکٹ لے لئے اور وعدہ کرلیا کہ رات کو ضرور "اتھالو" کا لطف اٹھائے گا اور اپنی حسین رفیق "حمرا" کو بھی ہمراہ لائیگا۔ نوجوان نے ہاتھ ملایا۔ اور حسین عورت نے پروفیسر کے چہرہ کو پرمعنی نگاہ سے دیکھا اور دونوں باغیچہ کی جھاڑیوں اور پودوں کو کودتے پھاندتے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

آج بھی تصویر خراب ہوچکی تھی۔

حمرا پروفیسر کا بازو تھامے ہوئے تھی وہ تھیٹر کے روشن دروازے کی طرف بڑھے۔

وہ ہندوستانی تیاتر کی وسعت کی ممکنات پر غور کررہے تھے اور دونوں ہجوم کو چیرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

وہ روشنی نیئر روشنی۔ موسیقی اور ہجوم کے شور کے درمیان بیٹھے تھے آرکسٹرا کے ترانوں سے ایوان گونج رہا تھا۔ اور "اتھالو" کی تمثیل فن تمثیل کے تمام منرکمال کے ساتھ دکھائی جارہی تھی۔ پروفیسر کی نگاہیں اطالیہ کے مناظر میں محو تھی۔ وہ نیلگوں سمندر وہ سیمیں چشمہ ہائے آب اور سنگترے کے سرسبز درختوں کا سایہ جو پانی پر ایک زرکار جال بچھا دیتا تھا جس میں سے دھوپ چھن چھن کر بحیرۂ قلزم کے پانی کو چومتی تھی۔

نصف سے زیادہ تمثیل دکھائی جاچکی تھی۔ "اتھالو" حبشی سپہ سالار کا جرم دکھایا جارہا تھا۔ "ڈسڈیمونا" ریشمی پردوں میں لپٹی پڑی تھی اور "اتھالو" اپنے افریقی خنجر کی دو ضربیں لگا چکا تھا۔ اور قریب تھا کہ تیسری ضرب سے اس کی زندگی کا خاتمہ کردے۔

اس وقت موسیقی کے ہلکے ہلکے تفکر انگیز ترانوں کو چیرتی ہوئی ایک پرچیخ سنائی دی۔

"سلما!"

"اتھالو" جھجک کر ایک جانب ہٹ گیا۔ پروفیسر بالکل سیدھا کھڑا تھا اس کی آنکھیں اس کی داڑھی کے پریشان بال۔ اس کا ماتھا بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس کا سینہ گرتا اور ابھرتا تھا۔ جذبات کے زیروبم اور تنفس کی سرعت سے وہ مضطرب ہوگیا۔ وہ اختلاج مہلک اختلاج محسوس کرتا تھا وہ محسوس کرتا تھا وہ مر رہا ہے۔ مرا جاتا ہے۔ وہ مٹھیاں کھولتا اور بھینچتا تھا حسرت آلود نگاہوں والی پریشان بال حسینہ اس کے سامنے تھی۔ وہ حسینہ جس کی نگاہوں میں عمر کا ایک سمندر موجزن تھا۔ ایک سربستہ راز کی طرح ایک سرزنباہ کی طرح وہ حسینہ ارغوانی سمور کوٹ والی مایوسی و ناکامرانی کا پیکر

"سڈا مونا" کے لباس میں اسٹیج پر متحیر کھڑی تھی۔ پروفیسر نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ اور وہ بتا سکتا تھا۔ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

وہ ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا۔ ایک نشست سے دوسری نشست پر کودتا۔ لوگوں کے شور اور بجلی کی خیرہ کن چمک کے درمیان کودتا اسٹیج پر پہنچ گیا۔

اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ اس کی آواز لرزتی ہوئی پھر بلند ہوئی۔

"سلما! —— میری پیاری سلما! —— تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا!"

اس نے ارغوانی سمور کے کوٹ والی حسرت نصیب حسینہ کو بھینچ کر اپنے سینہ سے لگا لیا۔ وہ اپنے دھڑکتے ہوئے مضطرب دل سے لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ اور پردہ موسیقی کی تانوں لوگوں کے شور بجلی کی خیرہ کن روشنی کے درمیان آہستہ آہستہ گر رہا تھا!

"وینس تھیٹر" کا "اتھالو" کبھی مکمل نہ ہوا۔ کیونکہ "ڈسڈا مونا" کا پارٹ کرنے والی نادرہ کا ایکٹرس نے اپنی تیاتر کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

محض تماشائی

(ا)

شمیم عرشۂ جہاز کی سلاخوں پر جھول رہا تھا!

اس نے جھولتے جھولتے اپنے دوستوں سے کہا "میں تو سلطانہ رضیہ بنوں گا۔ —— اور زہرہ کل جو تم سیاہ قمیص پہنے ہوئے تھیں وہ ذرا مجھے دے دینا؟"

جہاز کے مسافروں میں سب سے زیادہ شوخ۔ شریر اور باتونی لیکن اس وقت اس کے لہجہ سے متانت ٹپک رہی تھی۔ غالباً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کہ محفل رقص میں حصہ لینے کے علاوہ اس وقت اس کے دل میں اور کوئی خیال نہیں ہے۔ یہ اس کی عادت تھی کہ اپنی شرارت اور شوخی کے باوجود جب اس کا جی چاہتا تھا۔ متین بن جاتا تھا (اکثر اوقات اسے بھی شوخی سمجھا جاتا!) اور اسی متانت اور شوخی کے یکجا ہونے کی وجہ سے وہ "عقاب ہند" کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز مسافر تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ جہاز کی جان تھا!

زہرہ جس کو شمیم اختر نے ابھی ابھی مخاطب کیا تھا۔ بیگم ارجمند کے ہمراہ رنگون سے واپس آ رہی تھی اور یہ ناممکن تھا۔ کہ دوران سفر میں کسی نہ کسی طرح شمیم سے اس کا تعارف نہ ہوا ہو۔ شمیم کی عادت تھی کہ وہ ہر کسی سے پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتا تھا۔ لیکن جب اس نے زہرہ سے بے تکلفی بڑھانی چاہی تو اسے یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ زہرہ اسے ہر وقت علیحدہ علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور تعلقات بڑھانا نہیں چاہتی۔ نوجوان اختر میں تصنع نام کو نہ تھا۔ اس لئے وہ زہرہ کے اس برتاؤ سے ذرا سوچ میں پڑ گیا*

زہرہ جبیں نے نہایت بے رخی سے کہا "اگر تمہیں قمیص کی ضرورت ہے تو لے لینا!" شاید وہ اس سے بھی احتراز کرتی لیکن چونکہ شمیم جواب کا منتظر تھا۔ اس لئے ان الفاظ کی ضرورت پیش آئی*

شمیم نے ایک ٹھنڈا سانس لیا "چلو خیر ایک بوجھ تو کم ہوا۔ اب ایک اور چیز باقی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنے نظام الرقص سے عذرا مجھے دے سکو گی؟"

بیگم ارجمند نے بمشکل ہنسی ضبط کر کے پوچھا! "تم بھی رقص کرو گے؟"

شمیم نے منہ بنا کر کہا! "نہیں تو! —— اگرچہ نصرت نے مجھے رقص سے منع کر دیا ہے۔ میں صرف دیکھنے کے لئے جا بیٹھوں گا۔ بس یہ معلوم ہوگا۔ جیسے کسی نے ایک خوبصورت پھول لا کر رکھ دیا ہے —— کیوں زہرہ تم نے عذرا پر نشان بھی لگا لیا یا نہیں —— نہیں؟ تمہارا مطلب ہے کہ نشان لگا لوگی؟ شکریہ۔ بہت بہت شکریہ! . . . . اے لو نصرت صاحب بھی خراماں خراماں اسی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ کاش تم اسے انتونیہ بننے پر آمادہ کر سکو۔ میں تو بہت کہہ سن چکا!"

اس نے قہقہہ لگایا اور سلاخوں سے کود کر چلا گیا!

اگرچہ زہرہ کے چہرہ پر ہلکا سا غصہ تھا لیکن نگاہیں شمیم کے ساتھ ساتھ تھیں (وہ بہت اچھا لڑکا ہے لیکن اگر اس کے مزاج میں ایسی متانت اور سنجیدگی ہوتی جو کپتان نصرت کو دیگر مسافروں کی نظروں میں ممتاز کئے ہوئے ہے تو وہ اور بھی اچھا ہوتا!) . . . . کپتان نصرت کچھ اس طریقہ سے انکے پاس ٹہلتا ٹہلتا آیا گویا یہ ملاقات محض اتفاقاً ہو گئی تھی۔ وہ خاموش اور سنجیدہ مزاج تھا۔ تنہائی پسند تھا اور لازمی طور پر مجالس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب وہ گردن جھکائے شانوں کو کسی قدر اونچا کئے عرشۂ جہاز پر ٹہلتا تھا۔ تو کاہلی اور سستی اس کے ایک ایک فعل سے ظاہر ہوتی تھی۔ گو حقیقتاً ایسا نہ تھا (ایک محنتی ہوشیار اور کامیاب فوجی انجینئر کا سست ہونا ذرا محال ہے!) اس کی گفتگو بھی دلچسپ نہ ہوتی تھی۔ اس کے لب و لہجہ میں کوئی انوکھی بات نہ پائی جاتی تھی۔ کسی نے اس کی زبان سے آج تک کوئی لطیف جملہ نہ سنا تھا —— باوجود اس کے زہرہ جبین ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی سے اس سے ملتی تھی اور نہایت محبت سے اس سے پیش آتی۔ اس کے نزدیک نصرت اس قابل تھا کہ دنیا میں نمایاں شہرت حاصل کر سکے۔

بیگم ارجمند شمیم کی قہقہہ آمیز تفریح زیادہ پسند کرتی تھیں۔ چنانچہ اس موقع پر وہ انھیں اور کسی قدر شان کے ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہوئیں

لیکن بہانہ کرنا سوسائٹی کا ایک بہت بڑا اصول ہے اس لئے انہوں نے کہا۔" میں ذرا چل کر دیکھوں کہ وہ بقیہ لباس کیونکر حاصل کرتا ہے۔ یقیناً یہ بالکل انوکھا ہوگا ـــــ جیساکہ وہ خود ہے"!

زہرہ کا غصہ اور بڑھ گیا ـــ کچھ غصہ اور کچھ حقارت دونوں ملے جلے تھے!

اس نے کہا" شمیم کا کیا ہے؟ وہ تو مسخرہ ہے! لیکن میری طبیعت تو اس وقت کی خوش مذاقی سے اکتا جاتی ہے۔ ہر وقت قہقہہ لگانے سے آخر کیا فائدہ؟" اس نے اپنے رومال سے کھیلتے ہوئے کہا" جو لوگ کسی بات کو کبھی سنجیدہ طور پر نہیں لیتے میرے خیال میں وہ اپنی زندگی کامیابی کے ساتھ بسر نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر شمیم کو موت آئی تو وہ ہنستا ہوا مرے گا!"

بیگم ارجمند جو شمیم کی شوخیاں مادرانہ نقطہ نظر سے دیکھتی تھیں مسکرا کر بولیں" چلو یہ بھی اچھا ہے۔ عزیز من رونے سے ہمیشہ ہنستے رہنا زیادہ بہتر ہے۔ اگرچہ زیادہ آسان نہیں ہے"!

وہ زہرہ کے نقادانہ رویہ پر دل ہی دل میں مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئیں اور کپتان نصرت خاموشی سے زہرہ کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ زہرہ نے صرف تبسم سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کیونکہ الفاظ غیر موزوں ثابت ہوتے۔ اور گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ صرف وہ ہی ایک ایسی ہستی تھی جو اس کی متانت اور خاموشی سے نہ گھبراتی تھی۔ اسے نصرت سے بہت کچھ انس تھا۔ اور اس کے خوش باش دوست (شمیم!) کے ساتھ گفتگو کے بعد جو اثرات پیدا ہوجاتے تھے صرف اس کی خاموشی انہیں دور کر سکتی تھی۔ نصرت کبھی معمولی باتوں پر گفتگو کرنے کا عادی نہ تھا حقیقت میں وہ بات چیت کرتا ہی نہ تھا۔ لیکن زہرہ وہ لمحات جس قدر اطمینان قلب اور سکون کے ساتھ گذارتی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ طمانیت اسے جنت میں ملنے کی توقع نہیں!

کپتان نصرت دوسروں کے لئے غیر دلچسپ ہو تو ہو اس کے لئے نہ تھا۔ اور زہرہ ـــ اس پر فخر کرتی تھی!

(۲)

شمیم نے چپکے سے کہا" آؤ عرشہ پر چلیں۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اہا کس قدر حسین شب ہے"!

زہرہ نے اس کا انوکھا لباس ایک نظر سے دیکھا اور بلا انتہا مسکرا پڑی۔ ایک عرصہ سے دونوں کے مابین کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ عرشہ پر نکل آئی۔ بار بار اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ شمیم کے چہرہ پر زنانہ لباس پہننے کے بعد کس قدر نزاکت برسنے لگی ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ متعجب بھی تھی۔ کیونکہ اس کے لہجہ سے غیر معمولی طور پر متانت اور سنجیدگی کا اظہار ہو رہا تھا ـــ آخر کیوں؟ باوجود کوشش کے زہرہ اس کے لہجہ کا مطلب سمجھ نہ سکی۔

شمیم اسے سلاخوں تک لے گیا اور خود ان سے سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔

یکایک وہ مڑا اور بے تابانہ اس کی زبان سے نکلا!" زہرہ"!

ـــــ "

جلدی جلدی لیکن غیر مسلسل فقروں میں شمیم نے کہا" زہرہ! ـــ مجھے مجبور سمجھنا۔ ۔ ۔ ۔ آخر میں اسے کب تک چھپاؤں؟ مجھے ـــ تم سے ۔ ۔ ۔ ۔ محبت ہے! عشق ہے۔ ۔ ۔ ۔ تم شاید اس سے واقف ہو؟ میرے بتانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ـــ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ زہرہ۔ آخر تم کیوں مجھ سے اتنی برداشتہ خاطر رہتی ہو۔ جب میں تم سے بولنا چاہتا۔ تم ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتی ہو۔ کیوں میری۔ ۔ ۔ ۔ !

زہرہ کا دل دھڑکنے لگا اور وہ کسی قدر گھبرا گئی۔ کم از کم شمیم اس مرتبہ مذاق سے کوسوں دور تھا۔ لیکن زہرہ کے تصور نے ایک ایسے شمیم کو پیش کیا۔ جس کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا اور جو عنقریب زور سے ہنسنے والا تھا۔ محض تخیل کیونکہ تاروں کی دھندلی روشنی میں کوئی چیز صاف نظر نہ آتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس خیال نے اتنا زور باندھا کہ زہرہ کے دل میں شمیم کے خلاف جس قدر قوتیں خوابیدہ تھیں بیدار ہوگئیں۔ اسے غصہ آگیا۔ ایسا غصہ جو ہر لحظہ ترقی کرتا جا رہا تھا۔ اور جس نے اسے انتہائی بے رحمی اور سرد مہری پر آمادہ کر دیا +

اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا" آپ نے نہایت مناسب موقع تلاش کیا ہے۔ غالباً آپ کا خیال ہوگا کہ اس زنانہ لباس میں دیکھ کر کوئی آپ کی مخالفت کی جرات نہ کرے گا۔ کیوں"؟

شمیم نے نہایت سکون سے جواب دیا!" میں نے صرف موقع حاصل کیا ہے جو مجھے مل سکتا تھا۔ ہر کام موقع اور وقت سے ہوتا ہے میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ اگر میں روزمرہ کے لباس میں ہوتا تو تم میرے ساتھ باہر تک آنا بھی پسند نہ کرتیں!"

اس کے لہجہ میں تمسخر کی آمیزش آ چلی تھی۔ جس نے زہرہ کو مارے غصہ کے کپکپا دیا (گویا میرے الفاظ کوئی وقعت نہیں رکھتے اور میرا غصہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ بہت جلد اپنی غلطی محسوس کرے گا!) اس نے آہستہ سے کہا "شاید آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ آپ کا مسخرہ پن اور سلطانہ رضیہ کا لباس نہایت درجہ دلچسپ ہے اور قابل درگذر بھی؟ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی ہم خیال نہیں ہوں"!

شمیم نے بے ساختہ کہا "دیکھو زہرہ۔ تمہیں ہر چیز اور ہر بات کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ جو کچھ میں نے کیا وہ ہرگز ہرگز مسخرہ پن نہیں ہے۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میں خوبصورت اور نازک آبگینوں سے کھیلتا نہیں ہوں۔ محبت ایک پاک شے ہے اور پاک چیز کا مذاق اڑانا میرے مذہب میں تو کیا کسی کے مذہب میں روا نہ ہوگا میں خلوص سے ہر بات کہہ رہا ہوں۔ یاد رکھو خلوص سے"!

اس کی آواز اس کے قول کے ہم زبان تھی اور زہرہ اپنے لہجہ میں نرمی پیدا کرنے پر مجبور ہوئی۔ لیکن ابھی تک اس کے دل میں غصہ کے جذبات بدستور موجود تھے۔ اس نے لاپرواہی سے کہا "ممکن ہے اب اس وقت مخلصانہ طور پر ہر بات کہہ رہے ہوں۔ اس سے پہلے تو ایسا نہ تھا اور میرے خیال میں اس کے بعد بھی شاید ایسا نہ ہو۔ یہ تو آپ کی عادت ہے کہ آپ جب جی چاہتا ہے مخلص اور سنجیدہ بن جاتے ہیں"!

"خدا کے لئے۔ زہرہ ۔۔ خاموش رہو!" ۔۔ شمیم کا لہجہ نہ صرف سخت تھا۔ بلکہ ایک سنجیدہ مزاج انسان کی طرح اپنے ہمراہ ایک "ارادہ" لئے ہوئے تھا۔ اس نے کہا ۔۔ "تم غلطی کر رہی ہو۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا کہ تم نے سمجھ رکھا ہے۔ یا کم از کم میں اس قدر غیر سنجیدہ نہیں ہوں!"

زہرہ نے انتہائے سرد مہری سے کہا "صرف آپ کے الفاظ ہی ایسا کہتے ہیں۔ ورنہ . . . . ."

زہرہ اس قدر بے مہری سے کبھی پیش نہ آئی۔ لیکن شمیم کے مردانہ غرور نے تھوڑی دیر کے لئے اسے جنگ پر آمادہ کر دیا؟ آخر اس لڑکے نے ۔۔ جو بیہودہ زنانہ لباس میں اس کے پاس کھڑا تھا ۔۔ کیونکر اتنی جرات کی؟ اسے کیونکر ہمت ہوئی۔ کہ اس وقت زہرہ سے زندگی کی نازک ترین شے کا ذکر کرے۔ اپنی محبت کا اظہار کر کے اس کے بدلے زہرہ کی محبت کا متمنی ہو!)

اس نے دریافت کیا "آپ کس طرح مجھے باور کرا سکتے ہیں۔ کہ آپ کے الفاظ اور خیالات ایک ہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ تمام باتیں اخلاص پر مبنی ہیں اور آپ سچے دل سے کہہ رہے ہیں لیکن ۔۔ ہم دونوں خوب جانتے ہیں کہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ اب متانت اور سنجیدگی سے کوسوں دور ہیں۔ آپ تفریح کے بندے ہیں۔ آپ نے زندگی بھر کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ جو قابل ذکر ہو ۔ سوائے مذاق کے! دوسرے لوگ "کام" کرتے ہیں اور آپ ہمیشہ ظاہری نمائش کی فکر میں رہتے ہیں۔ آپ محض تماشائی ہیں"!

"تماشائی!" ۔۔ شمیم نے یہ لفظ ایسے لہجہ میں دہرایا کہ اس کا مطلب زہرہ نہ سمجھ سکی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "بلکہ نہایت چالاک اور ہوشیار تماشائی! . . . . . جناب اگر میں نے کوئی کارنمایاں انجام نہیں دیا۔ تو اس میں میری کونسی خطا ہے یہ تو واقعات کا قصور رہے۔ یوں تو میں بہت سے کام کر سکتا ہوں۔ انجن بھی چلا سکتا ہوں اور گولیاں بھی کھیل سکتا ہوں لیکن کارنمایاں ۔۔ دیکھو تمہارا نقطہ نظر غلط ہے۔ انسان کے ظاہری افعال پر مت جاؤ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو وہ کیا کرتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھو کہ وہ خود کیا ہے۔ صرف یہی ایک مقیاس ہے۔ ورنہ دنیا میں بیوقوف سے بیوقوف اور احمق سے احمق بھی ہیرو ہو سکتا ہے"!

زہرہ نے فرمائشی قہقہہ لگایا اور نہایت حقارت سے کہنے لگی!

"ماشاء اللہ ۔ کیا خوب؟ ۔۔ انسان کے افعال پر نہ جاؤ ۔۔ ضرور انسان کے افعال ہی یہ بتانے کی قدرت رکھتے ہیں کہ وہ کیا ہے انسان اپنے لئے خود واقعات اور مواقع پیدا کر سکتا ہے اور انہیں صحیح طور پر کام میں لا سکتا ہے۔ شمیم اختر صاحب آپ صرف باتوں سے مجھے یقین نہیں دلا سکتے کہ آپ کسی قابل ہیں"!

ذرا دیر کو خاموشی چھا گئی!

شمیم کے دل میں ہلکے ہلکے شبہات موجود تھے لیکن نہ تو اس نے ان شبہات کو صاف کرنے کی کوشش کی اور نہ اس سوال کا جواب طلب کیا۔ جس پر اس کے مستقبل کا دارومدار تھا بلکہ ۔۔ کس قدر تعجب ہے! ۔۔ یکایک اس نے سر جھکایا۔ جسم کو کسی قدر خم کیا اور مڑ کر جلد جلد قدم رکھتا ہوا چل دیا۔ زہرہ نے رخصت کا یہ انوکھا طرز دیکھا جس میں بہت کچھ خودداری اور خود پسندی کی آمیزش تھی۔ لیکن پورے طور

پر اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ عرشہ پر ٹہلتے ٹہلتے اس نے اپنی حالت سنبھالنی چاہی اور شمیم کی اس وضع کے معنی دریافت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود!

گذشتہ لمحات اسے بے چین چھوڑ گئے تھے!

(۳)

ابھی زہرہ کو عرشہ پر بیٹھے ہوئے کچھ عرصہ ہی ہوا ہوگا۔ کہ یکایک جہاز میں ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ جس نے اس سرے سے اس سرے تک اس کے جسم میں ایک کپکپی پیدا کر دی۔ پھر خود بخود تمام انجن بند ہو گئے۔ بڑے کمرہ میں جہاں درجہ اول کے مسافر رقص میں مشغول تھے ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ سب خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا اور لحظہ بھر بعد ایک دوسرے سے دریافت کر رہا تھا "یہ کیا ہوا؟"

کوئی شخص زہرہ کے سامنے سے بھاگتا ہوا پل کی طرف گیا۔ جہاں اس افسر کا دھندلا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ جو جہاز کی نگہبانی کر رہا تھا۔ چشم زدن میں ایک ہراس کی رو اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن ابھی اس نے بمشکل قدم آگے بڑھایا ہوگا کہ شمیم تیزی سے دوڑتا ہوا آناً فاناً میں پل تک گیا اور پل بھر میں اس کو عبور کر کے نگاہ سے پوشیدہ ہو گیا۔ یقیناً یہ شمیم ہی تھا۔ کیونکہ گہری سے گہری تاریکی میں بھی وہ ان بیہودہ کپڑوں کی سرسراہٹ سے اسے شناخت کر سکتی تھی:

قبل اس کے کہ زہرہ کو اس کی موجودگی کا احساس ہو وہ جا چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحہ میں تمام مسافر عرشہ پر نکل آئے اور ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے۔ کوئی اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا اور کوئی زیر لب اپنی پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن ہر شخص کی یہی کوشش تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح وہ اندیشہ اپنے دل سے دور رکھے جو ہر لحظہ اس کے دل میں جاگزیں ہوتا جا رہا تھا۔ زہرہ بھی اسی گروہ میں آ ملی۔ وہ مارے خوف کے کپکپا رہی تھی لیکن دوسروں کے ساتھ مل کر ایک اندیشہ کا مقابلہ کرنا تھا ایسا کرنے سے بدرجہا بہتر تھا!

مسافر بے آرامی سے اکٹھے ایک جگہ کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ جہاز کا کپتان پل کی طرف گیا اور نگہبان افسر کو بلا کر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ پل سے اتر کر مسافروں کی طرف آیا۔ ہر شخص کی نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی لیکن اس کا چہرہ ساکن تھا کسی قسم کی بے اطمینانی اور خوف کے آثار تک وہاں موجود نہ تھے۔ بلکہ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہجوم کو مخاطب کر کے کہا: "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ انجن گھر میں ایک معمولی سا حادثہ ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے انجن روک دیئے گئے ہیں۔ کپتان صاحب امید کرتے ہیں کہ آپ اپنی تفریح ہاتھ سے نہ دیں گے اور رقص بدستور جاری رکھیں گے!"

مسافروں نے (جن میں سے بعض تین تین صدی پیشتر کے لباس پہنے ہوئے تھے!) اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لیکن وہ مسکراتا رہا۔ اس نے کہا: "اگر مجھے اجازت ہو تو میں بھی رقص میں شریک ہو جاؤں۔ کیونکہ کپتان نے فی الحال میرے فرائض سے مجھے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ آپ ایک سادہ لباس والے کو بھی شامل کر سکتے ہیں؟"

وہ آہستہ سے کمرہ کی طرف چل دیا اور راستہ میں باجہ والوں کو پکار کر کہتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف اسی شخص کی ذات میں سلامتی پوشیدہ ہے۔ کیونکہ سب کے سب بلا توقف اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے لیکن رقص — محفل رقص ٹھنڈی ہو چکی تھی اور رقص میں اب کوئی لطافت باقی نہ تھی۔ افسر نے چپکے سے ایک سارنگی اٹھا لی اور کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ بجانا شروع کیا!

اسی طرح وہ کچھ عرصہ تک بحری گیت سناتا رہا۔ رفتہ رفتہ طلسم ٹوٹنے لگا۔ اور جب گاتے گاتے اس کی آواز بھرآنے لگی۔ تو بیگم ارجمند نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ غالب۔ اقبال۔ فانی۔ غرض کوئی شاعر ہی ایسا ہوگا۔ جس کے ایک دو شعر اس وقت حاضرین نے بیگم ارجمند سے نہ سنے ہوں۔ ان کی دیکھا دیکھی اوروں کو شوق پیدا ہوا اور اسی طرح اچھی خاصی محفل سرود منعقد ہو گئی۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا خوف وہراس میں کمی ہوتی جاتی تھی — لیکن ایک حد تک — ان احساسات کا ایک دم مٹ جانا محال بھی تھا کیونکہ ہر شخص کو معلوم تھا کہ جہاز کا ڈاکٹر غیر حاضر ہے!

کوئی دو گھنٹے بعد جہاز میں بیداری سی پیدا ہوئی۔ ایک خاص کپکپاہٹ ہلکی سی انجن کی تڑپ اور ذرا سی دیر بعد تمام باتیں حسب معمول تھیں۔ انجن کی آواز رفتہ رفتہ تیز ہوتی گئی اور جہاز پھر پوری رفتار سے چلنے لگا۔ نگہبان افسر کا چہرہ خوشی کے مارے چمک رہا

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ اس نے زور سے کہا: "اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ سب خیریت ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو مبارک باد دینی چاہئے!"

"تو گویا ہم خطرہ میں تھے۔ کیوں کپتان صاحب؟" ــ یہ سوال ایک بیگم صاحبہ کا تھا۔ جو ہر وقت ہر بات معلوم کرنے کی خواہشمند رہتی تھیں۔

افسر نے جواب دیا: "محض انجینیروں کا یہ خیال تھا۔ ورنہ اور کوئی بات نہیں ہے۔ وہ لوگ تو ہر معمولی بات کو خطرناک کہہ دیتے ہیں ــ بہرحال ہم دے بخیر گذشت کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اب مجھے رخصت ہو جانا چاہئے۔ میں جا کر آپ کے لئے قہوہ بھجواتا ہوں۔"

وہ اٹھا اور لاپرواہی سے ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔

خاموشی! ــ ایک ہلکے سے قہقہہ کی آواز بلند ہوئی۔ دروازہ کھلا اور سلطانہ رضیہ ہنستی ہوئی کمرہ میں داخل ہو گئی ہر شخص نے اس کی ہیئت کذائی کو عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا دوپٹہ غائب تھا۔ سر کے تمام بال چہرہ پر ادھر ادھر پریشاں تھے۔ اور قمیض کی ایک آستین غائب تھی۔ کپتان نصرت اس کے ساتھ تھا لیکن بہت پریشاں نظر آتا تھا۔ دونوں دروازہ کے نزدیک کرسیاں لے کر بیٹھ گئے۔

لاحول ولا قوۃ!" ــ سلطانہ رضیہ نے اپنے چہرہ سے بال ہٹاتے ہوئے کہا ــ "استغفراللہ!"

طلسم ٹوٹ گیا اور تمام کمرہ فرمائشی قہقہوں سے گونج اٹھا۔

لیکن شمیم کی آواز کچھ بھاری تھی اور اس کے لہجہ میں اس کی مخصوص ظرافت کا کوئی جزو شامل نہ تھا۔ اس نے کہا: "بھئی بڑی بدقسمتی کا سامنا ہے! مجھے دو گھنٹہ سے قلعہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے نجات ملی ہے۔ میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ کو انتظار کی زحمت گوارا کرنی نہ پڑی ہوگی کیونکہ میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ ابھی ابھی تو کوئی صاحب قہوہ کا ذکر کر رہے تھے؟"

مینیجر کرتار سنگھ نے چلا کر کہا: "آخر تھے کہاں تم؟ بڑی نالائق ہو ــ میں جانتا ہوں کہ تم نے کوئی شرارت ضروری کرنی ہے" ــ یہ ان کا پنجابی لہجہ تھا اور مسافر اس کے عادی ہو چکے تھے۔

شمیم نے جلدی سے جواب دیا: "میں نے؟ ــ میرے عزیز مینیجر صاحب اگر آپ نے کپتان کے سامنے اس قسم کے شبہات ظاہر کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے گھر پہنچنے تک قید خانہ میں بند رکھے گا!"

بیگم ارجمند کی قوت مشاہدہ بہت تیز تھی۔ انہوں نے کہا: "اماں تم انجن گھر میں تھے۔ ذرا اپنی قمیض تو دیکھو!"

"اوہ ــ یہ؟" ــ شمیم نے یہ کہہ کر لاپرواہی سے قمیض پر ایک نظر ڈالی۔ حقیقتاً یہ ناقابل استعمال ہو چکی تھی۔ دو تین جگہ سے تو اس کے بالکل چیتھڑے اڑ چکے تھے اور دامن پر کسی چکنی چیز کے چند بڑے بڑے داغ صاف نظر آ رہے تھے۔ باوجود ان سب باتوں کے اس کی ابرو پر بل تک نہ آیا۔ اس نے خوش مزاجی سے کہا: "اونہہ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اصل میں ڈر کے مارے میں سیڑھیوں پر سے لڑھک گیا۔ تنگ پاجامے اور ریشم کی لمبی لمبی قمیصیں بڑی ناکارہ ایجاد ہیں بھاگتے وقت مدد دینے کی بجائے الجھتی ہیں ــ بیگم ارجمند آپ نے دیکھا؟ ــ" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے تو نیند آ رہی ہے اس لئے اجازت چاہتا ہوں ... لیکن توبہ قہوہ تو بھول ہی گیا" ــ یہ کہہ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا!

سب مسکرا پڑے۔ بیگم ارجمند نے منہ پر رومال رکھتے ہوئے چپکے سے کہا: "معلوم نہیں آج اسے ہو کیا گیا ہے۔ چہرہ تو دیکھو کتنا زرد ہو رہا ہے۔ میں نہ مانوں گی کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے ــ!"

لیکن زہرہ اس وقت برداشتہ خاطر تھی۔ اس نے زیر لب کہا "اس کا کیا ہے۔ وہ تو مسخرہ ہے ــ مسخرہ!"

زہرہ اپنی قمیض کی وجہ سے خفا نہ تھی بلکہ اسے شمیم کی غیر مستقل مزاجی پر غصہ آ رہا تھا۔ جس قدر سنجیدگی سے اس نے اظہار محبت کیا تھا اسی قدر سختی اور سنجیدگی سے اسے صاف اور کورا جواب مل گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اپنی مایوسی کو اس قدر جلد اپنے دل سے محو کر دے اور اپنے لئے پھر وہی تفریح کی دنیا بنا لے!

غیر مستقل مزاج ــ غیر سنجیدہ اور محض تماشائی!

(۴)

دوسرے روز!

میجر کرتار سنگھ نے اپنا پنجابی لہجہ چھپاتے ہوئے نصرت سے دریافت کیا: "کیوں نصرت۔ آخر کل رات قصہ کیا تھا؟ میں نے آج صبح تمہیں انجینیر کے ساتھ دیکھا تھا۔ کہو کیا کیا باتیں ہوئیں؟ تم نے تو سب حالات دریافت کر لئے ہوں گے؟"

نصرت نے جواب دیا "میں بتانے سے معذور ہوں اور ـــــ اگر بتا بھی دوں تو شاید آپ سمجھ نہ سکیں۔ صرف دو چیزیں تھیں۔ بھاپ اور خطرہ۔ جہاز کے دو انجینئروں کے ہاتھ بالکل جھلس گئے تھے اور ایک کوئلہ ڈالنے والا بری طرح زخمی ہوا ہے۔ اس سے زیادہ میں نہیں بتا سکتا۔"

لیکن میجر کرتار سنگھ نے اپنے سوالات ختم نہ کئے تھے۔ کمرہ میں سب سے بلند آواز انہیں کی تھی اور وہ ہمیشہ اسی طرح گفتگو کیا کرتے تھے کہ دوسرا بھی سن لے۔ انہوں نے پھر سوال کیا "کیا تمہارا مطلب ہے۔ کہ بذات خود جہاز خطرہ میں تھا؟"

کپتان نصرت نے اپنے سامنے رکھے ہوئے رسالہ سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا "کم از کم میں تو یہی کہوں گا۔"

میجر صاحب نے کہا "شمیم صبح سے کہاں ہے؟"

"ابھی ذرا دیر ہوئی میں گیا تھا۔ تو وہ بستر پر لوٹ لگا رہا تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہو!"

عین اسی وقت شمیم اختر بھی ٹہلتا ٹہلتا آموجود ہوا۔

"اوہو" ـــــ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "سب موجود ہیں؟ کہئے میجر صاحب کیا حال چال ہیں؟ میں تو آج کل مریضوں میں شامل ہوں۔ کل سیڑھیوں سے گرتے وقت کلائی میں موچ آگئی تھی یہ دیکھئے نا۔"

اس نے اپنے بازو کو جنبش دی اور کلائی کو بچا کر میجر صاحب کو دکھایا۔ پھر اپنے ہاتھ کا انگوٹھا گریباں میں اس طور پر ڈال لیا۔ گویا یہ ایجاد ہی اسی لئے کیا گیا تھا۔ کہ اگر کسی کے چوٹ لگ جائے تو ہاتھ کو سہارا مل سکے۔ نصرت نے رسالہ سے نگاہیں ہٹا کر تھوڑی دیر تک شمیم کو غور سے دیکھا اور پھر مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔ لیکن میجر کرتار سنگھ خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے فوراً کہا "دیکھو جی۔ رات والے معاملہ میں تمہارا ہاتھ ضرور ہے . . . . اور مجھے اس کا یقین ہے!"

شمیم نے بلا پس وپیش جواب دیا "اور مجھے اس سے کب انکار ہے۔ سچ سچ اگر میں نہ ہوتا تو تم سب اس وقت سمندر کی تہ میں بیٹھے ہوا کھاتے!!!"

یہ کہہ کر وہ نہایت اطمینان سے ایک کتاب لے کر کرسی پر دراز ہوگیا۔ میجر کرتار سنگھ کچھ خفا سے معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کسی مسافر کا انجن گھر میں جا کر وہاں مشینوں کو ہاتھ لگانا ذرا کارے دارد تھا۔ اور گپ سے وہ چھیڑتے تھے۔ لیکن پھر بھی انہیں نصف سے زیادہ یقین تھا کہ اس قسم کی کوئی حرکت ہوئی ضرور ہے۔ وہ کچھ سوچتے رہے اس کے بعد چپکے سے اٹھ کر چل دیئے۔ ان کے جاتے ہی شمیم نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کتاب بند کر کے ایک طرف ڈال دی "دیکھا! میں نہ کہتا تھا؟" ـــــ اس نے نصرت سے کہا "نہیں معلوم ہے۔ میجر صاحب تشریف کہاں لے گئے ہیں؟ ہا ہا ہا! اب کپتان سے خوب منہ در منہ مباحثہ ہوگا" میں نے یہ پوچھنا ہے" (یہ ان کے پنجابی لہجہ کی نقل تھی!) "میں نے یہ کہنا ہے جی!" لیکن کپتان اسے ہوا بھی نہیں دے سکتا۔ وہ غریب بتا کیا سکتا ہے وہ تو قول دے چکا ہے"۔

نصرت نے صرف سر ہلایا (اس کی زبان بہت کم ہلتی تھی) اس لئے شمیم اٹھ کر عرشہ پر آگیا۔ کچھ مسافر ایک خاص قسم کے کھیل میں مصروف تھے اور یہ ناممکن تھا کہ شمیم کو مدعو نہ کیا جاتا۔ جہاں تک کھیل کا تعلق تھا وہ بھی کبھی انکار نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ قواعد بنانے کے بعد اسے شریک کر لیا گیا۔ اور عرشہ جہاز قہقہوں کی صداؤں سے گونجنے لگا۔ زہرہ بھی سلاخوں کا سہارا لئے کھڑی تھی اور کھیلنے والوں کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ جب شمیم اس کے نزدیک آیا۔ تو اس نے دریافت کیا "کیوں خیریت تو ہے؟"

شمیم نے جواب دیا "ہاں بالکل خیریت ہے۔ لیکن تم سے بولتے ہوئے آج ڈر معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری قمیص تمام ستیاناس ہوگئی!"

"آخر کیسے؟"

کھیل ختم ہوگیا اور دونوں پہلو بہ پہلو عرشہ پر ٹہلنے لگے۔

شمیم نے اپنا بیان شروع کیا۔ لیکن ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس نے کہا "گذشتہ شب اگر میں نہ ہوتا تو جہاز والوں کی جان کی خیر نہیں تھی۔ جونہی انجن بند ہوتے مجھے فوراً خیال آیا کہ لاؤ ایک نظر سے دیکھ تو لوں کہ انجینئروں کو تکلیف کیا ہے۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تکالیف جاتی رہیں۔ میری ایک آستیں جاتی رہی۔ لیکن میں نے جہاز زندہ درگور ہونے سے بچا لیا ـــ میں نے اور صرف میں نے . . . ."

وہ رک گیا اور پوچھا "تم اسے گپ سمجھ رہی ہو؟"

زہرہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "آپ کے خیال میں یہ بات قابلِ یقین بھی ہے"؟

شمیم نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں لیکن قاعدہ ہے دوست کی بات کا دوست اعتبار ——"

زہرہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے علم نہ تھا۔ کہ آپ کو میری دوستی . . . . ."

"اُفّ۔ خاموش رہو! تمہیں تو نہ جانے کیا ہوگیا ہے؟ میں اس سزا کا ہرگز ہرگز مستحق نہیں جو تم نے میرے حق میں تجویز کی ہے۔ پھر بھی —— مجھے قمیص خراب ہو جانے کا بہت رنج ہے اور اگر تم چاہو تو میں اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔ ہر طرح مصیبت ہی مصیبت ہے غالباً تمہیں اس کا بھی یقین نہ ہوگا۔ کہ میں سچ سچ پشیمان ہوں۔ زہرہ خدا کے لئے مجھ سے اس قدر بیگانگت کا برتاؤ تو نہ کیا کرو!"

اس کی باتوں میں سنجیدگی کی جھلک تھی۔ اور زہرہ دل ہی دل میں مسکرا پڑی۔ اس نے کچھ سوچ کر آہستہ سے کہا۔ "خیر قمیص کے معاملہ میں تو میں تمہیں معاف کر سکتی ہوں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ لڑکے کم و بیش شریر ہوتے ہی ہیں لیکن غضب تو یہ ہے کہ تم اب لڑکے بھی تو نہیں ہو؟"

یہ کہہ کر اس نے شمیم کی طرف دیکھا وہ پشیمان نظر آتا تھا لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں میں اس وقت بھی تبسم کی ہلکی سی لہر موجود تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لڑکا تھا اور بہت عرصہ تک رہیگا! زہرہ عنفوان شباب کے اس درجہ تک ابھی نہ پہنچی تھی۔ کہ ان بے بہا جذبات سے لطف اندوز ہو سکے اور انہیں قابلِ عفو سمجھ سکے!

شمیم نے خوش مذاقی سے کہا۔ "چلو تم نے قمیص تو معاف کی —— ذرا رکتے رکتے —— اور مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد تم میری خطا بھی معاف کر دوگی —— خطا نہیں جرأت"

زہرہ کی ابرو پر بل پڑ گئے۔ اس نے آہستہ سے کہا! "اس کے متعلق ہم جتنا اختصار کریں میرے خیال میں اتنا ہی اچھا ہوگا"۔

"اچھا یونہی سہی۔ لیکن تمہیں اس کا احساس تو ہوگا"۔ پھر وہی سنجیدگی کی جھلک —— "کہ میں سنجیدہ تھا اور ہوں"۔

زہرہ نے بے رخی سے کہا۔ "جہاں تک گپ کا تعلق تھا اور ہے وہاں تک آپ سنجیدہ تھے اور ہیں!!! —— خدا جانے آپ نے زندگی بھر کوئی ایسا کام بھی کیا ہے جو قابلِ فخر ہو۔ کیوں شمیم اختر صاحب"؟

شمیم کو بھی غصہ آگیا۔ "کاش تم مجھے صرف شمیم کہا کرو! ہاں میں نے کل ایک کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی۔ کیا یہ قابلِ فخر کام نہ تھا؟"

زہرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ کیونکہ وہ کنکھیوں سے دیکھ چکی تھی۔ کہ نصرت ٹہلتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے!

(۵)

دنیا میں بہت لوگ ایسے ہیں جن کو ایک نظر دیکھنے کے بعد کوئی شخص ان کی خوبیاں نہیں بتا سکتا!"

قصرِ "بہار افزا" کے مکیں آتشدان کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ زہرہ کی چچی بیگم ہارون اپنے شوہر سے امور خانہ داری کے متعلق چپکے چپکے کچھ گفتگو کر رہی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے فیروز ہارون کو یہ کہتے سنا۔ تو ان سے نہ رہا گیا اور وہ کہنے لگیں۔ "فیروز سچ تو کہتا ہے! میں بھی اس سے قبل فیروز کی ہم خیال نہ تھی۔ میں سوچتی تھی کہ انسان میں بہادری کا شائبہ ہو۔ انسان دلیر ہو تو بھلا مجال ہے کہ دوسروں کو معلوم نہ ہو۔ لیکن پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ فیروز کے متعلق مجھے ہمیشہ سے بزدل ہونے کا شک تھا اور اس شک کے باوجود ایک روز بیچ سمندر میں ہماری کشتی الٹ گئی۔ اس دن فیروز نے جس بہادری سے کود کر ہماری جان بچائی ہے۔ وہ میں اب تک نہیں بھولی!"

فیروز ہنس پڑا! "توبہ تم بھی کتنی بات بڑھانے کی عادی ہو!اماں وہ بیچ سمندر تھا یا کنارے سے ذرا سا فاصلہ؟"

زہرہ نے آہستہ سے کہا! "کچھ بھی ہو میں ہرگز ہرگز یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ مرد بہادری کا کام کرے اور اسے فخریہ بیان کرنے کی کوشش نہ کرے!

فیروز نے کہا! "تم غلطی پر ہو!"

زہرہ اپنی بات پر جمی رہی۔ کیونکہ وہ اس موضوع پر ایک نتیجہ اخذ کر چکی تھی اور جب نتیجہ اخذ ہو جاتا ہے۔ تو اس کو تبدیل کرنا ذرا فضول سی بات ہے ——!

فیروز نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔ اچھا کل ہمارے ہاں جو مہمان آرہے ہیں۔ ان میں

ایک ایسی ہستی ہے جو سب سے زیادہ شجاع اور میرے دوستوں میں غالباً سب سے بہتر ہے۔ میں اس کا نام نہ بتاؤں گا۔ بلکہ اس کا فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم اگر معلوم کر سکتی ہو تو کر لینا کہ وہ ہے کون؟ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے تم کامیاب نہیں ہو سکتیں"۔

زہرہ نے جواب دیا۔ "فیروز تم لڑکپن کی باتیں کر رہے ہو۔ میں ایک تماشائی ایک آوارہ گرد اور ایک حقیقی انسان کے مابین ہمیشہ امتیاز کر سکتی ہوں"۔

فیروز نے سر ہلایا۔ "کبھی نہیں۔ میں شرط لگاتا ہوں ——"

زہرہ مسکرا پڑی۔ اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ جو کچھ بھی ہو"۔

فیروز آرام سے کرسی پر دراز ہو گیا اور ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "صرف زبانی جمع خرچ! تم جانتی ہو کہ میری جیب میں شرط کے لئے پیسے یا روپے کبھی ہوتے ہی نہیں" —— پھر موضوع تبدیل کر کے —— "ہاں تم اگر چاہو تو میں اس ہستی کے کارنمایاں بہ تفصیل تمہیں سنا سکتا ہوں۔ پھر بھی شاید تم اس کا پتہ نہ بتا سکو گی۔ . . . میری اس کی ملاقات جنگ آسام کے موقع پر ہوئی۔ اس نے دو مرتبہ جنگ میں میری جان بچائی۔ ایک مرتبہ تو میرے بچاؤ کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ لیکن اس نے جس جاں جوکھوں سے مجھے بچایا ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ ہم نے ایک بہت بڑا جنگل طے کر کے دشمنوں پر حملہ کیا۔ لیکن ان پہاڑیوں نے کیا حرکت کی کہ اپنے نصف آدمیوں کو تو حملہ روکنے کے لئے چھوڑ دیا اور بقیہ نصف کو جنگل میں آگ لگانے کے لئے بھیج دیا۔ افوہ۔ جب ہمیں یہ خبر ملی ہے۔ تو فوج میں ایک آفت برپا ہو گئی۔ آگے دشمن کا ملک پیچھے جلتا ہوا میل بھر لمبا جنگل۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ وہ تو یوں کہو کہ ہمیں عین وقت پر خبر مل گئی۔ افسروں نے واپسی کا حکم دیا۔ اور تمام فوج اُلٹے قدموں واپس ہونی شروع ہوئی۔ لیکن جنگل میں داخل ہوتے ہی دھواں جو گھٹنا شروع ہوا ہے تو الہی توبہ۔ میں زخمی بھی ہو چکا تھا۔ اس لئے برداشت نہ کر سکا اور وہیں گر پڑا۔ میرا دوست میرے ساتھ ساتھ تھا اس نے مجھے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ اور دھوئیں اور آگ کا مقابلہ کرتا ہوا ان کے خلاف لڑتا ہوا آخرکار مجھے دشمن کے نرغے سے نکال ہی لایا!!!" —— خاموشی! —— "جنگ کے بعد وہ ادھر اُدھر آوارہ پھرتا رہا۔ لیکن بدستور اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ چند روز ہوئے مجھے اس کی خیر و عافیت ایک اور دوست سے معلوم ہوئی جو ایک جہاز پر کپتان ہیں۔ وسط سمندر میں ایک مرتبہ انجن خراب ہو گئے (زہرہ چونکی) جہاز کے دو انجینئر جھلس چکے تھے۔ لیکن بدقت تمام دونوں انجن گھر سے باہر آ گئے اندر ایک کوئلہ جھونکنے والا پڑا رہ گیا۔ وہ بیچارہ تمام جل چکا تھا۔ اور زخموں کے مارے اپنی جگہ سے ہل تک نہ سکتا تھا۔ میرا عزیز دوست —— وہی ہیرو جس کا میں ذکر کر رہا ہوں —— اسی جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ صرف وہی ایسا تھا۔ جو تنہا اس جہنم میں گیا اور اس کوئلہ جھونکنے والے کو نکال کر لایا!!! —— یہی نہیں وہ ایک اور انجینئر کو لے کر واپس گیا اور جب تک انجن ٹھیک نہ کر لئے اس وقت تک دم نہ لیا۔ بائلر کے پھٹ جانے سے ہر لحظہ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن اس نے صرف دوسرے مسافروں کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی ذرہ بھر پروا نہ کی اور یہی نہیں۔ جن لوگوں کو اس کا علم تھا کہ محض اس کی تندہی اور جاں فشانی سے جہاز غرقاب ہونے سے بچ گیا۔ اس نے انکو قسم کھانے پر مجبور کیا۔ کہ مسافروں سے اس کا ذکر تک نہ کریں لیکن اس قدر عظیم الشان قربانی کو پس پردہ رکھنے کی کون کوشش کرتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر تم اسے دیکھو تو بادی النظر میں یہ اندازہ ہرگز نہیں لگا سکتیں۔ کہ وہ ایسا کام کر سکتا ہے —— پھر کچھ سوچ کر ——" بس اس سے زیادہ میں نہ بتاؤں گا"۔

زہرہ نے کہا۔ "مت بتاؤ۔ میں خود جانتی ہوں۔ میں نے اسی جہاز پر گذشتہ دنوں سفر کیا تھا"۔

"ارے! تم بھی اسی جہاز پر تھیں؟ واہ بڑے مزے کی بات ہے۔ پھر تو کل تم اپنے پرانے دوستوں سے ملو گی۔ کیوں زہرہ؟ اور بہت ممکن ہے۔ کہ تم اس ہیرو کو جانتی بھی ہو۔ لیکن مجھے شبہ ہی ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ اس کا دوست ہونے کے باوجود بھی تمہیں اس کے اوصاف معلوم نہیں"۔

زہرہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بالکل غلط! بہت دن ہوئے میرا اس کا تعارف ہوا تھا۔ اور اسی وقت مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ اس میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں۔ اگرچہ وہ بہت خاموش طبیعت کا انسان ہے لیکن میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ کہ وہ ایک خاص کردار

مالک ہے - ہے نا؟ اگر وہ کل آ رہا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے کتاب اٹھالی اور ورق لوٹنے لگی - اس کے چہرہ پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ چکی تھی - اور اس کا دل بار بار ان خاموشی سے بسر کئے ہوئے لمحات کی یاد دلا رہا تھا جو اس نے عرشۂ جہاز پر کسی کے ہمراہ گذارے تھے - فیروز بہت دیر تک اسے دیکھا کیا - پھر زیرلب کہنے لگا "یہ بات ہے؟ ـــ تب تو زہرہ بہت دور اندیش ہے!!!"

(۶)

دوسرے روز "قصر بہار افزا" مہمانوں کی کثرت سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا - بندوقوں کے بکس - چھوٹے بڑے سوٹ کیس اور مختلف اقسام کے صندوق اس قدر تعداد میں جمع تھے - کہ تعجب ہوتا تھا - بیگم ہارون کی سب سے گہری سہیلی بیگم ارجمند کو اگر مدعو نہ کیا جاتا تو ظلم تھا وہ آئیں اور اپنے ہمراہ ایک تازگی اور شگفتگی لائیں - جب انہیں معلوم ہوا کہ زہرہ جبتیں بھی یہاں مہمان ہے - تو بیحد مسرور ہوئیں اور کہنے لگیں "کل شمیم اختر اور کپتان نصرت بھی آنے والے ہیں؟ میں تو یہ سمجھو نگی - کہ ایک مرتبہ پھر ہم سب جہاز پر سوار ہیں - ابھی گذشتہ یکشنبہ کو شمیم اور میں وہی زمانہ یاد کر رہے تھے - ہاں شمیم سے میری ملاقات ہوئی تھی - وہ شہر میں ٹھیرا ہوا تھا اور سنجانے کس کا انتظار کر رہا تھا - مگر اس کی تفریح اور مسخرہ پن کبھی نہ گیا - اور کپتان نصرت الٰہی پناہ - ایک روز شمیم چائے کے لئے اسے ہمارے ہاں گھسیٹ لایا - کیا بتاؤں کس قدر خاموش اور غیر دلچسپ انسان ہے!"

یہ سنکر زہرہ سے نہ رہا گیا اس نے کہا "کپتان نصرت کو غیر دلچسپ کون کہتا ہے؟ کم ازکم اس وقت تو وہ ایسے نہ تھے - جب ہماری ملاقات ہوئی تھی"۔

بیگم صاحبہ نے جواب دیا "عزیزمن نہ صرف غیر دلچسپ بلکہ گونگا ـــ بات تو کرنا جانتا ہی نہیں - مجھے یاد ہے کہ اس نے دوران گفتگو میں ایک مرتبہ اپنا منہ کھولا - اور وہ بھی شکر کے دو ڈلوں کی بجائے پانچ ڈلے مانگنے کے لئے! اگر کوئی صرف نصرت ہی کی مہمان نوازی کرے تو خدا جانے اس کا کیا حشر ہو - وہ تو شمیم موجود تھا - ورنہ میں اس قدر خاموش انسان کبھی اپنے ہاں مدعو نہ کرتی - بس اکیلے شمیم کے دم سے تمام کونت جاتی رہتی ہے . . . آج کل دونوں بڑے دوست ہیں - عید تو دونوں نے کپتان نصرت ہی کے گھر گذاری - اب یہ معلوم نہیں کہ نصرت کے اور گھر والے کیسے ہیں؟ اگر اسی کی طرح "صمٌ بکمٌ" ہیں تو بس ـــ! غریب شمیم پر کیا گذری ہوگی - اف وہ اس لڑکے نے بھی غضب کا مزاج پایا ہے - مجھے یقین ہے کہ وہ جاذو تک کو ہنسا سکتا ہے"!

زہرہ نے کسی قدر گرمجوشی سے کہا "بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی"۔

لیکن ایک اور خیال مدنظر رکھ کر اس نے ایسا کہا تھا اسے یقین تھا شمیم کے دماغ سے ناکامی کے تاثرات زائل ہو گئے ہونگے اور شمیم پھر وہی پہلا سا شمیم ہوگا - کیونکہ مستقل مزاجی آخری خوبی تھی - جو شمیم میں پائی جا سکتی تھی ـــ کم ازکم زہرہ کا خیال تو یہی تھا - کہ اس نے غیر مستقل مزاجی کے باعث تمام گذشتہ واقعات بھلا دئے ہوں گے *

تیسرے پہر کے قریب وہ ساحل سمندر کی طرف سیر کی غرض سے نکل گئی - لیکن اسے اطمینان نصیب نہ تھا - رہ رہ کر اسے شمیم اختر کا خیال آتا تھا - اور وہ سوچ میں پڑ جاتی تھی - شمیم کے متعلق اس کا اندازہ غلط تو نہ تھا - لیکن جب وہ سوچتی تھی - کہ کہیں میں نے یہ اندازہ لگانے میں غلطی تو نہیں کی تو وہ پریشان ہو جاتی تھی اور پھر شمیم سے ملاقات ـــ وہ کیونکر آنکھیں چار کر سکے گی؟ ـــ ان تمام تصورات نے زیادہ دیر کے لئے اسے اور پریشان کر دیا *

یکایک اسے نصرت کا خیال آیا اور وہ بے اختیار مسکرا پڑی "چلو یہ اچھا تھا - کہ نصرت موجود ہوگا - ورنہ شمیم کی تنہا موجودگی اس کے لئے بے معنی سی چیز تھی - وہ صرف ان لوگوں کو انتہا سے زیادہ چاہتی تھی - جو دنیا کا مشکل ترین کارنامہ انجام دے کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور تعریف و تحسین کے طوفان بے تمیزی کو چپ چاپ گذر جانے دیتے ہیں - فیروز نے اپنے ہیرو کا جو نقشہ کھینچا تھا - وہ حرف بحرف نصرت پر صادق آتا تھا - اور اسی خیال نے نصرت کی عزت اور انسیت زہرہ کے دل میں اور بڑھا دی - یہ سوچتے ہی اس کے چہرہ پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی - ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے فیروز کے بتائے ہوئے واقعات گذرنے لگے - اور بالآخر تخیل نے

نصرت کا دھندلا سا خاکہ اس کے پیش نظر کر دیا۔ خاموشی اور بیگانگت کے پس پردہ وہ ایسے نصرت کو دیکھ رہی تھی جو ہیرو تھا۔ اور سب سے بالا و برتر!

کاش شرارت اور رندان کا مجسمہ ہونے کی بجائے شمیم بھی نصرت جیسا ہوتا!

وہ پھر جھنجھلا اٹھی۔ آخر اسے بار بار شمیم ہی کیوں یاد آ جاتا ہے؟ وہ اپنے آپ کو اگرچہ شمیم سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی تمنا تھی کہ ادنےٰ درجہ کا تماشائی ہونے کی بجائے شمیم کو کچھ زیادہ وقعت کا مالک ہونا چاہیئے تھا!!!!

جب وہ واپس لوٹی۔ تو ہال میں بہت بڑا مجمع تھا۔ سب سے پہلے جو چیز اسے سنائی دی وہ ایک خاص قہقہہ تھا اور پھر شمیم کی موجودگی کا احساس جو خوش تھا بشاش تھا۔ اور ہر طرح مطمئن نظر آتا تھا زہرہ کو دیکھتے ہی وہ کھل گیا اور انتہائے شوق سے اس کی طرف بڑھا۔

مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا "تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے انتہائی سرور حاصل ہوا۔ زہرہ میں بہت خوش قسمت ہوں!"

زہرہ نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور اگرچہ وہ "نہایت سرد مہری سے ہاتھ ملانا چاہتی تھی۔ لیکن شمیم کے گرم اور پر شوق ہاتھ نے اس کے تمام ارادے زائل کر دئے۔ اسے یہ معلوم کر کے صدمہ ہوا۔ کہ شمیم اس کی ملاقات سے حقیقتاً اتنا ہی خوش ہوا جتنا کہ وہ کہہ رہا تھا (تو کیا شمیم ابھی تک ماضی کو فراموش نہ کر سکا؟) زہرہ نے اس کے بعد اپنے دوسرے دوستوں سے ایک ایک کر کے مصافحہ کیا اور سب سے آخر میں کپتان نصرت کی باری آئی۔ وہ سب سے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور جب زہرہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ تو اس نے نصف قدم بڑھ کر استقبال کیا۔ اس کے چہرہ پر سرخی کی ہلکی سی جھلک موجود تھی۔ اور یہ پہلا موقع تھا۔ کہ باوجود اپنی خاموشی اور بے زبانی کے نصرت نے چہرہ سے اپنے جذبات کا اظہار کیا!!!

نصرت نے خاموشی سے ایک کرسی زہرہ کی طرف سرکا دی اور جب وہ بیٹھ گئی تو اپنے حصہ کی پیالی بھی پیش کر دی۔ بیگم ارجمند نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور کہنے لگیں "زہرہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ہرگز یہ پیالی قبول نہ کرتی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے شکر کے دس ڈلے اس میں غائب ہوتے دیکھے ہیں!"

نصرت نے اپنی نگاہیں اٹھائیں لیکن زبان سے کچھ نہ کہا (جہاں اشاروں سے کام چل سکتا تھا وہاں وہ کبھی بولتا بھی نہ تھا) اور خاموشی سے زہرہ کی گفتگو سننے لگا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ زہرہ بیٹھی باتیں کئے جائے اور نصرت سنے جائے۔ اس کا چپ چاپ رہنا زہرہ کو گراں نہ گذرتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے "محویت" سمجھا کرتی تھی!

بیگم ہارون نے کہا "زہرہ تم اس بھلا بھگت کو (یہ نام شمیم کا عطیہ تھا) اپنے ساتھ کھانے پر بٹھانا۔ تم نے غریب پر کوئی جادو کر دیا ہے تمہارے ساتھ یہ خوب کھل کر باتیں کرتا ہے"۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ کیونکہ نصرت نے جب سنا کہ وہ کھانے پر زہرہ کے ساتھ بیٹھے گا تو مسکرا پڑا اور اگرچہ اس نے میز پر بھی بہت کم باتیں کیں لیکن زہرہ کو اس سے کیا شکایت ہو سکتی تھی۔ کھانے کے بعد بھی دونوں ہال کے ایک کونے میں علیحدہ جا بیٹھے۔ شمیم منتظر تھا کہ زہرہ سے تنہائی میں کچھ کہے۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا تو خاموشی سے "اٹن گھر" کی طرف چل دیا۔ بقیہ مہمان وہاں جمع تھے۔ شمیم کی موجودگی نے چند ہی لمحات میں اپنا اثر جمایا اور کچھ دیر بعد تمام کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگا۔

بہت دیر تک یہی ہوتا رہا۔ اگر شمیم نے کہا کہ آؤ "آنکھ مچولی" کھیلیں تو سب کے سب بچے بن گئے اور باغ میں آنکھ مچولی ہونے لگی۔ اور اگر اس نے ایسا ہی کوئی اور کھیل ایجاد کیا تو سب نے اسے ہی کھیلنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سب اپنے اپنے کروں سے تکیے اٹھا لائے اور دو گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک خاصی "جنگ عظیم" شروع کر دی۔ شمیم کے تمام ساتھی اسے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے اور کچھ دیر تک مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن بھاگتے ہی بنی۔ جلدی سے نصرت کی خوابگاہ میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ نصرت آتشدان کے پاس کرسی پر نہایت آرام سے لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ شمیم نے جب اس سے "دخل در معقولات" کی معافی چاہی۔ تو اس نے بھاری لہجے میں اس سے کہا۔ کہ مہربانی فرما کر کمرہ سے نکل جائیے۔

شمیم نے دروازہ سے کان لگا کر سنا۔ تو اس کے حریف سیڑھیوں

سے اتر رہے تھے جب ان کے قدموں کی آواز غائب ہوگئی۔ تو وہ نہایت اطمینان سے واپس آکر نصرت کی میز پر بیٹھ گیا اور نہایت محبت سے کہنے لگا "میرے عزیز دوست۔ میں تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اپنے چند قیمتی لمحات مجھے دے سکتے ہو؟"

"صرف دو منٹ!"

نسیم چھت کو دیکھنے لگا "بڑے سخی ہو واللہ ۔۔۔ سنو معاملہ بہت نازک ہے۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تم سچ مچ یہ کام کرنا چاہتے ہو؟ اور تم پوری طرح مجروح ہوئے ہو یا نہیں اور تمہارے دل میں بھی وہی ہے جو تم ظاہر کرنا چاہتے ہو یا نہیں۔ میرے مسکرانے پر خفا مت ہونا ابھی اصلی مطلب پوشیدہ ہے"۔

کمرہ میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد نصرت اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ یکایک اس نے کہا "تم جو کہنا چاہتے ہو وہ میں سمجھنے سے قاصر ہوں بہتر ہے کہ تم کمرہ سے چلے جاؤ"۔

نسیم اس کی عادت سے واقف تھا اس نے کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا "یار تم اس قدر جلد خفا کیوں ہو جاتے ہو اگر مجھے ایک سوال کا جواب دیدو تو اس میں کیا نقصان ہے"؟

نصرت نے سختی سے پوچھا "آخر تم دریافت کیا کرنا چاہتے ہو"؟

نسیم نے نرم لہجہ میں کہا "حضرت اتنا کہ تم زہرہ جبیں سے شادی کروگے یا نہیں"؟

"تو میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں"۔

نسیم نے مسکراتے ہوئے کہا "بڑے دوراندیش ہو دوست . . . میں جانتا ہوں کہ مجھے دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں لیکن پھر بھی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔ اچھا تمہیں زہرہ سے محبت ہے"؟

نصرت نے تیزی سے کہا "تم کیوں یہ سوال کرتے ہو"؟

نسیم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے سر جھکا کر کہا "بیشک اس قسم کی چھان بین کرنا بڑی رکیک حرکت ہو لیکن مجھے شبہ تھا۔ سچ پوچھو تو میں اس شبہ میں اسی وقت سے گرفتار تھا جب ہم "عقاب ہند" پر ہم سفر تھے۔ تو یہ سچ ہے"؟

"ہاں ۔۔۔ یہ سچ ہے"!

نسیم اس کے لہجہ پر ہنس پڑا "اگر یہ سچ ہے تو بہت اچھی بات ہے ۔۔۔ خدا تمہارے مستقبل کو بابرکت بنائے۔ نصرت میری دلی تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں ۔۔۔ بتا دینے کا شکریہ"!

وہ بڑھا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اگر دوست کی صلاح پر عمل کرنا چاہتے ہو تو زہرہ کی مرضی جلد از جلد حاصل کرلو"!

یہ کہہ کر وہ کودتا پھاندتا باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کرتا گیا۔

(۷)

بہار افزا سے کچھ دور ایک تاریخی مسجد کے کھنڈر تھے جو باوجودیکہ استداد زمانہ سے پامال ہو چکے تھے لیکن سیاحوں کی نظر میں اب بھی وقعت رکھتے تھے۔ بیگم ارجمند کے مہمانوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے دل میں یہ کھنڈر دیکھنے کی تمنا نہ ہو اس لئے سب سے مشورہ کرکے یہ طے پایا کہ اگلے روز تیسرے پہر کو تمام مہمان ساتھ ملکر وہاں چلیں حسب دستور نسیم نے نہایت گرمجوشی سے اس میں حصہ لیا اور جب سب چلے تو نسیم اور اس کا ایک اور ہم عمر ساتھی حمدی (اگرچہ اس کا اصلی نام حمید تھا) بیگم ارجمند کے ساتھ سب سے آگے آگے تھے۔ بات بات پر بیگم صاحبہ قہقہہ لگاتی تھیں۔ جو دور دور تک سنائی دیتا تھا۔

نصرت اور زہرہ بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھے کہ باقی سب لوگ بہت دور نکل گئے لیکن کسی کو خبر نہ ہوئی۔ آخر زہرہ چونکی اور اس نے کہا "ہم کو ذرا قدم بڑھا کر چلنا چاہئے۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی"۔

نصرت نے لاپرواہی سے کہا "کیا سچ مچ"؟

زہرہ نے کہا "ہاں ۔۔۔ آخر اس وقت پہنچنے سے کیا فائدہ جب سب واپس آرہے ہوں"؟

نصرت نے کہا "تو ہم اس وقت جاتے ہی نہیں"۔

زہرہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو نصرت نہایت شوخ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا وہ نرم لہجہ میں کہنے لگی "یہ تو ذرا اچھی بات نہیں معلوم ہوتی"!

نصرت نے سادگی سے جواب دیا "اگر تم کل صبح میرے ساتھ چلنا پسند کرو تو میں تیار ہوں"۔

دو راستے سامنے تھے۔ ایک ساحل کی طرف جاتا تھا اور دوسرا وہ جس پر تمام مہمان گئے تھے۔ دیکھ کر نصرت رک گیا اور ملتجیانہ نگاہوں سے زہرہ کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی کوئی فیصلہ نہ کرسکی اور چپ چاپ کھڑی

ہو گئی لیکن اتنا صرور تھا کہ با وجود کوشش کے وہ نصرت سے آنکھیں چار نہ کر سکتی تھی۔ یکایک نصرت نے جیب سے ہاتھ نکال کر بڑھایا اور کہا۔ "زہرہ جبیں ——— میرے ساتھ آؤ!"

زہرہ نے تامل کیا لیکن جب نصرت کو منتظر دیکھا تو اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور سست لہجہ میں پوچھا "کپتان نصرت آخر کہاں تک"؟

نصرت کے چہرہ پر تبسم پھیل گیا اس نے کہا "تمام راہ"

زہرہ نے ہنستے ہوئے دریافت کیا "اور وہ کتنی دور ہے"؟

"ہماری نگاہوں سے بہت دور!" ——— یہ جواب تھا ——— "آؤ زہرہ ہم زندگی کی شاہراہ پر پہلو بہ پہلو چل کر منزل مقصود کا پتہ لگائیں ——— آؤ"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جب دونوں گھر واپس آئے تو بہار کو بہت دیر ہو چکی تھی۔ دونوں چپکے چپکے داخل ہوئے اور جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے علیحدہ ایک کونے میں جا بیٹھے لیکن شمیم کی نگاہوں سے پھر بھی نہ بچ سکے۔ اس نے انہیں دیکھ لیا اور بہت بیدردی سے ہاتھ دھو کر نصرت کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ کہنے لگا "نالائق ——— بدتمیز۔ اگر آئندہ ایسا موقعہ آیا۔ تو یاد رکھنا کہ تمہیں سب سے آگے چلاؤں گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم واقعی بگلا بھگت ہو۔ دیکھنا جب ان لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ تم دونوں کہیں کھسک گئے ہو تو سب نے مجھے "بنانا" شروع کر دیا۔ واللہ بدنام کر دیا۔ رسوا کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ اسی طرح باتیں بناتا رہا لیکن نصرت نے مطلق کوئی التفات نہ کیا۔ وہ یہی کیا کرتا تھا کہ شمیم جو کچھ اس کے متعلق کہتا تھا۔ ہمیشہ خاموشی سے سن لیا کرتا تھا۔ ذرا دیر بیٹھنے کے بعد جب زہرہ اٹھ کر چلدی تو شمیم ٹہلتا ہوا نصرت کے پاس پہنچا اور کہنے لگا "اڈیسمنٹ کے کورٹ پر ٹینس کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ میں اب تک اس پر ٹینس نہیں کھیلا دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ اس میں آخر کیا بات ہے"؟

پہلے تو نصرت نے انکار کیا۔ لیکن بعد میں راضی ہو گیا۔ جب دونوں اپنے اپنے بلے بغل میں دبائے روش پر جا رہے تھے تو شمیم نے چپکے سے کہا "غالباً مجھے چاہئے کہ تمہیں مبارکباد دوں۔ کیوں نصرت"؟

نصرت نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "عزیزمن اگر ایسا کرنے سے تمہیں خوشی حاصل ہوتی ہو تو بے شک مبارکباد دے سکتے ہو۔

شمیم نے اسی انداز سے کہا "اچھا ——— دوست تم نہایت خوب انسان ہو! اور اسے خوش رکھ سکو گے"۔

نصرت نے جواب دیا "میں انتہائی کوشش کروں گا"۔

شمیم صرف مسکرا دیا۔ اس کی تمناؤں کا خون ہو چکا تھا اور ایک عزیز ترین اور بیش بہا چیز ہاتھ سے نکل جانے پر اس کا دل رو رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے کسی فعل سے دلی جذبات ظاہر ہونے نہ دیئے اسے زہرہ سے عشق تھا اور اگرچہ ایک مرتبہ زہرہ اس کی امیدوں کو ٹھکرا چکی تھی لیکن وہ امید ابھی تک مفقود نہ ہوئی تھی شاید ایک دن ——— ؟ لیکن اب ۔ ۔ ۔ ہاں اب اس کے لئے وہ امید بھی باقی نہ تھی۔ شمیم نے ضبط کیا اور اپنے جذبات کو مردانہ طور پر دبائے رکھا۔ وہ نہایت جوش سے ٹینس کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ تکالیف فراموش کرنے کے لئے ہمیشہ کسی ایسی چیز کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو توجہ دوسری طرف منعطف کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ نصرت بار بار سوچتا تھا۔ کہ وہ کیا بات ہے جو شمیم اس سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے ——— اور کھیل کے دوران میں بھی وہ یہی سوچتا رہا"۔

سردی کا زمانہ تھا۔ لیکن دونوں پسینے پسینے ہو گئے۔ شمیم نے تو جوش میں آکر آستینیں چڑھا لیں اور بالآخر نصرت کو شکست دے کر ہی چھوڑی جب کھیل ختم ہو گیا تو اور لوگ جو ذرا دیر کے لئے آ کھڑے ہوئے تھے تالیاں بجانے لگے۔ شمیم نے مڑ کر دیکھا تو بیگم ہارون اور زہرہ پاس پاس کھڑے تھے۔ دوسری طرف فیروز ہارون نصرت کی آمد کا منتظر تھا۔ شمیم اس قدر یکسو ہو کر کھیل رہا تھا۔ کہ ان کے آجانے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ فاتحانہ انداز سے مسکراتا ہوا انکی طرف دوڑا۔

اس نے بیگم ہارون سے کہا "میں تو جب تک رات نہ ہو جائے آتشدان کے نزدیک بھی نہیں جا سکتا۔ آپ دیکھتی ہیں پسینہ کی کیا حالت ہے؟ ابھی ہم ایک سٹ اور کھیلتے لیکن روشنی کافی نہیں ہے، کیا آپ لوگ سیر کے لئے جا رہے ہیں کہئے تو میں اور نصرت بھی

چلیں۔کیوں نصرت چلو گے؟"

وہ پوچھنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ زہرہ کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "ہیں شمیم۔تم نے اپنے بازو کو کیا کیا؟ اس پر یہ زخم کیسا ہے؟

"کچھ نہیں کچھ نہیں" کہہ کر شمیم نے آستیں الٹنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ زہرہ نے روک دیا۔ وہ کہنے لگی "تمہیں بتانا پڑیگا آخر یہ زخم کیسے اور کب لگا۔ بتاؤ شمیم"

فیروز نے مسکرا کر کہا "یہ حضرت کبھی نہیں بتا سکتے۔نصرت سے دریافت کرو

شمیم پریشان سا ہو گیا۔اور جلدی سے کہنے لگا "خبردار نصرت۔اگر تم نے بتایا تو اچھا نہ ہوگا۔یاد رکھنا اتنی مرمت کر دوں گا کہ کچومر نکل جائے گا۔بھئی واہ سورج غروب ہونے کے بعد چاند کو نکل آنے کی کیا بری عادت پڑ گئی ہے ... اب دیر ہو گئی اور اندر چلیں"۔

فیروز نے اپنا مضبوط بازو شمیم کی کمر میں ڈالتے ہوئے کہا!

"زہرہ میں تمہیں بتاتا ہوں یہ نالائق اپنے میزبان کا سر تو نہیں توڑ سکتا۔جہاز "عقاب ہند" . . ."

"فیروز!"

لیکن فیروز نے کوئی پرواہ نہ کی اور کہتا چلا گیا "عقاب ہند کے انجن گھر میں شمیم کا یہ بازو جھلس گیا تھا۔تم تو اسی جہاز پر تھیں۔شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک رات انجن خراب ہو گئے تھے۔وہی پرانا قصہ۔سمجھ گئی نا۔اب یہ شخص قابو سے باہر ہوا جا رہا ہے۔نصرت ذرا میری مدد کرنا۔ہاں زہرہ تم تو کہتی تھیں۔کہ تمہیں سب واقعہ معلوم ہے اور تم عقاب ہند کے ہیرو سے بھی واقف ہو؟"

زہرہ نے بھرائے ہوئے لہجہ میں کہا "مجھے یہ معلوم نہ تھا ——— میں نے یہ اندازہ قائم نہ کیا تھا!"

اس کے بعد اس کی نظروں میں ایک تاریک رات۔کمرہ رقص اور شمیم کا کہنا "اصل میں ڈر کے مارے میں سیڑھیوں پر سے لڑھک گیا تھا"۔اف وہ اس وقت اس نے کتنا عظیم الشان کام کیا تھا۔لیکن ......

اس کے المناک لہجہ نے دقتیہ طور پر سب کو پریشان کر دیا اور ایک خاموشی چھا گئی۔شمیم نے آخری کوشش کر کے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور چلا کر بولا "بیوقوف ——— پرلے درجہ کا گدھا ——— دیکھو نصرت اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا۔فیروز فیروز احمق نہ بنو۔ہٹو مجھے چھوڑ دو!"

نصرت نے مسکرا کر کہا "شمیم تم اپنی خوبیاں ہمیشہ نہیں چھپا سکتے جب تم کوئی نمایاں کام کرو۔تو اس کے لئے بھی طیار ہو جانا چاہئے۔کہ لوگ اس سلسلہ میں تمہارا نام لیں!"

فیروز نے بھی کہا "شمیم تم ہو بڑے کوڑھ مغز۔اگر کوئی تمہیں اس وقت دیکھے تو یہ خیال قائم کرے کہ مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانا بڑے شرم کی بات ہے۔اسام میں بھی تمہارا یہی حال تھا۔جب کام ہو چکتا تو اس طرح غائب ہو جاتے۔جیسا کہ گدھے کے سر سے سینگ ہر کوئی یہی سمجھتا تھا۔کہ تم محض تماشائی ہو حالانکہ اگر کوئی شخص ڈھونڈیا کر اس کا مستحق تھا تو تم تھے"۔

شمیم جلد جلد کوٹ پہن کر مڑا لیکن غصہ کے مارے برا حال تھا۔وہ کہنے لگا "تم بکتے ہو! اگر تم کسی کے کردار کا اندازہ ان افعال سے کرتے ہو جو جلد بازی میں اس سے سرزد ہو گئے ہوں تو مجھے یقین ہے کہ تم دنیا کے بدترین سیاہ کار کے سینہ پر ڈھونڈیا کر اس آویزاں کر دو گے!"

فیروز اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا "جی ہاں جلد بازی میں سرزد ہو گئے! عزیز دوست تم میں ہے ہی کیا۔بس جلد بازی ہی جلد بازی ہے۔یہی سبب ہے کہ تم مشکل سے مشکل کام بھی اندھا دھند کر گذرتے ہو"

شمیم نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا "جی میں آتا ہے کہ تمہارے ایک لات . . . . ."

(۸)

"شمیم اچھا ہوا تم مل گئے۔میں تمہیں ڈھونڈ ہی رہی تھی!"

زہرہ نصرت کے ساتھ سیر کر کے واپس آئی تھی اور گو اس کے چہرہ پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔لیکن خوبصورت آنکھیں دلی تکلیف کا اظہار کر رہی تھیں۔جب نصرت لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔تو زہرہ نے فیصلہ کیا کہ جس طرح ہو سکے شمیم سے مل لے۔سگریٹ نوشی کے کمرہ میں وہ اس خیال سے داخل ہوئی تھی۔کہ ممکن ہے شمیم وہاں ہو اسے یہ امید نہ تھی کہ وہ مل ہی جائے گا۔اس کی صورت دیکھتے ہی

یہ فقرہ بے انتہا درد زہرہ کے منہ سے نکل گیا۔

شمیم کرسی سے اچھل پڑا اور بولا "کیوں - مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں —— آؤ آتشدان کے پاس آ جاؤ۔"

زہرہ چلی تو گئی - لیکن بیٹھنے کی کوشش نہ کی بلکہ وہیں کارنس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں کہا۔

"میں تمہیں اس لئے تلاش کر رہی تھی کہ تم سے —— معافی مانگوں تمہارے متعلق جو خیال میں نے قائم کیا تھا اور جو کچھ کل تم سے کہا تھا اس پر بے حد پشیمان ہوں۔ کاش وہ الفاظ میری زبان سے نہ نکلتے میں تمہیں آوارہ اور مسخرہ سے زیادہ اہمیت نہ دیتی تھی لیکن اب مجھے سبق مل گیا ہے میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے جن کو اس نے نہ تو چھپانے کی کوشش کی اور نہ چھپا سکتی تھی۔ لیکن شمیم نے گویا اسے محسوس ہی نہ کیا۔ بلکہ زور سے ہنس پڑا اور پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا "معافی کیسی؟ تم نے قصور ہی کونسا کیا ہے۔ آؤ دوستوں کی طرح مصافحہ کر کے وہ تمام باتیں جو ان بیوقوفوں نے کہہ دی ہیں۔ اپنے دل سے فراموش کر دو۔ تم خود جانتی ہو کہ میرے متعلق تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ میں صرف مسخرہ ہوں سادہ سا۔ اس میں حبہ بھر شبہ کی گنجائش نہیں —— موضوع بدلنے کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ میں انتہا سے زیادہ مسرور ہوں کہ تم نے اور کپتان نصرت نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ وہ بہت خوب آدمی ہے۔ ہر کام صاف صاف کرتا ہے اور اپنے آپ کو احمق نہیں بنائے رکھتا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ اس کو ہنستا دیکھ کر کون اندازہ لگا سکتا تھا۔ کہ ایک وہ وقت بھی ہوگا۔ جب اس نے زہرہ سے وہی چیز طلب کی تھی۔ جس کے دوسرے کو مل جانے پر وہ اس قدر خندہ پیشانی سے ہدیہ مبارکباد پیش کر رہا ہے۔ لیکن زہرہ کو انتہائی صدمہ تھا اور وہ زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ آخر کار اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بولی "شمیم آخر مجھے اس طرح کیوں دھوکا دیا گیا؟ تم نے مجھے تاریکی میں کیوں رکھا؟ مجھے بتایا کیوں نہ دیا؟ اس قدر غلط اندازہ لگانے پر تم نے مجھے تنبیہ کیوں نہ کی؟ للہ بتاؤ!"

اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور شمیم نے نرمی سے اس کے ہاتھ پکڑ لئے لیکن ہنوز وہ متبسم تھا اس نے کہا "زہرہ چلو جانے بھی دو۔ تم جانتی ہو میں نے تمہیں جس دن واقعہ سنایا تھا۔ اس کے اگلے روز ہی بتا دیا تھا۔ مجھے تمہیں خراب ہو جانے کی کوئی وجہ بھی پیش کرنی چاہئے تھی۔"

شمیم کا مسکرانا زہرہ کے لئے تکلیف دہ تھا اور اسے برداشت نہ کر سکی۔ اس نے غصہ میں آ کر اپنے دونوں ہاتھ چھڑا لئے اور اس مرتبہ اس کا لہجہ پر درد اور بھرایا ہوا تھا۔ اس نے کہا "شمیم —— تم کس قدر سنگدل ہو اگر تم مجھے بتا دیتے۔ سمجھا دیتے تو یہ . . . مجھے کس قدر مختلف ہوتے —— مجھے تم سے نفرت تو نہ تھی —— ایک طرح محبت ہی تھی۔ لیکن تم ناقابل سے نظر آتے تھے —— شمیم میرا قصور نہیں۔ مجھے موقع ہی نہیں دیا گیا اور اب —— اب . . . ."

یہ کہتے کہتے اس کا دل بھر آیا اور وہ سر جھکا کر سسکیاں لینے لگی شمیم کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ بہت دیر تک خاموش کھڑا دیکھا کیا۔ لیکن جب ہچکیاں برداشت سے باہر ہو گئیں تو وہ آگے بڑھا اور زہرہ کے نزدیک پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا "زہرہ —— خدا کے لئے رو مت —— یہ ناقابل برداشت ہے۔ زہرہ زہرہ خدا کے واسطے اپنے آپ کو سنبھالو۔"

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زہرہ کے شانے آہستہ سے دبائے اور کہنے لگا "تمہیں معلوم ہے تم ابھی ابھی کیا کہہ چکی ہو؟ تمہیں مجھ سے محبت تھی؟ —— اُف! —— میں جانتا ہوں کہ یونہی تمہاری زبان سے نکل گیا۔ ورنہ تم انکار نہیں کر سکتیں کہ تم نصرت کے لئے ہو۔ ابتدا سے لے کر اب تک تمہیں صرف اسی سے محبت رہی ہے"!

زہرہ نے انکار نہ کیا۔ بلکہ اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

عین اس وقت دروازہ کھلا اور نصرت داخل ہوا آواز سنکر شمیم پھرتی سے مڑا لیکن نصرت ایک نگاہ میں معاملہ کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ اور جو کچھ اس کے چہرہ پر تھا۔ وہ جذبہ آج تک کسی نے نصرت میں نہ دیکھا تھا۔ شمیم اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور جلدی سے کہنے لگا "نصرت یہاں نہیں آؤ —— اپنا گھر میں آ جاؤ؟"

لیکن نصرت نے التفات تک نہ کیا۔ بلکہ سختی سے شمیم کو علیحدہ کر کے گذرنا چاہا۔ شمیم نے زور سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور کہنے لگا "نصرت بیوقوف نہ بنو۔ اسے دق کرنے سے کیا حاصل؟ [illegible]

ہے۔"

نصرت نے زور سے اپنا بازو چھڑا لیا اور بولا "میں تم سے تھوڑی دیر بعد گفتگو کروں گا۔ فی الحال تم یہاں سے دفع ہو جاؤ"

شمیم کو بازو سے علیحدہ کرکے وہ سیدھا زہرہ کے پاس پہنچا۔ اس کا چہرہ غصہ کے مارے لال ہو رہا تھا اور وہ دانت کچکچا رہا تھا۔ شمیم کے لئے زندگی بھر کی دوستی میں نصرت کے غصہ کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ نصرت نے نہایت التفات سے زہرہ کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا "زہرہ ۔ میری پیاری کیا بات ہے۔ آخر ہوا کیا؟"

لیکن زہرہ کچھ بتانے کی بجائے اور رونے لگی۔ شمیم نے البتہ خلیج پاٹ کرنے کی کوشش کی اور بلا پس و پیش گفتگو چھیڑ دی۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی لیکن جب وہ بولا تو اس نے اپنا لہجہ بہت کچھ سنبھال لیا تھا۔ اس نے کہا "نصرت یہ سب کچھ میری خطا ہے۔ مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے لیکن تمہاری اور فیروز کی بھی غلطی ہے۔ تم اسے جانے دو میں سب کچھ بتا دوں گا!"

نصرت نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور زہرہ سے کہا "زہرہ تم جاؤ۔ تمہیں لباس تبدیل کرنا ہے ورنہ کھانے پر دیر ہو جائے گی تم بے فکر رہو میں سب طے کر لوں گا"

زہرہ نے اپنا چہرہ اٹھایا اور اپنی سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ ایک لمحہ تک اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نہ کہہ سکی۔ آخر مڑی اور نہایت آہستہ آہستہ کمرہ سے باہر چلی گئی۔ نصرت نے سوچا کہ زہرہ کا اعتراف سننے سے قبل شمیم سے گفتگو کرنا زیادہ مناسب ہوگا اس لئے جب شمیم دروازہ بند کرکے اس کی طرف آیا۔ تو وہ ہمہ تن انتظار تھا۔

شمیم نے کہا "تم اعتراف چاہتے ہو؟ اچھا سنو۔ اس روز تم نے اور فیروز نے میرا راز افشا کر دیا تھا۔ اس سے قبل زہرہ مجھے نہایت معمولی ۔۔۔ نہیں غیر معمولی فطرت کا انسان سمجھتی تھی۔ میں اس کی نظروں میں ایک احمق سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ اسے لازمی طور پر خیال ہوا کہ میرے متعلق اندازہ لگانے میں اس نے بدترین بے انصافی کی ہے۔ زہرہ نہایت نیک دل لڑکی ہے چنانچہ وہ میرے پاس آئی اور اظہار افسوس کیا لیکن مجھے غصہ آگیا اور میں نے نہ جانے کیا کیا بک ڈالا ۔۔۔ یہ ہے تمام قصہ!"

نصرت نے ہر ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا "میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر تم نے کیا کیا کہا؟"

شمیم نے کہا "کوئی ایسی بات نہیں جو بتانے کے قابل ہو"

"پھر بھی تمہیں بتانا پڑے گا"

یہ کہہ کر نصرت نے نہایت سخت نگاہوں سے شمیم کی طرف دیکھا۔ غصہ ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اس نے آگے بڑھ کر شمیم کے شانے اپنے مضبوط ہاتھوں میں زور سے پکڑ لئے اور چلا کر کہا "تمہیں سب باتیں ایک ایک کرکے بتانی پڑیں گی دیکھوں تو کیسے نہیں بتاتے"

لیکن شمیم اس سے بالکل متاثر نہ ہوا۔ بلکہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر مسکراتا ہوا بولا "نہیں میرے پیارے دوست میں ہرگز نہ بتاؤں گا۔ اگر تم کہو تو میں تم سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں قطعی نہیں"

نصرت نے جواب دیا "مجھے یہ معلوم کرنے کا حق ہے کہ تم نے کونسی ایسی بات کہی جس نے اسے اتنا پریشان کر دیا؟"

شمیم نے کہا "تمہیں کوئی حق نہیں ہے ۔۔۔" پھر یکایک اپنا طرز بدل دیا۔ شاید وہ ضبط نہ کر سکا ۔۔۔ "لیکن نصرت کس قدر تعجب ہے کہ تم اب تک اسے محسوس نہ کر سکے۔ اچھا میں تمہیں بتاتا ہوں۔ زہرہ نے ہمیشہ کے لئے مجھے اس بنا پر مایوس کر دیا تھا کہ میں ۔۔۔ محض تماشائی تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ہمیشہ تفریح اور مسخرہ پن میرا کام تھا اور میں نے کوئی کارنمایاں آج تک انجام نہ دیا تھا لیکن اس روز فیروز نے اسے سب کچھ بتا دیا اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اگر زہرہ میری اس سیہ بختی کو اپنے خوبصورت آنسوؤں سے دھو دینا چاہتی تھی تو کونسا الزام عائد ہوتا ہے۔ ذرا اپنے دل ہی میں انصاف کرو!"

الفاظ کے ساتھ ساتھ نصرت کی گرفت بھی ہلکی ہوتی گئی۔

"تم بھی اس سے محبت کرتے ہو؟"

شمیم کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے لمحہ بھر کچھ سوچا پھر کہنے لگا "کیا ہم اس معاملہ کو اور طول دیں؟ نصرت میرے لئے میری ناکامی کافی ہے اس لئے بہتر ہو کہ تم یہ باتیں بھول جاؤ۔ اس سے کچھ نہ کہنا۔ کیونکہ محض پریشانی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا!"

وہ بے تابانہ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ پھر نصرت کے پاس آکر کھڑا ہو گیا

اور سرد آہ کھینچکر کہنے لگا "نصرت مجھے معاف کرنا۔ سب کچھ سہی۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ مشکل ترین چیز مجھے ملی ہے"!

نصرت نے بڑھ کر اسے سینہ سے لگا لیا اور کہنے لگا "عزیز دوست مجھے انتہائی قلق ہے۔ کاش میں یہ محبت قربان کر سکتا"۔

لیکن شمیم کی محبت قربانگاہ عشق پر مقبول ہو چکی تھی!

(۹)

حمدی نے اپنے پاؤں آتشدان کے سامنے نہایت آرام سے پھیلاتے ہوئے کہا "اوہ۔ کتنی ہیبت ناک رات ہے! تعجب ہے کہ شمیم اس وقت کہاں کھسک گیا۔ نصف شب گذرنے سے قبل سونے کا عادی تو ہے نہیں"۔

فیروز نے اونگھتے ہوئے کہا "یار۔ وہ سویا تو نہیں ابھی کیونکہ میں نے کوئی گھنٹہ بھر ہوا اسے باہر جاتے دیکھا تھا"

"باہر؟" حمدی نے تعجب سے کہا "آخر کس لئے؟"

نصرت نے جو کوچ پر آرام سے دراز تھا جواب دیا "کوئی نئی شرارت سوجھی ہوگی اور کیا؟"

فیروز نے قہقہہ لگا کر کہا "اوہو نصرت صاحب ہیں۔ میں تو سمجھا تھا۔ کہ سو رہے ہو۔ اور تمہیں سو بھی جانا چاہئے تھا۔ نصف شب گذر چکی ہے چلو بھئی اب جا کر سو رہیں۔ آخر صبح شکار کو بھی جانا ہے"

حمدی جھومتا ہوا اٹھا اور کھڑکی کے پاس جاتا ہوا بولا "توبہ کس قدر تند ہوا چل رہی ہے۔ آج سمندر خوب چڑھا و پر ہوگا"

پردہ ہٹا کر وہ باہر تاریکی میں جھانکنے لگا۔ لیکن سوائے لا محدود اندھیرے کے اور کیا نظر آ سکتا تھا۔ یکایک اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کھول دی اور باہر جھانکنے لگا۔ ہوا کا سرد جھونکا اندر آ کر تمام کمرہ میں بھر گیا اور فیروز کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ حمدی اس سے قبل ہی بول اٹھا۔ اس نے گھبراتے ہوئے لہجہ میں کہا "میں نے ایک   دیکھا تھا!"

نصرت نے بمشکل جمائی ضبط کرکے کہا "توبہ ہے"۔

حمدی نے جلدی سے کہا "توبہ و وبہ کچھ نہیں ہے۔ کوئی جہاز ہے — ارے بھائی ان جہنمی چٹانوں کے درمیان کوئی جہاز آ گیا ہے۔ میں تو تحقیق کرنے جاتا ہوں"۔

فیروز بولا "ارے ٹھہر جاؤ! — اچھا حمدی تمہیں یقین ہے کہ وہ خدنگا ہی تھا اور کچھ تو نہ تھا؟"

حمدی نے بے تابی سے کہا "ہاں ہاں خدنگا ہی تھا اور وہی خدنگا جو عموماً جہاز والے مصیبت کے وقت چھوڑا کرتے ہیں۔ تاکہ دیکھنے والے اگر ہوسکے تو مدد کو پہنچ جائیں۔ اور کچھ نہ تھا۔ کیا میں اتنا بیوقوف ہوں"؟

"لیکن ہم نے کسی قسم کی آواز نہ سنی"؟

"آواز! — اس قدر تند ہوا اور اتنے شور و شغب میں کیا خاک سنائی دیتا؟ اچھا اب خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ کہہ تو رہا ہوں کہ مجھے یقین ہے۔ چلنا ہے تو چلو!"

فیروز نے جواب دیا "ذرا صبر کرو۔ اگر ایسا ہے تو پہلے ایک سوار کو کیوں نہ کشتیوں کے اسٹیشن پر بھیج دیا جائے۔ یہاں سے کوئی دو میل ہوگا۔ بہت ممکن ہے وہ اس آفت سے بے خبر ہوں۔ اس لئے جتنے ہم ساحل پر پہنچیں اتنے جان بچانے والی کشتیاں بھی شاید آ جائیں!"

یہ کہتے کہتے وہ کمرہ سے باہر نکل گیا اور سوائے نصرت کے سب اس کے پیچھے ہوئے۔ نصرت کھڑکی بند کرنے کی خاطر رکا تھا جس کے سامنے وہ ایک لمحہ رک کر باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ رات نہایت تاریک تھی بار بار سرد ہوا کے جھونکے کمرہ میں داخل ہونے لگے۔ نصرت نے کھڑکی بند کر دی اور جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا دوسروں سے جا ملا!

سب کے سب فیروز کے ہمراہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے اصطبل تک گئے جہاں سے ایک سائیس کشتیوں کے اسٹیشن روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد لالٹینوں کا انتظام کیا گیا اور تمام گروہ ہوا کے تھپیڑے منہ پر کھاتا ہوا۔ اندھی کا مقابلہ کرتا ہوا۔ سردی کے مارے دانت کٹکٹاتا ہوا ساحل سمندر کی طرف چل پڑا۔

ساحل پر ناقابل بیان تاریکی اور وحشت چھا رہی تھی۔ بڑی بڑی لہریں جو اندھیرے میں انتہائی خوفناک شکل اختیار کر لیتی تھی۔ بار بار چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کا اٹھ اٹھ کر نہایت کرخت شور کے ساتھ پتھروں پر گر جانا ایک ایسا منظر پیش کر رہا تھا جو احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی یہ زمین کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گی۔

اس بند کے نزدیک جو گاؤں والوں نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے بنا لیا تھا۔ بہت سے آدمی کھڑے ہوئے تھے [illegible]

دور پر ایک زرد ٹمٹماتی روشنی نظر آ رہی تھی لیکن اس کے اور انسانوں کے درمیان سمندر حائل تھا ــــ ایک طوفانی ہیبت ناک باجبروت سمندر جس کی غیر ساکن سطح پر جھاگ جھاگ تھے۔ فضا پر چند چھوٹے چھوٹے تارے بھی چمک رہے تھے لیکن باقی تمام آسمان گہرے تاریک بادلوں سے پوشیدہ تھا!

فیروز کے ہاں کا ایک مالی وہیں موجود تھا جس نے زرد روشنی کی طرف اشارہ کر کے بتایا اور اس کے کان کے نزدیک چلّا چلّا کر کہنا شروع کیا۔ "او دیکھئے حجور ــ اور جو چٹانیں نا ہیں؟ او کے بیچ میں ہے حجور۔ لوٹ گیا ہے۔ چھوٹا سا دکھائی جہاج ہے حجور ــ او دیکھئے کالا کالا کچھ نجر آئے ہے مستول ہے سرکار او دیکھئے جری نجر جما کے سرکار!"

فیروز نے چلّا کر پوچھا "کسی کو اسٹیشن پر بھی بھیج دیا ہے؟"

جواب ملا "کوئی دو گھڑی آ گئے او جوان سے سرکار گئے تھے۔ حجور کشتیاں کسی اور جگو گئیں ہیں سرکار ــ کیے نھیں تلو ہاٹ گئیں ہیں جی۔ او ہم کو ایک کشتی سوں لے جانا کہتے تھے پر کون جانا؟ کسی نے حامی نہ بھری۔ سب نے کہہ دیا کہ اس طور چان میں تو چٹانیں اتی سی دیر میں کشتی توڑ تاڑ الگ بھی کر دیں گی ــ جان کا اللہ حافظ ہے رہا فظ۔ . . . اب تک واں تین ادمی دکھائی پڑے حجور او رہاں سے کوئی سو گز سے زادہ دور نہیں۔ پر یہ سو گز بھی موت کے سو گز ہیں سرکار کشتی تو جا سکتی نہیں۔ کوشش ہی کا ہے کو کرو؟"

موت کے سو گز! اور اس قدر عظیم الشان خطرہ اپنے سر لینے سے تین انسانوں کی جانیں بچ سکتیں ہیں۔ فیروز نے منہ پھیر لیا اور سوچنے لگا کہ آخر ان کے بچانے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ کس کی ہمت ہو۔ کہ اس اندھی میں اس قدر سخت طوفانی سمندر کو عبور کر کے ان تینوں کو بچا لائے۔ کیا سمندر اس باہمت انسان کو پاش پاش نہ کر دے گا؟ تصور ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یکایک طوفانی آواز کو چیرتا ہوا ایک شور سنائی دیا۔

بادل پھٹ چلے تھے اور آسمان پر اکثر تارے نظر آ رہے تھے جو بال بال آنکھیں مل مل کر اس ہیبت انگیز منظر کو دیکھ رہے تھے۔ دھندلی روشنی میں جہاز کا پھیکا سا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ جس کا نصف حصہ خونی لہروں کی نذر ہو چکا تھا اور بقیہ نصف سفید جھاگوں کا کفن پہنکر بلند چٹانوں کے درمیان موت کی آمد کا منتظر تھا۔ سو گز سے زیادہ نہیں لیکن ان مشکلات کی وجہ سے جو درمیان میں حائل تھیں یہی فاصلہ سو میل سے کم نہ تھا۔ فیروز کو خیال ہوا کہ مستول پر اسے کچھ انسانی مجسمے نظر آ رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے اسے یقین نہ ہوا۔ کیونکہ روشنی نہایت مدہم تھی۔

اتنے میں کسی نے اس کا بازو زور سے پکڑ کر ہلایا یہ حمدی تھا جو دیوانوں کی طرح چلّا رہا تھا "اسے جانے نہ دینا!! یہ حماقت ہے۔ پاگل پن ہے۔ للہ اسے جانے نہ دینا۔"

فیروز پھرتی سے مڑا اس کے بالکل قریب شمیم اختر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سر برہنہ تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ جسم پر وہی لباس تھا جو شام اس نے پہن رکھا تھا۔ موٹی رسّہ کا ایک ڈھیر اس کے قدموں کے نزدیک پڑا تھا۔ جس کا ایک سرا اس نے اپنی کمر میں باندھ رکھا تھا۔ وہ چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا "لوگو سنو میں ضرور کوشش کروں گا۔ جوں جوں میں آگے بڑھوں رسی چھوڑتے جاؤ۔ . . پانچ سو تک گنو . . . اگر رسی ڈھیلی رہے تو اسے کھینچ لو اور اگر ایسا نہ تو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ سمجھ گئے!

یہ کہہ کر وہ بلا پس و پیش لوہے کے زینہ کی طرف بڑھا یہ زینہ بند سے سمندر تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا لیکن کسی نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ شمیم نے مڑ کر دیکھا تو نصرت تھا۔ لالٹین کی روشنی شمیم کے چہرہ پر پڑی اور نصرت نے دیکھا کہ وہاں اب بھی وہی تبسم رقص کر رہا ہے۔ جس نے شمیم کو اور شمیم کے کردار کو مخصوص و ممتاز بنا رکھا تھا۔

شمیم نے آہستہ سے کہا "بیوقوف کیوں ہو گئے ہو۔ بجائے چھینی امان جیسا برتاؤ کرنے کے اگر تم رسی والوں کی مدد کرو تو بہت اچھا ہو!"

نصرت نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا اور کہنے لگا "تم ایسی افو حرکت نہ کرو ــ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا کس نے بتایا ہے"۔

شمیم نے نرمی سے اپنا بازو چھڑا لیا اور کہا "موت کے منہ میں جانا جرم نہیں ہے۔ میں اس کا انتخاب کرتا ہوں۔ دوسروں کی موت دیکھنے سے یہ بہتر یہی ہے کہ اپنے سر موت لے لی جائے۔ میں اپنی زندگی کا مالک ہوں اور جان بوجھ کر اسے خطرہ میں ڈالتا ہوں۔ تم خواہ مخواہ کیوں بیچ میں پڑتے ہو؟"

ذرا دیر تک وہ نصرت کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد مڑا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا۔

نصرت نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "اچھا یونہی سہی!"

اس کے بعد انتظار کے سخت بے چین اور صبر آزما لمحے آئے۔ آسمان صاف ہوتا جا رہا تھا لیکن طوفان میں کوئی کمی نہ تھی۔ رسی رک رک کر اور کبھی جھٹکوں سے چھوڑی جا رہی تھی۔ نصرت سب سے آگے کھڑا تھا اور اس کی نظریں طوفانی سمندر کو تک رہی تھیں — وہ اس ابلتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا جس نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک عزیز ترین ہستی کو نگل لیا تھا۔ کیا شمیم پھر واپس نہ آئیگا؟ کیا اس کا دوست ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گا۔ کیا یہ اس شخص کا آخری لمحہ تھا جس نے اس قدر جانجوکھوں میں پڑ کر چند انسانی جانوں کو بچانے کے لئے صرف اپنے آپ کو منتخب کیا؟

فیروز نے تھراتے ہوئے کہا "اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے"!

رسی چلتے چلتے رک گئی۔ نصرت چار سو پچاس تک گن چکا تھا۔ اس نے نہایت سکون کے ساتھ پانچ سو تک گنا پھر اپنا بازو اٹھا کر کھینچنے کے لئے اشارہ کیا۔ رسی ڈھیلی تھی۔ یکے بعد دیگرے سب مل کر اسے کھینچنے لگے لیکن وہ اس قدر آسانی سے کھینچتی چلی آ رہی تھی۔ کہ نصرت کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے تاریک پانی پر اپنی نگاہ جما دی اور غور سے دیکھنے لگا کہ کہیں چٹانوں سے رگڑ کھا کر رسی ٹوٹ تو نہیں گئی؟ . . .

لیکن کوئی دھندلی سیاہ چیز عجیب طرح سطح پر تیر رہی تھی!

وہ سہارا لیتا ہوا نیچے اترا اس کے قدموں کے نیچے سیڑھیاں تھر تھرا رہی تھیں۔ نصرت نے آہستہ سے رسی اپنے نزدیک گھسیٹ لی۔ لیکن عین اس وقت ایک بڑی لہر اٹھی۔ اگر وہ مضبوطی سے رسی نہ تھام لیتا تو یقیناً سمندر میں گر پڑتا۔ اس کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر دو انسانوں کو جو سرد اور بے جان سے تھے پانی سے باہر نکال لیا اور انکو سہارا دے کر اوپر لے آیا۔

ان میں سے ایک شمیم تھا!

لالٹین کی روشنی میں وہ لڑکھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور سر سے خون نکل نکل کر تمام چہرہ پر بہہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے خون صاف کرتے ہوئے کہا "مجھے پھر . . . جانا پڑیگا —— تم نے بہت جلد گھسیٹ لیا . . . ابھی وہاں دو اور باقی ہیں"!

وہ سانس لینے کے لئے رکا۔

"اُف . . . پر تم ہو نصرت؟ اچھا الوداع پیارے دوست"!

نصرت نے کہا "اس مرتبہ میں خود جاتا ہوں"!

شور و غوغا کے باوجود لوگوں نے شمیم کا قہقہہ سنا۔ اس نے کہا "نہیں نہیں کوئی ضرورت نہیں . . . . یہ میرا کام ہے اور اسے میں ہی کرونگا —— اکیلا! —— اس کے علاوہ تمہیں ٹھہرنا چاہئے۔ تمہاری ضرورت ہے"!

وہ زینہ پر کچھ دیر کھڑا رہا۔ تاکہ آنے والی کشمکش کے لئے تیار ہو سکے چاند زمیں کے ایک کونہ سے جھانک رہا تھا اور ابھی روشنی ہو چکی تھی اس کی زرد کرنیں شمیم کے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک آخری نگاہ سے اس خوبصورت منظر کو دیکھا۔ اردگرد ایک آخری نگاہ ڈالی اور کودنے والا ہی تھا کہ رک گیا اور مڑ کر نصرت کے کندھوں پر اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ رکھ دئے۔

اس نے کہا "نصرت محض تماشائی ہی کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اسے تمام و کمال دیکھتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ گو مجھے اعتراف ہے کہ ایک زمانہ میں میں نے کھیل میں شریک ہونے کی کوشش کی تھی۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ تم بھی کھیل میں شریک ہوئے اور فتح و نصرت تمہارے ہمرکاب رہی۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کہ مجھے تم سے کوئی بغض نہیں کوئی عناد نہیں۔ کیونکہ یہ اپنی اپنی قسمت ہے اس کے علاوہ تم مجھ سے کہیں بہتر ہو۔ وہ تم ہی کو چاہتی ہے اور ہمیشہ تم ہی سے اسے محبت رہی۔ یہی چیز تھی جس نے مجھے بتایا کہ دنیا میں میرا وجود کس لئے بنایا گیا ہے۔ اسی وقت سے میں اپنے مقصد حیات کی تکمیل کر رہا ہوں۔ اور خدا جانتا ہے کہ یہ میرے لئے کتنا آسان ہے"!

یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا سمندر میں کود پڑا۔

لہریں واپس ہو رہی تھیں۔ طوفان کی حدت کم ہوگئی تھی اور تاریکی بہت کچھ جا چکی تھی۔ جن لوگوں نے شمیم کو جاتے دیکھا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ طوفان کے شور سے بلند تر انہوں نے شمیم کا قہقہہ سنا اور بہت دیر تک صرف وہی قہقہہ فضا میں گونجتا رہا!

(۱۰)

زہرہ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اور تمام رات نہایت کرب و بے چینی سے گذری تھی۔ لیکن اسے پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ نہ معلوم اسے کیا ہوگیا تھا۔ وہ دیر سے سوئی تھی اور خلاف معمول بہت سویرے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ جب سے دل برابر دھڑک رہا تھا۔ باہر سخت سردی تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہوا تیزی سے چل رہی ہے۔

یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے بیگم ارجمند کو کمرہ میں داخل ہوتے پایا۔

اس نے تعجب سے دریافت کیا "کیوں کیا بات ہے؟ اوہ بڑی خوفناک رات تھی۔ تعجب نہیں اگر آپ کوئی بری خبر سنانے آئی ہوں"۔

بیگم ارجمند کا خوش و خرم چہرہ غیر معمولی طور پر افسردہ تھا۔ وہ خاموشی سے بستر کے کنارے آ کر کھڑی ہو گئیں اور زہرہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا "عزیز من۔ کپتان نصرت نے یہ فرض میرے سپرد کیا ہے۔ کہ تمہیں تمام واقعات سے آگاہ کر دوں۔ رات ایک چھوٹا سا دخانی جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر غرق ہو گیا۔ اس پر صرف تین آدمی زندہ بچے تھے لیکن طوفان اس قدر تند تھا۔ کہ کسی طرح ان کی مدد نہ کی جا سکتی تھی کوئی جان بچانے والی کشتی بھی موجود نہ تھی اور معمولی کشتی کا بھلا وہاں کیا کام تھا . . ."

زہرہ نے بیگم ارجمند کے چہرہ پر اپنی خوبصورت آنکھیں جما دیں۔ اور کہا "آپ کہے جایئے!"

بیگم صاحبہ نے بہت کوشش کے بعد کہنا شروع کیا "شمیم اختر ایک رسی کے ذریعہ ان تک پہنچا۔ ان میں سے ایک کو صحیح و سالم لے بھی آیا۔ اس کے بعد پھر گیا اور —— اور ——!"

ان کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے زہرہ کے ہاتھوں کو زور سے دبایا لیکن وہ سرد پڑ گئے تھے "اور —— دوبارہ وہ ان تک پہنچ گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسی چھوٹی پڑ گئی۔ اس نے کمر سے رسی کھول کر ان دونوں آدمیوں کو باندھ دیا اور وہ زندہ سلامت کنارے پر کھینچ لئے گئے۔ لیکن —— شمیم —— شمیم کا . . . . کوئی . . . . پتہ نہ ملا!!

ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے مشکل کہا "زہرہ —— ہائے لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہنستا ہوا مرا!"

زہرہ نے عجیب آواز سے کہا "ہاں —— میں جانتی تھی کہ ایسا ہی ہو گا —— میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا!"

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور بدن میں لہو کا نام نہ تھا۔ وہ اپنی بدقسمتی پر رو بھی نہ سکتی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ کہا "لیکن ایسا کیوں ہوا؟ —— مجھے تعجب ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟"

بیگم ارجمند نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگیں "زہرہ ہمیں یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں —— خدا کی مرضی میں کسی کو چارہ ہی کیا ہے۔ ہم دخل در معقولات کرنے والے کون ہوتے ہیں؟"

زہرہ نے کہا "نہیں یہ مت کہئے۔ مجھے یقین ہے کہ خدا اس قدر بے انصاف اور —— ظالم نہیں ہے!"

بیگم ارجمند خاموش ہو گئیں۔ آج سے دس سال قبل جب ان کے اپنے اکلوتے لڑکے کی موت ہوئی تھی۔ تو انہیں اتنا صدمہ ہوا تھا۔ جتنا اس وقت تھا۔ شمیم کی صورت اس کی باتیں اس کا طرز گفتگو ہر لحظہ ان کے سامنے تھا۔ اور انہیں یقین نہ آتا تھا۔ کہ وہ دنیا سے ہمیشہ کے لئے اٹھا لیا گیا۔ ان کا دل رو رہا تھا اور جوں جوں وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی تھیں ان کی پریشانی اور بڑھتی چلی جاتی تھی۔

زہرہ بستر سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہو گئی۔

بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تمام آسمان پر بکھرے ہوئے تھے سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ لیکن ہوا میں انتہائی سردی ابھی تک موجود تھی۔ اور افق پر سمندر کا ساکن پانی دھوپ میں جھلملا رہا تھا۔ زہرہ نے حسرت بھری نگاہیں اس نقطہ پر جما دیں جہاں محبت کے ناقابل عبور سمندر کا پیراک گذشتہ رات اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا

بیگم ارجمند نے نرم لہجہ میں دریافت کیا "تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

اس نے بغیر مڑے جواب دیا "جی نہیں —— شکریہ۔ مجھے تنہا چھوڑ دیجئے بس"

بیگم صاحبہ چپ چاپ کمرہ سے باہر چلی گئیں۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچ کر ان سے ضبط نہ ہو سکا اور تکیہ پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ہائے کس قدر پیارا لڑکا تھا! اسی کے دم سے قصر بہار افزا میں رونق تھی۔ وہی سب کو ہنساتا رہتا تھا اور اسی کا قہقہہ تھا جو تمام مکان کو اپنے سر پر اٹھا لیا کرتا تھا لیکن اب —— اب وہاں کیا تھا؟ تمام گھر سنسان اور خاموش پڑا تھا . . . جب وہ تھک گئیں اور آنسوؤں سے آنکھیں خشک ہو گئیں۔ تو انہوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر رنج و اندوہ کے نشان اپنے چہرہ سے مٹائے اور نیچے اتر کر ان مہمانوں میں آملیں جو ناشتہ کی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے کوئی کچھ نہ کھا رہا تھا۔ سب اپنے اپنے خیالات میں محو تھے۔ کمرہ کی فضا تک غمناک تھی۔

نصرت نے کہا "میں اب سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آیئے دوسرے

رہ ہیں آجائیے"۔

لیکن کمرہ میں داخل ہونے سے قبل ہی نصرت نے دریافت کیا۔ آپ نے اس سے کہہ دیا؟ اچھا اس خبر کا اس پر کیا اثر ہوا؟

اس کی مضطرب آواز فکر مند چہرہ اور سرخ آنکھیں بیگم ارجمند کے بربہ میں پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ انہوں نے جواب دیا "میرے خیال میں اس ریب کو سکتہ ہو گیا!

نصرت کمرہ میں بے تابانہ ٹہلنے لگا۔

آخر کار کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "اس سے کہئے کہ ذرا نیچے آجائے۔ سمجھا دیجئے گا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے اور کہہ دیجئے گا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور یہ کہ بہت ضروری کام ہے"۔

بیگم ارجمند نے تامل کرتے ہوئے کہا "اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اسے تنہا چھوڑ دوں"!

نصرت نے کہا "غالباً وہ میرا نام سنکر انکار نہ کریگی۔ کم از کم کوشش تو کیجئے"۔

ان کے چلے جانے کے بعد نصرت ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ چند گھنٹہ پیشتر شمیم اسی کمرہ میں اس کے ساتھ موجود تھا۔ اور اس کے غضبناک تیور دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہی تبسم تھا اور وہی میٹھی میٹھی باتیں تھیں جنہوں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا تھا نصرت کو اس وقت احساس ہوا کہ جو قربانی مرحوم نے اس کمرہ میں کی تھی وہ اس قربانی سے ہزار درجہ بیش بہا اور قابل قدر تھی۔ جو اس نے ساحل سمندر پر کی!

دروازہ پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ نصرت نے سر اٹھا کر دیکھا تو زہرہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی اور وہ استقبال کے لئے بڑھا۔ اس نے نرم لہجہ میں کہا "میں تمہیں ایک چیز دینا چاہتا ہوں"۔

زہرہ نے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔

نصرت نے اپنی آواز کو انتہائی کوشش کے ساتھ سنبھالتے ہوئے کہا "وہ چیز میرے پاس اس وقت لائی گئی تھی۔ جب بیگم ارجمند تم سے ــــ تمام واقعات کہنے گئیں تھیں۔ اور میں خود نہیں وہ چیز دینا چاہتا تھا"۔

زہرہ نے جلدی پوچھا "وہ ہے کیا؟"

نصرت نے ایک ملفوف کاغذ آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ایک خط جو مرحوم کے کمرہ میں مطالعہ کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ اور جس پر تمہارا نام تحریر ہے"!

وہ مڑا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تا کہ زہرہ تنہائی میں وہ خط پڑھ چکے۔ کمرہ میں خاموشی چھا گئی جو ہر لحظہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یکایک اس نے ایک آواز سنی اور مڑکر دیکھا تو زہرہ آتشدان کے پاس فرش پر پڑی ہوئی ہچکیاں لے رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحہ میں وہ زہرہ پر جھکا ہوا اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور نرم لہجہ میں اسے تسلی دیتا جا رہا تھا "زہرہ ــــ زہرہ! ــــ میری پیاری رودمت ــــ دیکھو میری اپنی زہرہ تم سمجھ دار ہو۔ آخر کیا فائدہ اس طرح جان ہلکان کرنے سے؟ ــــ میری پیاری رودمت۔ آخر ہم سب کو بھی رنج ہے۔ وہ ہمارا بھی دوست تھا۔ اور خدا بہتر جانتا ہے کہ ایسا دوست ہمیں اب نہ ملیگا۔ لیکن کیا کریں ــــ سوائے صبر! صبر! صبر! کے۔ ہمارے آنسو اُسے واپس نہیں لا سکتے۔ زہرہ ــــ میری جان . . ."

اسی طرح وہ بہت دیر تک سمجھاتا رہا اور جب زہرہ کی طبیعت سکون پذیر ہوئی۔ تو اس نے آہستہ سے اسے خط پڑھنے کے لئے کہا۔ نصرت نے پہلے انکار کیا۔ پھر تامل کیا لیکن جب بار بار زہرہ نے کہا تو اس نے خط کھول ڈالا سفید کاغذ پر پنسل سے لکھے ہوئے الفاظ بتا رہے تھے۔ کہ خط جلدی میں لکھا گیا ہے۔ اور نصرت سے گفتگو کے بعد کی تحریر ہے۔ لکھا ہے:۔

عزیز زہرہ۔ تم بے فکر رہو۔ میں نے نصرت سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اسے سب باتیں تمام و کمال سمجھا کر فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیشہ کے لئے تم دونوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں تا کہ آئندہ کوئی اور غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔ میں کہاں جاؤنگا۔ فی الحال اس سوال کا جواب خود بھی نہیں دے سکتا۔ یہ واضح رہے کہ میرے اور نصرت کے درمیان کوئی "فیصلہ" نہیں ہوا ہے جس کی بنا پر میں ایسا کر رہا ہوں۔ اور نہ اس نے مجھ سے کچھ کہا ہے بلکہ ہم بدستور پرانے دوست ہیں!

اس واقعہ کو بھول جاؤ۔ شروع سے آخر تک یہ ایک غلطی تھی بس!

مجھے خود احساس ہونا چاہئے تھا۔ کہ محض ایک تماشائی بننے سے زیادہ اور کسی چیز کی مجھے تمنا نہ رکھنی چاہئے پھر بھی میں

نے اپنے سے بالاتر درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ مجھے مل گیا۔ میں ایک ادنیٰ تماشائی سے زیادہ نہیں ہوں!

تم کو اور تمہارے ساتھ نصرت کو میں اپنے مخلص جذبات پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری آیندہ زندگی نہایت خوش و خرم ہوگی۔ اگر مجھے ایک دوستانہ اور مخلص مشورہ دینے کی اجازت دو تو یہ ہے کہ کسی شخص کے افعال کی ظاہری ٹیپ ٹاپ سے متاثر نہ ہونا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ میدان جنگ میں باقی رہ جانے والا اور وہاں سے نہ بھاگنے والا ہی ہیرو ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ دنیا نصرت جیسے انسانوں ہی کے بل پونے پر اب تک گھوم رہی ہے۔ ورنہ اور کچھ نہیں۔ باقی سب کے سب تو ایسے ہیں جیسے نمائش کے لئے جھالر اور بیل ٹانک دی جاتی ہے۔ جو ہمیشہ اس وقت اکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہے۔ جب کسی نئی چیز کا وقت آتا ہے۔

زہرہ اس شخص سے شادی کرو جس سے تم کو محبت ہے اور اپنے دل سے یہ بات بھلا دو کہ کسی اور نے بھی تمہاری خاطر اپنے آپ کو کبھی بیوقوف بنایا تھا۔

تمہارا سچا دوست

شمیم

اس طرح ایک سادہ تحریر ختم ہوئی لیکن اس کا ایک ایک لفظ قابل تکریم تھا صرف وہی ایک ایسی چیز تھی۔ جسے حقیقی طور پر مرنے والے کی یادگار کہا جا سکتا تھا۔ شمیم کے آخری الفاظ نے زہرہ کو ایک ایسا سبق دیا تھا جو تمام عمر فراموش نہ ہو سکا لیکن نصرت نے بھی اس سے ایک سبق حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ مرحوم اس کی بیوی زہرہ جبین کی نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان مرنے کے بعد بھی کس قسم کے تعلقات ہیں!

محض تماشائی! — لیکن الہ آباد تک ایک نازک ہستی اس کی پرستش کرتی رہے گی!

(ترجمہ) (یوسف حسین خان)

مکافات

فرانسیسی زبان کا ایک دلچسپ افسانہ

(از جناب خلیل احمد صاحب قریشی بی اے منٹگمری)

ڈاکٹر تیغرا اپنی سرگذشت یوں بیان کرتا ہے۔ "۱۸۴۵ء میں میں فوجی ہسپتال کی معیت میں بحیثیت اسسٹنٹ سرجن قاہرہ میں تھا۔ وہ شفاخانہ ایک چٹان پر جو زمین سے تین چار سو فٹ کی بلندی پر بنا ہوا اب تک نظر آتا ہے۔ وہاں کھڑے ہوکر قاہرہ کا تمام شہر بخوبی نظر آسکتا ہے۔ اور ارد گرد کے میدان جن پر دور تک نظر پڑتی ہے ایک عالیشان منظر پیش کرتے ہیں۔ میں اپنی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ جو کہ تازہ ہوا آنے کے لئے رکھی ہوئی تھی۔ پہاڑی کوّے اور گدھیں پہاڑی کے ارد گرد پرواز کرتے کرتے آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ میں نے باقیماندہ سگار کھڑکی کے راہ سے باہر پھینک دیا۔ اور میری نگاہیں پہاڑی فضا کی فرحت ناک دلاویزیوں میں ڈوب گئیں شش جہات میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد فوجی بگل کی آواز نے فضا میں ایک ہیبت ناک گونج پیدا کر دی۔

یہ میری زندگی کا معمول تھا۔ میں روزانہ زخمیوں کے وارڈ میں چکر لگاتا۔ نسخے تجویز کرتا۔ اپنے رجسٹر میں روزمرہ کی یادداشتیں درج کرتا۔ اور بعد ازاں اپنے کوارٹر کو لوٹتا۔ اس کے بعد پھر میں اپنی کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنی ٹیک کر کھڑا ہو جاتا اور گھڑیوں فردوس نگاہ منظر میں دلچسپی لیتا۔ کبھی کبھی عربی قافلہ دور میدان میں گزرتا ہوا نظر آتا۔ اونٹوں کی قطاریں نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ چٹانوں پر قاق کے درخت افق کے ساتھ ملے ہوئے۔ جن میں شکاری پرندے اڑ رہے ہوتے نہایت دلچسپ منظر پیش کرتے۔

بارکوں میں چکر لگانا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اور یہ تمام قدرت کے نظارے اگر وہاں میسر نہ آسکتے تو میری زندگی نہایت کٹھن ہو جاتی کسٹاگننگ میرا دوست میری اس قسم کی زندگی کو پسند نہ کرتا تھا میں کسٹاگننگ سے کس طرح متعارف ہوا مختصر بیان کرتا ہوں۔

جب میں قسطنطین میں وارد ہوا اور گاڑی سے اترا ہی تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ "آہا! معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارا اسسٹنٹ سرجن ہے"۔

میں مڑا تو ایک دراز قد دبلے جسم والا فوجی افسر تھا۔ اس کی مونچھیں سرخی مائل تھیں۔ اس کی ٹوپی اس قدر ٹیڑھی تھی کہ دائیں کان پر پڑ رہی تھی۔ اس کا خنجر دونوں ٹانگوں کے درمیان لٹک رہا تھا۔ یہ لفٹنٹ کسٹاگننگ تھا میں پھر مڑنا چاہتا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"خوش آمدید۔ ڈاکٹر! تمہیں مل کر مجھے نہایت مسرت ہوئی ہے تم تھک گئے ہو گے آیئے تھوڑی سی شراب پی لیں"۔ مجھے مجبوراً اسکی دعوت قبول کرنی پڑی۔ ہم ایک مختصر سے فوجی ہوٹل میں داخل ہوئے اس نے جام کو اٹھایا اور میری صحت پر مینوشی کی۔

لیکن جلدی ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ لفٹنٹ دوستی کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ پندرہ منٹ کے بعد جب ہوٹل کو شراب کی قیمت ادا کرنے کا وقت آیا۔ تو وہ اخبار میں نہایت بری طرح منہمک ہو گیا۔ اور قیمت مجھے ادا کرنی پڑی۔

اس کے بعد رجمنٹ کے اور افسروں سے میں نے ملاقات کی ایک ان میں سے ریمنڈ تھا اس نے مجھے بتایا کہ اس بھلے مانس لفٹنٹ نے اس کا بھی اسی طرح استقبال کیا تھا اور شراب کی قیمت پھر اس کو ہی ادا کرنی پڑی۔ وہ کہنے لگا۔

"میں اس قسم کے بدطینت انسانوں سے نفرت کرتا ہوں"۔

دن گذرنے گئے۔ حتی کہ قسطنطین میں ماہ جون میں بخار پھوٹ نکلا۔ فوجی مریضوں کے علاوہ شہر کے بہت سے بیمار ہمارے شفاخانہ میں داخل کئے گئے۔ اور مجھے قدرتی مناظر سے دلچسپی لینے کی بہت تھوڑی فرصت ملتی۔

کسٹاگننگ اور ریمنڈ بھی بخار کی زد سے نہ بچ سکے۔ کسٹاگننگ کو بخار نہ تھا۔ لیکن دل کی کمزوری کے باعث خفقان سا ہو گیا تھا۔

اور ساتھ ہی تمام بدن میں خوفناک رعشہ پیدا ہوگیا۔ جیساکہ شراب کثرت سے استعمال کرنے والوں کو ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے بستر سے اٹھ اٹھ کر تمام وارڈ میں دوڑتا اور کبھی اپنے بال نوچتا اور پھر بلند آواز فقیروں کی طرح آوازے لگاتا۔

"فاطمہ! فاطمہ!"

میں نے اس سے اندازہ لگایا۔ کہ کسی وقت وہ اس نام والی لڑکی سے محبت کرچکا ہے۔ اور غالباً اس کی کثرت مینوشی کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اس لڑکی کی محبت کو دماغ سے محو کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اسکی یہ حالت دیکھ کر نہایت ترس آیا۔ وہ نہایت خوفناک طریقہ سے کودتا ہوا کبھی ادھر جاگرتا کبھی ادھر۔ اس کا چہرہ سپید ہورہا تھا اور کبھی کبھی اس کے دانت جڑجاتے تھے۔ اس کی ہولناک آوازیں سن کر انسان لرزہ بر اندام ہوجاتا تھا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد جب اسے ہوش آتا تو وہ مجھ سے پوچھتا۔

"کیوں ڈاکٹر! میں نے خفقان کی حالت میں کوئی بات تو نہیں کی۔"

"کچھ نہیں لفٹننٹ!"

"لیکن کوئی نہ کوئی بات تو میں ضرور بک گیا ہوں گا۔ مجھے ضرور بتاؤ خدا کے لئے چھپاؤ نہیں۔"

"ہاں! تم نے کچھ کہا ضرور تھا۔ لیکن وہ بالکل بے تکی سی باتیں تھیں اور اب مجھے یاد بھی نہیں تم نے کیا کہا تھا۔"

"اچھا وہی بے تکی باتیں بتادو۔"

"اب نہیں پھر کسی موقع پر بتاؤں گا۔"

پھر وہ میری طرف گھور کر دیکھتا۔ گویا مری اندرونی دنیا کے تفحص و تجسس میں مصروف ہے۔ اور پھر یک لخت آنکھیں بند کرلیتا اور ہونٹوں کو کاٹتا اور پھر کہتا۔

"شراب کا ایک پیالہ مجھے اس وقت بچا سکتا ہے۔" شراب پی کر وہ مردوں کی طرح لیٹ جاتا۔

دوسری صبح جب میں کسٹا گنگ کے کمرہ میں جارہا تھا۔ تو راستے میں مجھے ریمنڈ ملا۔

"ڈاکٹر! کیا آپ مجھ پر ایک احسان کرسکتے ہیں۔"

"ہاں اگر میرے بس کی بات ہوئی تو میں حاضر ہوں۔"

"مجھے ایک دن کی رخصت لکھ دیں۔ باہر گھومنے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

"اس کا خیال بھی نہ کرو۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرسکتا ہوں لیکن ابھی باہر جانے کی رخصت نہیں دے سکتا۔"

"لیکن اب تو میں بالکل تندرست ہوں۔ چار دن ہوئے میرا بخار ٹوٹ چکا ہے۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن شہر میں ابھی تک بخار کثرت سے ہے اور تم وہاں نہیں جاسکتے۔"

"اچھا صرف دو گھنٹہ کے لئے مجھے رخصت دیدیں۔ صرف آنے جانے میں دو گھنٹے گزر جائیں گے۔ میں چند لمحے شہر میں گزاروں گا۔"

لیکن میں کسی طرح بھی رضامند نہ ہوا اور وہ نہایت مایوسی کی حالت میں لوٹ گیا۔ کسٹا گنگ بھی ہمیں دور بستر پر لیٹا دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جب میں اس کے پاس گیا۔ تو میں نے اس کی تیمارداری کی۔

"میں تندرست ہوں۔ کیا وہ ریمنڈ تھا۔ جو ابھی تمہارے پاس کھڑا تھا وہ کیا چاہتا تھا؟"

"وہ مجھ سے باہر جانے کی رخصت مانگتا تھا میں نے انکار کردیا۔"

وہ خوشی سے اچھل پڑا اور نہایت پرجوش آواز میں کہا "تو تم نے انکار کردیا۔ خوب ہوا۔" میں اس کے جذبات کو نہ سمجھ سکا۔ اور اسی فکر میں باہر نکل گیا۔

اسی رات وارڈ میں ایک مریض جاں بحق ہوا۔ میں نے بڑے کمرے میں اسکی لاش کو امتحان کے لئے چیرنا پھاڑنا شروع کیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیری رات تھی جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک لمپ میرا پاس رکھا تھا میرے سامنے والی دو کھڑکیاں کھلی تھیں۔ باہر پہرہ دار گشت لگا رہا تھا۔ اور اس کی قدموں کی چاپ کمرے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ اس وقت پہاڑی الو کثیر تعداد میں گوشت کی بو پر کھڑکیوں کے سامنے آکر بیٹھ گئے۔ ایک بڑے کمرے میں آدھی رات کے وقت اکیلے آدمی کا ایک مردہ جسم کا چیرنا پھاڑنا اور پھر گوشت خور جانوروں کا چکر لگانا اور چارسو عالمگیر خاموشی کا ہونا ایک نہایت دہشت انگیز منظر تھا۔ مین اسیوقت اوپر والے کمرے میں کچھ شور سا ہوا میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف گیا۔ مجھے کسی شخص کے قدموں کی آواز سنائی دی جو کہ چٹان کی پگڈنڈی پر جارہا تھا۔ میں حیران تھا۔ کہ ابھی تک پہرہ دار نے اس کو نہیں

دیکھا تھا۔ اس کے بعد کسٹاگنگ کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔

" ریمنڈ کہاں جا رہے ہو؟"

اس آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد پتھر پڑنے کی آواز سنائی دی اور کوئی شخص اس تنگ پگڈنڈی پر زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ مجھ پر اس قدر بے حسی واقع ہو گئی کہ میں وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ میں باہر نکل کر اس کا سبب دریافت کروں۔ مدد کے لئے چیخ و پکار کروں۔

پھر ایک دردناک چیخ سنائی دی۔ میں پھر مبہوت سا کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک حقارت آمیز قہقہہ کے ساتھ کسٹاگنگ کی کھڑکی اس زور سے بند ہوئی کہ اس کے شیشہ ٹوٹنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور گہری خاموشی چھا گئی۔

خوف سے جو میری حالت ہوئی وہ میں کس طرح بیان کروں میرے تمام بدن میں کپکپی ہو رہی تھی۔ میں ابھی تک کھڑکیوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اضطراب قلب سے میرا ہاتھ بار بار سینہ پر جاتا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکیوں کو بند کیا۔ اور اپنے کمرے میں چوروں کی طرح داخل ہوا سونے کی کوشش کی لیکن میرے کانوں میں ابھی تک اس شخص کے پھنکارے اور پھر کسٹاگنگ کا زہر خند قہقہہ گونج رہا تھا۔ میں نے دل میں ایسا خیال کیا۔ کہ پستول سے کسی شخص کو ہلاک کرنا ایک خوفناک چیز ہے لیکن ایک نعط سے کسی کو چٹان کی گہری غار میں پھینک دینا کس قدر دہشت ناک امر ہے۔

ان ہی ہیبت ناک خیالات میں محو میں قریبًا رات کے تین بجے سو گیا۔ خواب میں بھی مجھے یہی نظارہ دکھائی دے رہا تھا۔

جب میں اٹھا۔ تو آفتاب اپنی پوری روشنی میں چمک رہا تھا۔ آسمان بالکل نکھرا ہوا تھا۔ اور رات کا واقعہ مجھے ایک خواب پریشان کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ میں کپڑے پہنکر حسب معمول مریضوں کی تیمارداری کے لئے باہر نکلا اور سب سے پہلے ریمنڈ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ اندر نہ تھا اور بستر پر رات کو کوئی شخص نہ سویا تھا۔ دریافت کرنے پر کوئی سراغ نہ ملا۔ سب یہی کہتے تھے کہ وہ شام کو دیکھا گیا تھا۔

میں ہمت کر کے کسٹاگنگ کے کمرہ میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے میری نظر کھڑکی کے دو ٹوٹے ہوئے شیشوں پر پڑی۔

" رات کو کتنی خوفناک ہوا تھی کہ تمہاری کھڑکی کے شیشے بھی ٹوٹ گئے۔" وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھا تھا۔

" ہاں! رات کو غلطی سے کھڑکیاں کھلی رہ گئی تھیں۔"

میں نے اس کی نبض کو چھوا۔ " تم پہلے سے صحت یاب ہو چکے ہو۔ لیکن ابھی تک تمہارے دل میں بیقراری ہے۔ چار دن تک تم بالکل شفایاب ہو جاؤ گے۔"

رات کا خوفناک سین میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ریمنڈ کی موت کا باعث کسٹاگنگ ہی ہے۔ اس کی خوفناک آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں نبض دیکھنے کے لئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ تو مجھ کو معلوم ہو رہا تھا۔ کہ میں نے سانپ کو ہاتھ میں لیا ہوا ہے میں کانپ رہا تھا۔ میں جلدی اس کے کمرہ سے نکل جانا چاہتا تھا" ریمنڈ" جب میں باہر نکلنے لگا۔ تو پھر مڑا اور کانپتی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔ " ریمنڈ گذشتہ رات سے مفقود ہے۔ تمہارے کمرہ میں تو نہیں آیا تھا؟" وہ چونک پڑا گویا اسے کسی نے سوئی چبھو دی۔

" ریمنڈ! ریمنڈ میرے کمرے میں تو نہیں آیا۔ گذشتہ رات کوئی شخص میرے کمرے میں داخل نہیں ہوا۔"

اس کا چہرہ اس کے جرم کا راز افشا کر رہا تھا لیکن بدقسمتی سے میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ میں خاموش ہو رہا۔ میں اپنے کمرے میں بہتیرا اس معاملہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میں اس کا نام لے دوں کہ وہ ریمنڈ کا قاتل ہے تو یقینی امر ہے۔ کہ وہ انکار کرے گا اور اس کے انکار کی تردید کے لئے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور وہ اس کے بعد میرا جانی دشمن ہو جائے گا۔

چنانچہ میں خفیہ طور پر اس کی نقل و حرکات پر غور کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی وقت یہ راز ضرور افشا ہو گا۔

دوسرے دن عرب کا ایک قافلہ جو کہ قسطنطین جا رہا تھا ہمارے پاس آیا اور انہوں نے بیان کیا۔ کہ انہوں نے ایک درخت پر کچھ کپڑے لٹکے ہوئے دیکھے اور گدھیں اور چیلیں ہزاروں کی تعداد میں وہاں جمع تھیں۔ نزدیک آنے پر انہیں آدمی کی لاش نظر پڑی اور وہ یہاں اٹھا لائے۔ یہ ریمنڈ کی لاش تھی۔

فوجی شان کے ساتھ اس کی لاش کو دفنا دیا گیا اور دو تین دن

تک ہر ایک شخص اسی واقعہ پر گفتگو کرتا رہا۔ اور ہر ایک اپنے خیال کے مطابق رائے قائم کرتا۔ لیکن اس کے بعد جلدی ہی لوگ اس واقعہ کو بھول گئے۔

وہ لوگ جو ہمیشہ خطرہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ موت سے ہراساں نہیں ہوتے اور کسی کی موت پر ان کی ہمدردی نہایت تھوڑے وقفہ کے لئے ہوتی ہے۔ آج ایک کی موت واقع ہوتی ہے۔ کل اس کی جگہ اور آجاتا ہے اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ فوج کی زندگی ہمیشہ موت پر مضحکہ اڑاتی ہے۔ کیونکہ زندگی میں ہی ان کے لئے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ آج ایک کرنیل ہے کپتان ہے کل میدان وغا میں مٹی کا ڈھیر ہے۔ فیصلہ ہوا۔ لوگ بھول گئے اس کی شخصیت دفنا دینے کے بعد ہی صفحہ دنیا سے محو ہو گئی۔

میری حالت نہایت دگرگوں ہو رہی تھی۔ قاتل میرے سامنے تھا اور اس بات کا صرف مجھے علم تھا۔ ضمیر مجھ پر ایک غیر معمولی بوجھ ڈال رہا تھا۔ میری خاموشی میرے لئے باعثِ گناہ عظیم تھی۔ جب کسٹا گنک مجھے نظر پڑتا۔ تو میں دل مسوس کر رہ جاتا۔ غصہ کی وجہ سے میں اندر ہی اندر بل کھا کر رہ جاتا۔ لیکن میں مجبور تھا کاش میں مقتول کا بدلہ اس کے قاتل سے کسی طرح لے سکتا۔

وہ بھی جب مجھے دیکھتا۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھا جاتی۔ اور اس کی تیز نظریں مجھ پر جمی رہتیں۔ میں نے خیال کیا کہ اس کو اس بات کا شک ہے کہ مجھے اس کا راز معلوم ہے اور اگر اسے اس بات کا یقین ہو گیا تو ضرور مجھ پر حملہ کرے گا۔

میں ہر وقت اسی خیال میں محو رہتا اور میرے دل پر افسردگی سی چھائی رہتی۔ مجھے اس کا انتظام کرنا نہایت ضروری تھا اور جب تک میں موجودہ حالت کا رخ نہ بدلوں میں ایک لمحہ بھی چین سے نہ رہ سکتا تھا۔ لیکن میں کس طرح اس مصیبت سے نجات پا سکتا تھا؟ آخر کار خدا نے میری مدد کی۔

ایک دن جب میں شفاخانہ کے احاطہ سے باہر نکل رہا تھا۔ تو ایک کارپورل میری طرف دوڑتا ہوا آیا اور مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیا۔ جو کہ اس کو ریمنڈ کے کوٹ میں سے ملا تھا۔

"یہ ایک عورت فاطمہ کا لکھا ہوا ہے۔ غالباً مرحوم ریمنڈ اس سے محبت کرتا تھا۔ میں یہ رقعہ آپ کے پاس لایا ہوں۔ کیونکہ یہ خالی از دلچسپی نہیں"۔

میں نے رقعہ پڑھا بالکل مختصر تھا۔ ملاقات کی جگہ اور وقت لکھا تھا۔ پھر مجھے معاً خیال آیا۔ کہ کسٹا گنک بھی بیہوشی کی حالت میں "فاطمہ فاطمہ" پکارتا تھا۔ اس رقعہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ریمنڈ سے محبت کرتی تھی۔ غالباً اسی عورت کے ملنے کے لئے ریمنڈ مجھ سے رخصت مانگتا تھا اور جب میں نے رخصت دینے سے انکار کر دیا۔ تو وہ رات کے وقت پہاڑی پگڈنڈی کے خوفناک راستے سے اندھیرے کے پردے میں اپنی محبوبہ کے پاس جانا چاہتا تھا۔ پھر کسٹا گنک نے اس کو جاتے ہوئے دیکھ لیا اور ریمنڈ کی موت موانع ہوئی۔ سب باتیں ایک عقدۂ لاینحل بن گئیں۔

ہمارے احاطہ میں ایک شخص سیدی حمام رہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہو گیا تھا۔ اور تمام شہر کے طبیبوں سے مایوس ہو کر میرے پاس آیا تھا۔ اور میرے علاج سے وہ صحت یاب ہو گیا تھا۔ اس دن سے وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اس سے اس بات کا مشورہ کروں۔ میں سیدی حمام کے پاس گیا۔ وہ نماز ادا کر رہا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے کہا:

"آپ کس طرح غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں؟ کیا حکم ہے"؟

"کیا تم مجھے فاطمہ سے ملا سکتے ہو"؟

"فاطمہ! مصری لڑکی!"

"ہاں!"

"آپ کو اپنی جان کی قسم! اس سے ملاقات نہ کریں"۔

"کیوں!"

"اس نے بہت سے آدمیوں کو تباہ کیا ہے۔ اس میں کچھ اس قسم کا حسن جاذب ہے۔ کہ آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اس کے پاس ایک تعویذ بھی ہے"۔

"لیکن میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ حسن اور جوانی ہمیشہ رہنے والی چیزیں نہیں۔ اس کو کہو کہ میرے پاس بھی ایک تعویذ ہے۔ جس سے حسن اور جوانی زائل نہیں ہوتی بڑھاپے کے آثار چہرے پر ہرگز نمایاں نہیں ہوتے۔ انسان کا حسن ہمیشہ برقرار رہے گا۔ چونکہ بڑھاپا ہر ایک شخص پر آنے والا ہے۔ جوانی اور اس کی رعنائیاں دیرپا نہیں ہیں۔ اس لئے اس کو کہو کہ اگر وہ اپنے حسن کو غیر فانی بنانا چاہتی ہے۔

تو مجھ سے تعویذ لے"۔

"بہت اچھا! آپ کل اسی وقت یہاں تشریف لے آویں۔ تو اکٹھے چلیں گے لیکن ایک دفعہ میں پھر آگاہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے حسن سے دنیا کے ہر فرد کو مسحور کر لیتی ہے۔ اور میں آج ہی اس سے پوچھ لوں گا"۔ "تم خاطر جمع رکھو۔ مجھ پر اس کا سحر نہیں چل سکتا۔ اور اپنا وعدہ نہیں بھولنا"۔

میں نہایت بے قراری سے مؤذن کی اذان کا انتظار کرنے لگا آخرکار قرآن کے روح پرور الفاظ شہر کی دیواروں سے ٹکراتے ایک مینار سے دوسرے مینار تک اذان گونج اٹھی۔ تھوڑی دیر بعد ہمام داخل ہوا اور کہنے لگا۔

"جلدی چلئے فاطمہ آپ کا انتظار کر رہی ہے"۔

وہ آگے آگے ہولیا اور ہم شفاف آسمان کے تلے نہایت تیز سے قدم اٹھائے جا رہے تھے۔ شہر کی فلک بوس عمارتیں ایک عجیب دہشت برسا رہی تھیں۔

ہمام بغیر ادھر اُدھر دیکھے آگے آگے جا رہا تھا اس کا لمبا چغہ کبھی کبھی زمیں کو چھوتا تھا۔ اور وہ عربی زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ غ وہ کوئی دعا تھی۔ پھر وہ ایک تنگ تاریک گلی میں داخل ہوگیا۔ ا پندرہ بیس منٹ تک ہم اس تاریک گلی میں چلتے رہے۔ آخرکار ایک دروازہ پر جا کر ٹھیر گیا۔ اور دستک دی۔ میں نے اس کو آہ سے کہا۔

"تم کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا اور میری ترجمانی کرنی ہوگ

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"وہ فرانسیسی زبان جانتی ہے"۔

اس وقت ایک سیاہ رنگ کی خادمہ باہر آئی۔ ہمام نے عربی میں اس کو کچھ کہا۔ میں اندر داخل ہوا۔ ہمام باہر کھڑا رہا وہ خادمہ مجھے ایک کمرہ میں لے گئی۔ جو کہ نہایت اعلیٰ درجہ پر آراستہ تھا۔ جا بجا مصری حریر کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ سرخ رنگ کے غالیچے پر نیلے گاؤ تکیے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اور چھت پر نہایت اعلیٰ قسم کی مینا کاری ہو رہی تھی۔ پھر ایک پردے میں سے فاطمہ نمودار ہوئی۔ واقعی اس کا حسن نہایت دلفریب تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں ایک سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ ایک سحر انگیز مسکراہٹ اس کے چہرہ پر ظاہر ہوئی۔ کچھ دیر تو وہ مجھے دیکھتی رہی۔ پھر مخاطب ہوئی۔

"سیدی ہمام نے مجھے آپ کی تشریف آوری کی خبر کل دی تھی۔ میں آپ کی نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ پر کرمفرمائی کی اور میرے لئے دائمی حسن کا تعویذ لائے ہیں۔ میری عمر اس وقت سترہ سال کی ہے اور میں اس وقت اپنے آپ کو معمر خیال کرتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ جلدی ہی میرے حسن کی وہ عالمگیر کشش زائل ہونے والی ہے۔ مجھے اس وقت اس تعویذ کی نہایت ضرورت تھی"۔

میں اس وقت کچھ جھجک گیا۔ کیوں کہ یہ تعویذ کا تو صرف ملاقات کا ایک بہانہ تھا۔ میں نے مطمئن آواز میں موضوع کو بدلتے ہوئے کہا

"واقعی فاطمہ! جو کچھ تمہارے حسن اور عقل کی نسبت میں نے سنا تھا۔ وہ حرف بہ حرف ٹھیک ہے"۔

"آپ نے کس سے سنا تھا"؟

"ریمنڈ سے"

اس نے نہایت بلند آواز میں کہا "ریمنڈ سے"

"ہاں! ریمنڈ سے جو کہ کچھ دن ہوئے۔ پہاڑی سے گر کر ہلاک ہوگیا ہے۔ غالبًا تم کو اس سے محبت تھی"۔

"محبت! مجھے! نہیں یہ غلط بات ہے۔ کیا اس نے تم کو کہا تھا"۔

"نہیں! لیکن مجھے تمہارے اس رقعہ سے معلوم ہوگیا تھا۔ اور یہی رقعہ غالبًا اس کی موت کا باعث ہوا۔ اور تمہیں ملنے کے لئے اندھیری رات میں پہاڑی پر اس نے اپنی جان کھو دی"۔

جونہی میں نے یہ الفاظ ختم کئے وہ دیوانہ وار اٹھ کھڑی ہوئی اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ "میری خادمہ عائشہ نے جب مجھے کہا کہ ریمنڈ پہاڑی پر سے گر کر ہلاک ہوگیا ہے۔ تو فورًا مجھے خیال پیدا ہوا۔ کہ اس شخص کی کارستانی ہے۔ وہ بدمعاش ہے کمینہ ہے"۔

اس نے میرا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل زرد ہوگیا تھا۔ اور وہ ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کیا آپ اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے کی اپنی پوری کوشش نہ کریں گے۔ میرے لئے اور صرف میرے لئے اس شخص کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیلوں کے آگے پھینک دینا چاہئے"۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کس شخص کو؟

"کسٹاگنک کو اور کس کو!

"تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ اس شخص کو کسی طریقہ سے زہر دے کر مار دو۔ اسی نے مجھے ترغیب دی تھی۔ کہ میں بدنصیب ریمنڈ کو یہاں بلانے کے لئے رقعہ لکھوں۔ میں نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے ڈرا دھمکا کر اس کی طرف خط لکھوایا۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ یہ ایک سازش تھی کیسٹا گنک اس کی جان لینا چاہتا تھا"۔

پھر اس کے بعد اس نے کسٹا گنک کی محبت کا قصہ سنایا۔ وہ ایک وحشی تھا۔ اور فاطمہ کو اس سے سخت نفرت تھی۔

میں نے فاطمہ کو الوداع کہا۔ یہ قصہ سنکر مجھے نہایت قلق ہوا۔

میں اور ہمام اسی راستے سے پھر واپس جا رہے تھے۔

"صاحب! آپ کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ فاطمہ اپنا وار کر گئی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی آپ کو کہہ دیا تھا۔ کہ اس کے پاس ایک شیطانی طاقت ہے"۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا" ہمام! کوئی فکر کی بات نہیں"۔

میں جاتے ہی کسٹا گنک کے کمرہ میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ حسب معمول چونک پڑا۔

"کہئے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا"؟

ایک بات میں کہنی بھول گیا ہوں۔ جب میں فاطمہ سے رخصت ہونے لگا تھا۔ تو میں اس سے وہ خط لے آیا تھا۔ جو کہ کسٹا گنک نے فاطمہ کو ریمنڈ کو دعوت دینے کی ترغیب میں لکھا تھا۔

میں نے وہ خط کھول کر کسٹا گنک کے سامنے کیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اور پھر یک لخت مجھ پر جھپٹنے لگا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

میں نے اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا" اگر تم نے ذرا بھی [illegible] کی۔ تو میں تمہیں کتے کی موت ماروں گا۔ تم بدترین انسان ہو۔ [illegible] تم نے ریمنڈ کو قتل کیا۔ جس رات تم نے اسے قتل کیا۔ میں سب کچھ [illegible] کے بڑے کمرے میں کھڑا سن رہا تھا۔ تم اس کا انکار نہیں کر سکتے [illegible] جو کچھ تم نے اس لڑکی کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ تمہاری گندی [illegible] کی بیّن دلیل ہے۔ ایک فرانسیسی افسر سے یہ ہرگز توقع نہیں ہو سکتی [illegible] ہماری قوم میں ایک ناپاک روح ہو اور ہرگز اس قابل نہیں کہ تمہیں [illegible] رہنے دیا جائے۔ سنو! میں نہیں چاہتا۔ کہ میں تمہیں قانون کے ہاتھ [illegible] میں دیدوں اور وہ تمہیں نہایت ایذا رسانی کے بعد کیفر کردار تک پہنچائے۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ تم اپنے ہاتھوں اپنا کام تمام کر لو۔ صرف ایک دن کا تمہیں وقفہ دیتا ہوں۔ کل اس وقت تمہیں زندہ نہ دیکھوں۔ ورنہ مجبوراً کمانڈر کے حوالے تمہیں کرنا پڑے گا"۔

میں نے یہ الفاظ نہایت جوش میں کہے اور کہتے ہی باہر نکل آیا۔ اور ایک پہرہ دار اس کے کمرہ کے سامنے متعین کر دیا۔ اور اسے حکم دیا کہ وہ کسٹا گنک کو کسی بہانے سے بھی باہر نکلنے نہ دے اور یہ بھی ہدایات کیں کہ وہ کسٹا گنک کی حرکات پر غور کرتا رہے۔

آج میں اپنے کمرے میں نہایت اطمینان سے بیٹھا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ سر سے ایک بڑا بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔

مؤذن نے اذان دی۔ آہستہ آہستہ شور و شغب رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ میں اپنے دروازے کو مضبوط تالا لگا کر لیٹ گیا پھر اٹھا اور [illegible] کے سامنے کھڑا ہو کر تازہ ہوا لینے لگا۔ اور جو گذشتہ پانچ دن میں [illegible] کوفت ہوئی اس پر خیال دوڑانے لگا۔

دو پہرہ دار بدل چکے تھے۔ لیکن ابھی تک میں کھڑکی کے سامنے [illegible] تھا۔ اچانک سیڑھیوں پر سے کسی کے اترنے کی آواز آئی پھر آہستہ [illegible] میرے دروازہ پر کسی نے دستک دی۔

مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کسٹا گنک ہے۔

پھر کسٹا گنک کی آواز میرے کانوں میں پڑی" دروازہ کھولو"۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے دروازہ کو اپنے کندھوں سے زور دے کر کھولنا چاہا لیکن دروازہ مضبوط تھا۔ اور وہ واپس چلا گیا۔

میں نے اس خیال سے کہ وہ دوبارہ واپس آئے گا۔ دروازہ میں [illegible] دونی سلاخیں لگا دیں۔ اس کے بعد میں نے کسٹا گنک کو اسی خوفناک پگڈنڈی پر جس پر ریمنڈ کی موت واقع ہوئی تھی جاتے دیکھے۔ وہ اپنی کرپان کے ساتھ رگڑ رگڑ کر چل رہا تھا۔ جب وہ اس راستہ کے عین درمیان میں آیا۔ تو میں نے کہا۔

"کسٹا گنک! کہاں جا رہے ہو"؟

وہ یک لخت چونک پڑا اور کہنے لگا۔

آہا! ڈاکٹر تم اندر ہی تھے میں ابھی واپس آتا ہوں اور ہمیں آپس میں ایک معاہدہ کر لینا چاہئے۔ میں نے اپنے برقی لمپ سے نیچے والی اتھاہ غار میں روشنی ڈالی اور کہا۔